صدر العلما، عمدۃ المحققین علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ العالی
ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ کی علمی اور تحقیقی نگارشات کا قابلِ قدر مجموعہ بنام

مقالاتِ مصباحی

مُرتّب
محمد توفیق احسن برکاتی مصباحی
اُستاذ جامعہ اشرفیہ مُبارک پور

ناشر المجمع الاسلامی مُبارک پور اعظم گڑھ یوپی

صدر العلماء، عمدۃ المحققین علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ العالی

ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ کی علمی اور تحقیقی نگارشات کا قابل قدر مجموعہ بنام

مرتب

محمد توفیق احسن برکاتی مصباحی

استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

ناشر

المجمع الاسلامی مبارک پور اعظم گڑھ یوپی

تفصیلات

سلسلۂ اشاعت ۱۸۳

مقالات مصباحی
MAQALAT-E-Misbahi

تحریر
علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ العالی

ترتیب و تقدیم
محمد توفیق احسن برکاتی مصباحی

ضخامت: (۸۱۶)

سنہ اشاعت: ۱۴۴۳ھ/۲۰۲۲ء

کمپوزنگ
محمد زاہد اختر مصباحی، مبارک پور

قیمت:

ناشر
المجمع الاسلامی
ملت نگر مبارک پور، اعظم گڑھ

Writer:
Allama
Mohammad Ahmad Misbahi
Compiled by:
Taufiq Ahsan Barkati
Pages: *(816)*
Year Publication: 2022
Composing:
Mohammad Zahid Akhtar
Price:
Publisher:
Al-Majmaul Islami
Millat Nagar Mubarakpur
Azamgarh

Contact:
Phone: *+917007576367*
Email: *almajmaulislami123321@gmail.com*

انتساب

مرکز علم و فن دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم، مبارک پور
کے نام

فہرست مضامین

ابتدائیہ

باب اول: علمی وتحقیقی مضامین

باب دوم: فکری واصلاحی مضامین

باب سوم: سوانحی مضامین

باب چہارم: تأثراتی مضامین

باب پنجم: تبصرہ اور مکالمہ

باب ششم: مقدمے اور تقاریظ

باب ہفتم: فقہی مقالات کے خلاصے

باب ہشتم: مکتوبات

❀❀❀

تقدیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً ومصلیاً ومسلماً

ایک مومن کے لیے سب سے قیمتی متاع ایمان ویقین اور اصلاح وموعظت کے وہ خزانے ہیں جو مردانِ حق آگاہ اور سالکان راہِ خدا کی زندگیوں اور ان کے ملفوظات ونگارشات میں ملتے ہیں۔ بزرگوں کی کتابِ زندگی کے اوراق بیش قیمت تحریروں سے سجے ہوتے ہیں، جن کا مطالعہ کرنے والا ان گراں بہا جواہر پاروں کو چنتا اور انھیں حرزِ جاں بنا کر رکھتا ہے۔ اسی طرح علم وادب کا شجر سایہ دار، اُن باکمال اربابِ فن اور وارثانِ علوم کی محنتوں اور علمی وتحقیقی کوششوں کا نتیجہ ہے جن کے اعلیٰ ذہن اور روشن دماغی کا زمانہ قائل ہے۔ انھوں نے سفید کاغذ کی زمین پر قلم کی نوک سے علم وفن کے جو گل بوٹے کھلائے ہیں ان کی نکہت کو زوال واِدبار کا تلخ گھونٹ نہیں پینا پڑتا۔ ایمان ویقین پر کسی کی اجارہ داری ہے، نہ ہی علم وادب کی کاشت کسی کا خاص حق۔

اللہ تعالیٰ کی عطا بھی بڑی حیرت انگیز ہوتی ہے۔ کوئی ایمان ویقین سے بے بہرہ رہتا ہے لیکن حیران کن تحقیقات اور علمی برتری کا نشانِ امتیاز بن جاتا ہے اور کسی کے پاس ایمان وسلامتی کی دولت بے بہا موجود رہتی ہے لیکن وہ علم وادب سے تہی دامن رہتا ہے۔ ہاں! اگر کوئی ان دونوں کمال کا مجمع البحرین ہو جائے تو وہ مثال بن جاتا ہے۔ بلا مبالغہ استاذ گرامی حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ العالی ایمان ویقین کی پختگی میں اپنا جواب نہیں رکھتے، یوں ہی علم وادب، شعور وآگہی، فکر وتدبر اور اعلیٰ دماغی میں امتیازی شان کے مالک ہیں، اس حقیقت کے ثبوت کے لیے ان کے بلند پایہ اساتذہ اور درجنوں معاصرین کی رائیں شاہد بن سکتی ہیں۔ ان کی کتابِ زندگی کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ سادہ سی زندگی میں دینی وعلمی کاموں کی کس قدر رنگینیاں اور سلجھے ہوئے شفاف کردار میں علم وادب کے کتنے لعل وجواہر موجود ہیں۔

یہ زندگی راہِ مستقیم پر گامزن ہے، یہ کردار کسی "رجل غیب" کا عکس جمیل ہے، یہ علمی جہان کس قدر تابناک ہے، علم وادب کے اس آسمان کو باکمال اور نابغۂ روزگار اساطین علم وتحقیق نے چمکتے ستاروں سے سجایا ہے۔ یہ ہیرا بڑی محنتوں سے تراشا گیا ہے۔ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور سے سندِ فضیلت پا لینے کے بعد ایک دارالعلوم میں تعلیم و تدریس کی اجازت طلبی کے لیے استاذ مکرم حافظ ملت علامہ عبد العزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمہ کو مکتوب ارسال

کیا تو جوابی خط [محررہ: ۱۳۸۹ھ] میں استاذِ جلیل نے فرمایا:

" محبت نامہ ملا، آپ کی سعادت مندانہ زندگی اور مخلصانہ و محبانہ روش اس منزل پر ہے کہ میرے حاشیۂ خیال میں بھی غلطی اور ناراضی کا کوئی گوشہ اور شوشہ نہیں، میں آپ کا مخلص دعا گو ہوں۔ مولاے کریم ہمیشہ بہ صحت و سلامتی شاد و آباد رکھے، دین متین کی نمایاں و ممتاز خدمات انجام دلائے، آمین۔ آپ کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ابھی آپ اشرفیہ کو کچھ وقت اور دیں تو آپ اور زیادہ قیمتی ہو جائیں گے۔"[1]

اس مکتوب کا ہر جملہ ایک مشفق استاذ کا اپنے شاگرد کے لیے کامل اعتماد اور وثوق کی گواہی دیتا ہے، بطور خاص آخری جملہ ایک بیش قیمت کو اور زیادہ قیمتی بن جانے کا اشارہ یہ ہے۔ استاذ گرامی کا یہ اعتماد آج ایک کرامت بن کر موجود ہے۔

ان کی لسانی مہارت انتہائی حیرت انگیز ہے۔ بلکہ ان کا تحقیقی اسلوب و آہنگ اردو کے عناصر اربعہ کو چیلنج دیتا ہے۔ عربی، فارسی تحریروں میں جو لطافت و برجستگی پائی جاتی ہے وہ اہل عرب و فارس کو متحیر کر دینے والی ہے۔ ان کی اوریجنل عربی و فارسی نگارشات و تراجم دیکھے جائیں تو یہ ظاہری مبالغہ حقیقت سے کافی قریب محسوس ہوگا۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں کے اصول و مبادی سے متعلق ہند و پاک کے علما و اساتذۂ ادب ان سے مشاورت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک زمانے تک عربی ادب کی تدریس و تعلیم دی ہے، اور تصنیف و تحقیق کا طویل تجربہ بھی انھیں حاصل ہے۔ ڈاکٹر ارشاد احمد ساحل سہسرامی اپنی تاریخی کتاب "عرفان عرب" میں لکھتے ہیں:

"[علامہ] محمد احمد مصباحی: جامعہ اشرفیہ کے شیخ الادب والتفسیر تھے، اب شیخ الجامعہ ہیں، سینکڑوں مقالات اور درجنوں گراں قدر تصانیف رکھتے ہیں۔ طلبہ میں ادبی اور تحقیقی ذوق بیدار کرنا آپ کا خاص وصف ہے۔ ناچیز کو فکر و قلم کا جو بھی شعور حاصل ہوا، وہ حضرتِ استاذ کی فکری تربیت کا فیض ہے۔ عربی ادبیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ عربی نثر ایسی شستہ اور بے ساختہ لکھتے ہیں کہ عرب نژاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ تفسیر، حدیث، اسماء الرجال، اصول، فقہ، ادب، تاریخ میں مرتبۂ اختصاص پر فائز ہیں۔ چلتے پھرتے تاریخی مادے برآمد کر لینا آپ کے لیے عام سی بات ہے۔ آپ کی ذات گرامی مغتنماتِ روزگار سے ہے۔"[2]

"قرآنیات" سے ان کی حد درجہ آگاہی کی شہادت "تدوین قرآن" اور "رسم قرآنی اور اصول کتابت" کے مطالعے سے مل جاتی ہے۔ "تدوین قرآن" میں جہاں ابتداے نزول سے لے کر انتہاے تدوین تک کی پوری کیفیت کا ذکر اور تاریخ تدوین کا تفصیلی بیان موجود ہے، وہیں مخالفین اسلام کے الزامات کا مکمل سنجیدگی کے ساتھ

---

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، حافظ ملت نمبر، جون تا اگست ۱۹۷۸ء، ص: ۱۹۰

(۲) عرفان عرب، سلطان شیر شاہ سوری پبلی کیشنز، سہسرام، ۲۰۰۹ء، ص: ۵۵۴

علمی و تحقیقی جواب بھی دیا گیا ہے۔ کثیر تاریخی و علمی افادات ان پر مستزاد ہیں۔

"تفسیر قرآن" ان کا طویل تدریسی تجربہ ہے، ایک لمبے عرصے سے تا حال جامعہ اشرفیہ میں بیضاوی اور مدارک کی تعلیم و تدریس کا فریضہ نبھا رہے ہیں۔ مولانا احمد القادری، امریکہ لکھتے ہیں: "ان کی درسی تقریریں حافظ ملت علیہ الرحمہ کی تقریروں کا نمونہ ہوتی ہیں۔ "یعنی حسن ایجاز اور کمال تفہیم کا بے مثال نمونہ کہ اگر انھیں قلم بند کیا جائے تو ایک مستقل مضمون کی شکل اختیار کر لیں اور حذف و اضافے کی ضرورت کم محسوس ہو۔ عربی زبان میں "تفسیر مدارک" کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا ہے جسے "مواهب الجليل لتجلية مدارك التنزيل" [۱۴۲۹ھ] کے تاریخی نام سے مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ نے شائع کیا ہے۔

"علم حدیث و اصول حدیث" میں ان کی مہارتِ کاملہ کا اندازہ "تنقید معجزات کا علمی محاسبہ" پڑھ کر بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں محمد آباد گوہنہ، مئو میں علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی کی کتاب "حجة الله على العالمين فى معجزات سيد المرسلين " کے ربع حصے کا اردو ترجمہ کیا تو اس پر ایک بسیط مقدمہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء میں وہ مقدمہ "تنقید معجزات کا علمی محاسبہ" کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ یہ مقدمہ کیا ہے؟، سیرت النبی کے نام پر خصائصِ مصطفوی اور معجزاتِ نبوی کو مضحکہ خیز اور فرضی بتانے والوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے اور ان کے علمی رسوخ اور تاریخ دانی کا بھرم کھولتا ہے۔ اصول حدیث کے فرضی مقولوں کا سہارا لے کر معجزات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی تنقیدوں کا شیش محل ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہے، جسے دیکھ کر ادبی دنیا کے شہرت یافتہ محققین کی علمی سطحیت کا یقین ہو جاتا ہے اور خصائص مصطفوی سے ان کا بغض ظاہر ہو جاتا ہے۔ آپ نے ائمہ حدیث اور اصولیین کے مسلمہ ضابطوں کی روشنی میں حقیقی ماٰخذ کا سہارا لے کر جو چشم کشا حقائق پیش کیے ہیں ان کی قرار واقعی اہمیت مطالعہ کے بعد ہی ذہن میں محفوظ ہو سکتی ہے۔ اخیر میں آپ نے ان تنقیدوں کے اسباب بھی تلاش کر لیے ہیں جنھوں نے انھیں یہ سب کرنے پر مجبور کیا تھا۔

ان کی فقہی بصیرت کا بھی جواب نہیں۔ اس کا اندازہ مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ کے فقہی سیمیناروں کے فیصلے دیکھ کر ہو جاتا ہے جو ایجاز و جامعیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان کے فقہی کمال کا منہ بولتا ثبوت۔ اسی ضمن میں امام احمد رضا قادری قدس سرہ کے حاشیۂ شامی "جد الممتار" اول و دوم کی تدوین و تحقیق اور اس پر انتہائی جامع اور تحقیقی عربی مقدمے کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ صرف اس حاشیے کی نقل اور اصل مسودہ سے مقابلہ ہی کوئی معمولی کام نہ تھا، اس کی باضابطہ تدوین و تحقیق اور جلد ثانی میں شامی کی اس پوری بحث کا خلاصہ تحریر کر کے شامل کرنا جہاں امام احمد رضا قادری نے حاشیہ رقم فرمایا تھا۔ یہ بجاے خود ایک علمی و فقہی کام ہے اور یہ کام بغیر فقہی بصیرت کے کیا ہی نہیں

جاسکتا۔ صرف ایک شہادت پیش خدمت ہے، وہ بھی ایک ایسے عالم ربانی اور فقیہ اعظم کی جو مدح وستائش میں کڑے اصول کا پابند تھا اور حق دار کو ہی حق دینے کا مزاج آشنا تھا۔ شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ عربی مقدمہ جدالممتار کے اردو ترجمے کے "ابتدائیہ" میں رقم طراز ہیں:

"قدرت نے انھیں ذہانت وفطانت اور قوت حفظ کے ساتھ مطالعے کا ذوق وشوق بہت زیادہ عطا فرمایا، حفظ اوقات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیتے، ہر وقت مصروف۔ یہی وجہ ہے کہ جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ علم ادب میں اقران پر فائق ہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان میں رضویات کا ان جیسا کوئی واقف کار نہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ انتہائی متواضع، منکسر مزاج، قناعت پسند، زاہد صفت بزرگ ہیں۔ شریعت کے پابند، شبہات تک سے بچنے والے، تقویٰ شعار فرد، صاحب تصانیف دانش ور۔"(۱)

جدالممتار جلد ثانی کی اشاعت پر ایک شناور فن اور بزرگ قلم کار مفتی عبدالقیوم ہزاروی علیہ الرحمۃ (متوفی: ۷/۲ جمادی الآخرہ ۱۴۲۴ھ/ ۲۹ اگست ۲۰۰۳ء) نے ایک خط کے ذریعہ اپنے قلبی تاثرات کا اس طرح اظہار کیا:

۹ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

محترم المقام جناب علامہ محمد احمد مصباحی صاحب دامت برکاتہم

مزاج گرامی! ـــــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جدالممتار کی صورت میں گراں قدر علمی تحفہ موصول ہوا— کثیر الانواع مصروفیات کے باوجود آپ نے جس تعمق، دقت نظر، لگن اور خلوص سے یہ خدمت سرانجام دی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے، جو کام کئی لوگوں کو مرحلہ وار کئی سالوں میں کرنے تھے وہ اکیلے آپ نے پہلی اشاعت میں مکمل کر دیے اور مختصر حاشیہ جدالممتار کی آپ نے ایک مستقل اور مبسوط ایسی شرح تیار کر دی ہے جس میں تنویر، در مختار، شامی کے ساتھ متعلقہ مسائل پر اعلیٰ حضرت کی دیگر تحقیقات کے علاوہ آپ نے افادات، توضیحات اور تلخیصات کو اس میں سمو دیا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ.

تقدیم میں اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت پر قائم کردہ پندرہ عنوانات کی تقریب کے سلسلہ میں تعدد شواہد کا التزام پھر شواہد میں دقیق الفہم مسائل کا انتخاب آپ کی علمی مردانگی کی دلیل ہے۔ کہ سہل انگاری کی بجائے جرأت وبہادری سے مشکل میدان میں اتر کر مسائل کو دعوت مبارزت دی گئی

(۱) امام احمد رضا کی فقہی بصیرت، المجمع الاسلامی، مبارک پور، ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء، ص: ۸، ۹

ہے۔ سبحان الذی خصك وحباك لهذا العمل الشريف— کاش کہ آج اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ زندہ ہوتے تو آپ کی اس کاوش پر فخر فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے۔ یہ ناچیز اور جملہ علماے اہل سنت آپ کے اس احسان پر ممنون ہیں۔ اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وعافیت کے ساتھ مزید خدمات کی توفیق سے نوازے اور آپ کے علم وعمل اور خلوص میں برکت عطا فرمائے۔ آمین بجاه النبي الامي ﷺ(۱)

تاریخ ملل وفرق اور ان کے افکار واوہام سے کامل آشنائی، یوں ہی علم کلام میں ان کی مہارت کا اندازہ "حدوث الفتن وجهاد أعيان السنن" سے لگایا جاسکتا ہے جو عربی زبان میں اپنے موضوع پر مصنف کا عظیم علمی وتاریخی شاہکار ہے۔ ہندوستان اور مصر وبیروت سے اس کی طباعت واشاعت اس کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالغفار اعظمی نے کیا ہے۔

فن منطق وفلسفہ اور علم ہیئت سے بھی آپ کو اچھی خاصی واقفیت ہے۔ اگرچہ ان فنون میں حضرت کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ کے چھبیسویں فقہی سیمینار میں انھوں نے علم ہیئت وسائنس کی روشنی میں کرۂ عالم کی حقیقت بیان کی اور دنیا کے مختلف دائروں اور سورج کی گردش کا حال بیان فرمایا تھا، ساتھ ہی نظام شمسی وقمری، زمین کے شرقی وغربی بلاد، طویل العرض بلاد وغیرہ پر جو چشم کشا حقائق بیان فرمائے تھے انھیں سن کر یہ یقین پختہ ہو گیا کہ یہ فن بھی ان کی گرفت میں ہے۔

علم منطق کی مشہور کتاب "التهذيب" پر حضرت کے شاگرد مولانا محمد عاقل مصباحی نے عربی زبان میں شرح تحریر کی ہے جو مجلس برکات جامعہ اشرفیہ سے طبع ہو چکی ہے اور شامل درس نظامی ہے۔ جامعہ اشرفیہ میں دوران تدریس "شرح تہذیب" میں ایک مقام پر راقم الحروف کی نگاہ سے ایک مستقل بحث کی تلخیص گزری جو حضرت مصباحی صاحب کے قلم سے تھی، اسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ حضرت نے منطق کو بھی سرسری نہیں پڑھا، بلکہ اس فن پر بھی انھیں دسترس حاصل ہے۔

علم تصوف وسلوک کو ان کا زندگی نامہ کہا جاسکتا ہے، حقیقت تصوف، تاریخ تصوف، تعلیمات تصوف اور احوال صوفیہ پر ان کے مستقل مضامین ہیں۔ "امام احمد رضا اور تصوف" ایک معرکۃ الآرا تحقیقی کتاب ان کی قلمرو میں شامل ہے، اس کے مطالعے سے یقین ہوجاتا ہے کہ حضرت کی فکر میں علمی تصوف اور ان کی زندگی میں عملی تصوف کا خزانہ موجود ہے۔ اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ ایک مومن کی زندگی اگر شریعت کا مزاج رکھتی ہو، اس کے احوال

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، صدر الشریعہ نمبر، ص: ۳۶۳، جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ/ اکتوبر، نومبر ۱۹۹۵ء

وکردار میں شریعت جھلکتی ہو تو اس سے بڑا صوفی کوئی نہیں، آپ اسے صوفی کہیں یا نہ کہیں ۔ یہاں نہ بے شریعت طریقت موجود ہے، نہ بے علم زہد۔ اسے شریعت وطریقت کا مجمع البحرین کہہ لیں۔

ان کا عروضی کمال دیکھا جائے تو ان پر بلند پایہ شاعر و عروض داں ہونے کا گمان گزرتا ہے لیکن وہ عروض داں ہیں، شاعر نہیں۔ہاں! شعر فہمی کا ایسا ملکہ ہے جو محققین شعروادب کو انگشت بدنداں کردے۔اس سلسلے میں حضرت کی علمی و تحقیقی تصنیف "امام احمد رضا اور تصوف" کا مطالعہ کافی ہوگا، بطور خاص امام احمد رضا قادری کے اس کلام کے دو اشعار کی تشریح، جس کی ردیف "یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں" ہے۔ ممکن، واجب، امکاں، خطا، برزخ، سرّ خدا، یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں وغیرہ پر ان کا ڈیڑھ صفحے کا حاشیہ شعر فہمی کی پوری ایک کائنات تشکیل دیتا ہے۔اسی زمرے میں امام احمد رضا قادری کے قصیدہ "اکسیر اعظم" کا اردو ترجمہ بھی رکھا جاسکتا ہے۔اس مجموعے میں شامل مضمون "مولانا آسی غازی پوری کی شاعری کا اعتقادی رنگ" اور "امام احمد رضا کے افتا کی ایک خصوصیت" میں بھی یہ حقیقت مجلا نظر آتی ہے۔علم عروض وقوافی میں ان کی مہارت کا ثبوت "معین العروض" جیسی اہم کتاب ہے جو ایک زمانے سے درس نظامی کا حصہ ہے۔

ان کی ترجمہ نگاری بھی عجب شان وامتیاز رکھتی ہے۔ عربی وفارسی سے اردو ترجمہ دیکھیں تو ان پر اصل کا گمان گزرتا ہے، مثال میں فتاویٰ رضویہ، جلد اول [باب التیمم تا آخر] کی فارسی وعربی عبارتوں کا شاندار ترجمہ پیش کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح امام احمد رضا قادری کے فارسی قصیدے "اکسیر اعظم" اور اس کی فارسی شرح "مجیر معظم" کا اردو ترجمہ ایک شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ جد الممتار پر عربی مقدمے کا اردو ترجمہ بھی اسی امتیاز کو نمایاں کرتا ہے۔یوں ہی اردو تحریر وفتاویٰ کا عربی ترجمہ بھی مستقل تحریر کو اُجالتا ہے، اس کی بھی مثالیں جد الممتار جلد اول ودوم میں مل جائیں گی، بطور خاص جلد دوم میں امام احمد رضا قادری کے دو مستقل رسالے "عُباب الأنوار أن لا نكاح بمجرد الإقرار" اور "هبة النسافى تحقق المصاهرة بالزنا" کا عربی ترجمہ۔

ان تراجم میں سلاست وبرجستگی بھی ہے اور شانِ ایجاز بھی، حسنِ ادب بھی ہے اور جمالِ بلاغت بھی، شگفتگی بھی ہے اور معنویت بھی، بیان کی شوکت بھی ہے اور اسلوب واظہار کی ندرت بھی۔ یہ تحریریں بالکل سپاٹ ہیں نہ دقیق و فلسفیانہ۔ان میں دور از کار تعبیرات ہیں، نہ غیر منطقی نتیجے۔بلکہ ایک ایسا لطیف رنگ وآہنگ کہ زبان کو بھی بھلا معلوم ہو اور دل کو بھی چھو جائے۔یہاں جو کچھ ہے نتیجہ خیزی کی خوبی سے مالا مال ہے ۔ ژولیدہ بیانی اور الجھاؤ تو نام کا بھی نہیں۔ہاں! ان لوگوں کو یہ سب کچھ نظر آسکتا ہے جو اخبار کی اردو بھی نہیں سمجھ پاتے۔ اگر انھیں یہ خوبیاں نظر نہ آئیں تو وہ خود کو معذور سمجھیں۔

زبان وبیان اور تحقیق وتدقیق کی وہ تمام تر عظمتیں جو ایک عالم ومحقق میں ہونی چاہیے وہ یہاں بدرجۂ اتم

موجود ہیں ۔ یہ کمالات ان کی علمی وتحقیقی تصانیف اور مضامین دونوں میں نظر آتے ہیں۔ ہر جگہ ایک علمی زبان ہے جو ادب وفن کے زیور سے آراستہ ہے اور اسلوب کا وہی سنجیدہ، سبک خرام اور متین رنگ ہے جو ان کی نگارشات کو دوسروں کی تحریروں سے ممتاز کرتا ہے ۔ یہ رنگ تراجم میں بھی تبدیل نہیں ہوتا۔ ایک صاحب اسلوب قلم کار ومصنف کی یہی شناخت ہوتی ہے اور اس کا کمال بھی مانی جاتی ہے۔ دوسری اہم بات جو ان کی تمام تحریروں کے بین السطور سے منکشف ہوتی ہے وہ "ادب برائے زندگی" ہے۔یعنی ہر تحریر ایک خاص مقصد لے کر منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ حشو وزوائد سے پاک ہے۔

حضرت مصباحی صاحب قبلہ نے صرف اپنا ہی علمی وتحقیقی جہان آباد نہیں کیا، بلکہ اپنے باذوق تلامذہ وارباب قلم کی ایک ٹیم تیار کردی ہے جو ہند وبیرون ہند میں موجود ہیں۔انھیں متعدد پلیٹ فارم بھی دیے ہیں تاکہ علمی وتصنیفی کاز میں انھیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اگر مثال میں صرف المجمع الاسلامی، مبارک پور اور مجلس برکات جامعہ اشرفیہ کا نام پیش کیا جائے اور ان دونوں علمی وطباعتی اداروں سے متعلق مصباحی صاحب کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو دنیا کو حیرت ہوگی کہ کیا ایک شخص اتنا سب کچھ کرسکتا ہے؟

المجمع الاسلامی اور مجلس برکات کی تقریباً اکثر کتب وحواشی حضرت ہی کی نشان دہی، تحریک، تحقیق ونظر ثانی کے ساتھ طبع ہوئی ہیں۔ چند کتابیں اپنے احباب سے لکھوائی ہیں اور اکثر ان کے تلامذہ کی محنتوں کا ثمرہ ہیں۔ یہ کتابیں عربی، اردو، فارسی تینوں زبان میں ہیں۔بلکہ طلبۂ جامعہ اشرفیہ نے عربی واردو کی جو قدیم ونایاب کتب ورسائل جدید ترتیب وتحقیق کے ساتھ طبع کرائے ہیں ان سب میں حضرت کے مشوروں اور محنتوں کا رنگ شامل ہے۔

باب رضویات میں انھیں اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ کا قول گزرا: "ہندوستان میں رضویات کا ان جیسا کوئی واقف کار نہیں۔ " جد الممتار کی تحقیق وتدوین، امام احمد رضا کے کئی رسائل کی ترتیب وتحقیق وتحشیہ وترجمہ، "امام احمد رضا اور تصوف"، "امام احمد رضا کی فقہی بصیرت" جیسی گراں قدر استنادی کتابیں اور "فتاویٰ رضویہ: جہان علوم ومعارف" تین جلدوں کی ترتیب وتقدیم ایک تاریخی کام ہے جسے آپ نے انجام دیا ہے۔

جامعہ اشرفیہ میں آپ پہلے استاذ، پھر شیخ الجامعہ رہے، اب ناظم تعلیمات ہیں۔اور خالصاً لوجہ اللہ تفسیر مدارک وتفسیر بیضاوی کا درس بھی دیتے ہیں۔اسی طرح مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ کے سابق ناظم اور موجودہ صدر ہیں۔ فقہی سیمیناروں کے اکثر فیصلے حضرت ہی نے تحریر کیے ہیں۔

حضرت مصباحی صاحب دام ظلہ العالی کے علمی کمالات پر ہم نے انتہائی اجمال سے گفتگو کی ہے، ان شاء اللہ ان کا بسیط ومفصل جائزہ ایک مستقل تحقیقی مقالے میں لیا جائے گا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں کئی اہم بنیادی

موضوعات کو مالا مال کیا ہے۔ کچھ کا تذکرہ ماقبل کی سطور میں اجمالاً گزرا۔ بعض کا اندازہ اس مجموعۂ مقالات میں شامل ابواب کی سرخیوں سے ہوجائے گا۔

"تحریر و قلم" سے آپ کا رشتہ دورِ طالب علمی سے اب تک قائم ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں سے متعلق راقم الحروف کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ راقم کی دسترس میں نہیں۔ اس "مجموعۂ مقالات" کا سب سے قدیم مضمون "شیخ عزالدین بن عبدالسلام" ہے جو ماہ نامہ اشرفیہ، فروری ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک قدیم مضمون "امام احمد رضا کے افتا کی ایک خصوصیت" ماہ نامہ پاسبان الہ آباد، جولائی ۱۹۷۹ء میں شامل تھا، لیکن تلاش بسیار کے باوجود وہ نہ مل سکا۔ [اب یہ مضمون محب گرامی مولانا محمد ازہر الاسلام ازہری استاذ جامعہ اشرفیہ کی کوششوں اور مولانا جابر حسین مصباحی استاذ جامع اشرف، کچھوچھا شریف کی توجہ سے مختار اشرف لائبریری میں مل چکا ہے۔ ان حضرات کا بے حد شکریہ۔] بقیہ مختصر و طویل مضامین و مقالات، تبصرے اور مقدمے اس کتاب کی زینت ہیں۔

اِن جواہر پاروں کی جمع آوری کا ایک دھندلا خیال اس وقت آیا جب امام احمد رضا قادری کا فارسی قصیدہ اکسیر اعظم اور اس کی فارسی شرح کا اردو ترجمہ "تابِ منظم" کے نام سے رضا اکیڈمی، ممبئی نے دسمبر ۲۰۱۲ء میں شائع کیا تو راقم سطور نے اس کتاب پر ایک مختصر تعارفی اداریہ لکھا۔ پھر مارچ ۲۰۱۹ء کے آخری عشرے میں یہ خیال "عزم" میں بدل گیا۔ سب سے پہلے کرم فرما حضرت مولانا اختر حسین فیضی، استاذ جامعہ اشرفیہ کے سامنے یہ ارادہ ظاہر کیا، پھر حضرت مصباحی صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنا مدعا بیان کیا، حضرت نے بخوشی اجازت عطا فرمائی جس میں دعا کا رنگ بھی شامل تھا۔ کچھ مضامین پہلے سے راقم کی تحویل میں تھے، بقیہ کی تلاش کا کام شروع ہوا، جو اہل سنت کی آواز [مارہرہ مطہرہ]، ماہ نامہ اشرفیہ [مبارک پور]، استقامت [کان پور]، حجاز جدید [دہلی]، کنز الایمان [دہلی]، یادگار ایوبی [کشی نگر] وغیرہ مجلات میں ملے، اسی طرح اُن کتابوں کو تلاش کیا جن پر حضرت نے مقدمہ، تقریظ یا تاثر تحریر فرمایا ہے۔ چند ایک تبصرے بھی ملے، انٹرویو بھی دستیاب ہوا۔ زیادہ تر کتابیں فیضی صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود تھیں، تلاش میں ان کی رہنمائی بھی شامل رہی، راقم ان کا بے حد شکر گزار ہے۔ المجمع الاسلامی کی لائبریری، جامعہ اشرفیہ کی امام احمد رضا لائبریری اور ماہ نامہ اشرفیہ کے آفس میں موجود قدیم رسائل سے بھی استفادہ کیا۔ مکتوبات تو بہت ہیں مگر سب کی دست یابی بہت دشوار ہے، چند مکتوبات جو تھوڑی کاوش سے مل گئے، وہ شائع کیے جا رہے ہیں، اگر زیادہ مقدار میں دست یابی ہو گئی تو الگ کتابی شکل میں اشاعت ہو سکتی ہے۔ تقریباً تمام تحریروں کا ماخذ بھی حاشیہ میں دے دیا گیا ہے۔ اِس راہ میں جن اساتذہ و احباب نے بھی کسی طرح کا تعاون پیش کیا ہے راقم ان سب کا شکر گزار ہے۔ بطور خاص محب گرامی ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی، مالیگاؤں کا، جن کا علمی تعاون مسلسل ملتا رہتا ہے۔ یہ نگارشات آٹھ ابواب میں تقسیم کی گئی ہیں:

باب اول: علمی و تحقیقی مضامین۔
باب دوم: فکری و اصلاحی مضامین۔
باب سوم: سوانحی مضامین۔
باب چہارم: تاثراتی مضامین۔
باب پنجم: تبصرہ اور مکالمہ۔
باب ششم: مقدمے اور تقاریظ۔
باب ہفتم: فقہی مقالات کے خلاصے۔
باب ہشتم: مکتوبات۔

کتاب کی کمپوزنگ حافظ محمد زاہد اختر مصباحی، محلہ عزیز نگر مبارک پور نے کی ہے، راقم ان کا ممنون ہے۔ کچھ کمپوز شدہ تحریریں محب گرامی مفتی محمد ناصر حسین مصباحی نے عنایت کیں، ان کا بھی شکریہ۔ اصل سے مقابلے کا کام اساتذۂ اشرفیہ میں مولانا محمد رئیس اختر مصباحی، مولانا شہروز عالم مصباحی، مولانا اظہار النبی حسینی، مولانا محمد ذیشان یوسف مصباحی، مولانا محمد ذیشان مصباحی اور مولانا محمد آصف رضا برکاتی نے مشترکہ طور پر کیا ہے۔ ایک پروف راقم نے پڑھا۔ آخری بار خود حضرت مصباحی صاحب قبلہ نے تمام نگارشات دیکھیں اور بہت کچھ اصلاحات کیں۔ اس پیرانہ سالی میں یہ کرم فرمائی قابل صد ستائش اور لائق تقلید ہے۔ کثر اللہ أمثالھم۔ حضرت کی عنایتوں اور شفقتوں کا بیحد شکریہ۔ مزید اطمینان کے لیے محب گرامی مفتی محمد شاہد رضا مصباحی، مفتی محمد امام الدین مصباحی، مفتی شمیم اختر مصباحی، اور مولانا محمد جمال الدین مصباحی (اساتذۂ مرکزی دار القراءت جمشید پور) نے اصل سے مقابلہ کیا۔ راقم کی گزارش پر محب گرامی مفتی محمد رئیس اختر مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ نے ایک جامع سوانحی مضمون لکھ کر عنایت کیا، ہم ان کے ممنون ہیں۔ اب علم و ادب، فکر و فن، زبان و بیان، تحقیق و تنقید اور منفرد اسلوب نگارش کی یہ کہکشاں اہل ذوق کی نذر ہے۔ یہ جواہر پارے یقیناً اس لائق ہیں کہ انھیں حرز جاں بنایا جائے اور علم و ادب کے ساتھ یقین و عمل کی دولت سمیٹی جائے۔ ترتیب و تدوین میں جو کمیاں راہ پا گئی ہیں وہ راقم کی کم مائیگی اور بے بصیرتی ہے۔ اور ان تحریروں میں جو کمال ہے وہ حضرت استاذ جلیل پر اللہ و رسول کا فضل و احسان ہے۔ اللہ قبول فرمائے، آمین۔

توفیق احسنؔ برکاتی

[استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی]

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ مطابق ۵ جنوری ۲۰۲۰ء، یک شنبہ

علامہ محمد احمد مصباحی - احوال و آثار

مفتی محمد رئیس اختر مصباحی، بارہ بنکوی

نام و نسب:

آپ کا اسم گرامی محمد احمد، والد ماجد کا نام محمد صابر اور دادا کا نام عبد الکریم ہے، سلسلۂ نسب کچھ اس طرح ہے:
محمد احمد بن محمد صابر بن عبد الکریم بن محمد اسحٰق بن جمن خلیفہ۔
صدر العلماء، عمدۃ المحققین اور خیر الاذکیاء آپ کے معروف و مشہور القاب ہیں، جامعہ اشرفیہ سے فراغت کے بعد آپ کے نام کے ساتھ "مصباحی" کی نسبت کا اضافہ ہو گیا اور یہ نسبت ایسی مشہور ہوئی کہ جب ہندوستان میں اہل علم کے درمیان "مصباحی صاحب" کہا جاتا ہے تو آپ ہی کی ذات مراد ہوتی ہے، گویا آپ اس کلّی کے فرد کامل ہیں۔

جد امجد:

جد امجد "جمن خلیفہ" انتہائی نیک، دین دار، متقی، پرہیزگار، فیاض طبیعت اور بہادر شخص تھے، شمشیر زنی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، انھوں نے اپنے خرچ سے اپنے گاؤں بھیرہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

والد ماجد:

والد ماجد "محمد صابر اشرفی" کی ولادت ایک اندازے کے مطابق ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ایک خدا ترس اور دین دار گھرانے میں ہوئی، اس لیے شروع ہی سے اسلام و سنیت کے معاملے میں بہت پختہ، صوم و صلات اور وظائف کے انتہائی پابند، مسلک اہل سنت کی نشر و اشاعت اور باطل فرقوں کے رد و ابطال میں پیش پیش رہتے تھے۔
۵؍ جمادی الآخرہ ۱۳۴۵ھ بروز پنج شنبہ حضرت سید شاہ اشرف حسین اشرفی علیہ الرحمہ سے سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ میں بیعت ہوئے، اسی نسبت سے ان کے نام کے ساتھ "اشرفی" لکھا جاتا ہے۔
یہ بزرگوں کے بڑے عقیدت کیش اور ادب شناس تھے، مثبت، تعمیری اور رفاہی کاموں میں کافی دل چسپی رکھتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے احباب اہل سنت کے ساتھ مل کر ۱۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ/۲۸؍ اکتوبر

۱۹۶۱ء بروز جمعہ حافظ ملت علامہ شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان، بانی جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی سرپرستی اور موجودگی میں انجمن اہل سنت قائم کی جو آگے چل کر "انجمن امجدیہ اہل سنت" کے نام سے موسوم ہوئی۔
آج اس انجمن کے زیر اہتمام، مدرسہ عزیزیہ خیر العلوم، مدرستہ البنات العزیزیہ، دار الحفظ والقراءت، رضا مسجد، جامع مسجد قدم رسول، نوری مسجد، قادری مسجد وغیرہ قائم ہیں۔
۵؍ جمادی الآخرہ ۱۴۱۱ھ/۲۳؍ دسمبر ۱۹۹۰ء دوشنبہ کی شب دس بجے وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ، سابق صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ، مبارک پور نے نماز جنازہ پڑھائی۔

والدہ ماجدہ:

والدہ ماجدہ محترمہ تسلیمہ بنت عبد الرشید بن عبد الصمد، محلہ پورہ دیوان، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ میں تقریباً ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئیں، انتہائی نیک، عبادت گزار اور پاکیزہ طبیعت خاتون تھیں۔ ۱۵؍ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ/۱۳؍ نومبر ۱۹۸۱ء بروز جمعہ مبارکہ موضع بھیرہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، آپ کے برادر خُرد مولانا حافظ احمد القادری مصباحی دام ظلہٗ (مقیم حال امریکہ) نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ولادت:

آپ کی ولادت ۱۸؍ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ/۹؍ ستمبر ۱۹۵۲ء بروز سہ شنبہ موضع بھیرہ (Bheera) پوسٹ ولید پور، ضلع اعظم گڑھ (حال ضلع مئو) صوبہ اتر پردیش کے اسی علم دوست اور دین دار گھرانے میں ہوئی۔
موضع "بھیرہ" اعظم گڑھ سے تقریباً پچیس کلو میٹر پورب، مئو شہر سے ستائیس کلو میٹر پچھم اور تحصیل محمد آباد گوہنہ سے تین کلو میٹر اتر پچھم دریائے ٹونس کے کنارے واقع ہے۔

تعلیم و تربیت:

آبائی وطن بھیرہ ہی میں والدین کریمین کے زیر سایہ آپ کی نشو و نما اور تربیت ہوئی، ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ سے حاصل کی، پھر درجۂ سوم تک پرائمری تعلیم مدرسہ اسلامیہ رحیمیہ بھیرہ میں پائی۔
درجۂ سوم کی تعلیم کے بعد ۴؍ ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ/۱۸؍ اپریل ۱۹۶۲ء بروز یک شنبہ مدرسہ اشرفیہ ضیاء العلوم، خیر آباد میں داخلہ لیا اور شعبان ۱۳۸۶ھ/نومبر ۱۹۶۶ء تک تقریباً پانچ سال بڑی محنت، لگن، انہماک اور دل جمعی کے ساتھ ابتدائی فارسی سے شرح جامی تک تعلیم حاصل کی۔
اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لیے ۱۰؍ شوال ۱۳۸۶ھ/۲۲؍ جنوری ۱۹۶۷ء کو دار العلوم اہل سنت اشرفیہ

مصباح العلوم، مبارک پور میں داخلہ لیا اور تقریباً چار سال تک وہاں کی علمی فضا میں رہ کر ماہر فن، اور بافیض اساتذہ کے خوان علم سے خوشہ چینی کی اور ۱۰ر شعبان ۱۳۸۹ھ/ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کی شب علما و مشائخ کے مبارک ہاتھوں دستار فضیلت سے نوازے گئے۔

جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے دستار فضیلت پالینے کے بعد تدریس کے لیے ایک جگہ آئی، اجازت طلبی کے لیے استاذ مکرم حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمۃ کو ایک خط لکھا تو جوابی خط (محررہ: ۱۳۸۹ھ) میں حضرت نے فرمایا:

"محبت نامہ ملا، آپ کی سعادت مندانہ زندگی اور مخلصانہ و محبانہ روش اس منزل پر ہے کہ میرے حاشیۂ خیال میں بھی غلطی اور ناراضی کا کوئی گوشہ اور شوشہ نہیں، میں آپ کا مخلص دعاگو ہوں، مولائے کریم ہمیشہ بہ صحت و سلامتی شاد و آباد رکھے، دین متین کی نمایاں اور ممتاز خدمات انجام دلائے، آمین۔ آپ کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ابھی آپ اشرفیہ کو کچھ وقت اور دیں تو آپ اور زیادہ قیمتی ہو جائیں گے۔"[۱]

استاذ جلیل کے اشارے پر آپ نے تدریس کا ارادہ ترک کر دیا اور والد ماجد کی اجازت سے پھر شوال ۱۳۸۹ھ/ دسمبر ۱۹۶۹ء سے ربیع الآخر ۱۳۹۰ھ/ جون ۱۹۷۰ء تک دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم میں مزید تعلیم حاصل کی، اس طرح آپ حافظ ملت علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق "اور زیادہ قیمتی" اور نہایت قیمتی بن گئے اور دنیا آج آپ کو حافظ ملت علیہ الرحمہ کی کرامت کی شکل میں دیکھ رہی ہے۔

ازدواجی زندگی:

آپ کا عقد محلہ پچھم، بھیرہ، محمد آباد میں جناب محمد عمر مرحوم کی صاحب زادی سے ہوا، جن کے بطن سے ایک لڑکے کی ولادت بھی ہوئی نام شمیم رضا عرف غلام جیلانی رکھا گیا لیکن بچپن ہی میں اس کا انتقال ہو گیا، پھر کچھ ناموافق حالات کے سبب ان سے علاحدگی ہو گئی۔ دوسرا عقد حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی علیہ الرحمہ (م: ۱۴۰۶ھ) کی دختر نیک اختر عارفہ خاتون سے ہوا، لیکن قسمت نے یاوری نہ کی اور وہ داغ مفارقت دے گئیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا محمد فاروق علیہ الرحمہ، حسین پور گھوسی کی صاحب زادی قمر النسا مرحومہ سے عقد ہوا جن کے بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں بقید حیات ہیں جب کہ ایک بچہ فوت ہو چکا ہے۔

(۱) سالمہ خاتون قاسمہ (۲) مولانا عرفان رضا مصباحی (۳) سعیدہ خاتون (۴) مبارک حسین رضوی (۵) مولانا فیضان رضا امجد مصباحی (۶) ام الخیر فاطمہ۔[۲]

---

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، حافظ ملت نمبر، جون تا اگست ۱۹۷۸ء، ص: ۱۹۰

(۲) تذکرۂ علمائے بھیرہ، ولید پور، از مولانا ابوالوفا رضوی، ص: ۱۱۸-۱۱۹، ناشر مصباحی پبلی کیشن، محمد آباد، گوہنہ، ۱۴۳۹ھ/۲۰۱۸ء

شیوخ و اساتذہ:

آپ نے جن ماہرین فن اور جلیل القدر اساتذہ سے مختلف مقامات اور الگ الگ اوقات میں استفادہ کیا اور اپنی علمی تشنگی بجھائی ان کے اسما یہ ہیں: (۱) مولانا محمد عمر خیرآبادی، (۲) مولانا محمد حنیف مصباحی مبارک پوری، (۳) مولانا محمد سلطان رضوی ادروی، (۴) مولانا غلام محمد مصباحی بھیروی، (۵) حافظ و قاری نثار احمد مبارک پوری، (۶) ماسٹر اسرار احمد خان ادروی، (۷) ماسٹر محمد رفیق مبارک پوری۔

(ان حضرات سے آپ نے مدرسہ اشرفیہ ضیاء العلوم، خیرآباد میں تعلیم حاصل کی)

(۸) حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز، محدث مرادآبادی (م: ۱۳۹۶) (۹) حضرت علامہ عبدالرؤوف مصباحی بلیاوی (م: ۱۳۹۱ھ) (۱۰) بحر العلوم حضرت مفتی عبدالمنان اعظمی (م: ۱۴۳۴ھ) (۱۱) مولانا مظفر حسن ظفر ادیبی مبارک پوری (۱۲) حضرت علامہ محمد شفیع اعظمی مبارک پوری (م: ۱۴۱۱ھ) (۱۳) حضرت علامہ سید حامد اشرف مصباحی اشرفی کچھوچھوی (م: ۱۴۲۵ھ) (۱۴) حضرت علامہ قاری محمد یحییٰ مبارک پوری، (م: ۱۴۱۶ھ) (۱۵) حضرت علامہ اسرار احمد مصباحی لہراوی دام ظلّہ۔ (ان حضرات سے آپ نے دارالعلوم اشرفیہ میں اکتساب فیض کیا)

اسناد:

سند تجوید و قراءت، سند فضیلت درس نظامی، ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء (دارالعلوم اہل سنت اشرفیہ مصباح العلوم، مبارک پور) مولوی ۱۹۶۶ء، عالم ۱۹۶۸ء، فاضل دینیات ۱۹۷۵ء، فاضل ادب ۱۹۷۷ء، فاضل طب ۱۹۸۰ء، منشی ۱۹۸۱ء، منشی کامل ۱۹۸۳ء (عربی و فارسی بورڈ الہ آباد، اتر پردیش)

بیعت و خلافت:

حضرت صدر العلماء دام ظلہ العالی جب عمر کے کمال کو پہنچے تو جامع شرائط پیر کا انتخاب فرمایا اور ۲۶ر صفر ۱۳۹۳ھ/ یکم اپریل ۱۹۷۳ء بروز شنبہ رضوی دارالافتا، محلہ سوداگران، بریلی شریف میں مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مصطفیٰ رضا قادری نوری علیہ الرحمہ کے دست اقدس پر سلسلۂ قادریہ برکاتیہ میں بیعت و ارادت سے سرفراز ہوئے، پھر ایک سال بعد ربیع الاول ۱۳۹۴ھ میں حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سے مبارک پور میں سلسلۂ قادریہ، منوریہ، معمریہ میں طالب ہوئے۔ اس سلسلۂ مبارکہ میں حضور حافظ ملت سے حضور غوث اعظم تک صرف چار واسطے ہیں۔

مجاہد ملت علامہ شاہ حبیب الرحمٰن قادری اڑیسوی ۱۳۹۵ھ میں فیض العلوم جمشید پور تشریف لائے اور دلائل الخیرات شریف و جملہ اوراد و وظائف کی سند اجازت سے نوازا۔

امین ملت سید شاہ محمد امین میاں برکاتی دام ظلہ سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف نے ۳۰ر اکتوبر ۲۰۱۰ء عرس قاسمی کے مبارک موقع پر آپ کو سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ کی اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا اور آپ کی عظیم الشان اور بے لوث خدمات دینیہ کے اعتراف میں تکریم نامہ بھی پیش کیا۔

تدریسی خدمات:

تحصیل علم کے بعد سے اب تک آپ نے مختلف مدارس میں بڑی ذمہ داری، محنت، لگن اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ تدریسی فرائض انجام دیے۔ منتہی کتابوں کی مشکل ترین بحثیں طلبہ کے ذہن میں اتار دینا آپ کا نمایاں وصف ہے۔ آپ کی درسی تقریریں مختصر، جامع، بہت واضح اور شستہ ہوتی ہیں۔ جنھیں سمجھنا اور ذہن نشیں رکھنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اب ہم ذیل میں ان مدارس کے نام پیش کر رہے ہیں جہاں آپ نے تدریس کا فریضہ انجام دیا:

(۱) دارالعلوم فیضیہ نظامیہ، باراہاٹ، اِشی پور، ضلع بھاگل پور۔ جمادی الآخرہ ۱۳۹۰ھ/اگست ۱۹۷۰ء سے شوال ۱۳۹۱ھ/نومبر ۱۹۷۱ء تک۔

(۲) مدرسہ فیض العلوم جمشید پور، شوال ۱۳۹۱ھ/دسمبر ۱۹۷۱ء سے شوال ۱۳۹۶ھ/اکتوبر ۱۹۷۶ء تک۔

(۳) دارالعلوم ندائے حق جلال پور، فیض آباد۔ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ/دسمبر ۱۹۷۶ء سے شوال ۱۳۹۸ھ/۱۷ر ستمبر ۱۹۷۸ء تک۔

(۴) مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ، ضلع اعظم گڑھ (حال ضلع مئو) شوال ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء سے ۸ر شوال ۱۴۰۶ھ/۱۶ر جون ۱۹۸۶ء تک۔

(۵) دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور، اعظم گڑھ۔ ۹ر شوال ۱۴۰۶ھ/۱۷ر جون ۱۹۸۶ء سے تاحال۔

واضح رہے کہ ۳۰ر جون ۲۰۱۴ء کو حکومتی مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد سے آپ جامعہ اشرفیہ ہی میں بلا معاوضہ اعزازی طور پر تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

تلامذہ:

آپ کے خوان علم و فضل سے خوشہ چینی کرنے والے اہل علم کی تعداد ہزاروں میں ہے جن میں مسند نشینانِ درس و تدریس، رئیسانِ تحریر و قلم، ماہرینِ تنظیم و ادارہ سازی، خطیبانِ اثر آفریں، مصلحان قوم و ملت، مفتیانِ نکتہ رس، صوفیانِ تقوی شعار اور مختلف خوبیوں کے حامل افراد شامل ہیں جنھوں نے ہر میدان میں اپنی بیش بہا خدمات کا سکہ بٹھادیا۔ ہم ذیل میں آپ کے چند ممتاز تلامذہ کے اسما پیش کرتے ہیں:

حضرت مولانا عبد الحق رضوی، -حضرت مفتی بدر عالم مصباحی، -حضرت مولانا مسعود احمد برکاتی، -حضرت مولانا مبارک حسین مصباحی، -حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی، -حضرت مولانا محمد صدر الوریٰ قادری مصباحی، -حضرت مولانا اختر کمال قادری، -حضرت مفتی محمد نسیم مصباحی، -حضرت مولانا محمد ناظم علی مصباحی، -حضرت مفتی زاہد علی سلامی، -حضرت مولانا اختر حسین فیضی، -حضرت مولانا ساجد علی مصباحی، -حضرت مولانا حسیب اختر مصباحی، -حضرت مولانا دستگیر عالم مصباحی، -حضرت مولانا محمد عرفان عالم مصباحی، -حضرت مفتی محمود علی مشاہدی، -حضرت مولانا رفیع القدر مصباحی، -حضرت مولانا محمد ہارون مصباحی، -حضرت مولانا محمد اشرف مصباحی، -حضرت مفتی محمد ناصر حسین مصباحی، -حضرت مولانا ارشاد احمد مصباحی، -حضرت مفتی محمد توفیق احسنؔ برکاتی مصباحی، -حضرت مولانا محمد قاسم مصباحی ادروی، -حضرت مولانا عبد اللہ مصباحی ازہری، -حضرت مولانا حبیب اللہ مصباحی ازہری، -حضرت مولانا ازہر الاسلام مصباحی ازہری، -حضرت مولانا محمد اسلم مصباحی، -محمد رئیس اختر مصباحی (راقم الحروف) (اساتذۂ جامعہ اشرفیہ)

حضرت مولانا محمد نصر اللہ رضوی علیہ الرحمہ، -حضرت مفتی ایاز احمد مصباحی مرحوم پونہ، -حضرت مولانا عارف اللہ فیضی مصباحی، استاذ مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ، مئو، -حضرت مولانا عبد الغفار اعظمی مصباحی استاذ مدرسہ اشرفیہ ضیاء العلوم خیر آباد، -حضرت مفتی احمد القادری، امریکہ، -حضرت قاضی شہید عالم رضوی، استاذ جامعہ نوریہ، بریلی شریف، -حضرت مفتی آل مصطفیٰ مصباحی، استاذ جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی، مئو، -حضرت مفتی شمشاد احمد مصباحی، استاذ جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی، -حضرت مولانا صغیر اختر مصباحی، استاذ جامعہ نوریہ، بریلی شریف، -حضرت مولانا محمد عاقل مصباحی، صدر المدرسین جامعہ منظر اسلام بریلی شریف، -حضرت مولانا نظام الدین مصباحی، گجراتی، برطانیہ، -حضرت مولانا محمد یونس مصباحی، گجراتی، برطانیہ، -حضرت مفتی عالم گیر مصباحی، جامعہ اسحاقیہ جودھ پور، -حضرت مولانا شمس الحق مصباحی، جنوبی افریقہ، -حضرت مولانا قاضی فضل احمد مصباحی، بنارس، -حضرت مفتی محمد جمال اشرف مصباحی، جامعہ عربیہ اظہار العلوم، جہاں گیر گنج، -حضرت مفتی ارشاد احمد مصباحی، سہسرامی، -حضرت ڈاکٹر سجاد عالم مصباحی، کولکاتا، -حضرت مولانا ڈاکٹر افضل مصباحی، بنارس ہندو یونیورسٹی، -حضرت مفتی محمد صادق مصباحی، استاذ مدرسہ سعید العلوم، لچھمی پور، مہراج گنج، -حضرت مفتی محمد سلیم مصباحی، دارالعلوم منظر اسلام، بریلی شریف، -حضرت مفتی محمد عابد حسین مصباحی، قاضی جھارکھنڈ، -حضرت مولانا صلاح الدین مصباحی، جمشید پور، -حضرت مفتی انور نظامی مصباحی، نائب قاضی جھارکھنڈ، -حضرت مفتی محمد زبیر برکاتی مصباحی، ممبئی، -حضرت مفتی مبشر رضا ازہر مصباحی، بھیونڈی، -حضرت مفتی ضیاء المصطفیٰ مصباحی، جمشید پور، -حضرت مفتی محمد کمال الدین اشرفی

مصباحی، رائے بریلی،۔ حضرت مفتی نثار احمد مصباحی، سنت کبیر نگر،۔ حضرت مفتی جہاں گیر مصباحی ازہری، ناگ پور مہاراشٹر،۔ حضرت مولانا نور الحسن نعیمی مصباحی پچپڑوا، بلرام پور،۔ حضرت مولانا محمد رضوان مصباحی بارہ بنکوی،۔ حضرت مفتی محمد شمشاد مصباحی شہزاد پور،۔ حضرت مفتی عابد رضا مصباحی، پونہ،۔ حضرت مفتی شاہد رضا مصباحی، مرکزی دار القراءت جمشید پور جھارکھنڈ،۔ حضرت مولانا محمد حبیب مصباحی، استاذ مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن لکھنؤ،۔ حضرت مولانا فہیم مصباحی، استاذ مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن لکھنؤ،۔ حضرت مولانا خالد ایوب مصباحی،۔ حضرت مولانا سید اکرام الحق مصباحی صدر المدرسین دار العلوم محبوب سبحانی کرلا ممبئی،۔ حضرت مولانا محمود احمد مصباحی مبارک پور،۔ حضرت مولانا سلطان احمد مصباحی ہالینڈ۔ وغیرہ

طریقۂ تدریس:

تدریسی میدان میں بھی آپ نے اپنے استاذ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کو آئڈیل بنایا، حافظ ملت ہی کی طرح آپ کی درسی تقریر حسن ایجاز اور کمال تفہیم دونوں کی جامع ہوتی ہے، تفہیم کا انداز نہایت جنچا تلا، سنجیدہ، روح عبارت اور شرح کو سمیٹے ہوئے ہوتا، بعض مقامات پر جہاں ضرورت ہوتی ہے خصوصی بسط و تفصیل سے کام لیتے ہیں، آپ کا اطناب ہو یا ایجاز، بہت جاندار اور باریک تحقیقات کا حامل ہوتا ہے۔ جس فن کی کتاب کا درس دیتے ہیں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اسی فن کے ماہر ہیں، کتاب کا درس دینے سے پہلے عبارت خوانی ضرور کراتے ہیں اور ساتھ ہی حسنِ تلفظ اور ادائیگی مخارج پر بھی خاص توجہ فرماتے ہیں۔

آپ ہمیشہ اپنے استاذ جلیل کی ان نصیحتوں پر عمل پیرا رہتے ہیں:

(۱) علم دین کی تعلیم خالصاً لوجہ اللہ ہو اور جو ملے اسے انعام سمجھنا چاہیے (۲) تدریس کے لیے مدرس اسباق کی پوری تیاری کرے اور طلبہ کو مطالب بخوبی ذہن نشین کرانے کی کوشش کرے (۳) طلبہ کے اندر علمی لیاقت اور دینی و عملی حرکت لانا مقصود ہو، نہ یہ کہ کسی طرح ڈیوٹی سے سبک دوشی ہو (۴) طلبہ میں دینی، علمی، عملی لسانی و قلمی صلاحیتیں پیدا کرنے کی تدابیر عمل میں لانا اور انھیں آئندہ میدان عمل کے قابل بنانا۔

قلمی خدمات:

خداوند قدوس نے حضرت صدر العلماء دام ظلہ کو تصنیف و تالیف کا زبردست شعور اور ملکہ عطا فرمایا ہے، قرطاس و قلم کا شغف عہد طالب علمی ہی سے تھا، مختلف دینی و علمی موضوعات کو آپ نے عنوان قلم بنایا، جس موضوع پر لکھا اس کا حق ادا کر دیا، جس وادی کا رخ کیا اسے اپنے سحاب قلم سے سیراب کیا، آپ کی ہر تصنیف میں تحقیق و

تدقیق کا دریا موجزن ہے، آپ کے قلم حق رقم سے نکلی ہوئی روشنائی نے حکمت و معرفت اور صداقت و حقانیت کے گلہائے رنگ رنگ کھلائے۔ مختلف موضوعات پر آپ کی کتابیں علمی حلقوں میں مقبول اور صاحبان علم و فضل سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

آپ صرف ایک بہترین مصنف اور قلم کار ہی نہیں بلکہ مصنف گر بھی ہیں، اپنے تلامذہ اور متعلقین کو لکھنے کا ہنر بھی سکھاتے ہیں، مجلس برکات اور المجمع الاسلامی سے شائع ہونے والی تقریباً تمام اہم علمی و تحقیقی کتابوں پر نظر ثانی و اصلاح فرماتے ہیں جس کے باعث خود لکھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے اور نظر ثانی اور اصلاح کا کوئی اعلان بھی نہیں ہوتا، ہاں خود مصنفین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اگر نام کا ذکر کر دیا تو معلوم ہو گیا اور حضرت کا یہ کام بلا امید تشکر و بے شوق نمائش برابر جاری ہے۔ کثرت مصروفیات کے باوجود مختلف انداز سے قلمی خدمات انجام دے رہے ہیں، آپ کی علمی خدمات کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کتب و رسائل کی تصنیف: جیسے (۱) حدوث الفتن وجهاد أعيان السنن، (۲) مواهب الجليل لتجلية مدارك التنزيل، (۳) تدوین قرآن، (۴) معین العروض والقوافی، (۵) امام احمد رضا اور تصوف، (۶) تنقید معجزات کا علمی محاسبہ، (۷) شادی اور آداب زندگی، (۸) امام احمد رضا کی فقہی بصیرت جد الممتار کے آئینہ میں، (۹) رسم قرانی اور اصول کتابت، (۱۰) بیان واحد و جمع، (۱۱) رہ نمائے علم و عمل، (۱۲) شرک کیا ہے؟، (۱۳) نوائے دل، (۱۴) خلفائے راشدین اور اسلامی نظامِ اخلاق، وغیرہ۔

(۲) کسی کتاب یا رسالے کا عربی یا فارسی سے اردو یا اردو سے عربی میں ترجمہ جیسے (۱) عباب الأنوار أن لا نكاح بمجرّد الإقرار (اردو سے عربی)، (۲) هبة النساء في تحقق المصاهرة بالزنا (اردو سے عربی)، (۳) فتاوی رضویہ جلد اول، سوم، چہارم، نہم کی عربی و فارسی عبارات کا اردو ترجمہ۔ (۴) امام احمد رضا قادری کا فارسی قصیدہ اکسیر اعظم اور اس کی فارسی شرح مجیر معظم کا اردو ترجمہ "تاب منظم"۔ وغیرہ

(۳) کسی بڑے عالم کی کتاب کی تحقیق، تحشیہ، تلخیص اور ترتیب جدید جیسے: (۱) جد الممتار على رد المحتار، (۲) حاجز البحرين الواق عن جمع الصلاتين، (۳) الكشف شافيا حكم فونو جرافيا، (٤) وشاح الجيد فى تحليل معانقة العيد، (٥) مقامع الحديد على خد المنطق الجديد، (٦) تنزيه المكانة الحيدرية عن وصمة عهد الجاهلية، (۷) قصيدتان رائعتان (رسائل امام احمد رضا)

(۴) معاصرین یا اکابر علما و مشائخ کی پچاس سے زائد کتابوں پر تقدیم و تقریب و تقریظ، جیسے: امام احمد رضا اور رد بدعات منکرات۔ از مولانا یٰسین اختر مصباحی دار القلم دہلی۔ اسلام اور امن عالم، بزم اولیا، سنت کی آئینی حیثیت۔ از:

مولانا بدر القادری مصباحی، اسلامک اکیڈمی، دی ہیگ، ہالینڈ، انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ نظر ثانی و اضافہ رد براہین قاطعہ۔ از: عالم ربانی حضرت مولانا عبد السمیع بے دل سہارن پوری (م: ۱۳۱۸ھ)، نصر المقلدین فی جواب "الظفر المبین" از: علامہ حافظ و قاری سید شاہ احمد علی بٹالوی علیہ الرحمہ (م: ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء)، انتصار الحق فی إکساد أباطیل معیار الحق۔ از: حضرت علامہ مفتی محمد ارشاد حسین فاروقی مجددی رام پوری علیہ الرحمہ (م: ۱۳۱۱ھ)، الصوارم الهندیہ۔ از: مناظر اہل سنت علامہ حشمت علی خان قادری علیہ الرحمہ، حیات حافظ ملت۔ از: علامہ بدر القادری اسلامک اکیڈمی، ہالینڈ وغیرہ۔

(۵) مجلس برکات جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے شائع ہونے والی بیش تر کتابوں کی اصلاح و نظر ثانی: جیسے:
(۱)نورالایضاح مع حاشیہ ضوء المصباح، (۲)شرح نزهة النظر مع نخبة الفكر، (۳) امداد اللبیب لافهام التهذیب، (۴)منهاج العابدین، (۵)سراجی، (۶)الحواشی الجلیة فی تائید مذهب الحنفیه، (۷)میزان المتربي لدیوان المتنبي، (۸)مصباح الانشاء، (اول، دوم، سوم) (۹)کافیة النحو، (۱۰)المدیح النبوي (اردو ترجمہ) (۱۱)مقامات حریری (عربی حاشیہ و اردو ترجمہ) (۱۲)قواعد الصرف (اول، دوم) (۱۳)قواعد املا و انشا، (۱۴)سیرت خلفائے راشدین، (۱۵)تواریخ حبیب الہ، (۱۶)قواعد النحو، (۱۷)دراسة الصرف، (۱۸)حاشیہ مرقات، (۱۹)حاشیہ میزان و منشعب، (۲۰)حاشیہ المدیح النبوی۔

جامعہ اشرفیہ کے صدر المدرسین اور ناظم تعلیمات:

آپ ۹ر شوال ۱۴۰۶ھ/۱۷ر جون ۱۹۸۶ء میں جامعہ اشرفیہ ایک مدرس کی حیثیت سے تشریف لائے اور بڑی ذمے داری کے ساتھ تدریسی فرائض انجام دیے۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ/اگست ۲۰۰۱ء سے یکم رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ/۳۰ر جون ۲۰۱۴ء تک بحیثیت صدر المدرسین خدمات انجام دیں۔

دور صدارت جامعہ اشرفیہ کا سنہری دور مانا جاتا ہے، اس دور میں آپ نے تعلیم اور نظام امتحان میں گراں قدر اصلاحات فرمائیں، تعلیم و تربیت میں بہتری کے لیے بہت سے مفید اور قابل تقلید اصول و ضوابط وضع فرمائے اور انھیں عملی جامہ پہنایا، علما اور ماہرین تعلیم کی ایک جماعت کے ساتھ پرانے نصاب تعلیم پر نظر ثانی فرمائی اور ایک ایسا نصاب تعلیم مقرر فرمایا جو قدیم و جدید کا حسین سنگم ہے، جس کے نتیجے میں برصغیر میں ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی آپ کی شہرت ہوئی۔

پھر جب حکومتی قانون کے لحاظ سے آپ کی مدت ملازمت ختم ہوگئی تو جامعہ اشرفیہ کے ارباب حل و عقد نے

آپ سے "جامعہ اشرفیہ" کے ناظم تعلیمات کا منصب قبول کرنے کی گزارش کی جسے آپ نے قبول فرمالیا اور اب بھی جامعہ کا تعلیمی معیار بلند کرنے اور نظم و نسق بہتر بنانے کے لیے ہمہ وقت سرگرداں رہتے ہیں، اس کے علاوہ اعزازی طور پر کچھ کتابوں کا درس بھی دیتے ہیں۔

جامعہ اشرفیہ سے والہانہ لگاؤ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامعہ اشرفیہ کی عظمت میں آپ کی قابل افتخار شخصیت سے چار چاند لگ گئے، اس کی تعلیمی ترقی میں آپ کی مخلصانہ اور بے لوث کوششوں کا بڑا اہم رول ہے، جامعہ اشرفیہ سے آپ کو عشق و شیفتگی اور جنون و دیوانگی کی حد تک لگاو ہے۔ شب و روز اس کی ترقی اور اس کا تعلیمی معیار بہتر سے بہتر بنانے کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔

حج و زیارت:

حضرت صدر العلماء دو بار حرمین شریفین کی حاضری سے مشرف ہوئے، ۱۹۹۶ء میں پہلا حج فرمایا پھر ۲۰۱۴ء میں دوبارہ حج و زیارت کے لیے گئے۔

سپاس نامے اور ایوارڈ:

گوناگوں دینی، علمی اور ملی خدمات کے اعتراف میں مختلف اداروں نے آپ کو سپاس نامے اور ایوارڈ پیش کیے، میرے علم کے مطابق ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) **سپاس نامہ**— مدرسہ عالیہ قادریہ مولوی محلہ، بدایوں شریف۔ ۵ر صفر ۱۴۰۹ھ/۱۸ر ستمبر ۱۹۸۸ء بروز یک شنبہ۔
(۲) **سپاس نامہ**— آستانۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ، بموقع عرس قاسمی برکاتی ۱۳ر اکتوبر ۲۰۱۰ء۔
(۳) **سپاس نامہ**— جامعہ صمدیہ پھپھوند شریف، بموقع تحریری و تقریری مسابقہ ۲۱ر ۲۲ر محرم الحرام ۱۴۳۷ھ/ ۴ر ۵ر نومبر ۲۰۱۵ء۔
(۴) **قبلۂ عالم ایوارڈ**— بموقع جشن صد سالہ حضور حافظ بخاری، جامعہ صمدیہ پھپھوند شریف، ضلع اوریا، ۲۴ر فروری ۲۰۰۳ء۔
(۵) **حافظ ملت ایوارڈ**— جامعہ اشرفیہ مبارک پور، بموقع عرس عزیزی یکم جمادی الآخرہ ۱۴۳۹ھ/ ۱۸ر فروری ۲۰۱۸ء شب دو شنبہ۔

تبحر علمی:

آپ جملہ علوم و فنون میں دست گاہ رکھتے ہیں، درسی کتابوں کے علاوہ قرآن، تفسیر، علوم تفسیر، حدیث، اصول

حدیث، فقہ، اصول فقہ، معانی، بیان و بدیع، نحو و صرف، تاریخ و سیرت، ادب و لغت، عروض و قوافی، منطق و فلسفہ، وغیرہ علوم و فنون کی بے شمار کتابوں کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، چوں کہ آپ کی ذات علوم اسلامیہ اور فنون دینیہ کی بحر بے کراں ہے، اسی لیے آپ کی شخصیت ہم عصر علما کے درمیان ممتاز اور نمایاں ہے، مشکل اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے علما اور اساتذہ آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علمی استحضار اور قوت حافظہ:

خلاق کائنات نے آپ کو زبردست قوت حافظہ سے نوازا ہے، جو ایک مرتبہ پڑھ لیتے ہیں ذہن میں نقش ہو جاتا ہے۔ علم اتنا مستحضر ہے کہ جس موضوع پر بھی گفتگو ہوتی ہے اس پر اس طرح سے عبارتیں اور جزئیات پیش کرتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے اور اسی سے بیان فرما رہے ہیں، آپ کو کثیر احادیث، فقہی جزئیات، اردو، عربی اور فارسی کے اشعار ازبر ہیں، یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ آپ کی صحبت بابرکت سے فیض یاب ہونے والا ہر شخص اس کی گواہی دیتا ہے۔

وقت کی پابندی:

حضرت صدر العلماء حفظِ اوقات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے، آپ نے اپنے اوقات مختلف دینی و ملی، علمی و فنی، تحریری و تصنیفی کاموں کے لیے تقسیم کر رکھے ہیں، جن کی ہر موسم میں پابندی فرماتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں، تعطیل کے ایام بھی مطالعۂ کتب، تحریری و تصنیفی امور میں صرف فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا عارف اللہ فیضی مصباحی رقم طراز ہیں:

”حضرت والا اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے وقت کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف تھے، اسی لیے آپ نے اپنا قیمتی زمانہ نہ صرف اپنی نصابی کتابوں کے مطالعے اور ان کے مضامین کو ذہن نشیں کرنے میں گزارا بلکہ نصاب سے باہر کی ان کتابوں کا بھی گہری نظر سے مطالعہ فرمایا جو مستقبل کی زندگی کو کامیاب بنانے میں مددگار ثابت ہوں۔“ (نوے دل: ص: ۸، مصباحی پبلی کیشن، محمد آباد، مئو)

عشق رسول:

حضرت صدر العلماء دام ظلہ سرور کائنات سے والہانہ محبت اور گہرا عشق رکھتے ہیں جن کے جلوے آپ کی

گفتگو، تحریر، نشست و برخاست اور اطاعت و فرماں برداری کی صورت میں جا بہ جا نظر آتے ہیں۔

غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے والہانہ محبت:

یوں تو آپ تمام اکابر اہل سنت، مشائخ طریقت اور اولیاے ربانیین سے عقیدت رکھتے ہیں اور ان کا دل سے احترام کرتے ہیں لیکن غوث اعظم، قطب ربانی حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آپ کو والہانہ محبت اور گہری عقیدت ہے آپ صحیح معنوں میں عاشق غوث اعظم ہیں، آپ کی محفلیں ان کے ذکر سے معمور رہتی ہیں، آپ کا نہاں خانۂ دل سرکار غوثیت کی بابرکت یادوں سے آباد رہتا ہے، یہ غوث اعظم سے آپ کی عقیدت ہی ہے کہ ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو ان کے نام کی فاتحہ دلاتے ہیں۔

تقویٰ و پرہیز گاری:

آپ کی پوری زندگی تقویٰ و پرہیز گاری، شریعت مصطفیٰ اور سنت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کی پابندی سے آراستہ و پیراستہ ہے، آپ قرآن و حدیث صرف پڑھاتے ہی نہیں بلکہ کتاب و سنت کی شعاعیں آپ کے کردار و عمل سے پھوٹتی نظر آتی ہیں، سنن و مستحبات اور اوراد و وظائف کے پابند ہیں، آپ کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ملنا جلنا سب شریعت مصطفوی کی روشنی میں ہوتا ہے، یقیناً آپ شریعت کی پابندی اور پرہیز گاری میں اپنے استاذ مکرم حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے جلووں سے مستنیر ہیں۔

تواضع و انکسار:

حضرت صدر العلما تواضع و انکسار اور امانت و دیانت کے پیکر ہیں، تواضع آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہے، طلبہ پر شفقت، چھوٹوں پر مہربانی اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، معاصرین کی خوبیوں کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں، کبھی ان کی یا کسی کی بھی غیبت سننا پسند نہیں کرتے، نہ کسی کی بے جا تعریف کرتے ہیں اور نہ اپنی قرار واقعی تعریف سننا پسند کرتے ہیں۔

آپ کے زہد و تقویٰ اور بزرگی کی شہادت آپ کے ہم عصر اکابر علما بھی دیتے ہیں، چھبیسویں فقہی سیمینار کے موقع پر رئیس التحریر حضرت علامہ یٰسین اختر مصباحی دام ظلہ نے آپ کے تعلق سے اکابر علماے کرام اور مفتیان عظام کی موجودگی میں فرمایا:

”حضرت مولانا محمد احمد مصباحی سے میرے بچپن کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں، جس کی مدت پچپن سال، یعنی نصف صدی سے زیادہ ہے، اس تعلق سے میں کہتا ہوں کہ اپنے کردار و عمل کے لحاظ سے آج آپ جتنے بزرگ نظر آتے ہیں، پچپن سال پہلے بھی یہ اتنے ہی

بزرگ تھے۔"

اوصاف وکمالات:

دنیا میں ایسے لوگ کم ہی نظر آتے ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلے سے بے پروا ہو کر محض رضاے مولیٰ کی غرض سے خدمت دین متین کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیں۔ اس مادہ پرستی کے دور میں شہرت و نام وری سے دور رہ کر اخلاص، دردمندی، بے نیازی، بے نفسی، بے ریائی، بے لوثی، اخلاق و مروت، حسن اخلاق، علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری، روحانیت، خشیت الٰہی اور اصابت رائے سے مرصع کوئی پیکر جمیل مل جائے تو یقیناً وہ انسانی بستی میں خدا کی رحمت سے کم نہیں، استاذ گرامی حضرت صدر العلماء دام ظلہ کی شخصیت بھی انھیں برگزیدہ ہستیوں میں سے ہے، آپ کی زندگی کا گلستاں رنگا رنگ اور متنوع پھولوں سے مزین ہے۔ آپ صرف ایک تبحر عالم اور بلند پایہ مدرس ہی نہیں بلکہ آپ کی ذات میں ایک جہانِ کمالات و محاسن سمویا ہوا ہے۔

آپ کے برادر عزیز مولانا حافظ احمد القادری نے آپ کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"دوران تعلیم مجھے آپ کے اوصاف حمیدہ اور خصائل جمیلہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، خلوص وایثار، جود و کرم، امانت و دیانت، تقویٰ و پرہیزگاری، احساس ذمہ داری، خود اعتمادی و خود داری، عہد و پیمان میں پختگی، حفظ اوقات، جماعت کی پابندی، اوراد و وظائف، اور سنن و نوافل پر استقامت، کاموں میں سرعت، تحریر میں فصاحت، زبان میں بلاغت، تقریر میں اختصار و جامعیت، علوم و فنون میں مہارت، مسائل میں باریک بینی و نکتہ سنجی، معانی میں گہرائی و گیرائی، ظاہر و باطن میں یکسانیت، دین داروں سے محبت، بے دینوں سے نفرت، بدمذہبوں سے اجتناب، بزرگوں کا احترام، اکابر کا ادب، اصاغر پر شفقت، مقدمات کے فیصلے میں دور بینی، ہمت و شجاعت، حق گوئی و بے باکی، رعب و دبدبہ، عالمانہ وقار، نظم و نسق میں کمال، افہام و تفہیم کا ملکہ، بے لوث خدمات کا جذبہ اور اعمال و کردار کے اعلیٰ نمونے جو یہاں دیکھے، کم دیکھنے میں آئے۔"(۱)

قرآن سے محبت:

حضرت صدر العلماء دام ظلہ العالی قرآن کریم سے والہانہ محبت فرماتے ہیں، جس کے جلوے جگہ جگہ آپ کی زندگی میں نظر آتے ہیں، قرآن سے آپ کی شیفتگی کا عالم یہ ہے کہ کیسی بھی مصروفیت ہو، کیسا بھی انہماک ہو، پابندی کے ساتھ روزانہ تلاوت فرماتے ہیں اور اس سے متعلق علوم سے بھی گہری دل چسپی رکھتے ہیں، ایک زمانے سے طلبہ

(۱) حالات صدر العلماء، غیر مطبوعہ، ص:۱۹

کو تفسیر مدارک اور تفسیر بیضاوی کا درس دے رہے ہیں، نیز مدارک التنزیل پر "مواهب الجليل لتجلية مدارك التنزيل" کے نام سے عربی زبان میں ایک شان دار، عالمانہ اور محققانہ حاشیہ بھی رقم فرمایا ہے جو مجلس برکات سے شائع ہو کر اہل علم سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے، تدوین قرآن اور رسم قرآنی اور اصول کتابت جیسی کتابوں کی تصنیف بھی قرآن کریم سے آپ کی گہری وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ارباب علم و دانش کی نظر میں:

حضرت صدر العلماء علم و ادب، شعور و آگہی، فکر و تدبر اور اعلیٰ دماغی میں اپنی مثال آپ ہیں، اس حقیقت کا اندازہ اکابر اہل سنت و ارباب دانش کے درج ذیل تاثرات سے ہوتا ہے۔

فقیہ اعظم ہند، شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"قدرت نے انھیں ذہانت و فطانت اور قوت حفظ کے ساتھ مطالعے کا ذوق و شوق بہت زیادہ عطا فرمایا، حفظ اوقات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیتے، ہر وقت مصروف، یہی وجہ ہے کہ جملہ علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ علم ادب میں اقران پر فائق ہیں، جہاں تک میری معلومات ہے ہندوستان میں رضویات کا ان جیسا کوئی واقف کار نہیں، ان سب پر مستزاد یہ کہ انتہائی متواضع، منکسر مزاج، قناعت پسند زاہد صفت بزرگ ہیں، شریعت کے پابند، شبہات تک سے بچنے والے، تقویٰ شعار فرد، صاحب تصانیف دانش ور ... میں خود جن چند علما سے متاثر ہوں، ان میں آپ کی شخصیت نمایاں ہے۔"(۱)

علامہ سردار احمد لائل پوری محدث اعظم پاکستان کے تلمیذ اور داماد حضرت مفتی عبد القیوم ہزاروی علیہما الرحمہ کے تاثرات ص:۵، ۴ پر آچکے ہیں، انھیں وہیں ملاحظہ کریں۔

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد نقش بندی تحریر فرماتے ہیں:

"وہ (مولانا محمد احمد مصباحی) محقق بھی ہیں، مصنف بھی ہیں، مدرس بھی ہیں، مقرر بھی اور قلم کار بھی ان کی کئی نگارشات منظر عام پر آچکی ہیں جن سے ان کے تبحر علمی، دینی و فقہی بصیرت اور دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے... راقم ان کے خلوص و للہیت، عاجزی و انکساری سے متاثر ہے۔ یہ خوبیاں علما میں عنقا ہوتی جا رہی ہے۔"(۲)

(۱) ابتدائیہ: امام احمد رضا کی فقہی بصیرت جد الممتار کے آئینے میں، ص:۸-۹، رضا دار الاشاعت، لاہور

(۲) ابتدائیہ: امام احمد رضا کی فقہی بصیرت جد الممتار کے آئینے میں، ص:۲۱-۲۲، رضا دار الاشاعت، لاہور

حضرت مولانا بدرالقادری لکھتے ہیں:

"علامہ محمد احمد مصباحی حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کی نگاہ کیمیا کا انتخاب اور امت مسلمہ کی پاکیزہ دعاؤں کا ثمرہ ہیں۔"(۱)

علامہ محمد صدیق ہزاروی پاکستان رقم طراز ہیں:

"آپ (علامہ محمد احمد مصباحی) قدیم وجدید علوم کے ماہر، کئی علمی و تحقیقی کتب کے مصنف و مترجم ہیں، حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد رسائل اور فتاویٰ کو ترجمہ، تحقیق اور تحشیہ کے بعد عام اردو خواں حضرات کے لیے آسان بنا چکے ہیں۔"(۲)

سراج الفقہاء حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی صدرالمدرسین، جامعہ اشرفیہ مبارک پور فرماتے ہیں:

"آپ (علامہ محمد احمد مصباحی) کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ خوبیوں سے نوازا ہے، درس نظامی کے فنونِ متداولہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، عربی زبان و ادب میں آپ اپنے اقران میں ممتاز و منفرد ہیں، محقق، مصنف، مدبر، خاشع، متواضع ہیں، مصروف زندگی میں بھی اوراد و وظائف کے پابند ہیں۔"(۳)

حضرت مولانا عارف اللہ فیضی مصباحی لکھتے ہیں:

"خیر الاذکیاء، استاذی الکریم حضرت علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ العالی علوم وفنون عقلیہ و نقلیہ میں کامل دست گاہ رکھنے کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر بھی مکمل دست رس رکھتے ہیں۔ عصری اسالیب میں عربی اور اردو میں آپ کی تصنیف کردہ کتب اور آپ کے تحریر کردہ مقالات و خطبات میرے اس دعوے پر شاہد عدل ہیں۔ قدیم فارسی زبان و ادب کے ساتھ جدید فارسی زبان و ادب میں بھی آپ کو جو زبردست عبور حاصل ہے اس کا اندازہ تین چار صفحات پر مشتمل آپ کے ایک پر مغز اور نہایت متین و سنجیدہ مضمون سے ہوا۔"(۴)

حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور تحریر فرماتے ہیں:

"محقق عصر خیر الاذکیاء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ کی

(۱) ماہ نامہ سنی دعوت اسلامی ممبئی، جون ۲۰۰۳ء
(۲) پیش لفظ، فتاویٰ رضویہ، مترجم، مطبوعہ لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۸
(۳) مقدمہ جدید مسائل پر علما کی رائیں اور فیصلے، ج:۲، ص:۳۳، مجلس شرعی مبارک پور
(۴) نوائے دل، ص:۸، مصباحی پبلی کیشن، محمد آباد ۲۰۱۹ء

شخصیت بہت نمایاں ہے، آپ علوم مروجہ وفنون متداولہ پر مکمل دسترس کے ساتھ عربی و اردو دونوں زبانوں پر کامل عبور رکھتے ہیں، اور اخلاص وللّٰہیت، زہد و تقویٰ کا پیکر ہیں.... سچی بات تو یہ ہے کہ انھیں کی تربیت ورہ نمائی نے اس بے مایہ کو قلم پکڑنے کا شعور بخشا۔"(۱)

حضرت مولانا صدرالوریٰ مصباحی استاد جامعہ اشرفیہ رقم طراز ہیں:

"عمدۃ المحققین، حضرت علامہ محمد احمد مصباحی صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ جہاں ایک تبحر و نقاد عالم باکمال مدرس، صاحب طرز ادیب اور بلند پایہ محقق و مدقق ہیں وہیں دین وسنیت کے بے لوث خادم اور اخلاص و ایثار کے سچے آئینہ دار ہیں۔" (غیر مطبوعہ)

حضرت مولانا اسیدالحق عاصم قادری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"ایک محمد احمد مصباحی اور دوسرے عبدالحکیم شرف قادری ان دونوں حضرات کے قلم میں میں نے یہ خاص بات نوٹ کی کہ خالص درس گاہی ہونے کے باوجود یہ حضرات ایک شگفتہ اور معیاری نثر لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔"(۲)

مفتی توفیق احسنؔ برکاتی استاذ جامعہ اشرفیہ لکھتے ہیں:

"استاذ گرامی عمدۃ المحققین، خیر الاذکیا حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ بے پناہ ذاتی خوبیوں، علمی کمالات، دینی خدمات اور فکری وفنی جمالیات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں۔ آپ بہ یک وقت ایک مشفق استاذ و مربی، تبحر عالم دین، بلند پایہ محقق، کامیاب مترجم، ماہر محشی اور صاحب طرز ادیب و مصنف ہیں، تحریر میں سلاست و شگفتگی، طرز خاص کی مطابقت اور قوت استدلال و منطقی تجزیہ آپ کے امتیازات ہیں۔ آسان اسلوب کی حلاوت ذہن و فکر میں اس طرح گھل جاتی ہے کہ قاری دیر تک اس سے لذت اندوز ہوتا ہے اور نفس معانی کی کشش ایک زمانے تک اسے اپنا اسیر بنائے رکھتی ہے۔"(۳)

مناصب:

آپ کے تدبر، دور اندیشی، تبحر علمی اور خلوص وللّٰہیت کے باعث ہندوستان کے بہت سے اداروں کے ارباب

(۱) حرف آغاز-اصول حدیث، حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی، ص:۳
(۲) تذکرۂ علمائے بھیرہ، ولید پور، ص:۱۲۷
(۳) پیش لفظ-شرک کیا ہے؟ از علامہ محمد احمد مصباحی، مطبوعہ ممبئی، ۲۰۱۴ء

حل و عقد نے آپ کو اپنے ادارے کا سرپرست، ناظم تعلیمات یا ڈائرکٹر وغیرہ بنایا ہے اور ادارے کے عروج وارتقا کے لیے آپ کے اشارات وہدایات کو اپنے لیے فالِ نیک سمجھتے ہیں اور آپ کی طرف ادارے کے انتساب کو کامیابی کی ضمانت تصور کرتے ہیں، ان میں سے کچھ اداروں کے نام اور عہدوں کی تفصیل پیش خدمت ہے:

(۱) ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
(۲) صدر مجلس شرعی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
(۳) ڈائرکٹر مجلس برکات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
(۴) بانی رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ
(۵) صدر تنظیم المدارس، اترپردیش
(۶) سرپرست مرکزی دارالقراءت، ٹاٹانگر، جمشید پور

سادگی:

حضرت صدرالعلما دام ظلہ کی پوری زندگی سادگی کا نمونہ ہے، سادہ بیانی، سادہ مزاجی اور سادہ لباسی آپ کی دستار کے وہ طرے ہیں جن پر ہزاروں رنگینیاں قربان، اتنے بلند پایہ عالم دین ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں، کبھی بھی اپنے علم وفضل کا اظہار نہیں کرتے، جب کہ آج کے دور میں ذرا سا علم ہوا نہیں کہ اس کے اظہار کی فکر ہونے لگتی ہے۔ یقیناً آپ "کم خوردن، کم گفتن، کم خفتن" کا صحیح مصداق اور "یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم" کی خوب صورت تصویر ہیں۔ ہمیشہ سادہ لباس زیب تن فرماتے ہیں، لیکن اس سادگی سے بھی رعب ٹپکتا ہے اور انداز فقیری سے بھی شاہانہ جلال جھلکتا ہے۔

یہ اس عظیم المرتبت عالم ومحقق کا ایک مختصر زندگی نامہ اور اس کے علمی آثار کا اجمالی تعارف ہے، اس کتاب میں اسی قدر کی گنجائش ہے، اللہ تعالیٰ ان کے امثال زیادہ کرے، آمین۔

محمد رئیس اختر مصباحی بارہ بنکوی

باب اول

علمی وتحقیقی مقالات

مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کا درس کسب و تجارت (۱)

تخلیق انسانی کا مقصد رب کائنات کی معرفت اور اس کی عبادت ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن (۲)

اور میں نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا فرمایا کہ وہ میری عبادت کریں۔

مگر انسانی زندگی کی بقا اور حفاظت کے لیے خورد و نوش، لباس و پوشاک اور خانہ و مسکن ضروری ہے۔ اور ان ضروریات کی تکمیل کے لیے کسی نہ کسی حد تک سرمایہ و مال ہونا لابدی ہے۔ اور سرمایہ و مال کا حصول کسی ذریعہ و سبب کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے عقلی طور پر انسان اپنی زندگی میں حصول مال کا ذریعہ اپنانے کا محتاج ہے۔ شریعت اسلامیہ نے بھی انسان کی اس محتاجی کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس کے لیے کوئی ذریعۂ کسب اپنانا فرض قرار دیا ہے۔ لیکن اس باب میں اسے آزاد نہیں چھوڑا ہے کہ جہاں سے چاہے، جب چاہے اور جیسے چاہے سرمایہ حاصل کرتا جائے، خواہ کسی پر زیادتی ہو، کسی کی ایذا رسانی ہو، کسی کی حق تلفی ہو، یاد الٰہی سے غفلت ہو، عبادتیں فوت ہوں، کچھ پروانہ کرے، بس زیادہ سے زیادہ سرمایہ اکٹھا کرنے کی دھن میں لگا رہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جس طرح کھانے پینے، پہننے، رہنے سہنے کے معاملے میں بندوں کو بہت سے آداب اور حدود و قیود کا پابند بنایا ہے اسی طرح کسب کے معاملہ میں بھی بہت سے آداب اور حدود و قیود سے آشنا کیا ہے۔ اسی سے ایک مومن اور ایک غیر مومن کے طرز فکر اور انداز حرکت و عمل میں حد فاصل قائم ہوتی ہے اور دونوں کی زندگیوں میں خطِ امتیاز کھنچتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ ساری تعلیمات وحی ربانی کے تحت ہیں اور رب جانتا ہے کہ اس کے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے کون سا نظام نفع بخش ہے اور کون سا نظام ضرر رساں ہے۔

اسلام در اصل خدا اور رسول کی اطاعت و فرماں برداری کا نام ہے۔ اس لیے بندۂ مسلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خواہش نفس سے پہلے خدا اور رسول کی رضا اور خوشنودی کو دیکھے، جس کام میں اپنے جسم و جان کے خالق و

(۱) سال نامہ اہل سنت کی آواز، مارہرہ مطہرہ، نومبر ۲۰۰۶ء

(۲) سورۃ الذاریات، پ: ۲۷، آیت: ۵۶

مالک جل جلالہٗ اور اپنے ایمان و عمل کے ہادی و مربی علیہ الصلاۃ والسلام کی رضا دیکھے اس کی بجاآوری کرے اور جس میں ناراضی و غضب کی بو پائے اس سے دور بھاگے۔ یہی شانِ ایمان ہے، یہی تقاضاے اسلام ہے۔ دنیاے فانی کی رعنائیوں اور حیات ناپائدار کی لذتوں پر فریفتہ ہونا اس کا کام ہے جس کے فکر و خیال میں اس جہان کے سوا کوئی جہان نہیں اور جس کی نظر میں اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ بندۂ مومن تو اس جہان کی آبادکاری کے لیے فکر مند رہتا ہے جس کا ایک دن یہاں کے پچاس ہزار سال کے برابر ہے، اس کا مطمح نظر اس حیات کی رعنائیاں ہوتی ہیں جسے زوال نہیں، وہ اس گھر کی ویرانی سے لرزتا ہے جس میں اسے ہمیشہ رہنا ہے۔

چوں کہ تفصیل کی مہلت نہیں اس لیے اس اجمالی تمہید سے میں نے ان لوگوں کا جواب دینا چاہا ہے جو اسلامی قوانین کو خالق کائنات کے غیر متزلزل اور لافانی دستور کی حیثیت سے دیکھنے کی بجاے اپنی آوارہ خواہشات کے آئینے میں دیکھتے ہیں، خدا انھیں عقل سلیم دے اور صراط مستقیم نصیب فرمائے۔

اب آیئے دیکھیں کہ مصطفےٰ جان رحمت ﷺ نے کسب اور طلب رزق کے باب میں اپنے ماننے والوں کو کیا ہدایات دی ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ۔[۱]

ترجمہ: حلال کمائی طلب کرنا فرض ہے، فرائض کے بعد۔

(۲) طَلَبُ الْحَلَالِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔[۲]

ترجمہ: حلال کی طلب ہر مسلمان پر لازم ہے۔

ان حدیثوں سے جہاں طلب رزق اور کسب کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے روزی کی جستجو اور طلب معاش کو حلال کی قید سے مقید کر دیا ہے۔ یہیں سے دینی اور لادینی نقطۂ نظر کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ شریعت اسلامیہ روزی کمانے کی تاکید تو فرماتی ہے مگر انسان کو آزاد نہیں چھوڑتی بلکہ اسے جائز اور بے ضرر راہوں کا پابند بناتی ہے۔ انسان کم سے کم تر حاصل کرے یا زیادہ سے زیادہ لیکن ذریعہ جائز و حلال اور مقصد پاکیزہ و طیب ہونا چاہیے۔ خبیث اور ناجائز طریقوں سے جمع کی ہوئی دولت رب جلیل کے یہاں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ نہ ہی فاسد اور خبیث مقاصد کے لیے کمایا ہوا مال اس تاکید و ترغیب کے تحت آتا ہے جو آقاے دو عالم ﷺ

(۱) معجم کبیر للطبرانی، شعب الایمان للبیہقی بروایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، علاء الدین علی متقی ہندی (م:۹۷۵ھ) ج:۴، ص:۴، حدیث ۳۸، طبع دوم طباعت و اشاعت: دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء

(۲) مسند الفردوس للدیلمی، بروایت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔ کنز العمال علی متقی، ج:۴، ص:۲، حدیث:۱۱

نے اپنی احادیث کریمہ میں دی ہے۔

اسلام طیب ہی طیب ہے۔ اس لیے وہ مقصد، ذریعہ اور مصرف تینوں کی پاکیزگی چاہتا ہے۔ مال جمع کرنے کا مقصد اچھا ہے مگر تحصیل مال کا جو ذریعہ اپنایا وہ خراب ہے، یا ذریعہ تو اچھا ہے مگر مقصد ناپاک ہے، یا ذریعہ اور مقصد دونوں پاک تھے مگر جب مال ہاتھ میں آگیا تو بہت سارا مال ناپاک جگہوں یا لایعنی اور فضول راہوں میں صرف کر دیا، یہ تینوں صورتیں اسلام کی نظر میں مذموم ہیں اور ان پر صاحب مال سے مواخذہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ عبادات اور دیگر معاملات کی طرح کسب اور طلب رزق کے باب میں بھی رب جلیل کے نزدیک ہر طرح کی پاکیزگی ہی محمود و مطلوب ہے۔ اسی سے اسلامی نظریہ اور خود ساختہ پیمانوں اور اصولوں کا فرق عیاں ہو جاتا ہے۔

اب تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کچھ احادیث کریمہ پیش کی جاتی ہیں جن سے مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کے لائے ہوئے دین اور ان کی بے بہا تعلیمات کا عادلانہ اور پاکیزہ مزاج سمجھنے میں مدد ملے گی۔

پہلے چند آیات کریمہ ملاحظہ ہوں۔ قرآن فرماتا ہے:

(۱) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ[۱]

ترجمہ: اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ اور اللہ کا احسان مانو اگر تم اس کے پرستار ہو۔

(۲) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ[۲]

ترجمہ: اے ایمان والو! حرام نہ ٹھہراؤ وہ ستھری چیزیں کہ اللہ نے تمھارے لیے حلال کیں اور حد سے نہ بڑھو۔ بے شک حد سے بڑھنے والے اللہ کو ناپسند ہیں۔ اور کھاؤ جو کچھ تمھیں اللہ نے روزی دی حلال، پاکیزہ، اور اللہ سے ڈرو جس پر تمھیں ایمان ہے۔

(۳) وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔[۳]

ترجمہ: اور وہ رسول ستھری چیزیں ان کے لیے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا۔

(۴) وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔[۴]

(۱) سورۃ: بقرہ، آیت: ۱۷۲

(۲) سورۃ: المائدہ، آیت: ۸۷-۸۸

(۳) سورۃ: اعراف، آیت: ۱۵۷

(۴) سورۃ: بقرہ، آیت: ۱۸۸

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال جان بوجھ کر ناجائز طریقے پر کھاؤ۔

(۵) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا . [1]

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی سودا تمھاری باہمی رضامندی کا ہو اور اپنی جانیں قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر مہربان ہے۔

دست کاری اور کسب حلال:

حدیث ۳:

(۳) مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا خَيْرًا مِنْ اَنْ يَاكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَ اِنَّ نَبِيَّ اللهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ. [2]

ترجمہ: اس کھانے سے بہتر کوئی کھانا نہیں جس کو کسی نے اپنے ہاتھوں سے کام کر کے حاصل کیا ہے اور بے شک اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنی دست کاری سے کھاتے تھے۔

(۴) قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَيُّ الكَسَبِ أطيَبُ؟ قَالَ: عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ. [3]

ترجمہ: عرض کیا گیا: یارسول اللہ کون سا کسب زیادہ پاکیزہ ہے؟ فرمایا: آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور اچھی بیع۔ بیع مبرور (اچھی بیع) وہ جس میں خیانت اور دھوکا نہ ہو یا یہ کہ وہ بیع فاسد نہ ہو۔ [4]

(۵) اِنَّ اللهَ تَعَالىٰ يُحِبُّ العَبْدَ الْمُؤمِنَ الْمُحْتَرِفَ. [5]

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ایسے بندۂ مومن کو پسند فرماتا ہے جو کوئی حرفت اور پیشہ رکھتا ہے۔

(۶) اِنَّ اللهَ تَعَالىٰ يُحِبُّ اَنْ يَرىٰ عَبدَهٗ تَعِباً فِيْ طَلَبِ الحَلَالِ. [6]

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رزق حلال کی طلب میں محنت اور مشقت کرتے ہوئے

(۱) سورۃ: النساء، آیت: ۲۹

(۲) صحیح بخاری بروایت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ ج:۲، ص:۲۷۸، اصح المطابع، دہلی۔

(۳) مسند امام احمد، معجم کبیر طبرانی مستدرک حاکم بروایت رافع بن خدیج، و معجم کبیر طبرانی بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، کنز العمال، علی متقی، ج:۴، ص:۱، حدیث:۳، مشکوۃ المصابیح بروایت مسند امام احمد، ص:۲۴۲۔

(۴) حاشیہ مشکاۃ المصابیح، ص:۲۴۲ و بہار شریعت یازدہم ص:۵، صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی

(۵) حکیم ترمذی، معجم کبیر طبرانی، شعب الایمان بیہقی، ابن عدی، ابن النجار، بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کنز العمال، ج:۴، ص:۱و۵،

(۶) مسند الفردوس للدیلمی، بروایت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کنز العمال، ج:۴، ص:۲، حدیث:۷

دیکھنا پسند کرتا ہے۔

(۷) اِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّباً وَاِنَّ اللهَ اَمَرَ الْمُؤمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ فَقَالَ: يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صٰلِحًا وَقَالَ تَعَالىٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ.

ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَآءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ، وَ مطْعَمُهٗ حَرَام، وَمَشْرَبُهٗ حَرَام، وَمَلْبَسُهٗ حَرَام، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ. [1]

ترجمہ: بے شک اللہ پاک ہے اور پاک ہی قبول فرماتا ہے اور بے شک اللہ نے مومنین کو بھی اسی کا حکم دیا ہے جس کا رسولوں کو حکم دیا۔ اس نے رسولوں سے فرمایا: اے رسولو! پاک چیزوں سے کھاؤ اور اچھے کام کرو۔ اور مومنین سے فرمایا: اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاک چیزوں سے کھاؤ۔

پھر ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کرتا ہے پراگندہ حال، غبار آلود ہے (یعنی ایسی حالت ہے کہ جو دعا کرے قبول ہو) وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یارب، یارب کہتا ہے (دعا کرتا ہے) مگر حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور حرام غذا سے پرورش پائی، پھر اس کی دعا کیسے قبول ہو۔

(۸) اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلىٰ وُلْدِهٖ صِغَارٍ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلىٰ اَبَوَيْنِ شَيْخَيْنِ كَبِيْرَيْنِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى عَلىٰ نَفْسِهٖ يُعِفُّهَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعٰى رِيَاءً وَ مُفَاخَرَةً فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ الشَّيْطَانِ. [2]

ترجمہ: (۱) اگر اپنے کم سن بچوں کے لیے رزق کی تلاش میں نکلا تو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (۲) اگر سن رسیدہ بوڑھے ماں باپ کے لیے کوشش رزق میں نکلا تو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (۳) اور اپنے کو (سوال کی ذلت اور محتاجی کی کلفت سے) عفت و پارسائی میں رکھنے کے لیے کوشش میں نکلا تو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (۴) اور اگر ریا و نمود اور مفاخرت کے لیے مال جمع کرنے کی کوشش میں نکلا تو وہ شیطان کی راہ میں ہے۔

(۹) مَا كَسَبَ الرَّجُلُ كَسْبًا اَطْيَبَ مِنْ عَمَلِ يَدِهٖ، وَمَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلىٰ نَفْسِهٖ وَاَهْلِهٖ وَوُلْدِهٖ وَخَادِمِهٖ فَهُوَ صَدَقَةٌ. [3]

ترجمہ: اپنے ہاتھ سے محنت کی کمائی سے بہتر کوئی کمائی نہیں اور آدمی جو کچھ اپنے اوپر اور اپنے بال بچوں اور

(۱) صحیح مسلم بروایت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۱، مجلس برکات مبارک پور

(۲) معجم کبیر طبرانی، بروایت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کنز العمال، ج:۴، ص:۳، حدیث:۱۷

(۳) معجم کبیر طبرانی، بروایت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کنز العمال، ج:۴، ص:۳، حدیث:۱۷

خادموں پر صرف کرے وہ صدقہ ہے۔

(۱۰) طَلَبُ الحَلَالِ مِثْلُ مُقَارَعَةِ الْاَبْطَالِ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ، وَ مَنْ بَاتَ عَیِیاً مِنْ طَلَبِ الحَلَالِ بَاتَ وَاللہُ تَعَالیٰ عَنْهُ رَاضٍ.(۱)

ترجمہ: رزق حلال کی طلب اللہ کی راہ میں بہادروں سے نبرد آزمائی کی طرح ہے اور جو طلب حلال کی محنت سے تھکا ہوا رات بسر کرے وہ خدائے تعالیٰ کی رضا میں رات بسر کرنے والا ہے۔

(۱۱) طَلَبُ الحَلَالِ جِهَادٌ.(۲)

ترجمہ: رزق حلال کی طلب ایک جہاد ہے۔

(۱۲) لَیْسَ شَيْءٌ یُقَرِّبُكُمْ اِلَی الْجَنَّةِ اِلَا وَقَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَ لَیْسَ شَيْءٌ یُقَرِّبُكُمْ اِلَی النَّارِ اِلَا وَقَدْ نَهَیْتُكُمْ عَنْهُ وَ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ اَنَّ اَحداً مِّنْكُمْ لَنْ یَّخْرُجَ مِنَ الدُّنْیَا حَتیٰ یَسْتَكْمِلَ رِزْقَهٗ، فَلَا یَطْلُبْهُ بِمَعْصِیَةِ اللہِ فَاِنَّ اللہَ عَزَّوجَلَّ لَا یُنَالُ فَضْلُهٗ بِمَعْصِیَتِهٖ.(۳)

ترجمہ: جو چیز بھی تمھیں جنت سے قریب کرنے والی ہے اس کا میں نے تمھیں حکم دیا ہے اور جو چیز بھی تمھیں دوزخ سے قریب کرنے والی ہے اس سے میں نے تمھیں روکا ہے۔ بے شک روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ ہرگز کوئی شخص دنیا سے نہ جائے گا جب تک اپنا مقررہ رزق پورا پورا نہ پاجائے۔ تو آدمی اپنا رزق اللہ کی نافرمانی کے ساتھ نہ طلب کرے اس لیے کہ اللہ عزوجل کا فضل اس کی نافرمانی کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاتا۔

(۱۳) یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَنْ یَمُوْتَ حَتیٰ یَسْتَكْمِلَ رِزْقَهٗ، فَلَا تَسْتَبْطِئُوْا الرِّزْقَ، واتَّقُوْا اللہَ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَخذُوْا مَا حَلَّ وَدَعُوْا مَا حَرُمَ.(۴)

ترجمہ: اے لوگو! ہرگز کسی کو اس وقت تک موت نہ آئے گی جب تک اپنا رزق پورا پورا نہ پاجائے تو رزق ملنے میں دیر ہونے کا خیال نہ کرو، اللہ سے ڈرو اور رزق کی طلب میں عمدگی اختیار کرو، جو حلال ہو اسے لو اور جو حرام ہو اسے چھوڑ دو۔

(۱) سنن ابن ماجہ بروایت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۴، حدیث:۳۶

(۲) سنن سعید بن منصور، شعب الایمان بیہقی، بروایت السکن، کنز العمال، ج:۴، ص:۴، حدیث:۳۴

(۳) نسائی و مستدرک حاکم، بروایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۴، حدیث:۱۲۳-۱۲۴

(۴) مستدرک حاکم و سنن بیہقی، بروایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۳، حدیث:۱۲ و بمعناہ عن عدۃ من الصحابۃ۔

آداب کسب:

(۱۴) اِذَا فَتَحَ اللہُ لِاَحدِكُمْ رِزْقاً مِّنْ بَابٍ فَلْیَلْزَمْهُ. وَفِیْ روایة: فَلَا یَدَعْهُ حَتّٰی یَتَغَیَّرَ لَهٗ.(۱)

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے لیے ایک جہت سے کوئی رزق کھول دے تو اسے پکڑے رہے، چھوڑے نہیں، یہاں تک کہ اس کے حق میں وہ بدل جائے۔

(۱۵) قَالَ عُمَرُ: مَنِ اتَّجر فِیْ شَيْءٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فلَمْ یُصِبْ فیه فَلْیَتَحوَّلْ اِلیٰ غَیْرِهٖ.(۲)

ترجمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص تین مرتبہ کسی چیز کی تجارت کرے پھر بھی اس میں کامیاب نہ ہو تو کسی اور تجارت کی طرف منتقل ہو جائے۔

(۱۶) اُطْلُبُوْا الرِّزْقَ فِی خَبَایَا الاَرْض.(۳)

ترجمہ: زمین کی پوشیدہ جگہوں میں رزق تلاش کرو۔

(۱۷) التَّاجِرُ الْجَبَانُ مَحْرُومٌ وَالتَّاجِرُ الْجَسُوْرُ مَرْزُوْقٌ.(۴)

ترجمہ: اندیشہ کرنے والا بزدل تاجر نامراد رہتا ہے، ہمت کرنے والا دلیر تاجر رزق پاتا ہے۔

(۱۸) اِذَا صَلَّیْتُمُ الفَجرَ فَلَا تَنَامُوْا عَنْ طَلَبِ اَرْزَاقِكُمْ.(۵)

ترجمہ: جب نماز فجر پڑھ لو تو اپنے رزق کی تلاش سے غافل ہو کر سو نہ جاؤ۔

(۱۹) مَنِ اسْتَبْطَأَ الرِّزْقَ فَلْیُكْثِرْ مِنَ التَّكْبِیْرِ، وَمَنْ كَثُرَ هَمُّهٗ وَغَمُّهٗ فَلْیُكْثِرْ مِنَ الاِسْتِغْفَارِ.(۶)

ترجمہ: جو رزق ملنے میں دیر محسوس کرے تو تکبیر زیادہ کہے اور جس کا رنج و غم زیادہ ہو تو استغفار زیادہ کرے۔

(۲۰) مَا یَمْنَعُ اَحَدَكُمْ اِذَا عَسَرَ عَلَیْهِ اَمْرُ مَعِیْشَتِهٖ اَنْ یَقُوْلَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَیْتِهٖ: بِسْمِ اللہِ عَلیٰ

(۱) مسند امام احمد و سنن ابن ماجہ، شعب الایمان للبیہقی، مسند امام احمد بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال۔ علاء الدین علی علی المتقی (م ۹۷۵ھ) ج:۴، ص:۱۳ و ۱۴، حدیث:۱۳۶، ۱۰۷، ۱۰۸ طبع دوم، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد۔ اشاعت ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء۔ ونحوہ عن انس رضی اللہ عنہ عند البیہقی فی الشعب ایضا۔ حدیث:۹۳ و ۱۲۷۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ و دینوری فی المجالسہ بروایت الحسن کنز العمال علی المتقی، ص:۴، ص:۷۰، حدیث:۶۷۲۔

(۳) مسند ابو یعلی، معجم کبیر طبرانی، شعب الایمان بیہقی، دارقطنی فی الافراد بروایت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، تاریخ دمشق لابن عساکر بروایت عبداللہ بن ابی عباس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کنز العمال، ج:۴، ص:۱۳، حدیث:۱۰۹-۱۱۰۔

(۴) مسند شہاب قضاعی، بروایت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کنز العمال ج:۴، ص:۱۱، حدیث:۱۰۰۔

(۵) معجم طبرانی کبیر، بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کنز العمال، ج:۴، ص:۱۱، حدیث:۱۰۶۔

(۶) مسند الفردوس للدیلمی، بروایت سیدنا انس بن مالک، کنز العمال ج:۴، ص:۱۵، حدیث:۳۲۔

نَفْسِیْ وَمَالِیْ وَدِیْنِیْ اللّٰھُمَّ اَرْضِنِیْ بِقَضَائِكَ، وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا قُدِّرَلِیْ، حَتّٰی لَا اُحِبَّ تَعْجِیْلَ مَا اَخَّرْتَ، وَلَا تَاخِیْرَ مَا عَجَّلْتَ.[1]

ترجمہ: جب تم میں سے کسی کو معاش کی دشواری ہو تو اس کے لیے اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ دعا کرنے سے کیا مانع ہے؟ اللہ کے نام سے، میرے نفس، مال اور دین پر، اے اللہ! مجھے اپنی قضا سے راضی کر اور میرے لیے جو مقدر ہے اس میں برکت عطا فرما کہ میں اس کی جلدی نہ چاہوں جسے تو نے موخر رکھا ہے اور اس کا موخر ہونا نہ چاہوں جسے تو نے جلد رکھا ہے۔

(۲۱) كَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا دَخَلَ السُّوْقَ قَالَ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ مِنْ خَیْرِھَا، وَخَیْرِمَا فِیْھَا، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّھَا، وَشَرِّمَا فِیْھَا، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ اَنْ لَّا اُصِیْبَ فِیْھَا یَمِیْنًا فَاجِرَۃً، وَصَفْقَۃً خَاسِرَۃً.[2]

ترجمہ: نبی کریم ﷺ جب بازار میں داخل ہوتے تو کہتے: اے اللہ! میں تجھ سے اس کی خیر اور جو کچھ اس میں ہے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور تجھ سے اس کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ لیتا ہوں۔ اے اللہ! تجھ سے میرا سوال ہے کہ اس میں کوئی جھوٹی قسم اور خسارے والا سودا نہ پاؤں۔

ترکِ کسب اور مانگنے کی مذمت:

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف کسب کی ترغیب دی ہے اور اس کے آداب بیان فرمائے ہیں۔ دوسری طرف کسب چھوڑ کر مانگنے کا عمل اپنانے کی سخت مذمت کی ہے اور اس پر وعیدیں بھی سنائی ہیں۔ یہاں چند احادیث کا ترجمہ لکھا جاتا ہے:

(۲۲) سوال ایک قسم کی خراش ہے کہ آدمی سوال کر کے اپنے منہ کو نوچتا ہے، جو چاہے اپنے منہ پر اس خراش کو باقی رکھے اور جو چاہے چھوڑ دے۔ ہاں اگر صاحبِ سلطنت سے اپنا حق مانگے یا ایسے امر میں سوال کرے کہ اس سے چارہ نہ ہو تو جائز ہے۔[3]

(۲۳) جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے سوال کرے تو وہ جہنم کا گرم پتھر ہے۔ اب اسے اختیار ہے چاہے تھوڑا مانگے یا زیادہ مانگے۔[4]

---

(۱) ابن السنّی، عمل الیوم واللیلۃ، بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۵، حدیث:۳۰۔
(۲) ابو حامد یحییٰ بن بلال بزاز بروایت بُریدہ رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۷، حدیث:۶۷۴۔
(۳) امام احمد ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبّان، بروایت سَمُرہ بن جُندب رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۶، ص:۲۷۷ و ۲۷۸، حدیث:۲۱۱۸ و ۲۱۱۹۔
(۴) صحیح ابن حبان، الترغیب فی الذکر لابن شاہین، فوائد تمام، سنن سعید بن منصور، بروایت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۶،

(۲۴) جو شخص بغیر حاجت سوال کرتا ہے گویا وہ انگارا کھاتا ہے۔[1]

(۲۵) جو شخص سوال کرے حالاں کہ اس کے پاس اتنا ہے کہ وہ سوال سے بے نیاز ہے تو وہ آگ کی زیادتی چاہتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: وہ کیا مقدار ہے، جس کے ہوتے ہوئے سوال جائز نہیں؟ فرمایا: صبح و شام کا کھانا۔[2]

(۲۶) قَبِیصہ بن مُخارِق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ مجھ پر تاوان لازم آیا، میں نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا۔ فرمایا: ٹھہرو، ہمارے پاس صدقہ کا مال آئے گا تو تمھارے لیے حکم فرمائیں گے۔ پھر فرمایا: اے قبیصہ! سوال حلال نہیں مگر تین باتوں میں (۱) کسی نے ضمانت لی ہو (یعنی کسی قوم کی طرف سے دیت کا ضامن ہوا، یا آپس کی جنگ میں صلح کرائی اور اس پر کسی مال کا ضامن ہوا) تو اسے سوال حلال ہے، یہاں تک کہ وہ مقدار پائے پھر باز رہے۔ (۲) یا کسی پر آفت آئی کہ اس کے مال کو تباہ کر گئی تو اسے سوال حلال ہے یہاں تک کہ بسر اوقات کے لیے پا جائے۔ (۳) یا کسی کو فاقہ پہنچا اور اس کی قوم کے تین عقل مند شخص گواہی دیں کہ فلاں کو فاقہ پہنچا ہے (تین کی گواہی کا حکم بطور استحباب ایسے شخص کے لیے ہے جس کا مال دار ہونا معلوم و مشہور ہو ورنہ صرف اس کا بیان کافی ہے) تو اس کے لیے سوال حلال ہے اور ان تینوں باتوں کے سوا اے قبیصہ! سوال کرنا حرام ہے کہ سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔[3]

(۲۷) کوئی شخص رسی لے جائے اور پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا لا کر بیچے اور سوال کی ذلت سے اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو بچائے یہ اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے کہ لوگ اسے دیں یا نہ دیں۔[4]

(۲۸) فِراسی بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: کیا میں سوال کروں؟ فرمایا: نہیں۔ اور اگر چارۂ کار نہ ہو تو صالحین سے مانگو۔[5]

مولانا علی قاری علیہ الرحمہ نے مرقاۃ میں اس کی کئی وجہیں بیان فرمائیں (۱) صالح شخص دے گا تو مال حلال سے دے گا۔ (۲) وہ کریم اور مہربان ہوگا۔ (۳) پردہ دری نہ کرے گا، تمھاری محتاجی اور اپنی بخشش کا راز افشا نہ کرے

ص:۲۸۳، حدیث:۲۱۷۱۔
(۱) مسند امام احمد، صحیح ابن خزیمہ، مختارہ ضیا مقدسی، شعب الایمان للبیہقی، بروایت حبشی بن جنادہ رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۶، ص:۲۷۷، حدیث:۲۱۳ و ص:۲۸۱، حدیث:۲۱۴۹
(۲) مسند امام احمد، صحیح ابن حبان، سنن ابوداؤد، مستدرک حاکم، بروایت سہل ابن الحنظلیہ رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۶، ص:۲۷۹، حدیث:۲۱۳۵۔
(۳) مسند امام احمد، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، بروایت قَبِیصہ ابن مُخارِق رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۶، ص:۲۷۹، حدیث:۲۱۳۳۔
(۴) مسند امام احمد، صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، بروایت سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کنز العمال، ج:۶، ص:۲۷۸، حدیث:۲۱۲۲۔
(۵) سنن ابوداؤد، سنن نسائی، مشکوۃ المصابیح، ص:۱۶۳۔

گا۔(۴) تمھارے لیے دعاے خیر کرے گا جو مقبول ہوگی۔

(۲۹) عبد اللہ ابن الساعدی بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے صدقہ کا عامل بنایا۔ جب میں نے صدقہ وصول کر لیا اور انھیں لاکر دیا تو انھوں نے میرے لیے اجرت دینے کا حکم فرمایا۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ میں نے خدا کے لیے یہ کام کیا ہے اور میرا اجر اللہ کے کرم پر ہے۔ فرمایا: جو دیا جارہا ہے اسے لے لو، اس لیے کہ میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ کام کیا تھا۔ سرکار نے میرے لیے اجرت کا حکم دیا تو میں نے ایسی ہی بات کہی جو تم نے کہی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: جب مانگے بغیر تمھیں ملے تو لے لو، پھر کھاؤ اور صدقہ کردو۔[1]

(۳۰) ایک انصاری نے سرکار کی بارگاہ میں حاضر ہو کر سوال کیا، ارشاد فرمایا: کیا تمھارے گھر میں کچھ نہیں ہے؟ عرض کیا: ہے تو، ایک ٹاٹ ہے جس کا ایک حصہ ہم اوڑھتے ہیں اور ایک حصہ بچھاتے ہیں اور ایک لکڑی کا پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: میرے پاس دونوں چیزیں حاضر کرو۔ وہ حاضر لائے۔ سرکار نے اپنے دست مبارک میں لے کر ارشاد فرمایا: انھیں کون خریدتا ہے؟ ایک صاحب نے کہا: ایک درہم کے عوض میں خریدتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: ایک درہم سے زیادہ کون دیتا ہے؟ دو یا تین بار فرمایا۔ ایک اور صاحب نے عرض کیا: میں دو درہم میں لیتا ہوں۔ سرکار نے انھیں یہ دونوں چیزیں دے دیں اور درہم لے لیے پھر انصاری کو دونوں درہم دے کر ارشاد فرمایا: ایک کا غلہ خرید کر گھر ڈال آؤ اور ایک کی کلھاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ وہ حاضر لائے۔ سرکار نے اپنے دست مبارک سے اس میں بینٹ ڈالا اور فرمایا: جاؤ لکڑیاں کاٹو اور بیچو اور یہاں تم پندرہ دن تک نظر نہ آنا۔ وہ گئے لکڑیاں کاٹ کر بیچتے رہے۔ پندرہ دن کے بعد حاضر ہوئے تو ان کے پاس دس درہم تھے۔ چند درہم کا کپڑا خریدا اور کچھ کا غلہ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن سوال تمھارے منہ پر چھالا ہو کر آتا۔ سوال درست نہیں مگر تین شخصوں کے لیے۔ (۱) ایسی محتاجی والے کے لیے جو اسے زمین پر لٹادے۔ (۲) یا ایسے تاوان والے کے لیے جو اسے رسوا کردے۔ (۳) یا خون (دیت) والے کے لیے جو اسے تکلیف پہنچائے۔[2]

(۳۱) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

مَكْسَبَةٌ فِيْهَا بَعْضُ الدَّنَاءَةِ خَيْرٌ مِنْ مَسْأَلَةِ النَّاسِ.[3]

ترجمہ: ایسا ذریعۂ کسب جو کچھ نیچا شمار ہوتا ہو، لوگوں سے مانگنے سے بہتر ہے۔

(۱) سنن ابوداؤد، مشکوۃ المصابیح، ص:۱۶۳۔

(۲) سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، (بجز حصۂ اخیر: سوال درست نہیں الخ) مشکوۃ المصابیح، ص:۱۶۳

(۳) کتاب وقیع بروایت بکر بن عبد اللہ مُزَنی، کنز العمال، ج:۴، ص:۶۸، حدیث:۲۶۱۔

(۳۲) حدیث پاک میں ہے:

لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَّلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ.[1]

ترجمہ: صدقہ حلال نہیں مال دار کے لیے، نہ ایسے شخص کے لیے جو توانا و تندرست ہو۔

مذمت سوال سے متعلق احادیث بکثرت ہیں۔ پچیس حدیثیں بہار شریعت پنجم میں صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے ذکر فرمائی ہیں۔ مندرجہ بالا اکثر حدیثوں کا ترجمہ معمولی فرق کے ساتھ میں نے وہیں سے لیا ہے مزید احادیث وہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

کسب حرام کی مذمت:

(۳۳) لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حرامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلَ مِنْهُ وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكَ لَهٗ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكُهٗ خَلْفَ ظَهْرِهٖ إِلَّا كَانَ زَادَهٗ إِلَى النَّارِ.

إِنَّ اللهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالحَسَنِ، إِنَّ الخَبِيْثَ لَا يَمْحُو الخَبِيْثَ.[2]

ترجمہ: اگر کوئی بندہ مال حرام کمائے پھر اس سے صدقہ کرے تو وہ مقبول نہیں، اس سے خرچ کرے تو اس میں برکت نہ ہو اور اپنے بعد چھوڑ کر مرے تو جہنم میں اسے لے جانے کا سامان ہو (یعنی مال کی تین حالتیں ہیں اور حرام مال کی تینوں حالتیں خراب ہیں)

اللہ تعالیٰ بُرائی سے بُرائی کو نہیں مٹاتا، ہاں نیکی سے برائی کو محو فرماتا ہے، بے شک خبیث کو خبیث نہیں مٹاتا۔

(۳۴) لَا يَدْخُلُ الجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَ كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ أَوْلٰى بِهٖ۔[3]

ترجمہ: جو گوشت حرام سے اگا ہے جنت میں نہ جائے گا (یعنی ابتداءً نہ جائے گا) اور جو گوشت حرام سے اگا ہے جہنم اس کا زیادہ حق دار ہے۔

(۳۵) مَنْ لَّمْ يُبَالِ مِنْ أَيْنَ كَسَبَ المَالَ لَمْ يُبَالِ اللهُ مِنْ أَيْنَ أَدْخَلَهُ النَّارَ.[4]

ترجمہ: جسے یہ پروانہ ہو کہ مال کہاں سے حاصل کیا اس سے متعلق خدا کو بھی پروا نہیں کہ اسے کہاں

(۱) سنن ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن دارمی، بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، مسند امام احمد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، بروایت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۱۶۱۔

(۲) مسند امام احمد، شرح السنۃ، بروایت سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۲، مجلس برکات مبارک پور۔

(۳) مسند امام احمد، سنن دارمی، شعب الایمان للبیہقی، بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۳۔

(۴) مسند الفردوس للدیلمی، بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۹، حدیث:۸۷

سے جہنم میں داخل کرے۔

(۳۶) مَنِ اشْتَرٰی سَرِقَةً وَهُوَ یَعْلَمُ اَنَّهَا سَرِقَةٌ فَقَدْ شَرِكَ فِیْ عَارِهَا وَاِثْمِهَا.[۱]

ترجمہ: جس نے چوری کامال خریدا یہ جانتے ہوئے کہ چوری کامال ہے تو اس کے عار و گناہ میں وہ بھی شریک ہے۔

تجارت اور دیگر انواعِ کسب:

(۳۷) اِنَّ اَطْیَبَ الْکَسَبِ کَسَبُ التُّجَّارِ الَّذِیْنَ اِذَا حَدَّثُوْا لَمْ یَکْذِبُوْا، وَاِذَا اُئْتُمِنُوْا لَمْ یَخُوْنُوْا، وَاِذَا بَاعُوْا لَمْ یُطْرُوْا، وَاِذَا کَانَ عَلَیْهِمْ لَمْ یَمْطِلُوْا، وَاِذَا کَانَ لَهُمْ لَمْ یُعَسِّرُوْا.[۲]

ترجمہ: سب سے پاکیزہ ان تاجروں کی کمائی ہے جو بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، انھیں امانت دی جائے تو خیانت نہ کریں، وعدہ کریں تو اس کی خلاف ورزی نہ کریں، جب دوسرے سے خریدیں تو برائی نہ بیان کریں اور اپنی چیز بیچیں تو اس کی تعریف میں مبالغہ نہ کریں۔ ان پر کسی کا آتا ہو تو ادائیگی میں ٹال مٹول نہ کریں اور ان کا دوسرے پر آتا ہو تو سختی نہ کریں۔

(۳۸) اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ والصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ.[۳]

ترجمہ: راست باز، امانت دار تاجر انبیا، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔

(۳۹) اُوْصِیْکُمْ بِالتُّجَّارِ خَیْرًا فَاِنَّهُمْ بُرُدُالآفَاقِ وَاُمَنَاءُ اللهِ فِیْ الاَرْضِ.[۴]

ترجمہ: میں تم لوگوں کو تاجروں سے متعلق بھلائی کی وصیت کرتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ آفاق عالم کے قاصد اور زمین میں اللہ کے امین ہیں۔

(۴۰) اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ اَتَی جَمَاعَةً مِّنَ التُّجَّارِ، فَقَالَ: یَا مَعْشَرَ التُّجَّار! فَاسْتَجَابُوْا لَهُ، وَمَدُّوْا اَعْنَاقَهُمْ، فَقَالَ: اِنَّ اللهَ بَاعِثُکُمْ یَوْمَ القِیَامَةِ فُجَّاراً، اِلَّا مَنْ صَدَقَ وَ وَصَلَ وَفِیْ لفظ، وَ بَرَّ وَاَدَّی الاَمَانَةَ.[۵]

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ ایک جماعتِ تجار کے پاس تشریف لائے۔ فرمایا: اے گروہ تاجراں! سب نے لبیک کہی اور اپنی گردنیں دراز کرلیں۔ فرمایا: بے شک اللہ قیامت کے دن تمھیں بدکار اٹھائے گا مگر وہ جو سچ بولے،

(۱) مسند الفردوس للدیلمی، بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۹، حدیث:۷۸

(۲) مستدرک حاکم و سنن بیہقی، بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، کنز العمال ج:۴، ص:۷، حدیث:۶۵

(۳) شعب الایمان بیہقی، بروایت سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۷، حدیث:۱۴۷

(۴) سنن ترمذی، مستدرک حاکم، بروایت ابو سعید خدری، کنز العمال، ج:۴، ص:۳

(۵) مسند الفردوس، للدیلمی، بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۶، حدیث:۵۱

رشتہ جوڑے، نیک سلوک کرے اور امانت ادا کرے۔

(۴۱) عن قیس بن ابی غرزة قال: خرج علینا رسول الله ﷺ و نحن نبیع فی السوق، ونحن نسمّی السّماسرة، فقال: یا معشر التُّجَّارِ انّ سوقکم هٰذهِ یخالطها اللّغو والحلف فشوبوه بشيءٍ مّن الصّدقة او من صدقةٍ.[۱]

ترجمہ: حضرت قیس بن ابی غرزہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم پر جلوہ افروز ہوئے جب ہم بازار میں بیع کر رہے تھے۔ ہم تاجروں کو پہلے "سماسرہ" کہا جاتا تھا۔ سرکار نے فرمایا: اے تاجرو! تمھارے اس بازار میں لغو اور قسم کی آمیزش ہوتی ہے تو تم کچھ صدقہ کی آمیزش کیا کرو (یعنی راہ خدا میں کچھ دیتے رہو تاکہ تجارت کی خامیوں کی تلافی ہوا کرے)

(۴۲) علیك بالبزّ، فانّ صاحب البزّ یُعجبه انْ یکون النّاس بخیرٍ وّ فی خصبٍ.[۲]

ترجمہ: پارچہ فروشی اختیار کرو اس لیے کہ کپڑوں کا تاجر یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ خیر اور شادابی کے ساتھ رہیں۔

(۴۳) عمل الابرار من الرّجال الخیاطة، وعمل الابرار من النّساء الغزل.[۳]

ترجمہ: نیکوکار مردوں کا کام خیاطی ہے اور نکوکار عورتوں کا کام سوت کاتنا ہے۔

(۴۴) احرثوا، فانّ الحرث مبارکٌ واکثروا فیه من الجماجمِ.[۴]

ترجمہ: کاشت کرو، اس لیے کہ کاشت کاری میں برکت ہے اور کھیت میں (نظر بد کے دفعیہ کے لیے جانوروں کی) کھوپڑیاں زیادہ نصب کرو۔

(۴۵) اتّخذوا غنماً، فانّها تروح بخیرٍ وتغدو بخیرٍ.[۵]

ترجمہ: بکریاں پالو، اس لیے کہ وہ خیر کے ساتھ شام کو آتی ہیں اور خیر کے ساتھ صبح کو نکلتی ہیں۔

(۴۶) لمّا خلق اللهُ المعیشةَ جعل البرکاتِ فی الحرث والغنم.[۱]

(۱) تھذیب الآثار، ابن جریر طبری، معجم کبیر طبرانی، بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۷، حدیث:۶۷۲، ونحوہ عن غیرہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۴۔

(۲) مصنف عبد الرزاق، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۷، حدیث:۶۷۷ وابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۳، لولی الدین عبداللہ الخطیب التبریزی، تصنیف ۷۳۷ھ، اشاعت: مجلس برکات جامعہ اشرفیہ مبارک پور۔

(۳) تاریخ خطیب بغدادی، بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۸، حدیث:۱۵۳

(۴) فوائد تمام، تاریخ بغداد للخطیب، مکارم الاخلاق ابن لال، تاریخ ابن عساکر، بروایت سحل بن سعد ساعدی، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۸، حدیث:۱۵۴۔

(۵) مراسیل ابوداؤد، بروایت علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۸، حدیث:۱۵۵۔

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ نے اسباب معاش پیدا کیے تو کھیتی اور بکریوں میں برکتیں رکھیں۔

(۴۷) خير مال المرء مُهرةٌ مَّامُوْرَة أو سكّةٌ مَّابُورَة.(۲)

ترجمہ: آدمی کا بہتر مال سدھایا ہوا گھوڑے کا بچہ ہے یا گابھ لگی ہوئی کھجوروں کی قطاریں۔

(۴۸) احلُّ الكسب ما مشت فيه هاتان، يعني الرّجلينِ، وما عملت فيه هاتان يعني اليدين، وما عرقت فيه هٰذِه يعني الجبين.(۳)

ترجمہ: حلال ترین کمائی وہ ہے جس میں یہ دونوں چلیں یعنی دونوں پیر، اور جس میں یہ دونوں کام کریں یعنی دونوں ہاتھ اور جس میں یہ عرق آلود ہو، یعنی پیشانی۔

آداب معاملات:

(۴۹) رَحِمَ اللهُ رَجُلًا سَمحًا اِذَا بَاعَ، وَاِذَا اَشْتَرٰی، وَاِذَا اقْتَضٰی.(۴)

ترجمہ: خدا اس پر رحم فرمائے جو نرمی کا رویہ رکھے جب بیچے، جب خریدے اور جب تقاضا کرے۔

(۵۰) تم میں سے پہلے کے لوگوں میں ایک شخص تھا، اس کے پاس موت کا فرشتہ روح قبض کرنے آیا۔ اس سے کہا گیا، کیا تم نے کوئی کار خیر کیا ہے؟ عرض کیا: میں نہیں جانتا، فرمایا گیا: غور کرو، عرض کیا: میں تو اپنا کوئی کار خیر نہیں جانتا بجز اس کے کہ دنیا میں لوگوں سے خرید و فروخت کرتا تھا تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا، مال دار کو مہلت دیتا اور تنگ دست سے درگزر کرتا۔ یہ حضرت حذیفہ کی روایت ہے۔ (بخاری و مسلم) اس کے ہم معنی حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت ابو مسعود انصاری سے امام مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: اَنَا اَحَقُّ بِذَا مِنْكَ، تَجَاوَزُوا عَنْ عَبْدِيْ. عفو و درگزر کا میں تم سے زیادہ حق دار ہوں، اے فرشتو! میرے بندے سے درگزر کرو۔(۵)

(۵۱) كان رجل يُداينُ النّاس، فكان يقول لفتاه: إذَا أتيت معسراً تجاوز عنه لعل الله أن يتجاوز عنّا، فلقى الله فتجاوز عنه.(۶)

ترجمہ: ایک شخص لوگوں سے دَین کا معاملہ کرتا تھا تو اپنے غلام سے یوں کہتا تھا کہ جب تم کسی تنگ دست کے پاس

---

(۱) مسند امام احمد، بروایت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۸، حدیث:۱۵۷۔
(۲) مسند الفردوس للدیلمی، بروایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۸، حدیث:۱۴۱۔
(۳) مسند امام احمد، معجم کبیر طبرانی، بروایت سوید بن ہبیرہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۸، حدیث:۱۵۱۔
(۴) مسند الفردوس دیلمی، بروایت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۱۹، حدیث:۱۹۴
(۵) صحیح بخاری، بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۳۔
(۶) بخاری و مسلم، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۳۔

جاؤ تو اس سے درگزر کردیا کرو شاید اللہ ہم سے درگزر فرمائے۔ بعد موت وہ خدا سے ملا تو رب تعالیٰ نے اسے معاف کردیا۔

(۵۲) من أنظر مُعسراً أو وضع عنه أنجاه الله من كُرب يوم القيامة.(۱)

ترجمہ: جو کسی تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا دَین معاف کردے تو خدا قیامت کے کرب و غم سے اس کو نجات دے گا۔

(۵۳) مطل الغنى ظلم فاذا اتبع احدكم علىٰ مليء فليتبع.(۲)

ترجمہ: دینے میں مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ جب کوئی مدیون تم میں سے کسی کو مال دار کے پیچھے لگائے (دین کی ادائیگی اس کے حوالے کرے) تو وہ اس مال دار سے تقاضا کرے۔

(۵۴) عن جابر قال: قضاني رسول الله ﷺ وزادني.(۳)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے میرا قرض واپس کردیا اور مجھے زیادہ دیا۔

(۵۵) من كان له علىٰ رجل حقّ فمن أخره كان له بكلّ يوم صدقة.(۴)

ترجمہ: جس کا کسی پر حق آتا ہو پھر وہ اسے ادائیگی میں مہلت دے دے تو ہر روز اتنا مال صدقہ کرنے کا ثواب اسے ملے۔

(۵۶) باكروا فى طلب الرزق والحوائج فانّ الغدوّ بركة و نجاح.(۵)

ترجمہ: رزق اور حاجتوں کی طلب میں صبح سویرے نکلو، اس لیے کہ صبح کو نکلنے میں برکت اور کامیابی ہے۔

(۵۷) إذا وزنتم فارجحوا.(۶)

ترجمہ: (اے بیچنے والو!) جب تم تولو تو جھکا ہوا تولو۔

(۵۸) عن عمر قال: لا يبع فى سوقنا هٰذا إلّا من تفقّه فى الدين.(۷)

ترجمہ: امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمارے اس بازار میں وہی شخص بیع کرے جو دین میں فقاہت رکھتا ہو۔

---

(۱) صحیح بخاری و مسلم، بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۵۱۔
(۲) صحیح مسلم بروایت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۵۱، و نحوہ عن ابی الیسر عند مسلم۔
(۳) سنن نسائی حدیث:۴۶۰۵۔
(۴) صحیح بخاری و مسلم، بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۵۱۔
(۵) مصنف عبد الرزاق، کنز العمال، ج:۴، ص:۸۷، حدیث:۷۶۷، سنن ابو داؤد، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۵۳۔
(۶) مسند امام احمد بروایت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۵۳
(۷) معجم اوسط طبرانی، بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، کنز العمال، ج:۴، ص:۷۲، حدیث:۲۵۲۔

خیار شرط:

"بائع و مشتری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قطعی طور پر بیع نہ کریں بلکہ عقد میں یہ شرط کردیں کہ اگر منظور نہ ہوا تو بیع باقی نہ رہے گی۔ اسے خیار شرط کہتے ہیں۔

اور اس کی ضرورت طرفین کو ہوا کرتی ہے، کیوں کہ کبھی بائع اپنی ناواقفی سے کم داموں میں چیز بیچ دیتا ہے۔ یا مشتری اپنی نادانی سے زیادہ داموں میں خریدلیتا ہے، یا چیز کی اسے شناخت نہیں ضرورت ہے کہ دوسرے سے مشورہ کرکے صحیح رائے قائم کرے اور اگر اس وقت نہ خریدے تو چیز جاتی رہے گی۔ یا بائع کو اندیشہ ہے کہ گاہک ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ایسی صورت میں شرع مطہر نے دونوں کو یہ موقع دیا ہے کہ غور کرلیں۔ اگر نا منظور ہو تو خیار کی بنا پر بیع کو نامنظور کردیں۔"[1]

اب اس عنوان پر چند احادیث ملاحظہ ہوں:

(۵۹) المتبایعان کل واحد منهما بالخیار علیٰ صاحبه مالم یتفرقا إلّا بیع الخیار.[2]

ترجمہ: بائع و مشتری میں سے ہر ایک کو اختیار حاصل ہے جب تک جدا نہ ہوں (یعنی جب تک عقد میں مشغول ہوں عقد تمام نہ ہوا ہو) مگر بیع خیار (کہ اس میں بعد عقد بھی اختیار رہتا ہے۔ بہار شریعت، ۱۱/۳۶)

(۶۰) البیعان بالخیار مالم یتفرقا فإن صدقا و بینا بُورك لهما فی بیعهما، وإن کتما وکذبا محقت برکة بیعهما.[3]

ترجمہ: بائع و مشتری کو اختیار حاصل ہے جب تک جدا نہ ہوں۔ اگر وہ دونوں سچ بولیں اور عیب کو ظاہر کردیں تو ان کے لیے بیع میں برکت ہوگی اور اگر عیب کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو بیع کی برکت مٹادی جائے گی۔

(۶۱) الخیار ثلاثة ایام.[4]

ترجمہ: خیار تین دن تک ہے۔

(۶۲) اذا بایعت فقل لا خلابة، ثم انت بالخیار فی کل سلعةٍ ابتعتها ثلاث لیالٍ، فان

(۱) سنن ابن ماجه و مختارة الاحادیث، للضیاء المقدسی، بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کنز العمال، ج:۴، ص:۲۷، حدیث:۲۴۹۔

(۲) جامع ترمذی، کنز العمال، ج:۴، ص:۷۰، حدیث:۱۷۱۔

(۳) بہار شریعت یازدہم، صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، ص:۷،۳۶،۳، عکس طبع آگرہ۔

(۴) صحیح بخاری و صحیح مسلم، بروایت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۴

رضیت فامسك، وان سخطت فاردد.[1]

ترجمہ: جب تم کسی سے بیع کا معاملہ کرو تو یہ کہہ دو کہ "دھوکا نہیں" پھر جو سامان بھی خریدو، اس میں تمھیں تین دن اختیار ہوگا۔ اگر پسند ہو تو رکھو، ناپسند ہو تو واپس کردو۔

خیار رویت:

خیار رویت کیا ہے؟ اس سے متعلق مصنف بہار شریعت علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چیز کو بغیر دیکھے بھالے خرید لیتے ہیں اور دیکھنے کے بعد وہ چیز ناپسند ہوتی ہے، ایسی حالت میں شرع مطہر نے مشتری (خریدار) کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر دیکھنے کے بعد چیز کو نہ لینا چاہے تو بیع کو فسخ کردے۔ اس کو خیار رویت کہتے ہیں۔[2]

رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۶۳) من اشتریٰ شیئاً لم یره فهو بالخیار إذا رآهٗ إن شاء أخذه، وإن شاء ترکهٗ.[3]

ترجمہ: جس نے ایسی چیز خریدی جس کو دیکھا نہ ہو تو دیکھنے کے بعد اسے اختیار ہے، لے یا چھوڑ دے۔

بیہقی و دارقطنی نے اسے بسند ضعیف روایت کیا ہے مگر اس حدیث کو خود امام اعظم ابو حنیفہ نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

اس کی مزید تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک زمین بصرہ میں تھی۔ وہ انھوں نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیچ دی۔ کسی نے حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا اس بیع میں آپ کا نقصان ہے۔ انھوں نے کہا یہ زمین میں نے بغیر دیکھے ہوئے خریدی ہے، اس لیے مجھے اس بیع میں خیار حاصل ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی کسی نے کہا کہ اس بیع میں آپ کا گھاٹا ہے۔ انھوں نے بھی فرمایا: میں نے اپنی زمین دیکھے بغیر بیچ دی ہے، اس لیے اس بیع میں مجھے خیار حاصل ہے۔ دونوں حضرات نے اس معاملے میں جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم بنایا۔ انھوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے خیار حاصل ہونے کا فیصلہ کیا۔

یہ واقعہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سامنے ہوا کسی نے اس پر انکار نہ کیا تو گویا واقعہ کے وقت موجود تمام صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا کہ کوئی چیز بغیر دیکھے خرید لی تو خریدار کو خیار رویت حاصل ہوگا۔[4]

(۱) صحیحین، بروایت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۴

(۲) بہار شریعت مولانا امجد علی اعظمی، حصہ:۱۱، ص:۴۹

(۳) سنن بیہقی و دارقطنی، بروایت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کنز العمال، ج:۴، ص:۵۲، حدیث:۵۱۰

(۴) بہار شریعت، مولانا امجد علی اعظمی، ۱۱/۴۹--۵۰، بہ تلخیص۔ ہدایہ، برہان الدین علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی (م:۵۹۳ھ) ۳/۳۰

یہ واقعہ امام طحاوی و بیہقی نے حضرت علقمہ بن وقّاص لیثی سے روایت کیا۔[1]

خیار عیب:

عرف شرع میں عیب جس کی وجہ سے بیع کو واپس کر سکتے ہیں وہ ہے جس سے تاجروں کی نظر میں چیز کی قیمت کم ہو جائے۔

مبیع میں عیب ہو تو اس کا ظاہر کر دینا بائع پر واجب ہے، چھپانا حرام و گناہِ کبیرہ ہے۔ یوں ہی ثمن کا عیب مشتری پر ظاہر کر دینا واجب ہے۔ اگر بغیر عیب ظاہر کیے چیز بیع کر دی تو معلوم ہونے کے بعد واپس کر سکتے ہیں۔ اس کو خیار عیب کہتے ہیں۔

خیار عیب کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وقت عقد یہ کہہ دے کہ عیب ہوگا تو پھیر دیں گے، کہا ہو یا نہ کہا ہو، بہر حال عیب معلوم ہونے پر مشتری کو واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

لہٰذا اگر مشتری کو نہ خریدنے سے پہلے عیب پر اطلاع تھی، نہ وقتِ خریداری اس کے علم میں یہ بات آئی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں عیب ہے۔ تھوڑا عیب ہو یا زیادہ، خیار عیب حاصل ہے کہ مبیع کو لینا چاہے تو پورے دام پر لے لے، واپس کرنا چاہے تو واپس کر دے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ واپس نہ کرے بلکہ دام کم کر دے۔ ہاں اگر بائع نے یہ کہہ دیا ہو کہ میں اس کے کسی عیب کا ذمہ دار نہیں تو خیار عیب ثابت نہ ہوگا۔[2]

اب اس مضمون سے متعلق چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں:

(۶۴) مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْ لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللهِ، اَوْ لَمْ تَزَلِ الْمَلٰئِكَةُ تَلْعَنُه.[3]

ترجمہ: جس نے عیب والی چیز بیع کی اور اس کو ظاہر نہ کیا وہ ہمیشہ اللہ کی ناراضی میں ہے، یا فرمایا کہ ہمیشہ فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

(۶۵) اِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَرَّ عَلٰى صُبْرَةِ طَعَامٍ فَاَدْخَلَ يَدَهُ فِيْهَا، فَنَالَتْ اَصَابِعُهُ بَلَلاً فَقَالَ: مَا هٰذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟ قَالَ: أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ يَا رَسُوْلَ الله! قَالَ: اَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰى يَرَاهُ النَاس. مَنْ غَشَّنِي فَلَيْسَ مِنِّي.[4]

ترجمہ: حضور اقدس ﷺ ایک غلہ کی ڈھیری کے پاس سے گزرے، اس میں ہاتھ ڈال دیا، حضور کو انگلیوں

(۱) حاشیہ ہدایہ، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، بحوالہ تخریج زیلعی، ۲۰/۳

(۲) بہار شریعت، صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، ۶۰/۱۱-۶۱، بہ تلخیص۔

(۳) سنن ابن ماجہ، بروایت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۹

(۴) صحیح مسلم بروایت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۸

میں تری محسوس ہوئی، ارشاد فرمایا: اے غلہ والے یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس پر بارش کا پانی پڑ گیا تھا۔ ارشاد فرمایا: تو نے بھیگے ہوئے کو اوپر کیوں نہ کر دیا کہ لوگ دیکھتے، جو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں۔

(۶۶) لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ.[1]

ترجمہ: نہ خود نقصان میں پڑے نہ دوسرے کو نقصان میں ڈالے۔

(۶۷) لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ. مَنْ ضَارَّ ضَارَّهُ الله وَ مَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللهُ عَلَيْه.[2]

ترجمہ: نہ خود ضرر اٹھائے، نہ دوسرے پر ضرر ڈالے، جو ضرر پہنچائے گا اللہ اس کو ضرر پہنچائے گا، جو کسی کو مشقت میں ڈالے گا اللہ اس کو مشقت میں رکھے گا۔

(۶۸) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بشیر نامی ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ وہ تین دن تک حاضر بارگاہ نہ ہوئے۔ پھر آئے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ سرکار نے فرمایا: بشیر! تمھارا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے؟ عرض کیا: میں نے ایک اونٹ خریدا تھا وہ بھاگ نکلا، میں اسی کی تلاش میں تھا، میں نے اسے خریدتے وقت کوئی شرط نہ رکھی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: البعيرُ الشَّرودُ يرَدُّ منه. بھگوڑا اونٹ اسی عیب کی وجہ سے واپس کیا جا سکتا ہے (پہلے سے شرط ہونا ضروری نہیں)[3]

(۶۹) حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ جس نے کپڑے میں کوئی عیب پایا اسے واپس کر دے۔[4]

(۷۰) مخلد بن خُفاف کہتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریدا تھا اور اس کو کسی کام سے لگا کر اس سے کچھ آمدنی بھی حاصل کر لی تھی، پھر میں نے اس کے عیب پر اطلاع پائی، میں نے اس کا مقدمہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پیش کیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں غلام واپس کر دوں، اور اس کے ذریعہ جو آمدنی ہوئی ہے وہ بھی واپس کر دوں۔ پھر میں حضرت عروہ سے ملا اور ان کو واقعہ سنایا، انھوں نے کہا: شام کو میں عمر بن عبدالعزیز کے پاس جا کر انھیں بتاؤں گا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے معاملے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ "الخراج بالضمان" آمدنی ضمان کے ساتھ ہے۔ (یعنی جس کی ذمہ داری میں کوئی چیز ہو وہی اس کی آمدنی کا مستحق ہے، مبیع جب تک واپس نہ ہو خریدار ہی کی ضمان میں ہے) حضرت عروہ نے عمر بن عبدالعزیز کے پاس شام کو جا کر یہ بتایا تو

(۱) مسند امام احمد، سنن ابن ماجہ، بروایت عبداللہ بن عباس، و ابن ماجہ بروایت عبادۃ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہم، کنز العمال، ج:۴، ص:۳۳، حدیث:۳۰۵۔

(۲) امام مالک بروایت عمرو بن یحییٰ مازنی مرسلا و دار قطنی و حاکم و بیہقی بروایت عمرو عن ابی سعید الخدری مسندا، کنز العمال، ج:۴، ص:۳۵، حدیث:۳۲۵۔

(۳) ابن النجار، حسن بن سفیان، ابن شاہین، ابن مردویہ، ابو نعیم، کنز العمال، ج:۴، ص:۸۶، حدیث:۷۶۰-۷۶۱۔

(۴) مصنف عبدالرزاق، کنز العمال، ج:۴، ص:۸۵، حدیث:۷۵۶۔

انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آمدنی مجھے واپس ملے۔[۱]

اقالہ:

کبھی آدمی کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کے بعد افسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ معاملہ ختم ہو جائے اور میری چیز پھر سے مجھے واپس مل جائے۔ مگر تنہا وہ بیع ختم نہیں کر سکتا، جب تک دوسرا راضی نہ ہو۔ حدیث پاک میں اس کی ترغیب آئی ہے کہ کوئی اپنے معاملے پر پشیمان ہے، اس کی خاطر داری کے لیے دوسرے نے بھی موافقت کر کے معاملہ ختم کر دیا تو رب تعالیٰ کے یہاں ثواب کا مستحق ہوگا۔ دو شخصوں کے درمیان پہلے جو عقد ہوا اسی کے ختم کر دینے کو اِقالہ کہتے ہیں۔ سرکار ارشاد فرماتے ہیں:

(۱۷) مَنْ اَقَالَ مُسْلِماً اَقَالَهُ اللهُ عثْرَتَهُ يَوْمَ القِيَامَةِ.[۲]

ترجمہ: جو کسی مسلمان سے اقالہ کرے اللہ اس کی لغزش بروزِ قیامت معاف فرمائے گا۔

دیگر ذرائع کسب:

حصول مال یا تحصیل مال کے باب میں اور بھی ذرائع ہیں مثلاً: وراثت، ہبہ، صدقہ، قرض، اجارہ، شرکت، مضاربت وغیرہا۔ مصطفیٰ جان رحمت ﷺ نے ہر ایک سے متعلق ہدایات دی ہیں۔

اسی طرح بیع و شرا، اجارہ وغیرہ کی بہت سی صورتیں اور دیگر بہت سے ذرائع کو اسلام نے حرام و ناجائز قرار دیا ہے یا مکروہ و ناپسند رکھا ہے۔ مثلاً: سود، غصب، باطل و فاسد یا دھوکے والی بیعیں، لوگوں کی حاجت کے وقت غلہ روک رکھنا، اذانِ جمعہ کے بعد خرید و فروخت میں مشغول ہونا۔ ان سب سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور فقہائے اسلام کی تشریحات موجود ہیں، جن کی تفصیل کثیر صفحات اور اطمینان و سکون کے اوقات کی طالب ہے۔

ارادہ تھا کہ سب پر تھوڑی تھوڑی گفتگو کر دی جائے گی مگر بروقت اس کی بھی گنجائش نظر نہیں آتی اس لیے مختصراً عرض ہے کہ رحمۃ للعالمین ﷺ نے اپنے ارشادات میں ان حقائق کی تعلیم دی ہے:

(۱) مال اللہ کا عطیہ ہے۔ اس کی تحصیل اور اس کے خرچ میں وہی طریقہ اپناؤ جو رب نے پسند فرمایا ہے اور جس کی اس نے اجازت دی ہے۔ وہی تمھارا خالق و مالک ہے۔ وہی ہر لمحہ تمھاری پرورش کرنے والا ہے۔ تمھارا جسم، تمھاری جان، تمھارا مال، تمھاری صحت، تمھاری قوت، سب اسی کا عطیہ ہے۔ تھوڑی مدت اور قلیل عرصۂ حیات کے لیے اس نے تمھیں مختار بنا دیا تو اپنے آغاز و انجام کو فراموش کر کے رب کی نافرمانی میں نہ پڑو، ورنہ اس جہان فانی چند

(۱) شرح السنة للبغوی، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۴۹۔

(۲) سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، مشکوۃ المصابیح، ص:۲۵۰۔

روزہ کے بعد ایک اور جہان ہے جو غیر فانی اور جاودانی ہے۔

(۲) ہر اس ذریعہ سے بچو جس میں خدا کی ناراضی اور اس کا غضب ہو۔

(۳) باہمی ہم دردی، ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، فرائض الٰہیہ کی بجا آوری، خلق خدا پر شفقت و رحمت، اور تنگ دستوں کی اعانت کبھی نہ بھولو۔ اسی سے خلق اور خالق کے یہاں تمھیں وقار اور اعتبار حاصل ہو سکتا ہے۔

(۴) کسی پر ظلم، کسی کے ساتھ غدر و بد عہدی ہر گز نہ کرو، پڑوسیوں، قرابت داروں اور حاجت مندوں سے بے پروائی نہ برتو۔ فریب اور دھوکے والا معاملہ کبھی نہ کرو۔

(۵) نزاعی معاملات کا تصفیہ اس اصول پر ہو کہ "لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ" نہ خود ضرر اٹھانا ہے نہ کسی اور کو ضرر میں ڈالنا ہے۔

(۶) تم پر کسی بندے کا حق آتا ہے تو ادائیگی یا صاحب حق کی معافی کے بغیر دنیا تو دنیا قیامت میں بھی چھٹکارا نہ ہوگا۔ اس لیے دنیا سے جاؤ تو اس حال میں جاؤ کہ تمھاری گردن کسی کے دَین اور کسی کے حق میں پھنسی ہوئی نہ ہو۔

(۷) تمھارا کسی پر حق آتا ہو تو نرمی و چشم پوشی سے کام لو۔ ہو سکے تو معاف کر دو یا کچھ کمی کر دو یا کچھ عرصہ کے لیے مہلت ہی دے دو۔ سخاوت اور کشادہ دلی خدا کو محبوب ہے۔ بخل اور تنگ دلی رب کو ناپسند ہے اور تمھیں دنیا کا سارا مال و منال چھوڑ کر اسی کے حضور حاضر ہونا ہے۔ اس لیے اس کے یہاں سرخ روئی کی فکر کرو اور وہاں کی رسوائی سے ڈرو۔

وصلی الله تعالیٰ علیٰ سید المرسلین، رحمة للعالمین، أفضل الهادين، أكرم الأولين، والآخرين وعلى آله وصحبه اجمعين.

توحید-تصوف اور اہل تصوف[1]

کچھ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تصوف یا طریقت، شریعت سے کوئی جدا راہ ہے اس خیالؔ کو ان غلط کار متصوفوں نے بھی شہرت دی جو یہ کہتے ہیں کہ شریعت راہ ہے اور طریقت منزل۔ جو منزل تک پہنچ گیا اسے راہ کی کیا ضرورت؟ وہ اپنے کو تمام احکام و فرائض سے آزاد سمجھتے ہیں۔ در حقیقت یہ زَندقہ ہے، صوفیہ نے کبھی یہ معنی بیان نہ کیا، نہ ہی وہ طریقت کو شریعت سے بے نیاز سمجھتے ہیں، نہ ہی تصوف کو کتاب و سنت کی تعلیم سے الگ شمار کرتے ہیں۔ بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ جس طریق کو شریعت رد کردے وہ الحاد و زندقہ ہے، جو کشف معیار شرع پر پورا نہ اترے مکرِ شیطان ہے۔ تصوف کے تعارف میں تعبیرات بہت آئی ہیں مگر سب کا حاصل اور مآل ایک ہی ہے۔ یہاں دو تین کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عارف باللہ امام عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں:

"التصوف إنما هو زبدة عمل العبد بأحكام الشريعة."[2]

تصوف کیا ہے؟ بس احکام شریعت پر بندے کے عمل کا خلاصہ ہے۔

ابو عبداللہ محمد بن خفیف ضبّی قُدِّسَ سِرُّہ فرماتے ہیں:

"التصوف تصفية القلب، واتباع النبي صلى الله تعالى عليه وسلم في الشريعة."[3]

تصوف اس کا نام ہے کہ دل صاف کیا جائے اور شریعت میں نبی ﷺ کی پیروی ہو۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی قُدِّسَ سِرُّہ فرماتے ہیں:

"التصوف عبارة عن تجرد القلب لله تعالى، واستحقار ماسوى الله، وحاصله يرجع إلى عمل القلب والجوارح، ومهما فسد العمل فات الأصل."[4]

تصوف اس کا نام ہے کہ دل خدا کے لیے خالی ہو اور ماسوی اللہ کو خاطر میں نہ لائے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ

(۱) سال نامہ اہل سنت کی آواز، مار ہرہ مطہرہ، شعبان ۱۴۲۵ھ/اکتوبر ۲۰۰۴ء۔
(۲) طبقات الشافعیۃ الکبری، ص ۴۔
(۳) الطبقات الکبری للامام الشعرانی، ص ۱۸۔
(۴) احیاء علوم الدین، ج: ۲، ص: ۲۴۹، باب فوائد السفر وفضلہ ونیتہ۔

قلب اور اعضا سے متعلق اعمال و افعال درست ہوں۔ جب عمل فاسد ہوگا تو اصل ہی فوت ہو جائے گی۔

صوفیۂ کرام شریعت پر مضبوطی سے استقامت ہی کو خدا تک رسائی کا سب سے قریب ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:

"اقرب الطرق إلى الله لزوم قانون العبودية والاستمساك بعروة الشريعة."[1]

اللہ عزوجل کی طرف سب سے قریب راستہ قانون بندگی کو لازم پکڑنا اور شریعت کی گرہ کو تھامے رہنا ہے۔

شریعت پر استقامت اسی وقت صادق ہوگی جب ظاہر و باطن دونوں احکام الٰہی کے پابند ہوں۔ باطن اخلاق ذمیمہ سے منزہ ہو اور ظاہر اوصاف حمیدہ سے آراستہ - صرف چند فرائض و واجبات کی ادائگی اور چند ممنوعات و حرام سے پرہیز کر لینے سے شریعت کی پابندی کسی فقیہ کی نظر میں بھی کامل نہیں ہوتی، کسی عارف کے نزدیک کیا ہوگی؟ - کچھ اوصاف ذمیمہ کو دیکھیے جن سے بچنا اہل ظاہر کے نزدیک بھی ضروری ہے مگر کتنے ہیں جو اس پر پورے اترتے ہیں۔ بلکہ کتنے ہیں جو ان کے نام بھی ذہن میں رکھتے ہیں؟

اوصاف ذمیمہ:

(۱) رِیا (۲) عُجب (۳) حسد (۴) کینہ (۵) تکبر (۶) حُبِّ مدح (۷) حُبِّ جاہ (۸) محبت دنیا (۹) حُبِّ شہرت (۱۰) تعظیم اُمرا (۱۱) تحقیر مساکین (۱۲) اتباع شہوات (۱۳) مُداہَنت (۱۴) کفرانِ نعم (۱۵) حرص (۱۶) بخل (۱۷) طول امید (۱۸) سوے ظن (۱۹) عناد حق (۲۰) اصرار باطل (۲۱) مکر (۲۲) غدر (۲۳) خیانت (۲۴) غفلت (۲۵) قَسوت (۲۶) طمع (۲۷) تملق (۲۸) اعتماد خلق (۲۹) نسیان خالق (۳۰) نسیان موت (۳۱) جرأت علی اللہ (۳۲) نفاق (۳۳) اتباع شیطان (۳۴) بندگی نفس (۳۵) رغبتِ بطالت (۳۶) کراہت عمل (۳۷) قلت خشیت (۳۸) جزع (۳۹) عدم خشوع (۴۰) غضب للنفس (۴۱) تساہل فی اللہ، وغیرھا۔

ان سب سے باطن کو پاک کرنا اور پاک رکھنا ضروری ہے۔ صوفیہ اس کا اپنے نفس سے ہر وقت محاسبہ کرتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں کہ کسی چور دروازے سے اس طرح کا کوئی عیب تو نہیں در آیا۔ جس شخص میں باطن کا احتساب اور ہر لمحہ اس کی نگرانی نہ ہو اکثر ان آفات کا شکار ہو کر ان کا عادی بن جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اب بھی متقی و صاحب فلاح ہوں جب کہ وہ اپنے تقویٰ کا سونا بہت پہلے کھو چکا، یا یہ زر خالص کبھی اس کے ہاتھ ہی نہ آیا مگر یہاں پر اہل تصوف کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے جو محاسبہ و مراقبہ کا ثمرہ ہے۔

(۱) بھجۃ الاسرار للعلامہ ابی الحسن علی الشطنوفی، ص: ۵۰.

اخلاق حمیدہ:

اب یہ دیکھیے کہ اہل تصوف طالب سلوک کو کن اخلاق حمیدہ سے آراستگی کی تاکید فرماتے ہیں۔

حضرت میر عبد الواحد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۱۷ھ) فرماتے ہیں:

طالب صادق کو چاہیے کہ مکارم اخلاق حاصل کرے اور مقامات واحوال کی مشق کرے، مکارم اخلاق یہ ہیں:

(۱)رافت (۲)محبت (۳)شجاعت (۴۳)چشم پوشی (۵)پردہ پوشی (۶)درگزر (۷)صبر (۸)رضا (۹)بشارت (۱۰)حلم (۱۱)تواضع (۱۲)خیر خواہی (۱۳)شفقت (۱۳)تحمل (۱۵)موافقت (۱۶)احسان (۱۷)مدارات (۱۸)ایثار (۱۹) خدمت (۲۰)اصرار الفت (۲۱)بشاشت (۲۲)کرم (۲۳)فُتوت (۲۴)بذلِ جاہ (۲۵)مروت (۲۶)کشادہ روئی (۲۷) تَوَدُّد (۲۸)عفو (۲۹)صفح (۳۰)سخا (۳۱)جود (۳۲)وفا (۳۳)حیا (۳۴)تلطف (۳۵)خوش روئی (۳۶)آہستگی (۳۷) سکینت (۳۸)وقار (۳۹)ثنا (۴۰)حسن ظن (۴۱)تصغیر نفس (۴۲)توقیرِ اخوان (۴۳)تبجیل مشائخ (۴۴)چھوٹے بڑے پر رحم (۴۵)اپنے سلوک واحسان کو حقیر سمجھنا (۴۶)اپنے ساتھ کیے گئے سلوک کو عظیم سمجھنا۔

اہل تصوف کے اخلاق وہ نہیں جن کا جھوٹے دعویدار اظہار کرتے ہیں۔ طمع کو زیادت، بے ادبی و گستاخی کو اخلاص، حق سے باہر ہونے کو شطح کہتے ہیں۔ یعنی زبان درازی و بے باکی سے ایسی بات بولنا جو دین سے نکل جانے کا سبب ہو۔ خواہش کی پیروی کو ابتلا، بد خلقی کو ہیبت، بادشاہوں سے تقرب کو مسلمانوں کی سفارش تصور کرتے ہیں۔ بخل کو دانائی سمجھتے ہیں یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو اہل معرفت کی راہ و روش سے دور ہیں۔

مقامات:

اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادات میں بندہ یہ تصور رکھے کہ میرا قیام خدائے تعالیٰ کے سامنے ہے۔

مقامات کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱) **انتباہ:** خواب غفلت سے بیداری

(۲) **توبہ:** گناہوں کو چھوڑ کر دوام ندامت کے ساتھ حق تعالیٰ کی جانب رجوع اور کثرت استغفار

(۳) **اِنابت:** غفلت سے ذکر کی جانب واپسی اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حق سے خوف کا نام توبہ اور حق کی جانب شوق کا نام انابت ہے

(۴) **وَرَع:** ایسی چیز کو ترک کر دینا جس کی حِلّت میں شبہہ ہو

(۵) **محاسبہ نفس:** نفس کے سود و زیاں اور زیادتی و کمی میں فکر و غم

(۶) **ارادت:** راحت ترک کر کے طاعت و عبادت میں دائمی محنت

(۷) **زہد:** دنیا کی حلال شہوات سے باز رہنا

(۸) **فقر:** املاک نہ رکھنا اور جو کچھ ہاتھ میں نہ ہو اس سے دل خالی رکھنا

(۹) **صِدق:** ظاہر و باطن کا یکساں ہونا

(۱۰) **تصبّر:** نفس سے وہ باتیں برداشت کرانا جو اسے ناگوار ہوں اور اسے بہ جبر تلخیوں کا جام پلانا

(۱۱) **صبر:** شکایت ترک کر دینا

(۱۲) **رضا:** بلا میں لذت پانا

(۱۳) **اخلاص:** حق سبحانہ تعالیٰ کے معاملات سے خلق کو باہر رکھنا

(۱۴) **توکل:** حق تعالیٰ کی رزاقی پر بھروسہ اور غیر سے قطع طمع۔

احوال:

یہ دلوں کے معاملات کا نام ہے یعنی ذکر کی صفائی سے دلوں میں جو واردات آتے ہیں وہ احوال ہیں۔ حضرت جنید فرماتے ہیں: حال ایک وارد ہونے والی کیفیت ہے جو دل پر اترتی ہے اور ہمیشہ نہیں رہتی۔ کچھ احوال یہ ہیں:

(۱) **مراقبہ:** صفائے یقین کے باعث پس غیب کی چیزوں کو دیکھنا

(۲) **قرب:** خدا کے سامنے ماسوا سے ہمت جمع رکھنا

(۳) **محبت:** محبوب کی پسند و ناپسند میں اس کی موافقت

(۴) **رَجا:** حق نے جو وعدہ کیا ہے اس بارے میں اس کی تصدیق

(۵) **خوف:** اللہ کی سطوت و عقوبت کے تعلق سے دلوں کا مطالعہ

(۶) **حیا:** انبساط سے دلوں کو روکنا

(۷) **شوق:** محبوب کی یاد کے وقت قلب کا ہیجان

(۸) **اُنس:** خدا کی جانب سکون پذیر ہونا اور تمام امور میں عاجزی و مسکنت برتنا

(۹) **طمانیت:** قضا و قدر کے تحت جو بھی جاری ہے اس بارے میں خدا کی جانب سکون پذیر ہونا

(۱۰) **یقین:** شک دور ہونے کے ساتھ تصدیق

(۱۱) **مشاہدہ:** یہ رویتِ یقین اور رویتِ عین کے درمیانی فاصلہ کا نام ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: خدا کی عبادت اس طرح بجالا کہ گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ مشاہدہ آخری حال ہے۔

طالب صادق کو چاہیے کہ ان تمام اخلاق، مقامات اور احوال کی مشق و عادت ڈالے تاکہ رفتہ رفتہ یہ سب اسے

حاصل ہوجائیں اور مرید حقیقی بن جائے۔ اس کے بعد کچھ اور خوشبوئیں، تابشیں، بخششیں ہوتی ہیں جن کے بیان سے عبارت قاصر ہے اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔[1]

یہ ان امور کا اجمالی بیان ہے جن کی پابندی کی ہدایت و تربیت صوفیۂ کرام فرماتے ہیں۔ غور کیجیے ان میں کون ایسا امر ہے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو یا جن سے اعتقاد میں کوئی خرابی آتی ہو۔ لیکن برا ہو صوفیہ سے عداوت کا کہ تصوف کو زَندقہ اور صوفیہ کو زَنادِقہ کے نام سے شہرت دینے کی سعی مذموم جاری ہے، حالاں کہ یہ حضرات جس شدت و استقامت کے ساتھ اسلامی عقائد و احکام کے پابند ہوتے ہیں اور ان کے افکار و اخلاق کی جو بلندی ہوتی ہے اہل ظاہر کے یہاں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا مگر جب دل سے حق و انصاف رخصت ہو چکا ہو اور قلب میں بغض وعناد کی ظلمت گھر کر چکی ہو تو اس کا کیا علاج؟

توحید اور صوفیہ:

صوفیۂ کرام کے عقائد بھی وہی ہیں جو اکابر سلف اور اَعلام امت کے ہیں، جو قرآن مجید اور سنّت نبویہ سے ماخوذ ہیں۔ ان سے وہ سر مو انحراف گوارا نہیں کرتے۔ ہاں کشف و الہام کے نتیجے میں ان پر کچھ اسرار و معارف منکشف ہوتے ہیں جن کو وہ شریعت کی میزان پر تولتے ہیں اگر وہ شریعت سے متصادم ہیں تو رد کر دیتے ہیں اور اگر موافق ہیں تو قبول کرتے ہیں مگر انھیں دوسروں پر لازم نہیں کرتے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ توحید کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟ پھر کشف و شہود کے نتیجے میں اسے وہ کہاں ترقی دیتے ہیں؟ اور ان کا یہ کشف شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟

شیخ ابوطالب محمد بن علی مکی متوفیٰ ۳۸۶ھ "قوت القلوب فی معاملة المحبوب" میں رقم طراز ہیں:

"فرض توحید یہ ہے کہ قلب اس بات کا اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے، بغیر عدد کے۔ اول ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ موجود ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ حاضر ہے غائب نہیں۔ عالم ہے جسے جہل نہیں۔ قادر ہے عاجز نہیں۔ حی ہے جس کے لیے موت نہیں۔ قیوم ہے جسے غفلت نہیں۔ حلیم ہے جس کے لیے سفاہت نہیں۔ سمیع بصیر بادشاہ ہے جس کی بادشاہت کے لیے زوال نہیں..... اس کے اسما، صفات اور انوار نہ مخلوق ہیں نہ اس سے منفصل ہیں..... وہ نہ اشیا کے لیے محل ہے نہ اشیا اس کے لیے محل ہیں۔ الخ۔ بتلخیص و ترجمہ[2]

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (علی بن محمد) ۵۶۰ھ-۶۳۸ھ) اپنے عقائد مندرجہ فتوحات مکیہ میں لکھتے ہیں:

(۱) سبع سنابل، ص: ۵۳ تا ۵۵

(۲) قوت القلوب: ابوطالب مکی، ۲/۳۶۰، اشاعت مرکز اہل سنت، پوربندر

یقیناً اللہ تعالیٰ الٰہِ واحد ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہے، وہ بیوی اور اولاد سے منزہ ہے، مالک ہے جس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہ ہے جس کا کوئی وزیر نہیں، صانع ہے جس کے ساتھ کوئی مدبر نہیں، بذاتہ موجود ہے بغیر اس کے کہ اسے کسی موجد کی احتیاج ہو بلکہ ہر موجود اپنے وجود میں اس کا محتاج ہے۔ سارا عالم اس سے موجود ہے اور وہ از خود موجود ہے۔ نہ اس کے وجود کی کوئی ابتدا ہے نہ اس کی بقا کی کوئی انتہا، بلکہ اس کا وجود، مطلق قائم بالذات ہے۔ وہ نہ جوہر ہے کہ اس کے لیے مکان مانا جائے۔ نہ عرض ہے کہ اس کی بقا محال ہو، نہ جسم ہے کہ اس کے لیے جہت اور سامنا ہو، وہ جہات و جوانب سے پاک ہے۔ دلوں اور نگاہوں سے وہ دیکھا جانے والا ہے۔ عرش پر اس کا استوا ہے جیسا اس نے فرمایا اور اس معنی کے ساتھ جو اس کی مراد ہے..... اس کا کوئی مثل نہیں جس کا تصور کیا جائے یا جس پر عقل کی دلالت ہو۔ نہ کوئی زمان اس کی تحدید کرنے والا ہے نہ کوئی مکان اس پر مشتمل ہے بلکہ اس کا وجود تھا جب کہ کوئی مکان نہ تھا اور اسی طرح وہ آج ہے اس نے تکین و مکان کی تخلیق کی اور زمانے کو پیدا کیا اور فرمایا: میں واحد حی ہوں جس پر مخلوقات کی نگہداشت گراں نہیں۔ مصنوعات کی صفت سے کوئی ایسی صفت اس کی طرف راجع نہیں جس پر وہ پہلے نہ رہا ہو۔ وہ اس سے برتر ہے کہ حوادث اس میں حلول کریں یا وہ حوادث میں حلول کرے یا حوادث اس سے قبل ہوں، یا وہ حوادث کے بعد ہو، بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ تھا اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی۔ اس لیے "قبل و بعد" زمان کے صیغے ہیں جن کو اس نے وجود بخشا۔ وہ قیوم ہے جس کے لیے نیند نہیں، قہار ہے جس کا قصد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے مثل کوئی شے نہیں۔ اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ الخ۔ بتلخیص و ترجمہ[1]

توحید اور ذات و صفات سے متعلق یہ وہی عقائد ہیں جن پر پوری امت کا اجماع قائم ہے اور صوفیہ کرام کے نزدیک بھی وہ واجب الاذعان ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عقیدۂ توحید میں صوفیہ کہاں تک ترقی کرتے ہیں؟ سیدنا میر عبدالواحد بن ابراہیم بلگرامی قُدِّسَ سِرُّہ (م ۱۰۱۷ھ) "سبع سنابل" میں ارقام فرماتے ہیں:

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا [الاحقاف: ۱۳] بے شک جنھوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر استقامت کی۔ بحر الحقائق میں اس کے تحت نقل ہے: وہ لوگ جنھوں نے استقامت اختیار کی اعضا سے ارکان شریعت کی پابندی پر، نفوس سے آداب

(۱) الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر: امام عبدالوہاب شعرانی (۸۹۸ھ — ۹۷۳ھ)، ۱/۴، طبع اول مصر ۱۳۵۱ھ۔ المطبعۃ الحجازیہ۔

طریقت سے آراستگی پر، قلوب سے تعلقات سے کنارہ کشی پر، ارواح سے انوار صفات کی تجلی پر، سرسے خالص توحید پر، خفی سے غیر سے فنا اور حق کے ساتھ بقا پر—صاحب کشف الاسرار نے فرمایا: "ربنا الله" توحید اقرار سے عبارت ہے اور "ثم استقاموا" سے توحیدِ معرفت کی جانب اشارہ ہے۔ توحید اقرار یہ ہے کہ اللہ کو یکتا کہو اور توحید معرفت یہ ہے کہ اسے یکتا پہچانو۔ یعنی ہر جہت سے اس کی وحدت کا مشاہدہ کرنے والے ہوجاؤ باوجودیکہ عالم وحدت میں جہت نہیں۔

نے جہت می گنجد ایں جانے صفت — نے تفکر نے بیاں نے معرفت
آتشے از سر وحدت بر فروخت — غیر واحد ہرچہ پیش آمد بسوخت [1]

سیدنا شاہ ابوالحسن احمد نوری قُدِّسَ سِرُّہٗ (م ۱۳۲۴ھ) فرماتے ہیں:

وحدت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وجودی دوسری شہودی۔ وجودی کے معنی یہ ہیں کہ سالک کے علم اور نظر دونوں سے اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے اس کا شعور ختم ہوجائے اور اس کی نظر و علم میں اللہ کے سوا سب کچھ فنا ہونے کے بعد ذات باری تعالیٰ باقی رہے۔ یہی سالک کے مقام کی انتہا ہے۔ اس مقام پر آنے کے بعد سالک ولی ہوجاتا ہے۔ سیر الی اللہ کے ختم ہونے کے یہی معنی ہیں اور اسی کو مقام لاہوت کہتے ہیں۔ سیر و سلوک قادریہ میں یہ چوتھا مقام ہے۔ اس کے بعد سیر فی اللہ ہے کہ اس سے مراد ذات بحت باری تعالیٰ میں، جس کی کوئی حد نہیں، ترقی حاصل کرنا شروع ہوتا ہے اور حدیث شریف: ماعرفنا حق معرفتك (ہم نے جیسا کہ تیرا حق تھا تجھے نہ پہچانا) اسی سیر کی خبر دیتی ہے۔ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ وغیرہم تمام اولیاء اللہ کا یہی مسلک ہے۔ ایک قلیل تعداد وحدت شہود کی طرف گئی ہے اور اس کو سالک کا ابتدائی مقام جانتے ہیں، وحدت شہودی کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اس میں موجودات کا انکار صرف سالک کی نظر سے ہوتا ہے اس کے علم سے نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا تمام موجودات اس کے علم میں تو باقی رہتے ہیں صرف نظر سے ختم ہوجاتے ہیں۔ نظر میں صرف ذات باری باقی رہتی ہے۔ باقی سب نظر سے ہلاک اور فانی ہوجاتے ہیں مگر سالک کے علم میں باقی رہتے ہیں۔ جیسے سورج نکلنے پر ستارے۔ کہ سب ستارے نظر سے غائب ہوجاتے ہیں، نظر کے سامنے صرف سورج ہوتا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ ستاروں کا وجود ویسے ہی باقی ہے بس نظر سے چھپ گیا ہے۔ [2]

(۱) سبع سنابل شریف: میر عبد الواحد بلگرامی، ص: ۱۴۹، عکس طبع مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۹ھ
(۲) سراج العوارف فی الوصایا والمعارف: شاہ ابوالحسن احمد نوری، ترجمہ ڈاکٹر سید محمد امین برکاتی، ص: ۶۴، ۶۵، اشاعت ممبئی ۱۹۸۶ء۔

امام احمد رضا قادری بریلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ فرماتے ہیں:

حقیقی وجود صرف اللہ کے لیے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سب سے سچی بات جو عرب نے کہی وہ لَبِید شاعر کا یہ قول ہے: "اَلا، کُلُّ شيءٍ ماخَلا اللهَ باطل." ہمارے نزدیک ثابت ہوچکا ہے کہ کلمۂ لاالہ الااللہ کا معنی عوام کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور خواص کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مقصود نہیں اور اخص الخواص کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مشہود نہیں۔ اور جو مقام نہایت تک پہنچ گئے ان کے نزدیک یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اور سب حق ہے۔ مدارِ ایمان اول پر ہے۔ مدارِ صلاح دوم پر، کمالِ سلوک سوم پر اور وصول الی اللہ کا مدار چہارم پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان چاروں معانی سے حظِّ کامل عطا فرمائے۔ اپنے احسان و کرم سے— الدولة المكية بالمادة الغيبية ۱۳۲۸ھ اشاعت و طباعت بریلی، ص: ۳۲۴۔ [1]

یہاں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ صوفیہ واجب اور ممکن میں اتحاد کے قائل ہیں، واجب کو عین ممکن اور عین ممکن کو عین واجب جانتے ہیں اور "ہمہ اوست" کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن صوفیہ کا دامن اس الزام سے بری ہے۔ وہ ممکن کو ظل، عکس، پرتو، مظہر کہتے ہیں اور ظل بہر حال اصل سے جدا اور اصل کا غیر ہوتا ہے۔ ظِلّیت کی صراحت کے باوجود ان کے کلام سے عینیت ثابت کرنا غلط ہے، اگر کسی سے کوئی ایسی عبارت منقول ہے تو اس کی تاویل ضروری ہے کیوں کہ حلول و اتحاد کی نفی میں صوفیہ کرام کی صریح عبارات موجود ہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں کہ یہ بات ملحدین نے شیخ اکبر کے خلاف پھیلائی ہے۔ امام شعرانی نے شیخ اکبر کی کتابوں سے ان کا مذہب اور حلول و اتحاد کی نفی نقل کر کے واضح کیا ہے کہ شیخ اس خیال باطل سے بلاشبہ بری ہیں۔ چند عبارتیں یہاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں: جو حلول کا قائل ہے وہ بیمار ہے کیوں کہ حلول کا قول ایک لاعلاج مرض ہے اور اتحاد کے قائل اہل الحاد ہیں جیسے حلول کے قائل اہل جہل و فضول ہیں۔ (فتوحات - باب الاسرار)

حادث حوادث سے خالی نہیں ہوسکتا اگر قدیم کا حلول حادث میں ہو تو مجسمہ کی بات درست ہوجائے۔ قدیم نہ حلول کرنے والا ہے، نہ اس میں کوئی شَے حلول کرنے والی ہے.... عاشق جب کہتا ہے "انا مَن اَهوَى، ومَنْ اهوىٰ انا" تو یہ زبان عشق و محبت کا کلام ہے۔ زبان علم و تحقیق کا کلام نہیں۔ اسی لیے ایسا قائل جب سُکر سے صَحو میں آتا ہے تو اپنے قول سے رجوع کرتا ہے۔ (فتوحات - باب الاسرار)

(۱) امام احمد رضا اور تصوف: محمد احمد مصباحی، ص: ۱۰۳، اشاعت اول المجمع الاسلامی، مبارک پور، ۱۴۰۸ھ۔

اگر یہ صحیح ہے کہ انسان، انسانیت سے اور ملک، ملکیت سے ترقی کرکے خالق جَلَّ وعَلا سے متحد ہوجائے اور خلق، حق ہوجائے تو کسی کو کسی علم پر اعتماد نہ رہے اور محال واجب ہوجائے جب کہ قلب حقائق کی کوئی راہ نہیں۔ (فتوحات باب ۳۱۴)

خلقت کبھی مرتبۂ حق عَزَّوَجَلَّ میں نہیں ہوسکتی، جیسے معلول کبھی مرتبۂ علت میں نہیں۔ (فتوحات باب ۴۸)

کمالِ عرفان یہ ہے کہ عبد اور رب دونوں کا مشاہدہ ہو، جو عارف کسی بھی وقت مشاہدۂ عبد کی نفی کرے وہ عارف نہیں۔ اس وقت وہ صاحبِ حال ہے اور صاحب حال سُکروالا ہے جسے تحقیق نہیں ہوتی۔ (لواقح الانوار)

فتوحات باب ۳۶۷ میں لکھتے ہیں: بعض مکاشفات میں میری روح کی ملاقات حضرت ہارون علیہ السلام سے ہوئی۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! آپ نے یہ کیسے کہا: "فلا تُشمِتْ بِیَ الاعداء" (مجھ پر دشمنوں کو نہ ہنسا) وہ اعدا کون ہیں جن کا آپ مشاہدہ کررہے ہیں۔ جب کہ ہم لوگوں میں سے سالک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا مشاہدہ نہیں کرتا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا۔ تم نے جو کہا تمھارے مشاہدے کے لحاظ سے صحیح ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ جب تم خدا کے سوا کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کرتے تو کیا اس وقت نفس الامر سے عالم زائل ہوگیا جیسا کہ تمھارے مشاہدے میں زائل ہے یا نفس الامر میں عالم باقی اور غیر زائل ہے۔ صرف تم اس کے مشاہدے سے محجوب ہو اس لیے کہ ایک ایسی عظیم تجلی تمھارے قلوب پر واقع ہوئی جس نے عالم کو تمھارے شہود سے روپوش کردیا؟ میں نے عرض کیا: نفس الامر میں عالم باقی و غیر زائل ہے۔ صرف ہم اس کے مشاہدے سے محجوب ہوگئے۔ فرمایا: اس شہود میں خدا سے متعلق تمھارے عرفان میں کمی ہے جس قدر کہ مشاہدۂ عالم میں کمی ہے۔ اس لیے کہ سارا عالم اللہ کی نشانی ہے۔ اس جواب سے حضرت ہارون علیہ السلام نے مجھے ایسی معرفت کا افادہ فرمایا جو مجھے پہلے حاصل نہ تھی۔ انتہی۔ سیدی علی بن وفا رحمہ اللہ فرماتے کہ اگر کلام قوم میں کہیں اتحاد کا ذکر آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے کی مراد، حق کی مراد میں فنا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں میں اتحاد ہے جب ہر ایک دوسرے کے منشا کے مطابق کام کرتا ہے۔[1]

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ حلول واتحاد کے قول سے صوفیہ کرام کس قدر دور ہیں اور ان کی جانب اس خیال باطل کا انتساب کتنا غلط اور گمراہ کن ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ صوفیہ کا یہ مذہب شریعت کے موافق ہے یا مخالف؟ اس بارے میں علامہ فضل حق خیرآبادی (۱۲۱۲ھ — ۱۲۷۸ھ) نے الروض المجود (في حقيقة الوجود) میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وحدتِ

(۱) الیواقیت والجواہر فی عقائد الاکابر، ۱/۶۳-۵۵، بتلخیص وترجمہ

وجود کو پہلے دلیل عقلی سے ثابت کیا ہے پھر اس پر کئی آیات واحادیث پیش کرکے واضح کیا ہے کہ وحدت وجود کو مانے بغیر ان نصوص کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہوسکتا۔ ملاحظہ ہو، ص: ۳۴ تا ص: ۳۶، طبع مطبع مفید الاسلام حیدرآباد، ۱۳۱۳ھ۔

میں یہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قُدِّسَ سِرُّہ کا کلام پیش کرتا ہوں جس سے توحید، وحدت اور اتحاد کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور وحدت پر دلیل سمعی بھی فراہم ہوتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

یہاں تین چیزیں ہیں توحید، وحدت، اتحاد، توحید مدار ایمان ہے اور اس میں شک کفر اور وحدتِ وجود حق ہے، قرآن عظیم واحادیث وارشادات اکابر دین سے ثابت اور اس کے قائلوں کو کافر کہنا خود شنیع خبیث کلمۂ کفر ہے۔

رہا اتحاد، وہ بے شک زندقہ والحاد، اور اس کا قائل ضرور کافر۔ اتحاد یہ کہ یہ بھی خدا، وہ بھی، سب خدا۔ ع گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ حاشا للہ! الہ، الہ ہے اور عبد عبد۔ ہرگز نہ عبد الہ ہوسکتا ہے نہ الہ عبد۔ اور وحدتِ وجود یہ کہ وہ صرف موجود واحد، باقی سب ظلال وعکوس ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ.

صحیح بخاری، وصحیح مسلم، وسنن ابن ماجہ میں ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے ہے رسول اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فرماتے ہیں: أَصدَقُ كلمةٍ قالها الشاعر كلمةُ لَبِيد: ألا، كُلّ شيءٍ ماخلا اللهَ باطل، سب میں زیادہ سچی بات جو کسی شاعر نے کہی، لَبید کی بات ہے کہ سن لو! اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا ہر چیز اپنی ذات میں بے حقیقت ہے — کتب کثیرہ مفصلہ اِصابہ، نیز مسند میں ہے: سواد بن قارب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے عرض کی:

فاشهد ان الله لاشيء غيره   وانك مامون على كل غائب

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ موجود نہیں اور حضور جمیع غیوب پر امین ہیں۔

حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے انکار نہ فرمایا۔[1]

اب مسئلے کی قدرے تفصیل اور مثال سے تفہیم بھی ملاحظہ ہو۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

یہاں فرقے تین ہیں: **ایک** خشک اہل ظاہر، کہ حق وحقیقت سے بے نصیب محض ہیں۔ یہ وجود کو اللہ ومخلوق میں مشترک سمجھتے ہیں۔ **دوم** اہل حق وحقیقت کے بمعنی مذکور قائل وحدت وجود ہیں۔ **سوم** اہل زندقہ وضلالت، الہ ومخلوق میں فرق کے منکر، اور ہر شخص وشَے کی اُلوہیت کہ مُقِر ہیں — ان کے خیال واقوال اس تقریبی مثال سے روشن ہوں گے۔

ایک بادشاہ اعلیٰ جاہ آئینہ خانہ میں جلوہ فرما ہے، جس میں تمام مختلف اقسام و اوصاف کے آئینے نصب ہیں۔ آئینوں کا تجربہ کرنے والا جانتا ہے کہ ان میں ایک ہی شَے کا عکس کس قدر مختلف طوروں پر متجلّی ہوتا ہے۔ بعض میں

(۱) فتاویٰ رضویہ، ۶/۱۳۲، ۱۳۳، سنی دارالاشاعت مبارک پور

صورت خلاف نظر آتی ہے۔ بعض میں دھندلی، کسی میں سیدھی، کسی میں الٹی، ایک میں بڑی، ایک میں چھوٹی، بعض میں پتلی، بعض میں چوڑی، کسی میں خوش نما، کسی میں بھونڈی، یہ اختلاف ان کی قابلیت کا ہوتا ہے، ورنہ وہ صورت جس کا اس میں عکس ہے خود واحد ہے، ان میں جو حالتیں پیدا ہوئیں متجلی ان سے منزہ ہے۔ ان کے الٹے، بھونڈے، دھندلے ہونے سے اس میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔ وللہ المثل الأعلیٰ. اب اس آئینہ خانہ کو دیکھنے والے تین قسم کے ہوئے۔

اول-ناسمجھ بچے:

انھوں نے گمان کیا کہ جس طرح بادشاہ موجود ہے یہ سب عکس بھی موجود ہیں کہ یہ بھی تو ہمیں ایسے ہی نظر آرہے ہیں جیسے وہ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ اس کے تابع ہیں۔ جب وہ اٹھتا ہے یہ سب کھڑے ہوجاتے ہیں، وہ چلتا ہے یہ سب چلنے لگتے ہیں۔ وہ بیٹھتا ہے یہ سب بیٹھ جاتے ہیں۔ تو عین یہ بھی اور وہ بھی۔ مگر وہ حاکم ہے یہ محکوم۔ اور اپنی نادانی سے نہ سمجھا کہ وہاں تو بادشاہ ہی بادشاہ ہے۔ یہ سب اسی کے عکس ہیں، اگر اس سے حجاب ہوجائے تو سب صفحۂ ہستی سے معدوم محض ہوجائیں گے، ہو کیا جائیں گے اب بھی تو حقیقی وجود سے کوئی حصہ ان میں نہیں۔ حقیقتاً بادشاہ ہی موجود ہے، باقی سب پرتو کی نمود ہے۔

دوم-اہل نظر و عقل کامل:

وہ اس حقیقت کو پہنچے اور اعتقاد بنائے کہ بے شک وجود ایک بادشاہ کے لیے ہے، موجود ایک وہی ہے۔ یہ سب ظل و عکس ہیں کہ اپنی حد ذات میں اصلاً وجود نہیں رکھتے۔ اس تجلی سے قطع نظر کرکے دیکھو کہ پھر ان میں کچھ رہتا ہے۔ حاشا، عدم محض کے سوا کچھ نہیں اور جب یہ اپنی ذات میں معدوم و فانی ہیں اور بادشاہ موجود، یہ اس نمودِ وجود میں اسی کے محتاج ہیں اور وہ سب سے غنی، یہ ناقص ہیں وہ تام، یہ ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں اور وہ سلطنت کا مالک، یہ کوئی کمال نہیں رکھتے، حیات، علم، سمع، بصر، قدرت، ارادہ، کلام سب سے خالی ہیں اور وہ سب کا جامع، تو یہ اس کا عین کیوں کر ہوسکتے ہیں؟ لاجرم یہ نہیں کہ یہ وہی ہیں بلکہ وہی وہ ہے اور یہ صرف اس تجلی کی نمود۔ یہی حق و حقیقت ہے اور یہی وحدت الوجود۔

سوم-عقل کے اندھے:

سمجھ کے اوندھے، ان ناسمجھ بچوں سے بھی گئے گزرے۔ انھوں نے دیکھا کہ جو صورت بادشاہ کی ہے وہی ان کی، جو حرکت وہ کرتا ہے یہ سب بھی، تاج جیسا اس کے سر پر ہے بعینہ ان کے سروں پر بھی۔ انھوں نے عقل و دانش

کو پیٹھ دے کر بکنا شروع کیا کہ یہ سب بادشاہ ہیں اور اپنی سفاہت سے وہ تمام عیوب و نقائص جو نقصانِ قوابل کے باعث ان میں تھے خود بادشاہ کو ان کا موردِ کردیا کہ جب یہ وہی ہیں تو ناقص عاجز محتاج الٹے بھونڈے بدنما دھندلے کا جو عین ہے قطعاً انھیں ذمائم سے متصف ہے۔ تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا.

انسان عکس ڈالنے میں آئینے کا محتاج ہے اور وجود حقیقی احتیاج سے پاک، وہاں جسے آئینہ کہیے وہ خود بھی ایک ظل ہے، پھر آئینے میں انسان کی صرف سطحِ مقابل کا عکس پڑتا ہے جس میں انسان کے صفات مثل کلام و سمع و بصر و علم و ارادہ و حیات و قدرت سے اصلاً نام کو بھی کچھ نہیں آتا لیکن وجود حقیقی عزّ جلالہ کی تجلی نے اپنے بہت ظلال پر نفس ہستی کے سوا، ان صفات کا بھی پرتو، ڈالا۔ یہ وجوہ اور بھی ان بچوں کی نافہمی اور ان اندھوں کی گمراہی کی باعث ہوئیں اور جن کو ہدایتِ حق ہوئی وہ سمجھ لیے کہ

یک چراغے ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

انھوں نے ان صفات اور خود وجود کی دو قسمیں کیں: حقیقی ذاتی کہ متجلّی کے لیے خاص ہے اور ظلّی عطائی کہ ظلال کے لیے ہے اور حاشا یہ تقسیم اشتراکِ معنی نہیں بلکہ محض موافقت فی اللفظ۔ یہ ہے حق و حقیقت و عین معرفت۔ وللہ الحمد۔ (۱)

ایک حدیث طبرانی نے ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی، حضور والا صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ نے فرمایا:

إنَّ اللهَ يَجْمَعُ الأوّلينَ وَالأخرينَ فِي صعيدٍ واحد ثم يُنادِی منادٍ من تحتِ العرش يا اهلَ التوحيد اِنَّ الله عزّوجلّ قَدْ عَفَا عنكم فيقوم الناسُ فيتعلّق بعضُهم ببعض فِي ظُلاماتٍ، فينادى منادٍ يا اهلَ التوحيد لِيَعْفُ بعضُكم عَنْ بعض وعَلَيَّ الثواب.

یعنی بے شک اللہ عزوجل روز قیامت سب اگلوں کو پچھلوں کو ایک زمین میں جمع فرمائے گا پھر زیر عرش سے منادی ندا کرے گا اے توحید والو! مولا تعالیٰ نے تمھیں اپنے حقوق معاف فرمائے۔ لوگ کھڑے ہوکر آپس کے مظلموں میں ایک دوسرے سے لپٹیں گے۔ منادی پکارے گا: اے توحید والو! ایک دوسرے کو معاف کردو اور ثواب دینا میرے ذمہ ہے۔ (۲)

(۱) فتاوی رضویہ: امام احمد رضا قادری بریلوی، ۹/ ۳۳۳، ۳۴۴ سنی دار الاشاعت، مبارک پور
(۲) فتاوی رضویہ: امام احمد رضا قادری بریلوی، ۹/ ۵۰، اشاعت رضا اکیڈمی، ممبئی ۱۴۱۵ھ

یہ اہلِ توحید کون ہیں جن سے حقوق اللہ بھی معاف ہوں گے اور باہمی حقوق العباد کی بھی معافی کرا کے ثواب کا پروانہ مل جائے گا؟ امام احمد رضا قُدِّسَ سِرُّہ فرماتے ہیں:

فقیر کے گمان میں حدیث مذکور میں اہل توحید سے یہی محبوبانِ خدا مراد ہیں کہ توحید خالص نام کامل، ہرگونہ شرکِ خفی واخفی سے پاک ومنزّہ انھیں کا حصہ ہے۔ بخلاف اہل دنیا جنھیں عبدالدینار، عبدالدرہم، عبدطمع، عبد ہویٰ، عبد رغب فرمایا گیا۔ وقال تعالیٰ: اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اور بے شک بے حصولِ معرفتِ الٰہی اطاعتِ ہوائے نفس سے باہر آنا سخت دشوار۔ یہ بندگانِ خدا نہ صرف عبادت بلکہ طلب و ارادات بلکہ خود اصل ہستی وجود میں اپنے رب جلّ مجدہ کی توحید کرتے ہیں۔ لااله الا الله کے معنی عوام کے نزدیک لامعبود الا الله. خواص کے نزدیک لا مقصود الا الله. اہل ہدایت کے نزدیک لامشهودَ الا الله. تو اہل توحید کا سچا نام انھیں کو زیبا۔ ولہٰذا ان کے علم کو علم توحید کہتے ہیں۔ اعجب الامداد في مُكفِرات حقوق العباد (۱۳۱۰ھ) مشمولہ فتاویٰ رضویہ۔[1]

اب تک جو بیانات واقتباسات درج ہوئے ان سے صوفیہ کے مسلک توحید پر بخوبی روشنی پڑتی ہے اور چند باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں:

۱- توحید کے بارے میں جو عام امت کا عقیدہ ہے کہ لامعبود الا الله، صوفیہ بھی اسے پورے یقین واذعان کے ساتھ مانتے ہیں۔

۲- اہل سلوک اپنی ترقی معرفت کے نتیجے میں اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ لا معبود الا الله ماننے کے ساتھ لاموجودَ الا الله کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے قائل ہوتے ہیں۔

۳- صوفیہ عالم کے وجود وایجاد کے منکر نہیں لیکن حقیقی وذاتی وجود صرف وجودِ واجب کو مانتے ہیں۔ اور ظلی وعطائی وجود عالم کے لیے تسلیم کرتے ہیں۔

شیخ مجدد فرماتے ہیں: ممکن کے پاس جو کچھ بھی ہے حضرتِ وجوب سے مستفاد ہے، وہ اپنے باپ کے گھر سے کچھ نہیں لایا ہے۔ ظلّیت کا لحاظ کیے بغیر اسے موجود خارجی کہنا امر دشوار ہے اور واجب تعالیٰ کے ساتھ اس کے سب سے اخص وصف میں ممکن کو شریک ٹھہرانا بھی ہے۔

(۱) فتاویٰ رضویہ: امام احمد رضا قادری بریلوی، ۹/۵۲، ۵۳، اشاعت رضا اکیڈمی ۱۴۱۵ھ

تعالیٰ الله عن ذلك علوّا كبيرا.[1]

۴- ان کے اس کشف وشہود کو شریعت رد نہیں کرتی۔ بلکہ کتاب وسنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۵- صوفیہ کرام میں سے کوئی بھی واجب وممکن کے اتحاد کا قائل نہیں بلکہ یہ اہل الحاد کا قول ہے کہ من وتو، این وآں سب ایک ہے۔ صوفیہ کا دامن اس الحاد سے پاک ہے۔

۶- اہل تصوف اس کو بھی باطل مانتے ہیں کہ رب کا حلول کسی شَے میں ہو، یا کوئی شَے رب میں حلول کرے۔ رب نہ حوادث کا محل ہے، نہ حوادث رب کا محل ہیں۔ حوادث کو رب کا مکان ومحل ماننا گمراہ مجسمہ کا مذہب ہے (جس میں ابن تیمیہ اور اس کے اتباع داخل ہیں) صوفیہ کرام اور تمام سلف ایسے باطل عقیدے سے بری ہیں۔

۷- صوفیہ کی توحید ایسے اعلیٰ درجہ پہ ہے کہ خفی واخفی ہر قسم کے شرک سے پاک وصاف ہے۔

☆☆☆

(۱) مکتوبات امام ربانی: شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ) دفتر دوم، مکتوب ۹۸، ص: ۲۵۵ مطبع ایجوکیشنل کراچی۔

تصوف-روح اسلام[1]

صوفیہ اہل اسلام کی اس پاکیزہ جماعت کا نام ہے جس نے رب کی معرفت، رسول کی پیروی، خلق کی ہدایت اور بندگان خدا کی خدمت میں وہ مقام حاصل کیا جو دوسروں کو حاصل نہ ہوا۔ اکناف عالم میں اسلام کی اشاعت ان ہی کی بلند کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ان کی صاف دلی، سلامت روی اور بلند اخلاقی سے اپنے تو اپنے غیر بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ خود برصغیر ہند و پاک میں آج اسلام و سنت کی جو روشنی نظر آرہی ہے، اس میں سلاطین کی تگ و دو سے زیادہ صوفیہ کرام کی مساعی جمیلہ کا حصہ ہے۔

صوفیہ کرام کی عظمت سے متعلق چند اہم شہادتیں:

(۱) حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۴۵۰ھ۔۵۰۵ھ) وہ جلیل القدر بزرگ ہیں جنھوں نے رسمی علوم اور فنون بھی حاصل کیے۔ اور "تہافت الفلاسفہ" لکھ کر اسلام کی وہ عظیم خدمت انجام دی کہ فلسفیوں کا تعمیر کردہ صدیوں کا محل منہدم ہو گیا۔ کوئی باطل فرقہ نہ ہوگا جس کی بیخ کنی میں انھوں نے اپنی کوشش و ہمت صرف نہ کی ہو۔ اکابر علما ان کی تعظیم کرتے، اہم منصب اور عزت و شوکت انھیں حاصل تھی۔ مگر یہ اچھے سے اچھے مقام اور حقیقی و غیر متزلزل یقین کے طالب تھے مدتوں نظر و خوض کے بعد انھیں اپنی حالت سے بے رغبتی بڑھتی گئی اور اعلیٰ کی طلب میں نکلے، بڑی جانچ پڑتال کے بعد ان پر یہی منکشف ہوا کہ صوفیہ کا طریقہ ہی سب سے افضل و اعلیٰ ہے اس لیے اس کو اختیار کیا اور اسی پر وفات پائی۔

المنقذ من الضلال میں خود فرماتے ہیں:

مجھے اس بات کا علم قطعی و یقینی حاصل ہو گیا کہ صرف صوفیہ ہی وہ ہیں جو راہ خدا پر گامزن ہیں، ان کا راستہ سب سے زیادہ صحیح اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اگر تمام عقلا کی عقل، حکما کی حکمت اور اسرار شریعت سے آگاہ علما کا علم جمع ہو کر بھی ان کے اخلاق و کردار اور سیرت و روش کو بدلنے اور اس سے بہتر بنانے کی سعی کرے تو نہ ہو سکے، اس لیے کہ ان کی ظاہری و باطنی ہر روش اور ہر حرکت و سکون مشکاۃ نبوت کے نور سے حاصل شدہ ہے اور

---
(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، جولائی ۲۰۱۲ء

روے زمین پر نور نبوت کے سوا کوئی ایسا نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔

کہنے والا اس طریقے کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ قلب کو پورے طور پر ماسوی اللہ سے پاک کیا جائے اور نماز کی کلید تکبیر تحریمہ کی طرح اس مشرب کی کلید یہ ہے کہ دل یاد الٰہی میں مستغرق ہو اور آخری درجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات میں بالکلیہ فنا ہو جائے۔ یہ مقام تمام اختیاری درجات کی بہ نسبت سب سے اعلیٰ و اقویٰ ہے۔

(۲) امام یافعی عبداللہ بن اسعد یمنی فرماتے ہیں:

"اہلِ طریقت پر ان نادانوں کا اعتراض ایسا ہی ہے جیسے کوئی مچھر کسی پہاڑ پر بار بار پھونک مارے اور یہ چاہے کہ اس کے اس پھونکنے سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے گا۔" (الیواقیت والجواہر فی عقائد الاکابر، ص:۹)

(۳) مجد الدین فروز آبادی صاحب قاموس فرماتے ہیں:

"کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنی نظر قاصر کی رو سے صوفیہ کرام پر نکیر و اعتراض روا رکھے اس لیے کہ وہ فہم و کشف میں بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اہل تصوف میں کسی سے متعلق ہمیں یہ خبر نہ ملی کہ انھوں نے کسی ایسی بات کا حکم دیا ہو جو دین سے متصادم ہو، نہ ہی یہ کہ انھوں نے کسی کو وضو سے یا نماز سے روکا ہو یا ان کے علاوہ فرائض اسلام یا مستحبات سے منع کیا ہو۔" (یواقیت، ص:۱۲)

(۴) شیخ الاسلام مخزومی فرماتے ہیں:

"کسی عالم کے لیے صوفیہ پر اعتراض روا نہیں جب تک کہ ان کی راہ پر نہ چلے یا ان کے افعال و اقوال کو کتاب و سنت کے خلاف نہ پائے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ صوفیہ پر اعتراض کی ہمت کرنے سے پہلے ستر باتوں سے آگاہ ہونا شرط ہے پھر کہیں معترض کے لیے اعتراض کی اجازت ہوگی۔ ان باتوں کے تحت لکھتے ہیں:

(الف) رسولوں کے اختلاف درجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے معجزات اور اولیا کے درجات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی کرامات کی معرفت میں غواصی کرے اور ان پر ایمان لائے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اولیا تمام معجزات میں انبیا کے وارث ہیں مگر وہ جو مستثنیٰ ہیں۔

(ب) تفسیر و تاویل کی کتابوں اور ان کے شرائط سے آگاہ ہو، زبان عرب کی معرفت میں تبحر رکھتا ہو، مجازات و استعارات سے آشنائی میں درجۂ انتہا کو پہنچ چکا ہو۔

(ج) صفات باری سے متعلق آیات و اخبار میں سلف و خلف کے مقامات سے خوب آشنا ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس نے ظاہر کو لیا، کس نے تاویل کی، کس کی دلیل زیادہ راجح ہے۔

(د) اہل اصول کے علم میں تبحر اور ائمہ کلام کے منشاے کلام کا عارف ہو۔

(ہ) سب سے اہم شرط یہ ہے کہ صوفیہ کی اصطلاحات سے آگاہ ہو، تجلی ذاتی، تجلی صوری، ذات، ذات الذات، حضرات اسماوصفات، حضرات و درجات کے فرق، احدیث وحدانیت، واحدیت کے فرق سے آشنا ہو، ظہور وبطون، ازل وابد، عالم غیب وکون وشہادت، شئون، علم ماہیت وہویت، شکر ومحبت وغیرہ اصطلاحات کے معانی جانتا ہو اور یہ بھی معرفت رکھتا ہو کہ کون شکر میں سچا اور قابل درگزر ہے، کون جھوٹا اور قابل گرفت ہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو شخص ان حضرات کی مراد ہی سے بے خبر ہو وہ ان کا کلام کس طرح حل کر سکے گا۔ ہوگا یہ کہ ایسا معنی لے کر ان پر اعتراض کر بیٹھے گا جو ان کی مراد نہیں۔ انتہیٰ۔ (یواقیت)

آج کے غیر مقلدین اصطلاحات صوفیہ کو کیا جانیں، انھیں تو ظاہری اور مروج علوم کی اصطلاحات اور ان کے معانی واسرار کا بھی پتہ نہیں۔ علامہ ابن حجر عسقلانی (م:۸۵۲ھ) جیسے عظیم محدث وفقیہ اور ماہر کامل کا قصہ سنیے انھوں نے حضرت ابن الفارض کے قصیدۂ تائیہ کے کچھ اشعار کی شرح لکھی اور شیخ مدین رحمۃ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اجازت لکھنے کے لیے پیش کیا انھوں نے اوپر یہ لکھا کہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

سارت مشرقة و سرت مغربا

شتّان بين مشرق و مغرب

وہ مشرق کی سمت گئی اور میں مغرب کو چلا۔ مشرق ومغرب میں کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

یہ لکھ کر انھوں نے علامہ ابن حجر کے پاس بھیج دیا۔ جسے دیکھنے کے بعد انھیں اس بات پر انتباہ ہوا جو پہلے ان کی نظر سے اوجھل رہ گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے صوفیہ کی محبت اور حضرت سیدی مدین کی رفاقت اختیار کرلی اور اسی طریق پر دم واپسیں آیا۔ (یواقیت، ص:۱۲)

(۵) امام جلیل محی الدین ابوزکریا نووی (م:۶۷۶ھ) فرماتے ہیں:

کسی عاقل کے لیے اولیاء اللہ کے متعلق سوے ظن روا نہیں بلکہ اس پر لازم ہے کہ ان کے اقوال وافعال کی تاویل کرے جب تک کہ ان کے درجہ کو نہ پہنچ جائے۔ اس سے عاجز وہی ہوگا جو کم توفیق ہو۔

شرح مہذب میں فرماتے ہیں: تاویل ہو تو ستر وجہوں تک ان کے کلام کی تاویل کی جائے۔ لیکن اس کے بعد اگر ہم ایک تاویل بھی قبول نہ کریں تو یہ محض بے جا تشدد ہوگا۔ (یواقیت، ص:۹)

(۶) شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام (م:۶۶۰ھ) جن کی جلالت شان محتاج بیان نہیں اپنے وقت میں مصر کے سلطان العلما تھے۔ وہ اپنی تصنیف "کتاب الرعایۃ" میں فرماتے ہیں:

سارے لوگ تو شریعت کے رسوم ونشانات پر ٹھہرے ہوئے ہیں مگر صوفیہ کرام شریعت کی ان بنیادوں پر

قرار پذیر ہیں جو غیر متزلزل ہیں، اس کی تائید ان کرامات وخوارق سے بھی ہوتی ہے جو صوفیہ کے ہاتھوں پر رونما ہوتے ہیں اور کبھی کسی عالم کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتے اگرچہ علم کی بڑی سے بڑی منزل پر پہنچ چکا ہو مگر یہ کہ وہ بھی ان کی راہ پر گامزن ہو۔

شیخ عزالدین پہلے یہ کہتے تھے کہ "ہمارے ہاتھوں میں جو شریعت کے منقولات موجود ہیں کیا ان کے علاوہ بھی شریعت کا کوئی راستہ ہے؟ جو یہ دعویٰ کرے کہ شریعت کا کوئی علم باطن بھی ہے وہ باطنی قریب بہ زندیق ہے مگر جب مصر میں شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کی ملاقات ہوئی اور ان سے تحصیل علم کی تو صوفیہ کے مداح ہو گئے اور فرمانے لگے ان کا مسلک وہ ہے جو تمام اخلاق مرسلین کا جامع ہے۔" (یواقیت، ج:۲، ص:۹۲)

(۷) ابن ایمن نے اپنے رسالے میں امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ (م:۲۴۱) سے متعلق نقل کیا ہے کہ "وہ شروع شروع میں اپنے فرزند کو صوفیہ کے پاس بیٹھنے سے منع کرتے تھے ایک بار ان کے پاس رات کے وقت فضا سے ایک جماعت اتری ان لوگوں نے امام احمد سے شرعی مسائل پوچھنا شروع کیا۔ جن کے جواب میں امام عاجز رہے پھر وہ ہوا میں پرواز کر گئے اس وقت سے اپنے فرزند کو تاکید فرمانے لگے کہ صوفیہ کی ہم نشینی اختیار کرو اس لیے کہ انھیں خدا کی خشیت اور شریعت کے وہ اسرار حاصل ہیں جو ہمیں حاصل نہیں، جب کسی مسئلہ کے حل سے قاصر ہو جاتے تو شیخ ابوحمزہ بغدادی سے فرماتے: اے! صوفی اس مسئلے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ وہ جو بتاتے امام احمد اسے اختیار کر لیتے۔ (یواقیت، ص:۹۴)

شیخ محی الدین ابن عربی (م:۶۳۸ھ)

منکرین سب سے زیادہ سید المکاشفین حضرت محی الدین ابن عربی قدس سرہ کو اپنے تیر ستم کا نشانہ بناتے ہیں اور ان کے بارے میں نہ معلوم کیا کچھ کہہ جاتے ہیں لیکن اسلام کی مستند شخصیات اور امت کے اکابر علما نے ان کے بارے میں کیا فرمایا؟ امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب "الیواقیت والجواہر فی عقائد الاکابر" سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) شام کے شیخ الاسلام حضرت سراج الدین مخزومی فرماتے ہیں:

شیخ محی الدین کے کسی کلام پر انکار سے بچو اس لیے کہ اولیا کے گوشت زہر آلود ہوتے ہیں۔ (ان کی شان میں غیبت وبدگوئی مہلک ہے) ان سے بغض رکھنے والے کے دین کی بربادی یقینی ہے، جو ان کا دشمن ہوا اسلام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، نصرانی ہو گیا اور اس پر مر گیا، جس نے بدگوئی سے ان کے بارے میں زبان درازی کی خدا نے اس کو مردہ دلی کی بلا میں ڈال دیا۔

حضرت عبداللہ قرشی فرماتے تھے: جو خدا کے کسی ولی کی تحقیر کرتا ہے اس کے دل میں ایک زہر آلود تیر مارا

جاتا ہے اور مرنے سے پہلے اس کا عقیدہ فاسد ہو جاتا ہے اور اس کا خاتمہ خراب ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

ابو تراب بخشی فرماتے تھے: جب دل میں خدا سے روگردانی کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اولیا کی شان میں بدگوئی لگ جاتی ہے۔

(۲۔۳) شیخ کمال الدین زملکانی شام کے اجلۂ علما سے تھے یہ حضرت ابن عربی کے مداح ہیں۔ شیخ قطب الدین حموی جب شام سے اپنے ملک واپس آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے شیخ محی الدین کو کیسا پایا؟ انھوں نے فرمایا: "میں نے علم و زہد اور معارف میں انھیں ایسا تلاطم خیز سمندر پایا جس کا ساحل نہیں۔"

(۴) حافظ ابو عبداللہ ذہبی ابن تیمیہ کے شاگرد جو صوفیہ سے مخالفت رکھتے تھے ان سے پوچھا گیا کہ محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب فصوص الحکم کے بارے میں کہا ہے کہ انھوں نے اسے بارگاہ نبوت سے اذن پاکر ہی تصنیف کیا اس دعویٰ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حافظ ذہبی نے فرمایا: "میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ محی الدین ابن عربی جیسا بزرگ کبھی جھوٹ بولے گا۔"

(۵) شیخ صلاح الدین صفدی نے تاریخ علماے مصر میں ان کی مدح کی اور فرمایا ہے: "جو علوم لدنیہ والوں کا کلام دیکھنا چاہے اسے شیخ محی الدین ابن عربی کی کتابیں دیکھنا چاہیے۔"

(۶) شیخ قطب الدین شیرازی فرماتے ہیں: "شیخ محی الدین شریعت و طریقت کے علوم میں رتبہ کمال پر فائز تھے ان پر وہی اعتراض کرے گا جو ان کا کلام سمجھنے سے قاصر ہو اور اس پر اعتقاد نہ رکھتا ہو اس سے ان کی شان میں کوئی خلل نہیں آتا جیسے کفار نے انبیاے کرام کی جانب جنون و سحر کی نسبت کی تو اس سے انبیا کے کمال میں کوئی خلل نہ آیا۔

(۷) امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں "شیخ محی الدین عظیم ولی تھے۔"

(۸) مجد الدین فیروزآبادی قاموس میں فرماتے ہیں:

شیخ محی الدین ایک بحر ناپیدا کنار ہیں۔ جب وہ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اس وقت شہر مبارک میں علما و محدثین جمع تھے اور ان کے درمیان جس علم میں بھی گفتگو ہوتی شیخ ہی سب کا مرجع ہوتے، تمام علما ان کی مجلس کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے آتے ان کے سامنے حاضری باعث برکت جانتے ان کی تصانیف کا ان سے درس لیتے۔ مکہ کے کتب خانوں میں آج بھی ان کی تصانیف کا موجود ہونا میری بات کا سب سے زیادہ سچا گواہ ہے۔ وہ مکہ میں زیادہ تر حدیث پاک کے سننے، سنانے میں مشغول رہتے۔ وہیں انھوں نے اپنے شاگرد بدر الدین حبشی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کتابوں کی مراجعت کے بغیر فتوحات مکیہ تصنیف فرمائی، بعد تصنیف اسے ایک سال تک کعبہ معظمہ کی چھت پر رکھا پھر اتار کر دیکھا تو جیسی رکھا تھا ویسی ہی پایا، نہ اس کا کوئی ورق بھیگا، نہ ہواؤں سے چاک ہوا

جب کہ مکہ میں بارش بہت ہوئی اور آندھیاں کثرت سے چلیں۔ اس مقبولیت کا تجربہ کر لینے کے بعد ہی انھوں نے فتوحات مکیہ کی کتابت و قراءت کی اجازت دی۔

(۹) تقی الدین سبکی فرماتے ہیں:

"شیخ محی الدین ابن عربی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ فضل و کمال نے ان کے زمانے میں اپنی ساری کنجیاں ان کے سپرد کر دی تھیں اور کہہ دیا تھا آپ کے سوا کسی سے آشنا نہیں۔"

(۱۰) شیخ سراج الدین بلقینی سے حضرت ابن عربی کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا: "شیخ محی الدین کی کسی بات پر اعتراض و انکار سے بچو۔ اس لیے کہ جب وہ معرفت اور تحقیق حقائق کے سمندروں میں غوطہ زن ہوئے تو آخر میں فصوص الحکم، فتوحات مکیہ، تنزلات موصلی وغیرہ اپنی تصانیف میں وہ عبارات تحریر فرمائیں جو ان کے ہم رتبہ اہل اشارات پر مخفی نہیں۔ ان کے بعد کچھ ایسے لوگ آئے جو ان کے مسلک سے اندھے اور بے خبر تھے۔ انھوں نے اسے غلط ٹھہرایا بلکہ ان عبارات کی وجہ سے شیخ کو کافر کہا۔ یہ لوگ نہ تو شیخ کی اصلاح سے خود آشنا تھے نہ اس راہ کے سالکین سے دریافت کیا۔"

واقعہ یہ ہے کہ شیخ کے کلام میں کچھ ایسے رموز و اشارات، روابط و ضوابط اور حذف مضافات ہیں جو ان کے اور ان کے ہم رتبہ حضرات کے علم میں معلوم ہیں اور جاہلوں کے نزدیک مجہول ہیں۔ اگر یہ لوگ ان کے کلمات کو ان کے دلائل و تطبیقات کے ساتھ دیکھتے اور ان کے نتائج اور مقدمات سے آگاہ ہوتے تو وہ ثمرات پاتے جو مقصود ہیں اور ان کا اعتقاد بھی شیخ کے اعتقاد کے برخلاف نہ ہوتا۔

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں:

امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: ہر دور میں یہ ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی شخصیت بلند مرتبہ ہوئی تو کوئی کمینہ دشمن ان کی مخالفت پر اتر آیا مثلاً:

(۱) حضرت آدم کا دشمن ابلیس۔
(۲) حضرت نوح کا دشمن حام وغیرہ۔
(۳) حضرت داؤد کا جالوت اور اس کے ہم نوا۔
(۴) حضرت سلیمان کا صخر۔
(۵) حضرت عیسیٰ کا ان کی پہلی زندگی میں بخت نصر اور دوسرے دور میں دجال۔
(۶) حضرت ابراہیم کا نمرود۔

(۷)حضرت موسیٰ کا فرعون۔

(۸)اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ لگا رہا ان کا دشمن ابو جہل ہوا۔

(۹)حضرت ابن عمر کا بھی ایک دشمن تھا جب وہ اس کے پاس گزرتے وہ مذاق کرتا۔

(۱۰)کچھ مخالفین نے حضرت عبد اللہ بن زبیر پر نماز میں ریا ونفاق کا بہتان لگایا۔ ایک بار نماز میں ان کے سر پر کھولتا پانی ڈالا جس سے ان کا چہرہ اور سر جل گیا، اور انھیں پتہ نہ چلا، نماز سے سلام پھیرا تو احساس ہوا۔ فرمایا مجھے کیا ہوگیا ہے؟ لوگوں نے قصہ بتایا، فرمایا: حسبنا اللہ ونعم الوکیل. ایک مدت تک چہرے اور سر کے درد سے پریشان رہے۔

(۱۱)حضرت ابن عباس کا دشمن نافع ابن رزق تھا وہ انھیں سخت اذیت پہنچاتا اور کہتا یہ بغیر علم کے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔

(۱۲)کوفہ کے کچھ جاہل حضرت سعد بن ابی وقاص کی عداوت پر کمر بستہ تھے، فاروق اعظم کے پاس ان کی شکایت لائے اور کہا یہ اچھی طرح نماز نہیں پڑھتے، جب کہ حضرت سعد ان دس حضرات میں سے تھے جن کے لیے سرکار نے جنت کی شہادت وبشارت دی ہے۔

ان کے بعد ائمہ مجتہدین کو دیکھیے:

(۱۳)امام اعظم ابو حنیفہ نے خلفا وسلاطین کی جانب سے جو مصائب جھیلے وہ مخفی نہیں۔

(۱۴)امام مالک اس قدر پریشان ہوئے کہ پچیس سال تک روپوش رہے، جمعہ وجماعت کے لیے بھی باہر نہ آتے۔

(۱۵)امام شافعی نے اہل عراق اور اہل مصر کی سختیاں جھیلیں۔

(۱۶)امام احمد بن حنبل نے زدو کوب اور قید وبند کی مصیبتیں اٹھائیں۔

(۱۷)امام بخاری کو اس قدر تنگ کیا گیا کہ انھیں بخارا سے خرتنگ جانا پڑا۔

(۱۸)شیخ عبد الرحمن سلمی، احمد بن خلکان، شیخ عبد الغفار قوصی اور ایسے ہی دیگر ثقات نے بیان کیا ہے کہ دشمنوں نے حضرت بایزید بسطامی کو سات بار بسطام سے شہر بدر کیا۔ اس کی تحریک وہاں کے علما کی ایک جماعت کرتی تھی۔

(۱۹)حضرت ذوالنون مصری کو بیڑی اور زنجیر ڈال کر مصر سے بغداد لے گئے۔ ان کے ساتھ اہل مصر انھیں زندیق کہتے ہوئے بغداد تک گئے۔

(۲۰)حضرت سہل بن عبد اللہ تستری کو ان کے شہر سے بصرہ کی طرف نکالا، ان پر بہت سی بری باتوں الزام لگایا اور انھیں کافر کہا۔ جب کہ ان کی امامت وجلالت شان مسلم ہے۔ تستر سے نکلنے کے بعد تا حیات وہ بصرہ ہی میں

رہے، وہیں وفات پائی۔ اسی طرح اور بہت سی نظیریں پیش کی ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی نے حضرت ابن عربی کے دفاع میں بھی ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام یہ ہے: " تنبیہ الغبی فی تبرئۃ ابن عربی "(حضرت ابن عربی کی براءت پر نادان کو تنبیہ) دوسری کتاب حضرت ابن الفارض کے دفاع میں ہے، جس کا نام ہے " قمع العارض فی نصرۃ ابن الفارض "(حضرت ابن الفارض کی حمایت اور مخالف کی بیخ کنی)(یواقیت ملخصًا)

ان بیانات سے قارئین کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ اہل حق اور ارباب فضل وکمال کی عداوت اور ان کی تحقیر وتنقیص کوئی نئی چیز نہیں خدا کے احبا و اولیا اس طرح کے مصائب ہمیشہ جھیلتے آئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ ہر دور میں اہل انصاف کی بھی ایک جماعت رہی جس نے اہل کمال کے کمالات تسلیم کیے اور ان کے فضل وکمال کی کھلی گواہی دی اور ان کے مخالفین کا رد بھی کیا خصوصًا صوفیہ اور عرفا کی ہر دور میں اگر کچھ قاصرین نے مخالفت کی ہے تو بہت سے کاملین نے ان کی مدح سرائی بھی کی ہے۔ مخالفین تو گوشہ گمنامی میں مرکھپ گئے لیکن ان اولیاء اللہ اور ان کے حامیوں کی جلالت شان کا ڈنکا آج بھی بج رہا ہے۔ چند لامذہبوں کے شور وشغب سے صوفیہ وعرفا کی عظمت ومعرفت کا آفتاب کبھی دھندلا نہیں ہوتا۔ فرقہ لامذہبیاں کو اس قعر مذلت وسفاہت اور حال عناد وعداوت میں چھوڑیے اور آئیے ارباب حقیقت ومعرفت کی عظمت کا کچھ تذکرہ سنیے۔

تصوف اور صوفیہ کرام:

کچھ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تصوف یا طریقت، شریعت سے کوئی جدا راہ ہے۔ اس خیال کو ان غلط کار متصوفوں نے بھی شہرت دی جو یہ کہتے ہیں کہ شریعت راہ ہے اور طریقت منزل، جو منزل تک پہنچ گیا اسے راہ کی کیا ضرورت؟ وہ اپنے کو تمام احکام وفرائض سے آزاد سمجھتے ہیں، در حقیقت یہ زندقہ ہے، صوفیہ نے کبھی یہ معنی بیان نہ کیے نہ ہی وہ طریقت کو شریعت سے بے نیاز سمجھتے ہیں، نہ ہی تصوف کو کتاب وسنت کی تعلیم سے الگ شمار کرتے ہیں۔ بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ جس طریق کو شریعت رد کردے وہ الحاد وزندقہ ہے، جو کشف معیار شرع پر پورا نہ اترے مکر شیطان ہے۔

تصوف کے تعارف میں تعبیرات بہت آئی ہیں مگر سب کا حاصل اور مآل ایک ہی ہے، یہاں دو تین کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ عارف باللہ امام عبد الوہاب شعرانی فرماتے ہیں:

"التصوف إنما هو زبدة عمل العبد بأحكام الشريعة" تصوف کیا ہے؟ بس احکام شریعت پر بندے کے عمل کا خلاصہ ہے۔ (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ص:۴۰)

ابو عبد اللہ محمد بن خفیف ضبی قدس سرہ فرماتے ہیں:

"التصوف تصفية القلب، واتباع النبى ﷺ فى الشريعة" تصوف اس کا نام ہے کہ دل صاف کیا جائے اور شریعت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہو۔ (الطبقات الکبریٰ امام الشعرانی، ص:۱۸)

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی قدس سرہ فرماتے ہیں:

"التصوف عبارة عن تجرد القلب لله تعالىٰ، واستحقار ماسوى الله وحاصله يرجع إلىٰ عمل القلب والجوارح، ومهما فسد العمل فات الأصل."

(إحياء علوم الدين، ج:۲، ص:۲۴۹، باب فوائد السفر وفضله ونيته)

تصوف اس کا نام ہے کہ دل خدا کے لیے خالی ہو اور ماسوی اللہ کو خاطر میں نہ لائے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ قلب اور اعضا سے متعلق اعمال وافعال درست ہوں۔ جب عمل فاسد ہوگا تو اصل ہی فوت ہو جائے گی۔

صوفیہ کرام شریعت پر مضبوطی سے استقامت ہی کو خدا تک رسائی کا سب سے قریب ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:

"أقرب الطرق إلى الله لزوم قانون العبودية والاستمساك بعروة الشريعة" اللہ عزوجل کی طرف سب سے قریب راستہ قانون بندگی کو لازم پکڑنا اور شریعت کی گرہ کو تھامے رہنا ہے۔

(بهجة الأسرار للعلامة أبي الحسن على الشطنوفى، ص:۵۰)

شریعت پر استقامت اسی وقت صادق ہوگی جب ظاہر وباطن دونوں احکام الٰہی کے پابند ہوں، باطن اخلاق ذمیمہ سے منزہ ہو اور ظاہر اوصاف حمیدہ سے آراستہ، صرف چند فرائض وواجبات کی ادائیگی اور چند ممنوعات وحرام سے پرہیز کر لینے سے شریعت کی پابندی کسی فقیہ کی نظر میں بھی کامل نہیں ہوتی کسی عارف کے نزدیک کیا ہوگی؟ کچھ اوصاف ذمیمہ کو دیکھیے جن سے بچنا اہل ظاہر کے نزدیک بھی ضروری ہے مگر کتنے ہیں جو اس پر پورے اترتے ہیں، بلکہ کتنے ہیں جو ان کے نام بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

اوصاف ذمیمہ:

(۱) ریا (۲) عجب (۳) حسد (۴) کینہ (۵) تکبر (۶) حبّ مدح (۷) حبّ جاہ (۸) محبت دنیا (۹) حبّ شہرت (۱۰) تعظیم امرا (۱۱) تحقیر مساکین (۱۲) اتباع شہوات (۱۳) مداہنت (۱۴) کفران نِعَم (۱۵) حرص (۱۶) بخل (۱۷) طول امید (۱۸) سوے ظن (۱۹) عناد حق (۲۰) اصرار باطل (۲۱) مکر (۲۲) غدر (۲۳) خیانت (۲۴) غفلت (۲۵) قسوت (۲۶) طمع (۲۷) تملّق (۲۸) اعتماد خلق (۲۹) نسیان خالق (۳۰) نسیان موت (۳۱) جرأت علی اللہ (۳۲) نفاق (۳۳) اتباع شیطان (۳۴) بندگی نفس (۳۵) رغبت بطالت (۳۶) کراہت عمل (۳۷) قلت

خشیت (۳۸) جزع (۳۹) عدم خشوع (۴۰) غضب للنفس (۴۱) تساہل فی اللہ وغیرہا۔

ان اوصاف ذمیمہ سے باطن کو پاک کرنا اور پاک رکھنا ضروری ہے۔ صوفیہ اس کا اپنے نفس سے ہر وقت محاسبہ کرتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں کہ کسی چور دروازے اس طرح کا کوئی عیب تو نہیں در آیا۔ جس شخص میں باطن کا احتساب اور ہر لمحہ اس کی نگرانی نہ ہو اکثر ان آفات کا شکار ہو کر ان کا عادی بن جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اب بھی متقی وصاحب فلاح ہوں جب کہ وہ اپنے تقویٰ کا سونا بہت پہلے کھو چکا، یہ زر خالص کبھی اس کے ہاتھ ہی نہ آیا مگر یہاں پر اہل تصوف کی گرفت بہت زیادہ مضبوط ہوتی ہے جو محاسبہ ومراقبہ کا ثمرہ ہے۔

اب دیکھیے کہ اہل تصوف طالب سلوک کو کن اخلاق حمیدہ سے آراستگی کی تاکید کرتے ہیں۔ حضرت میر عبد الواحد بلگرامی رحمۃ اللہ (م ۱۰۱۷ھ) فرماتے ہیں:

"طالب صادق کو چاہیے کہ مکارم اخلاق حاصل کرے اور مقامات واحوال کی مشق کرے۔"

اخلاق حمیدہ: (۱) رافت (۲) محبت (۳) شجاعت (۴) چشم پوشی (۵) پردہ پوشی (۶) درگزر (۷) صبر (۸) رضا (۹) بشارت (۱۰) حلم (۱۱) تواضع (۱۲) خیر خواہی (۱۳) شفقت (۱۴) تحمل (۱۵) موافقت (۱۶) احسان (۱۷) مدارات (۱۸) ایثار (۱۹) خدمت (۲۰) الفت (۲۱) بشاشت (۲۲) کرم (۲۳) فتوّت (۲۴) بذل جاہ (۲۵) مروت (۲۶) کشادہ روئی (۲۷) تودّد (۲۸) عفو (۲۹) صفح (۳۰) سخا (۳۱) جود (۳۲) وفا (۳۳) تلطف (۳۵) خوش روئی (۳۶) آہنگی (۳۷) سکینت (۳۸) وقار (۳۹) ثنا (۴۰) حسن ظن (۴۱) تصغیر نفس (۴۲) توقیر اخوان (۴۳) تعظیم مشائخ (۴۴) چھوٹے بڑے پر رحم (۴۵) اپنے سلوک واحسان کو حقیر سمجھنا (۴۶) اپنے ساتھ کیے گئے سلوک کو عظیم سمجھنا۔

اہل تصوف کے اخلاق وہ نہیں جن کا جھوٹے دعویدار اظہار کرتے ہیں، طمع کو زیارت، بے ادبی وگستاخی کو اخلاص، حق سے باہر ہونے کو شطح کہتے ہیں۔ یعنی زبان درازی وبے باکی سے ایسی بات بولنا جو دین سے نکل جانے کا سبب ہو۔ خواہش کی پیروی کو ابتلا، بد خلقی کو ہیبت، بادشاہوں سے تقرب کو مسلمانوں کی سفارش تصور کرتے ہیں۔ بخل کو دانائی سمجھتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو اہل معرفت کی راہ وروش سے دور ہیں۔

مقامات کا مطلب یہ ہے کہ عبادات میں بندہ یہ تصور رکھے کہ میرا قیام خدائے تعالیٰ کے سامنے ہے۔ مقامات کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱) انتباہ: خواب غفلت سے بیداری۔

(۲) توبہ: گناہوں کو چھوڑ کر دوام ندامت کے ساتھ حق تعالیٰ کی جانب رجوع اور کثرت استغفار۔

(۳) انابت: غفلت سے ذکر کی جانب واپسی، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حق سے خوف کا نام توبہ اور حق

کی جانب شوق کا نام اِنابت ہے۔

(۴) وَرَع: ایسی چیز کو ترک کر دینا جس کی حلت میں شبہہ ہو۔

(۵) محاسبۂ نفس: نفس کے سود و زیاں اور زیادتی و کمی میں فکر و غم۔

(۶) ارادت: راحت ترک کر کے طاعت و عبادت میں دائمی محنت۔

(۷) زہد: دنیا کی حلال شہوات سے باز رہنا۔

(۸) فقر: املاک نہ رکھنا اور جو کچھ ہاتھ میں نہ ہو اس سے دل خالی رکھنا۔

(۹) صدق: ظاہر و باطن کا یکساں ہونا۔

(۱۰) تصبر: نفس سے وہ باتیں برداشت کرانا جو اسے ناگوار ہوں اور اسے بہ جبر تلخیوں کا جام پلانا۔

(۱۱) صبر: شکایت ترک کر دینا۔

(۱۲) رضا: بلا میں لذت پانا۔

(۱۳) اخلاص: حق سبحانہ تعالیٰ کے معاملات سے خلق کو باہر رکھنا۔

(۱۴) توکل: حق تعالیٰ کی رزاقی پر بھروسہ اور غیر سے قطع طمع۔

احوال: یہ دلوں کے معاملات کا نام ہے یعنی ذکر کی صفائی سے دلوں میں جو واردات آتے ہیں وہ احوال ہیں۔ حضرت جنید فرماتے ہیں: حال ایک وارد ہونے والی کیفیت ہے جو دل پر اترتی ہے اور ہمیشہ نہیں رہتی۔ کچھ احوال یہ ہیں:

(۱) مراقبہ: صفائے یقین کے باعث پس غیب کی چیزوں کو دیکھنا۔

(۲) قرب: خدا کے سامنے ماسوا سے ہمت جمع رکھنا۔

(۳) محبت: محبوب کے پسند و ناپسند میں اس کی موافقت۔

(۴) رَجا: حق نے جو وعدہ کیا ہے اس بارے میں اس کی تصدیق۔

(۵) خوف: اللہ کی سطوت و عقوبت کے تعلق سے دلوں کا مطالعہ۔

(۶) حیا: انبساط سے دل کو روکنا۔

(۷) شوق: محبوب کی یاد کے وقت قلب کا ہیجان۔

(۸) انس: خدا کی جانب سکون پذیر ہونا اور تمام امور میں عاجزی و مسکنت برتنا۔

(۹) طمانیت: قضا و قدر کے تحت جو بھی جاری ہے اس بارے میں خدا کی جانب سکون پذیر ہونا۔

(۱۰) یقین: شک دور ہونے کے ساتھ تصدیق۔

(۱۱) مشاہدہ: یہ رویتِ یقین اور رویتِ عین کے درمیان فاصلہ کا نام ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: خدا کی عبادت اس طرح بجالا کہ گویا اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ مشاہدہ آخری حال ہے۔

طالب صادق کو چاہیے کہ ان تمام اخلاق، مقامات اور احوال کی مشق و عادت ڈالے تا کہ رفتہ رفتہ یہ سب اسے حاصل ہو جائیں اور مرید حقیقی بن جائے۔ اس کے بعد کچھ اور خوشبوئیں تابشیں بخششیں ہوتی ہیں جن کے بیان سے عبارت قاصر ہے۔ اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ (سبع سنابل، ص: ۵۳ تا ۵۵)

یہ ان امور کا اجمالی بیان ہے جن کی پابندی کی ہدایت و تربیت صوفیہ کرام فرماتے ہیں۔ غور کیجیے ان میں کون ایسا امر ہے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو یا جن سے اعتقاد میں کوئی خرابی آتی ہے۔ لیکن برا ہو صوفیہ سے عداوت کا کہ تصوف کو زندقہ اور صوفیہ کو زنادقہ کے نام سے شہرت دینے کی سعی مذموم جاری ہے۔ حالاں کہ یہ حضرات جس شدت و استقامت کے ساتھ اسلامی عقائد و احکام کے پابند ہوتے ہیں، اور ان کے افکار و اخلاق کی جو بلندی ہوتی ہے اہل ظاہر کے یہاں اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا مگر جب دل سے حق و انصاف رخصت ہو چکا ہو اور قلب میں بغض و عناد کی ظلمت گھر کر چکی ہو تو اس کا کیا علاج؟

تعلیم صوفیہ کا ایک نمونہ:

کتاب و سنت کے ارشادات میں جو جامعیت اور گہرائی ہے اس کی تہ تک پہنچنا اہل اللہ ہی کا حصہ ہے۔ مثلاً ریا کی مذمت قرآن میں بھی ہے، حدیث میں بھی ہے، مگر اس کی صورتیں اور قسمیں کیا کیا ہیں؟ یہ کس کس طرح اعمال کو فاسد و ناقص کرتی ہے؟ اہل ظاہر اس کی تفصیلات کتاب و حدیث میں دکھانے سے قاصر ہیں۔ مگر صوفیہ انھیں بسط کے ساتھ بتاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں جو ان کے فہم قرآن و حدیث اور نظر غائر کا بین ثبوت ہے۔ مزید توضیح کے لیے یہاں حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہ کی کتاب "احیاء العلوم" باب ریا کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ تاکہ اربابِ تصوف کے مدارک و مراتب کا قدرے اندازہ ہو سکے اور اہل باطن و اہل ظاہر کے فہم و نظر کا کچھ فرق سمجھ میں آسکے۔

امام موصوف پہلے ریا سے متعلق آیات و احادیث پھر آثار و واقعات بیان کرتے ہیں۔ ایک حدیث یہاں بھی نقل کی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے تم پر سب سے زیادہ شرک اصغر کا خطرہ ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا وہ ریا ہے۔ اللہ عزوجل روز قیامت جب بندوں

ان کے اعمال کی جزا دے گا اس وقت ریاکاروں سے فرمائے گا تم دنیا میں جن کو دکھاتے تھے ان کے پاس جاؤ، دیکھو ان کے یہاں تم کو کچھ جزا ملتی ہے ؟ (مسند احمد، شعب الایمان، بیہقی، بروایت محمود بن لبید)

ریا کی حقیقت اور ریاکاری کے ذرائع:

ریا رویت سے اور سمعہ سماع سے مشتق ہے۔ ریا کی اصل یہ ہے لوگوں کو خیر کی خصلتیں دکھا کر ان کے دلوں میں اپنی منزلت پیدا کرنا مقصود ہو۔ جاہ و منزلت کی طلب عبادات کے ذریعہ بھی ہوتی ہے اور غیر عبادات سے بھی۔ مگر عرفاً عبادات اور ان کے اظہار کے ذریعہ طلب منزلت کو ریا کہا جاتا ہے اس لیے ریا کی تعریف یہ ہے: "اللہ کی طاعت سے بندوں کو مقصود بنانا۔"

یہاں چند چیزیں ہیں:

(۱) ریاکار جو عبادت گزار ہے۔

(۲) وہ لوگ جن کو دکھانا اور ان کے ذریعہ دلوں میں اپنی قدر و منزلت پیدا کرنا مقصود ہے۔

(۳) وہ خصلتیں جن کا اظہار مقصود ہے۔

(۴) ریا یعنی قصد اظہار۔

ریا کے ذرائع بہت ہیں مگر وہ پانچ اقسام میں سمٹ آتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے ذریعہ بندہ لوگوں کے سامنے آراستہ ہوتا ہے: (۱) بدن۔ (۲) لباس۔ (۳) قول۔ (۴) عمل۔ (۵) توابع اور خارجی چیزیں۔ اہل دنیا بھی ریا میں ان ہی ذرائع سے کام لیتے ہیں۔ مگر طاعات کے ذریعہ ریاکاری کی بہ نسبت اس ریا کی خرابی کم ہے جو ایسے اعمال کے ذریعہ ہو جن کا طاعت و عبادت میں شمار نہیں۔

(۱) بدن کے ذریعہ ریا: دین میں اس کی مثال لاغری و زردی کا اظہار تاکہ اس سے اپنی سخت محنت، امر دین پر اپنے حزن عظیم اور خوف آخرت کے غلبے کا خیال دلائے مگر دنیا کی ریا بدن کی فربہی، رنگ کی صفائی، قد و قامت کے اعتدال، چہرے کے حسن، بدن کی نظافت اور اعضا کی طاقت و تناسب کے اظہار سے ہوتی ہے۔

(۲) ہیئت و لباس کے ذریعہ رِیا: مثلاً سر کے بال پراگندہ رکھنا، چلنے میں سر جھکائے رکھنا، چہرے پر سجدے کا اثر باقی رکھنا، موٹے جھوٹے کپڑے پہننا، ازار یا پاجامہ پنڈلی تک رکھنا اس طرح کہ ان امور سے پیروی سنت کی نمائش مقصود ہو اور اہل زہد و صلاح کے دلوں میں اپنی وقعت بٹھانی مطلوب ہو۔ اور اگر صالحین اور امراد وزرا کی نظر میں قدر و منزلت کا ارادہ ہو تو ایسے کپڑے بنانا جو دونوں کے نزدیک پسندیدہ ہوں۔

(۳) کلام کے ذریعہ ریا:

اس قسم کے تحت اہل دین کی ریاکاری کے ذرائع یہ ہیں:

وعظ و نصیحت، حکیمانہ باتیں، اخبار و آثار یاد کرنا تاکہ بات چیت کے وقت سنا کر وسعت علم کا اظہار ہو، لوگوں کے سامنے ذکر کرتے ہوئے لبوں کو حرکت دینا، اگر آدمیوں کا مجمع ہو تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، برائیوں پر غضب، لوگوں کے ارتکاب معاصی پر رنج کا اظہار، حفظ حدیث ولقاے شیوخ کا دعویٰ بیان کرنے والے کی گرفت تاکہ اپنے علم و بصیرت کا اظہار ہو اور اہل دنیا کی ریاکاری اشعار و امثال کے حفظ، چرب زبانی، عبارت کی دل کشی وغیرہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔

(۴) عمل کے ذریعہ ریا:

مثلاً نمازی کا قیام اور رکوع و سجود کو لمبا کرنا، وقار و سکون کی نمائش کرنا، اسی طرح روزہ، صدقہ، حج وغیرہ اعمال میں طرح طرح کے تکلف برتنا، ریاکار کی حالت یہ بھی ہوتی ہے کہ اپنے کام میں بڑی تیزی سے جا رہا تھا کسی دین دار کو دیکھ لیا تو سر جھکا کر آہستہ چلنے لگا کہ کہیں وہ اسے جلد باز اور کم وقار نہ سمجھے، وہ نظر سے غائب ہوا تو پھر اپنی عادت پر آگیا پھر کوئی ایسا شخص نظر آگیا تو پھر وقار و سکون اختیار کر لیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تنہائی میں بھی وقار سے چلنے، رہنے، اٹھنے، بیٹھنے کی عادت بنا لیتا ہے تاکہ کوئی باخبر یہ نہ کہہ سکے کہ تنہائی میں اس کا حال اور ہے مجمع میں اور، اس عادت کے بعد وہ بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ ریا سے پاک ہو گیا حالاں کہ اس کی ریاکاری دوگنا ہو گئی اس لیے کہ تنہائی کا یہ تصنع مجمع ہی کی خاطر ہے۔ خدا سے حیا و خوف کی وجہ سے نہیں ہے۔

اور اہل دنیا کی ریاکاری ناز و انداز سے چلنے، چھوٹے چھوٹے قدم رکھنے، دامن یا ازار کے کنارے پکڑ کر چلنے، شانوں کو گردش دینے وغیرہ سے ہوتی ہے تاکہ جاہ و حشمت کی نمائش ہو۔

(۵) دوستوں اور ملاقاتیوں کے ذریعہ ریا:

مثلاً اس بات کی کوشش کہ کوئی عالم یا عابد و وزیر و امیر اس سے ملنے کے لیے آئے تاکہ لوگوں میں اس کی عظمت اور بڑے افراد کے اس کی جانب رجوع کا چرچا ہو، یا شیوخ و اکابر کا کثرت سے تذکرہ کرے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اسے کثیر بزرگوں اور عظیم لوگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہے اس قسم کے تحت اور بہت سی صورتیں ہیں۔

ریا کے ارکان و درجات:

ریا کے تین ارکان ہیں: (۱) ذریعہ رِیا۔ (۲) مقصود رِیا۔ (۳) خود قصد رِیا۔ پھر ان تینوں کے مختلف

درجات ومراتب ہیں:

قصد ریا:

اس کے چار درجات ہیں:

اول: یہ سب سے برا ہے۔ وہ یہ کہ عمل سے ثواب بالکل مقصود نہ ہو جیسے وہ شخص جو لوگوں کے درمیان ہو تو نماز پڑھ لے، اکیلا ہو تو نہ پڑھے۔ مجمع ہو تو خیرات کرے، تنہائی ہو تو نہ کرے۔

دوم: ثواب کا قصد تو ہو مگر ضعیف، وہ اس طرح کہ لوگوں کے سامنے ہے تو ثواب کا خیال آیا اور عمل بجالایا لیکن تنہائی میں ثواب کا خیال آیا تو نہ کیا، یہ درجہ بھی اوپر والے درجہ سے قریب ہی ہے۔

سوم: ثواب اور ریاکاری دونوں کا ارادہ برابر برابر ہو، وہ اس طرح کہ دونوں جمع ہوئے اس کے لیے محرک بنے، اگر صرف ایک امر ہوتا تو اس عمل کی انگیخت نہ ہوتی۔ یہ شخص بھی غضب سے سلامت رہنے والا نہیں۔

چہارم: صرف ثواب کا قصد رکھتا ہے لیکن اگر لوگوں کے سامنے ہے یا ان کے آگاہ ہونے کا موقع ہے تو عمل کے لیے قوت ونشاط ہے اور اگر ایسا موقع نہیں تب بھی اپنی عادت کے مطابق وہ عمل کی بجاآوری کرتا ہے اور تنہا ریا کے ارادے سے یہ عمل نہیں کرتا۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسے شخص کا عمل برباد نہ ہوگا مگر اس میں نقص ضرور آجائے گا ایسے قصد ثواب کے بقدر ثواب اور قصد ریا کے بقدر عتاب ہوگا۔ اور حدیث پاک: " أنا أغنى الأغنياء من الشرك "اس صورت پر محمول ہے جب دونوں قصد مساوی ہوں یا قصد ریا راجح ہو۔

ذریعۂ ریا: یہ طاعات ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) عبادات میں ریاکاری۔ (۲) عبادات کے اوصاف میں ریاکاری۔ اول زیادہ سخت ہے اس کے تین درجات ہیں:

اول: اظہار ایمان میں ریاکاری، ایسا شخص منافق ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور ریا کا یہ باب سب سے بدتر ہے۔

دوم: فرائض میں ریاکاری، یہ بھی بری ہے اس کی مثال یہ ہے کہ اس کا مال دوسرے کے ہاتھ میں ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ اس سے زکوٰۃ نکال دیتا مگر خدا جانتا ہے کہ وہی مال خود اس کے ہاتھ میں ہوتا تو زکوٰۃ نہ دیتا یا خلوت میں ترک نماز کا عادی ہے مگر مجمع میں رہتا ہے تو ادا کرلیتا ہے، لوگوں کے ساتھ ہے تو روزہ رکھ لیا مگر منتظر ہے کہ تنہائی پائے تو روزہ توڑ دے۔

سوم: ایمان وفرائض میں ریاکار نہیں مگر نوافل وسنن میں ریاکار ہے مثلاً تنہا ہے تو تہجد نہیں پڑھتا ہے لوگوں کے ساتھ ہے تو پڑھ لیتا ہے ایسے ہی عرفہ وعاشورا کا روزہ جسے مذمت سے بچنے یا مدح وستائش ملنے کی

غرض سے ادا کرلیتا ہے۔

اوصاف عبادت میں بھی ریاکاری کے تین درجے ہیں:

اول: براہِ ریاکاری ایسا عمل بجالائے جسے نہ کرتا تو عبادات میں نقص وخلل آتا مثلاً اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو بغیر تعدیل کے جلدی جلدی رکوع سجدہ کرلیا، لوگوں کے سامنے ہے تو تعدیل کے ساتھ سب ارکان ادا کر رہا ہے، اسی طرح کوئی شخص زکوٰۃ میں خراب سکے دینے کا عادی ہے لیکن اگر لوگوں کے سامنے دیا تو عمدہ سکے دیے۔ روزہ سے ہے تو مخلوق کی مذمت کے خوف سے غیبت وبے ہودہ گوئی سے بچتا ہے۔ تکمیل عبادت مقصود نہیں۔

دوم: براہ ریاکاری ایسا کام کرے جسے نہ کرتا تو عبادت ناقص نہ ہوتی اور کیا تو اس کی حیثیت تکملہ وتتمہ کی ہے۔ جیسے حد تعدیل سے زیادہ طویل رکوع وسجود کرنا، عادت سے زیادہ لمبی قراءت کرنا، روزۂ رمضان میں زیادہ تر خلوت میں رہنا، زکوٰۃ میں عمدہ کی جگہ زیادہ عمدہ دینا مگر جب کہ تنہائی اور لوگوں کے عدم اطلاع کی جگہ ہو تو ان امور کی رعایت نہ کرے۔

سوم: نوافل سے خارج کچھ زائد باتوں کی رعایت کرنا، مثلاً لوگوں سے پہلے جماعت میں پہنچنا، پہلی صف کا قصد کرنا، جب کہ خدا جانتا ہے کہ لوگوں کی اطلاع کا موقع نہ ہوتا تو یہ ان امور کی پروانہ کرتا۔

مقصودِ ریا: ریاکار کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوگا مال یا جاہ یا کچھ اور۔ اس لحاظ سے اس کے بھی تین درجات ہیں:

اول: سب سے زیادہ قبیح وشدید۔ وہ یہ ہے کہ عبادت کی نمائش، ورع وتقویٰ کے اظہار اور نوافل کی کثرت سے کسی گناہ کا ارتکاب اور اس کا موقع پانا مقصود ہو، مثلاً یہ کہ اس کے تقویٰ سے متاثر ہو کر اسے قضا کا عہدہ، اوقاف کی تولیت، مال یتیم کی سرپرستی وغیرہ حاصل ہوجائے۔ اور بے دریغ تصرف کرسکے، یا لباس صالحین، ہیئتِ صلحا، وعظ وتذکیر سے کسی خوبرو عورت یا لڑکے کا دام فجور میں لانا مقصود ہو۔

دوم: ریاکاری سے کوئی جائز حظ نفس یا مال دنیا حاصل کرنا مقصود ہو جیسے کسی خوب صورت یا معزز خاتون سے نکاح تک رسائی چاہتا ہو، یا وعظ میں گریہ وزاری اور جذبات کی انگیخت کا مقصد یہ ہو کہ لوگوں سے نذرانہ وہدیہ زیادہ وصول ہو۔

سوم: کسی حظ نفس یا مال دنیا کی طمع نہ ہو مگر اس خوف سے عبادت کی نمائش کرے کہ کہیں خاص زاہدین سے الگ نہ شمار ہو۔ لوگ اسے بنگاہ نقص نہ دیکھیں۔

ریائے خفی جو چیونٹی کی چال سے زیادہ پوشیدہ ہے:

ایک ریائے جلی ہے دوسری ریائے خفی:

(۱) جلی یہ ہے کہ ثواب بھی مقصود ہو مگر عمل پر برانگیختہ کرنے والی چیز جذبۂ نمائش ہے۔

(۲) اس سے کچھ خفی۔ وہ یہ ہے کہ عمل کے لیے ریا تنہا محرک تو نہ ہو مگر باعث تخفیف ہو جیسے وہ شخص جو تہجد کا عادی ہو مگر ادائیگی میں گرانی و دشواری محسوس کرتا ہو اور اگر کوئی مہمان آگیا تو وہی عمل بڑے نشاط اور چستی سے ادا کرتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسے اگر ثواب کی امید نہ ہوتی تو محض مہمانوں کے لیے نماز نہ پڑھتا۔

(۳) اس سے بھی زیادہ خفی۔ جذبۂ نمائش نہ محرک ہے نہ باعث آسانی مگر دل میں چھپا ہوا بیٹھا ہے جس کی علامت یہ ہے کہ لوگ اس کی عبادت گزاری سے مطلع ہو گئے تو سارا احساس مشقت جاتا رہا اور مسرت و راحت محسوس کرنے لگا۔

(۴) خفیہ طور پر عبادت کرے کہ لوگوں کو پتہ نہ چلے اور اگر لوگوں کو پتہ چل گیا تو اسے خوشی نہ ہو مگر اس کے دل کی آرزو یہ ہو کہ لوگ اسے پہلے سلام کریں، اس کی تعظیم و توقیر کریں، اگر اس میں کسی سے کوتاہی ہو تو اس کے دل پر گراں گزرے کہ اس قدر عبادت اور اخلاص کے باوجود میرا اعزاز نہیں۔

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ لوگوں کی آگاہی سے جو مسرت ہوتی ہے اس میں کون سی محمود ہے اور کون سی مذموم؟ اس کی پانچ صورتیں بتائیں ایک مذموم باقی محمود۔ پھر کون وہ ریا ہے جس سے عمل برباد ہو جاتا ہے اور کس سے بالکل برباد نہیں ہوتا۔ پھر ریا کا علاج کیا ہے اور اس بارے میں قلب کی اصلاح کیسے ہوگی ساری تفصیلات ہیں۔

(احیاء العلوم)

یہ دقائق و حقائق ان علوم کا شمہ ہیں جو ان علمائے ربانی کے قلوب میں موجزن ہیں، کیوں کہ جو کچھ سینوں میں تھا کتابوں میں منتقل نہ ہوا اور بہت علوم تو وہ ہیں جو محض دل ہی سے تعلق رکھتے ہیں تحریر کی گرفت میں نہیں آتے۔

بتائیے یہ معارف صوفیہ و اولیا کے سوا کسی ظاہری و غیر مقلد کے یہاں بھی دستیاب ہو سکتے ہیں؟ انھیں تو ان سب کی ہوا بھی نہ لگی، اگر کچھ بیان بھی کرتے ہیں تو وہ ان ہی علما سے سرقہ ہوتا ہے، یہ بھی غور کیجیے کہ کیا ان باتوں میں سے کوئی بات ایسی بھی ہے جو کتاب و سنت سے متصادم اور قابل رد و انکار ہو؟ ہر گز نہیں۔ وہ حضرات جو کچھ فرماتے ہیں کتاب و سنت میں ان کے طویل غور و فکر اور رب کی خاص نوازشات کا نتیجہ ہوتا ہے، کتاب و سنت میں ان امور کا ذکر ایجاز و اجمال کے ساتھ ہوتا ہے، اور ہر عالم کو اس کی بسط و شرح تک رسائی نہیں ہوتی: مثلاً حدیث میں ہے: "في الرياء شوائب أخفىٰ من دبيب النمل" (احمد، طبرانی بروایت ابو موسیٰ اشعری) ریا میں ایسی آمیزشیں ہوتی ہیں جو چیونٹی کی چال سے زیادہ پوشیدہ ہوتی ہیں یا فرمایا: "اتقوا هذا الشرك فإنه أخفىٰ من دبيب النمل" اس شرک سے بچو کہ یہ چیونٹی کی چال سے زیادہ مخفی ہے۔ (ابن حبان فی الضعفاء بروایت صدیق اکبر دار قطنی)

یہ بہت مجمل کلام ہے جس کی کچھ تفصیلات وہ ہیں جو امام غزالی کی کتاب مبارک سے نقل ہوئیں اگر یہ علمائے

ربانیین نہ ہوں تو ان مصائب و مکائد کی شرح کون کرے اور بندوں کو دام شیطان و نفس سے کون بچائے، وہ لوگ جہل مرکب کا شکار ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کتاب و سنت میں جو کچھ صاف و صریح طور پر بیان ہوا اس سے کچھ اور علوم کے چشمے نہیں نکلتے اور ان پر فکر و تدبر کے نتیجے میں علم باطن کے ہزاروں اسرار و رموز نہیں کھلتے یا علم باطن کوئی چیز نہیں، یا ہے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ورنہ کتاب و سنت نے کھول کر بیان کر دیا ہوتا۔

نادانو! کتاب و سنت میں صریح بیان کے ساتھ فکر و تدبر کی دعوت بھی تو ہے، اہل ذکر سے پوچھنے کی تاکید بھی تو ہے، اہل استنباط کی جانب رجوع کا حکم بھی تو ہے وہ کیوں ہے؟ اگر سب کچھ بیان ہی ہو چکا ہے اور سب پر عیاں و آشکارا ہی ہو چکا ہے تو فکر و تدبر کی دعوت کیوں؟ اہل استنباط کی جانب رجوع کی حاجت کیا؟ اہل ذکر سے پوچھنے کا فائدہ کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ جو امور تعلیم خدا و رسول کے بغیر بندوں کی دسترس سے باہر تھے یا دسترس کے باوجود مقام دعوت و ارشاد میں ان کا اعلان و اظہار ضروری تھا وہ ضرور بیان کر دیے گئے، اور ان ہی کو اساس قرار دے کر ان سے استخراج کے لیے دعوت و تاکید فرما دی گئی تاکہ امت کو فکر و تدبر کا ثواب بھی حاصل ہو اور معارف و عطایا کے لحاظ سے بندوں کے رتبہ و مقام کا فرق بھی ظاہر ہو، رب جلیل کی حکمتیں بیان و شمار سے باہر ہیں۔

❁❁❁

وحدۃ الوجود-مشائخ چشت کا منظورِ نگاہ نظریہ (۱)

وحدۃ الوجود ایک خالص عرفانی مسئلہ ہے جسے سید المکاشفین شیخ اکبر محمد بن علی بن محمد حاتمی طائی معروف بہ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ (۵۶۰ھ-۶۳۸ھ) نے اپنی تصانیف میں شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے جو عین ذات باری تعالیٰ ہے۔ باقی سب اس کے مظاہر اور پرتو ہیں۔ امام احمد رضا قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

"مرتبۂ وجود میں صرف حق عزوجل ہے کہ ہستی حقیقۃً اسی کی ذات سے خاص ہے۔ وحدتِ وجود کے جس قدر معنی عقل میں آسکتے ہیں یہی ہیں کہ وجود واحد، موجود واحد، باقی سب مظاہر ہیں کہ اپنی حد ذات میں اصلاً وجود وہستی سے بہرہ نہیں رکھتے۔ "کل شيء هالك الا وجهه".

اور حاشایہ معنی ہرگز نہیں کہ من وتو، زید وعمرو، ہرشے خدا ہے۔ یہ اہل اتحاد کا قول ہے جو ایک فرقہ کافروں کا ہے۔ اور پہلی بات اہل توحید کا مذہب ہے جو اہل اسلام وایمانِ حقیقی ہیں۔ (۲)

مشائخ قادریہ وچشتیہ وغیرہم ہمیشہ وحدۃ الوجود کے قائل رہے اور اہل ظاہر نے اس پر جو اعتراضات کیے ان کے جوابات بھی دیے اور ثابت کیا کہ یہ معنی قرآن وسنت کے خلاف نہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ مسئلۂ وحدت الوجود عقول متوسطہ کے فہم وادراک سے ماورا ہے اور صرف کشف وشہود کے ذریعہ اس سے آگاہی ہوسکتی ہے۔ لیکن علامہ فضل حق خیر آبادی نے خاص معقولی طرز پر بحث کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ صوفیہ کے اسرار واصول سے قطع نظر نگاہ عقل میں بھی حق یہی ہے کہ مصداق وجود صرف ایک حقیقت واجبہ ہے۔ باقی سب اس کے مظاہر اور تعینات ہیں۔ اس بارے میں انھوں نے ایک مفصل رسالہ "الرَّوْضُ المَجُود" تحریر فرمایا جس کا تذکرہ میں نے اپنے کئی مضامین میں کیا ہے۔ یہاں چاہتا ہوں کہ مختصراً اس کے چند اقتباسات بھی پیش کروں تاکہ اس کی تحقیقات سے کسی قدر آشنائی ہوسکے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی چشتی (۱۲۱۲ھ-۱۲۷۸ھ) فرماتے ہیں:

"نظر جتنی زیادہ دقیق اور صاف ہوگی اس سے حاصل ہونے والا علم بھی اتنا ہی زیادہ حق اور کامل ہوگا۔ اور صوفیہ کرام کا حصہ دقت نظر، پاکیزگی اسرار اور درستی افکار میں دوسروں سے زیادہ ہے تو رب سے متعلق ان کا اعتقاد بھی کسی انحراف سے بعید تر اور قبول وایمان کے لیے مناسب ولائق تر ہوگا۔ ان سے متعلق یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا عقیدہ اسلام کے برخلاف، یا

(۱) اہل سنت کی آواز، سالنامہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ، جلد ۱۵، ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ مطابق نومبر ۲۰۰۸ء، سیدنا غریب نواز نمبر ص: ۴۳۹ تا ۴۵۱

(۲) امام احمد رضا قادری: کشف حقائق واسرار دقائق (۱۳۰۸ھ) اشاعت رضا اکیڈمی ممبئی ص ۱۵

تقاضائے عقل کے برعکس ہے۔ یہ بات کسی طرح لائق التفات نہیں کہ صوفیہ کا مذہب عقل کے احکام وطریق سے ماورا ہے۔ اس لیے اس کی تائید یا تردید میں مصروف ہونا مناسب نہیں۔ صوفیہ کا طریقہ خلاف عقل نہیں ہوسکتا۔ حجۃ الاسلام امام محمد غزالی (۴۵۰ھ-۵۰۵ھ) احیاء العلوم میں فرماتے ہیں: یقین رکھو کہ طریق ولایت میں کوئی ایسا امر ظاہر نہیں ہوسکتا جسے عقل محال قرار دے۔ ہاں طریق ولایت میں ایسی بات ظاہر ہوسکتی ہے جس سے عقل قاصر وعاجز ہو یعنی وہ ایسی بات ہے کہ صرف عقل سے اس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ ایک وہ امر ہوتا ہے جسے عقل محال قرار دیتی ہے اور ایک امر وہ ہوتا ہے جو عقل کی دست رس میں نہیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ جو اس فرق کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ ہمارے خطاب کے لائق نہیں"۔ انتہی۔ (۱)

اس تمہید کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ واضح ہوگیا کہ مذہب صوفیہ طریقۂ عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل کی میزان صحیح پر تلا ہوا ہے۔ اس لیے پہلے ہم اسے دلیل عقلی سے بیان کریں گے تاکہ کسی تشدد پسند فلسفی کے لیے شک کی گنجائش نہ رہے پھر اسے نقلی دلائل سے مضبوط کریں گے تاکہ کسی تکلف پسند متکلم کے لیے طعن وتشنیع کا موقع نہ رہے۔

آگے رقم طراز ہیں:

وجود حقیقی ایک حقیقت واحدہ ہے جس میں اقسام وانواع حاصل کرانے والی فصلوں اور اشخاص بنانے والے عوارض کے ذریعہ اختلاف نہیں ہوتا بلکہ یہ بالذات مطلق رہتے ہوئے خود ہی متعین ہوتی ہے۔ اس کا تعین اس کی حقیقت سے زائد نہیں ہوتا مگر اعتباری طور پر۔ یہ بالذات واجب بھی ہے، کسی اور کی معلول نہیں، اس لیے کہ اس کے سوا کوئی موجود نہیں۔

اور جب یہ بالذات مطلق رہتے ہوئے خود ہی متعین ہوتی ہے تو یہی مابہ الاشتراک ہے ان اشیا میں جو ایک دوسرے کی غیر اور باہم جداگانہ ہیں۔ اسی طرح وہ ان اشیا کے درمیان بالذات مابہ الامتیاز بھی ہے، بغیر اس کے کہ کوئی امر اس کی طرف مضاف ہو یا کوئی معنی اس پر زائد ہو۔

اس کے تعیّنات ممکن ہیں اور خود وہ حقیقت، واجب ہے، جیسے تعیّنات باہم متغایر ہیں اور وہ واحد ہے۔ وہ حقیقت حقہ کسی ایک تعین میں محدود یا کسی ایک تشخص میں محصور نہیں۔ یہ اپنے تعینات میں بہت سے اطوار رکھتی ہے۔ وحدت کے باوجود کثرت میں نمایاں ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اے کہ ذاتِ خویش را مطلق مقید ساختی ❊ رنگ ہائے مختلف را صورت خود ساختی (۲)

اس اجمال کے بعد تفصیل دلیل کے لیے پہلے وہ چار مقدمات پیش کرتے ہیں:

(۱) علامہ فضل حق خیر آبادی: الروض المجود۔ اشاعت سمنانی کتب خانہ میرٹھ ۱۳۹۷ھ ص ۵-۶ ملتقطاً ومترجماً

(۲) ایضاً، ص ۷

پہلا مقدمہ:

وجود بمعنی مصدری جسے "ہستی" اور "ہونا" کہا جاتا ہے ایک فطری بدیہی امر ہے۔ یہ اشیا کے درمیان مشترک اور اذہان کے اندر اشیا سے منتزع ہے۔ خارج میں موجود نہیں۔ یہ بدیہی بات ہے جس سے کسی مکابر کو بھی اختلاف نہیں۔

دوسرا مقدمہ:

وجود مصدری جو اشیا سے منتزع ہے، اس کے لیے واقع میں کوئی ایسا منشأ انتزاع ہونا ضروری ہے جو محض اعتبار کرنے والے کے اعتبار یا فرض کرنے والے کے فرض کے تابع نہ ہو۔ ورنہ انتزاع وجود محض ایک اختراعی امر اور وہمی عمل ہو جائے گا۔ وہ منشأ انتزاع واقع میں موجود اور نفس الامر میں متحقق ہونا ضروری ہے تاکہ محض امر اختراعی نہ ٹھہرے۔ اس لیے کہ امور انتزاعیہ کی واقعیت یہی ہے کہ ان کا منشأ انتزاع واقع میں موجود ہو۔

تیسرا مقدمہ:

وجود مصدری کا منشأ انتزاع خود حقیقت موجودہ ہے، اس کے بغیر کہ کوئی امر اس پر زائد، یا کوئی معنی اس کے ساتھ منضم ہو۔

اس لیے کہ انتزاع کا منشأ اگر نفس حقیقت نہ ہو بلکہ حقیقت مع امر زائد ہو تو وہ امر یا تو انضمامی ہوگا یا انتزاعی؟ دونوں صورتیں باطل ہیں (تفصیل کتاب میں مذکور ہے) تو مصداق وجود کسی فرض فارض یا زیادتِ عارض کے بغیر خود حقیقت موجودہ کا ہونا ثابت ہے۔

چوتھا مقدمہ:

وجود کو اصل حقیقت سے، جو مصداق وجود ہے وہی نسبت ہے جو انسانیت کو ماہیت انسانیہ اور حیوانیت کو ماہیت حیوانیہ سے ہے۔ اس لیے کہ وجود نفس حقیقت سے زائد کوئی معنی نہیں جیسے انسانیت کا مفہوم حقیقت انسانیت سے زائد کوئی معنی نہیں۔ اس کا بیان تیسرے مقدمے میں ہو چکا ہے۔

ان مقدمات کی تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں کہ وجود مصدری چھوٹی بڑی تمام چیزوں سے منتزع ہے تو اس کے لیے کوئی ایسا منشأ انتزاع ہونا ضروری ہے جو واقعی ہو، محض فرضی واعتباری نہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ منشأ نفس ذات اور اصل حقیقت ہو اور اس کی جانب وجود کی نسبت اسی طرح ہو جیسے انسان کی طرف انسانیت اور حیوان کی طرف حیوانیت کی نسبت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معنی وجود کا مصداق کسی امر کی زیادتی اور کسی معنی کی اضافت کے بغیر خود ہی ہو۔ اور محال ہے کہ وہ منشأ اشیا سے مبائن یا مفارق کوئی امر ہو۔ اس لیے کہ وجود خود ان اشیا کے حقائق سے منتزع ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ وہ منشا حقیقت واحدہ ہو۔ اس لیے کہ اگر کئی حقائق ہوں تو وجود کی نسبت اپنے منشا کی جانب نسبت انسانیت بہ انسان کی طرح نہ ہوگی جیسا کہ چوتھے مقدمے میں ثابت ہوا۔

اور محال ہے کہ وہ حقیقت واحدہ اشیا سے منضم یا منتزع کوئی امر ہو جیسا کہ تیسرے مقدمے میں ثابت ہوا۔

اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ اشیا سے مبائن کوئی امر ہو، ورنہ ان سے وجود کا انتزاع نہ ہو سکے گا۔ وہ حقیقت کسی خاص تعین سے مقید بھی نہیں۔ اسی طرح وہ کلی مبہم نہیں ورنہ بذاتہ مصداقِ وجود نہ ہو سکے گی۔ بلکہ اپنے حصول میں خارجی محصلات کی محتاج ہوگی۔ تو یہ مطلق ہے یعنی ہر قید سے معرّا اور تعین کی صالح ہے۔

وہ کسی کی معلول بھی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس کے ماسوا نہ کوئی موجود ہے، نہ کسی کی کوئی اصلیت۔ اور جو چیزیں متغایر اور اس سے مبائن نظر آ رہی ہیں، یہ سب اسی کے شیون اور تعینات ہیں جو اسی سے پیدا اور اسی سے جلوہ نما ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ مصداق وجود جسے وجود حقیقی کہا جاتا ہے وہ، ایک حقیقت واحدہ واجبہ ہے جو سب میں پھیلی ہوئی اور ہر تعین وقید سے مطلق ہے۔ اب یہ بھی جان لو کہ وہ حقیقت جب اشیا کی کوئی انضمامی صفت نہیں، نہ کوئی وصف انتزاعی، نہ کوئی امر مبائن تو یہ ہر شے کا عین ہے۔ نہ اس معنی میں کہ ہر شے وہی حقیقت مطلقہ ہے بلکہ اس طرح کہ وہ حقیقت کسی امر کی زیادتی اور کسی معنی کے انضمام کے بغیر خود گوناگوں تعینات کے ساتھ جلوہ گر ہوتی اور طرح طرح کے اطوار میں نمایاں ہوتی ہے۔ تو ایک تعین کے اعتبار سے وہ ایک شے ہے اور دوسرے تعین کے اعتبار سے دوسری شے ہے"۔[1]

اس کی مزید تفصیل کے بعد بحر اور تعینات امواج کی مثال سے اس کی توضیح فرمائی ہے، اس کے بعد اس مسلک پر دس اعتراضات مع جوابات رقم فرمائے ہیں۔ پھر چند آیات پیش کر کے دلیل شرعی نقلی سے اس کی موافقت ثابت کی ہے۔

ملک العلما بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی علیہ الرحمہ (۱۱۴۴ھ-۱۲۲۵ھ) نے بھی اس موضوع پر عربی میں ایک رسالہ "وحدۃ الوجود و شہود الحق فی کل موجود" لکھا تھا۔ پھر نواب انور الدین خان بہادر کی فرمائش پر اسے فارسی میں لکھا۔ شاہ ابو الحسن زید فاروقی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا اور مکتوبات مجدد الف ثانی سے اخذ کرتے ہوئے متعدد حواشی بھی لکھے۔ یہ ترجمہ پہلی بار غالباً ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ مسلک وحدۃ الوجود کی توضیح و تفہیم کے لیے اس سے بھی کچھ اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ بحر العلوم فرماتے ہیں:

"وجود سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وجود اس کی حقیقت کا عین ہے۔ اور یہ وجود، مصدری وجود نہیں کیوں کہ مصدری وجود ایک انتزاعی امر ہے جس کا معنی "ہونا" ہے۔

ایسے انتزاعی مفہوم سے اللہ تعالیٰ بالا و برتر ہے بلکہ وجود سے مراد وہ حقیقت ہے جو مصدری وجود کا مصداق ہے جو

(۱) ایضا، ص ۱۰-۱۱

نفس وجود ہے، وہ اپنے مرتبۂ ذات میں کثرت سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ عالم شیونات وتعینات ہے۔ تمام شیونات وتعینات اس کے مظاہر ہیں اور وہ ان میں ظاہر و ساری ہے، اس کی سرایت وہ نہیں جس کے حلولی قائل ہیں یا جس کا بیان اتحادی کرتے ہیں بلکہ یہ سریان مثل اس سریان کے ہے جو گنتی کے اعداد میں ایک کا ہے۔ گنتی کے تمام اعداد بجز اکائیوں کے اور کچھ نہیں۔ عالم میں ایک ہی عین یعنی ایک ہی ذات کا ظہور ہے۔ کثرت میں وہی ظاہر ہے۔ اپنی ذات سے کثرت کا وجود نہیں۔ اللہ کی ذات سے اس کا ظہور ہوا۔ اللہ ہی کی ذات اس کثرت میں ظاہر ہے۔ اللہ ہی اوّل ہے۔ اللہ ہی آخر ہے۔ اللہ ہی ظاہر ہے۔ اللہ ہی باطن ہے۔ اللہ ان کے شریک بنانے سے پاک ہے"۔ (۱)

سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ (م ۱۳۲۴ھ) فرماتے ہیں: "وحدت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وجودی دوسری شہودی۔ وجودی کے معنی یہ ہیں کہ سالک کے علم اور نظر دونوں سے اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے اس کا شعور ختم ہوجائے اور اس کی نظر و علم میں اللہ کے سوا سب کچھ فنا ہونے کے بعد ذات باری تعالیٰ باقی رہے۔ یہی سالک کے مقام کی انتہا ہے۔ اس مقام پر آنے کے بعد سالک ولی ہوجاتا ہے۔ سیر الی اللہ کے ختم ہونے کے یہی معنی ہیں اور اسی کو مقام لاہوت کہتے ہیں۔ سیر و سلوک قادریہ میں یہ چوتھا مقام ہے۔ اس کے بعد سیر فی اللہ ہے کہ اس سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ میں، جس کی کوئی حد نہیں، ترقی حاصل کرنا شروع ہوتا ہے اور حدیث شریف ماعرفناك حق معرفتك (ہم نے جیسا کہ تیرا حق تھا تجھے نہ پہچانا) اسی سیر کی خبر دیتی ہے قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ وغیرہم تمام اولیاء اللہ کا یہی مسلک ہے۔ ایک قلیل تعداد وحدت شہود کی طرف گئی ہے اور اس کو سالک کا ابتدائی مقام جانتے ہیں۔ وحدت شہودی کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اس میں موجودات کا انکار صرف سالک کی نظر سے ہوتا ہے، اس کے علم سے نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا تمام موجودات اس کے علم میں تو باقی رہتے ہیں صرف نظر سے ختم ہوجاتے ہیں۔ نظر میں صرف ذات باری باقی رہتی ہے۔ باقی سب نظر سے ہلاک اور فانی ہوجاتے ہیں مگر سالک کے علم میں باقی رہتے ہیں۔ جیسے سورج نکلنے پر ستارے۔ کہ سب ستارے نظر سے غائب ہوجاتے ہیں، نظر کے سامنے صرف سورج ہوتا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ ستاروں کا وجود ویسے ہی باقی ہے بس نظر سے چھپ گیا ہے"۔ (۲)

امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ (۱۲۷۲ھ-۱۳۴۰) فرماتے ہیں:

حقیقی وجود صرف اللہ کے لیے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سب سے سچی بات جو عرب نے کہی وہ لبید شاعر کا یہ قول ہے: "ألا، کل شیء ما خلا اللہ باطل" ہمارے نزدیک ثابت ہوچکا ہے کہ کلمۂ لاالٰہ الا اللہ کا معنی عوام کے نزدیک

(۱) بحرالعلوم عبدالعلی فرنگی محلی: وحدۃ الوجود، ص: ۱۸ تا ۲۱۔ اشاعت شاہ ابوالخیر اکیڈمی، دہلی

(۲) شاہ ابوالحسین احمد نوری: سراج العوارف فی الوصایا والمعارف۔ ترجمہ ڈاکٹر سید محمد امین برکاتی، ص ۶۴-۶۵، اشاعت بمبئی ۱۹۸۶ء

یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور خواص کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مقصود نہیں اور اخص الخواص کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مشہود نہیں۔ اور جو مقام نہایت تک پہنچ گئے ان کے نزدیک یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اور سب حق ہے۔ مدارِ ایمان اول پر ہے۔ مدارِ اصلاح دوم پر، کمالِ سلوک سوم پر اور وصول الی اللہ کا مدار چہارم پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان چاروں معانی سے حظ کامل عطا فرمائے، اپنے احسان وکرم سے۔ (۱)

یہاں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ صوفیہ واجب اور ممکن میں اتحاد کے قائل ہیں، واجب کو عین ممکن اور ممکن کو عین واجب جانتے ہیں اور "ہمہ اوست" کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن صوفیہ کا دامن اس الزام سے بری ہے۔ وہ ممکن کو ظل، عکس، پرتو، مظہر کہتے ہیں اور ظل بہر حال اصل سے جدا اور اصل کا غیر ہوتا ہے۔ ظلّیت کی صراحت کے باوجود ان کے کلام سے عینیت ثابت کرنا غلط ہے، اگر کسی سے کوئی ایسی عبارت منقول ہے تو اس کی تاویل ضروری ہے کیوں کہ حلول واتحاد کی نفی میں صوفیہ کرام کی صریح عبارات موجود ہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں کہ یہ بات ملحدین نے شیخ اکبر کے خلاف پھیلائی ہے۔ امام شعرانی نے شیخ اکبر کی کتابوں سے ان کا مذہب اور حلول واتحاد کی نفی نقل کرکے واضح کیا ہے کہ شیخ اس خیال باطل سے بلاشبہ بری ہیں۔ چند عبارتیں یہاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں: جو حلول کا قائل ہے وہ بیمار ہے کیوں کہ حلول کا قول ایک لاعلاج مرض ہے اور اتحاد کے قائل اہل الحاد ہیں جیسے حلول کے قائل اہل جہل وفضول ہیں۔ (۲)

حادث حوادث سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اگر قدیم کا حلول حادث میں ہو تو مجسمہ کی بات درست ہوجائے۔ قدیم نہ حلول کرنے والا ہے، نہ اس میں کوئی شے حلول کرنے والی ہے۔ عاشق جب کہتا ہے "أنا من أهوى ومن أهوى أنا" تو یہ زبان عشق ومحبت کا کلام ہے۔ زبانِ علم وتحقیق کا کلام نہیں۔ اسی لیے ایسا قائل جب سکر سے صحو میں آتا ہے تو اپنے قول سے رجوع کرتا ہے۔ (۳)

اگر یہ صحیح ہے کہ انسان، انسانیت سے اور ملک، ملکیت سے ترقی کرکے خالق جل وعلا سے متحد ہوجائے اور خلق، حق ہوجائے تو کسی کو کسی علم پر اعتماد نہ رہے اور محال واجب ہوجائے جب کہ قلب حقائق کی کوئی راہ نہیں۔ (۴)

خلقت کبھی مرتبۂ حق عزوجل میں نہیں ہوسکتی، جیسے معلول کبھی مرتبۂ علت میں نہیں ہوسکتا۔ (۵)

(۱) امام احمد رضا اور تصوف: محمد احمد مصباحی، ص ۱۰۲، اشاعت اول المجمع الاسلامی مبارک پور، ۱۴۰۸ھ

(۲) فتوحات۔ باب الاسرار

(۳) فتوحات۔ باب الاسرار

(۴) فتوحات باب ۳۱۴

(۵) فتوحات باب ۴۸

کمال عرفان یہ ہے کہ عبد اور رب دونوں کا مشاہدہ ہو، جو عارف کسی بھی وقت مشاہدۂ عبد کی نفی کرے، وہ عارف نہیں۔ اس وقت وہ صاحب حال ہے اور صاحب حال شکر والا ہے جسے تحقیق نہیں ہوتی۔ [۱]

فتوحات باب ۳۶۷ میں لکھتے ہیں: "بعض مکاشفات میں میری روح کی ملاقات حضرت ہارون علیہ السلام سے ہوئی۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! آپ نے یہ کیسے کہا "فلا تشمت بي الاعداء" (مجھ پر دشمنوں کو نہ ہنسا) وہ اعدا کون ہیں جن کا آپ مشاہدہ کر رہے ہیں۔ جب کہ ہم لوگوں میں سے سالک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا مشاہدہ نہیں کرتا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا۔ تم نے جو کہا تمھارے مشاہدے کے لحاظ سے صحیح ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ جب تم خدا کے سوا کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کرتے تو کیا اس وقت نفس الامر سے عالم زائل ہو گیا، جیسا کہ تمھارے مشاہدے میں زائل ہے یا نفس الامر میں عالم باقی اور غیر زائل ہے۔ صرف تم اس کے مشاہدے سے محجوب ہو، اس لیے کہ ایک ایسی عظیم تجلی تمھارے قلوب پر واقع ہوئی جس نے عالم کو تمھارے شہود سے روپوش کر دیا؟ میں نے عرض کیا: نفس الامر میں عالم، باقی و غیر زائل ہے۔ صرف ہم اس کے مشاہدے سے محجوب ہو گئے۔ فرمایا: اس شہود میں خدا سے متعلق تمھارے عرفان میں کمی ہے جس قدر کہ مشاہدۂ عالم میں کمی ہے۔ اس لیے کہ سارا عالم اللہ کی نشانی ہے۔ اس جواب سے حضرت ہارون علیہ السلام نے مجھے ایسی معرفت کا افادہ فرمایا جو مجھے پہلے حاصل نہ تھی۔ انتہی۔ سیدی علی بن وفار حمہ اللہ فرماتے کہ اگر کلام قوم میں کہیں اتحاد کا ذکر آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے کی مراد، حق کی مراد میں فنا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں میں اتحاد ہے، جب ہر ایک دوسرے کے منشا کے مطابق کام کرتا ہے"۔ [۲]

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ حلول و اتحاد کے قول سے صوفیہ کرام کس قدر دور ہیں اور ان کی جانب اس خیال باطل کا انتساب کتنا غلط اور گمراہ کن ہے۔

میں یہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ کا کلام پیش کرتا ہوں جس سے توحید، وحدت اور اتحاد کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور وحدت پر دلیل سمعی بھی فراہم ہوتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

یہاں تین چیزیں ہیں: توحید، وحدت اور اتحاد۔ توحید مدار ایمان ہے اور اس میں شک کفر اور وحدت وجود حق ہے، قرآن عظیم و احادیث و ارشادات اکابر دین سے ثابت۔ اور اس کے قائلوں کو کافر کہنا خود شنیع خبیث کلمہ کفر ہے۔

رہا اتحاد، وہ بے شک زندقہ و الحاد، اور اس کا قائل ضرور کافر۔ اتحاد یہ کہ یہ بھی خدا، وہ بھی خدا، سب خدا، ع

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ حاشاللہ! الٰہ، الٰہ ہے اور عبد عبد۔ ہرگز نہ عبد الٰہ ہو سکتا ہے نہ الٰہ عبد۔ اور وحدت وجود یہ کہ

---

(۱) لوامح الانوار۔

(۲) الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الأکابر: امام عبدالوہاب شعرانی (۸۹۸ھ - ۹۷۳ھ) ج ۱، ص ۶۳-۶۵ بہ تلخیص و ترجمہ

وہ صرف موجود واحد، باقی سب ظلال و عکوس ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: "کل شيء هالك الا وجهه"

صحیح بخاری، و صحیح مسلم، و سنن ابن ماجہ میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اصدق کلمة قالها الشاعر کلمة لبيد الا كل شيء ما خلا الله باطل، سب میں زیادہ سچی بات جو کسی شاعر نے کہی، لبید کی بات ہے کہ سن لو! اللہ عزوجل کے سوا ہر چیز اپنی ذات میں محض بے حقیقت ہے۔ کتب کثیرہ مفصلہ اصابہ، نیز مسند میں ہے: سواد بن قارب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کی:

فاشهد ان الله لا شيء غيره   وانك مامون على كل غائب

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ موجود نہیں اور حضور جمیع غیوب پر امین ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہ فرمایا۔ [۱]

اب مسئلہ کی قدرے تفصیل اور ایک مثال سے تفہیم بھی ملاحظہ ہو۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

یہاں فرقے تین ہیں: ایک خشک اہل ظاہر، کہ حق و حقیقت سے بے نصیب محض ہیں۔ یہ وجود کو اللہ و مخلوق میں مشترک سمجھتے ہیں۔ دوم اہل حق و حقیقت کہ بمعنی مذکور قائل وحدت وجود ہیں۔ سوم اہل زندقہ و ضلالت، الٰہ و مخلوق میں فرق کے منکر، اور ہر شخص و شے کی الوہیت کے مُقر ہیں۔ ان کے خیال و اقوال اس تقریبی مثال سے روشن ہوں گے۔

ایک بادشاہ اعلیٰ جاہ آئینہ خانہ میں جلوہ فرما ہے۔ جس میں تمام مختلف اقسام و اوصاف کے آئینے نصب ہیں۔ آئینوں کا تجربہ کرنے والا جانتا ہے کہ ان میں ایک ہی شے کا عکس کس قدر مختلف طوروں پر متجلی ہوتا ہے۔ بعض میں صورت خلاف نظر آتی ہے۔ بعض میں دھندلی، کسی میں سیدھی، کسی میں الٹی، ایک میں بڑی، ایک میں چھوٹی، بعض میں پتلی، بعض میں چوڑی، کسی میں خوش نما، کسی میں بھونڈی، یہ اختلاف ان کی قابلیت کا ہوتا ہے، ورنہ وہ صورت جس کا اس میں عکس ہے خود واحد ہے، ان میں جو حالتیں پیدا ہوئیں متجلی ان سے منزہ ہے۔ ان کے لیے، بھونڈے، دھندلے ہونے سے اس میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔ وللہ المثل الاعلیٰ۔ اب اس آئینہ خانہ کو دیکھنے والے تین قسم ہوئے:

اول ناسمجھ بچے:

انھوں نے گمان کیا کہ جس طرح بادشاہ موجود ہے یہ سب عکس بھی موجود ہیں کہ یہ بھی تو ہمیں ایسے ہی نظر آ رہے ہیں جیسے وہ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ اس کے تابع ہیں۔ جب وہ اٹھتا ہے یہ سب کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ چلتا ہے یہ سب چلنے لگتے ہیں۔ وہ بیٹھتا ہے یہ سب بیٹھ جاتے ہیں۔ تو ہیں یہ بھی اور وہ بھی۔ مگر وہ حاکم ہے یہ محکوم۔ اور اپنی نادانی سے نہ سمجھا کہ وہاں تو

---

(۱) فتاوی رضویہ ج ۶، ص ۱۳۲-۱۳۳۔ سنی دار الاشاعت مبارک پور۔

بادشاہ ہی بادشاہ ہے۔ یہ سب اسی کے عکس ہیں، اگر اس سے حجاب ہو جائے تو یہ سب صفحۂ ہستی سے معدوم محض ہو جائیں گے، ہو کیا جائیں گے اب بھی تو حقیقی وجود سے کوئی حصہ ان میں نہیں۔ حقیقتاً بادشاہ ہی موجود ہے، باقی سب پر تو کی نمود ہے۔

دوم اہل نظر و عقل کامل:

وہ اس حقیقت کو پہنچے اور اعتقاد بنائے کہ بے شک وجود ایک بادشاہ کے لیے ہے، موجود ایک وہی ہے۔ یہ سب ظل و عکس ہیں کہ اپنی حد ذات میں اصلاً وجود نہیں رکھتے۔ اس تجلی سے قطع نظر کر کے دیکھو کہ پھر ان میں کچھ رہتا ہے۔ حاشا عدم محض کے سوا کچھ نہیں اور جب یہ اپنی ذات میں معدوم و فانی ہیں اور بادشاہ موجود، یہ اس نمودِ وجود میں اسی کے محتاج ہیں اور وہ سب سے غنی، یہ ناقص ہیں وہ تام، یہ ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں اور وہ سلطنت کا مالک، یہ کوئی کمال نہیں رکھتے، حیات، علم، سمع، بصر، قدرت، ارادہ، کلام سب سے خالی ہیں اور وہ سب کا جامع، تو یہ اس کا عین کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ لاجرم یہ نہیں کہ یہ سب وہی ہیں بلکہ وہی وہ ہے اور یہ صرف اس تجلی کی نمود۔ یہی حق و حقیقت ہے اور یہی وحدت الوجود۔

سوم عقل کے اندھے:

سمجھ کے اوندھے، ان ناسمجھ بچوں سے بھی گئے گزرے۔ انھوں نے دیکھا کہ جو صورت بادشاہ کی ہے وہی ان کی، جو حرکت وہ کرتا ہے یہ سب بھی، تاج جیسا اس کے سر پر ہے بعینہ ان کے سروں پر بھی۔ انھوں نے عقل و دانش کو پیٹھ دے کر بکنا شروع کیا کہ یہ سب بادشاہ ہیں اور اپنی سفاہت سے وہ تمام عیوب و نقائص جو نقصان قوابل کے باعث ان میں تھے خود بادشاہ کو ان کا موردِ کر دیا کہ جب یہ وہی ہیں تو ناقص عاجز محتاج الٹے بھونڈے بدنما دھندلے کا جو عین ہے قطعاً انھی ذمائم سے متصف ہے۔ تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا.

انسان عکس ڈالنے میں آئینے کا محتاج ہے اور وجود حقیقی، احتیاج سے پاک۔ وہاں جسے آئینہ کہیے وہ خود بھی ایک ظل ہے، پھر آئینے میں انسان کی صرف سطحِ مقابل کا عکس پڑتا ہے جس میں انسان کی صفات مثل کلام و سمع و بصر و علم و ارادہ و حیات و قدرت سے اصلاً نام کو بھی کچھ نہیں آتا لیکن وجود حقیقی عزّ جلالہ کی تجلی نے اپنے بہت ظلال پر نفس ہستی کے سوا، ان صفات کا بھی پر تو ڈالا۔ یہ وجوہ اور بھی ان بچوں کی نافہمی اور ان اندھوں کی گمراہی کی باعث ہوئیں اور جن کو ہدایتِ حق ہوئی وہ سمجھ لیے کہ

یک چراغے ست دریں خانہ کہ از پر تو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

انھوں نے ان صفات اور خود وجود کی دو قسمیں کیں: حقیقی ذاتی کہ متجلی کے لیے خاص ہے اور ظلی عطائی کہ ظلال کے لیے ہے اور حاشا یہ تقسیم، اشتراک معنی نہیں بلکہ محض موافقت فی اللفظ۔ یہ ہے حق حقیقت و عین معرفت۔ و للہ الحمد"۔[1]

(۱) فتاویٰ رضویہ ج۶، ص ۳۳-۳۴۔ سنی دار الاشاعت مبارک پور۔

ایک حدیث طبرانی نے حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی، حضور والا صلوات اللہ تعالیٰ و سلامہ علیہ نے فرمایا:

"إن الله يجمع الأولين والآخرين في صعيد واحد ثم ينادی مناد من تحت العرش يا أهل التوحيد ان الله عزوجل قد عفا عنكم فيقوم الناس فيتعلق بعضهم ببعض في ظلامات، ثم ينادی منادٍ ياأهل التوحيد ليعف بعضكم عن بعض وعلى الثواب"

یعنی بے شک اللہ عزوجل روز قیامت سب اگلوں پچھلوں کو ایک زمین میں جمع فرمائے گا پھر زیر عرش سے منادی ندا کرے گا اے توحید والو! مولا تعالیٰ نے تمھیں اپنے حقوق معاف فرمائے۔ لوگ کھڑے ہو کر آپس کے مظلموں میں ایک دوسرے سے لپٹیں گے۔ منادی پکارے گا: اے توحید والو! ایک دوسرے کو معاف کر دو اور ثواب دینا میرے ذمہ ہے"۔[1]

یہ اہل توحید کون ہیں جن سے حقوق اللہ بھی معاف ہوں گے اور باہمی حقوق العباد کی بھی معافی کرا کے ثواب کا پروانہ مل جائے گا؟ امام احمد رضا قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

"فقیر کے گمان میں حدیث مذکور میں اہل توحید سے یہی محبوبانِ خدا مراد ہیں کہ توحید خالص تام کامل، ہر گونہ شرکِ خفی و اخفی سے پاک و منزہ انھیں کا حصہ ہے۔ بخلاف اہل دنیا جنھیں عبدالدینار، عبدالدرہم، عبد طمع، عبد ہویٰ، عبد رغب فرمایا گیا۔ و قال تعالیٰ: "اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ" اور بے شک بے حصولِ معرفتِ الٰہی اطاعت ہوائے نفس سے باہر آنا سخت دشوار۔ یہ بندگانِ خدا نہ صرف عبادت بلکہ طلبِ ارادت بلکہ خود اصل ہستی و وجود میں اپنے رب جل مجدہ کی توحید کرتے ہیں۔ لا إله إلا الله کے معنی عوام کے نزدیک لامعبود إلا الله. خواص کے نزدیک لا مقصود إلا الله. اہل ہدایت کے نزدیک لا مشهود إلا الله. ان اخص الخواص ارباب نہایت کے نزدیک لا موجود إلا الله. تو اہل توحید کا سچا نام انھی کو زیبا۔ و لہٰذا ان کے علم کو علم توحید کہتے ہیں۔ (جعلنا الله تعالیٰ من خدامهم وتراب أقدامهم فی الدنيا والآخرة، وغفرلنا بجاههم عنده انه أهل التقویٰ وأهل المغفرة. آمین۔[2]

❁❁❁

(۱) فتاویٰ رضویہ ج۹، ص ۵۰۔ اشاعت رضا اکیڈمی بمبئی ۱۴۱۵ھ۔
(۲) فتاویٰ رضویہ ج۹، ص ۵۲-۵۳۔ اشاعت رضا اکیڈمی ۱۴۱۵ھ

نور فقاہت کی جہاں تابی[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً و مسلماً

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۔[2]

ترجمہ: اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں۔ (کنز الایمان)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو "دینی فقاہت" حاصل کرے اور اس فقاہت کا فائدہ اپنی پوری قوم کو پہنچانے کی کوشش کرے، نہ یہ کہ اس عمل کو تعلی و تفوق، دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرنے، انھیں مرعوب کرنے یا ذلیل و حقیر ٹھہرانے کا ذریعہ بنا لے بلکہ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ قوم کو دین کی ہدایت اور تعلیم کے ذریعہ خوف خدا کی حامل اور اس کے احکام پر عامل بنائے۔

حدیث پاک میں آیا: من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین.

"اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی فقاہت عطا فرماتا ہے۔"

میں نے غور کیا تو آیت اور حدیث دونوں میں "فقاہت فی الدین" کا ذکر ہے جو بہت جامع ہے۔

دین کے تحت **ایک** تو وہ عقائد ہوتے ہیں جن کو جاننا، ماننا اور دوسروں تک پہنچانا مطلوب ہوتا ہے۔ **دوسرے** وہ احکام ہوتے ہیں جو عبادات و معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں جاننے کے بعد حسب موقع خود عمل کرنا اور دوسروں کو بتانا، عمل کرانا ہوتا ہے۔ **تیسرے** وہ فضائل ہوتے ہیں جن سے اپنے باطن کو آراستہ کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ ان رذائل کا بھی ذکر آتا ہے جن سے دل کو پاک و صاف رکھنا ہوتا ہے۔

ان تینوں علوم کو بالترتیب (۱) علم عقائد یا علم کلام (۲) علم فقہ یا علم احکام (۳) علم اخلاق یا علم تصوف سے موسوم کیا گیا۔ امام اعظم ابو حنیفہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے علم عقائد کو "فقہ اکبر" سے موسوم کیا۔ اور عقائد میں "الفقہ الاکبر" کے نام

(۱) مجلس شرعی کے فیصلے، جلد اول، مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ، ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۴ء۔

(۲) سورۃ التوبہ، پ:۱۱، آیت: ۱۲۲

سے ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

جو حضرات مشکاۃ نبوت سے براہ راست فیض یاب ہوئے انھوں نے بہت کم مدت میں عقائد، احکام اور اخلاق تینوں کی تعلیم حاصل کر لی۔ وہ تینوں میں راسخ ہوئے اور تینوں میں دیگر افراد کے لیے ہادی و معلم بنے۔

صحابۂ کرام سے دین کی فقاہت حاصل کرنے والے اجلۂ تابعین بھی تینوں علوم کے جامع اور دوسروں کے لیے مبلغ و رہنما اور مربی و معلم ہوتے۔ اس وقت فقاہت فی الدین کی تین علوم میں تقسیم نہ تھی بلکہ یکجا تینوں کی تعلیم و تحصیل جاری تھی۔

بعد میں الگ الگ تینوں فنون کی حیثیت سے ان کی تدوین ہوئی اور علم عقائد، علم احکام، علم اخلاق کو جدا جدا بیان کرنے اور سیکھنے سکھانے کا سلسلہ جاری ہوا۔ تینوں کی بنیاد کتاب و سنت ہی پر قائم ہوئی اور انھیں سے اخذ و استناد اور تفریع و تفصیل پر "فقہ دین" کی پوری عمارت استوار ہوئی۔

کچھ شخصیات ایسی جامع اور عظیم تھیں جو تینوں علوم میں مرجع و مقتدا بنیں اور کچھ حضرات کو صرف دو یا ایک میں شہرت و مرجعیت حاصل ہوئی اگرچہ انھیں تعلق تینوں سے تھا اور ہر ایک سے بہرہ ور ہو کر وہ اپنی ذات میں کامل تھے۔ یہ منظر دور اخیر میں بھی نظر آتا ہے، بعض حضرات تینوں میں مرجع و مقتدا ہوئے اور بعض حضرات اپنی جامعیت کے باوجود کسی ایک یا دو میں مرجع و مشہور ہوئے۔

علم عقائد و کلام میں امام اعظم (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی خداداد فقاہت کا اندازہ ایک واقعے سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے بچپن کا ہے۔ خطیب خوارزمی (رحمۃ اللہ علیہ) بیان کرتے ہیں کہ روم کے نصرانی بادشاہ نے خلیفۂ بغداد کے یہاں اپنا ایلچی بہت سارا مال دے کر بھیجا اور اسے حکم دیا کہ مسلمانوں کے علما سے تین سوالات کرنا۔ اگر جواب مل جائے تو یہ سارا مال انھیں دے دینا ورنہ مسلمانوں سے خراج کا مطالبہ کرنا۔ وہ قاصد آیا اور تینوں سوالات پیش کیے۔ علما نے اپنے طور پر جواب دیا لیکن وہ خاموش نہ ہوا بحث کرتا رہا۔ اس وقت امام اعظم کم سن، نابالغ تھے اور اپنے والد کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھے، سفیر روم کا جواب دینے کے لیے اپنے والد سے اجازت طلب کی، انھوں نے اجازت نہ دی پھر خلیفۃ المسلمین سے اجازت طلب کی، خلیفہ نے اجازت دے دی۔ امیر المومنین کی اجازت کے بعد وہ سامنے آئے اور عیسائی سے کہا: کیا تم سائل ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا: منبر سے نیچے آؤ، سائل کی جگہ زمین پر ہے، میں مجیب ہوں، میری جگہ منبر ہے۔ رومی نیچے آگیا۔ امام منبر پر پہنچے اور فرمایا: اب بتاؤ تمھارا سوال کیا ہے؟

اس نے پوچھا اللہ سے پہلے کیا تھا؟ امام نے فرمایا: گنتی جانتے ہو؟ کہا: ہاں جانتا ہوں (ایک، دو، تین، چار، پانچ) فرمایا: ایک سے پہلے کیا ہے؟ اس نے کہا ایک سے پہلے کچھ نہیں۔ فرمایا: جب اس واحد مجازی، عددی سے پہلے کچھ بھی نہیں تو اس واحد حقیقی سے پہلے کیا ہوگا؟ وہ خاموش ہو گیا۔

پھر اس نے دوسرا سوال کیا کہ اللہ کس جہت میں ہے؟ امام نے فرمایا شمع جلاتے ہو تو روشنی کس جہت میں ہوتی ہے؟ اس نے کہا کسی جہت میں نہیں ہوتی، چاروں طرف اس کی روشنی نظر آتی ہے۔ فرمایا: جب اس نور مجازی کے لیے کوئی جہت نہیں تو اس نور حقیقی کے لیے کوئی جہت کیسے ہو سکتی ہے۔

اب اس نے تیسرا سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ بے کار رہتا ہے یا کچھ کرتا بھی ہے؟ فرمایا: "کل یوم ھو فی شان" وہ ہر دن ہر وقت کسی کام میں ہے۔ اور اس وقت اس کا کام یہ ہے کہ تجھ جیسے بے دین کو منبر سے اتارا اور مجھ جیسے مومن موحد کو منبر پر بلند کیا، تجھ کو ذلت دی اور مجھ کو عزت دی۔ ایلچی خاموش ہو گیا اور جتنا مال لے کر آیا تھا سب دے کر چلا گیا۔ (۱)

امام اعظم کی عظیم دینی فقاہت کا یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب وہ نہ امام اعظم تھے، نہ امام، نہ ابو حنیفہ بلکہ صرف نعمان بن ثابت نامی ایک خردسال فرزند تھے، بعد میں علم عقائد اور کلام و مناظرہ میں ان کی مہارت کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے ملحدین اور خوارج و معتزلہ وغیرہ کو چند منٹوں میں لاجواب کر دیتے۔ اس طرح انھوں نے اپنے دور کے فتنوں کو سرنگوں کر دیا۔ ان کی فقاہتِ باطن اور نورانیت قلب کی بھی ایک شہادت ایک ولیِ کامل کی زبانی سنیے۔ علم شریعت و طریقت کے جامع امام عبد الوہاب شعرانی شافعی م ۹۷۳ھ اپنے شیخ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میں نے سیدی علی خواص رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے عرفان کے مراتب ایسے دقیق ہیں کہ ان کی معرفت اکابر اولیاہی کو حاصل ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: امام ابو حنیفہ وضو خانے سے بہتا ہوا پانی دیکھ کر اس میں گرنے والے سارے صغیرہ، کبیرہ گناہوں اور مکروہات کو جان لیتے۔ اسی لیے انھوں نے وضو میں استعمال شدہ پانی کی تین حالتیں قرار دیں:

اول: یہ کہ وہ نجاست غلیظہ کی طرح ہے۔ یہ اس احتیاط کے تحت کہ ہو سکتا ہے وضو کرنے والا کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہو۔

دوم: یہ کہ وہ نجاست متوسطہ کی طرح ہے۔ یہ اس بنا پر کہ ہو سکتا ہے وضو کرنے والا کسی گناہ صغیرہ کا مرتکب ہوا ہو۔

سوم: یہ کہ وہ خود پاک ہے مگر دوسرے کو پاک کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ یہ اس لیے کہ ہو سکتا ہے وضو کرنے والا کسی مکروہ یا خلاف اولیٰ کا مرتکب ہوا ہو۔ یہ حقیقتاً گناہ نہیں، اس لیے کہ وہ فی الجملہ جائز ہے۔

کچھ مقلدین امام نے یہ سمجھا کہ یہ تینوں اقوال ایک ہی حالت سے متعلق ہیں، مگر ایسا نہیں، یہ تین اقوال تین حالتوں سے متعلق ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ یہ اس لحاظ سے کہ شرعی گناہ تین قسموں میں منحصر ہیں۔ مکلفین کی

(۱) الاشباہ والنظائر للعلامۃ زین بن نجیم المصری، م ۹۷۰ھ۔ فن سابع، حکایات و مراسلات، ۳/۱۷۱، ۳، بہ ایضاح و تلخیص

اکثریت ان میں سے کسی ایک کے ارتکاب سے خالی نہیں ہوتی، مگر نادراً۔ (۱)

دوسری جگہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے قول نجاست آبِ مستعمل کے تذکرے میں سیدی علی خواص شافعی رضی اللہ عنہ کا ارشاد اپنے سوال کے جواب میں نقل کرتے ہیں:

ہاں امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگرد، عظیم ترین اہل کشف میں تھے، وہ لوگوں کے وضو سے گرنے والا پانی دیکھ کر ان کی ان خطاؤں کو جان لیتے تھے جو پانی میں گری ہیں، یہ بھی امتیاز کر لیتے کہ کون سا غسالہ کبائر والا ہے، کون صغائر کا ہے، کون مکروہات کا ہے اور کون خلاف اولیٰ کی آمیزش رکھتا ہے۔ ہم سے بیان کیا گیا کہ امام ابو حنیفہ جامع مسجد کوفہ کے وضو خانے میں داخل ہوئے، ایک جوان کو وضو کرتے اور اس سے ٹپکتے پانی کو دیکھا تو فرمایا: بیٹا والدین کی نافرمانی سے توبہ کر۔ اس نے کہا: میں نے خدا کی بارگاہ میں اس سے توبہ کی۔ دوسرے شخص کا غُسالہ دیکھا تو اس سے فرمایا: بھائی زنا سے توبہ کر، اس نے کہا: میں نے ان سب سے توبہ کی۔ ان کے نزدیک یہ امور ایسے ہی تھے جیسے محسوس چیزیں ہوتی ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ امام اعظم نے اللہ سے دعا کی کہ ان پر اس طرح کا کشف بند کر دے اس لیے کہ اس میں لوگوں کی پوشیدہ بُرائیوں سے آگاہی ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ (۲)

امام شعرانی نے بتایا ہے کہ تمام ائمہ مجتہدین اہل کشف و مشاہدہ اور صاحب ولایت تھے۔ اگر یہ حضرات ولی نہ ہوں تو روے زمین پر کوئی ولی نہیں۔ (ص:۵۵) تمام ائمۂ مجتہدین اپنے متبعین کی شفاعت کرنے والے ہیں۔ ان پر دنیا، برزخ، روز قیامت اور پل صراط سے گزرنے تک جو بھی سختیاں در پیش ہوں سبھی ملاحظہ فرماتے اور ان کی دست گیری کرتے ہیں۔ (ص:۱۳۰-ص:۶۵)

وہ لکھتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے چشمۂ شریعت سے آگاہی دے کر مجھ پر احسان فرمایا تو میں نے دیکھا کہ تمام مذاہب اس چشمہ سے مرتبط ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مذاہب اربعہ کی ساری نہریں جاری ہیں اور جو مذاہب مٹ گئے وہ جامد پتھر کی شکل میں ہو گئے۔ ائمۂ کرام میں سب سے زیادہ لمبی نہر میں نے امام ابو حنیفہ کی دیکھی، پھر امام مالک، پھر امام شافعی، پھر امام احمد بن حنبل کی اور سب سے چھوٹی نہر مذہب امام داؤد کی دیکھی۔ یہ مذہب پانچویں صدی میں ختم ہو گیا۔ میں نے اس کی تاویل ان مذاہب پر عمل کی مدت کے دراز اور کوتاہ ہونے سے کی۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب جیسے تدوین میں سب مدوّنہ مذاہب سے پہلے تھا اسی طرح اختتام میں سب مذاہب کے بعد ہے۔ اہل کشف کا بھی یہی بیان ہے۔ (میزان، ص:۳۸)

(۱) میزان الشریعۃ الکبریٰ۔ امام عبد الوہاب شعرانی وصال ۹۷۳ھ۔ ج:۱، ص:۷۶، ۷۷، آخر فصل فیما نقل عن الامام احمد من ذمہ الرای و تقیدہ بالکتاب والسنۃ۔ اشاعت دار الکتب العلمیہ۔ بیروت۔ ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۸ء

(۲) میزان مذکور، ص:۱۳۰، کتاب الطہارۃ۔

امام اعظم کے کشف باطن اور معرفت اسرار سے متعلق درج بالا شہادتوں سے ان کی فقاہتِ احکام اور تدوین فقہ کی عظمت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ امام اعظم اپنے علم کلام اور علم باطن سے زیادہ اپنے علم فقہ اور قوتِ اجتہاد میں عالمی شہرت رکھتے ہیں اور ایک امام مجتہد کی حیثیت سے پوری دنیا میں متعارف ہیں۔

امام اعظم کے زمانے تک دستور یہ تھا کہ کوئی پیچیدہ واقعہ پیش آتا تو اس کا حکم تلاش کیا جاتا مگر امتِ مسلمہ پر امام اعظم کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے بہت طویل غور و فکر اس پر کیا کہ مستقبل میں کون سے مسائل پیش آسکتے ہیں۔ اس وقت اسلامی سلطنت کا رقبہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ اور روز بروز اس میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے انھوں نے عالم گیر سطح پر غور کیا کہ آئندہ کس طرح کے عائلی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی مسائل پیش آسکتے ہیں، اور نئے حالات میں عامۂ مسلمین، غیر مسلمین، قضاۃ و حکام اور سلاطین کے لیے دستور العمل کیا ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں انھیں کم از کم درج ذیل مراحل سے گزرنا تھا:

(۱) نئے حالات میں پیش آنے والے مسائل کی تعیین اور ان سوالات کا استخراج جن کے جوابات سے علما و فقہا کو عہدہ برآ ہونا ہے۔

(۲) کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں ان اصول و قواعد کی تخریج جن کے تحت مسائل کو حل کیا جائے۔

(۳) وہ مسائل جن کا ثبوت کتاب و سنت کی عبارت، اشارت، دلالت یا اقتضا سے ہوتا ہے۔

(۴) احادیث کا علم، ان کے الفاظ پر نظر، ان کے راویوں کا علم اور ان کے حالات پر نظر، ایک موضوع کے تحت چند حدیثیں ہیں تو یہ سب ایک دوسری کی تائید کرتی ہیں یا ان میں کچھ اختلاف و تعارض نظر آتا ہے تو اس کی بنیاد کیا ہے، پھر تطبیق یا ترجیح کی صورت کیا ہے؟

(۵) جملہ احادیث اور ان کے رواۃ کے احوال پر نظر کرتے ہوئے یہ فیصلہ کہ کون سی حدیث احکام میں قابل استناد ہے اور کون اس درجے کی نہیں ہے۔

(۶) جن مسائل کا ثبوت واضح طور پر کتاب و سنت اور اجماع سے نہیں ہوتا ان کا کتاب و سنت کے صریح احکام اور ان کی علتوں کی روشنی میں استنباط۔

ظاہر ہے کہ ان مراحل سے گزرنے کے لیے زبردست علم، ہمہ جہت نظر، طویل غور و فکر، صبر آزما ہمت و استقلال، کامل اخلاص و ہم دردی اور خدا و رسول کی بارگاہ سے خاص عنایت و فیضان ضروری ہے۔

اس لیے امام اعظم نے تدوین فقہ کا کام تنہا انجام نہ دیا بلکہ فقہا و مجتہدین کی ایک مجلس تشکیل دی جس کے سامنے ایک ایک مسئلہ پیش ہوتا، ہر شخص اپنے علم اور فقاہت اور دلائل کی روشنی میں بحث کرتا، جب ایک حکم پر سب کا اتفاق ہو جاتا تو اسے درج کر لیا جاتا ورنہ اختلاف کے ساتھ لکھا جاتا۔

اس عظیم جد و جہد کا ثمرہ یہ ہوا کہ ایک جامع دستور العمل تیار ہو گیا جس کا فائدہ سلاطین، امرا، قضاۃ، علما، فقہا، عامۂ مسلمین اور غیر مسلمین سبھی کو پہنچا۔ امام اعظم اور ان کے اصحاب کے احسان کا اعتراف ان جلیل القدر شخصیات نے کیا ہے جو اس کام کی عظمت و اہمیت سے آشنا ہیں۔

حضرت شداد بن حکیم جن کی عبادت کا یہ حال تھا کہ ساٹھ سال تک وہ رات کو سوئے نہیں۔ ظہر کے وقت وضو کرتے پھر اس کے بعد دوسری ظہر کے وقت دوسرا وضو کرتے۔ یہ بلخ کے امام اور حضرت سفیان ثوری کے شاگرد ہیں۔ ۲۱۳ھ میں وصال ہوا۔ وہ فرماتے ہیں:

”لو لا منّ الله علينا بأبي حنيفة وأصحابه حيث بينوا هذا العلم وشرحوا، لم نكن ندري ما نختار من ذلك وما ناخذ به.“ [۱]

یعنی اللہ تعالیٰ نے امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کے ذریعہ ہم پر احسان نہ فرمایا ہوتا تو ہم کو کچھ پتہ نہ چلتا کہ ہم کیا لیں، کیا چھوڑیں، کس پر عمل کریں اور کس پر عمل نہ کریں، لیکن ان حضرات نے علم فقہ کو ایسا واضح و آشکار کر دیا کہ ہمارے لیے کام آسان ہو گیا۔

حضرت ابن سُریج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کسی نے امام اعظم پر کچھ تنقید کی تو انھوں نے فرمایا: اے شخص! چپ رہ ان کے لیے تین چوتھائی (۳/۴ / ۷۵ فیصد) علم بالاجماع تسلیم شدہ ہے اور ایک چوتھائی علم جو باقی رہتا ہے وہ دوسروں کے لیے پورا تسلیم نہیں کرتے۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ فرمایا: اس لیے کہ علم سوال و جواب کا مجموعہ ہے۔ نصف علم سوال اور نصف علم جواب۔ ابو حنیفہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سوالات وضع کیے۔ تو یہ نصف علم ان کے حق میں مسلم ہے۔ پھر انھوں نے ان سولات کے جواب دیے تو بعض نے کہا: درست ہیں، بعض نے کہا: خطا ہیں۔ ہم اگر مان لیں کہ جوابات میں خطا اور صواب کی مقدار برابر ہے تو نصف درست ہوئے نصف غلط۔ تو نصف ثانی کا علم ان کے لیے مسلّم ہے۔ اب ایک چوتھائی جو باقی ہے اسے وہ دوسروں کے لیے تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ ان مسائل میں ان سے بحث کے لیے تیار ہیں۔ تو بقیہ چوتھائی دوسروں کے لیے مسلّم نہیں اور ان کے لیے تین چوتھائی مسلم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے شریعت کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور ابو حنیفہ اس شریعت کی تدوین کرنے والے پہلے شخص ہیں تو یہ بعید ہے کہ ربِّ کریم نے جس شریعت کی حفاظت کا ذمہ لیا اس کی تدوین کرنے والا پہلا شخص ہی خطا پر ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم فرائض میں کتاب لکھی اور علم فرائض نصف علم ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فرائض سیکھو اس لیے کہ یہ تمھارے دین سے ہے اور یہ نصف علم ہے۔

---

(۱) مناقب امام اعظم، از: امام موفق بن احمد مکی، م: ۵۶۸ھ، طبع اول ۱۳۲۱ھ، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ص: ۶۲

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ شرائط کے بارے میں کتاب لکھی۔ شرائط کی تعلیم فرمانے والا اللہ عزوجل ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: "و لا یاب کاتب ان یکتب کما علمه الله" شرطیں وہی وضع کر سکتا ہے جو نہایت علم کو پہنچا ہوا ہو اور علما کے اقوال و مذاہب سے باخبر ہو۔ اس لیے کہ شرطیں تمام ابواب فقہ پر متفرع ہوتی ہیں اور ان کے ذریعہ تمام مذاہب سے احتراز مقصود ہوتا ہے تاکہ کوئی حاکم اپنے مذہب کی بنیاد پر انھیں توڑنے یا فسخ کرنے کا فیصلہ نہ کر سکے۔ بڑا کمال یہ نہیں ہے کہ جب شرطیں وضع ہو گئیں تو انھیں سیکھ لیا۔ بڑا کمال ان کی ایجاد اور اول اول انھیں وضع کرنا ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرے کہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ فقہ، فرائض اور شرائط کے مدون اول نہیں، ان سے پہلے تدوین ہو چکی تھی تو اس سے کہو لاؤ صحابہ یا تابعین کی کوئی ایسی کتاب دکھاؤ جس میں یہ علوم جمع شدہ اور مندرج ہوں۔ وہ جھوٹا دعویدار مبہوت ہو کر رہ جائے گا۔ (۱)

یحییٰ بن آدم کوفی م: ۲۰۳ھ رجال صحاح ستہ سے عظیم محدث ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

کوفہ فقہ سے بھرا ہوا تھا۔ ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ، حسن بن صالح اور شریک جیسے کثیر فقہا کوفہ میں موجود تھے۔ لیکن کسی کے اقوال کو رواج عام حاصل نہ ہوا اور امام ابو حنیفہ کا علم بلاد و اقطار میں پھیل گیا۔ اسی کی بنیاد پر خلفا، ائمہ اور حکّام کے فیصلے ہوتے اور اسی پر معاملہ قرار پذیر ہوا۔

مزید فرماتے ہیں:

فقہ میں امام ابو حنیفہ کا قول اللہ کے لیے تھا۔ اگر اس میں غرض دنیا کی کچھ بھی ملاوٹ ہوتی تو اسے آفاق عالم میں یوں نفوذ و قبول حاصل نہ ہوتا خصوصاً جب کہ ان کے عیب جو اور حاسدین بڑی تعداد میں موجود تھے۔

فرماتے ہیں:

امام ابو حنیفہ نے فقہ میں وہ کوشش اور اجتہاد کیا جو ان سے پہلے کسی سے نہ ہوا تو اللہ نے ان کی رہنمائی فرمائی، راستہ ان کے لیے آسان کر دیا اور خواص و عوام ان کے علم سے نفع یاب ہوئے۔ (۲)

ابو عاصم نبیل (ضحاک بن مخلد) بصری (م: ۲۱۲ھ) رجال صحاح ستہ سے بلند پایہ محدث ہیں، ان سے عثمان بن عفان سجزی روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابو عاصم کو فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے امید ہے کہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے حصے میں روزانہ ایک صدیق کا عمل خدا کے یہاں جاتا ہے، میں نے عرض کیا: کیوں؟ فرمایا: اس لیے کہ ان سے اور ان کے اقوال سے انسانوں کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ (۳)

(۱) مناقب موفق، ص: ۱۳۷، طبع مذکور
(۲) ص: ۱۴۱، مناقب مذکور
(۳) ص: ۱۴۵، مناقب مذکور

اس فقہ حنفی سے ہر دور میں عظیم فقہا و محدثین وابستہ رہے اور اس کی توضیح و تائید اور بسط و تفصیل میں جلیل الشان کتابیں بھی قید تحریر میں آتی رہیں جن سے عوام و خواص مستفید ہوتے رہے۔

گزشتہ صدی میں اس کی تشریح و تائید اور نشر و اشاعت میں سب سے بڑا حصہ **اعلیٰ حضرت امام احمد رضا** قادری برکاتی قدس سرہ العزیز کا ہے۔ فقہ حنفی میں ان کی ژرف نگاہی کا اعتراف غیروں کو بھی ہے۔ اسی طرح فتنۂ لا مذہبی سے مذاہب ائمہ کے تحفظ میں بھی ان کا دلیرانہ و مجاہدانہ کردار ہے۔ برصغیر میں **فتاویٰ رضویہ** سے کوئی حنفی مستغنی نہیں۔ **اگر باضابطہ اس کی تعریب ہو جائے** تو وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے عموماً اور حنفیوں کے لیے خصوصاً ایک عظیم اور مستند مرجع و ماخذ کی حیثیت سے فیض بخش ہوگی۔

فتاویٰ رضویہ جلد اول جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے سامنے طبع ہوئی، صرف اسی کو دیکھیں تو اس میں وہ تحقیقات نادرہ ہیں جنھیں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کی کھلی ہوئی کرامت کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

(۱) پانی پر قدرت نہ ہونے کی ۱۷۵ صورتیں، ہر ایک پر کلام، ہر ایک کے ماخذ کا بیان، ساتھ ہی کلمات فقہا کے اشکالات کا ذکر، پھر تحقیق و تنقیح۔

(۲) جنس ارض کی تعریف و تحقیق، اس کے تحت علما کی ۱۴ مختلف عبارتوں کا ذکر اور اشکالات کا حل۔

(۳) آب مطلق کے بیان میں وہ بلند تحقیقات جن کی نظیر نہیں۔

(۴) آب مستعمل کی تعریف اور اس سے متعلق مسائل میں جلیل تحقیقات۔

(۵) طہارت سے متعلق ۱۱۴ر فتاویٰ کے تحت دیگر ابواب فقہ کے بے شمار مسائل کا بیان جنھیں فہرست میں ابواب کی سرخیوں اور صفحات کی نشان دہی کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ طہارت، نماز، زکاۃ، روزہ، حج، نکاح، طلاق، عتق، قسم، حدود، سیر، شرکت، وقف، بیع، شہادت، وکالت، دعویٰ، ہبہ، اجارہ، حجر، غصب، قسم، حظر و اباحت، فرائض، وغیرہ ابواب کے مسائل ضمناً موجود ہیں۔

(۶) ان کے علاوہ فقہی فوائد، رسم المفتی یعنی قواعد افتا، عقائد و کلام، حدیث، اصول حدیث، اسماء الرجال، فضائل و مناقب، اصول فقہ، طبعیات، ہندسہ و ریاضی وغیرہ سے متعلق بیش بہا افادات ہیں۔

(۷) خود فہرست کی ترتیب اور ضمنی مسائل اور افادات علوم و فنون کا احاطہ ایک بلند پایہ علمی کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان سب کے باوجود نہ کوئی تعلّی ہے، نہ فخر و غرور بلکہ صاف اعتراف ہے کہ جو کچھ ہے میری قدرت سے ورا اور محض فضل میرے رب کریم پھر میرے نبی رؤف و رحیم کا جل وعلا و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ (۱)

(۱) فتاویٰ رضویہ، کتاب الطہارۃ، باب التیمم، ج: ۱، ص: ۸۴۹، رضا اکیڈمی ممبئی

کہیں امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیضان کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"الحمدللہ! کلام اپنے ذروہ اقصیٰ کو پہنچا، امید کرتا ہوں کہ اس فصل بلکہ تمام رسالہ میں ایسا کلام شافی و متین و کافی و مبین برکات قدسیہ روح زکیہ طیبہ علیۃ امام الائمہ کاشف الغمہ سراج الامہ سیدنا امام اعظم واقدم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حصہ حاقۂ فقیر مہین ہو، والحمد للہ رب العالمین۔"[1]

اپنے ایک رسالے میں تکرار نمازِ جنازہ سے ممانعت پر فقہائے حنفیہ کی دلیلیں ذکر کیں پھر کچھ خاص وہ دلائل بیان کیے جو فیضِ قدیر سے ان کے قلب منیر پر فائض ہوئے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

"الحمدللہ! یہ ایک ادنیٰ ثمرہ ہے اس الٰہی عالم، ربانی حاکم کی نظرِ حقائق نگر کا جو مصداق اعلیٰ، عظیم بشارت والا، اس حدیث صحیح کا ہے کہ حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَو كان العلم معلّقاً بالثريا لتناوله قوم من أبناء فارس "علم اگر ثریا پر معلق ہوتا تو اولاد فارس سے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی لے آتے۔ اسے امام احمد نے مسند میں اور ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابوہریرہ سے اور شیرازی نے القاب میں حضرت قیس بن سعد سے روایت کیا رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اعنی امام الائمہ، سراج الامہ، کاشف الغمہ امامِ اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جن کی رائے منیر و نظر بے نظیر تمام مصالح شرعیہ کو محیط و جامع اور مومنین کے لیے ان کی حیات و موت میں خیر محض و نافع۔ فجزاه الله عن الإسلام والمسلمين كل خير و وقاه و تابعيه بحسن الاعتقاد كل ضر و ضير آمين."[2]

امام احمد رضا قدس سرہ نے اپنے دور کے نئے مسائل کا بھی محققانہ جواب رقم فرمایا ہے جن میں سے ایک مسئلہ کرنسی نوٹ کا ہے۔ پہلے سونے چاندی کے سکوں کا رواج تھا۔ ہندوستان میں سونے کے سکے کو اشرفی اور چاندی کے سکے کو روپیہ کہا جاتا۔ عرب میں دینار اور درہم بولتے۔ جب کاغذ کے نوٹ کا چلن شروع ہوا تو مکہ مکرمہ کے علمائے حنفیہ سے اس بارے میں کئی سوالات ہوئے، ایک جلیل القدر اور زبردست مفتیِ حنفیہ شیخ جمال بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں صرف یہ لکھا:

"مسئلہ نیا ہے اور علم علما کی گردنوں میں امانت ہے۔"

امام احمد رضا قدس سرہ جب اپنے دوسرے سفرِ حج میں مکہ مکرمہ وارد ہوئے تو وہ سوالات ان کے سامنے بھی پیش ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے جواب میں وہیں اپنا رسالہ "كفل الفقيه الفاهم فى احكام قرطاس الدراهم" بہت مختصر مدت میں تصنیف فرمایا جس کی متعدد نقلیں علما نے لیں۔ اس کی ایک نقل حرم شریف کی لائبریری میں بھی رکھی گئی۔ اس وقت کے مفتیِ حنفیہ شیخ عبداللہ بن صدیق بن عباس کی نظر سے وہ قلمی رسالہ گزرا تو

---

(۱) حاجز البحرین الواقی عن جمع الصلاتین، ۱۳۱۳ھ آخر فصل سوم مشمولہ فتاویٰ رضویہ، جلد دوم، رضا اکیڈمی ممبئی

(۲) النہی الحاجز عن تکرار صلاۃ الجنائز ۱۳۱۵ھ، آخری صفحہ مشمولہ فتاویٰ رضویہ، جلد چہارم، ص:۵۱، سنی دار الاشاعت مبارک پور۔

اس کا مطالعہ شروع کر دیا جب اس مقام پر پہنچے جہاں فتح القدیر کا یہ جزئیہ مرقوم تھا "لو باع كاغذة بألف يجوز ولا يكره" تو پھڑک اٹھے اور اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولے "أين كان جمال بن عبد الله من هٰذا النص الصريح" حضرت جمال بن عبداللہ اس نص صریح سے کہاں غافل رہے۔

اس رسالے میں نوٹ سے متعلق جملہ مسائل کا حل واشگاف انداز میں پیش کر دیا گیا ہے۔ رسالہ متعدد بار عربی و اردو میں شائع ہوا، فتاویٰ رضویہ میں بھی شامل ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ فتاویٰ رضویہ میں مسائل جدیدہ کی خاصی تعداد موجود ہے جو ایک جامع فہرست کی مقتضی ہے۔ ایسے مسائل کو منتخب کر کے الگ سے بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔ کاش کوئی صاحب علم اس پر توجہ مبذول کریں پھر جو اردو میں ہیں ان کی تعریب ہو جائے تو افادیت اور زیادہ عام ہو سکتی ہے۔

کفل الفقیہ کے علاوہ "الكشف شافيا حكم فونو جرافيا" بھی عربی میں ہے جس کی اشاعت صفر ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء میں المجمع الاسلامی مبارک پور و رضا اکیڈمی ممبئی سے پہلی بار ہوئی۔ اس میں رسالہ "أنوار المنان في توحيد القرآن" بھی شامل ہے۔

نئے مسائل ہمارے دور میں بھی پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے حل کے لیے علما و فقہا کی فکری و قلمی کاوشیں وقت کا اہم تقاضا ہیں، امام احمد رضا قدس سرہ اپنی خداداد فقاہت اور علوم و فنون کی زبردست مہارت کے باعث تنہا ایک متحرک مجلس علما اور ایک فعال اکادمی کا کام بآسانی اور بتمام حسن و خوبی انجام دیا کرتے تھے جس پر فتاوی رضویہ کی بارہ ضخیم جلدیں شاہد عدل ہیں۔ مگر آج نوپیدا پیچیدہ مسائل کا حل کسی ایک ذات سے ہونا انتہائی مشکل بلکہ عادۃً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے الجامعۃ الاشرفیہ میں ۱۹۹۲ء میں مجلس شرعی کی تشکیل عمل میں آئی جس نے امام اعظم کے اصول و قواعد اور امام احمد رضا قدس سرہ کے فتاویٰ کی روشنی میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور آج بھی جادہ پیما ہے۔ اس نے اپنے سفر میں ملک کے نامور علما اور فقہا کو بھی شریک کیا اور نئے باصلاحیت علما کو بھی فکر و تحقیق سے وابستہ کیا۔ جس کے نتیجے میں ساٹھ اہم مسائل کے فیصلے بھی ہوئے اور نئے علما کی ایسی ٹیم بھی تیار ہوئی جو آئندہ زمام کار سنبھالنے کی اچھی صلاحیت رکھتی ہے۔ رب کریم سب کو اپنی جزائے فراواں اور فضل بے پایاں سے نوازے اور اس مجلس خیر کو ہمیشہ آلام و آفات سے محفوظ و مامون رکھ کر جادۂ صدق و عدل پر گامزن رکھے. وهو المستعان و عليه التكلان. وصلى الله تعالىٰ وسلم و بارك علىٰ حبيبه سيد الإنس والجان وعلىٰ آله وصحبه وفقهاء دينه وعلماء شرعه ماتعا قب الملوان.

۶/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۲/ اکتوبر ۲۰۱۳ء بروز شنبہ

❁❁❁

امام احمد رضا بریلوی کے افتا کی ایک خصوصیت(۱)

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کی جلالت شان سے کون واقف نہیں؟ بلاشبہ ان کی ذات علوم و محاسن کا خزانہ تھی۔ آج بھی ان کے رشحات قلم دنیاے علم و فن کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ مگر یہاں ان سب پر کوئی تفصیلی بحث مقصود نہیں۔ بس ان کے افتا کی صرف ایک خصوصیت کی طرف مجھے اشارہ کرنا ہے۔

امام احمد رضا مسائل کے جواب میں جہاں سائل کے فکر و علم کا لحاظ فرماتے، وہیں اس کی زبان کی بھی پابندی کرتے۔ سوال اگر اردو میں ہوتا تو جواب بھی اردو میں ہوتا۔ اور اگر فارسی میں سوال آتا تو فارسی ہی میں جواب دیتے اور اگر سوال عربی میں ہوتا تو عربی ہی میں جواب لکھتے۔ اور کمال زبان کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کی فارسی دیکھی جائے تو کسی قادر الکلام ایرانی کا دھوکا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی عربی دیکھے تو کسی فصیح اللسان عربی نژاد کا تصور سامنے آتا ہے۔ زبان کی برجستگی، بیان کی شیرینی، اسلوب کی لطافت، محاورات اہل زبان کا استعمال، اور ان سب سے بڑھ کر اصلاح و تاثیر کا نادر حسن سب جمع ہیں۔ جب کہ فقہی مضامین میں زبان و بیان کی ان خوبیوں کا قائم و باقی رکھنا انتہائی دشوار ہے۔(۲)

عربی و فارسی ہی پر بس نہیں بلکہ عرصہ ہوا فتاویٰ کی ایک قلمی جلد میں، میں تو یہ دیکھ کر سخت حیرت میں پڑ گیا کہ انگریزی کا جواب انگریزی میں ہے اور جواب بھی مختصر نہیں بہت مبسوط ہے۔ (آخر میں دست خط سے پہلے "أمر برقمه" تحریر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل جواب اردو میں تھا، پھر سائل اور سوال کی رعایت سے اس کا ترجمہ انگریزی میں کرا کے بھیجا گیا۔)

اب میں ان کے افتا کی ایک اور حیرت انگیز خصوصیت کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ امام احمد رضا کا جواب صرف زبان ہی کی پابندی تک محدود نہیں۔ صنف زبان کا بھی پابند ہے۔ یعنی اگر سوال نثر میں ہے تو جواب نثر میں۔ اور اگر کسی نے نظم میں سوال کر دیا ہے تو جواب بھی نظم ہی میں دے رہے ہیں۔

---

(۱) ماہ نامہ پاسبان، الہ آباد، شمارہ جولائی ۱۹۷۹ء، ص: ۱۳ تا ۱۷

(۲) الحمد للہ اس سلسلے میں مکرمی حضرت مولانا الحاج محمد منشا تابش قصوری، ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف، جامعہ نظامیہ، لاہور نے ایک زر طلب مبر آزما اور مفید کام کا آغاز کر دیا ہے۔ امام احمد رضا کے فارسی فتاوے اور عربی فتاوے علیٰ حدہ جمع کر رہے ہیں مولاے کریم تکمیل سے نوازے۔ ۱۲

یہ دیکھیے فتاویٰ رضویہ جلد سوم، ص: ۶۵۴، شائع کردہ سنی دار الاشاعت مبارک پور، اعظم گڑھ۔

جناب مولانا نواب سلطان احمد صاحب بریلوی نے سوال کیا ہے:

عالمانِ شرع سے ہے اس طرح میرا سوال
دیں جواب اس کا برائے حق مجھے وہ خوش خصال
گر کسی نے ترجمہ سجدہ کی آیت کا پڑھا
تب بھی سجدہ کرنا کیا اس شخص پر واجب ہوا
اور ہوں سجدے تلاوت کے ادا کرنے جسے
پھر ادا کرنے سے ان سجدوں کے پہلے وہ مرے
پس سبک دوشی کی اس کے شکل کیا ہوگی جناب؟
چاہیے ہے آپ کو دینا جواب باصواب

اس طرح استفتا میں دو سوال ہیں (۱) جس طرح آیت سجدہ پڑھنے سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے کیا اسی طرح اس کا ترجمہ پڑھنے سننے سے بھی سجدہ واجب ہو جاتا ہے؟ (۲) جس کے ذمہ سجدۂ تلاوت واجب ہو اور ادائے سجدۂ تلاوت سے پہلے انتقال کر جائے تو اس کی سبک دوشی کیوں کر ہو سکتی ہے؟

جواب ملاحظہ کیجیے۔ حکم مسئلہ کی توضیح، دلیل، حوالۂ کتاب سبھی موجود ہے۔ اور مفتیان کرام کے حرف آخر "الله اعلم بالصواب" کی بھی پابندی ہے۔ ان سب کے باوجود کوئی لفظ حشو اور بھرتی کا نہیں۔ سب بامعنی اور افادۂ مطلب کے تحت ہیں۔ رقم طراز ہیں:

ترجمہ بھی اصل سا ہے وجہ سجدہ بالیقیں
فرق یہ ہے فہم معنی اس میں شرط اس میں نہیں
آیت سجدہ سنی جانا کہ ہے سجدہ کی جا
اب زباں سمجھے نہ سمجھے، سجدہ واجب ہو گیا
ترجمہ میں اس زباں کا جاننا بھی چاہیے
نظم و معنی دو ہیں ان میں ایک تو باقی رہے
تاکہ من وجہٍ تو صادق ہو سنا قرآن کو
ورنہ اک موجِ ہوا تھی چھو گئی جو کان کو

ہے یہی مذہب ، به يُفتىٰ، عليه الاعتماد
شامی[1] ازفیض[2] ونہر[3] والله أعلم بالرشاد
سجدہ کا فدیہ نہیں اشباہ[4] میں تصریح کی
صیرفیہ [5] میں اسی انکار کی تصحیح کی
کہتے ہیں واجب نہیں اس پر وصیت وقتِ موت
فدیہ گر ہوتا تو کیوں واجب نہ ہوتا جبرِ فوت
یعنی اس کا شرع میں کوئی بدل ٹھہرا نہیں
جز ادا یا توبہ وقت عجز کچھ چارہ نہیں
یہ نہیں معنی کہ ناجائز ہے یا بے کار ہے
آخر اک نیکی ہے نیکی ماحیِ اوزار ہے
قُلتُهٗ اَخْذاً مِنَ التعليلِ فى أمرالصّلاه
وهُو بَحثٌ ظَاهِرٌ وَالعلم حقّا لِلالٰه

بحث اور اشعار پر ایک نظر:

"ترجمہ بھی اصل سا ہے وجہ سجدہ بالیقیں" اس میں پہلے سوال کا جواب ہو گیا کہ جس طرح آیت سجدہ پڑھنے سننے سے سجدہ واجب ہوتا ہے اسی طرح آیت سجدہ کا ترجمہ پڑھنے اور سننے سے بھی سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے مگر دونوں کے وجوب میں ایک فرق تھا جسے مصرعِ ثانی میں بیان فرماتے ہیں: فرق یہ ہے — فہم معنی اس میں شرط اس میں نہیں — آیت سجدہ کا ترجمہ سننے سے — سجدہ واجب ہونے کے لیے معنی کا سمجھنا ضروری ہے۔ اور خود عربی آیتِ سجدہ سننے کی صورت میں فہم معنی شرط نہیں۔ بس آیت سجدہ سن لینے ہی سے سجدہ واجب ہوتا ہے۔ البتہ غیر عربی داں کے لیے اگر چہ آیت سجدہ کے معنی سمجھنا شرط نہیں مگر اس پر وجوب سجدہ کے لیے اسے یہ علم ہو جانا ضروری ہے کہ یہاں آیت سجدہ ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار۔ للعلامۃ محمد امین بن عمر عابدین الشامی ت ۱۲۵۲ھ۔
(۲) فیض المولی الکریم علی عبدہ ابراہیم۔ للعلامۃ ابراہیم بن عبدالرحمٰن الکرکی۔
(۳) النہر الفائق فی شرح کنز الدقائق للعلامۃ عمر بن نجیم اخی صاحب البحر، متوفی ۱۰۰۵ھ
(۴) الاشباہ والنظائر للعلامۃ زین بن ابراہیم بن محمد الشہیر بابن نجیم المصری، صاحب البحر الرائق، متوفی: ۹۷۰ھ
(۵) نقدھا الامام احمد رضا البریلوی من کتب الفتاویٰ المعتبرۃ مؤلفہا الشیخ أسعد بن یوسف بن علي، مجد الدین الصیرفي البخاری ت ۱۰۸۸ھ۔

لكن لا يجب على الأعجمى مالم يعلم كما فى الفتح أى وإن لم يفهم.
منحۃ الخالق علی البحر الرائق میں مزید فرماتے ہیں:
وعبارته فى الخلاصة لكن يعذر فى التاخير مالم يعلم بها.[1]
اعلیٰ حضرت نے اس جزئیہ کا بھی افادہ فرمادیا:

آیت سجدہ سنی "جانا کہ ہے سجدہ کی جا"
اب زباں سمجھے نہ سمجھے سجدہ واجب ہو گیا
ترجمہ میں اس زباں کا جاننا بھی چاہیے

سماع ترجمہ کی صورت میں زبان کا جاننا، معنی کا سمجھنا واجب ہونے کی دلیل نقل فرماتے ہیں:

نظم و معنی دو ہیں ان میں ایک تو باقی رہے
تاکہ من وجہٍ تو صادق ہو سنا قرآن کو

اس کی توضیح یہ ہے کہ قرآن نظم و معنی دونوں کا نام ہے اور وجوب سجدہ کے لیے دونوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔ کل چار صورتیں ہوں گی:

(۱) نظم و معنی دونوں موجود۔ جیسے کسی عربی داں نے آیت سجدہ سنی، معنی سمجھ گیا۔ سجدہ واجب، کہ یہاں دونوں موجود ہیں۔

(۲) نظم ہے، معنی نہیں۔ مثلاً عجمی نے آیت سجدہ سنی، اسے معلوم ہو گیا کہ یہ آیت سجدہ ہے مگر معنی نہ سمجھا۔ پھر بھی سجدہ واجب ہو گیا۔ کیوں کہ یہاں خود نظم قرآن موجود ہے اگر چہ سامع کے نزدیک ثبوتِ معنی نہیں۔

(۳) معنی ہے، نظم نہیں۔ ایرانی نے فارسی زبان میں آیت سجدہ کا ترجمہ سنا، سجدہ واجب ہو گیا۔ کیوں کہ اس نے باعتبار معنی قرآن سنا، اگر چہ باعتبار نظم نہ سنا، اور وجوب سجدہ کے لیے من وجہٍ قرآن سن لینا کافی ہے۔ ردالمحتار میں شرح مجمع البحرین سے ہے:

لأنه إذا فهم كان سامعا للقرآن من وجه دون وجه.

(۴) نظم و معنی دونوں نہیں۔ مثلاً ایرانی، ہندوستانی، پاکستانی، کسی نے بھی انگریزی میں آیت سجدہ کا ترجمہ سنا زبان سے آشنا نہیں۔ کچھ نہ سمجھا۔ سجدہ واجب نہ ہوا۔ اس لیے کہ سامع کے نزدیک نظم و معنی میں سے ایک کا بھی ثبوت نہ ہوا بس اک موج ہوا تھی چھو گئی جو کان کو۔

(۱) منحۃ الخالق۔ للعلامۃ الشامی، ج:۲، ص:۱۳۰۔ دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، الطبعۃ الثانیۃ۔

غور کیجیے اعلیٰ حضرت نے تیسری ہی صورت نہ بتائی۔ بلکہ چاروں صورتوں اور ان کی دلیل کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

ترجمہ سننے کی صورت میں امام اعظم اور صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد) رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اختلاف ہے۔ امام صاحب کے نزدیک آیت سجدہ کی طرح ترجمہ کا بھی سمجھنا ضروری نہیں۔ سراج وہاج میں ہے کہ امام اعظم نے قولِ صاحبین کی طرف رجوع فرمالیا۔

وفی الفیض و به یفتی وفی السراج أن الإمام رجع إلى قولهما وعليه الاعتماد. (۱)

اسی اختلاف پھر رجوع امام کے پیش نظر امام احمد رضا فرماتے ہیں:

ہے یہی مذہب، بِہٖ یُفْتیٰ، علیہ الاعتماد

فتویٰ کے مختلف الفاظ وعلامات اپنے اندر الگ الگ خصوصیت رکھتے ہیں، کوئی راجح، کوئی ارجح، کوئی ضعیف و مرجوح۔ اسی لیے بہٖ یفتی اور علیہ الاعتماد کے الفاظ بعینہ استعمال کر دیے۔ تاکہ حیثیت ترجیح واضح ہو جائے اور چوں کہ یہ ثابت ہے کہ امام صاحب نے قول صاحبین کی طرف رجوع فرمالیا اسی لیے افادہ فرمایا کہ "ہے یہی مذہب۔"

شامی از فیض و نہر واللہ أعلم بالرشاد

اس مصرع میں حوالہ اور حوالے کا حوالہ دونوں ذکر کر دیا کہ پورا مسئلہ شامی میں ہے اور شامی نے فیض و نہر سے نقل کیا ہے۔ پھر واللہ أعلم بالرشاد بھی نظم فرمادیا۔ والحمدللہ.

مسئلہ دوم:

سجدہ کا فدیہ نہیں اشباہ میں تصریح کی
صیرفیہ میں اسی انکار کی تصحیح کی
کہتے ہیں واجب نہیں اس پر وصیت وقت موت
فدیہ گر ہوتا تو کیوں واجب نہ ہوتا جبر فوت

اگر کسی کے روزے فوت ہو گئے۔ ادا پر قدرت پائی مگر ادا نہ کیا۔ یہاں تک کہ وقت موت آ گیا۔ یا روزے سے عاجز شیخ فانی ہے تو ان سب پر فدیہ واجب ہے۔ خود ادا نہ کیا تو ولی کو وصیت کر جانا واجب ہے۔ یہ فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ نصف صاع گیہوں یا ایک صاع جو جس طرح فطرہ میں ہے۔

لیکن اسی طرح اگر کسی پر سجدۂ تلاوت رہ گیا تو فدیہ یا وقت موت فدیہ کی وصیت واجب نہیں۔ شامی میں

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار، ج:۱، ص:۵۱۴، مطبوعہ مصر- اس مسئلے پر پیش کردہ شامی کی دوسری عبارتیں بھی اسی صفحہ، اسی مقام کی ہیں۔ ۱۲

زاہدی کی قنیہ سے ہے: و لا یجب علی المحتضر الایصاء بها و قیل یجب۔ (۱)

صاحب قنیہ نے یہاں دو قول ذکر کیے عدم وجوب اور وجوب۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: اشباہ میں عدم وجوب کی تصریح کی۔ صیرفیہ میں اسی کو صحیح قرار دیا۔ علامہ شامی نے بھی تاتارخانیہ سے عدم وجوب ہی کی تصحیح نقل کی ہے۔ (۲)

مزید فرماتے ہیں:

یعنی اس کا شرع میں کوئی بدل ٹھہرا نہیں
جز ادا یا توبہ وقت عجز کچھ چارہ نہیں

جب واجب کا مثل، مثل غیر معقول ہو۔ یعنی عقل اس کے ادراک سے قاصر ہو تو اس کے مثل و بدل ہونے کا نص سے ثبوت ضروری ہے۔ آیت کریمہ:

وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (اور جنھیں اس کی طاقت نہیں وہ فدیہ دیں ایک مسکین کا کھانا) (۳) سے فدیہ کا بدل روزہ ہونا ثابت ہے۔ اس لیے روزہ سے عجز کے وقت فدیہ یا وصیت فدیہ واجب ہے۔ مگر فدیہ کا بدلِ سجدہ ہونا کسی نص سے ثابت نہیں۔ لہٰذا فدیہ سجدہ کا بدل قرار نہ پایا۔ اس لیے سجدہ کی جگہ فدیہ یا اس کی وصیت کے وجوب کی کوئی صورت نہیں۔ اب سجدہ سے سبک دوشی کی صرف دو صورتیں ہیں (۱) قادر ہو تو ادائے سجدہ۔ (۲) عاجز ہو گیا تو توبہ۔

لیکن اگر کسی نے بصورت عجز، فدیہ ادا کر دیا یا فدیہ کی وصیت کر گیا تو یہ فدیہ ناجائز و بے کار بھی نہ ہوگا۔ بہرحال یہ ایک نیکی ہے اور نیکی گناہ مٹاتی ہے۔ جیسے فدیہ کا بدلِ نماز ہونا نص سے ثابت نہیں۔ مگر امام محمد زیادات میں فرماتے ہیں (مرنے والے نے ادائے فدیہ کی وصیت کی) اور اس کی طرف سے فدیہ ادا کیا گیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگا۔ فقہائے کرام اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن کا فدیہ کو بدلِ روزہ قرار دینا دو صورت رکھتا ہے یا تو یہ بدلیت کسی ایسی علت (یعنی عجز) پر مبنی ہے جو روزہ و نماز دونوں میں مشترک ہے تو بلاشبہہ فدیہ روزہ کی طرح نماز کا بھی بدل ہو جائے گا۔ یا اس کی علت ایسی ہے جو روزہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے تو فدیہ بدل نماز نہ ہوا مگر ایک صدقہ و نیکی ضرور ہے۔ جس میں گناہ مٹانے کی صلاحیت ہے۔ (اس لیے احتیاطاً نماز کے فدیہ کی وصیت کرنا واجب کیا گیا)

(۱) ردالمحتار، ج:۱، ص:۵۳
(۲) ردالمحتار، ج:۱، ص:۵۳
(۳) بقرہ، پ:۲، ع:۷، ت:۱۵۴

ردالمحتار میں علامہ شامی فرماتے ہیں:

وکذا علقه (أی الإمام محمد رحمة الله علیه) بالمشیئة فیما إذا أوصیٰ بفدیة الصلوٰة لأنهم ألحقوها بالصوم احتیاطاً لاحتمال کون النص فیه معلولا بالعجز، فتشمل العلة الصلوٰة، وإن لم یکن معلولاً یکون الفدیة برّا مبتدءًا یصلح ماحیا للسئیات۔[1]

امام احمد رضا علیہ الرحمہ یہی تفصیل اجمالاً بیان فرماتے ہیں:

یہ نہیں معنی کہ ناجائز ہے یا بے کار ہے
آخر اک نیکی ہے، نیکی ماحیِ اوزار ہے

چوں کہ خاص فدیۂ سجدہ کے بارے میں جائز، مفید اور ماحیِ سیئات ہونے کا حکم کتب فقہ میں صراحۃً مذکور نہیں اس لیے فرمایا:

قُلْتُهٗ اَخْذًا مِّنَ التَّعْلِیْلِ فِیْ اَمْرِ الصلاہ
وَهُوَ بحثٌ ظَاهِرٌ وَّالْعِلْمُ حَقًّا لِلْاِلٰه

یہ حکم فقہاکی اس تعلیل سے ماخوذ ہے جو انھوں نے فدیۂ نماز کے بارے میں افادہ فرمائی۔ اور یہ کوئی پوشیدہ و دقیق بات نہیں بلکہ روشن بحث ہے۔ اور علم کما حقہ معبود برحق ہی کو ہے۔

میں نے یہاں مسائل کو بسط وتفصیل کے ساتھ صرف اس لیے بیان کر دیا ہے کہ یہ سمجھا جا سکے کہ اعلیٰ حضرت نے نظم میں جواب کی پابندی کے باوجود مسئلے کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑا۔ مسئلے کی توضیح، تنقیح، تصحیح، ترجیح، دلیل اور حوالۂ کتاب اسی شان سے تحریر فرمایا جو نثر میں ان کے لیے معروف ہے۔ نظم کا نمایاں وصف ایجاز واختصار ہے، تو اعلیٰ حضرت کا کمال ایجاز بھی یہ ہے کہ صرف ان ہی دس اشعار میں یہ ساری تفصیلات بیان کر دیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مزید خوبی آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمائی کہ سائل نے جس بحر میں سوال کیا، اعلیٰ حضرت نے اسی بحر میں جواب دیا۔ دیکھیے دونوں کی بحر، بحر رمل مثمن مقصور ومحذوف ہے۔

فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلات/یا فاعلن (مکرر)

(۱) ردالمحتار، ج:۱، ص:۳۹۲

سوال:

عالمان شرع سے ہے اس طرح میرا سوال
دیں جواب اس کا برائے حق مجھے وہ خوش خصال

عالمانے	شرعسے ہے	اس طرح مے	راسوال	
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات	
دیں جوابس	کابرائے	حق مجھے وہ	خوش خصال	(مقصور)
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات	

گر کسی نے ترجمہ سجدہ کی آیت کا پڑھا
تب بھی سجدہ کرنا کیا اس شخص پر واجب ہوا

گرکسی نے	ترجمہ سَج	داک آیت	کا پڑا	
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن	
تب بِ سجدہ	کرنَ کا اس	شخص پر وا	جب ہوا	(محذوف)
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن	

جواب:

ترجمہ بھی اصل سا ہے وجہ سجدہ بالیقین
فرق یہ ہے فہم معنی اس میں شرط اس میں نہیں

ترجمہ بھی	اصل سا ہے	وجہ سجدہ	بلیقیں	(مقصور)
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات	
فرق یہ ہے	فہم معنی	اس مِ شرطس	مے نہیں	
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات	

آیت سجدہ سنی جانا کہ ہے سجدہ کی جا
اب زباں سمجھے نہ سمجھے سجدہ واجب ہو گیا

آیتے سج	دہ سنی جا	ناک ہے سج	دہ ک جا
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن

ہوگیا (محذوف)	سجد واجب	جے نَ سم جے	اب زبا سم
فاعلن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن

اس بحر کی پابندی کے باوجود جواب کی شعری خوبیاں نمایاں ہیں۔ دونوں کو ایک بار پھر پڑھ کر دیکھیے۔ سوال میں تکلف کی جھلک نمایاں ہے۔ خصوصاً "چاہیے ہے آپ کو دینا جواب باصواب" میں "ہے" کا لفظ مذاق پر گراں معلوم ہوتا ہے، مگر وزن اس کے بغیر درست بھی نہیں ہوتا۔ حالاں کہ سائل نواب مولانا سلطان احمد خاں صاحب بریلوی خود عالم وفاضل اور باکمال شاعر ہیں۔

سوال کے برخلاف اعلیٰ حضرت کے جواب میں کوئی لفظ محض وزن و قافیہ کی پابندی کے پیش نظر لایا گیا ہو، کہیں ایسا محسوس نہ ہوگا۔ حشو اور بھرتی کا کوئی لفظ نہیں۔ ہر جگہ برجستگی، سلاست، لطافت ہی لطافت ہے۔ تصنع و تکلف کا نام ونشان نہیں۔

یہ ہے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کا وہ ہمہ گیر کمال، جس نے شعرا، علما، فقہا سبھی کی محفل میں ان کا مقامِ امتیاز نہایت بلند کر دیا ہے۔ ع

جس سمت آ گئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

مفتی اعظم کے ایک فتوے کا تقابلی مطالعہ [1]

کسی شخصیت کے علمی فضل وکمال سے آشنائی کے لیے دو ہی طریقے زیادہ کارگر اور معتبر ہوتے ہیں، ایک یہ کہ خود اس کی علمی گفتگو سنی جائے اور مختلف موضوعات پر اس سے کلام کر کے اس کی وسعت نظر، استحضار اور علمی گہرائی کا اندازہ کیا جائے، دوسرے یہ کہ اگر اس کے رشحات قلم موجود ہوں اور متعدد موضوعات پر اس کے مضامین و کتب دستیاب ہوں تو انھیں پڑھ کر اس کے علمی منصب و مقام کا تعین کیا جائے، ماضی کی شخصیات کے بارے میں یہی دوسرا طریقہ زیادہ استعمال ہوتا ہے، اور باوثوق سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کی زبانی فضل وکمال کا جو اجمالی تعارف و تذکرہ ہوتا ہے اس سے کسی محقق کی پوری تسکین نہیں ہوتی، خصوصاً اگر بیان کرنے والے افراد کا علم وکمال اور ثقاہت و تقویٰ اس کے نزدیک زیادہ قوی نہ ہو تو اس کے لیے اعتماد اور مشکل ہو جاتا ہے۔

ہم نے مفتی اعظم کی علمی مجلسیں تو بالکل نہ پائیں یا بہت ہی کم پائیں، اس لیے ہمارے لیے ان کی تصانیف اور ان کے رشحات قلم ہی مشعل راہ کا کام کر سکتے ہیں اور بحمدہ تعالیٰ جب ہم ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو نہ صرف فقہ وفتویٰ بلکہ تفسیر وحدیث، عقائد وکلام، عربیت وبلاغت، حسن انشا وکمال تفہیم، حالات زمانہ سے آشنائی اور حکمت وتدبیر جیسے بہت سے محاسن مفتی اعظم کی ذات میں یکجا نظر آتے ہیں، اس اجمال کی تفصیل یا اس دعوے کی تصدیق کے لیے میں کچھ شواہد پیش کر رہا ہوں، تاکہ عام قارئین بھی مفتی اعظم کی جلالت شان سے کسی قدر روشناس ہو سکیں۔

فتوے کا کام کوئی نئی چیز نہیں، مفتی اعظم کے زمانے میں اور اس عصر سے پہلے اور بعد میں بھی یہ کام برابر ہوتا رہا ہے اور آج بھی جاری ہے مگر جب فتاوی کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ہر مفتی کے خاص کمال کو گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں تو ہر ایک کا جوہر نمایاں ہوتا ہے اور جو ان میں ممتاز ہے اس کی امتیازی حیثیت عیاں ہوتی ہے۔

حسن اتفاق سے مجھے ایک سوال ایسا ملا جس کا جواب مفتی اعظم کے ساتھ ان کے معاصر متعدد ارباب فتویٰ نے رقم کیا ہے، ان جوابات میں جو فرق میں نے محسوس کیا وہ بیان کرنے میں اگر کامیاب ہو گیا تو کسی حد تک مفتی اعظم کے افتا کا کمال واضح ہو سکے گا۔

(۱) انوار مفتی اعظم، ص: ۲۳۱ تا ۲۴۷، رضا اکیڈمی، ممبئی سنہ ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء

قصہ یہ ہے کہ تحریک خلافت کے دوران مسٹر ظفر بی اے کی ایک نظم بعنوان "نالۂ خلافت" کئی بار شائع ہوئی، پھرے جون ۱۹۲۵ء کے اخبار زمیندار میں وہی نظم "فیصلۂ کفر واسلام" کے عنوان سے دوبارہ چھپی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ کے خلیفہ و شاگرد مولانا سید احمد ابوالبرکات قادری رضوی قدس سرہ (۱۳۱۲ھ-۱۳۹۸ھ) نے اس نظم کے تین اشعار سے متعلق مفتیان کرام سے استفتا کیا اور ان کے جوابات شائع کیے (بعض حضرات سے سوالات میں اس سے قبل کے بھی دو اشعار ارسال کیے گئے تھے) اشعار یہ ہیں:

یہ سچ ہے کہ اس پہ خدا کا چلا نہیں قابو
مگر ہم اس بت کافر کو رام کرلیں گے
بجاے کعبہ خدا آج کل ہے لندن میں
وہیں پہنچ کے ہم اس سے کلام کرلیں گے
جو مولوی نہ ملے گا تو مالوی ہی سہی
خدا خدا نہ سہی رام رام کرلیں گے

ذوق ایمانی رکھنے والا ہر شخص ان اشعار کو سن کر ہی متنفر و بیزار ہو جائے گا اور پکار اٹھے گا کہ یہ کسی ایمانی فکرو ذہن کی پیداوار نہیں ہے اور شاعر حریم اسلام سے قدم باہر نکال چکا ہے مگر جب ایک مفتی سے اس کے متعلق سوال ہوگا تو وہ محض اپنے ذوق کے حوالہ سے جواب نہیں دے سکتا، بلکہ عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر اور شرعی اصول پر ہر شعر کو جانچ کر واشگاف انداز میں دلائل و وجوہ کے ساتھ واضح کر کے اسے جواب دینا پڑے گا، اب آیئے دیکھیں کہ مفتیان کرام نے کیا جوابات تحریر فرمائے۔

① مفتی مدرسہ ارشاد العلوم رامپور، مولانا ارشاد حسین مجددی نے ان تین اشعار اور ان سے قبل کے دو اشعار دیکھ کر جو حکم تحریر فرمایا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

"صورت مسؤلہ میں تیسرے شعر کا پہلا مصرع اور چوتھا شعر، اور پانچویں شعر کا آخری مصرع لزوم کفر میں صریح ہے، اس وجہ سے کہ تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں قائل خداے تعالیٰ کے عاجز ہونے کی تصریح کرتا ہے۔ وھل ھٰذا الاکفر صریح.

اور چوتھے شعر کو بالفرض اگر تعریض پر محمول کیا جائے تب بھی ایسی تعریضیں کہ جن سے حق سبحانہ و تعالیٰ کی شان کی تنقیص مترشح ہو اور اس کی تنزیہ و تقدیس کے خلاف ہوں قطعاً کفر ہیں۔ خدا خدا نہ ہوا بلکہ ان یاوہ گو۔ اَلشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ (سورہ شعراء ۲۶/۲۲۴) کے تعریضات اور تمسخر کا آلہ ہو گیا کہ کبھی کسی اکفر سے خدا کو تعبیر کر دیا، اور کبھی مشرک سے، کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (سورہ کہف ۱۸/۵) کجا حق سبحانہ و تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہ، معبود برحق اور کجا رام و لچھمن کہ جو دو شخص اہل ہنود کے معبود باطل، جن کو وہ نعوذ باللہ خدا مانتے اور جانتے ہیں۔

مؤخر الذکر تین شعروں کے بعض الفاظ صریح کفر ہیں اور شرعاً حکم کفر اس پہ ہوتا ہے جس پر صراحۃً قائل کا لفظ دلالت کرے اگرچہ قائل نے قصد کفر نہ کیا ہو۔"

مذکورہ اشعار کے حکم میں کل اتنی ہی بات ہے جو اس فتوے میں لکھی گئی اور قائل پر حکم کی صراحت قید تحریر میں نہ آئی، ہاں ابتدائی تمہید اور بعد کی عبارتیں ایک ساتھ ملانے کے بعد یہی متعین ہوتا ہے کہ صاحب فتوی کے نزدیک ان اشعار کے قائل کی تکفیر ہی ہوگی۔ وجہ کفر میں صرف ایک بات واضح طور پر بیان کی گئی کہ پہلے مصرع میں قائل نے خدا کے عاجز ہونے کی تصریح کی ہے، اس کے باوجود یہ فرمایا کہ لزوم کفر میں صریح ہے اور بطور ابہام یہ لکھا ہے کہ تین شعروں کے بعض الفاظ صریح کفر ہیں، جب کہ ان الفاظ کی صراحت اور وجہ کفر کی وضاحت کے لیے قاری کی جستجو اور دریافت کو سخت تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

② دوسرا فتوی پاکستان کے مشہور عالم مولانا عبد الکریم درسؔ مفتی کراچی کا ملاحظہ ہو، ان کے پاس مذکورہ تین اشعار اور ان سے قبل کے دو اشعار ارسال ہوئے تھے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

نیچے کے تینوں شعر متوازی بکفر و محتوی ارتداد ہیں، ان تینوں شعروں میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا حقیقی معنی مہجور یا متعذر یعنی ایسا متروک الاستعمال ہو جس میں تاویل کی گنجائش ہو، تیسرے شعر کے جملہ "یہ سچ ہے" سے شائبہ شک بھی دور ہو گیا، اور نعوذ باللہ من سوء ذاک الاعتقاد، خالق کا اپنی مخلوق پر قابو نہ چلنے کی تحقیق اور تاکید ہوگئی اور آیہ کریمہ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سورہ ھود: ۱۱/۴) سے صاف صاف انکار ہو چکا۔ وھٰذا کفر صریح.

اور دوسرے مصرع میں ذات خداوندی پر اپنی نِدّیت ثابت کی ہے۔ خاک بدہن قائلش

چوتھے شعر کے پہلے مصرع سے اس موجود حقیقی کا کعبہ سے خلو، اور لندن کو اس لامکان ذات کا مکان اور مقام قرار دینا کفر نہیں تو اور کیا ہے؟

اور دوسرا مصرع پہلے مصرع کا مؤید یعنی "وہیں پہنچ کر ہم اس سے کلام کرلیں گے" اور "کلام کرلیں گے" سے کلیم اللہ بننا سب سفسطہ اور الحاد ہے۔

پانچویں شعر میں آیۂ کریمہ وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ (سورہ فاطر ۱۹/۳۵) کا انکار ہے۔ مولوی اور مالوی یعنی مومن اور کافر، عارف اور اجنبی یعنی غیر عارف دونوں مسٹر ظفر کے سامنے برابر ہیں، مالوی۔ مولوی تو مولوی ایک فاسق مسلم کے برابر بھی نہیں ہو سکتا، ان شعروں کا قائل کافر اور مرتد ہے، الا ان یرجع و یتوب.

اس فتوے میں وجوہ کفر کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ کہنا کہ مخلوق پر خالق کا قابو نہ چلا۔ (۲) اپنے کو ذات الٰہی کا مساوی و مقابل ٹھہرانا۔ (۳) ذاتِ لامکان کے لیے مکان قرار دینا۔ (۴) کلیم اللہ بننے کا دعویٰ اور خیال۔ (۵) مومن اور غیر مومن کو یکساں قرار دینا اور دونوں میں فرق نہ جاننا۔

ساتھ ہی قائل کا حکم آخر میں واضح کر دیا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ فتویٰ پہلے فتوے سے زیادہ وقیع اور تشفی بخش ہے، بیان میں اجمال اور عربی الفاظ کے، کثرت سے استعمال کی شکایت کی جا سکتی ہے۔ وہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ مستفتی خود ہی زبردست عالم ہیں۔ بہر حال بحیثیت مجموعی پہلے فتوے سے یہ بدرجہا واضح و جامع ہے۔

(۳) تیسرا فتویٰ مولانا محمد ابراہیم قادری مدرس اول دار العلوم شمس العلوم بدایوں کا ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

"فقہاے کرام علیہم الرحمہ نے فرمایا کہ جو شخص خداے تعالیٰ کو معاذ اللہ ایسے وصفوں سے متصف کرے کہ اس کے لائق نہ ہوں، یا خداے تعالیٰ کو جاہل، عاجز ٹھہرائے یا اس کے نام کے ساتھ تمسخر کرے اور اختیاراً ایسے قول کہے (وہ تعریضاً اور نقلاً نہ ہوں) اگرچہ کہنے والا اسے کفر نہ جانے اور اس کا اعتقاد نہ رکھے، وہ شرعاً ایسے قول کی بنا پر کافر ہو جاتا ہے" اس بیان کی مؤید عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"جو شخص نثراً، نظماً یہ کہے کہ خدا کا اس بت کافر پر قابو نہ چلا مگر میں اس کو مطیع کرلوں گا یا خدا، خدا کی جگہ رام رام باتباع فلاں کافر کرلوں گا تو یہ کلمات صریحاً کفر کے ہیں، جس میں تاویل کی گنجائش نہیں، اگرچہ کہنے والا اعتقاد نہ رکھے۔"

اس فتوے کی تمہید میں چند وجوہ کفر ذکر کرنے کے بعد ان کے قائل کا حکم بیان کیا اور اس کی تائید میں کتب فقہ کی عبارتیں پیش کر دیں، آخر میں شعر سے متعلق کفر کی دو وجہیں تحریر کیں، ایک خدا کو عاجز اور اپنے کو قادر بتانا، دوسری خدا کی جگہ باتباع کافر رام رام کرنا، ان سب کو کفریہ کلمات بتایا، اور قائل خاص کا حال غالباً تمہید فتوی کی روشنی میں فہم ناظرین پر چھوڑا۔

بہر حال اس میں دو وجہیں بہت صراحت کے ساتھ بیان کیں، اور قائل کا حکم بھی کسی قدر ظاہر کر دیا، اگرچہ بہ الفاظ خویش صراحت نہ کی، اس لحاظ سے یہ فتوی پہلے فتوے سے بہتر اور دوسرے فتوے سے کم تر ہے۔

(۴) چوتھا فتوی امام احمد رضا قدس سرہٗ کے سچے اور جاں نثار حامی، ہمارے مخدوم گرامی حضرت مولانا سید

اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی سجادہ نشین سرکار مارہرہ شریف رحمہ اللہ تعالیٰ ورحمنا بہ کا ہے، ان کی ابتدا و اشگاف اور واضح و غیر مبہم ہے اور جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں کسی شہرت گیر اخبار کے ایڈیٹر کے ادنیٰ سے ادنیٰ پاس و لحاظ سے بہت دور ہو کر دین و ایمان اور حقیقت و حقانیت کی پاس داری کا جذبہ بہت عیاں ہے۔ جو اس خاندان والا شان کی ہر دور میں نمایاں روایت رہی ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ آج بھی جاری ہے۔ رقم طراز ہیں:

"شعر نمبر ۳: یقیناً قطعاً کفر خالص ہے۔ اس میں نہایت صاف واضح الفاظ میں خدا کو عاجز کہا اور عاجز بھی کیسا کہ جس "بت کافر پر بقول اس شاعر کافر کے خود یہ قادر ہے، خدا کا اس پر کچھ بس نہیں چلا اور یہ خدا کی طرف عجز کی نسبت اور وہ بھی ایسی، یقیناً قطعاً اجماعاً کفر خالص ہے۔"

اس کے بعد تائیدی عبارتیں نقل کی ہیں۔ پھر فرماتے ہیں:

"یہ شعر اپنے اس معنی کفری میں نہایت واضح و صاف، متعین ناقابل تاویل و توجیہ ہے، جس میں کسی ایسی تاویل کی جو اسے کفر سے نکال سکے اصلاً گنجائش نہیں، نہ ایسے کفر صریح میں ادعاے تاویل مقبول و صحیح۔"

پھر شفا و نسیم الریاض کی عبارتیں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس شاعر کے خسار و بوار کے لیے اس کا یہی ایک ملعون شعر کیا کم تھا کہ اس نے آگے اور کفر بکا اور شعر نمبر ۴: کے پہلے مصرع میں مشرک کو اپنا رہبر و رہنما، ہادی و پیشوا بنانے کی اپنی مشرک پرستی کو ایک تعلیق موہوم کی بے معنی آڑ کے ساتھ ظاہر کرنے کے بعد دوسرے مصرع میں صاف صاف کہہ دیا کہ ع- خدا خدا نہ سہی رام رام کرلیں گے۔

اس مشرک پرستی پر تو رد کامل علماے اہل سنت کے رسائل میں ہے۔ یہاں کہنا یہ ہے کہ اس دوسرے مصرع میں کلمۂ اسلام خدا خدا کو ایک کلمۂ کفر رام رام سے مساوی ماننا اور اس کلمۂ اسلام کو چھوڑ کر اس کلمۂ ملعونہ یعنی رام رام کو اختیار کرنا ہے، اور یہ دونوں یقیناً کفر ہیں۔

کفر و اسلام کے مساوی جاننے کا کفر ہونا تو بدیہی ہے، اور رام کے معنی ہیں رما ہوا، سمایا ہوا، مشرک خدا کو اسی لیے رام کہتے ہیں کہ وہ ان کے زعم فاسد میں ہر شَے ہر خلا میں رما ہوا، سمایا ہوا ہے اور خدا کو کسی چیز میں رما ہوا جاننا یقیناً کفر ہے۔ (پھر عبارت اِعلام ابن حجر و حوالۂ شفا)

اور کفـــر اِس وقت کرے یا آئندہ اس کے کرنے کا ارادہ کرے بہر حال اِسی وقت کافر ہو جائے گا۔ (بعدہ عبارت ہندیہ عن الخلاصہ)

اس فتوے میں شاعر کا حکم بھی واضح ہے اور وجوہ کفر بھی تحقیقی طور پر صاف صاف بیان کی گئی ہیں، الفاظ بھی سلیس، اکثر عام فہم زوردار اور واضح و غیر مبہم استعمال کیے گئے ہیں۔

غور فرمائیں درج ذیل وجوہ کفر کو کس عمدہ طریقہ پر ثابت فرمایا ہے:

(۱) خدا کی طرف عجز کی نسبت بلکہ صراحۃً عاجز کہنا، وہ بھی اس حد تک کہ جس پر خود یہ شاعر قادر ہے وہ اس سے عاجز ہے۔

(۲) مشرک کو اپنا ہادی و پیشوا بنانا، جس کی تفصیل رسائل علمائے اہل سنت کے حوالے کی۔

(۳) کلمۂ اسلام کو کلمۂ کفر کے مساوی ماننا۔

(۴) کلمۂ اسلام چھوڑ کر کلمۂ کفر اختیار کرنا۔

(۵) خدا کو کسی چیز میں رما ہوا سمجھنا۔

یہ پانچ وجہیں اس فتوے سے عیاں ہیں، اور جیسا کہ راقم نے اخذ کیا، مولانا عبد الکریم درس علیہ الرحمہ کے فتوے سے بھی پانچ وجہیں دریافت ہوتی ہیں پہلی وجہ تو وہی ہے جو ہر فتوے میں بیان کی گئی ہے، باقی چار وجہیں الگ ہیں۔

(۲) اپنے کو ذات الٰہی کا مساوی و مقابل ٹھہرانا۔

(۳) ذات لامکاں کے لیے مکان قرار دینا۔

(۴) کلیم اللہ بننے کا دعویٰ۔

(۵) مومن و غیر مومن کو یکساں قرار دینا۔

اگرچہ یہ وجہیں مولانا سید اولاد رسول محمد میاں برکاتی علیہ الرحمہ کے طرز تحقیق اور انداز بیان کے ساتھ بہت واضح طور پر نہیں لکھی گئیں، مگر ان کے کلام سے یہ وجہیں آسانی سے اخذ کی جا سکتی ہیں، تاہم تعداد وجوہ برابر ہے۔ اور فتوائے مارہرہ کی زبان و بیان کا کمال، اظہار حق میں صراحت و جسارت کا جلال، شعر کے فہم و تفہیم کے ساتھ بعض الفاظ کی تحقیق اور وجوہ کفر پر کتب علما کی تائید کا حسن و جمال اپنی جگہ عیاں ہے۔

⑤ اب آیئے امام احمد رضا قدس سرہٗ کے فرزند جلیل مفتی اعظم مولانا شاہ مصطفی رضا قدس سرہٗ کے فتوے پر نظر ڈالیں جنھوں نے فتوے کے گھر میں آنکھیں کھولیں، فقہ و کلام کی باریکیوں کے حل میں طالب علمی کا زمانہ بسر کیا اور یہ عہد ابھی سر بھی نہ ہوا تھا کہ افتا کا آغاز کر دیا اور والد گرامی کی اجازتِ افتا اور عطا کردہ مہر سے سرفراز ہوئے۔ دراصل اسی فتوے کے لیے سابقہ چار فتوے بھی مکمل پاسِ ادب کے ساتھ نقل کیے گئے۔ تقابلی مطالعے کا کام ہی کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ بہت سے قابل قدر اور اپنی اپنی جگہ عظیم و جلیل رشحات قلم پر نگاہ نقد گزارتے ہوئے ہر ایک کے درجہ و مقام کو متعین کرنا فرائض میں داخل ہو جاتا ہے، مگر ان شاء اللہ المولیٰ الروف الکریم ہم کسی حال میں اکابر کے ادب اور احترام کا دامن ایک لمحے کے لیے بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیں گے۔ وھو الموفق و خیر معین.

اس فتوے پر بیس جلیل القدر علما کی تصدیقات بھی ہیں، جن میں درج ذیل ہستیاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

(۱) صدر الشریعہ ابو العلا مولانا محمد امجد علی اعظمی۔ (۲) صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی۔ (۳) شیر بیشۂ اہل سنت مولانا حشمت علی خاں قادری لکھنوی۔ (۴) مولانا سید غلام قطب الدین سہسوانی سہیل ہند۔ (۵) مولانا مفتی محمد غلام جان قادری۔ (۶) مولانا معوان حسین احمدی مجددی۔ (۷) مولانا محمد اسماعیل محمود آبادی۔ (۸) مولانا حسنین رضا قادری بریلوی۔ (۹) مولانا محمد مختار صدیقی میرٹھی۔ (۱۰) مولانا تقدس علی رضوی بریلوی، علیہم الرحمہ۔

مستفتی کی حیثیت سے نائب ناظم حزب الاحناف لاہور، جناب محمد الدین کلاتھ مرچنٹ کا نام ہے اور صرف تین اشعار مذکورۃ الصدر سے متعلق سوال کیا گیا ہے کہ کفریات کا تعلق انھیں تین سے ہے، صورت سوال یہ ہے:

"آیا یہ اشعار شرعاً درست ہیں یا خلاف شرع ہیں؟ در صورت ثانی شاعر کا کیا حکم ہے؟ ہمارے دیار کے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ان اشعار کا مفہوم کفر و الحاد ہے اور قائل پر تجدید اسلام اور تجدید نکاح لازم اور جس طرح ان اشعار کی اشاعت عام ہوئی اسی طرح توبہ نامہ کی اشاعت بھی واجب ہے۔

بعض شعرا کا خیال ہے کہ ان اشعار کا مفہوم کفر نہیں، پس جناب کی خدمت میں گزارش ہے کہ اشعار ذیل کے مفاہیم پر غور فرما کر جو حکم شرع شریف ہو اسے دلائل فقہیہ سے مزین بہ مواہیر فرما کر پتا ذیل پر حتی الوسع جلد واپس فرمائیں۔"

خاص ان اشعار سے متعلق جواب سات صفحات پر مشتمل ہے اور درمیان میں علمائے دین کے خلاف عوامی غوغا آرائیوں اور نئی روشنی، نئی تہذیب کے بے جا تجدد پسندوں اور فرقہ نیچریہ کے اضلال و اغوا اور کید و افترا کا رد ہے۔ چوں کہ فتویٰ بہت تفصیلی ہے اس لیے یہاں اس کی تلخیص اور تقابلی مطالعہ کے طور پر ضروری تحلیل سے کام لیا جا رہا ہے۔ ابتداءً چند مثالوں کے ساتھ واضح کرتے ہوئے یہ رقم فرمایا ہے:

"اے عزیز! یہ کیا پوچھتا ہے کہ یہ اشعار درست ہیں یا خلاف شرع؟ ارے برادر دینی! یہ پوچھ کہ کیسے اخبث و اشنع کفریات ہیں، جن میں شائبہ بھی ایمان کا نہیں اور جو ان کے کفر ہونے اور ان کے قائل و قابل کے کافر ہونے میں شک کرے اس کا کیا حکم ہے؟ بلکہ در حقیقت توبات پوچھنے کی یہ بھی نہیں کہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ قطعاً کفر ہیں، یقیناً کفر ہیں۔ فالعیاذ باللہ تعالیٰ.

بے شک ان اشعار کا قائل و قابل کافر اور جو اس کے کفر و مستحق عذاب ہونے میں ادنیٰ شک کرے وہ بھی اسی کا ساتھی۔"

ان الفاظ سے قول اور قائل اور ان کے حامی و موافق سبھی کا حکم پہلی نظر میں ہی واضح ہو جاتا ہے۔ تفصیل اور دلائل کا نمبر اس کے بعد آتا ہے، یہ وہ طرز افتا ہے جو امام احمد رضا کے فتاویٰ میں عام طور سے ملتا ہے۔ والولد سر لأبيه.

ساتھ ہی ان سطور کے تیور سے عیاں ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کی بارگاہ منزہ و مقدس میں جسارت و بے لگامی اور گستاخ و بدکلامی کس قدر شنیع و قبیح ہے، جس کے بعد انسان کی ذاتی شان و شوکت اور وجاہت و شہرت شریعت مقدسہ کی عدالت عالیہ اور علماے ربانیین کی بارگاہ حق پسند میں ذرا بھی پاس و لحاظ کے قابل نہیں رہ جاتی جیسے دنیاوی کچہریوں میں قتل ناحق کا یقینی مجرم یا کسی شاہی حکومت میں پاک و صاف بادشاہ پر غلط بہتان و افترا کرنے والا باغی یا خلاف تہذیب گالیاں دینے والا بے باک یا ایسے کسی سلطان کا قاتل، پوری حکومت میں کسی کے نزدیک قابل رحم و لائق حمایت نہیں قرار پاتا اور ہر شخص اس کے خون سے زمین کا چہرہ رنگین کر دینا سراسر عدل و انصاف تصور کرتا ہے۔ یہی حال ان افراد کا ہوتا ہے جو خدا کی تنزیہ و تقدیس اور اس کی اطاعت و وفاداری کا قلادہ گردن میں ڈال لینے کے بعد اس پاک و بے عیب ذات بلند کی شان اقدس میں یاوہ گوئی یا اس کے باجبروت قانون عام کی کھلی ہوئی خلاف ورزی اور بغاوت اور اس کی حکومت میں رہ کر اس سے بے وفائی پر اتر آتے ہیں۔ یقیناً یہ کوئی زیادتی یا ناانصافی نہیں۔

نئی روشنی کے بے جا تجدد پسندوں کو شاتمان خدا اور سول کی یہ حیثیت شاید آفتاب کی روشنی میں بھی نظر نہیں آتی، یا دماغوں کی صائب روشنی سے عاری ہو چکے ہیں، اس لیے مذکورہ بالا قسم کے دنیاوی فیصلوں کو تو حق و انصاف سمجھتے ہیں مگر اس سے زیادہ برے جرم پر شرعی فیصلوں کو طعن و تشنیع سے یاد کرنا، اپنے ذہن و دماغ کا کمال اور اپنی زبان و قلم کا ہنر سمجھتے ہیں، جب کہ یہ سراسر ناانصافی، بددماغی اور بدزبانی ہے۔ خدا عقل سلیم سے نوازے اور حق کو حق، ناحق کو ناحق دکھائے۔

اب آیئے یہ دیکھا جائے کہ فتوے کی ابتدائی سطور کی تفصیل اور ان کی دلیل میں کیا لکھا گیا ہے؟

ابتدائی سطور چند باتوں پر مشتمل ہیں:

(۱) قول کا حکم (۲) قائل کا حکم (۳) اس قول کو ماننے والے اور قبول کرنے والے کا حکم (۴) قائل و قابل کے حکم کفر میں شک لانے والے کا حکم۔ اس لیے تفصیل اور دلیل میں بھی ان سب سے بحث ناگزیر ہے، دیگر فتاوی سے اس فتوی کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ صرف قول و قائل ہی نہیں بلکہ ذکر شدہ چاروں امور کا احاطہ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو، تحریر فرماتے ہیں:

"شعر اول کے دونوں مصرعے کفر خالص ہیں۔

(۱) پہلے میں صاف تصریح کی کہ اس بت پر خدا کا قابو نہ چلا۔

(الف) یہ اللہ عز و جل کی کھلی توہین اور اس کی قدرت عظیمہ، کاملہ، کریمہ اِنَّ اللہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کا رد و انکار ہے کہ ایک شَے ایسی بھی ہے جس پر خدا کو قدرت نہیں اور اس پر اس کا قابو نہیں اور وہ اس سے عاجز رہا۔

(ب) یہ سرے سے الوہیت کا انکار ہوا کہ جو عاجز ہو خدا ہی نہیں ہو سکتا، تو مصرع خبیثہ لعینہ کے قائل نے الوہیت کا حقیقتاً انکار و ابطال کیا، تو بے شک وہ اور جو اسے قبول کرے وہ، ہر مسلمان کے نزدیک کافر ہوا، اور جو ایسے کو کافر نہ جانے یا اس کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر، کہ پہلے نے کفر کو کفر نہ جانا۔ الوہیت ہی کا انکار اگر کفر نہ ہوا تو اور کیا کفر ہوگا؟ ایمان کو ایمان جیسا جاننا ضرور ہے، یوں ہی کفر کو کفر جاننا، جو کفر کو کفر نہ جانے گا وہ ایمان کو کیا جانے گا کہ تعرف الأشياء بأضدادها (چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں) اندھا روشنی کی قدر کیا جانے گا، اور دوسرے نے شک کیا، اور کفر کے کفر ہونے کی تصدیق ضروری ہے تو شک اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، کہ تصدیق ہی کا نام ایمان ہے اور وہ بہ حالت شک ناممکن۔

(۲) اور دوسرے مصرع میں برملا اپنے آپ کو خدا سے زائد قدرت والا بتایا تو اس کا مرتبہ گھٹایا اور اپنا رتبہ اس سے بڑھایا، ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ کتنا خبیث تر کفر ملعون ہوا۔

اس دوسرے مصرع میں اپنی الوہیت کا اثبات کیا، پہلے مصرع میں خدا کی الوہیت سے اسی لیے انکار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ لوگ جسے خدا کہتے ہیں اور اس کی قدرت بہت عظیم مانتے ہیں اور اسے ہر شَے پر قادر جانتے ہیں، ہم سچ کہتے ہیں کہ ایک چیز ایسی ہے کہ اس سے وہ عاجز رہا، اسے وہ اپنی قدرت سے دبا تا رہا، مگر اس کا اس پر قابو نہ چلا تو وہ خدا نہ ہوا کہ خدا عاجز نہیں ہوتا۔

اور ہم اس چیز کو بھی رام کر لیں گے، جس پر لوگوں کے خدا کا قابو نہ چل سکا، اور جس سے وہ عاجز رہا، کسی طرح اسے رام نہ کر سکا، تو ہم ہر شَے پر قادر ہوئے، تو ہم خدا ہوئے نہ کہ وہ عاجز کہ جسے لوگوں نے خدا بنا لیا۔ والعیاذ باللہ سبحانہ وتعالیٰ

کیا کوئی مسلمان اس کے کفر ملعون ہونے میں ادنیٰ شک لائے گا، بے شک ہر مسلمان کہے گا لاریب یہ کفر ہے اور اس کا قائل و قابل کافر۔

(۳) یوں ہی اس کا دوسرا شعر:

بجاے کعبہ خدا آج کل ہے لندن میں
وہیں پہنچ کے ہم اس سے کلام کر لیں گے

کفر خالص ہے۔ (۱) مسلمانوں کا دینِ مقدس اسلام، اللہ کو جسم و جسمانیات سے پاک بتاتا ہے۔

(الف) مکان جسم ہی کے لیے مخصوص ہے تو اللہ تعالیٰ مکان سے پاک ہے وہ مجسم نہیں۔

(ب) مکان مخلوق ہے، وہ خالق ہے۔

(ج) مکان حادث ہے، وہ قدیم ہے۔

(د) مکان جسم کو محیط ہوتا ہے اور اللہ اس سے پاک ہے کہ کوئی شَے اس کا احاطہ کرے، وہ اپنے علم و قدرت سے ہر شَے کو محیط ہے۔ و اللہ بکل شيء محیط.

اور شاعر لندن کو خدا کا مکان بتاتا ہے، تو خدا کو مجسم جانتا ہے اور لندن کو اسے محیط مانتا ہے جب تو کہتا ہے کہ خدا آج کل کعبے میں نہیں، لندن میں ہے، بے شک وہ اہل اسلام کے نزدیک کافر ہے، اللہ و رسول کے نزدیک کافر ہے۔

باوجودے کہ مسلمان کعبۂ معظمہ کو، بلکہ ہر مسجد کو، اس لیے کہ وہ خالصاً اللہ ہی کی ملک ہیں، بیت اللہ کہتے ہیں، مگر جو کعبۂ معظمہ کو اللہ کا مکان اور اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس کا مکین مانے ان کے نزدیک کافر ہے۔ یوں ہی اللہ عزوجل زمان سے بھی پاک ہے کہ زمانہ بھی حادث و مخلوق ہے۔

(۲) اور یوں بھی کہ اس نے کعبۂ معظمہ سے لندن کو بڑھایا۔ کعبۂ مقدس کی توہین کی، مگر جو ربِّ کعبہ کی ایسی شدید توہین و تنقیص کر چکا ہو ایسے سے اس کی کیا شکایت کرنا، ما علی مثله یعد الخطا۔ (ایسے کی خطا کی کیا گنتی؟ کیا شمار؟)

(۳) یوں ہی اس کا تیسرا شعر کھلا الحاد و زندقہ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ (الف) مولوی و مالوی اس کے نزدیک برابر ہیں، (ب) خدا اور رام ایک ہیں، (ج) کفر و اسلام میں کچھ فرق نہیں، (د) اس کے نزدیک خدا خدا نہ کیا رام رام کر لیا بات ایک ہی ہے، حاصل وہی ہے، حالاں کہ ہرگز خدا رام نہیں اور ہرگز رام خدا نہیں، (ہ) مشرکین کا مذہب نا مہذب ہے کہ ہر چیز میں رما ہوا، سرایت و حلول کیے ہوئے ہے، خدا کو اپنے اسی عقیدۂ خبیثہ کی بنا پر رام کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ "رمنے" اور حلول کرنے سے پاک ہے، تو خدا کو رام کہنا کفر ہوا اور خدا خدا کرنا عبادت اور کفر کو عبادت جاننا کفر۔ اور نہ سہی؛ فرض کیجیے کہ وہ رام کے یہ معنی بھی نہ سمجھتا ہو جب بھی ہمارا خدا وہ نہیں، جو ہنود بے بہبود کا مذموم خدا ہے جسے مشرکین نے خدا سمجھ لیا ہے۔ (د) اور مشرکین میں تو اتنا جذب ہو جانے کو تو دیکھو کہ خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے، کہ مسلمان اور اس کے پیشواؤں کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ ان کے معبود برحق کا ترک اور مشرکین میں گھلنے کے لیے ان کے معبود باطل کا اختیار ہے، اور یہ ترک اور اختیار دونوں کفر ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ کیسا اخبث کلمہ ہے۔

جو مولوی نہ ملے گا تو مالوی ہی سہی
خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے

کہ مولوی نہ ملے گا تو وہ بد نصیب مولوی کے خدا کو ہی چھوڑ دے گا اور مشرکین کے طاغوت مالوی کو اختیار کرے گا اور مالوی کے خدا کو پوجنے لگے گا۔

اس کے قائل اور ان شعرا پر جنھوں نے کہا ہے کہ ان اشعار کے مفاہیم کفر نہیں، توبہ و تجدید ایمان فرض اور ہر فرض سے بڑھ کر فرض ہے، نئے سرے سے مسلمان ہوں اور اپنی اپنی بیویوں سے جب کہ وہ راضی ہوں، از سر نو نکاح کریں اور کہیں بیعت ہوں تو تجدید بیعت بھی لازم، یوں ہی اگر حج کر چکے ہوں تو پھر حج کرنا بھی ضروری ہے کہ کفر سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں، تو پہلا حج مثل اور اعمال کے حبط ہو گیا اب دوسرا حج یوں فرض کہ حج کی فرضیت کا وقت عمر ہے، لہٰذا اب پھر حج ضروری و واجب، توبہ کریں اور بہانے نہ بنائیں کہ وہ کافر ہو چکے اپنے ایمان کے بعد۔ واللہ الموفق۔" (ملخصا)

اس فتویٰ میں وجوہ کفر کا جس ژرف نگاہی اور دقتِ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے وہ ناظرین پر عیاں ہے، ساتھ ہی ہر وجہ کی دلیل بھی بیان کر دی گئی ہے اور قائل کا حال بھی منکشف کر دیا گیا ہے، وجوہ کفر پر نظر ڈالیں تو درج ذیل امور سامنے آئیں گے:

(۱) خدا کی قدرت کاملہ کا انکار اور اس کی عاجزی کا اقرار، (۲) اس سے دراصل خدا کی الوہیت اور اس کے خدا ہونے ہی کا انکار ہوا، (۳) اپنی قدرت کو خدا کی قدرت سے زائد بتانا، (۴) یہ دراصل اپنی الوہیت کا اثبات ہوا، اسی لیے پہلے خدا کی الوہیت سے انکار کیا، (۵) خدا کے لیے مکان ماننا، (۶) مکان جسم کے لیے ہوتا ہے تو خدا کو جسمانی جاننا، (۷) یہ ماننا کہ لندن اسے محیط ہے، (۸) لندن کو کعبۂ معظمہ سے بڑھانا اور کعبہ کی توہین کرنا، (۹) مولوی و مالوی، مومن و غیر مومن میں فرق نہ ماننا، (۱۰) خدا اور رام کو ایک سمجھنا، (۱۱) کفر و اسلام میں فرق نہ جاننا (۱۲) کلمۂ اسلام خدا خدا اور کلمۂ کفر رام رام کو یکساں قرار دینا، (۱۳) خدا کے لیے کسی چیز میں سرایت و حلول کے اعتقاد پر مشتمل لفظ اختیار کرنا، (۱۴) اہل اسلام اور ان کے معبود برحق کا ترک، (۱۵) اہل باطل اور ان کے معبود باطل کو اختیار کرنا۔

ان اشعار میں جو قوی، صاف، صریح اور ناقابل تاویل وجہیں التزاماً اور لزوماً موجود تھیں انھیں کو فتوے میں واضح طور پر پیش کر کے ان کے احکام بیان کر دیے گئے ہیں، اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی صداقت و قوت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود فتوے کے الفاظ پیش کر دینے اور ان کی خصوصیات کی جانب اجمالی اشارہ اور مختصر وضاحت کر دینے کے بعد دیگر فتاوی سے اس فتوے کا امتیاز اور مفتی اعظم کی دقت نظر، جودت قلم، حسن تفہیم، کمال تنقیح، زور بیان، شوکت کلام اور سطوت فتوی عیاں کرنے کے لیے مزید تبصرے اور بسط و تفصیل کی حاجت باقی نہ رہی۔

اس فتوے کے آخر میں حسبِ طلبِ سائل نصوص فقہیہ بھی پیش کر دیے گئے ہیں اور ایک حدیث کے

ساتھ یہ حکم بھی مرقوم ہے کہ اعلان جرم کی طرح اعلان توبہ بھی ضرور ہے، یہ گمان نہ کریں اور اب اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ کلمۂ کفر ایک بار زبان یا قلم سے نکل گیا اس کے بعد ہزار بار کلمہ پڑھا ہے، اب تک کیا وہ کفر باقی رہ گیا؟ اس پر مجمع الانہر شرح ملتقی الأبحر کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے:

"إن أتى بكلمة الشهادة على وجه العادة لم ينفعه مالم يرجع عما قاله لأنه بالإتيان بكلمة الشهادة لا يرتفع الكفر" (ج:۲،ص:۳۲۵،کتاب السیر والجہاد، باب المرتد، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اگر بطور عادت اس نے کلمۂ طیبہ پڑھ لیا تو یہ اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا، جب تک کہ توبہ نہ کرے، کیوں کہ بغیر توبہ صرف کلمہ پڑھ لینے سے کفر ختم نہیں ہوتا۔

یہ مبارک فتویٰ انجمن حزب الاحناف لاہور سے پہلی بار ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا، دوسری بار رضا دار الاشاعت، رچھا، ضلع بریلی شریف ۱۴۱۰ھ میں ہوا۔ سرورق پر ایک عرفی نام ہے "سیف الجبار علی کفر زمیندار" دوسرا ہجری تاریخ پر مشتمل "القسورة على ادوار الحمر الكفرة" (۱۳۴۳ھ) تیسرا عیسوی تاریخ پر مشتمل "ظفر على رمة من كفر" (۱۹۲۵ء)

درمیان رسالہ ان لوگوں کی خبر گیری بھی ہے جو ایسے شخص کو دائرۂ اسلام میں شمار کرتے ہیں، جو کلمۂ اسلام کا مدعی ہے خواہ اس کے ساتھ وہ نبوت کا دعویٰ کرے، مدعی نبوت کی حمایت کرے، اسے نبی یا امام و پیشوا مانے، خدا کے لیے کذب ممکن بلکہ واقع مانے، علم رسول کو حیوانات و بہائم کے علم سے ناپاک تشبیہ دے، کلمہ میں نام رسول کی جگہ اپنے پیر اشرف علی کا نام لے، جنت و نار، جن و ملائکہ کے وجود اور نماز و روزہ وغیرہ فرائض کا منکر ہو، ختم نبوت کے قطعی اجماعی معنی کو نہ مانے، دوسرا نبی آنا جائز یا واقع مانے اور ایسے ہی بڑے سے بڑے ایک یا چند کفر کا مرتکب ہو مگر ان کے نزدیک کلمہ پڑھ لینے کے بعد جس قدر کفریات کرتا اور بکتا رہے ایمان و اسلام رخصت نہیں ہوتا، آدمی سچا پکا مسلمان برقرار رہتا ہے۔

ہاں جو ایسے سخت شنیع کفریات کے مرتکب کو کافر کہے وہ ان کے نزدیک مجرم ہے اس کی ہر طرح تذلیل و تحقیر ان کے یہاں داخل تہذیب و شرافت ہے، اس کے خلاف صفحات کے صفحات رنگین کرنا عظیم خدمت ہے، ان کے خیال میں کفر کرنا، کفر بکنا، کفر لکھنا، کچھ عیب نہیں، کافر کہنا عیب ہے۔

ان خیالات فاسدہ کے رد میں رقم طراز ہیں:

"قرآن وحدیث ہمیں بتاتے ہیں کہ زمانۂ اقدس میں ایسے لوگ تھے جو کلمۂ اسلام پڑھتے تھے، اور نہ صرف کلمۂ اسلام ہی پڑھتے تھے بلکہ دربار رسالت میں حاضر ہو کر شہادتیں ادا کرتے تھے، کہ ضرور ضرور بے شک و شبہہ

یقینی حضور اللہ کے رسول ہیں، حضور کی خدمت میں حاضر رہتے، حضور کے پیچھے نمازیں پڑھتے، حضور کے ساتھ جہاد کرتے تھے، مگر اس کے باوجود انھیں اللہ و رسول نے جھوٹا، فریبی، کذاب، منافق فرمایا اور ان کے اس کلمۂ طیبہ پڑھنے اور بڑی بڑی تاکیدات کے ساتھ شہادت رسالت دینے اور نمازیں ادا کرنے اور جہاد میں شریک ہو کر اپنی جانیں دینے اور کفار کی جانیں لینے پر نظر نہ فرمائی، سب کو ھَبَاءً منثورًا فرما دیا۔" (انتہی بتلخیص یسیر)

اس کے بعد آیات و احادیث پیش کر کے اسے واضح فرمایا، حاشیہ کے چند صفحات پر قتل مرتد کا حکم اور اس کے خلاف غوغا آرائیوں کا دل کش و دل نشین اور مستحکم و قوی جواب بھی رقم فرمایا اور یہ ثابت فرمایا ہے کہ علما جو کچھ بیان کرتے ہیں اپنی طرف سے نہیں، قرآن و حدیث سے بیان کرتے ہیں، بلکہ قرآن نے ان باغیانِ بارگاہ صمدیت اور گستاخانِ دربار رسالت کو جس تذلیل و تحقیر کے ساتھ اور جیسے القاب حقارت کے ساتھ یاد کیا ہے علما ان کے لیے وہ سب استعمال بھی نہ کر سکے، اگر اسی طرح وہ انھیں یاد کرتے تو نہ معلوم کیسا کچھ جامہ سے نکلتے، آپے سے باہر آتے، اس پر قرآنی آیات لکھ کر وہ القاب مذمت عیاں کر دیے ہیں جو ان منکرین کے لیے وارد ہوئے، اس کے بعد فرمایا:

"بحمد اللہ تعالیٰ کلام اپنے منتہیٰ کو پہنچا اور ظاہر و باہر ہوا کہ یہ علما کو بے تہذیب و بے ادب بتانے والے خود سخت بے تہذیب اور نہایت بے ادب ہیں۔

آخر میں چند آیات و احادیث پیش کر کے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان باغیوں اور گستاخوں کے ساتھ اہل ایمان کو کیسا سلوک کرنے کی ہدایت و تعلیم دی گئی؟ اور بہ نظر اختصار چند ہی پر اکتفا کیا ہے۔

الغرض عہد و ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ کے تمام متعلقات بھی بیان کر دیے ہیں اور متعدد فتنوں اور غوغا آرائیوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے، اہل عقل و خرد اگر عدل و انصاف کے ساتھ اس رسالے کا مطالعہ کریں تو ان کے دلوں میں ایمان و اسلام کی اہمیت، بارگاہ خدا و رسول کی عظمت، کفر و ارتداد کی شناعت و قباحت، اللہ و رسول کے قطعی احکام کی خلاف ورزی و بغاوت کرنے والوں کی خرابی و حقارت اور شان خدا و رسول میں بے ادبی و جسارت کی رذالت اچھی طرح جاگزیں ہو سکتی ہے اور جاہلانہ و ظالمانہ مکر و فریب اور فتنہ و فساد سے نجات بہت آسان ہو سکتی ہے۔

اس رسالے کے مطالعہ سے مفتی اعظم کے علم و افتا کے کچھ اور گوشے بھی ملے، جو ان کے کچھ اور فتاوی میں بھی دیکھے، ان شاء اللہ المولیٰ تعالیٰ ان سب پر تفصیلی گفتگو ایک مستقل مضمون میں ہوگی، فی الحال میں سمجھتا ہوں کہ جو موضوع میں نے اختیار کیا اور جو عنوان منتخب کیا، اس سے مکمل طور پر نہیں تو بڑی حد تک سبک دوش ہو چکا ہوں۔ وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ.

شارح بخاری کی جلالت علمی سے میری روشناسی (۱)

حضرت شارح بخاری (مفتی محمد شریف الحق امجدی) کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میری عمر چھ سات برس کی تھی۔ والد صاحب کا معمول یہ تھا کہ عید کے دوسرے دن گھوسی جاتے اور اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے ساتھ وہاں کے مقتدر علما سے بھی ملتے۔ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ جب تک باحیات تھے ان کے یہاں پابندی سے حاضر ہوتے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے ساتھ میں بھی گھوسی جانے لگا۔ اس زمانے میں صدر الشریعہ تو نہ تھے مگر دیگر جن علما سے والد صاحب ملتے ان میں علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی اور حضرت مفتی صاحب قبلہ سر فہرست تھے۔ اس سے میرے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ یہ حضرات یہاں کے بڑے علما میں ہیں۔

علمی باتیں کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ ان حضرات کی مجلسوں سے اپنے طور پر کوئی رائے قائم کرتا۔ اتنا ہی تعارف ایک عرصے تک باقی رہا۔ مفتی صاحب کو خود پڑھنے اور سمجھنے کا اتفاق اس وقت ہوا جب میں مدرسہ ضیاء العلوم خیر آباد کے بعد دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں ہدایہ اولین، مشکوٰۃ شریف وغیرہ کی جماعت میں داخل ہوا، اور کسی کے ذریعہ پاسبان الہ آباد کا حسین نمبر "کربلا کا مسافر" دستیاب ہوگیا۔ پڑھنے کی عادت پرائمری ہی کے دور سے تھی۔ یہ نمبر ملا تو پورا پڑھ گیا۔ در اصل یہ نمبر محمود عباسی امروہوی کی کتاب "خلافت معاویہ ویزید" کے رد میں شائع ہوا اس کے مندرجات کو سامنے رکھ کر علامہ مشتاق احمد نظامی نے چند سوالات قائم کیے اور ملک بھر کے ارباب فکر وقلم سے جوابات حاصل کرکے شائع کیے۔ سوالات کچھ اس طرح تھے:

(۱) حضرت علی کی خلافت صحیح ہے یا نہیں؟
(۲) انھوں نے حضرت عثمان کا قصاص کیوں نہیں لیا؟
(۳) یزید فاسق وفاجر تھا یا زاہد ومتدین؟
(۴) اس کی خلافت درست تھی یا نہیں؟
(۵) حضرت امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق پر تھے یا خطا پر؟
(۶) وہ شہید فی سبیل اللہ ہیں یا نہیں؟

(۲) معارف شارح بخاری، طبع ممبئی، جنوری ۲۰۰۰ء

اس پر ملک کے طول وعرض سے کثیر علمائے کرام نے اپنے جوابات رقم فرمائے۔ بعض بہت اجمالی تھے بعض ذرا تفصیلی، اکثر مضامین میں مسلک اہل سنت کی کتابوں سے ان کے واضح جوابات پر اکتفا کیا گیا ہے مگر چند مضامین میں محمود عباسی کے خیالات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے ان میں دو تین مضامین نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ ان دو تین میں سر فہرست حضرت مفتی صاحب کا مضمون ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ مفتی صاحب نے جواب لکھنے سے پہلے خود محمود عباسی کی کتاب پوری پڑھی اور اس کی بنیادی غلطیوں پر گرفت کرکے ایسا بھرپور رد فرمایا کہ شکوک وشبہات کے سارے بادل چھٹ جائیں اور حق کا آفتاب عالم تاب ہوکر جلوہ گر ہوجائے۔ بے جا نہ ہوگا اگر میں اس مضمون پر مکمل تبصرہ کردوں تاکہ میرے تدریجی تعارف اور بے پناہ تاثر کی بات پوری ہوجائے۔

مفتی صاحب نے پہلے محمود عباسی کے تمسکات کا خلاصہ درج ذیل عبارت میں نقل کیا، اس کا حاصل نکالا پھر رد کی جانب اشہب قلم موڑا۔

"یہ بیعت چوں کہ باغیوں اور قاتلوں کی تائید بلکہ اصرار سے منعقد ہوئی تھی۔ اور یہ خلافت ہی عثمان ذوالنورین جیسے محبوب اور خلیفہ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کرکے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی۔ نیز قاتلین سے قصاص جو شرعاً واجب تھا نہیں لیا گیا اور نہ قصاص لیے جانے کا کوئی امکان باقی تھا۔ اکابر صحابہ نے بیعت کرنے سے انکار کیا، اس لیے بیعت خلافت مکمل نہ ہوسکی۔"

اس دعوے کا تجزیہ کرتے ہوئے دکھایا کہ حضرت مرتضیٰ کی خلافت نامکمل ہونے کے ثبوت میں تین باتیں پیش کی گئی ہیں۔ (۱) اس خلافت کا سبائیوں کے زیر اثر قیام۔ (۲) قاتلان عثمان سے عدم قصاص (۳) اکابر صحابہ کا بیعت سے انکار۔ پھر پہلی اور تیسری بات کے رد میں علامہ ابن حجر مکی کی صواعق محرقہ، امام جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفا بحوالہ طبقات ابن سعد اور محب الدین طبری کی الریاض النضرہ فی مناقب العشرۃ کی عبارتوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت مرتضیٰ کی خلافت سبائیوں کے زیر اثر قائم نہ ہوئی بلکہ ارباب حل وعقد اور اکابر صحابہ کے اتفاق ہی سے قائم ہوئی جن میں عشرہ مبشرہ میں سے حضرت طلحہ وزبیر اور اصحاب بدر بھی شامل ہیں۔

دوسری بات بہت جذباتی ہے اور ناصبی طبقہ نے اپنی کتابوں میں اسے بہت رنگ دے کر بیان کیا ہے۔ میری نظر سے بھی یہ اعتراض بارہا گزر چکا تھا جو خاصا شک انگیز ہے اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے بہت صاف اور دو ٹوک بات کہی ہے جو ہر شبہہ وشک کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کافی ہے اور جسے پہلی بار پڑھ کر میں خوشی کے سمندر میں ڈوب گیا اور صاحب مضمون کی ناقدانہ بصیرت اور قضا وافتا کی مہارت کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ فرماتے ہیں:

"قانون اسلام کی روشنی میں قصاص کے لیے ضروری ہے کہ (۱) مقتول کے ورثہ خلیفہ یا قاضی کے یہاں مقدمہ

دائر کریں۔ (۲) قاتل کی نشان دہی کریں۔ (۳) اس کے قاتل ہونے پر شرعی شہادت پیش کریں یا قاتل خود اقرار کرے پھر کہیں حاکم پر قصاص لینا واجب ہوتا ہے۔ سیدنا عثمان کے ورثہ نے نہ مقدمہ دائر کیا نہ قاتل کو نامزد کیا، نہ بینہ اور شرعی شہادت کی نوبت آئی۔ ان سب کے بغیر حضرت علی قصاص لیتے تو کس سے لیتے کس بنیاد پر لیتے اور کیسے لیتے؟ ورثہ کے مطالبہ و تعیین کے بغیر حاکم کو کسی پر دست اندازی کا حق ہی کہاں ہے؟ اگر اس قسم کا کوئی دعوی بارگاہ خلافت میں دائر ہوا تھا تو امروہوی صاحب اس کا ثبوت لائیں۔ حد تو یہ ہے کہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر حتی کہ خود حضرت معاویہ نے لشکر کشی ضرور کی مگر اس قسم کا کوئی دعوی بارگاہ خلافت میں دائر نہیں کیا۔" (ملخصا) آگے فرماتے ہیں:

"امروہوی صاحب کے سامنے انگریزی قانون ہے جس کے تحت کسی قتل کے بعد پولیس فرضی لوگوں کو پکڑتی ہے، شبہہ میں گرفتار کرتی ہے، زدوکوب کرتی ہے۔ پھر کسی پر مقدمہ چلاتی ہے۔ اگر تیر تکہ پر بیٹھ گیا اور فرضی گواہ جج کی نظر میں جرح و قدح سے سلامت رہ گئے تو قاتل کو پھانسی ہوگئی ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اصل قاتل گلچھرے اڑاتا ہے اور کوئی بے گناہ شخص تختہ دار پر ہوتا ہے۔ اسلام کا قانون ایسا ظالمانہ نہیں۔ نہ حضرت علی سے اس کی امید کہ وہ اسلامی قانون چھوڑ کر کسی دوسرے قانون پر عمل کریں نہ ہی ان سے یہ توقع کہ دعوی دائر ہو، ثبوت بہم پہنچے پھر بھی قصاص نہ لیں۔ قصاص حد ہے، ثبوت کے بعد حد جاری نہ کرنا شدید ترین ظلم اور بہت بڑا فسق ہے، اس کے ارتکاب کی نسبت مولائے مومنین داماد سید المرسلین کی طرف کرنا ابن تیمیہ جیسے بے باک اور اس کے اندھے مقلدین کا کام ہو سکتا ہے کسی سنی صحیح العقیدہ کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" (ملخصا)

اس کے بعد ثابت فرمایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت حق تھی اور وہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مقابلے میں درستی پر تھے پھر متعدد احادیث کریمہ سے اس کی تصریحات پیش کی ہیں اور امام نووی شارح صحیح مسلم کی فیصلہ کن عبارت پر یہ بحث ختم کردی ہے یہاں تک پاسبان کے پہلے دو سوالوں کا جواب مکمل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد یزید کے فسق و تدین کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس بارے میں محمود عباسی کا جائزہ لیتے ہوئے مفتی صاحب نے بتایا ہے کہ:

(۱) امروہوی صاحب نے اپنی ساری تحقیقات کی بنیاد اس پر قائم کی ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن خلدون کے علاوہ سارے مورخین روایت پرست تھے۔ انھیں جو کچھ ملا، بلا تحقیق و جستجو اندھا دھند نقل کر دیا۔

(۲) امام ابن جریر طبری جیسے جلیل القدر مسلم الثبوت امام کو شیعہ کہہ کر نا قابل اعتبار قرار دیا ہے جب کہ علامہ ذہبی نے ابن جریر پر الزام کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جھوٹی بدگمانی ہے، ابن جریر اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک امام اکبر ہیں۔ رہا ابن خلدون تو وہ خارجیوں کا بھائی معتزلی تھا۔ مولانا عبد الحی فرنگی محلی کے مجموعہ فتاویٰ جلد اول ص: ۲۷۷، میں عبد الرحمٰن حضرمی معروف بہ ابن خلدون کے معتزلی ہونے کی صراحت موجود ہے۔"

طبری جیسے امام وقت کو شیعہ بنا کر نا مقبول اور ایک معتزلی کو محقق و ثقہ بنا کر مقبول و معتمد دکھانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ امروہوی صاحب کے نزدیک جو ان کی افتاد طبع کے موافق ہے وہ محقق، مدقق، صحیح العقیدہ، معتمد سب کچھ ہے اور جو خلاف طبع ہے وہ کچھ بھی نہیں۔ اسی کا نام تحقیق اور ریسرچ ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

اس تجزیے سے محمود عباسی کی امانت و دیانت کا راز اچھی طرح منکشف ہو جاتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ جس غلط بات پر یہ لوگ اپنا اعتقاد جما لیتے ہیں اسے صحیح دکھانے کے لیے کیسی کیسی حیرت انگیز خیانتوں کا ارتکاب کرتے چلے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس انداز پر ریمارک کرتے ہوئے ایک جگہ بڑا دل چسپ اور دنداں شکن طنز کرتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

"امروہوی صاحب یزید کی محبت میں اس درجہ خود رفتہ ہیں کہ انھیں احادیث صحیحہ اور کبار صحابہ و تابعین کے ارشادات تک نظر نہیں آتے۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ "یزید کے معاصرین میں صرف عبد اللہ بن زبیر اسے برا بھلا کہتے تھے مگر چوں کہ وہ خود آنکھ سے دیکھتے نہیں تھے اس لیے ان کی بات لائق اعتبار نہیں۔" لیکن اس کے برخلاف امروہوی صاحب تیرہ سو برس کے بعد یزید کے فضل و کمال کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا آپ یزید کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔"

خود مشاہدہ نہ کرنے کی وجہ سے اگر عبد اللہ بن زبیر جیسے عظیم صحابی کا بیان ہم عصر ہونے کے باوجود نا قابل اعتبار ہے تو تیرہ سو برس بعد پیدا ہونے والے کا قول اسی بنیاد پر نا قابل اعتبار کیوں نہیں؟ اور اگر تیرہ سو برس پر پھیلے ہوئے وسائط کے باوجود من مانی تحقیق و تفتیش کی بنیاد پر ایک معمولی درجے والے فنکار کا بیان معتبر ہے تو بغیر کسی زمانی فاصلے کے ایک جلیل القدر معاصر صحابی کی قابل اعتماد تحقیق و تفتیش اور یقین و اذعان پر مبنی بیان کیوں قابل اعتبار نہیں؟ یہ ایسی گرفت ہے جس سے آج کے نام نہاد محققین کے لیے گلو خلاصی ممکن نہیں۔

محمود عباسی کے معیار تحقیق و اعتبار کا پردہ چاک کرنے کے بعد یزید کی حیثیت واضح فرمائی ہے۔ پہلے یزید کی مذمت پر مشتمل احادیث کریمہ شارحین کرام کے ارشادات کے ساتھ پیش فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میری امت کی بربادی یزید و مروان جیسے نوخیزوں کے ہاتھوں ہوگی، بعض احادیث میں نام یزید کی صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ یہ اموی شخص امر امت میں سب سے پہلا "رخنہ انداز" ہوگا۔ سب سے پہلا "سنت کا بدلنے" والا ہوگا۔ رسول جسے "مبدل سنت" بتائیں اسے "متبع سنت" کہنا نہایت ناروا جسارت ہے۔ پھر یہ تحریر فرمایا ہے کہ خود اموی خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز کے سامنے ایک شخص نے یزید کو "امیر المومنین" کے لقب کے ساتھ ذکر کیا تو انھوں نے اسے بیس کوڑے لگوائے۔ یزید کے ہم عصر حضرت عبد اللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: "ہم یزید کے خلاف اس وقت صف آرا ہوئے جب ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں (ہماری سستی اور غفلت کی وجہ سے) ہم پر آسمان سے پتھر نہ برسائے جائیں۔ وہ ایسا شخص تھا جو امہات

اولاد اور بیٹیوں بہنوں سے نکاح کرتا، شراب پیتا، نمازیں ترک کرتا۔"

اس کے بعد متعدد روایات سے یزید کا فسق و فجور، واقعہ حرّہ کے مظالم، یزید کی موت کے بعد اس کے بیٹے معاویہ کا یزید کی برملا مذمت پر مشتمل خطبہ، حضرت حسن بصری کا بیان، امام احمد بن حنبل، علامہ ابن جوزی، سعد الدین تفتازانی کے اقوال ذکر کیے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں۔"

"اگرچہ علماے محتاطین نے کفر یزید کے معاملہ میں سکوت فرمایا ہے کہ کفر کے لیے جس درجہ کا ثبوت درکار ہے وہ حاصل نہیں لیکن جس بدنصیب کے بارے میں اتنے جلیل القدر ائمہ اور علما کفر کا فتویٰ دیں اسے لائق فائق زاہد وہی کہے گا جو دینی امور سے غافل و ذاہل ہوگا۔"

پھر "اول جیش من امتی یغزون مدینة قیصر مغفور لهم" سے یزید کی مغفرت پر استدلال کی خیانتیں ذکر کی ہیں اور شارحین حدیث کے جوابات رقم فرمائے ہیں پھر ایک مستقل مضمون میں اس استدلال کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں، یہ بحث اصل مضمون میں دیکھنے کے لائق ہے اور علمی و تاریخی ہر لحاظ سے قابل داد ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ یزید کے بارے میں امت کا اتفاق ہے کہ وہ فاسق و فاجر تھا، امام احمد بن حنبل اور ابن جوزی وغیرہ اسے کافر بھی کہتے ہیں اس پر (نام زد کر کے) لعنت کو بھی جائز فرماتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ وہ زاہد و عابد تھا۔ تمام تاریخ چھان ڈالیے اس کے زہد و قناعت کا ایک واقعہ بھی نہیں ملے گا۔ اگر تھا تو امروہوی صاحب نے اسے نقل کیوں نہیں کیا۔"

اس کے بعد خود محمود عباسی کی بیان کردہ ایک روایت سے ثابت فرمایا ہے کہ وہ زاہد نہ تھا۔ یہاں پاسبان کے تیسرے سوال کا جواب مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد چوتھے سوال کی طرف رخ فرمایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اپنے برملا فسق و فجور کے باعث وہ خلافت کا اہل تھا نہ اس کی خلافت درست تھی، اسی لیے صحابہ کرام نے اس پر نکیر کی۔ منکر کو بدلنا قول سے بھی ہوتا ہے فعل سے بھی۔ افضل فعل سے بدلنا ہے، صحابہ نے قولاً انکار فرمایا ہے، امام عالی مقام نے فعل سے اس کی مخالفت کی، نواسہ رسول کے شایان شان یہی تھا کہ جو طریقہ افضل ہے اسی پر ان کا عمل ہو۔

اس کے بعد یہ ثابت فرمایا ہے کہ یزید کے مقابلے میں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق پر تھے۔ اور وہ ظلماً شہید کیے گئے۔ اس بارے میں احادیث کریمہ اور تمہید ابو شکور سالمی کی عبارتیں پیش کر کے فیصلہ رقم کیا ہے۔ اسی پر بس نہیں، آگے ان دلائل کا جائزہ لیا ہے جن سے امام عالی مقام کے خاطی ہونے کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ یہ بحث بھی خاصی طویل ہے اس لیے وہیں دیکھی جائے۔ آخر میں یہ دکھایا ہے کہ امروہوی صاحب نے اپنے قیاسات فاسدہ کو درایت کا نام دے کر ان کے ذریعہ شہادت کربلا کے بہت سے مسلمہ جزئیات کا انکار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بطور

نمونہ ایک جزئیہ اور اس کے انکار کے سلسلے میں امروہوی صاحب کی درایت یا قیاس فاسد کا بڑا دل چسپ تعاقب کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

"امام عالی مقام مکہ معظمہ سے آٹھ ذی الحجہ کو نہیں بلکہ دس ذی الحجہ کو چلے ہیں اور راستے میں تیس منزلیں ہیں۔ لہٰذا امام دس محرم کو کربلا میں جلوہ فرما ہوئے اسی دن شہید ہو گئے نہ تین دن کربلا میں قیام رہا نہ تین دن تک پانی بند رہا۔"

اس دعوے کی بنیاد کسی حدیث یا تاریخی کتاب پر نہیں بلکہ اس کے پیچھے یہ قیاس کار فرما ہے جو عوام کے لیے خاصا مغالطہ انگیز اور جذباتی ہے۔ وہ یہ کہ "کیا یہ ممکن تھا کہ امام حج کو چھوڑ کر کوفہ چل دیتے ایسی کیا جلدی تھی "یعنی دسویں تاریخ کو حج ہوتا ہے اس لیے ان پر فرض تھا کہ پہلے حج ادا کریں پھر کہیں سفر کریں۔ حج سے فراغت ۷/ ذی الحجہ کو ممکن نہیں اس لیے آٹھ کو روانگی بھی ممکن نہیں۔ اور اس سلسلے کی ساری روایات محض غلط اور افسانہ ہیں۔ اس قیاس کی پردہ دری کرتے ہوئے مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

"آپ نے یہاں کتنی ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ حضرت امام بارہا حج ادا فرما چکے تھے۔ حج فرض ان کے ذمہ نہیں تھا۔ یہ حج اگر ادا فرماتے تو نفل ہوتا۔ دوسری طرف کوفیوں نے یزیدی استبداد کے ازالہ کے لیے ہر ممکن مدد کا یقین دلایا تھا ایسی صورت میں ازالۂ منکر فرض تھا۔ منیۃ المصلی پڑھنے والا بھی جانتا ہے کہ نفل پر فرض کی ادائگی مقدم ہے۔ اگر حضرت امام نے اس اہم فرض کی ادائگی کے لیے ایک نفل ترک کر دیا تو اس میں کیا گناہ لازم لایا۔"

آگے یہ بھی دکھایا ہے کہ اس قیاس فاسد کے بر خلاف خود بیان امروہوی کی روشنی میں قیاس صحیح کا تقاضا یہ ہے کہ پانی بند ہو کیوں کہ امروہوی صاحب بھی یہ کہتے ہیں کہ "ابن سعد لڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن یزید کی بیعت لینا اس کا مطمح نظر تھا۔" ایسی صورت میں قیاس یہ چاہتا ہے کہ پانی بند کر دیا جائے تاکہ امام تشنگی سے جاں بلب ہو کر چھوٹے چھوٹے بچوں کو تڑپتے بلکتے دیکھ کر عزیمت چھوڑ کر رخصت پر عمل فرمالیں۔

اس کے آگے جو تعاقب ہے وہ اور زیادہ دل چسپ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس قیاس فاسد کا تقاضا تو یہ ہے کہ امام دسویں محرم کو بھی کربلا نہ پہنچے اس لیے کہنا یہ چاہیے کہ دسویں کو شہادت اور کربلا کا پورا قصہ ہی محض ایک افسانہ ہے۔ نہ امام اس تاریخ کو کربلا پہنچے، نہ شہادت ہوئی، نہ وہ سارے واقعات پیش آئے جن سے تاریخ و سیر کی کتابیں لبریز ہیں۔ درایت ہو تو ایسی ہو، صرف پانی بند کرنے کا انکار کیا تو کون سا بڑا تیر مار لیا۔ پورا کمال تو جب تھا کہ جس درایت سے پانی بند ہونے کا انکار کیا اسی سے یہ بھی ثابت کر دیتے کہ پورا واقعۂ کربلا ہی محض افسانہ ہے جس کی حیثیت بوستان خیال سے زیادہ نہیں۔ شارح بخاری لکھتے ہیں:

"اسی طرح آپ نے بڑی طولانی بحث کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ "مکہ سے کربلا" تک تیس منزلیں ہیں اور دو منزلہ سہ منزلہ کسی طرح ممکن نہیں، لہٰذا ایک دن میں ایک ایک منزل کے حساب سے تیس دن میں تیس منزلیں

طے کر کے دسویں محرم کو کربلا پہنچے۔"

واقعہ یہ ہے کہ عقل پر محبت یا بغض کا پردہ پڑ جانے کا کوئی علاج نہیں۔ پہلی منزل بستان عامر چوبیس میل ہے۔ دسویں ذی الحجہ کو حج کے مراسم ادا کر کے کوئی شخص کسی طرح چوبیس میل طے نہیں کر سکتا۔ امروہوی صاحب کو کیا خبر کہ دسویں ذی الحجہ کو کیا کیا مراسم ہیں۔ دسویں ذی الحجہ کو آفتاب نکلنے سے کچھ پہلے مزدلفہ سے چل کر منیٰ آنا ہے۔ جمرۃ العقبہ پر کنکری مارنا ہے۔ قربانی کرنا ہے۔ حجامت بنوانی ہے۔ پھر مکہ معظمہ جا کر طواف زیارت اور صفا مروہ کی سعی کرنی ہے۔ کیا کسی عقل مند آدمی کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ ایک دن میں مزدلفہ سے چل کر منیٰ آئے، وہاں کے مراسم ادا کر کے پھر مکہ معظمہ گئے، وہاں کے مراسم ادا کرنے کے بعد اتنا وقت بچا کہ حسینی قافلہ چوبیس میل کی مسافت طے کر کے بستان عامر پہنچ گیا۔ یقیناً ایسا ممکن نہیں، لہذا امروہوی صاحب کی تحقیق کی بنا پر یہ لازم آئے گا کہ امام گیارہ کو مکہ سے چلے اور گیارہ کو کربلا جلوہ فرما ہوئے پھر دس کو شہادت کس طرح ہوئی؟

دوسرے یہ کہ ۱۱ر ۱۲ ذی الحجہ کو کنکریاں مارنا حج کے واجبات سے ہے۔ حج اگرچہ نفل ہو، ۱۱ر ۱۲ کی رمی واجب ہے۔ امام عالی مقام اگر حج نہ کرتے تو صرف ترک نفل لازم آتا۔ اور حج شروع کر کے ۱۱ر ۱۲ کی رمی چھوڑنے میں ترکِ واجب لازم آئے گا۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہوگی کہ ترکِ نفل سے بچنے کے لیے ترکِ واجب کے وبال میں مبتلا ہوں۔ لہذا آپ کی جغرافیائی ریسرچ کی بنا پر لازم آئے گا کہ امام تیرہویں ذی الحجہ کو مکہ سے روانہ ہوں اور تیرہویں محرم کو کربلا پہنچیں۔"

اس مضبوط گرفت کو پڑھنے کے بعد میں فرط مسرت سے جھوم اٹھا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک سے ایک دام تزویر پھیلا کر انسانی فکر و عقل کا شکار کرنے والے اہل باطل اگر موجود ہیں تو ان کے مکائد کا طلسم ہوش ربا توڑنے والے اہل حق بھی موجود ہیں۔ یہ تھا حضرت مفتی صاحب کی علمی جلالت سے میرا پہلا تعارف۔

یہ مقالہ کئی لحاظ سے قابل تحسین اور باعث تاثر بنا۔ اس سے احادیث و روایات پر وسعت نظر، تاریخ سے ماہرانہ آشنائی، رجال سے واقفیت، فقہ و افتا کی مہارت، نقد و نظر اور رد و مناظرہ کا کمال، زبان و بیان کی چاشنی، تفہیم کا حسن، مغلق الفاظ، پیچیدہ تراکیب سے دوری، معنی کی ژولیدگی اور تعقید سے سلامتی وغیرہ بھی کچھ عیاں ہے۔

اس مقالے کو پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مفتی صاحب جن سے والد صاحب پابندی سے اور احترام کے ساتھ ملتے اور وہ بھی والد صاحب کے ساتھ سادگی اور اعزاز سے پیش آتے ان کا علمی مرتبہ کیا ہے۔ میں نے سنا کہ سحبان الہند مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پوری بھی اسی مضمون کے ذریعہ مفتی صاحب کی جلالت علمی سے آشنا ہوئے اور اس کے بعد ملاقات پر بہت اعزاز و تحسین سے پیش آئے۔ اپنے رفقا علامہ نظامی و علامہ ارشد القادری وغیرہ کے ذریعہ اور دیگر اہل علم سے سن کر اجمالاً وہ بھی مفتی صاحب کو ایک جید عالم سمجھتے تھے مگر مشاہدہ و تجربہ کا لطف اور عین

الیقین کی حلاوت کچھ اور ہی چیز ہے:

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

اس کے بعد میرے رفیق درس مولانا مبین الہدیٰ نورانی گیاوی نے مجھے مفتی صاحب کی کتاب "اشک رواں" عنایت کی۔ یہ میری پیدائش سے چھ سال پہلے ربیع الاول ۱۳۶۵ھ کی تصنیف ہے جو بیت الانوار گیا سے شائع ہوئی۔ اس کا موضوع "کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست" ہے۔ اس موضوع پر حافظ ملت علیہ الرحمہ کی کتاب "الارشاد" میں پڑھ چکا تھا۔ یہ اشک رواں سے نو دس ماہ بعد شائع ہوئی مگر والد صاحب نے غالباً حافظ ملت سے اس کے دو نسخے حاصل کر رکھے تھے اس دور میں انھیں بھی لیگ اور کانگریس کے قضیے سے خاصی دل چسپی تھی۔ کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ لیگ اور کانگریس کوئی بھی اس قابل نہیں کہ پوری ہم نوائی کی جائے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ دونوں سے جدا رہ کر شریعت کی پابندی کی جائے۔ یہ بات اشک رواں میں بہت شرح و بسط، دلائل و براہین اور پورے جوش شباب کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس کی تصنیف کے وقت حضرت مفتی صاحب کی عمر تقریباً ۲۵ر سال تھی مگر علم و فکر کی پختگی کتاب سے عیاں ہے۔ مذاہب سے آشنائی، تاریخ سے باخبری، استنباط و استدلال کا تجربہ، رد و نقد کی مہارت، قلم کی روانی، جوش خطابت کا رنگ سبھی کچھ اس تحریر میں جلوہ نما ہے، نوجوان فاضلوں میں یہ ساری چیزیں یکجا شاید و باید ہی نظر آتی ہیں۔ اس سے میں نے اندازہ کیا مفتی صاحب اپنے دور طالب علمی ہی میں کافی وسیع النظر ہو چکے تھے اور فراغت کے چند سال بعد اور زیادہ کمال پیدا ہو گیا۔

"اشک رواں" کا سیاسی موضوع میرے لیے فکر انگیز تو بنا مگر زیادہ دل چسپی کا باعث نہ ہوا اس لیے کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا، دونوں پارٹیاں اپنا اپنا مطلوب بڑی حد تک حاصل کر چکی تھیں اور جس تیسری راہ کے لیے دعوت دی گئی اس پر عمل اور اس کی تیاری کا زمانہ برسوں پہلے ہونا چاہیے تھا پھر کہیں علمائے حق کی قیادت میں صحیح ڈھنگ سے آزادی حاصل ہوتی اور زمام اقتدار لائق ہاتھوں میں پہنچتی۔ مگر شاطران فرنگ و یہود کی چالوں میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ انھوں نے علمائے دین کو میدان سیاست و حکومت سے بے دخل کرنے اور زمین فرنگ کے تربیت یافتہ دین و علم میں خام کار افراد کو بساط سیاست کے مہروں کی شکل میں استعمال کرنے کا منصوبہ مدتوں پہلے تیار کیا اور پچاس سال نہ گزرے ہوں گے کہ اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے اور دوسری جنگ آزادی تک اس منصوبے کا عملی روپ بالکل منظر عام پر آگیا۔

میری دلچسپی کی چیز "اشک رواں" کی دینی و علمی بحثیں تھیں۔ ان میں بعض چیزیں میرے لیے بالکل نئی تھیں مثلاً: یہ تو میں نے سن رکھا تھا کہ کچھ لوگ رام اور کرشن وغیرہ کو نبی مانتے ہیں چوں کہ رطب و یابس سب کچھ پڑھ ڈالنے کی عادت تھی اس لیے یہ بھی کہیں نظر سے گزر چکا تھا لیکن اس عقیدے کی بنیادیں کیا ہیں اور ان کے جوابات

کیا ہیں۔ تفصیلاً اس کو کہیں نہ دیکھا تھا۔ اس کتاب میں مسلم لیگ کی حمایت میں پرورش پانے والے فرقوں کے ذیل میں قادیانی، رافضی، وہابی، دیوبندی، نیچری کا تعارف کراتے ہوئے ایک ایسے طبقے کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو رام و کرشن وغیرہ کو نبی مانتا ہے پھر اس میں اس طبقے کا استدلال اور اس کا جواب اشک رواں میں تفصیلاً مرقوم ہے۔ یہ حصہ میرے علم میں خاص اضافے کا سبب بنا اور ایک باطل نظریے کا تشفی بخش تعاقب دیکھ کر ایک کیف آگیں مسرت حاصل ہوئی۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

"کرشن، رام چندر، گوتم بدھ وغیرہم کو نبی اور رسول یا مذہبی رہنما ثابت کرنے کے لیے جو انتہائی کلام کیا جاتا ہے۔ یا کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مولا عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ کوئی گروہ ایسا نہیں جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ۔ ہر امت کے لیے کوئی رسول ہے۔ جب ہر امت اور گروہ میں ہادی اور رسول آئے تو ہندوستان کے لیے بھی ضرور کوئی آیا ہوگا۔ اب وہ کون ہے؟ نہ تو قرآن نے بتایا کہ وہ فلاں ہے اور نہ حدیث نے خبر دی کہ وہ فلاں ہے۔ نہ کسی اور معتبر ذریعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ہو نہ ہو وہ شری کرشن جی مہاراج ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ گوتم بدھ ہوں۔"

اس کے بعد اس استدلال کا بھرپور رد فرمایا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) آیات کریمہ کے اندر ہر امت اور قوم میں ہادی و رسول آنا مذکور ہے۔ ہر ملک یا شہر اور قصبہ میں آنا مذکور نہیں اس لیے ہر ملک میں آنا کوئی ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اہل ہند جس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس میں نبی آچکے ہوں مگر خاص سرزمین ہند میں نہ آئے ہوں۔

(۲) بالفرض کسی سرزمین میں نبی آئے تو ضروری نہیں کہ ان کا نام بھی ہمیں معلوم ہو؟ قرآن کریم میں ایسے رسولوں کا بھیجنا مذکور ہے جن کو قرآن میں بیان کر دیا گیا اور ایسے رسولوں کا بھی جن کا اسما کے ساتھ بیان نہیں ہوا۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (۱۶۴-نساء) حدیث میں ایک لاکھ چوبیس ہزار یا دو لاکھ چوبیس ہزار انبیا علیہم السلام کا آنا مذکور ہے مگر کون ہے جو ان کے نام بتا سکے؟

(۳) کسی کو نبی ثابت کرنے کے لیے ایسے نص قطعی کی ضرورت ہے جس میں کوئی شبہہ نہ ہو۔ اور نبی نہ ہونے کے ثبوت میں یہی دلیل کافی ہے کہ اس کے نبی ہونے پر کوئی دلیل قطعی قائم نہیں۔ محض ہو سکتا ہے کہ یہ ہو، شاید کہ وہ ہو، اندھے کی لاٹھی سے نبی کا اثبات نہیں ہو سکتا ہے جیسا کہ کتب عقائد میں اس پر دلائل قاہرہ قائم ہیں۔

(۴) نبی کے لیے ضروری ہے کہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بلند اور ہر قسم کے گناہ صغیرہ و کبیرہ سے پاک ہو خصوصاً ایسے گناہوں سے جو باعث نفرت ہیں مثلاً: جھوٹ، چوری، زنا کاری۔ امام فخر الدین رازی نے یہاں تک تصریح فرمائی ہے کہ زنا سے نبی کے ماں باپ کا بھی بری ہونا ضروری ہے چہ جائے کہ خود نبی۔ اس معیار پر مذکورہ افراد کو

دیکھیے تو ان کے اخلاق و کردار جو ان کی کتابوں میں مذکور ہیں کسی صالح انسان کے بھی لائق نہیں، کسی نبی میں کیا ہوں گے۔ اگر یہ کہیے کہ ان کتابوں کا کوئی اعتبار نہیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ ان افراد کے دنیا میں وجود کا بھی کوئی اعتبار نہیں، نبی ہونا تو بہت دور کی بات ہے، الغرض جن کتابوں سے ان کے وجود کا علم ہوتا ہے انھی سے ان کے ایسے کردار کا بھی علم ہوتا ہے جو شان نبوت کے بالکل منافی ہے۔ پھر ان کی نبوت کا ظن و گمان چہ معنی؟

(۵) ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر قوم کے لیے ہادی اور رسول آئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر قوم یا ہر ملک و شہر کے لیے ہر دور میں کوئی نبی ضرور رہے ہوں۔ سیدنا عیسیٰ اور ہمارے نبی علیہما السلام کے درمیان تقریباً چھ سو برس کا زمانہ ایسا گزرا ہے کہ اس میں کوئی نبی نہ آیا۔ ہمارا دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے نبی کی رسالت ہر ملک اور ہر قوم کے لیے عام ہے، بالفرض کسی قوم یا ملک میں پہلے نبی نہ آئے ہوں تو بھی ہمارے نبی کی بعثتِ عامہ سے ہر قوم کے لیے ہادی و نذیر یا رسول و نبی آنے کی بات پوری ہو جاتی ہے۔ اب ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ آیت کریمہ کا مصداق ایسے انسانوں کو بنائیں جن کے وجود ہی کا ہماری شریعت میں کہیں پتا نہیں۔ اور جن ذرائع سے ان کے وجود کا علم ہوتا ہے ٹھیک انھی ذرائع سے اس کا بھی یقین ہوتا ہے کہ یہ اپنے اعتقاد و عمل کے لحاظ سے شان نبوت سے بہت دور ہیں۔

اس کے بعد کردار و عمل سے آگے ان کے کفری اعتقاد کا ذکر کرتے ہوئے بحث ختم کر دی گئی ہے۔

نیچریوں کے بیان کے تحت سرسید کی وہ عبارت بھی مذکور ہے جس میں بہشت کا مذاق اڑایا گیا ہے پھر اسی رنگ میں اس کا جواب بھی دیا گیا ہے جو خاص مفتی صاحب کے قلم کا حصہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقد و نظر، استدلال و استنباط، اور رد و طرد کا جوہر مفتی صاحب کے اندر شروع ہی سے ودیعت تھا جو تجربہ اور امتداد زمانہ کے صیقل سے اور زیادہ آب دار و تاب ناک ہوتا گیا۔ یہ حضرت مفتی صاحب کے رتبۂ علمی اور نتیجۂ قلمی سے میرا دوسرا تعارف تھا۔

۱۹۶۸ء میں جب میں ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، مدارک شریف وغیرہ پڑھ رہا تھا، سیوان کانفرنس منعقد ہوئی جو پٹنہ میں ادارہ شرعیہ کے قیام کی تمہید بنی۔ اس میں شرکت کے لیے میرے رفقائے درس میں سے مولانا فضل حق غازی پوری اشرفیہ سے گئے۔ واپسی میں وہاں سے اَشرفُ السِّیَر ساتھ لائے۔ اس کے ٹائٹل پیج کی زیارت تو گھوسی میں سرکار مجاہد ملت کی تقریر کے دوران ہو چکی تھی مگر مندرجات دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ رفیق موصوف کتاب لائے تو ان سے پہلے میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا اور ختم کرنے کے بعد ہی واپس کی۔ اس کے ٹائٹل پر نصف اول جلد اول مرقوم ہے اس میں بڑا حصہ مقدمہ اور کتب سیر کے تعارف پر مشتمل ہے پھر سیرت کا آغاز ہوتا ہے اور اسلامِ آبا و امہات رسول اکرم پر یہ نصف جلد اول اختتام پذیر ہوتا ہے۔ سوے اتفاق کہ اس وقت کتاب پیش نظر نہیں لیکن پہلے پہل میں اس کے جن مندرجات سے زیادہ متاثر ہوا وہ اجمالاً ضرور بیان کر سکتا ہوں۔

مقدمے میں سیرۃ النبی کی خامیوں کا تذکرہ اور امام واقدی پر جرح کا تفصیلی رد کیا گیا ہے جو دار المصنفین کی

سیرت نگاری پر سر دھننے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔ میں اس مقدمے سے بہت متاثر ہوا۔ اور بعد میں "تنقید معجزات کا علمی محاسبہ" لکھتے وقت اس سے استفادہ بھی کیا اور امام واقدی کے سلسلے میں خطیب بغدادی کی تاریخ، تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب وغیرہ کی خود مراجعت کرتے ہوئے کچھ اضافہ بھی کیا۔

دوسرا مبحث تاریخ ولادت اقدس کا ہے۔ جناب شبلی نعمانی نے اس بارے میں ایک نئے ہیأت داں محمود فلکی کی تحریر سے مرعوب ہو کر یا "کل جدید لذیذ" سے محظوظ ہو کر بالکل نیا قول یہ اپنایا ہے کہ سرکار کی ولادت ۹ ربیع الاول کو ہوئی۔ مفتی صاحب نے اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ رائے تاریخ ولادت سے متعلق روایات میں سے کسی روایت سے مطابقت نہیں رکھتی اور اہل فن کے تقویمی استخراج سے بھی میل نہیں کھاتی۔ پھر تقویمی استخراج پر بنائے کار اس وقت درست ہوتی جب زمانۂ جاہلیت میں ماہ و سال کا دور سیر قمر کے مطابق ہوتا۔ قرآن سے ثابت ہے کہ مشرکین مہینے بڑھالیا کرتے تھے یہاں تک کہ سرکار نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا: آج زمانہ گھوم پھر کر اپنی اس حالت پر آگیا ہے جس پر تخلیق زمین و آسمان کے وقت تھا۔ اس لیے اہل سیر نے ہیأت و تقویم سے صرف نظر کرتے ہوئے اعتماد اس پر کیا جو روایتِ مشہورہ سے ثابت ہے یعنی بارہویں ربیع الاول، اور اسی پر اہل مدینہ و اہل اسلام کا عمل ہے جو بجائے خود حجت ہے۔

مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ مستشرقین کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر اپنے روایتی و تاریخی اثاثہ کو ساقط و بے اعتبار قرار دینے اور معذرت خواہی کا انداز اختیار کرنے کی بجائے مخالفین کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کرنے کی جرأت "اشرف السیر" میں کار فرما ہے۔ جو ایک مسلم سیرت نگار اور دینی عالم کے شایان شان ہے۔ یہ تھا حضرت مفتی صاحب کے وفور علم، زور قلم، جرأت نقد و نظر اور وسعت فکر و فن سے میرا تیسرا تعارف۔ جو بحمدہ تعالیٰ میرے زمانۂ طالب علمی ہی میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد جب میں مدرسہ فیضیہ نظامیہ باراہاٹ ضلع بھاگل پور میں مدرس تھا، مفتی صاحب کا ایک فتوی روزے میں انجکشن سے متعلق پڑھا۔ یہ میرے رفیق درس مولانا عبد المبین نعمانی کے استفتا کے جواب میں لکھا گیا جسے برادر موصوف نے المیزان کچھوچھا شریف کے ایک شمارے میں شائع کرایا۔ پھر پاسبان میں بھی چھپا۔ اب یہ فتوی برادر گرامی مولانا یٰسین اختر مصباحی کی تعارفی کتاب "شارح بخاری" میں بھی شائع ہو گیا ہے اور مجموعۂ مقالات میں بھی شامل ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے۔ انجکشن کے ذریعہ اگر دوا یا غذا جسم میں پہنچائی جائے تو روزہ ٹوٹے گا یا نہیں؟ یہ ایک نیا سوال تھا جس کا جواب مفتی صاحب نے نفی میں دیا ہے اور کتب فقہ سے اخذ کرتے ہوئے اس کے دلائل فراہم کیے ہیں۔ حضرت کی شان افتا سے یہ میرا پہلا تعارف تھا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔

کبھی تقریر سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، میری فراغت کے تیسرے سال مفتی صاحب دار العلوم اشرفیہ کے جلسۂ

دستار فضیلت میں مدعو ہوئے اور دو روزہ اجلاس میں دونوں دن تقریر فرمائی پہلے دن "علم غیب" کے موضوع پر تقریر کی جو میں نے دیر سے پہنچنے کے باعث درمیان سے سنی اور دوسرے دن "رحمت عالم" کے عنوان پر تقریر کی جو میں نے شروع سے آخر تک بغور سنی، یہاں تک کہ اس کے مضامین ذہن نشیں ہو گئے اور کسی یادداشت میں درج بھی کر لیے۔ یہ تھا حضرت کے حسن خطابت سے میرا پہلا تعارف۔

تقریر میں چند خاص باتیں میں نے محسوس کیں: (۱) عالمانہ وقار (۲) اعتقادی اور علمی لحاظ سے پختگی (۳) جملوں اور مضامین کی صحت و ندرت (۴) مضمون علمی اور مشکل ہونے کے باوجود بہت آسان انداز میں ایسا بیان کہ عوام کو بھی بخوبی سمجھ میں آئے۔ (۵) ترتیب میں ایسی عمدگی کہ پورا خطاب ذہن نشین رہے اور چاہیں تو اسی ترتیب کے ساتھ سامعین دوسروں کو سمجھا سکیں۔ (۶) ایسا دلچسپ اور موثر خطاب کہ اکتاہٹ نہ ہو (۷) سطحی و غیر تحقیقی باتوں سے مکمل اجتناب۔

تقریریں کئی طرح کی ہوتی ہیں: (۱) ادق اور علمی جن کو اہل علم ہی سمجھ سکیں (۲) سطحی اور دلچسپ جن کو عوام تو پسند کریں مگر اہل علم حقارت سے دیکھیں۔ (۳) غیر تحقیقی باتوں کی کثرت، علمی و تاریخی لحاظ سے غلط، روایات میں اپنی جانب سے بے جا اضافے، الفاظ کے، جملوں کے، مضامین کے، غلط سیاق و سباق کے پیوند پر پیوند مگر بیان میں ایسی چاشنی اور زور کہ عوام وجد میں آجائیں۔ ایسی تقریروں سے ان خطبا کے کشکول بھرے ہوتے ہیں جنھیں رضائے خدا و رسول سے زیادہ خوشنودی عوام عزیز ہوتی ہے اور ثواب آخرت سے زیادہ حطامِ دنیا جمع کرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ (۴) روایت و درایت اور علم و تحقیق کی رو سے صحیح معلومات کی جامع اور زبان و بیان کے لحاظ سے دلچسپ اور عام فہم جس سے عوام و خواص دونوں نفع اندوز ہوں۔

قسم اول کا دائرۂ نفع محدود ہے، قسم دوم و سوم کی کثرت ہے۔ ایسی تقریریں اور ایسے خطبا ہر دور میں عوام کے دل و دماغ پر چھائے رہے مگر صحیح معنی میں خطاب اور خطابت وہی ہے جو چوتھی قسم کے معیار پر کامل ہو۔ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی تقریر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے اور نہایت جامع، مفید اور بصیرت افروز ہوتی ہے۔

وہ اعتقادیات پر ایسے ٹھوس دلائل کے ساتھ خطاب فرماتے ہیں کہ مذبذب کا ایمان درست ہو جائے اور صحیح الاعتقاد شخص راسخ الاعتقاد اور اپنے دین کا مبلغ بن جائے، عملیات پر بھی ایسی موثر باتیں پیش کرتے ہیں کہ انسان انھیں اپنا کر صالح و اطاعت شعار ہو جائے۔ علمی تقریبات اور مجمع علما میں بھی ایسا مختصر اور نکات و معارف سے بھرپور خطاب فرماتے ہیں جو ان کے لیے فکر و بصیرت کے نئے دریچے کھول دے اور علم و آگہی کے نئے گوشے روشن کر دے۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء.

اس کے بعد حضرت کی کتاب "تحقیقات" پہلی بار بنام "التحقیقات لدفع التلبیسات" کی

اشاعت ہوئی اس کے مطالعہ سے مشرف ہوا، اس میں شہادت رسل کی بحث نے بہت متاثر کیا پھر "اسلام اور چاند کا سفر" منظر عام پر آئی، یہ ایک نئے موضوع پر بڑی ہی بصیرت افروز، معلومات افزا، شبہات شکن کتاب تھی جس نے صرف مجھے ہی نہیں، تمام علمی حلقوں کو متاثر کیا۔

یہ میرے تعارف کے ابتدائی نقوش تھے، بعد میں جب حضرت مبارک پور تشریف لائے اور میں جلال پور سے محمد آباد گوہنہ آگیا تو مبارک پور بکثرت حاضری ہوتی اور علمی باتیں بھی ہوتیں۔ اسی دوران نزہۃ القاری کا کام شروع ہوا، ابتداءً صرف ترجمہ کا ارادہ تھا اور اسی نہج پر کافی تحقیق کے ساتھ ترجمہ کا کام ہو رہا تھا، مولانا لیٰسین اختر صاحب اور مولانا افتخار احمد صاحب بھی موجود رہتے تھے۔ اس کاوش کو دیکھ کر میں نے یہ عرض کیا کہ احادیث کا صرف ترجمہ عوام کے لیے باعثِ تشویش ہو سکتا ہے جیسا کہ غیر مقلدین اور دیوبندیوں کے ترجمے پڑھنے کے بعد حنفی عوام جب بہت سی باتیں اپنے مسلک کے خلاف پاتے ہیں تو انھیں تشویش لاحق ہوتی ہے۔ جتنی محنت ترجمہ کے لیے صرف ہو رہی ہے اس میں تھوڑا اضافہ کر لیا جائے تو ایک مختصر شرح بھی ہو جائے گی اور لوگوں کے لیے اطمینان بخش ہوگی، بحمدہ تعالیٰ حضرت نے یہ رائے قبول فرمائی اور نو جلدوں میں "نزہۃ القاری" کے نام سے شرح مکمل ہوگئی جس پر اہل علم کا خراج تحسین اس مجموعہ میں زیب نظر ہوگا۔ بلا شبہہ یہ زبردست اور عظیم خدمت ہے جس پر سبھی اہل علم کو ممنون و شکر گزار ہونا چاہیے۔ رب تعالیٰ ہمیں بھی دینی و علمی خدمات سے نوازے اور حضرت کے نقش قدم پر چلنے والے بکثرت افراد پیدا فرمائے، آمین۔

حافظ ملت کے علمی افادات(۱)

حافظ ملت نے پوری زندگی درس و تدریس اور تقریر و تبلیغ کا شغل رکھا۔ مصروفیات بہت زیادہ تھیں مبارک پور تشریف لائے تو تیرہ اسباق روزانہ پڑھاتے جس میں سب سے چھوٹا سبق شرح جامی کا تھا۔ آپ کے بڑھتے ہوئے اثرات اور علمی وجاہت دیکھ کر دیوبندی مکتب فکر کے مولوی شکر اللہ مبارک پوری نے تقریروں کے ذریعے مذہبی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور پھر دونوں طرف سے مقابلے کی تقریریں شروع ہوگئیں۔ ایک دن حضرت کی تقریر ہوتی اور ایک دن مولوی شکر اللہ کی۔ اُس وقت حضرت کے طلبہ بھی بڑی محنت و مستعدی کے ساتھ حضرت کی معاونت کرتے، حافظ ملت فرمایا کرتے کہ "وہ طلبہ میرے لیے قوت بازو تھے" مخالف مقرر کی پوری تقریر نوٹ کرتے اور شام کو سارے مشاغل سے فراغت کے بعد حضرت اُسے سنتے، عصر سے مغرب تک کی درمیانی مدت جوابی تقریر کی ساعت اور جواب الجواب کے لیے طلبہ کی تیاری میں صرف ہوتی۔ اگرچہ یہ سلسلہ مسلسل ساڑھے چار ماہ تک تھا۔ مگر تدریسی مشاغل، غیر درسی اوقات میں کچھ کتابوں کی تدریس، اہل محلہ اور ملاقاتیوں کی دل داری اور اس طرح کے بہت سے مشاغل کا ہجوم رہتا۔ غالباً ۱۳۹۴ھ میں ایک بار بزم امجدیہ عزیزیہ (واقع محلہ جگسلائی، جمشید پور) کی دعوت پر حضرت جمشید پور تشریف لے گئے تھے۔ میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا بعد ملاقات، نماز مغرب جگسلائی جامع مسجد میں حضرت کے پیچھے ادا کی، حضرت نماز پڑھ کر اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ میں امام جامع مسجد حضرت مولانا محمد حسین صاحب اعظمی سے گفتگو اور حضرت کے حالات پر تبادلۂ خیال میں مصروف ہوا۔ اور میں نے ان سے کہا کہ حافظ ملت نے کوئی خاص تصنیفی سرمایہ نہیں چھوڑا جس کے باعث ان کے افادات اور علوم سے آنے والی نسل محروم رہ جائے گی۔

کثرت تصنیف سے موانع:

اس گفتگو کے بعد میں حضرت کی قیام گاہ پر حاضر ہوا تو حضرت نے فرمایا:

بفضلہٖ تعالیٰ تصنیفی صلاحیت مجھے ضرور ملی اور قلم کی قوت بھی......... یہ کہہ کر فرمایا: کیا کہوں، بہر حال مجھے

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، حافظ ملت نمبر، جون، جولائی، اگست ۱۹۷۸ء

لکھنے پر قدرت تھی، جس کا نمونہ "العذاب الشدید" ہے، اسے "مقامع الحدید" کے جواب میں چند ایام کی مختصر مدت میں تیار کیا، مگر چوں کہ اسے عجلت میں لکھا تھا اس لیے خاطر خواہ نہ ہوئی، کتاب اپنے تلمیذ عزیز مولانا محبوب احمد صاحب کے نام سے منسوب کر دی، حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ (حضرت کے استاذ گرامی مولانا امجد علی صاحب قبلہ متوفی ۱۳۶۷ھ) نے کتاب دیکھ کر فرمایا: "کتاب بڑی معرکۃ الآرا اور جلیل القدر ہے، حافظ صاحب کو اسے اپنے نام سے شائع کرنا چاہیے تھا۔"

ارشد (رئیس التحریر مولانا ارشد القادری صاحب) کا کہنا ہے "اس کتاب نے مجھے مناظرہ سکھایا۔"

قوت تصنیف کے باوجود ہمیشہ عوائق و موانع در پیش رہے، مصروفیات نے گھیرے رکھا، جس کے باعث میں کچھ لکھ نہ سکا، ایک طالب علم نے (حضرت نے نام بتایا تھا، مگر مجھے یاد نہ رہا) مرقات (علامہ فضل امام خیر آبادی) کی شرح (مصنف مولانا عبد الحق خیر آبادی، جس کا درجہ قاضی مبارک کے مساوی ہے) پڑھنا شروع کی توان کے اصرار پر میں نے شرح مرقات کا حاشیہ لکھنا شروع کیا، مگر طالب علم موصوف فراغت حاصل کر کے چلے گئے، جس کے باعث یہ حاشیہ ناتمام رہ گیا اور پھر کوئی ایسا باذوق طالب علم مذکورہ کتاب پڑھنے والا نہ ملا کہ اس کے لیے حاشیہ کی تکمیل ہو سکے۔"

اس میں شبہہ نہیں کہ حضرت کی جو کچھ بھی تحریریں، مقالے اور خطوط وغیرہ پیشِ نظر ہیں وہ انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور ان کی مصروفیات سے سبھی اہل تعلق باخبر ہیں، ورنہ یقیناً ہمارے لیے عظیم تصنیفی سرمایہ بھی ضرور چھوڑ جاتے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ حافظ ملت نے اگر چہ زیادہ تصنیفات نہ چھوڑیں مگر بے شمار مصنفین ضرور پیدا کر دیے۔ طلبہ کے اندر تحریری ذوق پیدا کرنے میں ہمیشہ ان کا زبردست ہاتھ رہا۔ خصوصاً جس طالب علم کے اندر تصنیفی صلاحیت اور تحریری ذوق دیکھتے اُسے اسی طرف لگا دیتے جس کے باعث آج حافظِ ملت کے تلامذہ میں اُردو، عربی، فارسی کے جید اہل قلم دیکھے جا سکتے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ تمامی حضرات کی کاوشیں بروے عام لائے اور انھیں افادہ عامہ کے اجر سے نوازے۔ وهو الموفق و خير معين.

درسی افادات:

حضرت کی تقریر، تحریر اور گفتگو کی طرح تعلیم بھی حسنِ ایجاز، اور کمالِ تفہیم دونوں کی جامعیت کا بے مثال نمونہ تھی۔ بعض مقامات پر خصوصی بسط اور تفصیل سے کام لیتے، اگر چہ اس بسط کے الفاظ اور ان کے معانی کا تناسب دیکھا جائے تو اسے بھی ایجاز ہی سے موسوم کرنا پڑے گا۔ الغرض حضرت کا اطناب ہو یا ایجاز بہت جان دار اور باریک تحقیقات کا حاصل ہوتا۔ مگر یہ ہماری ناقابل تلافی کوتاہی اور لا پروائی ہے کہ حضرت کے خطبات، ملفوظات اور

واقعات کی طرح ہم نے یہ افادات بھی قید تحریر سے آزاد رکھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت غور و خوض اور حافظہ پر زور ڈال کر بھی صرف چند افادات آج قلم کی گرفت میں لا سکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے قوی الحافظہ حضرات کا بھی یہی حال ہوگا کہ سو ڈیڑھ سو سے زیادہ جمع نہ کر سکے ہوں گے، خیر اس طرح بھی اگر متعدد تلامذہ نے کوشش کی ہے تو افادات کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

سوال سے زیادہ جواب دیا جا سکتا ہے:

بخاری شریف کی حدیث ہے:

عن ابن عمر عن النبی صلى الله عليه وسلم أن رجلا سأله مايلبس المحرم فقال لايلبس القميص ولا العمامة ولا السراويل ولا البرنس ولا ثوبا مسه الورس والزعفران فإن لم يجد النعلين فليلبس الخفين وليقطعهما حتى يكونا تحت الكعبين (ج:۱، ص:۲۵)

"حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم ﷺ سے راوی ہیں، کہ ایک شخص نے حضور سے دریافت کیا: احرام باندھنے والا کیا پہنے؟ فرمایا: کرتا، عمامہ، پاجامہ، اور ٹوپی نہ پہنے، نہ ہی وہ کپڑا جس میں ورس اور زعفران لگا ہو۔ اگر جوتے نہ پائے تو موزے پہن لے، اور انھیں کاٹ دے تاکہ ٹخنوں کے نیچے ہو جائیں۔

اس حدیث پر دوسرے افادات اور مکمل تقریر کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ:

آخری حصہ فإن لم يجد النعلين (اگر جوتے نہ پائے الخ) سائل نے دریافت نہیں کیا تھا، جواب میں ذکر فرمایا گیا تاکہ یہ مسئلہ بھی معلوم ہو جائے۔

اس پر فرمایا: ایک بار محمد آباد گوہنہ (مبارک پور سے قریباً ۸ر میل پورب واقع ہے) سے ایک استفتا آیا۔ رافضی کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ میں نے جواب میں دوسرے مباحث کے ساتھ لکھا: رافضی، قادیانی، وہابی، دیوبندی سب کی نماز جنازہ حرام، سخت حرام ہے۔

بعد میں معلوم ہوا یہ استفتا دیوبندی مکتبِ فکر کے کچھ لوگوں نے بھیجا تھا اور اس سے اُن کا مقصد سُنی شیعہ فساد و اختلاف برپا کرنا تھا۔ مگر اس جواب سے اُن کی ساری اسکیم فیل ہو گئی۔

یہ تھا حافظِ ملت کا حسن تدبر اور ان کی سیاسی بصیرت جسے ان کی سوانح کا مستقل موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

قانون اصول فقہ:

بخاری شریف میں یہ حدیث متعدد روایات و طرق سے بفرق اجمال و تفصیل مختلف مقامات پر آئی ہے:

عن أنس أن النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم أُتي بلحم تصدق به على بريرة فقال هو عليها صدقة وهو لنا هدية. (ج:۱،ص:۲۰۲)

"حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں حضور ﷺ کے پاس ایک گوشت حاضر کیا گیا۔ جو حضرت عائشہ کی کنیز جناب بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر صدقہ کیا گیا تھا، فرمایا: اس پر صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔

اس کی تفہیم کے لیے حضرت نے بجائے لمبی چوڑی تقریر کے اصول فقہ کا ایک ایسا قاعدہ بتادیا جو آج تک یاد رہا اور بہت سے مواقع پر مفید ثابت ہوا، فرمایا: "تبدّل ملک سے تبدّل عین ہوجاتا ہے حکماً۔"

جب وہ گوشت حضرت بریرہ کے قبضہ میں پہنچا تو صدقہ ہوا۔ اور جب انھوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو اب صدقہ نہ رہا بلکہ ہدیہ ہو گیا، اس لیے ہاشمی کے لیے اسے تناول کرنا جائز ہو گیا۔ اسی حدیث سے فقہا نے یہ اصول مستنبط کیا کہ ملکیت بدل جانے سے حکماً اصل حقیقت بدل جاتی ہے۔ فقہ کے بہت سارے مسائل اسی اصل اور قانون پر مبنی ہیں۔

ایک تاویل کا رد بلیغ:

ترمذی شریف پڑھنے کے زمانہ میں یہ حدیث بھی آئی "أبردوا بالظهر فإن شدة الحر من فيح جهنم"۔ ظہر ٹھنڈی کرکے پڑھو اس لیے کہ سخت گرمی جہنم کی تپش سے ہے۔ تو کسی سے اس حدیث کی تاویل یوں سننے میں آئی کہ اگر سخت گرمی جہنم کی تپش کے باعث ہے تو ہر جگہ گرمی ہونی چاہیے جب کہ کشمیر اور نینی تال میں ٹھنڈک ہوتی ہے اس لیے یہ حدیث بر سبیل تفہیم و تمثیل ہے جیسے کہ جب خوش گوار ہوا چلتی ہے تو کہا جاتا ہے "جنت سے ہوا آرہی ہے۔"

مولانا فضل حق غازی پوری وغیرہ چند ساتھیوں نے حافظ ملت کے سامنے یہ تاویل پیش کرتے ہوئے استصواب کیا تو آپ نے فرمایا: "نیچریت ہے۔" (یہ طریقہ نیچریوں ہی کا ہے کہ صریح نصوص کو ظاہر سے منحرف کر دیتے ہیں، اور بالکل بے سروپا تاویلات اڑاتے ہیں) اور اس کا رد بلیغ فرمایا۔ اگلے سال جب بخاری شریف میں یہ حدیث آئی تو خود میں نے بھی سنا کہ حضرت نے تاویل مذکورہ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ تاویل کسی طرح صحیح نہیں، گرمی کے موسم میں کشمیر اور نینی تال میں بھی وہ ٹھنڈک نہیں رہ جاتی جو موسم سرما میں وہاں ہوتی ہے۔ بلکہ نسبۃً وہی فرق ہوتا ہے جو ہمارے یہاں جاڑے اور گرمی میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں بعض عوارض کی وجہ سے وہ موسم نہیں ہوتا جو ہمارے یہاں ہوتا ہے۔ حدیث کو بلا دلیل اس کے

ظاہر سے پھیرنا ہرگز درست نہیں۔

اپنی بڑائی کرنا بھی ایک موقع پر جائز ہے:

درس گاہ میں ایک بار حضرت نے اس مسئلہ سے متعلق افادہ فرمایا تھا جسے میں نے اسی دن لکھ رکھا تھا خوش قسمتی سے یہ تحریر مل گئی جو یہاں نقل کر رہا ہوں۔

۱۵ر جمادی الآخرہ ۱۳۸۹ھ / ۳۰ر اگست ۱۹۶۹ء شنبہ۔ درس بخاری شریف میں حضور حافظ ملت نے فرمایا:

"مومن عزت اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب اعدائے دین کی تذلیل کرے۔ اور بوقت مقابلہ انھیں حقیر و ذلیل ثابت کردے۔ اگر ان کے سامنے انکسار و تواضع سے پیش آئے تو اس میں اس کی ذلت ہے۔ محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ (علامہ سید محمد صاحب کچھوچھوی شاگرد اعلیٰ حضرت متوفی ۱۳۸۱ھ) کا بیان ہے کہ میرا عبدالشکور کاکوروی سے مناظرہ ہوا جس میں اس نے "صرفی مسئلہ" پر بحث کرتے ہوئے مجھ سے بطور طنز کہا کہ آپ نے شرح مائۃ بھی نہیں پڑھی، اس پر میں نے اس کی بھرپور تذلیل و تحقیر کی اور اپنے کو اس کے مقابلے میں بہت کچھ بڑھایا جس سے وہ رسوا ہو کر شکست خوردہ ہو گیا، میں نے مناظرہ میں فتح تو حاصل کر لی، لیکن میرے دل میں اپنے ان جملوں سے جو اپنی بڑائی میں کہہ ڈالے تھے، انقباض پیدا ہو گیا کہ میں کبر و عجب کا مرتکب ہوا جو قطعاً مذموم ہے۔ طبیعت میں ایک تکدّر رہا کرتا تھا، جس کے باعث میں نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کی طرف رجوع کرنا چاہا، حاضر بارگاہ ہوا۔ وہاں تو دل کی دھڑکنیں دیکھی جاتی تھیں اور سطح دماغ پر ابھرتے ہوئے اعتراضات کا بچشم بصیرت مشاہدہ ہوا کرتا تھا پہنچنے کے بعد فرمانے لگے، "فقیر کو کبھی اپنی بڑائی پسند نہیں آتی، خدا کا فضل ہے جو کچھ ملا ہے کچھ اپنے کو اس پر غرور و ناز نہیں، تکبّر و عُجب بہت ہی مذموم ہے، آدمی کسی بھی بلند مرتبے پر پہنچ جائے اسے فخر نہیں کرنا چاہیے۔" محدث اعظم بیان فرماتے ہیں: اتنے جملے سننے کے بعد میں دم بخود رہ گیا اب تو کچھ پوچھنے کی بھی مجال نہ رہی اور میں اپنے نفس پر بہت زیادہ ملامت کرنے لگا لیکن اعلیٰ حضرت نے پھر اس کے بعد فرمایا:

"مگر دشمن رسول اور اعدائے دین کے مقابلے میں کبھی انکساری نہیں برتنا چاہیے، وہاں تو یہ شخص دین حق کا ذمہ دار ہوتا ہے، اسے دین کو بلند و برتر ثابت کرنا ہوتا ہے اور حمایت رسول ﷺ میں ان کی عظمت شان کا اظہار اس کا فریضہ ہوتا ہے، وہاں تواضع و انکسار سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اُن کے مقابلے میں اپنے کو بلند و بالا کہنا جائز اور دین متین کی حمایت ہے۔"

محدث صاحب فرماتے ہیں: میں اتنا سننے کے بعد بہت مسرور ہوا۔ دل کا انقباض اور تکدُّر دور ہوا۔ اور

انشراح صدر ہوگیا۔" فالحمد لله على ذلك.

حلوا اور مٹھائی:

بخاری شریف پارہ ۲۲ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث ہے كان رسول الله ﷺ يحب الحلواء والعسل. رسول اللہ ﷺ کو حلوا اور شہد پسند تھا۔ رفیق گرامی مولانا عبد الستار پرولیاوی ذکر کرتے ہیں (۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں) یہ حدیث پڑھاتے وقت حضرت نے فرمایا: اس سے حلوا کا مرغوب اور رسول اللہ ﷺ کا بھی پسندیدہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مولانا عبد الرحمٰن پورنوی نے عرض کیا: حلوا کا معنی تو مطلق "میٹھی چیز" ہے معروف حلوا مراد نہیں۔ فرمایا:

جب بھی تو حلوا کی پسندیدگی اور استحباب ثابت ہے کہ یہ بھی اسی مطلق کا ایک فرد ہے (بلا تخصیص) مطلق کا استحباب اُس کے فرد خاص کے استحباب کو مستلزم ہے۔"

دیگر افادات

جمعہ کی اذان ثانی اور حضرت کی فقہی بصیرت:

ایک بار درس گاہ میں حضرت نے فرمایا: بنارس سے کچھ لوگ آئے، انھوں نے کہا: امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل شہر سے فرمایا: "جب بین یدی الخطیب اذان ہو اس وقت نہ چلو بلکہ جب پہلی اذان ہو اسی وقت چلو۔" اس میں بین یدی الخطیب کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے یہاں اذان ثانی خطیب کے قریب ہوا کرتی تھی۔ میں نے کہا: اس سے اذان ثانی کا بیرون مسجد ہونا ثابت ہوتا ہے کوفہ جیسے شہر کے لوگ اذان ثانی سن کر اپنے گھروں سے مسجد چلتے، یہ لوگ اذان ثانی اُسی وقت سن سکتے تھے جب بیرون مسجد ہوتی رہی ہو۔ اندرون مسجد کی اذان بھلا اس وسیع شہر میں لوگوں کے گھروں کے اندر تک کب پہنچی کہ وہ سن کر آتے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمۂ قرآن:

نیچریوں کا عقیدہ ہے کہ رام، کرشن وغیرہ بھی نبی تھے اس پر "ولكل قوم هاد" سے استدلال کرتے ہیں کہ ہر قوم کے لیے ایک ہادی اور رسول ہے تو آخر ہندی قوم کے لیے بھی کوئی ہادی اور رسول ہوگا۔ اور وہ یہی سب ہیں۔ حالاں کہ کسی شخص کو بھی نبی ماننے کے لیے نصِ یقینی ضروری ہے، رام، کرشن وغیرہ کا تو کسی اسلامی دلیل سے وجود بھی ثابت نہیں اور جن غیر اسلامی ناقابل التفات کتابوں سے ان کا وجود معلوم ہوتا ہے خود ان ہی کتابوں سے ان کے وہ

حالات بد بھی معلوم ہوتے ہیں جو کسی نبی تو کیا، کسی "مومن" میں بھی نہ ہوں گے۔ بہر حال، حافظِ ملت نے ایک بار فرمایا۔ نیچریوں کے قول کی ساری بنیاد "لكل قوم هاد" پر قائم ہے۔ مگر اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ ہی سے ان کا سارا قصر استدلال بالکل منہدم کر دیا ہے۔ آیت کریمہ ہے: "انما أنت منذر ولكل قوم هاد" اعلیٰ حضرت نے ترجمہ فرمایا تم تو ڈر سنانے والے ہو اور ہر قوم کے ہادی۔ یعنی یہ فرمان صرف ہمارے رسول گرامی ﷺ سے متعلق ہے کہ تم تو ہر قوم کے لیے ہادی اور نذیر ہو۔ اب ولكل قوم هاد سے نیچریوں کے استدلال کی گنجائش ہی نہ رہی۔

حاضر و گواہ:

انجمن امجدیہ، بھیرہ ولید پور، اعظم گڑھ کے اجلاس میں ایک بار حضرۃ الاستاذ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ دام ظلہ نے آیت کریمہ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ شاہد کا معنی حاضر ہے، نماز جنازہ کی وہ دعا جس میں ہے لشاهدنا وغائبنا (مغفرت فرما) ہمارے حاضر کی اور ہمارے غائب کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہد بہ معنی حاضر آتا ہے لہٰذا آیۂ کریمہ سے ثابت ہوا کہ رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حاضر و ناظر بنا کر بھیجا۔ بعدہ حافظِ ملت نے تقریر کی تو حضرت نے مفتی صاحب قبلہ کی تحسین کے ساتھ حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یہی مان لو کہ شاہد کے معنی گواہ ہیں۔ تو بتاؤ گواہ کون ہوتا ہے؟ کیا وہ شخص گواہ ہو سکتا ہے جو واقعہ کے وقت موجود نہ ہو۔ یا موجود ہو مگر بہ چشم خود دیکھا نہ ہو۔ ہرگز نہیں۔ گواہ وہی ہوتا ہے جو واقعہ کے وقت حاضر بھی ہو اور ناظر بھی۔ لہٰذا إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا میں شاہد کے معنی گواہ لینے پر بھی حضور ﷺ کا حاضر و ناظر ہونا اپنی جگہ بعینہ ثابت ہے۔ ولله الحمد.

نماز نصف شعبان:

شب برات ۱۳۹۳ھ میں اختلاف رہا، بعض اضلاع میں ۲۹ ر رجب کو ہلال شعبان کی رویت ہوگئی تھی لیکن جمشید پور میں کوئی شرعی ثبوت نہ ملنے کے باعث ۳۰ کے حساب سے شب برات تھی۔

حافظ ملت نے پندرہویں شعبان کے اجلاس (منعقدہ جمشید پور) میں شب برات کی فضیلت پر تقریر فرمائی اور اس میں حاشیہ جلالین للعلامۃ احمد الصاوی المالکی علیہ الرحمہ کے حوالے سے یہ حدیث پیش کی:

من صلى فيها مائة ركعة أرسل الله تعالىٰ اليه مائة ملك: ثلاثون يبشرونه بالجنة وثلاثون يؤمنونه من عذاب النّار وثلاثون يدفعون عنه أفات الدنيا وعشرة يدفعون عنه مكايد الشيطان. (صاوی سورۂ دخان پ:۲۵)

جس نے اس شب میں سو رکعت نماز پڑھی۔ خدائے تعالیٰ اس کے پاس سو فرشتے بھیجتا ہے۔ تیس اسے جنت

کا مژدہ سناتے ہیں، تیس اس کو عذاب دوزخ سے مامون رکھتے ہیں۔ تیس آفات دنیا سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور دس فرشتے شیطان کے مکر وفریب اس سے دور کرتے ہیں۔

حافظ ملت نے فرمایا: "ان عظیم فوائد کے پیش نظر شب برات میں نماز پڑھ لینی چاہیے، سو رکعت پڑھنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی، بس ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے۔ میں اس نماز کا پابند ہوں، امسال شب برات میں اختلاف رہا، تو میں نے کل بھی سو رکعتیں پڑھیں اور آج بھی پڑھیں۔"

حافظ ملت ایک زمانے سے بلا ناغہ، شب برات جمشید پور میں کیا کرتے۔ اسی شب میں مدرسہ فیض العلوم کا جلسۂ دستار بندی منعقد ہوتا ہے جس میں حضرت کی شرکت لازمی سمجھی جاتی۔ میں نے چار سال تو خود مشاہدہ کیا کہ حضرت جلسہ گاہ تشریف لے جانے سے پہلے بعدِ مغرب فوراً اور کبھی ذرا دیر بعد یہ نماز ضرور پڑھتے۔ آخری سال ۱۳۹۵ھ جس میں حضرت کی طبیعت مضمحل اور نقاہت زیادہ تھی، اُس سال بھی یہ نماز فوت نہ ہونے دی حدیث پاک أفضل الأعمال ادومها۔ (بہترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ رہے) کا جلوہ اگر دیکھنا ہو تو کوئی حافظ ملت کے صبر آزما اور مشقتوں سے لبریز اعمال زندگی دیکھے۔

نشان سجدہ اور داغ جبیں:

اسی سال ۱۴ر شعبان کو جب حافظ ملت مدرسہ فیض العلوم میں تشریف فرما تھے، علامہ رشد القادری صاحب نے ایک صاحب کا ذکر کیا کہ یہ نمازوں کے تو پابند نہیں، مگر پیشانی پر ایک نمایاں داغ بنا رکھا ہے حضرت نے فرمایا: "بہت بری چیز ہے۔ قرآن میں اُس علامتِ سجدہ کی تعریف کی گئی ہے جو چہرے میں نمایاں ہوتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ ان کی علامت ان کے چہروں میں ہے۔ قرآن کریم میں "فی جباهھم" (ان کی پیشانیوں میں) نہیں ہے۔ حضرت کے پاس تفسیر صاوی شریف رکھی ہوئی تھی۔ فرمایا: اسی صاوی میں داغ سجدہ کی مذمت میں ایک حدیث ذکر کی ہے۔"

یہ سن کر فوراً میں نے صاوی شریف سے یہ مقام نکالا۔

(سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ) وهو نور و بياض يعرفون به فى الأخرة أنهم سجد وافى الدنيا. (جلالين)

(ان کی علامت ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے نشان سے) وہ ایک نور اور سفیدی ہے جس سے آخرت میں اس کی شناخت ہوگی کہ انھوں نے دنیا میں سجدے کیے ہیں۔ (جلالین)

علامہ احمد صاوی فرماتے ہیں:

اختلف فى تلك السيما فقيل: إن مواضع سجودهم يوم القيمة ترى كالقمر ليلة البدر وقيل هو صفرة الوجوه من سهر الليل وقيل: الخشوع الذى يظهر على الأعضاء حتى يتراءى أنهم مرضىٰ وليسوا بمرضى وليس المرادبه ما يصنعه بعض الجهلة المرائين من العلامة فى الجبهة. فإنه من فعل الخوارج وفى الحديث "إنى لأبغض الرجل وأكرهه إذا رأيت بين عينيه أثر السجود." (صاوی شریف، سورہ فتح، پ:۲۶)

اس علامت میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کے اعضائے سجدہ روز قیامت چودھویں کے چاند کی طرح روشن نظر آئیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ چہرے کی زردی ہے جو شب بیداری کے باعث پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے وہ خشوع مراد ہے جو اعضا پر نمایاں ہوتا ہے، جس سے کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ وہ بیمار ہیں حالاں کہ بیمار نہیں۔ اس سے وہ "داغ" مراد نہیں جسے بعض ریاکار جاہلین اپنی "پیشانیوں" میں بنا لیتے ہیں۔ یہ تو خارجیوں کا فعل ہے۔ حدیث شریف میں ہے: میں تو اُس شخص کو دشمن اور ناپسند رکھتا ہوں جس کی آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) نشان سجدہ دیکھتا ہوں۔

حضور حافظ ملت کی توجیہ، علامہ احمد صاوی کی تصریح، اور اس حدیث پاک سے ہم لوگوں کو ایک عجیب انشراحِ صدر ہو گیا، مولانا ارشد القادری صاحب نے کہا۔ میرے دل میں ایک انقباض رہتا تھا کہ قرآن علامتِ سجدہ کی تعریف کرتا ہے اور ہم لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا داغ سجدہ قرآن کا پسندیدہ اور محمود ہے۔ مگر آج شرح صدر ہو گیا کہ "داغ پیشانی" تو مذکورِ قرآن ہی نہیں۔ بلکہ اس میں تو نور چہرہ کی تعریف فرمائی گئی ہے۔

موت کیا ہے؟

حافظ ملت نے تقریروں میں بارہا اس پر روشنی ڈالی۔ فرماتے:

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ جب کہا جاتا ہے: فلاں آدمی مر گیا تو بتاؤ جسم و روح میں سے کون سی چیز ہے جو مر گئی یا فنا ہوئی۔ کیا روح مر جاتی ہے؟ ہر گز نہیں۔ اہل اسلام ہی نہیں بلکہ فلاسفہ کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ روح نہیں مرتی، پھر کیا جسم مر جاتا ہے؟ یہ بھی نہیں۔ اُسے تو تم آنکھوں سے دیکھتے ہو، ہاتھوں سے ٹٹولتے ہو۔ تمام اعضا اپنی جگہ سلامت ہیں کوئی عضو فنا نہیں ہوا۔ پھر موت کیا ہے؟ میں کہتا ہوں موت جسم اور روح کے اختلاف کا نام ہے۔ جب

تک روح اور جسم کا اتصال و اتفاق تھا، آدمی زندہ تھا۔ جب دونوں میں اختلاف اور جدائی ہوگئی کہ دیا انسان مرگیا۔
معلوم ہوا اتفاق زندگی ہے اور اختلاف موت۔ ایک جسم و روح کا اختلاف شخص کی موت ہے۔ افراد خانہ کا اختلاف گھر کی موت ہے۔ ایک محلہ، ایک گاؤں، ایک شہر، یا ایک ملک کا اختلاف اُس محلہ، گاؤں، شہر یا ملک کی موت ہے۔

مدرسہ اور مسجد:

حضرت کو مدرسہ اور تدریس سے پوری زندگی شغف رہا۔ بہت سارے مدارس کی بنیاد رکھی، کسی مدرسہ کے جلسۂ تاسیس کی دعوت حتی الامکان رد نہ فرماتے۔ اور ایسے اجلاس میں مدرسہ کی اہمیت پر خصوصی تقریر کرتے۔ مسجد اور مدرسہ کی عمومی افادیت کا فرق بیان کرتے ہوئے حضرت سے ہم نے بار بار سنا کہ:
اگر کسی نے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا تو اسے اس مسجد میں ہر نماز پڑھنے والے کا ثواب ملے گا لیکن اگر وہی شخص دوسری مسجد یا کسی دوسری جگہ نماز پڑھے تو اس کے نماز پڑھنے کا ثواب پہلی مسجد تعمیر کرانے والے کو نہ ملے گا۔ اور اگر کسی نے مدرسہ کی تعمیر میں حصہ لیا تو اس مدرسہ سے نماز و روزہ، احکام شرع، اور علوم دینیہ سیکھ کر جانے والا ہر ایک طالب علم جہاں بھی رہے، جس جگہ نماز پڑھے، روزہ رکھے، اور کوئی کار خیر کرے، اس مدرسہ کی تعمیر میں حصہ لینے والا اس طالب علم کے ہر کار خیر کا ثواب پائے گا۔ اور خود اس مدرسہ کے اندر اساتذہ و طلبہ یا دیگر حضرات کے تعلّم و تعلیم اور عملِ خیر کا ثواب مزید برآں ہے۔
حافظ ملت کے یہ افادی جملے معانی کثیرہ کا گنجینہ، حسن ایجاز کا بہترین نمونہ، فقہی دقت نظر، اور ان کی نکتہ شناسی کی شاندار مثال ہیں۔ ان مختصر جملوں کی اگر تفصیل کی جائے تو ایک مبسوط اور لمبی تقریر ہو سکتی ہے۔

خدا کے نافرمان سے متارکت اور دعاے قنوت:

حافظِ ملت فرماتے ہیں: مجھے دور طالب علمی میں تقریر کی پوری مشق ہوگئی تھی اور کسی بھی موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کر سکتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا: مجھے کوئی بھی موضوع دے دیا جائے ایک گھنٹہ تقریر کروں گا۔ لوگوں نے معروف "دعاے قنوت" میری تقریر کا عنوان تجویز کیا۔ میں نے اُس پر ایک گھنٹہ برجستہ تقریر کی۔
"اس دعاے قنوت میں توکل، ایمان، شکر، کفرانِ نعمت، عبادت، نماز وغیرہ کا مضمون تو ہے ہی مگر میں نے ونخلع ونترك من يفجرك پر خاص روشنی ڈالی، بتایا کہ رب العالمین کے حضور کھڑے ہو کر روزانہ اقرار کیا جاتا ہے کہ "ہم جدا ہوتے ہیں اور اُس شخص کو چھوڑتے ہیں جو تیری نافرمانی کرے" لیکن اس اقرار کے مطابق عمل کہاں

تک ہوتا ہے۔ یہ تو ہر فاجر اور خدا کے نافرمان سے قطع تعلق کا اقرار ہے۔ اور کافر و مرتد تو سب سے بڑا فاجر اور نافرمانِ خدا ہے اُس سے تعلق اور دوستی بھلا کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟"
یہ چند افادات میں نے بہ عجلت پیش کر دیے ہیں۔
اشرفیہ کے حافظِ ملت نمبر کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ افسوس کہ میں نے یہ کام پہلے شروع نہ کیا۔ ورنہ اس طرح کے اور بھی افادات ذہن میں محفوظ ہیں۔ خدا کرے انھیں جلد ہی کہیں لکھ کر پیش کر سکوں۔ آمین

ملفوظات و واقعات

حضرت مولانا عبد الحق خیر آبادی:

معقولات میں حافظ ملت کا سلسلۂ تلمذ بواسطۂ صدر الشریعہ (م ۱۳۶۷ھ) از مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری (م ۱۳۲۶ھ) حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ) علیہم الرحمہ سے ملتا ہے ان کے صاحبزادے مولانا عبد الحق خیر آبادی کے بارے میں فرمایا کہ وہ جامعۂ ازہر مصر پہنچے۔ وہاں ایک جگہ منطق کی مشکل و اہم اور معرکۃ الآرا کتاب "افق المبین" پڑھائی جا رہی تھی۔ مولانا عبد الحق صاحب بھی اس درس گاہ میں پہنچے اور طلبہ کی صف میں بیٹھ گئے۔ استاذ کی ان سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ دوران درس استاذ نے ایک تقریر کی اُس پر مولانا نے اعتراض کیا، استاذ نے اس کا جواب دیا۔ اس جواب پر مولانا نے سات اعتراضات قائم کر دیے۔ استاذ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ آپ مولانا عبد الحق خیر آبادی ہیں۔ افق المبین کے اس سوال پر میرے مذکورہ جواب کے بعد سات اعتراضات قائم کرنے والا آج دنیا میں مولانا عبد الحق خیر آبادی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

طریقۂ اصلاح اور ظرافت طبع:

(۱) ایک بار ایک طالب علم نے ہدایۃ النحو پڑھتے وقت عبارت یوں پڑھی، "من حيث الإعراب والبَناءِ" فرمایا: بنائے کیا؟ بگاڑ دیا۔ ہونا چاہیے تھا: والبِناء.
(۲) مدارک شریف ج:۳ ص:۲ (سورۂ کہف) کی عبارت ہے: "يعني أن قولهم هذا لم يصدر عن علم ولكن عن جَهل مفرط" اُسے میں نے یوں پڑھا "عن جِهْلٍ" فرمایا: جِہل پڑھنا خود جَہل ہے۔ اب عبارت درست کر کے میں نے پڑھ دیا "عن جَهلٍ مفرط"
(۳) ایک بار کہیں نماز پڑھی۔ امام صاحب کو اس نماز میں بہت زیادہ کھانسی آتی رہی یا کہا جائے کہ کھانستے

رہے، بعد نماز حضرت نے فرمایا: "امام صاحب کی کھانسی کھانسیوں کی امام ہے۔" (بروایت مولانا یٰسین اختر مصباحی)

عیادت:

حافظ ابراہیم صاحب مبارکپوری مرحوم رشتے میں والد صاحب کے بھائی ہوتے ہیں۔ اکثر ہمارے گھر ان کی آمد ہوتی۔ بڑی محبت رکھتے تھے۔ ایک بار والد صاحب بیمار ہوئے، اور حافظ ابراہیم صاحب سے کہا کہ مبارک پور جاکر حافظ ملت سے دعاے شفا کرائیں۔ اور ہو سکے تو حضرت سے ایک تعویذ لے کر بھیج دیں۔ موصوف نے حضرت سے پیغام عرض کیا اور تعویذ بھیج دیا۔ اس کے چند دنوں بعد حضرت کا محمد آباد گوہنہ ایک اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف لانا ہوا۔ (مبارک پور سے براہ ابراہیم پور محمد آباد جانے کے لیے راستہ میں خیر آباد سے پہلے دھریرا گھاٹ پڑتا ہے جہاں سے اتر کر ٹونس ندی پار کر کے ہمارے وطن بھیرہ تک رسائی ہوتی ہے۔ ندی سے بھیرہ تک پیادہ تقریباً ۱۰ منٹ کا راستہ ہے) اس دن اچانک حافظ ملت اور حضرت مولانا سید حامد اشرف صاحب غریب خانہ پر پہنچے۔ اس وقت میں خیر آباد مدرسہ ضیاء العلوم میں زیر تعلیم تھا۔ آواز دی تو ننگے سر باہر نکلا حضرت کو ناگہاں دیکھ کر سخت تعجب ہوا، ملاقات کی اور حضرت اندر تشریف لائے، فوراً والد صاحب بھی ملے۔ والد صاحب کو دیکھ کر فرمایا آپ کو صحت یاب دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ عیادت کے لیے محمد آباد کا رکشہ چھوڑ کر یہاں آگیا۔

سادگی اور محنت کی قدر:

والد صاحب نے کچھ مٹھائی منگائی اور وہی پیش کی۔ یہ تقریباً تین بجے کا وقت تھا۔ چائے کے لیے میں دودھ کی تلاش میں نکلا۔ اس وقت بھیرہ میں چائے کا کوئی ہوٹل بھی نہ تھا۔ پورب محلہ سے پچھم محلہ اور دکھن محلہ تک میں نے دوڑ لگائی، بہ مشکل تمام دکھن پورہ میں لعل محمد صاحب کے یہاں دودھ ملا، وہ بھی دہی جمانے کے لیے رکھا جا چکا تھا۔ موصوف کے لڑکے محمد رفیق نے اسی سے ایک پاؤ دودھ نکال کر دیا۔ اُدھر سے واپس آیا تو طول انتظار کے باعث سادی چائے حضرت کے سامنے رکھی جا چکی تھی۔ اب دودھ لے کر حاضر ہوا تو فرمایا: دودھ کی ضرورت نہیں، سادی چائے پی جا سکتی ہے۔ والد صاحب نے عرض کیا: "بڑی محنت سے ملا ہے" فرمایا: "جب اس پر محنت صرف ہوئی ہے تو لاؤ"۔ یعنی محنت کی قدر ضروری ہے اور محنت رائگاں نہیں کی جا سکتی۔

چند منٹ مزید قیام رہا۔ دعائیں دیں۔ مولانا سید حامد اشرف صاحب قبلہ سے بھی دعائیں کرائیں۔ اور پھر پیادہ پا محمد آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ محمد آباد گھاٹ تک میں نے مشایعت یا متابعت کا فریضہ انجام دیا۔ اس سنت عیادت پر حیرت ہوتی ہے کہ دھریرا گھاٹ سے بھیرہ پیدل آنا۔ اور پھر وہاں سے محمد آباد پیدل جانا "کارے دارد"

میں وہاں کا باشندہ ہوں مگر جوانی میں بھی یہ مسافت طے کرنے کے لیے مجھے بڑی ہمت کرنی پڑتی ہے۔ ایک بار برادر محترم مولانا بدر القادری نے میرے ساتھ محمد آباد سے بھیرہ پہنچتے وقت کہا: اگر یہ آپ کا وطن نہ ہوتا تو شاید آپ بھی ایسی زحمت پیادہ پائی برداشت نہ کرتے، میں نے کہا: بالکل۔ مگر حضور حافظ ملت کے لیے صرف سنت عیادت کی ادائگی میں یہ ساری زحمتیں گوارا تھیں۔ در حقیقت ان کے نزدیک ہر ایسے شخص کی بے پناہ قدر تھی جو سنیت سے سچی ہمدردی رکھتا ہو اور مذہب کا سچا خادم ہو۔ یہی جذبۂ قدر شناسی و محبت انھیں اپنے خدام کی دل جوئی کے لیے ایسی مشقتیں جھیلنے پر بلا تکلف آمادہ کر دیا کرتا تھا۔ اللھم ارزقنا نصیبا منہ۔

مہمان بحیثیت مہمان کی خاطر و تواضع:

بارہا سیکڑوں اور ہزاروں افراد کو حافظ ملت کی قیام گاہ مدرسۂ قدیم میں حاضری کا شرف حاصل ہوا ہوگا۔ وہاں جانے والے مہمانوں کے لیے حضرت بنفس نفیس چولھا جلاتے، چائے بناتے، اور پلاتے، گرمی کا موسم ہوتا تو شربت کا اہتمام کرتے۔ چاہے یہ حاضر ہونے والا، اپنا مرید و شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔ اور کمال تو یہ ہے کہ مہمان اگر ان کے کام میں ہاتھ بٹانا، یا کوئی خدمت کرنا چاہتا تو ہرگز گوارا نہ کرتے۔ مولوی عبد الحلیم صاحب بھیروی کے والد عبد الشکور صاحب جو حضرت کے مرید ہیں ایک بار حاضر خدمت ہوئے، چاہا کہ پنکھا جھلیں۔ گوارا نہ کیا اور فرمایا: "آپ مہمان ہیں۔"

رفیق گرامی مولوی عبد الستار صاحب پر ولیاوی بیان کرتے ہیں کہ بقر عید کی چھٹی میں جو طلبہ مدرسہ میں رہ جاتے، بعد نماز حضرت ان سب کی دعوت کرتے، سویاں، چائے اور بسکٹ سے ضیافت فرماتے پھر سب کو عیدی دے کر واپس کرتے، یہ ان کا لازمی معمول تھا۔ میں چوں کہ بھیرہ کا ہوں اس لیے بقر عید کے دن مبارک پور میں گذارنے کا اتفاق نہ ہوا (بھیرہ مبارکپور سے ۶ر میل دوری پر ہے) قریبا ہر ہفتہ گھر پہنچ جاتا تھا۔ تعطیل عید الاضحیٰ میں رکنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ منظر بچشم خود دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ مولانا عبد الستار صاحب بیان کرتے ہیں حضرت خود اپنے ہاتھوں تمام طلبہ کے سامنے پیالیاں اور ماحضر پہنچاتے۔ ایک بار میں نے چاہا کہ ذرا ہاتھ بٹاؤں اور پیالیاں طلبہ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ فرمایا: بیٹھو، میں میزبان ہوں۔ ان گرامی الفاظ سے کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ مزید کوئی ہمت نہ کر سکا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ امام مالک کے یہاں امام شافعی علیہ الرحمہ تحصیل علم کے لیے حاضر ہوئے تو انھوں نے امام شافعی کو مہمان کی جگہ رکھا اور بحیثیت میزبان خود اُن کی خدمت انجام دی۔ امام شافعی فرماتے ہیں: میں اس وقت سخت شرمندہ ہو گیا۔ جب نماز صبح کے وقت میرے استاذ امام مالک نے اپنے ہاتھوں وضو کا پانی حاضر

کیا۔ مگر حافظ ملت کے یہاں بارہ سو برس بعد اس کا عملی نمونہ مشاہدہ میں آتا ہے۔ یہ ہے رسول گرامی وقار ﷺ کی سنت پر عمل اور اسلاف کرام کے اسوۂ حسنہ کی پیروی۔ دور حاضر میں جس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ اعزا و اقربا اور احباب و رفقا کے ساتھ تو کسی حد تک بعض لوگ اس کی پابندی کر لیتے ہوں گے۔ مگر ان مریدین اور تلامذہ کی خدمت جو سامنے زانوے ادب تہ کرنے کے عادی اور دست بوسی، قدم بوسی اور اکرام و تعظیم کے مشتاق ہوتے ہیں۔ انتہائی نادر بلکہ نایاب ہے۔ اور زیادہ مشکل اس کا التزام اور دوام ہے۔ دو چار بار، دس بیس آدمیوں کے ساتھ کوئی شخص چاہے تو ایسا کر سکتا ہے مگر پوری زندگی سختی سے اس پر عمل درآمد، یہی ہے حافظ ملت کا وہ نمایاں اور امتیازی کردار جس کی نظیر ڈھونڈھے نہیں ملتی۔

قلت وقت کے باعث اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، توفیق الٰہی نے یاوری کی تو مزید واقعات جلد ہی کسی رسالے میں نذر قارئین کروں گا۔ واللہ الموفق لکل خیر وھو المستعان وعلیہ التکلان.

مکتوبات

① ۱۰ر شعبان ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو اشرفیہ سے میری فراغت ہوئی۔ تعطیل کلاں کے بعد ۲۰ر شوال ۱۳۸۹ھ کو خالص پور ادری ضلع اعظم گڑھ کے کچھ لوگ آئے، وہ اپنے مدرسہ بیت العلوم خالص پور میں خدمتِ تدریس کے لیے مجھے لے جانا چاہتے تھے، والد صاحب نے ان کے اصرار پر اجازت دے دی۔ مگر میں نے حضور حافظ ملت کو اجازت طلبی کا خط لکھا اور اپنی کوتاہیوں، تقصیر اور غلطیوں سے معافی بھی طلب کی، جس کے جواب میں حضرت نے مندرجہ ذیل کرم نامہ تحریر فرمایا۔

۷۸۶

از دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور

محب محترم مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم .... دعاے خیر و سلام مسنون

محبت نامہ ملا۔ آپ کی سعادت مندانہ زندگی اور مخلصانہ، محبانہ روش اس منزل پر ہے کہ میرے حاشیۂ خیال میں بھی غلطی اور ناراضگی کا کوئی گوشہ نہیں۔ میں آپ کا مخلص دعا گو ہوں۔ مولاے کریم ہمیشہ بصحت و سلامتی شاد و آباد رکھے، دین متین کی نمایاں و ممتاز خدمات انجام دلائے۔ آمین

آپ کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ابھی آپ اشرفیہ کو کچھ وقت اور دیں تو آپ اور زیادہ قیمتی ہو جائیں گے، چناں چہ آپ کے والد صاحب سے میں نے کہا تھا۔

آپ کی اور آپ کے متعلقین کی جو راے ہو اگر آپ کو خالص پور کی جگہ پسند ہے اور جانا چاہتے ہیں تو میری اجازت ہے۔ اپنے والد صاحب کو سلام کہہ دیجیے، فقط عبد العزیز عفی عنہ۔ ۲۱ر شوال ۸۹ھ

اس کے بعد ۲۱ر شوال ہی کو تحصیل تعلیم مزید کی خاطر اشرفیہ پہنچ گیا۔ میرے ہم سبق برادر محترم مولانا بدر عالم صاحب بدر القادری زید مجدہ کو بھی یہی حکم ہوا تھا۔ وہ مجھ سے چند دنوں پہلے پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا: آگئے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: میں نے بھی ایک بار ترک تعلیم کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ صدر الشریعہ کا حکم ہوا کہ ابھی آپ کو مزید پڑھنا ہوگا۔ میں نے تعمیل حکم کی تھی۔ تم لوگوں نے بھی کی۔

اس سے پہلے کسی موقع پر حضرت نے بیان فرمایا تھا گھریلو پریشانیوں کے باعث میں نے بہت ساری کتابیں پڑھنے سے پہلے ہی دورۂ حدیث لینا چاہا۔ صدر الشریعہ نے فرمایا: تعلیم پوری کرو، خدا حافظ ہے۔ تو خدا نے ایسی حفاظت فرمائی کہ مزید تین سال اجمیر شریف میں گذرے۔ اور اس کے بعد حضرت بریلی تشریف لے گئے تو وہاں بھی حاضر خدمت ہو کر اور ایک سال تعلیم حاصل کی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلك.

② ۱۷ر اگست ۱۹۷۰ء/ ۱۴ر جمادی الآخرہ ۱۳۹۰ھ کو بحکم حافظ ملت اشرفیہ چھوڑ کر استاذان محترم حضرت مولٰنا حافظ عبد الرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمہ اور قاری محمد یحیٰ صاحب قبلہ کی ہمرکابی میں دار العلوم فیضیہ نظامیہ باراہاٹ، اِشی پور، ضلع بھاگل پور برائے تدریس حاضر ہوا۔ حضرت حافظ جی قبلہ اور قاری صاحب دو تین دن بعد اشرفیہ واپس ہو گئے۔ پھر میں نے حافظ ملت کی خدمت میں اپنی خیریت وغیرہ پر مشتمل ایک عریضہ لکھا۔ جس کے جواب میں منقولہ ذیل کرم نامہ موصول ہوا۔

محب محترم مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم ...... دعاے خیر و سلام مسنون!

آپ کا خط ملا تھا۔ مصروفیات زیادہ ہیں۔ جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کی سعادت مندی، سلامت روی، دین پروری سے قوی امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ دین متین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں گے۔ دعا ہے خداوند کریم آپ کی عمر میں برکت دے، علم و فضل میں وسعت دے، آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین۔

والدّعا – عبد العزیز عفی عنہ ۴ر جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ۔

③ ۱۰ر شوال ۱۳۹۰ھ کو حضرت کی ملاقات کے لیے اشرفیہ حاضر ہوا مگر ۱۰ر تاریخ کو جمعہ تھا، اس لیے محروم لقا رہا ۱۱ر شوال کی صبح کو دار العلوم فیضیہ نظامیہ پہنچ گیا پھر حضرت ۱۱ر کو مبارک پور تشریف لائے، ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے بھی حضرت کو ایک اطلاعی عریضہ لکھ دیا جس کا یہ جواب موصول ہوا۔

از اشرفیہ، مبارکپور ۲۲؍ شوال ۹۰ھ

محب محترم مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم .... دعوات وافرہ وسلام مسنون!

آپ کا خط ملا۔ ملاقات نہ ہوئی، مجھے خوشی ہوئی کہ آپ وقت پر مدرسہ پہنچے۔ مولائے کریم بہ صحت و سلامتی شاد و آباد رکھے، زیادہ سے زیادہ دینی خدمات انجام دلائے، مخلصانہ دینی خدمات آخرت کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ سب سے بڑی بنیادی چیز احساس ذمہ داری ہے۔ جس کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوگا وہ ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خداوند کریم ہمیشہ کامیاب فرمائے۔ آمین۔ محب محترم جناب مولانا شاہدی صاحب و جناب حاجی صاحب وغیرہ سب احباب کو سلام ودعا۔

فقط عبدالعزیز عفی عنہ

④ شعبان ۱۳۹۰ھ میں تعطیل کلاں کے بعد مکان پہنچا، اُس وقت دارالعلوم فیضیہ نظامیہ کے حالات کچھ ایسے دیکھے کہ میں نے وہاں مزید رہنا مناسب نہ سمجھا، اس وقت حافظ ملت محمد آباد گوہنہ ایک جلسہ میں تشریف لائے تھے۔ اُن سے ماجرا کہہ سنایا، اور اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ پھر اسی موضوع سے متعلق رمضان شریف میں حضرت کے وطن بھوجپور ضلع مرادآباد کے پتے پر ایک خط لکھا جس کے جواب میں یہ گرامی نامہ وصول ہوا۔

محب محترم جناب مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم .... دعوات وافرہ وسلام مسنون!

آپ کا خط ملا جس میں مدرسہ فیضیہ سے مستعفی ہونے کی اجازت طلب کی ہے۔ جواباً تحریر ہے آپ نے وہاں کے حالات اور مستقبل میں مزید خرابی کا اندازہ بتایا تھا۔ اس وقت میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کو اختیار ہے۔ وہی اس وقت کہتا ہوں کہ آپ مختار ہیں۔

میں مدرس کا تقرر کرتا ہوں، ہٹاتا نہیں ہوں۔ مدرس اپنی خوشی سے خود چھوڑ دے اُسے اختیار ہے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اپنے والد صاحب و دیگر احباب سے سلام مسنون کہہ دیجیے، والدعا والسلام۔

فقط عبدالعزیز عفی عنہ

⑤ بھاگلپور میں مولانا فضل حق غازی پوری بھی میرے ساتھ مدرس تھے، وہ رمضان شریف میں تراویح پڑھانے جمشید پور جاتے تھے۔ مولانا ارشد القادری صاحب سے انھوں نے میری تدریس کے لیے گفتگو کر لی۔ اور اپنے اصرار سے مجھ کو جمشید پور لے گئے، چند ہی دنوں کے بعد حافظ ملت کا ٹیلی گرام موصول ہوا کہ مولانا عبدالرؤف صاحب انتقال کر گئے۔ اس سانحہ کی خبر پاکر دوسرے تیسرے دن علامہ ارشد القادری مبارک پور پہنچے۔ غالباً انھیں کے ذریعے مجھے حضرت کا یہ گرامی نامہ ملا۔

محب محترم جناب مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم........ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت علامہ ارشد القادری صاحب تشریف لائے۔ فرمایا مولوی محمد احمد، مولوی عبدالستار فیض العلوم میں مدرس رکھ لیے گئے۔ مجھے یہ معلوم ہوکر بڑی خوشی ہوئی، فیض العلوم بھی اپنا ادارہ ہے، اپنا ہی سمجھ کر محنت سے کام کرنا چاہیے۔ بار بار مدرس اور مدرسہ کی تبدیلی مضر ہے۔ وثوق واعتماد جاتا رہتا ہے اور کام بھی نہیں ہوتا۔ بزرگوں نے بتایا ہے "یک در گیر محکم گیر" بہر حال آپ جم کر محنت سے کام کریں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ عزیز مکرم جناب مولوی عبدالستار صاحب کو بہ مضمون واحد سلام ودعا۔

فقط عبدالعزیز عفی عنہ

⑥ میں نے بذریعہ ڈاک فیض العلوم میں کارِ تدریس منظور کر لینے کی خبر حضرت کو دی تھی، اور عرض کیا تھا کہ مولانا عبدالستار صاحب پرولیاوی بھی یہیں ہیں۔ مولانا حافظ فضل حق غازی پوری بھی شہر کے مدرسہ دارالقرآن، ذاکر نگر میں مدرس ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کرم نامہ دستیاب ہوا۔

از: اشرفیہ، مبارک پور ۱۹؍ ذوالقعدہ ۹۱ھ

محب محترم مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم......... السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط ملا۔ اس کا جواب تو جو ہو سکتا تھا میں نے لکھ دیا ہے بہر حال میں آپ کے اور مولوی حافظ فضل حق اور مولوی عبدالستار صاحب سب کے لیے دعا کرتا ہوں کہ مولیٰ تعالیٰ دین کی خدمت کی توفیق بخشے۔ آپ حضرات کی مقبولہ خدمت سے فیض العلوم کو ترقی ہو۔ بام عروج پر پہنچے۔ آمین۔ سب کو سلام ودعا۔ فقط عبدالعزیز عفی عنہ۔

⑦ میں نے اپنے ادبی ذوق اور عربی جدید کی تحصیل سے متعلق حضرت کو ایک خط لکھا تھا۔ جس کا یہ جواب موصول ہوا۔

۸؍ ذی القعدہ ۱۳۹۲ھ

محب محترم مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم !السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ صادر ہوکر مسرت بخش ہوا۔ حصول کمال کا ذوق معلوم ہوکر بڑی خوشی ہوئی۔ مولائے قدیر پورا فرمائے۔ ہر فن میں کمال عطا فرمائے۔ عربی ادب کی خود ہی کوشش کرتے رہیے۔ باہر جانے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ اپنی سعی سے کم از کم قدیم عربی پر قدرت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد جدید کے لیے بھی کوئی سبیل نکل آئے گی۔ میری دعائیں شامل حال ہیں اور رہیں گی۔ مدرسین و طلبہ اور علامہ ارشد القادری صاحب کو سلام ودعا۔

فقط عبدالعزیز عفی عنہ

⑧ میرے لڑکے محمد احمد مرحوم عرف غلام جیلانی شمیم رضا کی طبیعت عرصہ سے خراب رہتی تھی۔ اس کے لیے میں نے رمضان شریف ۱۳۹۳ھ میں حضرت سے تعویذ کی درخواست کی۔ اسی خط میں اپنی علمی مصروفیت اور حصول کمال کے لیے اپنی سعی و محنت کا بھی ذکر کر دیا۔ اس کے جواب میں ذیل کا گرامی نامہ اور تعویذات موصول ہوئے۔

۲۴؍ رمضان ۱۳۹۳ھ

محب محترم جناب مولوی محمد احمد صاحب زید مجدکم .... السلام علیکم ورحمتہ

یہ جملہ بڑا ہی پیارا تھا کہ حصول کمال کی کوشش کر رہا ہوں۔ خداوند کریم آپ کو باکمال کرے۔ عمر میں برکت، علم و فضل میں وسعت عطا فرمائے، آمین۔ پینے کا تعویذ روانہ ہے۔ بچے کے لیے بھی تعویذ ہے جس پر تاگہ بندھا ہے۔

تاخیر جواب کا سبب میری علالت و مصروفیت ہے۔ عبدالعزیز عفی عنہ

حضرت آسی کی شاعری کا اعتقادی و اِصلاحی رنگ[1]

آسیِ مست کا کلام سنو
وعظ کیا ، پند کیا ، نصیحت کیا

حضرت آسی کا کلام دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک عنفوان شباب اور دورِ جوانی کا، جب مشق سخن اور مشاعروں میں شرکت کا زمانہ تھا۔ اس دور کی شاعری میں معشوقانِ مجازی کا بھی ذکر ملے گا اور اسے شیخ یا کسی بزرگ یا باری عزوجل پر محمول کرنا بہت زیادہ تکلّف کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔

مثلاً ایک بار صفیر بلگرامی نے مومنؔ کا یہ شعر طرحِ مشاعرہ میں دیا:

کھول دو وعدہ کہ تم پردہ نشیں ہو نہ وصال
اپنی زلفوں کی طرح بات بناتے کیوں ہو

اس شعر میں ''وعدہ کھولنا'' خلاف محاورہ ہے اور وصال کی پردہ نشینی بھی محلِّ کلام ہے حضرت آسیؔ نے اس طرح پر غزل کہی جس میں متعدد اشعار بلا تکلف حسن حقیقی پر محمول ہو سکتے ہیں۔ مگر مشاعرے میں غزل پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہنچے تو صفیرؔ صاحب سے آنکھ ملا کر فرمایا کہ دیکھیے محاورہ یوں نظم کرتے ہیں۔ اشارہ یہ تھا کہ مومنؔ محاورہ نظم کرنا چاہتے تھے، نظم نہیں کر سکے۔ شعر یہ ہے:

تم پری زاد ہو، وعدہ تو پری زاد نہیں
آپ اُڑتے ہو اُڑو، بات اڑاتے کیوں ہو[2]

دوسرا حصہ بعد کی شاعری کا ہے جس میں پختگی، سلاست اور برجستگی کے ساتھ یہ بھی نظر آئے گا کہ اس کا تعلق عشق حقیقی سے ہے یا اس کے ذیل میں ہے مثلاً اپنے مرشد، کسی شیخ سلسلہ، ذات سرور کائنات یا ان کے آل و اصحاب

(۱) بوستان آسی، جلد سوم، مولانا عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، دہلی، اپریل ۲۰۱۵ء
(۲) عین المعارف، ص: ۵۰۔ مختصر حالات از حضرت سید شاہد علی سبز پوش علیہ الرحمہ۔ تاریخ اشاعت: ندارد، غالباً ۱۹۹۶ کے آس پاس کی اشاعت ہے، چوتھا یا پانچواں ایڈیشن ہوگا۔ انجمن فیضان رشیدی، کمر ہٹی، کلکتہ نے شائع کیا، اگلے حوالے بھی اسی ایڈیشن کے ہوں گے۔ محمد احمد مصباحی

میں سے کسی کو ملحوظ نظر رکھ کر شعر کہا گیا ہے۔ اور بیش تر مقامات پر عشق مجازی کا شیدا شعر کو بآسانی اپنے مطلب پر بھی محمول کر سکتا ہے۔

حضرت آسی کے کلام کا بڑا حصہ وحدۃ الوجود کے گرد نغمہ سرا ہے مگر اس میں بھی جو اظہار کا بانکپن، انداز بیان کا تنوع، طرز تفہیم کی دل کشی، معانی کی شوکت اور خیالات کی ندرت ہے وہ آپ کے قلم کا خاص حصہ ہے۔ فرماتے ہیں :

پوچھتے ہو کہ سرِّ وحدت کیا
ما سوا کی بھلا حقیقت کیا
(ص۱۰۴)

وہ کیا ہے ترا جس میں جلوا نہیں ہے
نہ دیکھے تجھے کوئی اندھا نہیں ہے
(ص۱۹۷)

بصارت ملی ہے ان آنکھوں کو جب سے
سوا تیرے کچھ میں نے دیکھا نہیں ہے
(ص۱۹۷)

بے حجابی یہ کہ ہر شے میں ہے جلوہ آشکار
گھونگھٹ اس پر دہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے
(۲۰۹)

تم نہیں کوئی، تو سب میں نظر آتے کیوں ہو
سب تمھیں تم ہو تو پھر منہ کو چھپاتے کیوں ہو
(۱۵۷)

کیا نیستیِ ہست نما کی ہستی
دھوکے سے بھری ہے ما سوا کی ہستی
آسی اِس دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہستی ہے اگر تو بس خدا کی ہستی
(ص۲۹۱)

کلام آسی کا بیش تر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے، یہاں تک کہ خود فرمایا: ع

کسی کی مدح خوانی نہ کی ہم نے جز غزل خوانی
(ص۲۷۴)

مگر غزل کا دامن بڑا وسیع ہوتا ہے، اس میں ہر قسم کے مضامین سما سکتے ہیں اور اس میں ہر شعر مستقل ہوتا ہے، اس لیے الگ الگ اشعار میں متنوع اور مختلف خیالات کا اظہار بآسانی ہو جاتا ہے۔
میں نے غور کیا تو حضرت آسی کی غزلوں میں جہاں وحدۃ الوجود اور حسن و عشق کا جلوہ کثرت سے ہے وہیں عقائد کا بیان، حسن عمل کی ترغیب، آرائش قلب کی تاکید، صدق طلب کی تعلیم اور راہ سلوک کے رموز بھی جابجا جلوہ فشاں ہیں۔ سب پر باضابطہ تبصرہ تو مشکل ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ چند عنوانات قائم کر کے اشعار پیش کرتا چلوں تاکہ کلام آسی کا یہ رخ بھی ملحوظِ خاطر اور زیب نظر ہو۔

صفات کے افعال و مظاہر پر نظر ہو تو ہر آن ایک نئی شان ہے :

مزا ہر آن میں ہے شان نو کا
مگر جب دل نہ ہو غافل ہمارا
(ص۹۴)

نور مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا ہر مخلوق میں جلوہ نما: حدیث پاک کی روشنی میں اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ سب سے پہلے نورِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کی تخلیق ہوئی، پھر اسی سے ساری کائنات پیدا کی گئی اس لیے ہر شے کے وجود میں نور مصطفیٰ کا شمول و ظہور ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے نغمہ زن ہیں:

جو شے تری نگاہ سے گزرے درود پڑھ
ہر جزو و کل ہے مظہر انوار مصطفیٰ
(۲۰۱)

وہی نور ہے اصل ارکانِ عالم
انھیں نے بڑھائی ہے سب شانِ عالم
وہی جسم اطہر ہوا جانِ عالم
"بروے زمیں گشت سلطانِ عالم
کے کو بود پائمالِ محمد" ﷺ
(تضمین بر کلام جامی ص۲۴۷)

محبت کی کارفرمائی: جو دل تخمِ عشق سے آباد ہے اس کے لیے ساری آسائشیں تیار ہیں اور جو اس سے خالی اور ویران ہے وہ دائمی سوزش اور کلفتوں کا شکار ہے۔ بڑی صفائی سے فرماتے ہیں:

جس نے کچھ تخم محبت کا نہ بویا دل میں
ایسا ہی دل ہے سدا آگ میں جلنے کے لیے
(۲۳۵)

جس نے کچھ تخم محبت کا ہے بویا دل میں
ہے سدا باغ میں وہ پھولنے پھلنے کے لیے
(۲۳۵)

بارگاہِ رسول تک رسائی خدا تک رسائی ہے: اسے کتنی تاکید اور یقینِ محکم کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:

عشق بازو جو شہِ ہر دوسرا تک پہنچا
وہ خدا تک ، وہ خدا تک ، وہ خدا تک پہنچا
(ص ۹۴)

جوازِ توسّل: توسّل کے خلاف منکرین کتنی ہرزہ سرائیاں کرتے اور اسے شرک تک پہنچانے کی جسارت ناروا کرتے ہیں مگر حضرت آسیؔ بڑی سنجیدگی اور دل کشی کے ساتھ ان کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نسبت شرک بجز تہمت بے جا کیا ہے
دل ہے جب اس کی طرف ، رخ ہے وسائل کی طرف
(۱۲۸)

ملنے والوں سے راہ پیدا کر
اس کے ملنے کی اور صورت کیا؟
(۱۰۴)

راہِ حق کی ہے اگر آسیؔ تلاش
خاکِ رہ ہو مرد حق آگاہ کی
(۱۸۱)

عقیدۂ شفاعت: شفاعت کا مضمون بہت سے بزرگوں نے اپنے اشعار میں گوناگوں انداز میں باندھا ہے۔ حضرت آسیؔ کے بھی انداز کی نزاکت اور اعتقاد کی صداقت دیکھیں:

گناہ گار ہوں میں واعظو! تمھیں کیا فکر
مرا معاملہ چھوڑو شفیع محشر پر
(۱۴۰)

واہ رے الفت اپنی امت کی
مجھ سے بے کس کی بھی شفاعت کی
(۱۷۷)

ہم ایسے غرقِ دریائے گنہ جنت میں جا نکلے
توانِ لَطْمۂ موجِ شفاعت ہو تو ایسی ہو
(۱۵۴)

نعیم و جحیم، حُسن کے دو متضاد جلوے:

نعیم کیسی جحیم کیسی، کرشمے سارے یہ حسن کے ہیں
کسی کو لوٹا ثواب ہوکر، کسی کو مارا عذاب ہوکر
(۱۱۹)

اختیار و استمداد: سرورِ کائنات علیہ الصلوات والتحیات اپنے رب کی عطا سے صاحب تصرف و اختیار ہیں، جہاں چاہیں پل بھر میں پہنچ سکتے ہیں، دور افتادہ دردمندوں کی چارہ سازی اور طالبانِ امداد کی فریادرسی ان کی رحمت عام اور اختیار عظیم کے حضور کسی طرح قابل انکار و ارتیاب نہیں۔

کیوں نہ پہنچے میری فریاد کو وہ پل بھر میں
جو پلک مارنے میں عرش خدا تک پہنچا
(۹۴)

حبِّ آلِ رسول:

زندگی کا نہ ادا خاک ہوا حق آسیؔ
جان جب خاک رہِ آل پیمبر نہ ہوئی
(۱۷۳)

ہے فخرِ جہاں آسیؔ اُن کی غلامی
اسی میں کمالات کی ہے تمامی
نہیں رہتی ہے پختہ کاروں میں خامی

"بصدق و صفائے چناں گشت جامؔی
"غلام غلامانِ آلِ محمد"، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم
(تضمین -- ص ۲۴۷)

چاریار:

چار یارانِ نبی میں آسؔی
تبعیت مجھے ہر یار کی ہے
طلبِ راہِ خدا میں لیکن
پیروی حیدرِ کرار کی ہے
(ص ۱۹۹)

بارگاہِ قادریت:

دل ہے آسؔی فدائے غوثِ پاک
جانِ شیدا مبتلائے غوثِ پاک
جانیے اس کو ولی اللہ کا
جس کے دل میں ہو ولائے غوثِ پاک
گردنیں ہوں اولیا کی، زیرِ پا
کون ایسا ہے سوائے غوثِ پاک
زیرِ فرماں ہیں زمین و آسماں
رشکِ سلطاں ہے گدائے غوثِ پاک
روزِ محشر آسؔیِ بے چارہ کو
بخشنا یا رب برائے غوثِ پاک
(ص ۱۳۱)

پوچھتے ہو شہِ جیلاں کے فضائل آسؔی
ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا
(ص ۱۰۶)

شوقِ دیدارِ رسول:

کہتے ہیں تم کو جو دیکھا تو خدا کو دیکھا
خواب میں بھی تو میسّر ہو یہ دولت مجھ کو
(۱۲۶)

دیدارِ الٰہی:

ہوں گنہگار مگر حسرتِ دیدار نہ پوچھ
جلوہ تیرا ہو تو دوزخ بھی ہے جنت مجھ کو [۱]
(۱۲۶)

(۱) راقم کو یہاں المستند المعتمد بناء نجاة الأبد ۱۳۲۰ھ (للإمام أحمد رضا القادري البريلوي ۱۲۷۲ھ - ۱۳٤۰ھ) شرح المعتقد المنتقد ۱۲۷۰ھ (للعلامة فضل الرسول البدايوني ۱۲۱۳ھ - ۱۲۸۹ھ) کی ایک دل چسپ عبارت یاد آتی ہے جو اس بحث کے تحت ہے کہ جو شخص ظاہراً مطیع و فرماں بردار ہے اور علم الٰہی میں (یعنی باطناً) بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے، یہ عقلاً ممکن ہے یا نہیں؟ اَشعریہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے، ماتریدیہ کہتے ہیں کہ محال ہے۔ امام احمد رضا قدس سرہ نے اس خاص مسئلے میں اشعریہ کا مذہب اختیار کیا ہے اور اس پر دلیل قائم کی ہے۔ اسی ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

و لا مانع عقلًا أن يتجلى الربُّ سبحنه و تعالى على بعض مَن في النار و يرزقَه رويةَ وجهه الكريم رحمةً منه، فإن الرحمة واسعة لا حَجْر فيها، و كذا لا امتناعَ عقلًا أن يربِطَ المولى سبحنه و تعالى حصولَ ذلك لمن يشاء بدخول النار، فيتحقق أن ذلك الإيلام لرفع الدرجات ، و جليلِ المثوبات، كما كان يكون في الحياة الدنيا. و لا والله لو فعل الله سبحنه و تعالى ذلك لرأيت عبادَه المخلصين إلى النار مُهرعين ، و في طلبها مسرعين ، و عن الجنة هاربين ، كهربهم عن الشهوات الدنيوية طلبًا لوجه الحق المبين، و الحمد لله ربّ الغلمين. (ص ۸۰ - اشاعت المجمع الإسلامي مبارك پور)

(ترجمہ) "عقلاً کوئی بات اس سے مانع نہیں کہ رب سبحانہ و تعالیٰ جہنم میں واقع کسی شخص پر اپنی رحمت سے تجلّی فرمائے اور اسے اپنا دیدار عطا فرمائے اس لیے کہ رحمت میں بڑی وسعت ہے، کوئی رکاوٹ نہیں۔ اسی طرح عقلاً یہ بھی محال نہیں کہ مولا سبحانہ و تعالیٰ جس کے لیے چاہے اپنے دیدار کا حصول، دخول نار سے وابستہ فرمادے تو ثابت ہوگا کہ وہ الم رسانیِ جہنم رفعِ درجات اور عظیم ثواب وصِلات کے لیے ہے جیسے اہل طاعت و معرفت پر دنیاوی زندگی میں مصائب و آلام کا نزول بلندی درجات و ثواب کے لیے ہے۔ اگر اللہ سبحانہ کی طرف سے ایسا ہو تو خدا کی قسم اس کے مخلص بندے بے تحاشا جہنم کی طرف دوڑتے، اس کی طلب میں تیز گام اور جنت سے گریزاں نظر آتے، جیسے آج وہ اس کے دیدار کی طلب میں دنیاوی خواہشات و شہوات سے گریزاں ہیں۔ اور تمام حمد اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے"

معلوم ہوا کہ مخلصین و عارفین کے نزدیک ربّ کریم کا دیدار اور جمال حق کا مشاہدہ وہ عظیم نعمت اور وہ بلند و بالا مقصود و مطلوب ہے کہ اس کا حصول اگر جہنم میں جانے پر موقوف ہو تو انھیں جہنم ہی محبوب ہے۔ اور بلفظِ عارف ربانی حضرت آسؔی قدس سرہ النورانی:

ع جلوہ تیرا ہو تو دوزخ بھی ہے جنت مجھ کو

واعظو ! اس کو دیکھ لو پہلے
پھر کہو حور کیا ہے جنت کیا
(۱۰۴)

یادِ نبی اور حسرت و تمنا:

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد
(۱۱۵)

نہ میرے دل، نہ جگر پر، نہ دیدۂ تر پر
کرم کرے وہ نشانِ قدم تو پتھر پر
(۱۳۰)

صلاحیت بھی تو پیدا کر اے دل مضطر
پڑا ہے نقشِ کف پاے یار پتھر پر
(۱۳۰)

اخیر وقت ہے آسیؔ چلو مدینے کو
نثار ہو کے مرو تربتِ پیمبر پر
(۱۳۰)

وصف رخ انور و شمیم روح پرور:

پرتوِ عارض ہے دریا نور کا
زلف صحرا ہے سکندر پور کا[۱]
(۱۰۷)

(۱) حضرت سید شاہد علی سبز پوش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عین المعارف پر اپنی تعارفی تحریر میں لکھا ہے: صحراے ختن کی مشک بوئی کی تعریف تمام شُعرا نے کی ہے۔ صحرا کی مشک بوئی محض خیال ہے اس لیے کہ جب تک مشک زندہ غزال کے نافہ میں رہتا ہے خوشبو باہر نہیں پھیلتی۔ حضرت نے صحراے سکندر پور کی تعریف جس خوبی سے کی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ سکندر پور کے اطراف میں گلاب، جوہی، چنبیلی اور بیلے کی کاشت ہوتی ہے اور دریاے گھاگھرا بھی قریب ہے [خوشبوؤں سے لبریز اس صحراسے زلفِ عطر فزا کی تشبیہ بلیغ بڑی برمحل اور کیف آگیں ہے۔ مصباحی]۔ نسخہ عین المعارف مذکور الصدر ص ۵۱۔

تمھارے حسن کی تصویر کوئی کیا کھینچے
نظر ٹھہرتی نہیں عارض منور پر
(۱۳۰)

وہ جسم تھا یا کوئی گل تر، شمیم جس کی وہ روح پرور
جدھر سے گزرے بسا وہ رَستا، بہا پسینہ گلاب ہوکر
(۱۱۹)

امید مغفرت، نازِ بندگی اور قوتِ رَجا:

واعظ! مرا معاملہ میرے خدا کو سونپ
بندہ گناہ گار ، وہ آمرزگار ہے
(۱۸۹)

اعمال کی پرسش تجھے، ہم کو یہ تفحُّص
رحمت تری بڑھ کر ہے کہ تقصیر ہماری
(۱۸۴)

نہ ستاری کو شرم آئے نہ غفاری کو غیرت ہو
قیامت میں ترا بندہ ترے آگے فضیحت ہو
(۱۵۶)

گناہ گار کی سن لو تو صاف صاف یہ ہے
کہ لطفِ رحم و کرم کیا پھر انتقام کے بعد
(۱۱۵)

اصل مطلوب دیدار باری و رضاے الٰہی، نہ حصول جنت و دوریِ جہنم:

مری نظروں میں تو ہو، ڈر ترا، تیری محبت ہو
نہ دنیا ہو، نہ عقبٰی ہو، نہ دوزخ ہو، نہ جنت ہو
(۱۵۶)

سوا تیرے نہ مائل ہو کسی پر ، وہ طبیعت دے
تری اُلفت ہو، تیرا عشق ہو، تیری محبت ہو
(۱۵۶)

مجھ کو ہنگامۂ محشر سے غرض
بس تمنا ترے دیدار کی ہے
(۱۹۹)

خوف دوزخ ، نہ حرص جنت کی
بے غرض میں نے تجھ سے الفت کی
(۱۷۷)

اس کے کوچے میں کہاں کش مکشِ بیم و رَجا
خوفِ دوزخ بھی نہیں ، خواہشِ جنت بھی نہیں
(۱۴۹)

تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا
(۹۲)

اصل فتنہ ہے قیامت میں بہارِ فردوس
جُز ترے کچھ بھی نہ چاہے مجھے وہ دل دینا
(۹۲)

اس سے مانگا بھی اگر کچھ تو اسی کو مانگا
دیکھنا حوصلہ و ہمتِ سائل کی طرف
(۱۲۸)

صدقِ طلب اور علوِ ہمت کی تعلیم: عابدین میں کوئی جہنم کی کلفتوں سے بچنے کے لیے رب کی عبادت کرتا ہے، کوئی جنت کی آسائشیں پانے کے لیے مشقت و ریاضت میں لگا رہتا ہے مگر عارفین کا مطلوب جمال حق کا دیدار اور رضائے مولیٰ کا حصول ہوا کرتا ہے، اس لیے قاصرین کے حوصلوں کو مہمیز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اور ہمت بلند کر اے شیخ
طمَع و خوف کی عبادت کیا
(۱۰۴)

باغِ رضواں بھی باغ ہے آخر
سیرِ گل کے لیے ریاضت کیا

اس سے مِل جو ہمیشہ ساتھ رہے
بے وفاؤں سے لطفِ صحبت کیا

عشق کی رہبری:

عشق کامل ہو تو مرشد نہیں ایسا کوئی
خود وہی قبلہ وہی قبلہ نما ہوتا ہے
(۲۳۶)

بدرقۂ راہ طلب میں نہیں ہمت کے سوا
راہبر کوئی نہیں جوشِ محبت کے سوا
(۱۰۶)

فرماں روائی دل:

کشورکشا وہی ہے جسے ہو فتح دل نصیب
شاہی اُسی کی جو کہ ہو فرماں روائے دل
(۱۳۶)

صدقے میں اپنے بازوے اطہر کے یا علی
آسؔی کو اپنے کیجیے خیبر کشائے دل
(۱۳۶)

اصلاحِ قلب کی تعلیم: دل ہی وہ مسکن ہے جہاں حسن محبوب جلوہ نما ہوتا ہے۔ اسے اگر آراستہ و پیراستہ نہ کیا تو استقبال واکرام یار کا کچھ حق ادا نہ ہوا، دیگر مساکن کو بنانے سنوارنے میں اس کے خاص جلووں کو بسانے کا اہتمام کہاں؟ اس طویل و نا تمام بیان کو چند سادہ و عام فہم اور دل نشیں لفظوں میں بتمام و کمال سمیٹنا، ساتھ ہی طالبانِ راہ کی تربیت اور فہمائش کرنا کسی عارفِ سخنور اور مرشد کامل ہی کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

دل جو تھا خاص گھر اس کا ، نہ بنایا افسوس
مسجد و دَیر بنایا کرو، کیا ہوتا ہے
(۲۳۶)

حالتِ دنیا پر تنبیہ اور زہد کی ترغیب: دنیا دل لگانے کے قابل نہیں، اس میں ہر دم کوئی تازہ آفت و مصیبت رونما

ہوتی رہتی ہے، اس کے لیے بقااور دوام نہیں اسی لیے دار فانی سے موسوم ہے، اس کا انجام بڑا بھیانک اور دردناک ہے۔
مضمون اگرچہ پامال ہے مگر اختصار کا کمال، طرزِ ادا کی دل کشی اور اثر آفرینی کا امتیاز اپنی جگہ آپ ہے۔ فرماتے ہیں:

مآل اس کا قیامت ہے قیامت
وہ آفت کی جگہ ہے دارِ فانی
(۱۷۵)

دنیا کی رنگینیوں میں اُلجھنا، اپنے کو آفات و آلام کی زد پر لانا ہے اور اس سے بے تعلقی میں ہر طرح عافیت ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ راحت چھوڑ کر بے فائدہ کلفت میں پھنستے ہیں۔

ترکِ دنیا تو ہے دنیا طلبی سے آسان
چھوڑ کر سہل ، عبث جاتے ہیں مشکل کی طرف
(۱۲۸)

مرشد کامل کی شان یہی ہے کہ وہ دلوں کو فریب دنیا سے آگاہ و خبردار اور دارِ بقا کی نعمتوں کا عاشق و طلب گار بنائے، اشعار بالا میں یہ شان جلوہ گر ہے۔

قتلِ حبِّ مال: مال و دولت کی محبت انسان کو آخرت سے غافل اور بہت سی معصیتوں کا حامل بنادیتی ہے اور مرشد کی ذمہ داری یہ ہے کہ انسان کو معصیت سے بیزار، نیکیوں کا خوگر اور آخرت کا شیدا بنائے اس لیے آخرت سے غافل اور معصیت کا مرتکب بنانے والی محبت سے جو دل کو خالی نہ کرسکے وہ اپنے فرض کی ادائگی سے قاصر ہے اور جو اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ حبِّ مال کو بالکل فنا کے گھاٹ اتار دے وہی مرشد کامل ہے، بعض سلسلوں میں ارشاد کی تکمیل کیمیاگری کی تعلیم پر ہوتی ہے تاکہ حاجت و اضطرار کے وقت صاحب منصب ارشاد کسی کا دست نگر نہ ہو مگر سچی کیمیاگری سونا بنانے کا فن سکھانا نہیں بلکہ دل میں پائی جانے والی حبِّ زر کو اچھی طرح کُشتہ کرنا ہے۔ فرماتے ہیں:

کیمیا گر وہی درویش ہے میرے نزدیک
ہوسِ زر کو کرے خوب جو کُشتا دل میں
(۱۴۶)

تاکید و ترغیب عمل: مریدوں بلکہ سارے مومنوں کو عمل کا پابند بنانا، آخرت کی رسوائی اور حسرت و افسوس سے بچانا اور جذبۂ عمل کو مہمیز کرنا ایک عالم و مرشد کی اہم ذمہ داری ہے، اس کا کچھ نمونہ حضرت آسی کے اشعار میں بھی نمایاں ہے، ملاحظہ ہو:

روزِ بازارِ جزا ہے اور خالی اپنے ہاتھ
جب سمجھنا تھا نہ سمجھے، آج پچھتاتے ہیں کیوں
(۱۴۵)

کارِ امروز بہ فردا مگزار اے آسی
آج ہی چاہیے اندیشۂ فردا دِل میں
(۱۴۷)

رات ہے رات تو بس مرد خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی، یا ذوقِ مناجات کی رات
(۱۱۱)

حُسنِ صورت کے لیے خوبیِ سیرت ہے ضرور
گل وہی جس میں کہ خوشبو بھی ہو رنگت کے سوا
(۱۰۶)

تواضع کی تعلیم و تاکید:

خاکساری سببِ آبروے سالک ہے
جو ملا خاک میں آنسو ، دُرِ نایاب ہوا
(۸۲)

سربلندوں کو ہے جُھکنا لازم
یہ صدا گنبد دوّار کی ہے
(۱۹۹)

عادت رکھنا فروتنی کی اے دل
نخوت نہیں بھاتی ہے کسی کی اے دل
کھول آنکھ حبابِ بحر سے عبرت لے
بے مغز ہے جس نے سرکشی کی اے دل
(۲۸۶)

ذرّے سے جو دیکھنے میں کم تر ہوں گے
تیرے لیے وہ بھی مہر انور ہوں گے
اے دل نہ برابری کسی کی کرنا
ہاں خاک کے اِک روز برابر ہوں گے

(۲۸۱)

اور بھی کچھ دل کش موضوعات اور دل نواز اشعار تھے جو میں نے فرصت کی کمی کے باعث ترک کر دیے، جیسے شاملِ مضمون اشعار پر تھوڑا تھوڑا تبصرہ اسی وجہ سے قلم انداز ہوا۔

بہر حال حضرتِ آسی کی غزلیں جہاں ان کے مذاق عشق اور ذوقِ معرفت کی ترجمانی کرتی ہیں وہیں ان کے حسن اعتقاد، بلندی اخلاق، اور جذباتِ اصلاح و عمل کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ اور اظہار کی برجستگی، طرز ادا کی دل کشی، قوتِ تخیل کی کار فرمائی اور معنی آفرینی تو پورے کلام پر چھائی ہوئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اہل ذوق نے مختلف جہتوں سے "عین المعارف" کا جائزہ لیا ہے اور ہمیں حضرت آسی کے شاعرانہ کمالات سے بھی روشناس کیا ہے۔ خدا کرے اس کی ضوفشانی عام سے عام تر ہو۔

شب جمعہ ۱۶ / رجب ۱۴۳۵ھ / ۱۵ / مئی ۲۰۱۴ء

۞۞۞

مبلغِ اسلام اور کتاب التصوف[1]

کتاب التصوف مسمّیٰ بہ "لطائف المعارف" کا وہ ایڈیشن ہمارے سامنے ہے جو البدیٰ پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں پہلے ایڈیشن کا کوئی حوالہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ کتاب پہلی بار کب اور کہاں سے شائع ہوئی۔

ابتدا میں حضرت مبلغِ اسلام کے داماد ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری کے قلم سے ایک تعارف شامل ہے بعنوان: حجۃ الاسلام مولانا و مرشدنا شاہ محمد عبد العلیم الصدیقی القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دینی خدمات کا مختصر تعارف۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب حضرت کے وصال کے بعد اور ڈاکٹر صاحب کی حیات میں شائع ہوئی۔ صفحہ ۱۲۸ پر حضرت مصنف کی یہ عبارت ہے: "نظریات اور اصولِ تصوف، یعنی اس مبارک فن کا علمی شعبہ، بحول اللہ و قوتہٖ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ کو دوسری جلد میں بالتفصیل ملے گا" یہاں بریکٹ میں لکھا گیا ہے (جو مسوّدہ، افسوس! نہ مل سکا)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے دو حصے تھے، حصۂ اول میں تصوفِ علمی کا بیان، حصۂ دوم میں تصوفِ عملی کا ذکر مگر دوسرے حصے کا مسودہ نہ مل سکا اور ایک اہم علمی و روحانی خزانے سے ہم محروم رہ گئے۔

حصۂ اول کے خاص عنوانات یہ ہیں:

مقدمہ۔: تلاشِ حق: ص اول، حقیقتِ روح: ص ۸، اغذیۂ روحانی: ص ۱۲، امراضِ روحانی: ص ۱۳، ضرورتِ شیخ: ص ۱۸، تزکیۂ قلب: ص ۲۰، علمِ تصوف: ص ۲۳، التوبۃ النصوح سچے دل کی توبہ: ص ۲۴، سلوکِ نقش بندیہ مجددیہ: ص ۲۵ تا ۴۱، سلوکِ قادریہ: ص ۴۲ تا ۶۲، سلوکِ سہروردیہ: ص ۶۳ تا ۶۹، سلوکِ حضراتِ چشت اہلِ بہشت: ص ۷۰ تا ۸۴، چشتیہ و قادریہ کے کچھ دیگر اذکار: ص ۸۴ تا ۹۰، مشاہدے کے بعض طریقے: ص ۹۱ تا ۹۳، سلوکِ طریقت و احکامِ شریعت: ص ۹۳، دنیا کے دوسرے مذاہب اور ان کا سلوک: ص ۱۱۶، ضمیمہ: مسمریزم و ہپنوٹزم یا نظر بندی اور بھان متی کا سانگ: ص ۱۳۸ تا ۱۴۴، ختمِ کتاب۔ یہ ضمیمہ غالباً ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری کا لکھا ہوا ہے۔

کتاب کے مضمون کے ساتھ اس کی زبان، اندازِ بیان اور طرزِ تفہیم نے بھی مجھے بہت متأثر کیا۔ تصوف کے

(۱) ماہ نامہ پیام حرم، جمداشاہی، مبلغ اسلام نمبر، ۲۰۱۵ء

خشک اور پیچیدہ مضامین کو ایسی دل کش زبان اور اثر انگیز اسلوب میں پیش کرنا، مضامین میں تبحر کے ساتھ زبان وبیان پر قدرت اور استاذانہ مہارت کی دلیل ہے۔ یقیناوہ ایک شیخِ کامل، دعوتِ حق کے ماہر، بندگانِ خدا کی ہدایت کے لیے دردمند اور انھیں راہِ راست پر لانے کی مساعیِ جمیلہ پر کاربند تھے۔ جزاہ اللّٰہ عناوعن المسلمین خیرمایجزی بہ عبادہ العاملین المخلصین۔

میں چاہتا ہوں کہ قارئین بھی کسی قدر اس کتاب سے بہرہ منداور اس کی زبان سے لطف اندوز ہوں۔اس لیے اگلی سطور میں اس کے اقتباسات زیادہ پیش کروں گا اور اپنا تبصرہ بہت مختصر کروں گا۔ ناظرین، کتاب کی عظمت وافادیت سے از خود آشنا ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ یہ خیال رہے کہ پوری عبارتیں نقل کرنا زیادہ دشوار ہے اس لیے تلخیص اور کچھ حذف واضافہ بالتسہیل کی راہ اپنائی جائے گی۔اہلِ تحقیق کے لیے اصل کی مراجعت ضروری ہے۔

احکم الحاکمین اور اپنے منعمِ حقیقی سے قربِ وصل اور اس تک باریاب کرنے والے نفسِ قدسی کی پیروی، روحِ انسانی کا فطری تقاضا اور یقینی فریضہ ہے، اسے دل نشیں کرنے کے لیے ابتدایوں کی ہے:

”حمد کے قابل خالقِ کون ومکاں، نعت کے مستحق سیدِ انس وجاں، اس نے سارے عالم کو بنایا، انھوں نے عالم کو مقصدِ حیات بتایا۔ اس کی نعمتیں، اس کا کرم ایسا عظیم کہ کتنی بھی کوشش کرو گننا اور شمار کرنا اور گھیرنا محال، ان کی رحمت ایسی وسیع کہ جو کچھ ملا انھیں کے صدقے، جو کچھ بنا انھیں کے طفیل میں۔ مگر وائے بدقسمتی! آج کوئی چائے کی پیالی، پان کی گلوری بلکہ معمولی ایک الائچی بھی دے تو آداب کے لیے جھک کر سلام کریں۔ کسی نے ذرا سا احسان کر دیا تو شکریہ ادا کرتے کرتے زبان سوکھتی ہے۔ کوئی قوت رکھتا ہے، نعمت رکھتا ہے، دولت مند ہے تو ہزار جتن کیے جاتے ہیں کہ اس سے روابط بڑھیں، تعلقات پیدا ہوں، ہم اسے پہچانیں، وہ ہمیں جانے - معمولی سلام دعا نہیں، دوستی نہیں بلکہ محبت اور محبت بھی بے تکلف محبت کسی نہ کسی طرح حاصل ہو ہی جائے۔ کون ہے جسے بادشاہ کا مقرب بننے کی تمنا نہ ہو۔ کون ہے جس کے دل میں دنیا کی محبت کا درد رہ رہ کر چٹکیاں لیتے ہوئے ہر اس قوت اور صاحبِ قوت ، دولت اور صاحبِ دولت، دنیا اور اہلِ دنیا سے ہم آغوش ہونے کے ولولے نہ پیدا کرتا ہو۔

مگر یہ محقق ہوتے ہوئے کہ دنیا کا بنانے والا وہ پروردگار، دولت کا دینے والا وہ کردگار، ساری چیزوں کا وہی والی و مختار (اسی سے غفلت و بے تعلقی لوگوں کا شعار) اصل کو چھوڑنا اور شاخوں سے لٹکنا، مکیں کو چھوڑنا اور مکان سے دل لگانا، اس سے زیادہ بے سمجھی کی بات اور کیا ہوگی؟ ہوش کی آنکھیں جب کھلتی ہیں، عقل کے ناخن جب لیے جاتے ہیں، حواس جب درست ہوتے ہیں... بندہ اس کے عرفان اس کی پہچان کے دریاے ناپیدا کنار میں غواصی کے لیے قدم اٹھاتا ہے... مگر با وصف کمالِ ظہور، وہ ایسا مستور کہ انتہاے مقامِ تحقیق، اولِ منزلِ واقفیت بھی

نہیں۔ کمالِ شعور، ابتداے ادراکِ ذات کا مقدمہ بھی نہیں۔ آئینۂ خیال میں جو شکل بھی محقق ہوئی جب غور کیا تو میرے واہمے کی ایک مخلوق، صغریٰ کبریٰ نے جس نتیجے پر پہنچایا وہ میرے دائرۂ علم میں محدود، فلسفے کی موشگافیوں نے جس نقطے کو پایا وہ میرے عقلیات کا ایک مفروضہ مجسمہ اور وہ واجب الوجود قادرِ مطلق، خالق ہے نہ کہ مخلوق، محیط ہے نہ کہ محاط و محدود، باقی ہے نہ کہ فانی، قدیم ہے نہ کہ حادث۔

اے بر تر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وزہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ماہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

پس رخشِ خیال تگ ودو سے ہارا، سمندِ عقل کے گھٹنے ٹوٹے:

خواب تھا جو کچھ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

اس لق ودق بیابانِ حیرانی اور بادیۂ پریشانی میں رحمن ورحیم کے ایک متوالے کی دل کش آواز، درد والے لہجے میں آتی ہے: ماعرفناك حق معرفتك سننے کے لیے کان لگاؤ، جاننے پہچاننے کے لیے آنکھیں لاؤ، اس نے تو دیے ہیں مگر تم نے ان کو دوسری آوازوں سے بھر لیا، اس نے تو عطا کی ہیں مگر تم نے ان کو دوسرے نظاروں سے محوِ تماشا کر لیا، جب توجہ کرو گے آوازِ غیر سے کان بہرے ہوں گے، جمالِ غیر سے آنکھیں بند ہوں گی کان کھولو اور اس کا کلام سنو، چشمِ حق بیں واکرو اور اس کی راہ دیکھو۔ وہ کلام ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (فرماؤ اگر تم خدا کی محبت چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمھیں دوست بنا لے گا) وہ راہ ہے: ما انا علیه واصحابی (جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ) جس نے دیکھا اسی طرح دیکھا، جس نے پایا اسی صورت سے پایا، کسب سے استعدادِ وہب پیدا کرو، پھر

فیض روح القدس ارباز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

اس کا طریق ہے: فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں) انبیا و مرسلین کی بعثت اسی شاہراہِ حقیقی کو پیش کرنے کے لیے تھی، دوستوں اور محبوبوں کی خلقت اسی شراب کا ساقی بنانے کے لیے تھی۔ منزل پر پہنچایا فقط انھی نے، محبوب سے ملایا صرف انھی نے، کج روی سے بچایا، ورطۂ ہلاکت سے نکالا، وہمیات سے چھڑایا۔ اس لیے کہ وہ اپنی عقل کے گھوڑے نہ دوڑاتے، وہ اٹکل کے تیر نہ مارتے بلکہ وہی سناتے جو سنتے تھے، وہی بولتے تھے جو

بلوائے جاتے تھے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى.

الہامش از جلیل و پیامش ز جبرئیل
نطقش نہ از طبیعت و رایش نہ از ہوا

آج بھی جو اپنی کہے جھوٹا، جو ان کی کہے سچا۔ (کتاب التصوف: ص ۱ تا ۷، بہ تلخیص)

کتاب کی تمہید مذکور میں معرفتِ رب کی اہمیت اور ہادیِ برحق کی ضرورت کو بڑے پیارے اور مدلل انداز میں واشگاف کیا گیا ہے۔ اس کے بعد خدارسی کے لیے روحانی ریاضت کا بیان ہے۔ اس ذیل میں روح کی حقیقت، روح کی غذا، روح کے امراض، روح کے علاج اور روحانی معالج کا تذکرہ ہے۔

حقیقت روح:

" موے سر سے ناخنِ پا تک تمام وجود ایک جسم ہے اور اس کی حیات کا دار و مدار ایک چیز پر۔ جب تک وہ ہے، جسم ہے اور جب وہ علاحدہ ہوئی، جسم مردہ ہوا، بے کار شمار کیا گیا، کسی نے زمین میں دفنایا، کسی نے جلایا، غرض کسی نہ کسی طرح جلد خاک میں ملایا۔

کیا کبھی اس پر بھی غور کیا کہ آن کی آن اور لحظہ کے لحظہ میں کیا سے کیا ہو گیا؟ وہ پیاری چہیتی صورت کیوں ایسی دو بھر ہو گئی کہ ایک لحظے کے لیے گھر میں رکھنی بھی ناگوار ہے۔ کوئی چیز تو تھی جس کے جاتے ہی یہ جسم کسی قابل نہ رہا۔ وہ کیا تھی؟ ہوا تھی؟ پانی تھا؟ مٹی تھی؟ آگ تھی؟

کوئی کہتا ہے حیات تھی، جان تھی، گیس تھی، اسپرٹ تھی، آتما تھی، روح تھی، تھی ضرور کوئی چیز، نام کچھ رکھ لو۔ مگر یہ تو بتاؤ اس کی تعریف کیا ہے؟ وہ تھی کیا؟ کہاں سے آئی؟ اور کہاں گئی؟... فلسفی حیران ہیں، سائنسٹ پریشان، نہ کسی آرٹ میں اس کا سراغ، نہ سائنس میں اس کا پتہ، جانیں تو کیوں کر جانیں؟ پہچانیں تو کس طرح پہچانیں؟

جب کسی کو پتہ چلتا تو چھپی باتوں کو بتانے والے، غیب کی خبریں لانے والے، عرش سے فرش تک کے حالات بیان فرمانے والے، مکہ کے چاند، مدینہ کے تاجدار، احمدِ مختار محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی لوگ آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے؟

وہ سرکار جو اپنی طرف سے نہیں بولتے بلکہ جو ان کا رب کہلواتا ہے، کہتے ہیں۔ جو وہ بلواتا ہے، بولتے ہیں۔ اس بات میں بھی اپنی رائے نہیں بتاتے بلکہ وحیِ ربانی و فرمانِ الٰہی صاف صاف لفظوں میں اس طرح سناتے ہیں: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (القرآن: ۱۷/۸۵) "لوگ آپ سے

روح کے تعلق سے سوال کرتے ہیں، آپ ان سے فرما دیجیے کہ روح تو میرے رب کے امر سے ہے اور تمھیں تو علم تھوڑا ہی سا دیا گیا ہے۔"

"رب کے حکم سے، رب کے امر سے؟ کیا مطلب نکلا، کیا سمجھے؟ کوئی یوں کہے کہ ارشادِ کن کی تجلیات میں سے ایک تجلی ہے۔ کوئی کہے کہ عالمِ امر کی ایک مخلوق۔ تجلی کی حقیقت خود ایک اجمال، عالمِ امر کی کیفیت خود مغلق، پھر سمجھیں تو کس طرح سمجھیں۔

یوں سمجھ لو کہ "جنابِ رب العزت جل وعلا کے ساتھ خاص نسبت و تعلق و رابطہ رکھنے والی ایک ایسی شے ہے جس کے متعلق جب تک اس رب تک رسائی نہ ہو" عالمِ امر سامنے نہ آئے، تجلیات پر تو فگن نہ ہوں، حقیقت و تعریف کا منکشف ہونا محال۔"

اطبا طلبۂ طب کو علمِ طب سکھانے کے لیے چیڑ پھاڑ کر بدن دکھائیں، تب تشریحِ بدن کا کچھ عقدہ کھلے، علم کیمیا کا ماہر کیمسٹری کے متعلم کے سامنے مادے کی تفریق کرے تب اس کی ماہیت کی کچھ خبر ملے، اسی طرح جب اس دریائے روح میں غوطہ زن ہوں تب گوہرِ مقصود ہاتھ آئے اور حقیقت جلوہ نما ہو۔

ہاتھ نہ ہلاؤ کچھ نہ بنا سکو گے۔ کان نہ لگاؤ کچھ نہ سن سکو گے۔ زبان نہ چلاؤ کچھ نہ بول سکو گے۔ بلا تمثیل اسی طرح روح کو جب تک کام میں نہ لاؤ اس کی "صفات" نہ معلوم کر سکو گے، تا بہ "ذات" چہ رسد۔

(کتاب التصوف: ص ۹ تا ۱۱)

غذائے روحانی:

کام میں لانے کے لیے پہلے قوت کی ضرورت، قوت کے لیے تغذیہ کی حاجت۔ اسی طرح روح کو کام میں لانے کے لیے بھی روح میں قوت کی ضرورت اور قوت کے لیے غذا کی حاجت۔ جسم، مادے کا جز ہونے کے اعتبار سے مادی اغذیہ کا محتاج ہے تو اس نسبتِ خاص کے سبب جو روح کو رب جل وعلا سے حاصل، وہ بھی ایسی ہی غذا کی ضرورت مند جو اس رب کے ساتھ خاص مناسبت رکھتی ہو۔ اس لیے پہلے ان غذاؤں کو معلوم کیجیے جو روح کو قوت دینے والی اور اسے اس کی حقیقی معراجِ کمال تک پہنچانے والی ہیں۔

ربِ عظیم جل وعلا کے ساتھ یوں تو کون سی چیز ہے جو نسبت نہیں رکھتی ہر مخلوق مظہر ہے اور مظہر اسماے صفات کو اس ذات کے ساتھ ایک خاص نسبت حاصل اور ہر اسمِ صفت میں تغذیۂ روح کی ایک خاص کیفیت تغذیہ روح موجود، لیکن اسمِ ذات اس نسبت میں اخص، اس لیے تغذیہ میں اعظم۔ اسی لیے ارشاد ہے: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۞ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳/ ۱۹۰،۱۹۷)

"یقیناً آسمان و زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے لَوٹ پھیر میں سمجھ داروں کے لیے نشانیاں ہیں۔ (سمجھ دار وہ ہیں) جو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر (لیٹے ہوئے، یعنی ہر حالت میں) اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی پیدائش میں فکر۔"

عقل منداور سمجھ دار عرف عام میں بھی وہی شخص کہا جاتا ہے جو کمائے اور کھائے، نہ وہ جو ہاتھ پیر توڑ کر اپاہج بن جائے۔ پس اس میدان میں بھی سمجھ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو اسمِ ذات کے ذکر اور اسمائے صفات میں فکر کی مبارک اغذیہ کا کاسِب بنے اور ان سے اپنی روح کو قوت پہنچائے۔ تو ذکر اور فکر، یہ دو غذائیں ہیں۔ (ایضاً: ص ۱۲-۱۳)

امراضِ روحانی:

غذا استعمال کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس میں کسی خراب یا مضر چیز کی آمیزش تو نہیں؟ اسی طرح یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جسم میں کوئی بیماری تو نہیں؟ اگر جسم بیماری میں گرفتار اور سخت امراض میں مبتلا ہے تو غذا کیسی ہی عمدہ ہو، دودھ ہو یا انڈا، نفع دینا در کنار الٹا نقصان ہوگا۔

مرض کیا ہے؟:

مزاج کا نقطۂ اعتدال سے ہٹنا یا کسی غیر طبعی امر کا پیش آنا علمِ طب میں مرض کہلاتا ہے۔ پس روح کی حالتِ اعتدال یہ ہے کہ "اس کی نسبت اس کے ربِ اکرم کے ساتھ قائم ہو اور کوئی دوسرا تعلق اپنی مقناطیسی کشش سے اس کو اس کے مقام سے جدا کرنے اور ہٹانے والا نہ ہو۔"

اس رب کے منشا کے خلاف جس قدر امور ہیں وہ روحانی غیر طبعی امور کہے جائیں گے اس لیے روح کا ما سوی اللہ کی طرف میلان اور معاصی کی جانب رجحان، یہی وہ بلائیں ہیں جن کو طبِّ روحانی میں امراضِ روحانی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فلسفیانِ اخلاق نے انہی کو ذمائم سے یاد کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی تدبیریں اور علاج کے لیے دوائیں تعلیم فرمائیں۔

ہم یہاں بڑی بڑی بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں جو حقیقۃً مہلک ہیں اور حیاتِ حقیقی کا خاتمہ کر دینے والی۔ تم نے سنا کہ مزاج کا حالتِ اعتدال سے ہٹنا ایک مرض ہے لیکن جہاں حالتِ اعتدال سے صرف کسی قدر ہٹنا ہی نہیں بلکہ اصل سے قطعِ تعلق ہو تو وہ مرض یقیناً سخت ترین بن جائے گا اور اس کے نتائج کیسے کچھ مہلک ہوں گے۔ روحانی

امراض میں بدترین مرض شرک ہے یعنی "اس خداوندِ جلیل و جبار جلّ جلالہٗ کی ذات یا صفات میں کسی کو کسی عنوان سے اس کا ہم سر و ہم پلہ بنانا یا کوئی ایسا کام کرنا جو اس اعتقاد پر دلالت کرنے والا ہو۔" یہ مرض نہایت مہلک ہے، اس کو بغاوت کہیے، غدر سمجھیے - اگر اسی حالت میں زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ (معاذ اللہ!) تو مالکِ عالم فرما رہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (یقیناً اللہ اس بات کو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، اس کے سوا جس کو جس کے لیے چاہے بخش دے)

اسی طرح کفر بھی ہے، شرک میں ما سوا اللہ سے رابطہ جوڑنا تھا، کفر میں خدا سے سرکشی و روگردانی، خواہ کسی اور سے رابطہ پیدا ہو یا نہ ہو۔ یہ بھی ایسا ہی خطرناک۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ولهم عذاب عظيم۔

ان کے ساتھ ہی ایک اور بلا بھی ہے کہ حقیقتاً دل میں شرک ہو، کفر ہو اور ظاہر یہ کیا جائے کہ ایسا نہیں بلکہ خدا کے سامنے گردن جھکی ہے یعنی مسلم ہیں، اس کو نفاق کہتے ہیں۔ چوں کہ یہ بہت سے امراض کا مجموعہ ہے، شرک ہے، کفر ہے، جھوٹ ہے، دھوکا ہے، ریا ہے، وغیر ذالک۔ اسی لیے یہ سب سے زیادہ ہلاکت میں ڈالنے والا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (یقیناً منافق آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ڈالے جائیں گے)

بزرگی، بڑائی، عظمت و جلالت، اسی شہنشاہ کے شایانِ شان ہے جس نے تمام عالم کو بنایا، سب کچھ اس کی مِلک، وہ سب کا مالک، وہی حقیقی بادشاہ ہے، سب فنا ہونے والے اور وہ لمن الملك اليوم کا نقارہ بجانے والا، اس کے سامنے اکڑنا، اپنے آپ کو بڑا جاننا خواہ اس کے مقابلے میں ہو جیسے فرعون و نمرود کا دعویِ خدائی یا اس کی مخلوق پر اپنی بڑائی، نسبتیں اگرچہ مختلف ہیں مگر مرض نہایت مہلک جس کو اس اصطلاحِ امراضِ روحانی میں تکبر و نخوت اور غرور و تمکنت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی ہلاکت کو غیور قہار و جبّار خداوندِ عظیم نے یوں فرمایا: فلبئس مثوى المتكبّرين (پس تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا تو بہت ہی برا ہے۔ (القرآن: ۱۶/۲۹)

یہ ہیں سب سے زیادہ مہلک امراض، باقی ان کے ماسوا ہر وہ چیز جو اس رب کی مرضی کے خلاف ہو، جس سے اس نے صراحۃً منع فرمایا یا اس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے برا بتایا، مرضِ روحانی ہی ہے کہ ہر وہ بات جو روح کو اس کے نقطۂ اعتدال یعنی قربِ ربانی کے مقام سے ہٹانے والی ہوگی، مرض ہی کہلائے گی۔ اسی چیز کو اصطلاحِ شرع میں گناہ کہتے ہیں۔

کون سی چیز مضر ہے، کون مفید؟ کون سی حالت، حالتِ صحت ہے اور کیا کیفیتِ مرض؟ اس کا فیصلہ طبیبِ حاذق سے ہوگا، اسی کا اس باب میں اعتبار۔ ورنہ ناواقف کبھی تندرست کو بیمار اور بیمار کو تندرست سمجھتا ہے۔ خود بیمار

کبھی اپنے کو تندرست جانتا ہے، بری بھلی ہر چیز کھانے کی رغبت کرتا ہے اور چٹ پٹے مزے کے لیے ہر چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

روحانی امراض کی تشخیص اور حقیقی بیماری کی تعیین۔ یعنی کسی چیز کے گناہ ہونے یا نہ ہونے۔ میں انسانی رائے کو دخل نہیں، اس کا فیصلہ وحی والہام سے ہوتا ہے، اس پر اس تعیین و تشخیص کا دار ومدار۔ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت کہ یہ الہام ووحی صحیح ہے یا نہیں ؟ اس امر کو جس کسوٹی پر چاہو اچھی طرح پرکھو اور جب کسی چیز کو الہام ووحی بری بتائے، بے چوں وچرا مان لیا جائے کہ بے شک وہ بری ہے خواہ اس کی برائی ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اسی لیے فرمایا گیا: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (القرآن:۵۹:۷) (رسول جو تمھیں دیں لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے بچے رہو)

جب کبھی کوئی بدنی بیماری پیش آتی ہے، بلغم، سودا، صفرا، خون، ان میں سے کوئی خلط حدِ اعتدال سے بڑھتا ہے، فساد آتا ہے، طبیب منضج پلاکر، مادّہ اکھاڑ کر مسہل دیتا اور تنقیہ کرتا ہے۔ جب تنقیہ سے صفائی ہو جاتی ہے، قوت کی دوائیں اور عمدہ غذائیں کھانے کی اجازت دیتا ہے۔ جو دوا وہ کھلائے کھانی ضروری اور جس چیز سے وہ بچائے بچنا واجب۔ اسی طرح امراضِ روحانی کے مبتلا کے لیے طبیبِ روحانی کی ضرورت اور جو وہ بتائے اس پر عمل کرنے کی حاجت۔ (کتاب التصوف: ص ۱۳ تا ۱۷)

ضرورتِ شیخ:

اگر امراضِ روحانی میں مبتلا ہو، خطراتِ ماسوی اللہ کا ہجوم ہے اور ہلاکت کا اندیشہ۔ طبیب کو ڈھونڈو جو خود تندرست ہو، صحیح الدماغ والحواس ہو، مرض کی حقیقت جاننے والا ہو اور مزاج کو بھی پہچاننے والا۔ صرف عقل کے گھوڑے دوڑا کر آپ کو طبع آزمائی کا آلہ بنانے والا نہ ہو بلکہ تجربہ کار اساتذۂ طب، حکمائے مشہور کے اقوال سے تمسک رکھنے اور اس شاہ راہ پر چلنے والا ہو جس پر چل کر بہت سے مریض تندرست ہو چکے ہوں۔

وہ زبردست طبیب:

جس کے پاس نہ صرف دوا ہے بلکہ نسخۂ شفا، سیدِ کونین، رسولِ ثقلین، طبیبِ قلوب، شفیعِ ذنوب، سرکارِ مکہ، مولائے مدینہ ہیں صلی اللہ تبارک وتعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم جن کے علاج نے کبھی خطا نہ کی۔ ایک دو نہیں بلکہ لاکھوں ایسے زبردست بیمار جو پابہ گور تھے، جن کے قلوب زنگارِ معاصی سے اس قدر سیاہ ہو چکے تھے کہ مہرِ ایمان کی تجلیات کا منعکس ہونا ہی از قبیلِ محال معلوم ہوتا تھا، آناً فاناً انھیں نہ صرف صحیح و تندرست بنایا بلکہ ایسا زبردست

پہلوان کر دکھایا کہ بڑے بڑے شہ زور ان کے ڈر سے لرزے میں آئے۔

اس لیے سب سے مقدم یہ امر کہ ان کے دربار کے سند یافتہ، ان کی درس گاہ کے تعلیم یافتہ ایسے شخص کی طرف رجوع کرو جس کا سلسلہ حضور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک صحیح ہو، صحیح الحواس ہو نہ کہ مجذوب، مرض ومزاج کی پہچان رکھتا ہو، کتاب وسنّت کا عالم ہو اور خود صحیح المزاج یعنی سنّتِ مبارکہ کی پیروی کرنے والا اور ہر گناہ ومعصیت سے بچنے والا ہو۔ اگر اس میں یہ صفات موجود نہیں تو خود بھی ڈوبے گا اور تم کو بھی لے ڈوبے گا۔ اگر مکار ہے اور بندۂ شکم، شیروں کے لباس میں گدھا ہے، بچو، بچو۔ تم متردّد ہو گے کہ ہم پہچانیں کیوں کر؟ کرامتوں پر نہ پھولنا، مکاشفات پر نہ بچھنا۔ بزرگوں نے فرمایا کہ اگر کسی کو ہوا پر اڑتا اور پانی پر چلتا دیکھو لیکن سنّت کے خلاف پاؤ، سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔

ان شرطوں کو دیکھ لو، کتاب وسنّت کی کھلی ہوئی کسوٹی پر پرکھ لو۔ نسبتِ صحیح اگر حضورِ اکرم روحی فداہ ﷺ سے رکھتا ہے، ضرور ان کے دربار میں مؤدب ہوگا، اطبائے روحانی یعنی اولیائے کرام کی شان میں ہر آن ہر لحظہ پاسِ ادب رکھے گا۔ اگر گستاخ وبے ادب ہے، دولتِ علمِ الٰہی سے محروم ہے، بد نصیب ہے۔ زنہار! زنہار! اس کے قریب نہ جاؤ ایاکم وایاھم لا یضلّونکم ولا یفتنونکم (ان سے دور رہو، ان کو اپنے سے دور رکھو، کہیں وہ تمھیں گمراہ نہ کر دیں، کہیں وہ تمہیں فتنے میں نہ ڈال دیں۔ (الحدیث)

ہاں جو ان شرائط میں کامل ہے وہی تمھارے لیے فاضل، اس کی ذات کو غنیمت سمجھو۔ اعتقاد شرط ہے۔ اگر طبیبِ ظاہر سے بد عقیدہ ہو گے۔ دوا کے متعلق پہلے ہی سے یہ سمجھ لو گے کہ فائدہ نہ دے گی تو مشہور بات ہے کہ اثر نہ ہوگا یا ہوگا تو بدیر، لہٰذا صحیح اعتقاد کے ساتھ اسی کو اپنا ہادی اور رہبر سمجھ کر، مؤدبانہ حاضر ہو، شرمندگی کے آنسو بہاتے ہوئے سچے دل سے توبہ واستغفار کا منضج ومسہل استعمال کرو اور قدرتِ الٰہی کا تماشا دیکھو۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لهٗ (حدیث) جس نے گناہ سے سچی توبہ کر لی تو اب وہ بے گناہ جیسا ہو گیا۔ (کتاب التصوف: ص ۱۸ تا ۲۰)

خلاصہ:

یہاں تک یہ بیان ہوا کہ انسان کے لیے اپنے پروردگار، اپنے خالق ومالک کو پہچاننا اور اس سے ربط وتعلق اور قرب پیدا کرنا ضروری ہے۔ انسانی وجود میں ایک ہی چیز ہے جو امرِ رب سے ہے، وہ ہے انسان کی روح۔ اسی کو کام میں لگانے سے رب کے قرب کی راہ پیدا ہوگی مگر کام میں لگانے سے پہلے اس میں قوت وتوانائی چاہیے، قوت کے لیے غذا چاہیے اور غذا دینے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ روح میں کوئی بیماری تو نہیں؟ ورنہ بیمار کے لیے

مقوی غذائیں بجائے فائدے کے ضرر رساں ہوجاتی ہیں۔ روح کی بیماری: شرک، کفر، نفاق، کبر و غرور اور ہر گناہ و معصیت ہے۔ ان امراض کے علاج کے لیے طبیبِ حاذق کی ضرورت ہے اور روحانی دنیا میں طبیبِ حاذق وہی ہے جس کا علم، وحی والہام سے حاصل ہو۔ جب اس کی پرکھ ہوجائے کہ یہ طبیب وحی والہام سے تائید یافتہ ہے تو وہ جو مرض اور علاج بتائے اسے قبول کرنا صحت کے لیے ناگزیر ہے۔ ارواحِ انسانی کے زبردست طبیب رحمۃ للعالمین سید المعصومین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ پھر جو ان کی درس گاہ کے تعلیم یافتہ و سند یافتہ ہیں۔ جو ان سے صحیح نسبت رکھنے والے، صحیح مزاج، صحیح علم و تقویٰ والے ہیں، ایسے کسی معلمِ کامل کی تلاش کرو اور اسے اپنا معالج بناؤ وہ تمہاری روحانی بیماریوں کی تشخیص کرکے ان کی دوا کرے گا۔ پھر تمہاری روح کو غذا اور قوت بہم پہنچائے گا۔ روح کی غذا، خدا کا ذکر اور اس کی صفات میں فکر ہے، مرشدِ کامل کی رہنمائی میں صحیح اور مفید طریقے پر "ذکر و فکر" ہی سے تمہارا روحانی سفر کامیاب ہوسکے گا اور تم قربِ الٰہی کی منزل تک باریاب ہوسکو گے۔

تزکیۂ قلب:

روحِ حیوانی کا مولد قلب ہے۔ روحِ حقیقی کے ساتھ بھی قلب کو ایک خاص تعلق ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ان فی جسد آدم لمضغۃً لو فسدت فسدالجسد کلهٗ ولو صلحت صلح الجسد کلهٗ الا وھی القلب، الا وھی القلب، الا وھی القلب (حدیث) آدمی کے جسم میں ایک پارۂ گوشت ہے اگر اس میں فساد آیا تو سارا جسم فاسد ہوا اور اگر وہ صلاح پذیر ہوا تو تمام بدن صلاح پذیر ہوا۔ خبردار ہوجاؤ وہ قلب ہے، ہوشیار ہوجاؤ وہ دل ہے، غور سے سن لو وہ دل ہے۔)

احادیث میں یہ مضمون موجود کہ ایک معصیت قلب پر ایسا کام کرتی ہے جیسے زنگار کا ایک نقطہ چمک دار لوہے پر۔ غور کرو کہ چمک دار لوہا جس میں تمہارا منہ نظر آتا ہے، کچھ دنوں کیچڑ میں پڑا رہا، زنگ کے نقطے لگتے لگتے کالا ہوگیا، اب اس کی صفائی کی کیا تدبیر؟

کسی لوہار کو تلاش کرو، وہ اس زنگ آلود سیاہ لوہے کو بھٹی میں ڈال کر دھونکنی سے آگ کو دھونکے گا یہاں تک کہ لوہا اچھی طرح تپ جائے اور حرارت اس کے رگ وپے میں اس طرح سرایت کرجائے کہ خود انگارہ معلوم ہونے لگے۔ اس وقت لوہار اَہرَن پر رکھ کر ہتھوڑے سے کوٹے گا، زنگ دور ہوگا، پانی میں غوطہ دے کر دھوئے گا، پھر صیقل کرے گا، وہی زنگ آلود سیاہ لوہا آئینۂ سکندری کی طرح شفاف ہوکر جمالِ محبوب دکھانے کے قابل ہوجائے گا۔

اسی طرح وہ مصفّٰی و مجلّٰی قلب جو زنگارِ معاصی اور کدورتِ ماسوی اللہ سے آلودہ ہوکر سیاہ پڑگیا ہے قلوب پر

صیقل کرنے والے یعنی باطنی تزکیہ فرمانے والے جن کی شان میں فرمایا گیا: یُزَکِّیۡهِمۡ (وہ ان کا تزکیہ فرماتے ہیں) سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کرو۔ ان کے دربار کے خادم، ان کے ساتھ صحیح نسبت رکھنے والے، اسی صیقل گری کے سند یافتہ شیخ کی خدمت میں لاؤ، وہ ایمان و محبتِ الٰہی کی چنگاری باطنی قوت سے تمہارے قلب میں ڈالیں گے اور تمھیں سکھائیں گے کہ لاالٰہ کی دھونکنی سے اسے دھونکو، الا اللہ کی ضربوں سے اسے کوٹو اور محمد رّسول اللہ کے مبارک ذکر کے آبِ رحمت میں اسے غوطہ دو، پھر ذکرِ اسم ذات سے اس پر صیقل کرو۔

کفر و شرک کے جلی داغ اس طرح جائیں گے، لا کو قلب سے اٹھاؤ، دائیں شانے تک لاؤ، الٰہ کے ہمزے کو شانے سے اٹھاؤ اور لا کو دماغ تک کھینچ کر ھا دماغ سے نکال کر عرش تک پہنچاؤ کہ تمام معبودانِ باطل فنا ہوں، لا معبود کا تصور ذہن میں رہے، وہاں سے فیوضِ الٰہیہ کو لیے ہوئے الٰہی جلال و قوت کی ضرب الا اللہ قلب پر دو تاکہ خدائے قدوس کی تجلیات قلب پر پرتو فگن ہوں اور دل میں بیٹھ جائے کہ "بس وہی ایک معبود ہے۔"

جب یہ مضمون دل پر جم جائے، شرک و کفر، کذب و زور وغیرہ کا مجموعۂ نفاق کا شائبہ بھی باقی نہ رہ جائے، اس وقت لا معبود الا اللہ کے بجائے لا مقصود الا اللہ کا تصور کرو، یہ ہے انقطاع ماسوی اللہ، جب تک تن دہی سے ایک ہی جانب رجوع کرکے یکسوئی کے ساتھ متوجہ نہ ہوگے مطلب حاصل نہ ہوگا۔

لہٰذا اچھی طرح دل میں جماؤ کہ میرا مقصود اللہ کے سوا کچھ نہیں ہے اور کوئی جس کا وسوسہ دل میں باقی ہے، تکبر جس کا نقطہ قلب پر لگا ہے بلکہ خود اپنی ہستی جو ایک پردہ بن کر راہ میں حائل ہے، انانیت کی صورت میں کہیں رنگ نہ لائے اس لیے اس حقیقت پر غور کرو کہ وہی تھا اور کچھ بھی نہ تھا، وہی رہے گا اور کچھ بھی نہ رہے گا، یہ تمام ظل ہو یا ظہور، فی نفسہٖ کچھ بھی نہیں، اس کو بھی ہٹاؤ اور لا مقصود الا اللہ کے بجائے تصور کرو لا موجود الا اللہ یہ ہے وہ زبردست تنقیہ جس کو اصطلاحِ صوفیہ میں "جاروبِ قلب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تا بہ "جاروبِ لا" نہ روبی راہ
نہ رسی در سرائے "الا اللہ"

اس میں دوا بھی ہے اور غذا بھی، مرض بھی جائے گا اور قوت بھی آئے گی۔ اس کے مختلف طریق ہیں چہار زانو یا دو زانو بیٹھ کر، بلند آواز سے خواہ پست آواز سے، خواہ سانس کے ساتھ تصور ہی تصور میں، خواہ حبسِ دم کے ساتھ تخیل سے، خواہ بلا حبسِ دم، خیال ہی خیال میں، اس لیے کہ اصل مطلب خیال ہی خیال جمانا اور یکسوئی پیدا کرنا ہے۔ جس مریض کے لیے جیسا مناسب ہو یہ طبیب بتا سکتا ہے اسی تنقیہ کو "تزکیۂ قلب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔" (کتاب التصوف: ص ۲۰ تا ۲۳)

اس کے بعد علمِ تصوف کی تعریف ہے، وہ فرماتے ہیں: "وہ مقدس و مبارک علم جو قلب کو ذمائم کی نجاست سے پاک بنانے کی ترکیب سکھائے اور صفاے باطن کا طریق بتاکر روح کو اس کی معراجِ کمال تک پہنچائے اور رفیقِ اعلیٰ سے وصالِ حقیقی پانے کی طرف دال ہو، تصوف کہلاتا ہے۔ تزکیہ و عروج کے طریقے کو سلوک، اس راہ کے چلنے والے کو سالک یا متصوف اور منتہی کو صوفی کہتے ہیں۔"

اس کے بعد سلوکِ نقش بندیہ مجددیہ، سلوکِ قادریہ، سلوکِ چشتیہ، سلوکِ سہروردیہ کی تفصیل اور طریقِ عمل کی تفصیل ہے۔ سلوکِ مجددیہ کے تحت لطائفِ عشرہ کا بیان اور ہر لطیفے کے تحت اس کا طریقہ عمل وضاحت اور اختصار کے ساتھ آسان انداز میں مذکور ہے۔ درمیان میں مراقبات اور ولایتِ صغریٰ و ولایتِ کبریٰ کا ذکر ہے۔ اسی ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

دائرۂ ولایتِ صغریٰ:

یعنی مراقبۂ احدیت و معیت میں ظلالِ اسما و صفات کی سیر ہوتی ہے، ماسوی اللہ کا خیال دل سے محو ہوتا ہے، نسبتِ توحید غلبہ کرتی ہے، کبھی رقت طاری ہوتی ہے، بے خودی پیدا ہوتی ہے، استغراق بڑھتا ہے، دوامِ حضور حاصل ہوتا ہے، معیت کا بھید جس کی طرف الفاظ وھو معکم اینما کنتم دال ہیں، قلب پر منکشف ہوتا ہے اور وہ خصائصِ ستودہ جن کا مفہوم دائرۂ الفاظ سے نکل کر گوشۂ دماغ میں ایک شکل مفروضہ رکھتا ہے، وجودِ سالک میں پیدا و ہویدا ہوتی ہیں یعنی مقاماتِ عشرہ: توبہ، انابت، زہد، قناعت، ورع، شکر، صبر، توکل، رضا، تسلیم اجمالاً حاصل ہوتے ہیں۔ اب سالک میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ کشفِ قبور، کشفِ قلوب، کشفِ ارواح، اس کے لیے ان کیفیات کا حصول اور مقامات پر فائز ہونے کا ایک کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام پر پہنچ کر اگر ان بکھیڑوں میں پڑا اور یہیں کا ہو رہا تو ایک سخت محرومی ہے۔ طالبِ صادق کا کام ہے کہ اس سے آگے بڑھے کہ میدان وسیع ہے اور منزلِ مقصود کہیں اور۔

اے برادر بے نہایت درگہے است
ہر چہ بروے می رسی بروے مایست

ہوشیار رہنا، کہیں یہ کیفیات اس مطلوبِ حقیقی سے غافل نہ کر دیں جس کے سراغ میں گھر سے نکلے ہو۔ ریل میں بیٹھ کر جا رہے ہو، راستے میں عجیب و غریب مناظر نظر آئیں گے، دشت و بیابان میں سبزہ زار کا سماں ضرور دلکش ہوگا، دامنِ کوہ میں پانی کا مچلنا، چشموں کا ابلنا یقیناً دل فریب ہوگا، روح کو فرحت، قلب کو راحت ملے گی اور

ضرور ملے گی مگر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، وہ نظر فریب ادائیں اگر ایسی بھائیں کہ وہیں بیٹھ رہے تو اِدھر گھر بار چھوڑا اُدھر مقصود نہ ملا۔ دوسرے یہ خوف ہے کہ اس سبزہ زار میں جہاں ہرن چوکڑیاں بھرتے پھر رہے ہیں، بلبلیں چہچہا رہی ہیں، طوطی نغمہ گا رہی ہے، شیرِ بیاباں بھی کسی نہ کسی جھاڑ میں چھپا ہوگا، سانپ اور بچھو بھی اسی سبزہ زار میں پنہاں ہوں گے۔ نفس و شیطان کا شیر، خودی و انانیت کے سانپ اور بچھو کہیں کام تمام نہ کر دیں اور خسر الدنیا والآخرۃ کی نوبت نہ آئے اس لیے ولایتِ کبریٰ میں قدم رکھو۔" (کتاب التصوف: ص ۳۳ تا ۵۵)

اس کے بعد ولایتِ کبریٰ کے مراقبات مذکور ہیں، بعد تکمیل لکھتے ہیں:

یہ ہے وہ مبارک سلوک جو حضراتِ مشائخ و صوفیہ نقش بندیہ کا معمول رہا ہے۔ صدرِ اول میں ایک نگاہِ پُر انوار سرکارِ نبیِ اکرم روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، کیفیاتِ ذکر و فکر پیدا کرنے والی اور مقامات طے کراتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچانے والی ہوتی تھی۔ صحابۂ کرام اسی سراجِ منیر سے منور شدہ کواکب و نجوم تھے۔ اصحابی کالنجوم بأیهم اقتدیتم اهتدیتم (میرے اصحاب ستاروں جیسے ہیں تم نے جس کسی کی پیروی کی ہدایت پائی۔ حدیث) انھی کی شان تھی، اصحاب میں اکبر، خلفا میں اول، معیتِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اخص کہ معیتِ ذات کے منصبِ جلیل پر ممتاز اور اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (یقیناً خدا ہمارے ساتھ ہے) کے صاحبِ راز حضرت صدیق اکبر ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا۔ انھوں نے مشکوٰۃِ نبوت سے انوار اخذ کرتے ہوئے اس راہ کو پایا۔ ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے حضراتِ مشائخ نقش بندیہ ہیں رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ انھوں نے سالکینِ راہِ طریقت کی آسانی کے لیے ان قواعد و ضوابط کو مرتب و مدوّن کرتے ہوئے عالم کے سامنے پیش کیا۔ مبارک ہیں وہ نفوس جو اس راہ پر گامزن ہوں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد جو فائز المرام ہوں اور دولتِ وصالِ محبوب سے مالا مال۔ ان سے عرض کہ:

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

اس تزکیہ و تصفیہ اور فائز المرام ہونے کے لیے اور متعدد طریقے ہیں، کما قیل: الطرق الی اللہ بعدد أنفاس خلق اللہ (اللہ تک پہنچنے کے راستے خلقِ الٰہی کے سانسوں کی تعداد کے برابر ہیں۔ یعنی: ہر ایک کا مالک سے ملنے میں خاص نرالا انداز)

سالک جس طریقے کی طرف اپنی طبیعت کو مائل پائے یا جس راہ پر شیخِ کامل لگائے، ہمت و استقلال کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو جائے بحول اللّٰہ و قوتہٖ و بمنّہٖ تعالیٰ امیدِ حصول و وصول یقینی۔ (کتاب التصوف: ص ۴۰ تا ۴۲)

اس کے بعد ص ۴۲ سے ۹۳ تک دیگر سلاسل کے سلوک کا بیان ہے۔ پھر ص ۹۳ سے ص ۱۰۲ تک سلوکِ

طریقت واحکامِ شریعت میں مناسبت اور ہم آہنگی دکھاتے ہیں۔ اسی عنوان کے آخر میں ایک اعتراض وجواب بھی تحریر فرماتے ہیں۔ (ص:۹۶تا۱۰۲ ملاحظہ ہو)

ایک شبہہ کا ازالہ:

بعض افراد یہ شبہ پیش کر دیا کرتے ہیں کہ اذکار واشغال کے طریقے نو ایجاد ہیں، نہ زمانۂ نبوت میں ان کا سراغ، نہ صحابہ وتابعین کے دور میں ان کا وجود۔

یہ شبہ محض ناواقفیت اور لاعلمی کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ان شبہ کرنے والوں عزیزوں کو نہ ان اذکار کی حقیقت کا علم، نہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی خبر۔ اس مقام پر ہم چند باتوں کا اظہار ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ ان شبہات کا سدّباب ہو سکے۔

اگر یہ امر کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں ان طریقوں کا رواج نہ تھا، صحیح مان بھی لیا جائے تو آپ دن رات دیکھتے ہیں کہ ان دیہات میں جہاں کوئی ماہرِ فنِ جراحی موجود نہیں، کسی دنبل یا پھوڑے سے مواد خارج کرنے یا زخم کے اندمال کے لیے دوائیں استعمال کی جاتی ہیں، پلٹس باندھی جاتی ہے لیکن اگر کوئی قابل سرجن موجود ہو تو اس قدر مشقت کی ضرورت نہیں وہ ایک آنِ واحد میں عملِ جراحی (آپریشن) کرے گا اور تھوڑی مدت میں سب کام درست ہو جائے گا۔ مدتوں کا مریض عرصے تک اطبا کے زیرِ مشق رہے مگر ایک تجربہ کار ماہرِ فنِ طب اکسیر کی ذرا سی پڑیا میں ایک عرصے کے مفلوج وجود کو کندن بنا دیتا ہے۔ اسی مثال سے قیاس فرمالیجیے کہ دورِ اول میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظرِ کیمیا اثر آنِ واحد میں کدوراتِ ماسوی اللہ کی آلودگی سے قلب کو پاک کرنے والی اور اپنی قوتِ باطنی سے روح کو درست حالت میں لانے والی ہوتی۔ اس دور میں ہماری ظاہری آنکھیں اس جمالِ پر انوار کے دیدار سے محروم ہیں۔ ہمیں ان اصولوں پر غور کرنا ہے جو ہمارے علاج اور تغذیہ کے لیے سرکار نے بتائے اور اس پلٹس کو استعمال کرنا ہے جو مواد کو پکائے اور قابلِ اخراج بنائے۔

اندرونی علاج کرنا ہے اس مادۂ فاسدہ کا جو ہماری صحتِ روحانی کا سب سے بڑا دشمن ہے یعنی نفسِ امارہ، جس کے لیے قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے: إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (نفس تو برائی ہی کا حکم دینے والا ہے) اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اعدیٰ عدوك نفسك التی بین جنبیك (تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیری کروٹوں کے درمیان ہے)

پھر علاج کرنا ہے اس بیرونی سرگرم حملے کا جو شیطان کی صورت میں رونما ہو جس کے لیے ارشادِ خداوندی

ہے: إِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (یقیناً شیطان انسان کے لیے کھلا ہوا دشمن ہے، اور فرمان ہے: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (شیطان تمھیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے)

ان دونوں بیماریوں کا علاج وہی اصول علاج بالضد کے مطابق ملاحظہ کیجیے۔ دشمنِ اول کے مقابلے کے لیے ارشاد ہے: خالفوا الھوٰی (مخالفت کرو خواہشوں کی)، دوسرے دشمن کے لیے حکم ہے: وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ۔ (شیطانی خطروں کی پیروی نہ کرو)

اِسہال کی تدبیر اور اخراجِ مادہ کا طریق توبہ کی صورت میں موجود، ارشادِ ربانی ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (القرآن ۴:۶۴) اگر انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو تمھارے پاس حاضر ہوں، پھر اللہ سے بخشش مانگیں اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعائیں کریں تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا پائیں۔

اب رہیں غذائیں، ان کے لیے ارشاد اور نہایت روشن ارشاد کہ دل کا چین اور قلب کی راحت اللہ کے ذکر میں ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. دل اللہ کے ذکر ہی سے آرام پاتے ہیں، دل کے چین اور اطمینان پر تمام امور موقوف، اس لیے کہ وہ وجود کی جڑ اور تمام جوارح اسی سے متعلق۔ اسی لیے دل کو یہ غذا پہنچانے کے لیے تاکید پر تاکید۔ کہیں ارشاد ہے: فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ تم میرا ذکر کرو میں تمھارا ذکر کروں گا۔ کہیں یہ حکم کہ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ. کثرت کے ساتھ اپنے رب کا ذکر کرو اور شام سویرے اسی کی پاکی بیان کرو۔۔ تحریض کے لیے حدیث میں یوں فرمایا گیا: لا یقعد قوم یذکرون اللہ الّا حفتھم الملٰئکۃ وغشیتھم الرحمۃ ونزلت علیھم السکینۃ، وذکرھم اللہ فیمن عندہٗ جو لوگ اللہ کا ذکر کرنے بیٹھتے ہیں فرشتے انھیں ڈھانپ لیتے ہیں، رحمت ان پر چھا جاتی ہے، سکینہ واطمینان انھیں حاصل ہوتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اس مجمع میں یاد کرتا ہے جو (اس کے مقربین کا) اس کی بارگاہ میں ہے۔ پھر تہدید کے لیے قرآنِ کریم میں آیا ہے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى. جس کسی نے ہمارے ذکر سے روگردانی کی اس کے لیے تنگ روزی ہے اور قیامت کے دن اسے اندھا اٹھائیں گے۔

پھر حدیثِ صحیح میں یہ بھی بتایا گیا کہ افضل الذکر لا الہ الا اللہ. اس ذکر کے یہ مختلف طریقے ہیں جو آپ نے ملاحظہ فرمائے تاکہ روح وقلب کو ان کے ذریعے ایسی قوت حاصل ہو جائے کہ وہ آرام پاسکیں، چین حاصل کر سکیں اور قوتِ دافعہ اس قدر بڑھ جائے کہ مادۂ فاسدہ یعنی نفسِ امارہ وحملۂ بیرونی یعنی شیطان وابلیس کے شرور سے محفوظ ہو جائیں۔

جہاد کی فرضیت وضرورت سے کس کو انکار؟ مقصودِ اصلی مقابلۂ کفار مسلّم، اس کے لیے سامان کی حاجت

تسلیم، زمانۂ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں تیر و تلوار اور نیزہ و کمان کے ذریعہ مقابلۂ کفار کیا جاتا۔ آج اگر توپ، بندوق، ہوائی جہاز، بم کے گولے یا سمندروں میں تارپیڈو غیرہ جہاد کے وقت کام میں لائے جائیں تو کیا ان کو یہ کہہ کر چھوڑا جاسکتا ہے کہ یہ آلات سرکارِ دوعالم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے زمانے میں نہ تھے؟

علیٰ ہٰذا ایمانی قوت رکھنے والے سرکار کے فیضِ صحبت سے پلنے والے صحابہ کو نہ پریڈ کی ضرورت تھی نہ قواعد کی حاجت، نہ نشانہ بازی کا باقاعدہ انتظام۔ آج اگر باقاعدہ بہ تعینِ اوقات قواعد اور پریڈ کے لیے اہتمام کیا جائے اور جدید اصولِ حرب استعمال میں لائے جائیں تو کیا ان کو یہ کہہ کر رد کیا جاسکتا ہے کہ قرونِ سابقہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ شاید ہی کوئی بے عقل ایسا ہو جو ایسی رکیک بات اپنے ذہن میں لائے۔ بس اسی پر قیاس کر لیجیے کہ جتنے طریقے ہیں ہر زمانے کے مطابق اعدا کی سرکوبی کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں جس کی تعلیم خود سرکار علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے دی۔ وہاں جنگ کی صورت میں جنگ کا طریق ہی بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے لیکن یہاں نہ آلات میں تغیر، نہ طریقِ جدال میں تفاوت۔ اصل وہی تعلیمات ہیں، طریقِ ادا ہر متعلم کی استعداد کے مطابق جدا جدا تعلیم کیا گیا۔

معدے کو غذا پہنچانا، کھانا کھلانا فرائضِ حیات میں داخل۔ اس کھانے کے متعلق حلال و حرام کو دلائل قرآنِ عظیم و احادیثِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے واضح کر دیا۔ گائے کا گوشت حلال اور مقوی، انڈا، مکھن، دودھ، دہی ساری غذائیں اچھی۔ اسی طرح پھل پھلواری، دال ترکاری، اجمال یا تفصیل سے بہر صورت کسی نہ کسی طرح ہر شے کے متعلق حکم بتا دیا گیا پھر جس کی حرمت ثابت نہ ہو اس کے لیے الأصل فی الأشیاء الإباحة (اشیا میں اصل اباحت ہے) کا کلیہ فقہا نے ترتیب دیا ہے۔

گوشت حضورِ انور ﷺ نے بھی تناول فرمایا، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی نوش جاں کیا، تابعین و تبعِ تابعین سبھی نے کھایا مگر کس طرح؟ کیا ہماری طرح کوٹ کر مصالحہ ملاکر، کباب سیخ بنا کر یا مرغن، مُحمّرب، قلیا قورما، سوپ یخنی بنا کر یا یوں ہی بڑے بڑے ٹکڑے آگ پر گرم فرماکر؟ آج اگر گوشت کو ان ترکیبوں سے پکایا جائے تو کیا کوئی سمجھ دار اس پر یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ کھانے کا یہ طریقہ بدعت یا خارج از اباحت ہے؟ ہاں جو کہے گا یوں ہی کہے گا کہ گوشت کھانا سنّت، دست کا گوشت اور بھی زیادہ قابلِ رغبت اس لیے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کو اس سے خاص الفت۔

اسی طرح اس باب میں بھی تصور فرمالیجیے کہ ذکرِ نفی و اثبات یا اسمِ ذات ذکر ہی ہے، نہ کہ کچھ اور۔ اور اس کا ورد کرنا ہر مومن و مسلم کا کام، ہاں ورد کا کیا عنوان ہو؟ یہ ہر ایک شخص اپنی آسانی اور ضرورت کے مطابق خود غور کرلے کہ کس طرح میرے لیے زیادہ نافع ہوگا اور اس روحانی غذا کو کس طرح کس مصالحے کے ساتھ بنا کر میں زیادہ لذت یاب ہوسکتا ہوں۔ خود غور نہ کرسکے تو دوسروں سے مشورہ کرلے کہ کھانا پکانے کے نت نئے طریقے روز بروز

یوں ہی نکلتے رہتے ہیں۔

ایک اصول یہیں سمجھ لیجیے اور یاد رکھیے، ان شاء اللہ تعالیٰ ہر جزئیے میں کام دے گا۔ ذکرِ الٰہی کا داخلِ دین ہونا ثابت۔ اب اگر ان طریقوں میں سے کسی طریق پر کسی صاحب کو اعتراض ہو تو وہ براہِ کرم اس کے حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی ہونے کے لیے کوئی دلیل شرعی بیان فرمادیں۔ اگر ان تینوں باتوں میں سے کسی کے لیے بھی کوئی دلیل نہ ہو (اور یقیناً نہیں ہے) تو امرِ مباح اپنی اباحت پر قائم۔ چوں کہ یہ ذکر اللہ ہے، اس کا مستحب و سنّت ہونا ظاہر و باہر۔

قرآنِ عظیم منزّل من اللہ اور اس کا پڑھنا اور جاننا ہر مسلمان پر واجب۔ اس کے پڑھانے کے لیے دن رات ہم اپنی ضرورتوں کے مطابق نئے نئے قاعدے بناتے ہیں، اسی کے سمجھانے کے لیے صرف و نحو، اسی کے حقائق تک رسائی کے لیے معانی و بیان، پھر مخالفینِ قرآن کے اعتراضات کے دفاع کے لیے معقول کلام۔ بنظرِ غور دیکھا جائے تو یہ سب تعلیمات اسی لیے ہیں کہ خدا کا کلام سمجھنے کے لیے قابلیت پیدا ہوجائے۔ اسی طرح اصل مقصود ہے کہ بندہ اپنی شانِ بندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس معبودِ حقیقی کے دربار میں سرِ نیاز جھکائے اور جس عبادت کا وہ مالکِ حقیقی مستحق ہے نیز جس اندازِ عبادت کو بجالانے کا یہ بندہ بشانِ عبودیت مکلف ہے وہ عبادت حضورِ قلب کے ساتھ بجالائے تاکہ اس دربار میں قرب و وصول کی نعمت سے مالامال ہوکر عرفان کے منازل طے کرتے ہوئے اس رب کو جانے اور اسے پہچانے۔

اس عبادت کا بہترین طریقہ بلکہ واحد انداز بصورتِ فرض بندے کے ذمے نماز کی شکل میں عائد کیا جاتا ہے اور اسی نماز کو منازلِ عرفان کی معراجِ کمال بتایا جاتا ہے۔

اس کے بعد ”سلوک الصلوٰۃ“ کے عنوان سے نماز میں حضورِ قلب اور توجہ الی اللہ کی تعلیم و تفہیم کرتے ہوئے اسے وصول الی اللہ کا ذریعہ بنانے کا تفصیلی بیان ہے جو سراسر منقول ہی منقول ہے اور اس میں نوایجاد ہونے کا شبہ وارد کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔ (ملاحظہ ہو: ص ۱۰۳ تا ۱۱۵)

اسلامی سلوک کا بیان مکمل کرنے کے بعد دیگر مذاہب کے سلوک کا بیان ہے۔ عنوان ہے ”دنیا کے دوسرے مذاہب اور ان کا سلوک“ یہ بیان ص ۱۱۶ سے شروع ہوکر ص ۱۲۹ پر ختم ہوتا ہے۔ نفعِ عام کے لیے اس کی بھی تلخیص کچھ توضیح و تسہیل کے ساتھ سپردِ قلم کی جاتی ہے:

” جو حضرات کسی دینِ سماوی سے منسلک ہوئے ان کے نزدیک ذاتِ واجب الوجود کا تصور تعلیمِ انبیا کے زیرِ اثر موجود ہے لیکن جو کسی دینِ سماوی سے منسلک نہ ہوئے ان میں بھی ایسے افراد ملتے ہیں، جنھوں نے اس نظامِ عالم کو چلانے والی ایک ہستی کا سراغ بتایا۔

اپنی قوتِ فکریہ کو کام میں لانے والا انسان جب آسمان و زمین کی تخلیق، مہر و ماہ کی گردش، ستاروں اور سیاروں کے حیرت انگیز نظام، روز و شب کے اختلاف اور زمانے کے انقلابات پر نظر کرتا ہے تو اسے ایک قادر و توانا ہستی کے ہمہ گیر نظم و ضبط کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ دائرۂ غور و فکر میں قدم رکھنے والا، حقائقِ مادّیات کی طرف التفات کرنے والا ہر نفس اس نتیجے پر پہنچتا اور ضرور پہنچتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ہستی اس عالم کی مشینری کو ضرور چلا رہی ہے۔

تماشا گاہِ عالم کے نت نئے کھیلوں نے جو اس دورِ ترقی کی مابہ الامتیاز خصوصیت کہے جا سکتے ہیں، اگرچہ آج اکثریت کو ایسا محوِ تماشا کر رکھا ہے کہ وہ اس طرف عنانِ تخیل پھیرنا بھی حماقت اور اضاعتِ وقت سمجھتے ہیں لیکن اقلیت ہی سہی، اس زمانے میں بھی اس طرف متوجہ ہوتی اور ضرور ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی گوشے سے، کبھی نہ کبھی مالکِ حقیقی کے نام کی آواز آ ہی جاتی ہے۔

زمانِ قدیم میں جب تک دو آتشہ دخت رز کی البیلی اداؤں نے دنیا کو اس قدر بے خود نہ بنایا تھا، حسنِ مادّی کے طرزِ دلبری نے لوگوں کے قلوب کو بہت نہ رِجھایا تھا، ضرور ایسے افراد کی کثرت پائی جاتی ہے جو اس حسنِ حقیقی کی تلاش میں حیراں و سرگرداں ہوں۔ وہ فلاسفہ کی شکل میں ہوں یا جوگیوں اور رشیوں کے پیکر میں۔ کچھ نہ کچھ پاتے ہی ہوں گے جسے دکھا کر ایک جماعت کو اپنا متبع بناتے اور اپنی اپنی جماعتوں کی قیادت و پیشوائی فرماتے ہیں۔

اس طرح قدیم رہنماؤں کو بعض لوگوں نے صاف صاف "نبی و رسول" کہنے سے بھی گریز نہ کیا جب کہ نبوت و رسالت ایسا منصب ہے جس کے متعلق وحیِ آسمانی کے بغیر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں کو حاصل تھا۔ اس خیالِ ناحق کو ایک مثال کی روشنی میں رد کرتے ہوئے یہاں رقم طراز ہیں:

نبی و رسول کے اصطلاحی نام تو یقیناً انھیں نہیں دیے جا سکتے، اس لیے کہ یہ شریعتِ اسلام کے مصطلح خطابات ہیں۔ جب تک کسی شخصیت سے متعلق یقینی صورت یعنی واقعی الہام و وحی کے ذریعے اس خطاب سے نوازا جانا ثابت نہ ہو جائے، دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی کو اس خطاب سے امتیاز یافتہ ہونے کا دعویٰ کر سکے۔

بلا تمثیل خان بہادر، رائے بہادر، سر اور نائٹ کے خطابات اگرچہ اپنے لغوی معنٰی کے اعتبار سے ہر بہادر، مقتدر اور رائی کے معتمد پر صادق آ سکیں یا کسی فرد کا اپنی قوم و جماعت یا حکومت میں ایسا اقتدار ہو جو اس قسم کے خطاب یافتگان کو حاصل ہوتا ہے اور آپ کا تخیل آپ کو اس حد تک آمادہ کرتا ہو کہ آپ اسے اس خطاب سے یاد فرماتے ہوں لیکن آپ کی تخصیص اور آپ کا تخاطب، قانونِ حکومت کے نزدیک درست نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک کہ واقعی حکومت نے اس خطاب کی منظوری نہ دی ہو نیز آپ اس قسم کے غلط تخاطب کے جرم سے بری نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ اس کے ثبوت میں حکومت کے کسی مسلّمہ اعلان کی گارنٹی نہ پیش کریں۔

اسی لیے اسلام کی شریعتِ حقہ کا یہ فتویٰ ہے کہ جس طرح کسی ایسے نبی و رسول کی نبوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جن کی نبوت و رسالت کی خبر قرآنِ عظیم کی وحیِ یقینی نے دی یا رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کے متعلق حدیثِ صحیح میں اطلاع بخشی۔ اسی طرح کسی ایسے فرد کو جس کے متعلق انھیں دونوں ذریعوں سے تخصیص کے ساتھ یہ خطاب پانے کی خبر نہ ملی ہو، نبی کہنا یا رسول بتانا یقیناً خدائی فرمان کی توہین اور قانون شکنی ہوگی۔ آپ انھیں رہبر کہہ دیں، بعض اقوام کا ہادی سمجھ لیں۔ امکانی طور پر یہ قیاسی حکم بھی لگا دیں کہ ممکن ہے وہ ایسے ایسے ہوں مگر قطعی طور پر حکم دینا یقیناً سخت غلطی ہے جس میں آج بہت سے لوگ مبتلا ہیں۔ والعیاذ باللہ منہا.

اب اصل مقصود کی تکمیل کے لیے فرماتے ہیں:

المختصر وہ فلاسفہ یا جوگی، او تار یا رشی، جماعتوں کے رہنما یا ہادی، جب کبھی صحیح طریق پر اس مالکِ حقیقی کی تلاش میں قدم اٹھاتے ہیں، اس راہ روی کے لیے ایک اصولِ اولین متفقہ طور پر بتاتے ہیں، وہ ہے مجاہدہ اور ریاضت و مشقت کے ذریعے نفس کی مخالفت۔ رہی یہ بات کہ منزلِ مقصود کو پاتے اور شاہدِ مطلوب کے دربار میں باریاب ہوتے ہیں یا نہیں؟ اس کے متعلق بے سوچے سمجھے لوگ جو چاہیں کہہ دیں مگر حقیقۃً بر حسبِ اسبابِ ظاہر لا و نعم (نہیں اور ہاں) میں جواب دینا مشکل۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجاہدہ و ریاضت سے نفس کشی اور تپسیا سے روح میں قوت، شہوانیات و نفسِ امارہ کی حرکات میں کم زوری و نقاہت پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض بندگانِ خدا اس تھوڑی سی قوت اور معمولی سی طاقت کو اپنے اندر محسوس کرتے ہوئے استدراج و خوارق کے بکھیڑے میں پھنسے اور یہیں کے ہو رہے۔ بعض آگے بڑھے مگر عقلیات کے گھوڑے کہاں تک دوڑتے، مادیات کو راہ میں پا کر اسی بکھیڑے میں پھنس رہے۔ روح، مادّہ دونوں کو قدیم مانا، روح کی منازلِ ارتقا کو تناسخ (آواگون) کا چکر جانا اور اسی روح کو سب کچھ سمجھا۔ بعض سیرِ مادیات میں مصروف ہوئے اور صفات میں تدبر کرتے کرتے انھیں مظاہرِ صفات کو عینِ ذات ماننے لگے۔ بعض نے بزعمِ خویش انتہائی ترقی کی، کثرتِ صفات کو معائنہ کرتے ہوئے ان میں وحدت سمجھی اور توحید کے دریائے ناپیدا کنار کے کنارے پر پہنچ کر اس قدر نتیجہ پا سکے کہ "ہست" "ہے"۔

اس قسم کے مقتدا بہت سی قوموں اور جماعتوں میں گزرے، سب کا اِحصا تو اس مختصر میں دشوار، ہاں بالاجمال والاختصار صرف دو بڑی جماعتوں کے زبردست پیش رَوؤں کی بعض تعلیمات کا اظہار، ایرانی آتش پرست کہی جانے والی جماعت کے مقتدا جناب زرتشت کے ماننے والے عوام آج کچھ کہیں اور کچھ کیا کریں۔ وہ کواکب پرست ہوں یا آتش پرست لیکن ان کی تعلیمات کو سمجھنے والے نفوس کے حالات کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو توحید کی جھلک، اگرچہ ہزاروں پردوں میں سہی، نمایاں ضرور ہوتی ہے۔ آزر کیواں جو ایک جلیل القدر مؤبد ہے، اکبر کے

زمانے میں ہندوستان آیا، پٹنہ میں سکونت اختیار کی، ۱۰۲۷ء میں انتقال کیا، محمد محسن ایک فاضل ہم عصر کا بیان ہے کہ میں نے خدا کے وجود پر دو سو ساٹھ (۲۶۰) دلیلیں اس کی زبان سے سنیں، خوارق بھی اس سے صادر ہوتے دیکھے۔ اس جماعت کے متصوفین نے بھی طریقِ خداجوئی و خداطلبی کے لیے جن شرائط کو ضروری جانا وہ ریاضت و نفس کشی ہی پر مبنی۔ انھوں نے سلوک کی شرطیں پانچ بتائیں:

۱۔ گرسنگی ۲۔ خاموشی ۳۔ بیداری ۴۔ تنہائی ۵۔ یادِ یزدانی۔

یادِ یزدانی کے لیے تین امور کا حضور ضروری۔ "اول خدا، دوم قلب، سوم تصورِ مرشد۔"

اس کے بعد ان کا ایک طریقۂ ذکر اور ذکر کے وقت نشست کی ہیئت کا بیان ہے، پھر لکھتے ہیں:

"یہ مشق بہت سی مشقوں کا خلاصہ یا یوں کہیے کہ سب میں اعلیٰ اور زیادہ باتیجہ لیکن اس کی کیفیات اور اس اسم کے اثرات وکیفیات تک محدود۔ اس سے آگے وہی بڑھے جو اس اسم سے بالا اسم کو جانے۔"

اس کے بعد دوسری بڑی جماعت کی ریاضت کا ذکر ہے، آگے لکھتے ہیں:

لیکن یہ سیر بھی اسمِ "ادم" کے معانی کے مطابق اسی کائنات کی سیر ہوگی اور یہ علم اور پہچان بھی اسی اسمِ صفت کی تجلیات کے معاینے تک محدود۔ سارے ویدوں کا مطالعہ کر جائیں، تمام شاستروں کو دیکھ جائیں، اس ذاتِ بحت کے اسمِ ذات کا کہیں اشارہ تک نہ پائیں۔ جب اسمِ ذات تک رسائی نہیں تو سیرِ ذات کیوں کر کریں؟ اسی لیے اس مشرب کے جتنے افراد کے حالات بھی ملاحظہ میں آتے ہیں سب کی اقصی الغایات سیرِ صفات ہے اور بس۔ ذات تک رسائی وہی پائے جو مقدمہ درسیات اسمِ ذات ہی کو بتائے۔

سطحیات میں مبتلا، برہما، کشن، مہادیو کی پوجا کرنے والا جتھا ہر مادی دیوتا کو خدا سمجھنے اور کہنے والا تو حقیقت سے جدا، شرک کے مرض میں پھنسا ہوا، ان سے نہ ہمیں کچھ غرض، نہ ان کی حرکات وسکنات سے کچھ مطلب۔ انھوں نے تو خود اپنے معلمین کی تعلیمات کو بھی پیچھے ڈالا۔ جس کسی نے ایک روزی دینے والے دیوتا کی پوجا کا سبق دیا، انھوں نے اسے گائے سے تعبیر کیا۔ ایسے بے عقلوں سے کیا الجھنا اور ان کی باتوں میں کیوں پھنسنا۔ ہم تو اس حقیقت کی طرف قدم اٹھانے والوں اور اس ذاتِ مطلق کے عرفان پہچان کے لیے سمندِ عزم بڑھانے والوں کا ذکر کر رہے ہیں اور انھیں کے متعلق کہہ رہے ہیں۔

ایزد و اہرمن کی تفریق کرنے والے، خالقِ خیر و خالقِ شر دو خدا ماننے والے، آگ اور سورج کو دیوتا قرار دے کر ان کی پوجا کو اپنا وظیفہ بنانے والے، مادہ پرست دنیاداروں کی طرح ان لغویات میں پھنسے رہیں، ہم انھیں کیا کہیں جب وہ اپنے معلمین کے بتائے ہوئے نورِ حقیقی کی طرف توجہ ہی نہ کریں۔

ہم نے جو کچھ کہا اور کہہ رہے ہیں وہ انھی نورِ حقیقت کا سراغ لگانے والوں اور معرفت کی راہ پر قدم بڑھانے والوں سے متعلق ہے۔ ان کی نہایت یہی کائنات کی وسعت اور گلشنِ اسماے صفات کی مملکت ہے۔ ذاتِ جامع جمیعِ صفات ان شؤن والوں سے بالا، وراء الوریٰ، ثم وراء الوریٰ، اس کا پتہ اس کو ملا جو اسماے صفات سے آگے بڑھا اور یہ آگے بڑھنا اسی کو نصیب ہوا جس نے شاہدِ ذات سے اسم ذات کا سبق لیا۔

اس کے بعد تصوف پر اعتراض کرتے ہوئے اسے جوگیوں اور زرتشتیوں کے سلوک سے تشبیہ دینے والوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے اعتراض کا جواب رقم فرماتے ہیں:

ان اسرار سے ناآشنا، ان حقائق سے بے پروا، وہ جن کو نہ اس راہ کی خبر نہ اس محبوبِ حقیقی کے عشق کا سودا، اپنی کم علمی و کم فہمی کے سبب یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا سلوک یا تصوف جوگیوں اور زرتشتیوں سے لیا گیا، ان کی مشقیں انھی کی نقلیں، ان کے اصول انھی کے معمول۔

جوگیوں اور زرتشتیوں کے اصولِ ریاضت کو اسلامی تصوف کی صف میں لانا ایسا ہی ہے جیسے کاغذ کی ناؤ بنا کر نالی یا کسی برتن میں اسے چلانے والا بچہ کہے کہ بڑے بڑے جنگی جہاز اور زبردست اسٹیمر، بڑے بڑے دریا اور ناپیدا کنار سمندر کیا ہیں؟ یہی میرا جہاز اور یہی میرا بحر و بر۔

یا کنکوے اور پتنگ اڑانے والا یوں کہے کہ ہوائی جہاز کیا ہے؟ یہی میرا کنکوا۔ اس کا محل پرواز یہی ہوا ہے اور میری پتنگ کا مقامِ عروج وارتقا بھی یہی خلا۔ جس طرح آپ ان مثالوں کو سن کر ہنسیں گے اسی طرح واقفین ان معترضین کے تخیلات کو سن کر متبسمانہ انداز میں ٹال دیا کرتے ہیں۔

آگے بتایا ہے کہ اسلامی تصوف اور دیگر مذاہب کے اصولِ ریاضت میں کتنا فرق ہے، یہ اگلی جلد میں واضح ہوگا جہاں نظریاتی تصوف کا بیان ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ دونوں کے افکار و نظریات میں کتنا بُعد اور کس قدر نمایاں فرق ہے۔ اس جلد میں تصوف کے عملی شعبے سے بحث کی گئی ہے اس لیے وہ تفصیلات یہاں مذکور نہیں۔ پھر بھی یہاں چند فرق ملاحظہ کر لیجیے۔

(۱) ہر کیش کے سلوک میں ترک و تجرید لازم، برہمچریہ کے یہاں آشرم اور رہبانیت ضروری، یہاں لا رھبانیۃ فی الاسلام اصولِ اولین۔

(۲) وہاں انتہائی مشقتوں اور ریاضتوں کے بعد بھی سیرِ صفات سے آگے بار نہیں، یہاں ابتداے کار ہی میں عروج الی الذات پر مدار۔۔۔ حضرت سرکارِ مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:

اوّل ما آخرِ ہر منتہی است
آخر ما جیبِ تمنا تہی است

(۳) وہاں بعض منتہی بھی عینِ ذات کو صفات کہہ اٹھتے ہیں، یہاں ابتدا ہی سے لاعین ولاغیر کا مسلک رکھتے یا آئینوں میں تجلیات کا معاینہ کرتے اور مظاہرِ صفات سے اسی ذات کے مشاہدات کی طرف راہ پاتے ہیں۔ یا مظاہر اور نشانیوں کو لاموجود کی نفی میں فنا کرتے ہوئے، واجب و ممکن کے معانی فہم میں لاتے ہوئے ممکن وہالک وحادث کو ایک اعتبارِ مفروضہ جان کر الاٰن کما کان کا رنگ ملاحظہ فرماتے ہیں۔

جلال و جمال دونوں صفات ایک ذات کا کمال جانتے ہوئے اس بحر ناپیدا کنار میں غوّاص کے لیے جب آگے بڑھے کبھی انوار کی جھلک میں سب کچھ مشاہدہ کیا، کبھی ظلمات بعضها فوق بعض کی تاریکیوں میں اپنے وجود کو بھی گم پایا بلکہ پانے کا احساس بھی کھویا، پھر کیسا نور، کیسی ظلمات، نہ یہ رہا نہ وہ رہا۔ کثرت سے وحدت میں آیا، وحدت سے توحید کے مقام پر فائز ہوا، پھر توحید کی لفظی صورت کو بھی چھوڑا. التوحيد ترك التوحيد فى التوحيد کا راز کھلا۔

جِن کھوجا ، تِن پائیاں ، گہرے پانی بیٹھ
میں بپرن ایسی بھئی ، رہی کنارے بیٹھ

یہ حال ہے قال نہیں، نہ قلم کو یارائے تحریر، نہ زبان کو مجالِ تقریر، من سكت سلم، من سلم نجا۔"

نفس کی مخالفت اور مشقت وریاضت پر رہبرانِ مذاہب کا اتفاق دیکھ کر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سب مذاہب ایک ہیں، ان کی ہدایت کے لیے رقم طراز ہیں:

"اتحادِ مذاہب کا خواب دیکھنے والے سطحیات پر سرسری نظر ڈال کر بھی اگر کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں تو یوں ہی سمجھ لیں کہ وہاں ابجد تھی اور یہاں تکمیل، کما قیل: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (القرآن، ۵:۳)

اتحادِ مذاہب اور وحدتِ تصوف:

کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام مذاہب سے اچھی اچھی باتیں چن کر ایک نئی شکل ترتیب دی جائے۔ اس سے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ کام کون کرے گا؟۔ ایسی حالت میں کہ عجائب واوہام پرستی کا ہیولیٰ حقیقی نور کی کرنوں کے سامنے حجاب بن گیا ہو اور مادّیات کی آلودگی روحانیت کی لطافت پر گرد کی طرح چھاگئی ہو۔ یہ کام انسانی طاقت سے باہر ہے، انسان متضاد کیفیات کا حامل ہے، ممکن ہے کہ اس مبارک نیت وارادے میں اس کی اغراض ذاتی وعصبیت نفسانی شریک بن جائیں۔ ممکن ہے وہی نفسِ لئیم جو اس راہ میں ہمیشہ رہ زنی کیا کرتا ہے اس کو راہ ہی غلط بتائے۔ پھر باوصف کمالِ جدو جہد جو کچھ سامنے آئے وہ ظنی ہی ظنی ہو، یقین کا اطلاق اس پر نہ ہو پائے۔ اس لیے کہ یقین کے لیے جن براہین کی ضرورت وہ انسان کو میسر نہ ہو سکیں۔

بہر صورت اس ضرورت کی تکمیل کی ذمے داری بھی اپنی رحمت سے اس مالکِ قدوس جل جلالہٗ ہی نے لی۔ اور إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ فرماتے ہوئے یہ بتادیا کہ صحیح اصولوں کی طرف رہبری ہمارا ہی کام۔ ظنی نہیں قطعی ویقینی وحی کے ذریعے فرمادیا گیا کہ: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔ طریقِ عروج الی اللہ، بامقصد حیات کو پورا کرنے کی راہ ایک معانی لفظ اسلام ہی میں مضمر۔ خدائی احکام کے سامنے سر جھکاؤ اور الہام و وحی کے ذریعے جو راہ ملے اسی کو اختیار کرو۔ تمام مذاہبِ حقہ جو انبیاواصفیا نے پیش فرمائے، تمام طرقِ صحیحہ جو بعض سچے رہبروں اور ہادیوں نے بتائے ان میں جہاں تک رطب ویابس نے دخل پایا، عقلیات ومادّیات ملے، ذاتی اغراض ونفسانی خواہشات نے آلودگی پیدا کی ان سب کو علیٰحدہ کر دیا گیا۔ اور دنیا کے انسانوں نے جس چیز کو بھلایا یا منازلِ ارتقا پر کما ینبغی فائز نہ ہونے کے سبب جو امور مخفی رکھے گئے اس کمی کو پورا کیا گیا، میل کچیل کو دھویا گیا، نکھری ہوئی تعلیم بکمل صورت میں، تمام مذاہبِ حقہ کے عطر کی شکل میں اس محبوب ذاتِ احدیت کی معرفت بھیج دی گئی اور فرمادیا گیا هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ. (القرآن، ۶۲:۲)

وہ رسول جو خدا کے سوا کسی اور کے سکھائے ہوئے نہیں، اس رب ہی کے بتانے سے اس کی نشانیاں لوگوں کو دکھاتے، ان کا تزکیۂ باطن فرماتے اور کتاب وحکمت کے اصول سکھاتے ہیں۔ وہ اپنے عقلیات کے تیر نہیں چلاتے۔ اپنی ذاتی اغراض کو دخل نہیں دیتے، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، ظنیات پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ جو کہتے ہیں اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى، قطعی ویقینی ہے۔ ان کا مبلغِ تحقیق، تاریخ کی مدوّنہ کتابیں نہیں بلکہ جو کچھ ہے وہ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کے علمِ قدیم کا فیضان ہے۔

چودہ سو برس پہلے نہایت دل کش انداز میں عرب کی پر نور وادی سے دنیا نے سنا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ تم تکمیل چاہتے ہو وہ ہو چکی، تم اتمامِ نعم کے متمنی ہو اس کی صورت سامنے آگئی۔ شفقت علیٰ خلق اللہ کے مضمون کو ذہن میں لے کر تم تمام مخلوق کو ایک رنگ میں دیکھنا چاہتے ہو، اسلام کی طرف سے اجنبیت کا پردہ اٹھاؤ، وہ دیکھو اسلام کس محبت کے ساتھ تمام مذاہبِ حقہ موسویت وعیسویت کے ماننے والوں کو آواز دے رہا ہے: تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا. (القرآن: ۳/۶۴)

(۱) عقیدۂ توحید (۲) توجہ الی اللہ (۳) اعراض عما سوی اللہ، یہی تین زرّیں اصول ہیں جن پر تمام مذاہبِ حقہ کا دار و مدار ہے۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جن پر تمام عالم کے حقیقت بیں متحد ہیں۔ اسلام اس اتحاد کا نمونہ اور اسلام ہی اس واحد تصوف کا معلم جو تمام عالم کی خوبیوں کا مخزن، تمام جزئیات پر حاوی اور تمام محاسن کا جامع ہے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔

عالم کی عمارت جس ستون یا پتھر کے سبب نامکمل تھی وہ ستون یا پتھر یا یوں کہو کہ وہ رابطۂ برقیہ جس نے تمام عالم کے مذاہبِ حقہ کی عمارتوں کو باہم متحد کر کے ایک مستحکم قلعے کی صورت میں منتقل کر دیا، وہ دینِ قدیم، اسلام کے جمانے والے سرکار محمد رّسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیش کردہ طریق ہے۔

انھوں نے اپنے دامن میں سارے عالم کے حق گو اور حق پسند افراد کو لیا اور سب کو: وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا. کا درس دیا، خدا کی محبت اور پریم کا جام پلایا اور ایک بادۂ وحدت سے تمام عالم کو سرشار بنایا۔ جس کا دل چاہے، آئے، ایک عَلَمِ توحید کے نیچے جمع ہو جائے۔ اس احد و صمد ذات کی طرف دھیان لگائے۔ غیر اللہ کی نفی کرتے ہوئے لا الہ الا اللہ کہے اور محمد رّسول اللہ (ﷺ) کے ظلِ عاطفت میں تربیت پاتے ہوئے منازلِ عرفان طے کر لے۔

گھر بیٹھے یہ دولت مل رہی ہے، بے تلاش و جستجو، بے سعی و محنت یہ خزانہ ہاتھ آ رہا ہے، فلسفیانہ رنگ کی طرف میلان ہو، دلائل و براہین کا دفترِ بے پایاں موجود، سادہ لطائف و حقائق کا ذوق ہو، اسمائے صفات کا مخزن، تمام کائنات کا، قرآنِ کریم سامنے، وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ. (القرآن۔۶:۵۹)

خدا کا ذکر کرو، صفات میں فکر کرو، ذات کی طرف راہ لو، ایں و آں کے خیالات دل سے بھلاؤ، ماسوی اللہ کا نقش قلب سے مٹاؤ، یک سوئی کے ساتھ اس کی طرف دھیان جماؤ، اگر مقصود کو نہ پاؤ، منزل پر نہ پہنچ جاؤ تب ہی کچھ کہنا۔

جھگڑے فساد سے منہ موڑو، زق زق، بق بق چھوڑو، انانیت کا رشتہ توڑو، دیکھو تو یہی سب کچھ ملے گا، باتیں بنانے میں وقت ضائع نہ کرو، قیل و قال سے زبان کو روکو اور گیان دھیان سے کام لو، روح کو اپنی راہ پر لگنے کی مہلت تو دو۔

قال را بگزار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

(کتاب التصوف ص:۱۳۰ تا ۱۳۶)

یہ ہے اس مبارک کتاب کا ایک جلوۂ بے حجاب، اس کے حقائق و معارف کا ایک دل کش انتخاب اور اس کے حسن دل آرا کی ایک نظر افروز جھلک جس میں مصنف کا داعیانہ جذبہ نمایاں ہے۔ زبان و بیان کی دل کشی، حلاوتِ کلام کی چاشنی، دقیق مضامین کو دلوں میں اتارنے کا فن، پیچیدہ مسائل کی تفہیم کا کمال، تصوف اور اس کی عملی مشق سے گہرا لگاؤ، ایک شیخِ کامل کا اندازِ تربیت، ایک سچے مرشد و رہنما کا سوزِ دروں، ایک دینی داعی و مبلغ کا جوش و ولولہ سبھی کچھ عیاں ہے۔ میں نے حسبِ وعدہ اپنا تبصرہ بہت کم رکھا ہے تاکہ اہلِ نظر خود مبلغِ اسلام علیہ الرحمہ کی تحریروں سے براہِ راست مستفید ہوں۔

❁❁❁

سیدنا غوث اعظم[1]

کا رُتبہ تمام اولیا سے بُلند ہے

تمہیدی گفتگو:

سرکار مفتی اعظم قدس سرہ کے زمانے میں ۱۳۹۸ھ کے عرس رضوی کے بعد دس بارہ دن حضرت کے قائم کردہ دار العلوم مظہر اسلام (مسجد بی بی جی) بریلی شریف میں میرا اور برادر گرامی مولانا عبد المبین نعمانی کا قیام رہا۔ اس درمیان اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے حاشیۂ شامی (جد المتار علی رد المحتار) کی نقل کا اصل قلمی نسخے سے مقابلہ کرنا تھا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اپنی مملوکہ رد المحتار ہی پر حواشی تحریر فرمائے تھے۔ سرکار مفتی اعظم علیہ الرحمہ نے یہ نسخہ ہمیں حضرت مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی سفارش پر رضوی دار الافتا سے مفتی محمد اعظم رضوی ٹانڈوی دام فیضہ کے ہاتھوں عنایت فرمایا تھا۔

اس کے آخر کے منسلک اوراق پر سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد "قدمي هٰذه على رقبة كل ولي الله" کے عموم پر اعتراض نقل کرکے اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے جواب تحریر فرمایا تھا۔ اُس وقت میں دار العلوم ندائے حق، جلال پور، ضلع فیض آباد (حالیہ ضلع: امبیڈکر نگر) میں مدرس تھا۔ جلال پور واپسی کے بعد دس بارہ دن کے اندر وہ مضمون مع ترجمہ میں نے ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور میں اشاعت کے لیے مدیر اعلیٰ محب گرامی مولانا بدر القادری کے پاس بھیج دیا اور مارچ ۱۹۷۸ء (مطابق ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۳۹۸ھ) کے شمارے میں شائع ہوگیا۔ (ملاحظہ ہو مذکورہ شمارہ ص ۲۵ ر تا ۳۱ ر اور کچھ بقیہ کے لیے ص: ۲۱)

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی یہ تحریر ۲۰ ر رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ کی ہے۔ قصیدہ "اکسیر اعظم" اس سے چند دن قبل نظم ہوا ہے اور "مجیر معظم" کی تصنیف و تسوید ۱۳۰۳ھ میں ہوئی مگر نظر ثانی، کچھ مضامین کا اضافہ اور تکمیل ۲۸ ر ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ جمعہ کو بعد نماز جمعہ ہوئی۔ ملاحظہ ہو مجیر معظم کا دیباچہ اور اختتام۔ مجیر معظم میں بھی یہ اعتراض و جواب قدرے تفصیل سے مرقوم ہے مگر مذکور الصدر قلمی مضمون میں ایک بحث زیادہ ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ یہ مضمون بھی یہاں شریک اشاعت کردیا جائے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ماہنامہ اشرفیہ (مارچ ۱۹۷۸ء) کے بعد یہ مضمون

(۱) تاب منظم ترجمہ اکسیر اعظم و مجیر معظم، رضا اکیڈمی ممبئی، دسمبر ۲۰۱۲ء، ص: ۱۹۳- ۲۰۸

دوبارہ کہیں شائع بھی نہ ہوا۔ تقریباً ۳۵ سال گزر چکے۔ اس مضمون سے پہلے اس کا خلاصہ میں نے لکھا ہے۔ پھر ایک نوٹ ہے۔ پھر اصل مضمون اور ترجمہ ہے۔ نوٹ یہ لکھا تھا:

"امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مضمون ان کی مملوکہ رد المحتار للعلامۃ الشامی جلد اول کے اخیر میں منسلک اوراق پر خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے قلم فیض رقم کی تحریر خاص سے میں نے مولانا عبد المبین نعمانی کے ساتھ ۶ ر ربیع النور ۱۳۹۸ھ کو بریلی شریف میں نقل کیا ہے۔ فارسی مضمون اعلیٰ حضرت کا ہے اور توضیحی ترجمہ میں نے کردیا ہے۔ فارسی داں حضرات اصل فارسی سے لطف اندوز ہوں اور ترجمہ میں اگر کوئی خامی ہو تو مطلع فرماکر ممنون بنائیں ورنہ اپنے تاثر سے ضرور نوازیں۔

محمد احمد اعظمی مصباحی

دار العلوم ندائے حق، جلال پور، فیض آباد، یوپی

۱۷ ر ربیع النور ۱۳۹۸ھ / ۲۵ ر فروری ۱۹۷۸ء

اب یہاں بھی پہلے خلاصہ تحریر کیا جارہا ہے، پھر فارسی مضمون، بعدہ ترجمۂ مذکور۔ عنوان وہی ہے جو سابقہ اشاعت میں رکھا گیا تھا۔

محمد احمد مصباحی

۲۷ ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ / ۱۲ ر دسمبر ۲۰۱۲ء - چہار شنبہ

خلاصۂ مضمون:

حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بربنائے امر فرمایا تھا: "میرا یہ قدم خدا کے ہر ولی کی گردن پر ہے۔" بعض حضرات نے کہا اس عموم میں اگلے پچھلے تمام اولیائے کرام شامل نہیں۔ اس لیے کہ اگلے اولیا میں صحابۂ کرام بھی ہیں جن کی افضلیت سب پر مسلّم ہے، اور متاخرین میں سیدنا امام مہدی ہیں جن کے متعلق حضور کی بشارت ہے۔ لہٰذا ارشادِ مذکور کا مطلب یہ ہے کہ صرف زمانۂ غوثیت کے ہر ولی کی گردن پر قدم غوث ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اس شبہہ کا زیر نظر مضمون میں اعلیٰ حضرت قُدِّسَ سِرُّہٗ نے جواب دیا ہے۔ حاصلِ جواب یہ ہے:

(۱) تخصیص بلا ضرورت نہیں کی جاتی، اور کی جاتی ہے تو بقدر ضرورت۔

(۲) عرفاً لفظ اولیا کا اطلاق غیرِ صحابہ و تابعین پر ہوتا ہے، لہٰذا فرمانِ غوثیت "کل ولی اللہ" کے زیرِ اطلاق وہ نہیں آئیں گے کہ حاجتِ تخصیص ہو۔

(۳) کسی کی افضلیت دلیلِ سمعی سے ثابت ہوتی ہے۔ سیدنا امام مہدی کی تفضیل پر جب کوئی دلیل نہیں تو ان کی افضلیت کا دعویٰ بے جا ہے۔

(۴) محض بشارتِ آمد، دلیلِ افضلیت نہیں ورنہ بشارت حضور غوث پاک کے لیے بھی ہے۔

(۵) اور مفصل بشارت ہونی بھی افضلیت کی مقتضی نہیں، ورنہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اُن ہزاروں صحابہ کرام سے افضل ماننا پڑے گا جن کے متعلق کوئی تفصیلی بشارت مسموع نہیں۔

(۶) امام مہدی کا خلیفۃ اللہ ہونا بھی اُن کی افضلیت کا مقتضی نہیں۔ کیوں کہ یہ خلافت الٰہیہ براہ راست تو ہے نہیں، بوسائط ہے۔ یہ سرکار غوثیت کو بھی حاصل ہے۔

(۷) سرکار غوثیت کے بعد امام مہدی کا زمانہ ہوگا اور بازار، بازارِ سیدنا مہدی ہوگا۔ یہ بات بھی افضلیتِ امام مہدی کا سبب نہیں ہو سکتی، کہ یوں انتقالِ نیابت کا سلسلہ تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے صدیق اکبر، ان سے بالترتیب خلفاے مابعد تک جاری ہے، جو موٴخر کے مقدم سے افضل ہونے کا سبب ہرگز نہیں، پھر یہی بات یہاں افضلیتِ سیدنا امام مہدی کا سبب کیوں کر ہوگی۔

(۸) برسبیلِ تنزل اگر مان لیا جائے کہ سیدنا امام مہدی کی افضلیت ثابت ہے، اور لفظ اولیا کا اطلاق صحابہ و تابعین کے لیے عام ہے، اور اس بنا پر ارشادِ غوث اعظم میں تخصیص کی جائے، تو صرف بقدر ضرورت تخصیص کی جائے گی، اور کہا جائے گا کہ سرکارِ غوثیت مآب کے ارشاد مذکور سے صحابہ و تابعین اور سیدنا امام مہدی مستثنیٰ کیے جائیں گے۔ نہ یہ کہ تخصیص کا دائرہ اتنا عام کر دیا جائے کہ تمام اولیاے متقدمین و متاخرین کو محیط ہو جائے، اور حضور غوث اعظم کا فرمان صرف ان کے اہل زمانہ کے لیے محدود کر دیا جائے۔ اس لیے کہ قاعدہ یہ ہے کہ ضرورت کے تقاضے پر اگر کہیں تخصیص کی جائے تو بس بہ قدر ضرورت اور اُس سے زیادہ تجاوز ناروا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی اصل............فارسی تحریر کی نقل

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قول قائل کہ واجب است تخصیص ارشاد ہدایت بنیاد "قدمي هٰذه على رقبة كُل ولي الله" بَاولیاے ہماں زمان برکت نشان، و روا نیست تعمیمش ہمہ اولیاے متقدمین و متاخرین را۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ زیرا کہ در متقدمین صحابہ اند۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم۔ و تفضيلهم على جميع أولياء الأمة مقطوع به. و در متاخرین حضرت سیدنا امام مہدی است کہ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم از قدومش خبر دادہ، و اورا خلیفۃ اللہ نام نہادہ۔ هذا ملخص ما قال ذلك القائل.

أقول و بالله التوفيق: اجماع دارند آناں کہ باتفاق ایشاں اجماع قاطع انعقاد یابد کہ حملِ کلام بر ظاہرش

واجب است۔ ما لم يَصْرِف عنه صارف. و تاویل بے دلیل اعتبار را نشاید، ورنہ امان مرتفع شود از جملہ نصوص، و عمومات بالخصوص۔ و آں چہ بقدرِ ضرورت ثابت شود ہم بقدر ضرورت مقتصر ماند، و تعدیۂ او بماعداے او تعدی است۔ و تخصیصات عقلیہ و عرفیہ و کذا ہر تخصیصے کہ مرتکز در اذہان باشد تا آں کہ حاجت بابانتِ او ز نہار نیفتد از عدادِ تخصیص خارج است۔ حتی کہ عام را از درجہ قطعیت فرو نیارد۔ و كل ذلك مبرهن عليه في الأصول.

إذا ثبت ذلك فنقول: آں چناں کہ ہنگامِ ذکر تفاضلِ اتمیاں فیما بینہم حضرات عالیہ انبیاء اللہ علیہم افضل الصلاۃ والسلام بے تخصیص مخصوص اند ہم چناں وقتِ ابانتِ تفاوتِ اولیاء اللہ در درجات خود با حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان بے استثنا مستثنیٰ باشند، لِمَا ارتكز في عقائد المؤمنين أنهم أفضل الأمة جميعًا، و لا يقاس بهم أحد ممن بعدهم. بلکہ در رنگ ہمیں اکابر اند خیارِ تابعین، قدست اسرارہم لاشتہار قولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم.

و قطع می کند شغب را آں چہ افادہ کرد حضرت شیخ شیوخ علماء الہند شیخ محقق مولانا عبد الحق دہلوی أفاض الله علينا من بركاته، و نفعنا في الدارين بعلومه و إفاداته، کہ عرفاً لفظ اولیاء اللہ و ہم چناں عرفا، و واصلین، و سالکین، و مشائخ، بر ماوراے صحابہ و تابعین اطلاق کردہ آید، بارہا شنیدہ باشی کہ "چنیں و چناں ست مذہبِ صحابہ و تابعین و اولیاے امت و علماے ملت۔" اگرچہ صحابہ و تابعین خود اولیا و علما بلکہ ساداتِ ایناں بودند۔ بالجملہ بمادۂ صحابہ کرام تعمیمِ ایں ارشاد واجب الانقیاد را عزمِ شکستن ہوسے خام بیش نیست۔

و أما حديث سيدنا إمام مهدى جعلنا الله ممن والاه. آمين. أقول، وربي يغفر لي: بحثِ تفضیل سمعی است، عقلِ مجرد را بداں راہ نیست فإن المدار مزية القرب، والعقل لا يهتدي إلى إدراكه من دون مدرك من السمع. و ہیچ دلیلے قائم نشدہ بر تفضیلِ سیدنا الامام بر حضرت سیدنا الغوث رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ و مَن ادّعىٰ فعليه البيان.

واما آں کہ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقدومش بشارت فرمود، اقول: بقدومِ حضرت غوث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نیز بشارت دادہ است، إذ قال في الحديث الصحيح لسيدنا علي المرتضىٰ و سيدتنا البتول الزهراء كرم الله تعالىٰ وجههما: أخرج منكما كثيرًا طيبًا.

شاید مراد آں ست کہ ایں جا بہ تخصیصِ نام و تفصیلِ احوال مژدہ دادہ اند۔ أقول ایں ہم موجب تفضیل مبشَّر بہ بر غیر او نیست۔ در کتب سابقہ بشارت آمدہ است بخلافت حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع ذکرِ دیگر مناقب او، کما روی کعب الأحبار، و ایں معنی ہرگز موجب تفضیلش نباشد بر ہزاراں صحابہ کرام از مہاجرین و انصار کہ ذکرِ نام و نشانِ ایشاں بالتخصیص ہیچ گاہ از کتب سابقہ مسموع نیست۔

واما آں کہ حضرت امام رضي الله تعالیٰ عنہ خلیفۃ اللہ باشد: اقول: سمعاً و طاعۃً! اما ایں خلافت بوسائط کثیرہ است نہ اَصالۃً کہ ہیچ فردے از افراد انسان را ایں شرف نیست، جز حضرات انبیا و مرسلین علیہم الصلوات من رب العٰلمین، ایشانند خلفاے مستقل، و مَن عَدَاہم خلفاے ایشاں۔ پس خلیفۃ اللہ الاکبر سید العٰلمین است۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین۔ و خلفایش ظاہرًا و باطنًا ابوبکر ثم عمر ثم عثمان ثم علي رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، و حضرت مہدی کہ خلیفہ باشد در حقیقت خلیفہ علي مرتضی است رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

بلکہ از محاوراتِ صحابہ کرام معلوم است کہ خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمیں جناب صدیق اکبر را گفتند رضي الله تعالیٰ عنہ۔ چوں فاروق اعظم بر کرسی زعامت جلوہ کرد خواستند کہ او را خلیفۃُ خلیفۃِ رسولِ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گویند، حضرت فاروق ایں تطویل را مکروہ داشت کہ مرا خلیفہٗ خلیفہ گویند و آں را کہ پس از من آید خلیفۃُ خلیفۃِ خلیفۃِ رسولِ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، و ہکذا پس لقبِ "امیر المؤمنین" وضع فرمود۔ بالجملہ خلافت الٰہیہ حضرت مہدی را نیست الا بوسائط، و بایں معنی جناب غوثیت مآب را نیز نقد وقت است۔ کما لا یخفیٰ۔

واما آں کہ امر بدست حضرت غوث اعظم تا ظہور پر نور حضرت مہدی است رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ باز بازار، بازار مہدی باشد۔ اقول ہم چنیں ایں منصب منتقل شدہ آمدہ است از حضرت رسالت علیہ افضل الصلوۃ والتحیۃ بحضرت صدیق، و از صدیق بفاروق، و از و بعثمان، و از و بعلی مرتضیٰ، و از و بامام حسن، و از و بامام حسین باز امام زین العابدین بترتیب تا حضرت عسکری، و بدست او بود تا ظہورِ حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ اگر ایں انتقال موجبِ تفضیلِ منتقل الیہ باشد ببیں کہ سخن تا بکجامی رسد۔ چہ بلاے جاہلی باشد کہ ایں انتقال را، انتقال سلب و عزل داند۔ و لا حول ولا قوۃ إلا باللہ العلي العظیم. و چوں ایں چنیں نیست تفضیل از کجا؟ من فقیر نمی گویم کہ مفضولیت حضرت مہدی مقطوع بہ است۔ اما می گویم و سپید می گویم کہ تفضیلش بر حضرت غوثیت معلوم نیست، پس چگونہ نقض کردہ شود بداں بر کلیتِ ارشادِ مذکور۔

و بعدَ اللتیّا والّتی، غایت ما في الباب آنست کہ ما نحن فیہ عام مخصوص منہ البعض باشد، پس زنہار تخصیص نکردہ شود از و مگر افرادے کہ دلیل بر تخصیصِ آنہا قیام پذیرد۔ و در باقي بر عمومِ خود جاری ماند۔ کما ہو القاعدۃ المعروفۃ. نہ آں کہ ازیں تخصیصات قلیلہ پناہ جستن را تخصیصے عظیم از پیش خود بے اقتضاے دلیلے بکار برند۔ فالحقّ الحملُ علی الظاہر، والإجراء علی العموم، إلاّ ما خُصَّ بدلیل، و العلم بالصواب عند الملك الجلیل. و صلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ و أصحابہ أجمعین.

کتبہ عبدہ المذنب أحمد رضا عفي عنہ بمحمد المُصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم.

[شب بستم (۲۰) ماہ رمضان المبارک لیلۃ السبت، ۱۳۰۲ہجریہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ۔ آمین۔]

فارسی تحریر کا اردو ترجمہ.............. از: محمد احمد مصباحی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد "قدمی ھذہ علی رقبۃ کلِّ وليِّ اللہ" (میرا یہ قدم خدا کے ہر ولی کی گردن پر ہے) کے متعلق قائل کا کہنا کہ اس ارشادِ ہدایت بنیاد کو صرف اُسی زمانۂ مبارک کے اولیا کے ساتھ خاص کرنا ضروری ہے۔ اور ارشاد عالی کے معنی یہ ہیں کہ "میرے زمانہ کے ہر ولی کی گردن پر میرا قدم ہے"۔ اس ارشاد کو تمام اولیاے متقدمین و متاخرین کے لیے عام کرنا جائز نہیں اور یہ معنی لینا درست نہیں کہ " اولیاے متقدمین و متاخرین میں سے ہر ایک کی گردن پر میرا قدم ہے"۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ اس لیے کہ متقدمین میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ اور تمام اولیاے امت پر ان کی تفضیل (انھیں سب سے افضل قرار دیا جانا) قطعی طور پر ثابت ہے۔ اور متاخرین میں حضرت سیدنا امام مہدی ہیں جن کی تشریف آوری کی خبر مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دی، اور انھیں "خلیفۃ اللہ" کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ یہ اُن ساری باتوں کا خلاصہ ہے جو اُس قائل نے کہیں۔

جواب:

أقول و باللہ التوفیق. میں کہتا ہوں اور خدا ہی کی طرف سے توفیق ہے۔

تمہیدی مقدمے:

(۱) وہ تمام حضرات جن کے اتفاق سے اجماع قطعی منعقد ہوتا ہے اس مسئلہ پر اجماع رکھتے ہیں کہ "کلام کو اس کے ظاہر پر محمول کرنا ضروری ہے جب تک ظاہر سے پھیرنے والی کوئی دلیل نہ ہو۔"

(۲) اور تاویل بے دلیل قابل اعتبار نہیں، ورنہ تمام نصوص اور خصوصاً عموم رکھنے والے اقوال سے امان اٹھ جائے، کیوں کہ بے دلیل تاویل تو ہر نص میں ہو سکتی ہے، اور اسی طرح ہر عام کو خاص کر دینا ممکن ہے۔

(۳) وہ تخصیص جو ضرورۃً ثابت ہو بس قدرِ ضرورت تک محدود رہے گی، اُسے جاے ضرورت سے آگے بڑھانا، حد سے تجاوز اور تعدی ہے۔

(۴) عقلی و عرفی تخصیصات اور ایسے ہی ہر وہ تخصیص جو اس حد تک ذہنوں میں جمی ہو کہ اس کے اظہار و بیان کی قطعاً حاجت نہ ہو یہ سب شمارۂ تخصیص سے خارج ہوں گی، یہاں تک کہ (وہ عام جس سے کوئی فرد خاص نہ کیا گیا ہو قطعی ہوتا ہے، اور جس عام سے تخصیص کر دی گئی ہو ظنی ہو جاتا ہے، مگر) ایسی بے ضرورت تخصیص عام غیر مخصوص منہ البعض کو (عام مخصوص منہ البعض بنا کر) درجۂ قطعیت سے نیچے (مرتبۂ ظنیت میں) اتارنے کے قابل ہرگز نہ ہوگی۔ ان تمام باتوں پر فن اصول میں برہان قائم ہو چکی ہے۔

تخصیص صحابہ کی بحث:

جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں جس طرح امتیوں کے باہم ایک دوسرے سے افضل ہونے کا ذکر ہو تو انبیاے کرام علیہم السلام بے تخصیص مخصوص ہوں گے (اور کسی امتی کے سب سے افضل ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دوسرے امتیوں سے افضل ہے، نہ یہ کہ حضرات انبیا سے بھی افضل ہے۔) اسی طرح جب اولیاء اللہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے باہمی درجات کے تفاوت کا بیان ہو تو حضراتِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بے استثنا مستثنیٰ رہیں گے۔ (اور کسی ولی کی افضلیت کا یہی مطلب ہوگا کہ وہ دوسرے تمام اولیا سے افضل ہے، نہ یہ کہ صحابۂ کرام سے بھی افضل ہے۔) اس لیے کہ مؤمنین کے عقیدے میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ صحابہ کرام تمام امت سے افضل ہیں، اور ان کے بعد کے کسی شخص کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان ہی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے رنگ میں خیارِ تابعین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بھی مستثنیٰ رہیں گے اس لیے کہ حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم کا یہ ارشاد مشہور ہے کہ سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو میرے زمانے والوں سے متصل ہیں پھر وہ جو اُن سے متصل ہیں۔

اور سارا جھگڑا اُس سے ختم ہو جاتا ہے جو علماے ہند کے شیخ الشیوخ، شیخ محقق مولانا عبد الحق دہلوی علیہ الرحمہ نے افادہ فرمایا۔ اللہ ہم پر ان کی برکتوں کا فیضان عام کرے، اور ان کے علوم و افادات سے ہمیں دونوں جہان میں نفع بخشے۔ (شیخ محقق کا افادہ یہ ہے) کہ "عرفاً لفظِ "اولیاء اللہ" اسی طرح عُرفا، واصلین، سالکین اور مشائخ کے الفاظ کا اطلاق صحابہ و تابعین کے علاوہ بزرگوں پر ہوتا ہے۔ بارہا سنا ہوگا کہ یہ ہے اور وہ ہے صحابہ اور تابعین اور اولیاے امت اور علماے ملت کا مذہب۔ اگر چہ صحابہ و تابعین خود اولیا و علما بلکہ علما و اولیا کے سردار تھے۔"

حاصل بحث یہ کہ جب عرفاً اولیا کا اطلاق صحابہ و تابعین پر نہیں ہوتا تو لفظ "کل ولی اللہ" سے ان حضرات کو خاص کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ لہٰذا حضرات صحابہ کا ذکر کر کے حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کی تعمیم ختم کرنے کا عزم اور اُس کے عموم کی قطعیت زائل کرنے کا قصد ایک "ہوسِ خام" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

تخصیص سیدنا امام مہدی کا جواب:

رہی سیدنا امام مہدی کی بات۔ اللہ تعالیٰ ہم کو انھیں دوست رکھنے والوں میں سے بنائے۔ آمین۔ میں کہتا ہوں اور میرا رب مجھے بخشے:

(۱) کسی کو کسی سے افضل قرار دینے کا معاملہ سمعی، اور کسی نصِ معتبر کے سننے پر موقوف ہے، عقلِ محض کو اس میں دخل نہیں، کیوں کہ افضلیت کا دار و مدار قرب خداوندی کی خصوصیت پر ہے، اور عقل اس کے ادراک سے قاصر ہے، جب تک کسی دلیل سمعی کا سہارا نہ ہو۔ اور سیدنا امام مہدی کے سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے

افضل ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ جو ثبوتِ دلیل کا مدعی ہو دلیل پیش کرے۔ اور جب دلیل نہیں تو افضلیت کا ثبوت بھی نہیں۔

(۲) اور یہ بات کہ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آمدِ سیدنا امام مہدی کی بشارت دی تو میں کہتا ہوں، آمدِ حضرت غوث رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بھی بشارت دی ہے۔ حدیث صحیح میں ہے: سیدنا علی مرتضی اور سیدتنا بتولِ زہرا کرم اللہ تعالیٰ وجہہما سے فرمایا: تم دونوں سے بہت سی طیب و پاکیزہ اولاد پیدا فرمائے گا۔ حضور غوث اعظم بھی ان کی اولادِ طیبہ میں ہیں، لہٰذا یہ بشارت انھیں بھی شامل ہوگی۔

(۳) شاید قائل کی مراد یہ ہے کہ سیدنا امام مہدی کے نام کی تخصیص اور حالات کی تفصیل کے ساتھ سرکار نے بشارت دی ہے۔ اور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں تفصیلی بشارت نہیں، تو میں کہتا ہوں: بشارتِ تفصیلی بھی مبشَّر بہ (جس کے بارے میں بشارت دی گئی ہے اُس) کو دوسروں سے افضل قرار دینے کی موجب نہیں۔ پہلے کی آسمانی کتابوں میں حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خلافت سے متعلق اُن کے دوسرے فضائل و مناقب کے ذکر کے ساتھ بشارت آئی ہے جیسا کہ کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ مگر یہ تفصیلی بشارت ہرگز سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ہزاروں اُن مہاجرین و انصار صحابہ کرام سے افضل قرار دینے کا باعث نہیں جن کا تذکرہ کتب سابقہ میں کسی جگہ بھی اُن کے نام و نشان کی خصوصیت کے ساتھ سننے میں نہیں آیا۔

(۴) رہی یہ بات کہ سیدنا امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۃ اللہ ہوں گے۔

اقول: - بسر و چشم - مگر یہ خلافت الٰہیہ بہت واسطوں کے توسط سے ہوگی براہِ راست نہ ہوگی، کہ افراد انسان میں سے کسی کو یہ شرف حاصل نہیں، سوائے حضرات انبیا و مرسلین علیہم الصلوات والسلام کے۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے خلیفہ براہ راست ہیں، اور اُن کے علاوہ حضرات ان ہی کے خلیفہ ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ اکبر سید العٰلمین ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔ اور اُن کے خلفاے ظاہری و باطنی ابوبکر پھر عمر، پھر عثمان پھر علی ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

اور حضرت مہدی جو خلیفہ ہوں گے وہ در حقیقت حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ ہیں — بلکہ صحابہ کرام کے محاورات سے معلوم ہے کہ "خلیفۂ رسول اللہ" صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صرف جناب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کہتے۔ جب فاروق اعظم کرسی قیادت پر جلوہ گر ہوئے تو صحابہ نے چاہا کہ انھیں خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہیں۔ حضرت فاروق نے یہ تطویل ناپسند کی کہ مجھ کو خلیفۂ خلیفہ کہیں، میرے بعد والے کو خلیفہ کے خلیفہ کا خلیفہ" پھر اسی طرح بعد میں آنے والوں کے لیے اضافتوں کا سلسلہ دراز کرتے جائیں،

لہٰذا انھوں نے "امیر المؤمنین" کا لقب وضع فرمایا۔

مختصر یہ کہ خلافت الٰہیہ حضرت مہدی کو ہے، مگر براہ راست نہیں بلکہ بوسائط۔ اور اس معنی میں تو جناب غوثیت مآب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی خلافت حاصل ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں۔

اور یہ بات کہ امر خلافت حضور غوث اعظم کے لیے حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ظہور پر نور تک ہے پھر حضرت مہدی کا سکّہ رائج ہوگا اور بازار، بازار سیدنا مہدی ہوگا۔

اقول: اسی طرح یہ منصب منتقل ہوتا آیا ہے حضرت رسالت علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیۃ سے حضرت صدیق تک، صدیق سے فاروق تک، اُن سے عثمان، ان سے علی مرتضی، اُن سے امام حسن، ان سے امام حسین تک پھر امام زین العابدین سے بترتیب حضرت عسکری تک، اور ان کے ہاتھ میں یہ منصب سیدنا غوث اعظم کے ظہور تک تھا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم - اگر یہ انتقال امر خلافت، منتقل الیہ (جس کے پاس منتقل ہوکر آیا ہے اُس) کو افضل قرار دینے کا سبب ہو تو دیکھو بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ جہالت عجیب بلا ہے کہ قائل خلافت ونیابت کے اس طرح منتقل ہونے کو یہ سمجھتا ہے کہ ایک سے خلافت سلب ہو جائے گی، اور اُسے معزول کر دیا جائے گا پھر دوسرے کی طرف یہ خلافت منتقل ہوگی، جس سے یہ گمان کر لیا کہ یقیناً بعد والا خلیفہ معزول شدہ خلیفہ سے افضل ہوگا. ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم. اور جب ایسا نہیں تو تفضیل کہاں؟

فقیر یہ نہیں کہتا کہ حضرت مہدی کا مفضول ہونا قطعی ہے، لیکن میں یہ کہتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ حضرت غوثیت پر اُن کی تفضیل معلوم نہیں۔ تو ان کا نام پیش کر کے حضور غوث پاک کے ارشاد مذکور (میرا یہ قدم خدا کے ہر ولی کی گردن پر ہے) کی کلیت پر کیوں کر نقض واعتراض وارد کیا جا سکتا ہے۔

ساری چنیں و چناں کے بعد آخری بات بس یہ کہی جا سکتی ہے کہ ارشاد مذکور عام مخصوص منہ البعض ہے (یعنی ایسا عام ہے جس سے بعض افراد خاص کر دیے گئے ہیں) تو اُس سے صرف اُن ہی افراد کو خاص کیا جائے گا جن کی تخصیص پر دلیل قائم ہو، اور دوسرے سارے افراد میں یہ ارشاد گرامی اپنے عموم پر جاری رہے گا۔ جیسا کہ قاعدہ معروفہ ہے، نہ یہ کہ ان معمولی تخصیصات کی پناہ لینے کو خود اپنی طرف سے ایک عظیم تخصیص کر ڈالیں جس کی بنیاد ہرگز کسی دلیل پر قائم نہیں۔ پس حق یہ ہے کہ کلام کو ظاہر پر محمول رکھیں، اور عموم پر جاری کریں، ہاں اگر تخصیص کریں تو صرف اس کی جو کسی دلیل سے مخصوص ہو۔ و العلم بالصواب عند الملك الجليل و صلى الله تعالى على سيدنا و مولانا محمد و آله و أصحابه أجمعين .

[تحریر امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ بتاریخ ۲۰؍ رمضان المبارک شب شنبہ ۱۳۰۲ھ]

❁❁❁

باب دوم

فکری و اصلاحی مضامین

اہل سنت کی تصنیفی خدمات[1]

اس موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور نجی محفلوں میں بھی اس پر گرما گرم بحثیں ہوتی رہتی ہیں، جن کا حاصل زیادہ تر منفی خیالات اور ماتم و مرثیہ کی طرف جاتا ہے۔ میرے خیال میں اولاً تو یہ حالات کا غائرانہ اور منصفانہ جائزہ نہیں۔ ثانیاً جہاں تک کمی ہے، اس کا حل یہ نہیں کہ صرف ماتم و مرثیہ سے زبان و قلم کو آلودہ کرکے، تسلی کرلی جائے۔ ایک دوسرے کو مجرم قرار دیا جائے اور خود کو بالکل بری الذمہ اور بے قصور تصور کیا جائے۔ اگر تھوڑا بہت اپنے قصور کا اعتراف بھی دبے لفظوں میں ہو تو عملی سرگرمی اور مثبت اقدامات سے دوری ہی برقرار رکھی جائے۔

یہ تو اپنے احباب اور بزرگوں کے ملک گیر تاثرات بتاتے ہوئے ان پر ضروری ریمارک میں نے لگا دیے، خود راقم السطور کے خیالات اس باب میں کافی تحلیل و تجزیہ اور بسط و تفصیل کے متقاضی ہیں۔ لیکن اپنی عدیم الفرصتی اور سامعین و قارئین کے قیمتی وقت کا لحاظ کرتے ہوئے چند اجمالی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ میرے پورے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے علما نے کام بے پناہ کیا ہے اور مسلسل سرگرم جہد و عمل رہے ہیں۔ جن کی تفصیل کتابی شکل میں منظر عام پر آچکی ہے، لیکن ضروریات اور وقت کے تقاضے کسی ایک حد پر رکنے والے نہیں، اس لیے یہ سلسلۂ عمل، ترقی کے ساتھ جاری رہنا ضروری ہے اور کسی کوتاہی کا علاج شکوہ و شکایت نہیں، بلکہ ٹھوس، منصوبہ بند، مثبت اور تعمیری اقدامات ہیں۔ اب اس تلخیص کی قدرے تفصیل ملاحظہ ہو:

اس میں شک نہیں کہ امام احمد رضا قدس سرہ نے ہر فن میں یادگار تصانیف چھوڑی ہیں خصوصاً فقہ حنفی میں انھوں نے اور ان کے جلیل القدر خلیفہ صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ والرضوان نے ہماری جماعت کو اس منزل پر پہنچا دیا ہے کہ آج دنیا کا کوئی طبقہ ہمارے فقہی سرمایے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ امام احمد رضا قدس سرہ سے قبل علامہ فضل حق خیر آبادی، علامہ فضل رسول بدایونی، بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی و دیگر علمائے فرنگی محل، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا سلامت اللہ رام پوری، مولانا نجم الغنی رام پوری، مولانا سید عبد اللہ محدث دکن، مولانا انوار اللہ حیدر آبادی، مولانا وصی احمد محدث سورتی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مبلغ اسلام مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی، مولانا سید سلیمان اشرف بہاری، مولانا ظفر الدین بہاری وغیرہم علمائے اہل سنت قدست

(۱) ماہ نامہ حجاز جدید، دہلی، شمارہ دسمبر ۱۹۸۹ء

اسرار ہم نے تفسیر، حدیث، سیرت، تاریخ، منطق و فلسفہ، تاریخ ادیان و مذاہب، رد فرق جدیدہ، طب یونانی وغیرہا مختلف علوم و فنون میں اہم اور گراں قدر عربی، فارسی، اردو تصانیف کا ذخیرہ پیش کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر حضرات درجنوں سے زائد کتابوں کے تنہا مصنف ہیں اور ان کی بہت سی کتابوں کی اشاعت اور ان کی پذیرائی بھی ہوئی ہے۔

ان کی جلیل القدر خدمات کا انکار تو انکار ہے ان کے تذکرے سے تغافل بھی نہ صرف یہ کہ اپنے اسلاف کی احسان فراموشی اور ظلم و ناانصافی ہے، بلکہ اپنی جماعت کی بھی کردارکشی اور ضرر رسانی ہے۔

حال کی خدمات میں بھی مفتی احمد یار خاں نعیمی کی تصانیف، خصوصاً شرح مشکوۃ، تفسیر نعیمی، اسی طرح علمائے اہل سنت کے حالیہ تراجم صحاح ستہ اور شروح حدیث مثلاً تفہیم البخاری، نزہۃ القاری، سیرت میں شفا شریف، مدارج النبوۃ، تصوف میں غنیۃ الطالبین، مکاشفۃ القلوب وغیرہ کے ترجمے اور دوسرے مختلف موضوعات و علوم پر بے شمار کتابوں کو نظر انداز کرنا اور بالکل منفی و مکروہ پروپیگنڈہ جاری رکھنا اپنے علما کی خدمات کی ناقدری کے ساتھ اپنی جماعت کی بھی تحقیر ہے۔ جب کہ ہماری حریف جماعتیں نہایت منظم طور سے دو کام بڑے شد و مد سے انجام دے رہی ہیں۔

ایک تو عام طبقوں کو یہ باور کرانا کہ جو کچھ کیا ہے ہم نے کیا ہے اور اسلامی ہند کی علمی و سیاسی ترقی میں سارا کردار صرف ہمارا ہے۔ دوسرے یہ یقین دلانا کہ بریلوی جماعت محض جاہلوں کی جماعت ہے اور تصنیفی و تحقیقی میدان میں اس کی خدمات صفر کے درجے میں ہے اور جماعت ایسی ہے تو اس کا عقیدہ بھی ویسا ہی ہوگا۔

حالاں کہ ان کا وسیع النظر حلقہ ہمارے علما کی اعلیٰ قابلیت و استعداد اور ان کی خدمات سے اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن ان کی یہ منظم سازش ہے کہ اہل حق کی ہر آواز کو دبادو، ان کی ہر قد آور شخصیت اور اس کی خدمات کو دفن کردو۔

ایسے ماحول میں سنی مقررین، مدرسین، طلبہ، شعرا، مصنفین، ناشرین اور سارے ارباب دانش کا فرض اور اہم فرض تو یہ تھا کہ تقریر و تحریر ہی نہیں بلکہ نجی مجلسوں، درس گاہوں بلکہ تفریحوں میں بھی اپنے علما اور اپنی جماعت کی خدمات کو زیادہ سے زیادہ متعارف بھی کرائیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے متعلقین کو بھی چلانے کی کوشش کریں۔ عام تعارف کے سلسلے میں ہمارے مقررین کا طبقہ سب سے اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ کاش وہ اس طرف متوجہ ہو۔

یہ عہد حاضر کے قابل ذکر دانشوران اہل سنت کا کتنا بڑا ظلم یا کتنا عظیم سہو اور تغافل ہے کہ ان کی تقریریں اور تحریریں ہمارے جماعتی مخالفین بلکہ ہٹ دھرم معاندین کے لیے ہماری کردارکشی کا خاصا مواد فراہم کر رہی ہیں۔ اپنے سنی نوجوانوں کے جذبات کی لو تیز کرنے اور سرگرم عمل بنانے کے لیے علمائے حق اور جماعت اہل سنت کو غلط طور پر ناکارہ اور اپاہج دکھانے کے علاوہ بھی ہزاروں تدبیریں ہو سکتی ہیں۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ کام کا وسیع میدان ابھی خالی پڑا ہے، اگرچہ اب تک بے پناہ کام انفرادی طور پر ہر دور

میں ہوتا رہا ہے۔ جو کچھ کمی رہ گئی اور آئندہ جو سرگرمی ہونی چاہیے اس باب میں چار باتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

(۱) بدمذہبی کا تباہ کن سیلاب برصغیر میں تقریر و تحریر، تحقیق و تصنیف، سیر و تفریح، (چلت پھرت) اور مجلسی ورک ہر شکل میں اہل حق کی آبادیوں کی طرف بڑی تیزی سے بڑھا اور پھیلا، ہمارے حریفوں نے جارحانہ اور عریاں طور بھی سنی عوام کو شکار کیا اور مستشرقین یورپ سے سیکھ سیکھ کر دو نمبر کی راہ سے بھی ہمارے تعلیم یافتہ اور سادہ لوح طبقہ کو بری طرح بہکانے کی کوشش کی۔ پہلے اپنے کسی غیر اختلافی کام سے انھیں متاثر کیا۔ پھر اپنی شخصیت کے ساتھ اپنا عقیدہ بھی ان کے ذہن میں اتار دیا۔ اور بھی طرح طرح کے حربے ان کے پاس ہیں جو اہل نظر سے مخفی نہ ہوں گے۔

ایسے بھیانک ماحول میں علمـــاے حق کو نہ تو تنظیم کا موقع ملا نہ ان کی طرح اپنی شخصیت، پھر اپنا عقیـــدہ منوانے کی مہلت ہاتھ آئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نئی جماعت اور تحریک میں اسپرٹ اور تنظیم زیادہ ہوتی ہے۔ جب کہ قدیم جماعت کے بہت سے افراد سرد جذبات اور اس کے نتیجے میں انتشار و بد نظمی کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ ہماری جماعتی زندگی تھی کہ جماعت کو باطل کے حملوں سے بچانے کے لیے جو جہاں تھا وہیں سرگرم عمل ہو گیا۔ اس وقت علما کا منصبی فریضہ یہی تھا کہ آبادیوں کی طرف بڑھنے والے تیز و تند سیلاب سے قوم کو واشگاف انداز میں فوراً باخبر کریں اور اس کو تباہی و ہلاکت کے غار سے جتنی جلد ہو سکے نکالیں یا بچائیں اور آئندہ محفوظ رکھیں۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ شکار ہونے والی قوم کا غالب طبقہ ناخواندہ یا کم خواندہ تھا جس کے لیے تصانیف کے انبار بے سود ہیں۔ اس لیے تقریر اور زبانی تبلیغ پر ہر طرف زیادہ توانائیاں صرف کی گئیں۔ جب کہ تعلیم یافتہ کی اصلاح و ہدایت اور مقررین و مبلغین سے بھی غافل نہ رہے بلکہ امام احمد رضا قدس سرہ کی تقریباً ساری کوشش اسی حصے پر مرکوز رہی۔

(۲) ان سنگین حالات میں ہوا یہ کہ ان انفرادی خدمات اور برصغیر کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی علمائے حق کی اصلاحی و دعوتی مساعی کو نوٹ کرنے اور ان کا ریکارڈ رکھنے والے افراد بھی خاطر خواہ نہ رہ سکے، بلکہ ہر شخص اسی خدمت میں مصروف ہو گیا جس میں دوسرے مصروف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی اور ناواقف نسل کو ان خدمات سے پورے طور پر روشناسی بھی حاصل نہ ہو سکی۔

حال میں مولانا محمود احمد قادری کی کتاب "تذکرۂ علمائے اہل سنت" مولانا عبد الحکیم شرف قادری کی "تذکرۂ اکابر اہل سنت" ان کے شاگرد مولانا عبد الستار قادری کی "مرآۃ التصانیف" اور متعدد ماہناموں کے شخصیات نمبروں نے اس باب میں اہم کردار ادا کیا۔ مذکورہ اور دوسری تعارفی تصانیف نے شخصیات اور ان کی متنوع خدمات کو اجاگر کیا۔ اور "مرآۃ التصانیف" نے صرف تیرہویں، چودہویں صدی کی تقریباً چھ ہزار تصانیف اہل سنت کا تعارف

کرایا ہے۔ پھر میں اعتراف کرتا ہوں کہ اب بھی کام باقی ہے، لیکن ان اہم کتب کی اشاعت کے باوجود کوئی ان سے تغافل کر کے غیروں کی صدائے بازگشت بننا اپنے اور اپنی جماعت کے لیے سرمایۂ افتخار، باعث وقار اور منفعت بخش سمجھتا ہو تو اتنی بلند فکر اور اتنی اونچی حکمت و مصلحت تک ہمارے فہم قاصر کی رسائی اب تک نہ ہو سکی اور خدا کرے کہ آئندہ بھی نہ ہو سکے۔

(۳) تصنیف، اشاعت، پذیرائی یہ تین چیزیں ہیں اور تینوں میں اتنا گہرا ربط ہے کہ ان میں سے صرف تصنیف پر نظر مرکوز رکھی جائے تو بہت سی دشواریوں کا حل کبھی فراہم ہی نہ ہو سکے گا۔

تصنیف بغیر اشاعت کے اپنا مقصد اور فائدہ کھو بیٹھتی ہے اور اشاعت ہو لیکن قوم اپنے چند سکوں کو اس سے زیادہ محبوب اور قیمتی سمجھتے ہوئے اس کی پذیرائی نہ کرے تو اشاعت بھی بیکار ہو جاتی ہے اور مصنف اور ناشر کی ناقابل عفو حد تک حوصلہ شکنی اور سخت ناقدری ہوتی ہے جب کہ پذیرائی سے اشاعت کو قوت ملتی ہے اور اشاعت سے تصنیف کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

اس تمہید کے بعد خاص بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج دوسروں کی طرح ہمارا عالم، مفکر اور صاحب قلم انسان بھی مختلف معاشی اور خانگی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ دوسرے وہ علمی استحضار اور وہ ایمانی حرارت، وہ بیکراں جذبۂ ایثار و قربانی سے دہکتا ہوا سینہ، وہ فقر و درویشی کا لباس و مسکن اور اس پر قناعت جس سے اسلاف کی بڑی تعداد سرشار نظر آتی ہے آج یہ اوصاف خال خال ہی ملتے ہیں اور ذرا بے احتیاطی سے بولنے کی جسارت کروں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ناپید ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کل کا عالم تدریس، تقریر، تصنیف، بیعت و ارشاد حتیٰ کہ تعویذ نویسی کے ذریعے حاجت روائی سب سے تنہا عہدہ بر آ ہو لیتا اور اپنی معیشت کا انتظام بھی کر لیتا اور آج جس شعبے سے معاش وابستہ ہے وہ تو برابر جاری ہے، لیکن باقی کے لیے فرصت نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ پھر بھی جو کچھ ہو جاتا ہے رب قدیر کے بے پناہ شکر و امتنان اور قوم کی طرف سے خاطر خواہ قدر دانی اور ہمت افزائی کا مستحق ہے۔

اگر تدریس کی طرح تصنیف کا معاملہ بھی ہو تو اس باب میں حیرت انگیز اضافہ بہت جلد سامنے آ سکتا ہے کیوں کہ جماعت پر چودہ سو سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی خدا کا شکر ہے کہ آج ہمارے اندر ارباب علم و فن کا ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جس کے جذبات سرد نہیں اور جس کا خون سفید نہیں ہوا ہے۔ حالات نے ستم ڈھایا ہے تو یہ:

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا کرے کوئی

مختصراً یہ عرض کروں کہ اگر دار التعلیم کی طرح دار التصنیف اور دار الاشاعت وغیرہ بھی ہو اور باضابطہ خدمت لی

جائے تو کام زیادہ بھی ہوگا اور مستحکم و مربوط بھی۔

ایک باصلاحیت قلم کار اپنے کام کے لیے عظیم لائبریری، طباعت کا سرمایہ، اشاعت کے وسائل تنہا کیسے فراہم کر سکتا ہے اور دنیا بھر کے گوناگوں موضوعات سے دس پانچ آدمی مل کر چشم زدن میں کیوں کر عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں؟ ان کی مشکلات کو نظر انداز کر کے تن آسانی اور مفاد پرستی کا الزام لگانا سخت ناانصافی ہے۔ گو بعض افراد پر اس طرح کا علم راس اور منطبق ہو لیکن سارے اسلاف اور موجودہ اصاغر و اکابر پر یہ الزام محدود فکر کی نشانی ہے۔

الحمد للہ! آج بھی ہماری جماعت میں لکھنے والوں کی کمی نہیں اور صرف جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں درجنوں اچھے لکھنے والے ہمیشہ رہتے اور فارغ ہوتے ہیں، دیگر مراکز و مدارس کے فارغین و طلبہ بھی ہرگز اس سے خالی نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے کام بھی ان کی بساط کے مطابق سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن مناسب مواقع نہ ملنے پر ان غریبوں کی صلاحیتوں کا مر جانا بالکل فطری اور لازمی امر ہے۔ جب کہ ان کو باتنخواہ مدرس کی طرح باتنخواہ مصنف بنایا جائے اور ان کے لیے تمام تر سہولتیں فراہم کی جائیں اور خاطر خواہ رہنمائی بھی کی جائے تو وہ چند برسوں میں عالمی موضوعات پر فکر انگیز خیالات سے قوم کو بہرہ ور کر سکتے ہیں۔ آج دو طریقے اپنائے جا سکتے ہیں:

(۱) ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے سیکڑوں مدارس جہاں تعمیر و تعلیم کے لیے ہزاروں جتن کرتے ہیں۔ وہیں ایک بڑی لائبریری پر بھی توجہ دیں اور دو چار اہل قلم کو بھی معقول مشاہرہ پر ایک پروگرام دے کر مقرر کریں، پھر ان کی تصانیف کی طباعت و اشاعت کا بھی شعبہ رکھیں۔

(۲) قوم کا بیش بہا جذبہ تعاون مدارس کے لیے خون فراہم کر سکتا ہے۔ کمی صرف یہ ہے کہ ان کی ضرورت و نزاکت قوم کو بتائی جائے اور اسے ان کی اہمیت و افادیت اور کام کے خالی پڑے ہوئے وسیع میدان سے اچھی طرح باخبر کیا جائے۔ قوم موجودہ اداروں کی بھی مدد کر سکتی ہے اور اس سے آئندہ مزید تصنیفی و اشاعتی ادارے قائم کر کے ان کے لیے بھی تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جو قوم عرس و قوالی، محرم کی سبیلوں، جلسوں اور کانفرنسوں وغیرہ کے لیے پانی کی طرح روپے بہا سکتی ہے وہ لائبریری، دار التصنیف، دار الاشاعت وغیرہ کے لیے بھی بھرپور توانائیاں صرف کر سکتی ہے۔ اس کے جذبات کی اصلاح، قدر دانی اور صحیح رخ پر لگانا ہمارا ہی فریضہ ہے۔

الحاصل مذکورہ دونوں طریقوں سے تفسیر، حدیث، سیرت، تاریخ، جدید فلسفہ و ادب، رد استشراق، رد بد مذہباں وغیرہ سے متعلق ان تمام خانوں کو جن میں خلا نظر آ رہا ہے، جدید تر اور خوب تر انداز میں پُر کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ضرورت و ماحول کے مطابق نئی نصابی کتابیں بھی تیار کی جا سکتی ہیں۔ موجودہ نصاب پر تنقید بجا ہے، لیکن

متداول نصاب بہتر وکامل اگر چاہتے ہیں تو نصاب کے تصنیفی بورڈ کے علاوہ چارۂ کار نہیں۔ کاش! کوئی اسے بھی سوچے۔

تصنیف و اشاعت کے میدان میں "سنی دارالاشاعت مبارک پور" "مرکزی مجلس رضا لاہور" "المجمع الاسلامی مبارک پور" "مکتبۃ الحبیب الہ آباد" "مکتبہ قادریہ لاہور" جیسے قومی سطح کے اداروں کی خدمات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

تجارتی بنیاد پر کام کرنے والے ادارے بھی اگر صبر آزما جذبۂ دینی کو ساتھ رکھیں اور خواص کے لائق ذرا ست رفتاری سے نکلنے والی کتابوں کو بھی نکالنے اور پھیلانے کی سعی مردانہ جاری رکھیں تو بڑا انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ ہم علمی ترقی کا منظر دیکھنے کے مشتاق ہیں خواہ اس کے پیچھے صالح تجارتی جذبہ یا تجارتی و تبلیغی دونوں سے ملا ہوا جذبہ ہی کار فرما ہو۔ بار بار اشاعت سے گزشتہ و موجودہ خدمات کا احیا اور ان کی تجدید از حد ضروری ہے، یہ نہ ہو تو بس خلا ہی خلا دکھائی دے گا۔

(۴) ان سب کے بعد انفرادی و اجتماعی طور پر اشاعتوں کی پذیرائی از حد ضروری ہے، جس کے لیے ہر شخص کو ایک تو اپنی ذاتی لائبریری قائم کرنا اور اپنی جماعت کی تمام نشریات کو بڑی عالی ظرفی اور مثالی حوصلہ افزائی کے ساتھ خریدنا ہوگا۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ قومی لائبریریاں قائم کرنا اور مدرسوں میں کتب خانہ کے اس شعبہ کو بھی فروغ دینا ہوگا۔ عوام کے اندر بھی کتابیں خریدنے، پڑھنے، مکتبے قائم کرنے، اشاعتی مراکز کی فہرستیں حاصل کرنے اور کتابیں منگانے کی تحریک کرنا ہوگا۔ مراسلات سے ناشرین اور مصنفین کی حوصلہ افزائی بھی کرنی ہوگی۔

یہ ماحول برپا ہو جائے تو ماہناموں اور روزناموں کی خاطر خواہ نکاسی اور ان کے لیے خون کی فراہمی بھی کوئی مسئلہ نہ رہ جائے گی اور قوم مصنفین کو بھی مقررین کی طرح خوش حالی و فارغ البالی کے علاوہ فکر و نظر کی جولانیت اور بحث کی دماغ سوز کاوشوں اور گھلا دینے والی محنتوں میں ثبات و استقامت بھی عطا کر سکے گی۔ اس طرح ہمارے اہل قلم کی نگارشات کا میدان زمین سے آسمان پر پہنچ جائے گا اور ہمارا قلم کار اس انداز کی جدت طراز قلمی خدمات بھی انجام دے سکے گا جو مغرب کے فارغ البال اور خوش حال طبقے کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ پھر ہر طرف سے یہ آواز سنائی دے گی:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

لیکن یہ بات کسی لمحہ ذہن سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ اس قسم کا ماحول برپا کرنے کے لیے کوئی آسمان سے نازل نہیں ہوگا، نہ ہی ہمیں دفن کرنے والا مغرب و مشرق ہمیں آگے بڑھانے آئے گا۔ بلکہ ترقی و پیش قدمی کی واحد صورت یہی ہے کہ ہمارا ہر طبقہ اور ہر فرد اپنی اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور ماتم و شکوہ کے بجائے جس طرح بھی ہو سکے گزشتہ و موجودہ ارباب علم و فن اور اصحاب قرطاس و قلم کے کاز کو مربوط و مضبوط اور منظم و مستحکم کرتے ہوئے آگے بڑھانے کی سرگرم کوشش کرے۔ السعی منا والإتمام من الله۔ ❁❁❁

اہل سنت کی شیرازہ بندی ـــــ مسائل اور امکانات[۱]

آج جب ہم اہل سنت کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں بنیادی فکری و اعتقادی اتحاد کے باوجود عالمی یا ملکی یا صوبائی یا ضلعی سطح پر عملاً کوئی باضابطہ ارتباط نظر نہیں آتا۔ یوں اپنی نجی ضروریات اور وقتی کاموں کے لیے لوگ آپس میں رابطہ ضرور رکھتے ہیں مگر جماعتی و اجتماعی انداز میں کوئی باقاعدہ تنظیم کسی میدان میں نہیں۔ نہ کوئی دعوتی و اصلاحی مرکز ہے جس پر سب متفق ہوں، نہ کوئی روحانی قیادت ہے جو سب کا مرجع اور سب پر اثر انداز ہو، نہ کوئی تعلیمی و تربیتی ادارہ ہے جس میں سب کے لیے کشش ہو اور جس کی پیشوائی سب کو قبول ہو، نہ کوئی علمی تحقیقی تصنیفی انجمن ہے جسے قبول عام حاصل ہو، نہ دوسرے سماجی رفاہی قومی میدانوں میں کام کی کوئی اجتماعی ہیئت ہے جو قابل ذکر ہو۔ اور سیاسی میدان تو بالکل خالی ہے، اس میں نہ ہماری کوئی نمائندگی ہے، نہ قومی و ملکی سطح پر ہمارا کوئی نام و نشان۔ یہ پورا وسیع و عریض میدان غیروں کے لیے محفوظ ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ انفرادی طور پر جماعت میں بہت سارا کام ہو رہا ہے اور اسی کی بدولت جماعت کا کارواں کسی طرح رواں دواں ہے لیکن اجتماعیت اور تنظیم کی شان ہی الگ ہے اور اس کے ثمرات و برکات ہمہ گیر اور پائدار ہیں۔

مسائل: اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل سنت و جماعت جن کا وجود عہد رسالت سے آج تک پورے تسلسل کے ساتھ چلا آرہا ہے، یہی ہمیشہ بیرونی و اندرونی سازشوں کا نشانہ بنے۔ خارجی طاقتوں کا نشانہ بھی یہی رہے اور داخلی فتنوں کا شکار بھی یہی ہوئے۔ خلافت راشدہ کے دور اخیر میں خوارج کا گروہ ہمارے ہی درمیان سے نکلا اور خود مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہوا، اس کے بعد بھی ہر دور میں ایک تسلسل کے ساتھ فتنے اٹھتے، فرقے بنتے اور باطل مذاہب بڑھتے رہے۔ اہل سنت کی تعداد گھٹتی رہی، اہل حق کو اکثر ادوار میں بیرونی دشمنوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا اور عوام کو داخلی فتنوں سے بچانے کے لیے بھی سرگرم رہنا پڑا۔ ان کی دردمندی، مخلصانہ سرگرمی اور ہمہ جہت مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فرقوں کا خاتمہ ہو گیا اور آج ان کی طرف اپنے کو منسوب کرنے والا کوئی نہ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے اٹھائے ہوئے کچھ خیالات بعد کے نئے فرقوں میں در آئے اور ان کے اثرات آج بھی باقی ہیں مگر قدیم علمائے حق اور ان کے معاونین سے جو کچھ ہو سکتا تھا اس میں انھوں نے کوئی کسر روا نہ رکھی۔

(۱) اہل سنت کی آواز، مارہرہ مطہرہ، نومبر ۲۰۱۵ء

اب اہل سنت پر جن فرقوں کا حملہ زیادہ شدت سے ہو رہا ہے وہ تقریباً دو سو سال پہلے کی پیداوار ہیں۔ یہ اہل سنت ہی کے درمیان سے نکلے اور ایک نیا مذہب بنا کر اہل سنت کو صراط مستقیم سے ہٹانے اور نئے جال میں پھنسانے کی مہم تیزی سے شروع کر دی۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف حربے استعمال کیے:

(۱) کتابیں لکھیں جن میں اہل سنت کے عقائد و معمولات کو شرک و بدعت قرار دیا۔

(۲) اجتماعات اور جلسے کر کے لوگوں کا ذہن مسموم کرنے کی کوشش کی۔

(۳) لوگوں سے مکانوں، دکانوں پر ملاقات کر کے انھیں اپنی طرف مائل کیا۔

(۴) اہل سنت کے درمیان اپنے مکاتب و مدارس قائم کر کے تعلیم و تربیت کے نام پر ہماری نسل کو قریب کیا پھر اسے اپنا ہم عقیدہ اور اپنے مذہب کا داعی و مبلغ بنا دیا، اسی طرح اہل سنت کے درمیان مسجدیں بنائیں یا ان کی مسجدوں پر قبضہ کیا پھر نمازیوں کو اپنا ہم عقیدہ بنا لیا۔

(۵) اسکول اور کالج قائم کر کے عصری تعلیم کا شوق دلایا پھر طلبہ کے ذہن میں اپنا عقیدہ اور مذہب بھی اتار دیا۔

(۶) کلمہ و نماز کی تبلیغ کے نام پر ایک جماعت قائم کی اور اس کے ذریعے اہل سنت کے بے شمار افراد اور چھوٹی بڑی بہت سی آبادیوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔

(۷) ان کے علاوہ تحقیق و تصنیف، سیاسی و سماجی نقل و حرکت اور دوسرے ہر قسم کے ذرائع سے لوگوں کو پہلے اپنا مداح و معتقد پھر اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کی۔

ان حرکتوں سے نقصان صرف اہل سنت کو پہنچا، انھی کی تعداد گھٹی، انھی کے افراد اہل باطل کا نشانہ بنے اور وہی طرح طرح کی سازشوں کا شکار ہوئے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔

اب اہل سنت کے سامنے دو چیلنج ہیں:

(۱) اپنے ٹوٹے ہوئے افراد کو پھر جوڑنا۔

(۲) دیگر افراد کو شکار ہونے سے بچانا۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ دشمن کے پاس جتنے اسلحے اور ہتھیار ہیں ان سے زیادہ ہتھیار اور ان سے قوی اسلحے ہمارے پاس ہوں، ان کے اندر جو سرگرمی اور مستعدی ہے اس سے زیادہ ہمارے اندر ہو۔

اس کے لیے باہمی اختلاف و انتشار سے دوری اور تحفظ عقائد و فروغ مسلک کے لیے اجتماعیت اور شیرازہ بندی کس قدر ضروری ہے، یہ اہل دانش کے لیے محتاج بیان نہیں۔

امکانات: پیشوایان اہل سنت اور دردمندان ملت اگر دل و جان سے متوجہ ہوں تو اسباب و وسائل کی

فراہمی ہمارے لیے بھی ممکن ہے اور ایسا ہو سکتا ہے کہ کام کو مختلف حصوں اور شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبے کے لیے لائق اور فعال افراد پر مشتمل مجلسیں یا بورڈ بنا دیے جائیں تاکہ کام آسانی سے ہو سکے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ تین چار یا چار پانچ افراد پر مشتمل ایک تھنک ٹینک یا مجلس اعلیٰ ہو، جو پوری بالغ نظری کے ساتھ تمام امور کے لیے منصوبہ سازی، مجالس سازی، اصول سازی اور تنفیذ و ترویج کی ذمہ دار ہو۔ اسی طرح مشکلات اور رکاوٹوں پر غور کرنے اور انھیں دور کرنے پر بھی اس کی نظر ہو۔

یہ کام ممکن ہونے کے ساتھ مشکل ضرور ہے۔ وقت اور سرمایے کی بڑی قربانی چاہتا ہے۔ اتنے بڑے ملک میں پھیلے ہوئے اہل سنت کی شیرازہ بندی اور ہر خطے کے لوگوں کو متحرک و فعال بنانا اور شاطرانہ حملوں کے دفاع کے لیے بیدار و تیار رکھنا کوئی ایسا کام نہیں جو چند دنوں یا ہفتوں کی محنت میں انجام پذیر ہو جائے۔ مہینوں بلکہ برسوں کی مدت درکار ہے۔

ہو سکتا ہے کہ پہلے ہر علاقے کا دورہ کر کے وہاں کے حالات اور ضروریات کا جائزہ لیا جائے، قابل عمل اور لائق اعتماد افراد تلاش کیے جائیں، پھر جہاں مکتب، مسجد، مدرسہ، اسکول، کالج، شفاخانہ وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت ہو ان کا قیام عمل میں لایا جائے اور طے شدہ خطوط پر ان کا انتظام معتمد افراد کے سپرد کیا جائے۔ اور جہاں پہلے سے ادارے قائم ہیں انھیں بھی تنظیم سے منسلک کرنے کی کوشش کی جائے اور انھیں زیادہ فعال اور کارآمد بنایا جائے۔

اس طرح ہر جگہ کے حالات سے واقفیت بھی بہم ہو گی اور ہر علاقے کے نمائندے مجلس اعلیٰ کے ماتحت مجلس منتظمہ یا مجلس شوریٰ میں شامل ہوں گے اور برابر ان سے رابطہ رہ سکے گا۔

بہت بڑی مرکزی عمارت اور بہت سے آفسوں اور ورکروں کی بھی ضرورت ہو گی جو ہر علاقے کے حالات جانے، ان کی رپورٹ پیش کرنے اور عام ضروریات کے لیے اپنے متعلقہ مقامات کا دورہ کرنے کے ذمہ دار ہوں۔

ساری تفصیلات تھنک ٹینک یا مجلس اعلیٰ طے کر سکتی ہے۔ اگر ملک گیر پیمانے پر آغاز مشکل ہو تو جس حد تک بآسانی ابتدا ہو سکے اسی حد پر کام شروع کیا جائے۔ اسی طرح جو کام انفرادی طور پر یا کسی مجلس اور بورڈ کی ماتحتی میں ہو رہے ہیں انھی کو تقویت دی جائے اور جو میدان بالکل خالی ہے اس پر خاص توجہ صرف کی جائے۔

سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ پیش قدمی کس طرح سے ہو؟ کہاں سے ہو؟ اور کون کرے؟ بہر حال یہ اقدام ایک یا چند حساس، دردمند، مخلص اور توانا قلب و جگر کے بغیر ممکن نظر نہیں آتا۔ مگر قوم کے خسارے سے صرفِ نظر کسی طرح روا نہیں۔ اقدام ہونا چاہیے اور ضرور ہونا چاہیے۔ واللہ الموفق والمعین.

اندیشے: اگر سارے اکابر اور پیشوایان قوم اس میں دل چسپی نہیں لیتے تو جو دردمند اور حساس حضرات

ہیں وہی پیش قدمی کرکے کام شروع کریں اور آگے بڑھائیں، باقی حضرات سے گزارش کی جائے کہ اگر حمایت اور مشارکت نہیں کرسکتے تو مخالفت اور رکاوٹ سے بھی باز رہیں ورنہ احکم الحاکمین کے حضور اہل سنت کے عظیم خساروں کا حساب دینے کے لیے تیار رہیں۔

اگر جماعت کی اکثریت خصوصاً اہل علم و دانش اور اہل ثروت میں یہ احساس بیدار ہوجاتا ہے کہ ہم مسلسل خساروں سے دوچار ہیں اور تلافی کے لیے میدان عمل میں جان و دل، ہوش و خرد، اور زبان و عمل کے ساتھ سرگرم ہونا ضروری ہے تو کام کی راہیں کھل سکتی ہیں ورنہ غفلت و بے حسی کے ماحول میں کام یابی کی توقع فضول ہے۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ اکثریت حساس اور بیدار ہونے کے ساتھ کسی پیش قدمی کی منتظر ہے۔ رب تعالیٰ ہمارا حسنِ ظن راست فرمائے اور سب کو حسب درجہ و مقام اور حسب ہمت و صلاحیت توفیق خیر سے نوازے۔ وھو المستعان وعلیہ التکلان.

محمد احمد مصباحی

۳؍ ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ / ۱۷؍ ستمبر ۲۰۱۵ء شب جمعہ

٭٭٭٭٭٭

خلیج کا بحران[1]

باسمہ وحمدہ والصلوۃ علی نبیہ وجنودہ

ایک وقت وہ تھا جب دنیا کی قوتیں اسلام کے غلبہ و دبدبہ سے ہراساں نظر آتی تھیں اور اسلام کی پرکشش خوبیاں دنیا کے گوشے گوشے میں بسنے والے انسانوں کو اپنا گرویدہ بناکر ایمان و یقین کی دولتوں سے مالا مال کر رہی تھیں۔ ماضی قریب میں بھی ترکی سلطنت کا جاہ و حشم اور پوری دنیا میں اس کا رعب و دبدبہ معروف و مشہور تھا لیکن اسلام دشمن طاقتیں بڑی سرگرمی سے میدان کارزار میں اتریں اور انھوں نے ایک سے ایک حربے استعمال کیے۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی کے سارے وسائل اپنائے۔ ان سے ایمان و یقین کی دولت چھیننے کی ہر کوشش بروے کار لائیں۔ اور اپنی قوموں کے اندر ہر عصبیت و تنگ دلی اور اسلام دشمنی کو اس قدر پروان چڑھایا کہ آج دنیا کا نقشہ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ جہاں کسی مسلم ملک کو طاقتور دیکھا اعداے اسلام اس کے پیچھے پڑ گئے۔ جب کسی قائد کو مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے پایا، اس کی جان کے درپے ہوگئے۔ شاہ فیصل نے مغربی ممالک کے خلاف تیل کو اسلحے کے طور پر استعمال کیا تو اس کے بھتیجے ہی کے ہاتھوں اسے قتل کرادیا۔ ایران نے سر اٹھایا تو عراق سے لڑا کر اس کا کس بل نکال دیا۔ اور اب عراق نے اسرائیل اور امریکہ کو آنکھیں دکھائیں تو اس کا راشن پانی بھی بند کر دیا گیا۔

دوسری طرف خود شاہ فیصل کے جانشینوں کو اس طرح شیشے میں اتارا کہ وہ اب مغرب ہی کو اپنا ملجا و ماویٰ اور اپنا آقا و فرماں روا سمجھتے ہیں۔ کویت اور سعودی عرب کے بادشاہوں کو ان ممالک پر اس قدر اعتماد ہے کہ اپنا اربوں ڈالر کا سرمایہ اپنے ملک، کسی اسلامی ملک، یا اسلامی ممالک کے کسی متحدہ بینک میں جمع کرنے کی بجائے امریکہ میں رکھ چھوڑا ہے۔ اگر وہ اپنے کسی ملک میں رکھتے تو یقیناً اسے فروغ حاصل ہوتا، اس کی قوت میں اضافہ ہوتا، اسلامی ملکوں کے اقتصادی و تجارتی مسائل حل ہوتے۔ لیکن افسوس کہ اپنا سرمایہ ایسے بینکوں میں جمع کر رکھا ہے جو ان کی دولت کو خود ان کے خلاف پورے طور سے استعمال کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ خطرہ بھی ہے کہ نکالنا چاہیں تو نکالنا در کنار سارا سرمایہ ہی منجمد ہوجائے جیسا کہ متعدد بادشاہوں اور ملکوں کے خلاف یہ ہوچکا ہے۔

---

(۱) خلیج کا بحران، مرتبہ مولانا مبارک حسین مصباحی، المجمع الاسلامی، محمد آباد، دسمبر ۱۹۹۰ء میں شامل ہے۔

امریکہ نے یہ ایسا زبردست حربہ استعمال کیا ہے کہ سعودیہ عربیہ اور کویت وغیرہ اس کے خلاف کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور آج تو پوری طرح ان کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔ اپنی جنگی حکمت عملی، اپنی فوجی قوت میں اضافہ، اور اپنے اندر اتفاق واتحاد کی راہ سے ہٹ کر دوسروں پر بھروسہ کرنے کی جو سزا ملنی چاہیے وہ ان ممالک کو برسہا برس سے مل رہی ہے۔ لیکن ایمانی غیرت ویقین، اسلامی جوش وہمت، حوصلہ مندانہ اقدام وجرأت، اور مومنانہ دوراندیشی وفراست کے بغیر اپنی ذلت ونکبت کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔

رسول عربی فداہ ابی وامی ﷺ کی غلامی کو کفر وشرک قرار دے کر امریکہ کے بندۂ بے دام ہوئے تو اس حد تک کہ یہ شعور بھی نہ رہا کہ ہم خدا اور خدا کے محبوبوں کا چارہ گر آستانہ چھوڑ کر اس کے دشمنوں کی چوکھٹ پر جبیں سائی کر رہے ہیں۔ جب یہ شعور ہی نہیں تو اس جبیں سائی اور دریوزہ گری سے نکلنے کی فکر کہاں تک پیدا ہوگی۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اس وقت خلیج کی پیدا شدہ صورت حال میں امریکہ جس طرح دخیل ہے اور پورے عالم اسلام کو عرب میں اس کی فوجوں کی موجودگی سے جو خطرہ لاحق ہے وہ ہر مسلمان کو تڑپانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ عجیب بے غیرتی ہے کہ اسے جائز ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں گڑھی جا رہی ہیں۔ اور ایک کا جرم دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کیا اس طرح کی باتوں سے وہ داغ دھل سکتا ہے جو عرب ممالک کی مسلسل عیاشیوں اور دفاعی قوتوں سے مجرمانہ غفلتوں نے پیدا کیا ہے؟ یہ کون سا اسلام ہے جو اپنا سرمایہ اپنے خلاف استعمال کرانے کی حکمت عملی سکھاتا ہو، دفاعی قوتیں فراہم کرنے سے روکتا ہو اور عیاشیوں میں دولت لٹانے کی تلقین کرتا ہو؟ وہ کون سی آیت ہے جو اپنوں، اپنے رسولوں اور خداداد روحانی قوت واقتدار رکھنے والے انبیا واولیا سے مدد طلبی کو کفر وشرک قرار دیتی ہو، لیکن اپنے دشمنوں، اسلام کے دشمنوں اور خدا اور رسول کے دشمنوں سے استعانت واستمداد اور اتحاد ووداد کو جائز ولازم بتاتی ہو؟ وہ کون سی حدیث ہے جو دشمنان اسلام کے لیے ہر نرم سے نرم اور نفع بخش سے نفع بخش پالیسی اپنانے کی تلقین کرتی ہو؟ بات بات پر اہل اسلام کی گردن زدنی کا حکم صادر کرتی ہو۔ اور سچے پکے ایمان والوں کو کافر وبے ایمان ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کی فوجی اور دماغی توانائی استعمال کرنے کی اجازت بخشتی ہو۔

یہ بھی وقت کا المیہ ہے کہ جنھیں خود اپنے ایمان واعتقاد اور قوت واتحاد کی فکر ہونی چاہیے وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر ومشرک قرار دے کر انھیں از سر نو مسلمان کرنے پر سارا سرمایہ صرف کر رہے ہیں۔

آج کی صحبت میں ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ خلیج کا یہ بحران کیسے پیدا ہوا؟ اور اس خصوص میں عالمی پیمانے پر عراق کو سراسر مجرم ٹھہرانے اور سعودیہ عربیہ کو بالکل بے گناہ ثابت کرنے کے مضمرات کیا ہیں؟ بالخصوص ہندوستان کے مسلم طبقوں میں آنکھ بند کر کے سعودیہ کی جو پرشور حمایت کی جا رہی ہے کیا یہ امریکہ سے متوقع خطرات کا جواب بن سکتی ہے؟ آئندہ صفحات سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ البتہ ان حامیوں کو اس حمایت کی معقول قیمت ضرور مل جائے گی۔ بلکہ پہلے سے ملتی آئی ہے، جس کا حق ادا کرنا یہ اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔

ان میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو سعودیہ کو اپنی ٹولی کی مخصوص مذہبی اور آئیڈیل حکومت تصور کرتا ہے۔ اور اس کے ہر ناجائز کو جائز ثابت کرنے کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جسے خود سعودی حکومت کے علمانہ صرف یہ کہ گمراہ کہتے ہیں بلکہ کافر ومشرک قرار دینے میں بھی اپنا کوئی نقصان نہیں سمجھتے۔ اور یہ طبقہ بھی ماضی میں اس کی مذمت کے لیے اپنا سارا زور قلم صرف کر چکا ہے۔ ترکی حکومت کے زمانے میں اس کی ضلالت وگمراہی کے ثبوت میں پوری کتاب لکھ ڈالی۔ اور آج ہمہ وقت اس کی صداقت وحقانیت کا ڈنکا بجانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہونے دیتا۔ حالات کی اس قدر تبدیلی کیوں؟ وجہ صرف یہ ہے کہ اس طبقہ نے ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کو اپنا مذہب ٹھہرایا ہے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک جس سے اس کا مادی اور گروہی مفاد وابستہ ہو وہ پوری دیدہ دلیری کے ساتھ اس کا ناقوس اپنے ہاتھ میں لے کر بجانے کو تیار رہتا ہے۔

اب سیاسی حلقوں اور دنیادار طبقوں کی نظر سے بھی یہ بات مخفی نہ رہی کہ صرف اہل سنت وجماعت ہی وہ سواد اعظم ہے جو ہمیشہ اپنے موقف پر سختی سے کاربند رہا ہے اور کسی قیمت پر بھی اس نے کبھی اپنے ضمیر وایمان کا سودا نہیں کیا ہے۔ وہ اگر بولتا ہے تو وہی بولتا ہے جو حق کا تقاضا ہو، جو اسلام کی آواز ہو، جو قرآن کا ارشاد ہو، جو رسول گرامی وقار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان ہو۔

ٹکوں اور سکوں پر اس کے فتوے نہیں بکتے۔ منصب وعہدہ کے عوض اس کا دین وایمان نہیں خریدا جا سکتا۔ وہ مالی اور مادی طور پر کمزور تو ہو سکتا ہے، لیکن باطل کو باطل اور غلط کو غلط کہنے کے لیے اس کے ہر فرد کا ضمیر بیدار رہتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ دوسروں کی غلط روی طشت از بام کرتا ہے بلکہ اپنوں کو بھی اگر جادۂ حق سے منحرف ہوتے دیکھتا ہے تو اس کے خلاف چیخ پڑتا ہے۔ اس کے یہاں گروہی عصبیت کی بنیاد پر کسی قائد کی بڑی سے بڑی غلطیوں کی تاویل نہیں کی جاتی بلکہ اسے بھی درستی اور سچائی کی طرف آنے کی پر اصرار دعوت دی جاتی ہے۔

اب ورق الٹیے اور کھلی آنکھوں اور بیدار دل ودماغ سے حقائق کا جائزہ آپ خود ہی لیجیے۔

بحران کی ابتدا:

خلیجی بحران کیسے شروع ہوتا ہے اور کویت پر عراق کا حملہ کب اور کیوں ہوا؟اس سلسلے میں ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ تفصیل معلوم ہوچکی ہے۔ لیکن ان معلومات کو اپنے ذہنوں میں ایک بار پھر تازہ کرلیں۔ایک اخبار اس کی پوری سرگزشت یوں رقم کرتا ہے:

"قاہرہ میں ۴۵ ممالک پر مشتمل آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کا اجلاس ہورہا تھا، کویت اس اجلاس کی جس میں اسلامی ممالک کے وزراے خارجہ شریک تھے صدارت کررہا تھا۔ دوسری طرف جدہ میں شاہ فہد، صدر حسنی مبارک کی کوششوں سے کویت اور عراق کے درمیان سرحدی تنازعہ کو سلجھانے کے لیے گفتگو ہورہی تھی۔ عراق نے کویت کی سرحد پر زبردست فوجی اجتماع کرلیا تھا۔ لیکن کسی نے عراق کی اس حرکت کو مرعوب کرنے کی کوشش سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

۳۱/ جولائی کو تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک کی میٹنگ میں بھی عراق کی جھڑپ متحدہ عرب امارات اور کویت کے ساتھ ہوئی۔ عراق نے الزام لگایا تھا کہ یہ دونوں ممالک اپنے متعینہ کوٹے سے زیادہ تیل نکال کر چپکے چپکے فروخت کررہے ہیں، جس کی وجہ سے دنیا میں تیل کی قیمتوں میں زبردست کمی ہورہی ہے۔ اوپیک تنظیم نے دنیا میں تیل کی قیمتیں ایک سطح پر رکھنے کے لیے تمام ممالک کا پیداواری کوٹہ مقرر کررکھا ہے۔ سب ممبر ممالک اس بات کے پابند ہیں کہ اس معینہ مقدار میں تیل نکال کر فروخت کریں۔ اور اوپیک تنظیم نے جو شرح مقرر کی ہے ان کے مطابق ہی فروخت کریں۔ دونوں ممالک عراق کے اس الزام کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے اور عراق ایران اور چند دوسرے ممالک کی کوششوں سے تیل کے نرخ میں اضافہ کیا گیا۔ پہلے تیل کے ایک بیرل کی قیمت ۱۴ ڈالر تھی۔ جو میٹنگ کے بعد بڑھا کر ۲۰ ڈالر کردی گئی۔ اور سب ممبر ممالک نے عہد کیا کہ وہ اپنے متعینہ کوٹے سے زیادہ تیل پیدا نہیں کریں گے۔

جدہ میں ہونے والی یہ میٹنگ درمیان میں ہی ناکام ہوگئی۔ اور عراقی وفد یکم اگست کو میٹنگ کا بائیکاٹ کرکے بغداد واپس لوٹ آیا۔ یکم اگست اور ۲/اگست کی درمیانی شب میں رات ایک بجے عراقی فوجوں نے کویت کی سرحد میں گھس کر دارالسلطنت جس کا نام بھی کویت ہے کی طرف مارچ شروع کردیا۔ اور ۹ گھنٹے میں انھوں نے پورے کویت پر قبضہ کرلیا۔ کویت کا حکمراں خاندان جو تقریباً ڈھائی سو سال سے کویت پر حکمرانی کررہا تھا اس نے بھاگ کر سعودیہ عربیہ میں پناہ لے لی۔ پوری کاروائی میں لگ بھگ ۸۰۰ کویتی فوجیوں اور شہریوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اصل میں عراق اور کویت کے درمیان یہ تنازعہ بہت پرانا ہے۔ ترکی حکومت کے دوران کویت عراق کے صوبے بصرہ کا ایک حصہ تھا۔ اور بغداد کے سلطان نے کویتی حکمراں خاندان کو جس کے موجودہ سربراہ شیخ جبار الاحمد الصباح ہیں کو مسند حکومت عطا کی تھی، بغداد میں ترکی اقتدار کے دور میں بھی حکومت اسی خاندان کے پاس رہی۔ ترکی اقتدار کے خاتمہ کے بعد جب انگریزوں نے اپنی عیاری سے عالم اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کیے تو کویت کو عراق سے الگ کردیا اور اس کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ کیوں کہ کویت چھوٹی سی حکومت ہونے کے باوجود تیل کی دولت سے مالامال تھا۔ لیکن ساٹھ کے دہے میں جب عالمی صورت حال کے تحت نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہورہا تھا تو انگریزوں نے ۱۹۶۱ء میں کویت کو آزاد کردیا۔ تو اس وقت بھی عراق کے حکمراں عبدالکریم قاسم نے دوبارہ عراق میں کویت کو ضم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت عراق ایک کمزور ملک تھا، اس کی فوجی طاقت بھی بہت کم تھی۔ چناں چہ جیسے ہی عراق نے کویت کو ضم کرنے کی کوشش کی برطانیہ کی کویت میں موجودہ صرف چھ ہزار فوج نے نقل و حرکت شروع کردی اور عراق کو کسی انتہاپسندانہ اقدام سے باز رکھا۔ بعد میں بین الاقوامی حالات اور دوسری وجوہات نے عراق کا ارادہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ اور کویت عالمی سطح پر ایک فوجی ریاست کے بطور اپنی منفرد حیثیت تسلیم کرانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ چوں کہ کویت میں بھی بادشاہت تھی اس لیے لامحالہ اس کا جھکاؤ اور اس کی قریبی نسبت ان عرب ممالک سے رہی جہاں آج بھی شہنشاہیت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ بادشاہت اور سوشلزم ان دو متضاد نظریات نے پورے عالم عرب کو دو دھڑوں میں بانٹ دیا۔

جس وقت عراق نے کویت پر حملہ کیا اس وقت مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں اسلامی ممالک کی کانفرنس چل رہی تھی۔ کانفرنس میں یہ خبر بجلی کی طرح گری۔ اس سے بھی زیادہ خراب حالت امریکہ اور اس کے یوروپی حلیفوں کی ہوئی۔ امریکہ جس کے سٹیلائٹ ساری دنیا میں چکر لگاکر دن رات جاسوسی کرتے رہتے ہیں اور جس کی سی آئی اے ساری دنیا میں سیاسی افراتفری مچاتی رہتی ہے۔ عراق نے اپنی حرکت سے سب کو حیران و ششدر کردیا"۔ (اخبار نو دہلی جلد ۸ شمارہ ۱۳، ۱۷/ تا ۲۳/اگست ۱۹۹۰ء ص، ۳۔ تلخیص)

عراقی حملے کے جواب میں امریکہ نے سعودیہ کو یہ دکھایا کہ امریکی فوجوں کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ سعودیہ بھی نہ بچ سکے گا۔ جنانچہ اس نے اس کا یقین کرلیا اور امریکہ کو اپنے صحن میں گھسنے کی دعوت دی۔ وہ اپنی ڈھائی لاکھ فوج اور بے شمار اسلحوں کے ساتھ اس سرزمین میں اتر آیا۔ اس فوج میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ اسرائیلی فوجیں بھی بڑی مقدار میں شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ نے اقوام متحدہ پر دباؤ ڈال کر فوراً عراق کی اقتصادی ناکہ بندی کی تجویز منظور کرائی۔ اور اس پر نہایت شدت سے عمل درآمد بھی شروع کردیا۔ یہاں تک کہ عملاً اسے

اقتصادی ناکہ بندی تک ہی محدود نہ رکھا، بلکہ معاشی اور غذائی ہر طرح کی پابندی عائد کر دی۔ دواؤں کا پہنچنا بھی مشکل ہو گیا۔ اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

دوسری طرف ۲۸/اگست ۱۹۹۰ء کو ایک صدارتی فرمان کے ذریعہ کویت کو عراق کا ایک صوبہ بنالیا گیا۔ اور اس کا نام قدیمہ رکھا گیا۔ ادھر امریکہ نے تمام ممالک پر دباؤ ڈالا کہ عراق کے خلاف اپنی فوجیں بھی سعودیہ میں بھیجیں۔ اور اب فوجی کاروائی شروع کرنے کے لیے سارے ممالک کے اتفاق کی سرگرم کوشش جاری ہے۔ امریکہ مزید اپنی ایک لاکھ فوجیں سعودیہ میں اتار رہا ہے۔ دوسری طرف عراق بھی اپنے سارے سازوسامان کے ساتھ حملے کا منتظر کھڑا ہے۔ عراق کویت خالی کرنے کے لیے یہ شرط عائد کرتا ہے کہ اسرائیل بھی عرب کے مقبوضہ علاقے واپس کرے اور خلیج سے امریکی فوجیں واپس جائیں۔ اور امریکہ و دیگر ممالک کا یہ مطالبہ ہے کہ عراق غیر مشروط طور پر کویت خالی کر دے ورنہ ناکہ بندی تو جاری ہی رہے گی، فوجی کاروائی کر کے اسے تباہ و برباد بھی کیا جا سکتا ہے۔ انجام صرف عراق ہی کے خلاف جائے گا یا سارے عرب ممالک کے لیے زہر قاتل ثابت ہوگا؟ اور امریکہ و اسرائیل سراسر فائدے ہی میں رہیں گے یا انھیں بھی ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا؟ ان سوالات پر ہر طرف سے مختلف آوازیں آ رہی ہیں۔ بہر کیف صورت حال بڑی پیچیدہ، سنگین، اور نہایت خطرناک ہے۔ خدا خیر کرے۔

عراق نے کویت پر حملہ کیوں کیا؟

اس سلسلے میں یہ بیانات سامنے آتے ہیں۔ ہفتہ وار اخبار "بلٹز" ممبئی لکھتا ہے:

"عراق نے کویت پر حملہ کیوں کیا؟ اس کا کہنا ہے کہ کویت کے نوجوانوں اور حریت پسندوں نے عراقی افواج کو دعوت دی تھی کہ وہ کویت آئیں اور شاہی حکومت کے پنجے سے انھیں آزاد کرائیں۔ عراق کا کہنا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کویت میں عراقی فوجوں کی مزاحمت کی گئی ہوتی اور کویتی افواج نے ان کا کچھ تو مقابلہ کیا ہوتا۔ عراق یہ بھی کہتا ہے کہ امیر کویت اپنے عوام کو چھوڑ کر سعودی عرب کیوں چلے گئے؟ وغیرہ وغیرہ۔ تاہم بادی النظر میں عراق کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں کہ پہلے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی تھی کہ کویت کے حکمراں کے خلاف خود کویتی فوجی یا شہری علم بغاوت بلند کرنے والے ہیں۔

عراق کی دوسری بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ صدر صدام حسین کا کہنا ہے کہ اوپیک سمجھوتے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کویت اور متحدہ عرب امارت نے زیادہ مقدار میں تیل نکالا۔ اور اسے عالمی منڈی میں بھیج کر تیل کی قیمت کوڑیوں میں کر دی۔ عراق کا کہنا یہ بھی ہے کہ کویت نے سرحدوں کے قریب گہرے کنویں کھود کر اس کا تیل

چرالیا ہے" (بلٹز: جلد ۲۷، شمارہ ۳۲، سنیچر ۱۱/اگست ۱۹۹۰ء، ص: ۱۲)

اسی سلسلے میں اخبار نو کا ایک اقتباس یہ ہے:

"کئی ماہ قبل جب سے صدام حسین نے غاصب اور ظالم اسرائیل کو چیلنج دیا تھا کہ اگر اس نے کسی عرب ملک پر حملہ کرنے کی جرأت اور غلطی کی تو عراق اس پر انتہائی تباہ کن زہریلے گیسوں کی بارش کر دے گا کہ آدھا اسرائیل جل کر خاک ہو جائے گا۔ اس لیے اسرائیل امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس جیسے ملکوں میں زبردست زلزلہ آ گیا۔ سب سے پہلے ساری دنیا میں صدر صدام حسین کے خلاف کردار کشی کی لہر پیدا کی گئی تاکہ عالمی رائے عامہ کو ان کے خلاف مشتعل کیا جا سکے۔ امریکہ کی بدنام خفیہ ایجنسی سی آئی اے اور امریکی سفارت خانوں کے ذریعہ نیز اسرائیلی اثر میں کام کرنے والی خبر رساں ایجنسیوں کے توسط سے صدر صدام حسین کے خلاف گمراہ کن اور بے بنیاد مفروضات سے آراستہ پروپیگنڈہ شروع کیا گیا۔ اور ان کا پیکر اس طرح پروجیکٹ کیا گیا گویا وہ ہٹلر یا چنگیز ہوں۔ اس معاملے میں امریکی پروپیگنڈہ بازوں نے جرمنی کے گوئبلز کو بھی مات کر دیا۔ یہ پروپیگنڈہ مہم شباب پر تھی کہ امریکہ نے صدر صدام حسین کو قتل کرا دینے اور ان کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی سازش رچی۔ اور کویت کے کٹھ پتلی حکمراں جابر الصباح کو اس خطرناک سازش کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری سونپی۔ جابر سے کہا گیا کہ وہ عراق کے اندر اور باہر کام کرنے والے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ یہ دونوں کام انجام دلائیں۔

عراق کو اس سازش کی بھنک مل گئی۔ اور یہ امریکی منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا۔ صدام حسین کا تختہ الٹ دینے میں ناکام ہونے کے بعد منصوبہ کے دوسرے مرحلے میں عراق پر کویت کی سرزمین سے اچانک اور بھرپور حملہ کر دینے کا خاکہ تیار کیا گیا۔ اور اس سلسلے میں سعودی عرب، خلیجی ملکوں کے شیخ اور مصر و شام وغیرہ کے سربراہوں کو بھی اعتماد میں لیا گیا۔ جب صدر صدام حسین کو انتہائی معتبر ذرائع سے معلوم ہو گیا کہ عراق پر اچانک اور برق رفتار حملہ کی تیاریاں پوری کی جا رہی ہیں تو انھوں نے اس سازش کی بساط ہی الٹ دی۔"

(اخبار نو، جلد ۸، شمارہ ۱۵، ۳۱/اگست تا ۶/ستمبر ۱۹۹۰ء، ص: ۱۶)

عراق کی ناکہ بندی اور اسرائیل کی پشت پناہی:

عراق کی ناکہ بندی پر امریکہ، اقوام متحدہ، اور سلامتی کونسل کی پالیسی پر ایک سوال کے جواب میں عراق کے سفیر عبدالودود شیخلی (سفارت خانہ نئی دہلی) فرماتے ہیں:

"ہمیں اقوام متحدہ کو بحیثیت ایک عالمی کمیونٹی کے جس کا ایک تحریری چارٹر ہے یقیناً قابل احترام سمجھنا

چاہیے۔ مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کے قول وفعل میں بہت تضاد ہے۔ اس پورے دہے میں جواب ختم ہونے والا ہے امریکی اور دوسرے سامراجی ممالک نے پوری کوشش یہی کی ہے کہ وہ کہیں کچھ اور، کریں کچھ اور، وہ دنیا میں چلا چلا کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ وہ انسانی حقوق کے محافظ اور علمبردار ہیں۔ لیکن عملی طور پر وہ انسانی حقوق کی نفی کرتے ہیں خواہ وہ ان کے اپنے ملک ہوں یا فلسطین، مثلاً انسانی حقوق کے یہ نام نہاد محافظ فلسطینیوں کی تحریک انتفاضہ کی طرف سے آنکھیں موندے رہتے ہیں۔ وہ اس وقت کہاں ہوتے ہیں جب فلسطین میں معصوم بچے مارے جاتے ہیں؟ اب انھی کی شہ پر عراق کے خلاف معاشی ناکہ بندی کی گئی ہے۔ کیا یہ ان کے لیے ضروری نہ تھا کہ وہ پہلے اسرائیل کے خلاف یہی کاروائی کرتے۔ جب اس نے اقوام متحدہ کی کھلی خلاف ورزی کر کے جنوبی لبنان پر قبضہ کیا تھا یا جب اس نے جارڈن کے دریا کے مغربی کنارے پر قبضہ کیا تھا یا غازہ پٹی اور گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کیا تھا۔ اس وقت تو انھوں نے کبھی بھی معاشی ناکہ بندی یا معاشی بائیکاٹ کی بات نہیں کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اس کی قطعی پروا نہیں ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ بلکہ ان کا اصل مقصد تو عربوں کے خلاف سازش کرنا ہے۔ اس خطے کے خلاف سازشیں کرنا ہے۔ اس کے لیے وہ یہ آڑ لیتے ہیں کہ وہ اپنے مفادات کی حفاظت کر رہے ہیں اور اس خطہ کے عربوں کی مدد کر رہے ہیں اور انھیں عراق سے بچا رہے ہیں۔" (اخبار نو دہلی، جلد ۸، شمارہ ۱۶، ۷/ تا ۱۳ ستمبر ۱۹۹۰ء ص:۹)

اقوام متحدہ کا کردار:

اس سلسلے میں یہ اقتباس پڑھیے:

"اقوام متحدہ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد ۱۹۴۵ء میں وجود پذیر ہوئی۔ اس کا نصب العین بین الاقوامی سطح پر امن قائم رکھنا ہے۔ ابتدا میں اس کے ممبروں کی تعداد صرف ۵۱ تھی۔ دو سال کے عرصہ میں اس کی تعداد بڑھ کر ۸۱ ہو گئی جو آج کئی سو پر مشتمل ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک سلامتی کونسل ہے جس میں دنیا کی پانچ بڑی طاقتیں امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ملک بھی شامل ہوتے ہیں جن کی حیثیت عارضی ہوتی ہے۔ سلامتی کونسل کا خاص مقصد یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی تنازعہ پر غور کرے اور جارحانہ کاروائی کرنے والے کے خلاف کاروائی کرے۔ پندرہ ممبروں والی اس کونسل میں کسی قرار داد کی منظوری کے لیے ۹ ممبروں کی حمایت ضروری ہے۔ جب کہ پانچ مستقل ارکان کو ویٹو پاور حاصل ہے جو کسی بھی تجویز کو مسترد کر سکتے ہیں۔ لیجیے ۹ ممبروں کی رائے کو ایک نے ٹھکرا دیا، مطلب صاف ہے کہ جس کے پاس طاقت ہے اس کی چودھراہٹ چلے گی۔ ان پتوں پر تکیہ کرنا آج عالمی برادری کے تمام کمزور ملکوں کی مجبوری بن چکا ہے۔

دراصل مغربی سامراج اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے آج سے ۴۵ سال قبل پیش قدمی کے طور پر اقوام متحدہ کو وجود میں لایا تھا۔ تاکہ اس کی آڑ لے کر اسلام اور مسلمانوں کی سرکوبی کرتا رہے۔ اس سازش کا دوسرا حصہ اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنا ہے جسے صرف چند ملکوں ہی نے تسلیم کیا ہے۔ جب کہ فلسطین کے وجود کو دنیا کے ۱۱۵ ملکوں نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج صہیونی طاقت برابر فلسطینیوں سے نبرد آزما ہے۔ اس سازش میں امریکہ کے ساتھ دنیا کی دوسری بڑی طاقت روس بھی شامل ہے۔ اسی سازش کے تحت روسی یہودیوں کی اسرائیل میں نوآبادکاری ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں روسی یہودیوں کو اسرائیل میں آباد کیا گیا ہے۔ شیر فلسطین یاسر عرفات نے حال ہی میں ایک انٹرویو میں انکشاف کیا ہے کہ اسرائیل ایک عظیم تر ریاست بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ جس میں عراق، شام، لبنان، اردن، مصر اور سعودیہ عربیہ کے کچھ حصے شامل ہوں گے۔ اس وسیع تر اسرائیل کے نقشے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے ۴۵ سالہ دور میں اقوام متحدہ نے کئی کام کیے اور بہت سے نازک مرحلوں میں اقوام متحدہ نے بیچ میں پڑ کر جنگوں کو ٹالا ہے۔ ایران، یونان، ڈچ، انڈونیشیا، جنوبی، شمالی کوریا، انگلستان اور مصر کے درمیان ہونے والے جھگڑے اس کی چند مثالیں ہیں۔

جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں نسل پرستی اور رنگ کا مسئلہ، جنوبی اور شمالی ویتنام کا مسئلہ اقوام متحدہ کے لیے جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اور سب سے بڑھ کر فلسطین کا مسئلہ اس کے ماتھے پر بدنما داغ بنا ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرار داد ۲۴۲ اور ۳۳۸ جس میں اسرائیل سے عرب مقبوضہ خالی کرنے کی بات کی گئی ہے۔ اسی طرح قرار داد ۴۲۵ جس کے تحت جنوبی لبنان سے اسرائیل کو اپنی فوجیں بلا لینی چاہیے۔ لیکن اسرائیل نے اس پر آج تک عمل نہ کیا۔ کیوں کہ اس کا ناجائز باپ امریکہ ہر اس قرار داد کو ویٹو کر دیتا ہے جو اس کی ناجائز اولاد اسرائیل کے خلاف ہوتا ہے۔" (اخبار نو دہلی، جلد ۸، شمارہ ۱۶۔ ۷ / تا ۱۳ / ستمبر ۱۹۹۰ء ص:۶)

خلیج کے معاملے میں امریکہ کی اس قدر دلچسپی کیوں؟

اس سلسلے میں اخبار نو لکھتا ہے: " یہ تمام بحران تو بادی النظر میں عربوں کی باہمی چپقلش معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے پس منظر کو غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ہر بحران کے پیچھے مغربی سامراج کار فرما رہا ہے۔ جب جب کسی عرب لیڈر نے تیل کی طاقت کو محسوس کر کے اسے بطور اسلحہ استعمال کرنے کی کوشش کی تو اسے پوری توانائی سے مغربی سامراج نے کچلا ہے۔ شاہ فیصل کا قتل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آج صدام حسین کے خلاف یہ تمام تر توانائیوں کے ساتھ آمادۂ پیکار ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت ان کا طریقۂ کار اور تھا، آج اور ہے۔" (جلد ۸، ش ۱۸۔ ۲۱ / تا ۲۷ / ستمبر ۱۹۹۰ء ص:۱۳)

امریکہ کے نقد فائدے:

یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امریکہ جیسے خود غرض اور شر پسند ممالک اپنے مادی منافع کے بغیر اپنی جگہ سے ہلنا تو دور کی بات ہے کسی کی حمایت یا مخالفت میں زبان بھی نہیں ہلا سکتے۔ انسانی ہمدردی، حقوق انسانی کی حفاظت، اخلاقی بلندی وغیرہ جیسے خوبصورت الفاظ ان کے یہاں محض ایک نمائشی لیبل اور جلب منفعت کے کارگر اسلحہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے الفاظ کے بطن میں حقیقی معنی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ امریکہ نے کویت کی بازیابی اور سعودی عرب کی شاہی بچانے کے لیے اپنی فوج اور دوسری توانائیوں اور کوششوں کی پیش کش کیسے گوارا کر لی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امریکہ نے یہ سب اپنے خاص منافع کے پیش نظر کیا ہے اور اس کے عزائم نہایت خطرناک ہیں۔ اس کا اور دیگر مغربی ممالک کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ عراق کی قیادت سے تیل کی قیمت اور پیداوار پر پابندی لگ رہی تھی۔ اس لیے مصلحت یہ تھی کہ اسے اس قدر پسپا اور رسوا کر دیا جائے کہ وہ کسی معاملے میں قیادت کا خیال ہی ترک کر دے۔ یہی سزا اس نے ایران کو دی تھی۔ جب ایران نے امریکی یرغمالیوں کے معاملے میں اسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ سزا کی نوعیت تھوڑی بدلی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ عراق کو بالواسطہ مدد پہنچا کر ۹ سال ایران و عراق جنگ جاری رکھ کر ایران کو اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ سر بھی نہ اٹھا سکے۔

اسی طرح وہ مختلف طریقوں سے مصر اور لیبیا کو بھی زیر کر چکا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب جتنے عرب ممالک ہیں وہ بری طرح امریکہ سے لرزاں و ترساں نظر آتے ہیں۔ اور وہ جو چاہتا ہے ان سے منوا لیتا ہے۔ کویت کے تیل کی پیداوار میں اضافہ اور کم سے کم قیمت پر امریکہ کے ہاتھوں اس کی فروخت امریکہ کی اسی منفعت جوئی کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ڈھائی لاکھ فوج کا جو خرچ امریکہ کے سر آتا تھا وہ یک لخت سعودیہ کے سر منتقل ہو گیا۔ جو یومیہ کروڑوں ڈالر تک پہنچتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ کہ عرب ممالک میں مالی لحاظ سے سعودیہ سب سے زیادہ طاقتور نظر آتا تھا۔ اسے اس قدر مصارف میں ڈال دیا جائے کہ اس کی بھی کمر ٹوٹ کر رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ جو ملک اپنے پورے دفاعی بجٹ سے صرف پچاس ہزار فوج کا انتظام کرتا تھا۔ یک بیک اس پر اپنی فوج کے مقابلے میں کئی گنا بہتر اور زیادہ لوازم کے ساتھ ڈھائی لاکھ فوج کا انتظام بڑا ہی خزانہ شکن معاملہ ہے۔ مگر امریکہ نے اسے باور کرایا کہ اگر وہ ہماری فوجیں نہیں حاصل کرتا ہے تو اس کا سارا وجود ہی خطرے میں ہے۔ اس لیے یہ ایک ضروری اقدام ہے جس سے انحراف اپنی

موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح امریکی ماہرین کو سعودی عرب کے زمینی ذخیروں کی دریافت، اور اس سرزمین کی مالی صلاحیتیں جانچنے کا بھرپور موقع مل سکے گا۔ اور وہ سیر و سیاحت کے نام پر اس خطہ کے چپہ چپہ کو چھان کر اس کی مخفی قوتوں کا راز معلوم کر سکیں گے۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ امریکی فوج میں شامل اسرائیلی فوج سعودی سرزمین کے راستوں اور اس پر فوجی حملہ کے متوقع اور منصوبہ بند ذرائع کو بروئے کار لانے کے سارے طریقوں پر غور کر سکے گی۔

چھٹا فائدہ یہ ہے کہ اتنی بڑی فوج یہاں رکھنے کے بعد سعودی حکومت پوری طرح تابع فرمان رہے گی۔ کیوں کہ ہر لمحہ اسے یہ خطرہ رہے گا کہ کسی بات میں بھی اگر اپنی ضد پر اڑ گئے تو امریکہ چشم زدن میں ہمیں خاکستر کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی وزارت دفاع جس نے بار بار یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اپنی سرزمین سے عراق پر حملہ کی اجازت نہ دے گی۔ آج امریکہ کی خواہش اور سرگرمی کے پیش نظر اپنا موقف تبدیل کر چکی ہے۔

ساتواں فائدہ یہ ہے کہ اس علاقے میں امریکی فوج کے بھاری بھرکم وجود کے باعث کوئی بھی عرب ملک اسرائیل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکے گا۔ اور اگر کسی نے اس پر حملے کا ارادہ بھی کیا تو سب سے پہلے اسے خود اپنے وجود و عدم کے بارے میں غور کر لینا ہوگا۔ اس طرح عرب ممالک کی ہزار ہا مخالفتوں، لاتعداد کانفرنسوں، بے شمار تجویزوں اور منصوبوں کے باوجود اسرائیل کے وجود کا پورا پورا تحفظ ہو جائے گا۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ آج فلسطینیوں پر اسرائیل کے تازہ ترین مظالم سامنے آ رہے ہیں، لیکن کوئی ملک نمائشی مذمت سے زیادہ اسرائیل کے ساتھ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اب مقبوضہ علاقوں کی واپسی کا مطالبہ چھوڑ کر ایک نمائشی قسم کی نئی تنظیم بنانے کی تجویز پاس ہو رہی ہے۔ یقیناً یہ سب خلیج اور سعودی عرب میں امریکہ کی بھاری طاقت کی موجودگی کا کرشمہ ہے۔

آٹھواں فائدہ یہ ہے کہ ایک طرف امریکی فوج کے بوجھ سے سعودیہ کی کمر ٹوٹے گی، تو دوسری طرف اقتصادی و معاشی ناکہ بندی سے عراق کا کس بل نکل جائے گا۔ پھر جنگ ہو یا نہ ہو عالم اسلام میں کوئی ملک ایسا نہ بچ سکے گا جو مغربی مفادات اور امریکی سامراج کے خلاف کچھ سوچنے سمجھنے کی بھی ہمت کر سکے۔

نواں فائدہ یہ ہے کہ اربوں ڈالر کا امریکی اسلحہ جو بیکار ہو رہا تھا۔ سعودیہ کے ہاتھوں فروخت کر کے مالی استحصال کی راہ بھی ہموار ہو گئی۔ اب وہ استعمال ہو یا نہ ہو امریکہ کا دام خالی ہو گیا۔ دوسری طرف اسرائیل کو بھی اس سے زیادہ مقدار اور قوت میں اسلحے فراہم کرنے کا جواز نکل آیا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو طاقت کا توازن برقرار نہ رہتا۔

دسواں فائدہ یہ ہے کہ تحفظ حرمین کے نمائشی کردار کے باعث تمام عرب ممالک جو امریکہ سے یک گونہ

نفرت رکھتے تھے وہ اس کے بہت قریب آسکیں گے اور پوری طرح اس کے اشاروں پر چلنے کے لیے تیار رہیں گے۔ پھر اگر جنگ بھی ہوتی ہے تو کوئی امریکہ کی مذمت نہ کر سکے گا۔ بلکہ سب اس جرم میں برابر کے شریک ٹھہریں گے۔

یہ تو نقد فوائد ہیں جو خود ہی اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ مغرب کو اس بحران سے جو کچھ نقصان ہو رہا ہے ان کے فوائد کی وجہ سے یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آئندہ امریکہ کے جو خطرناک منصوبے اور منفعت پرستانہ و جارحانہ عزائم ہیں وہ تو ابھی کالی کوٹھری میں بند ہیں۔ کاش! عالم اسلام کو عقل آئے اور وہ اپنے مسائل خود حل کرنے اور اپنے کو دشمن سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اس کے لیے ایمانی عزم و یقین اور قرآنی ہدایات پر استقامت سے کاربند ہونے کی ضرورت ہے۔

محمد احمد مصباحی

۲۷ر نومبر ۱۹۹۰ء

❁❁❁❁❁❁

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں

مجلس برکات کا قیام[1]

بہت زمانے سے یہ شکوہ عام تھا کہ درسی کتابوں کی اشاعت اکثر و بیشتر دوسروں کے یہاں سے ہوتی ہے ہمارے یہاں اس طرف توجہ نہیں۔ یہ شکوہ زیادہ شد و مد کے ساتھ ایسے لوگ کرتے ہیں جو اپنے سر کوئی ذمہ داری نہیں لیتے، نہ اپنے کو کسی جماعتی کاوش کا ذمہ دار شمار کرتے، نہ ہی کام اور اس کی مشکلات سے آگاہی رکھتے، نہ ہی کام ہو جانے کے بعد اس کی قدر دانی اور ہمت افزائی کا حوصلہ رکھتے ہیں، نہ شکوہ و شکایت کی طرح کام کی مدح و ستائش سے دل چسپی رکھتے ہیں گویا وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ ہر کام کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرائیں اور خود ہر طرح بری الذمہ رہیں۔ مزید برآں جب کام ہو جائے تو اس طرح چپ سادھ لیں کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور کچھ لوگوں کو تو عیب چینی سے اس قدر والہانہ شغف ہے کہ خامی نہ ملے تو فرضی خامی گڑھ کر بیان کرتے ہیں مثلاً یہ کہ سنیوں کی کتابیں گراں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اگر کسی سے آنکھیں قرض لے کر بھی دیکھیں تو نظر آئے کہ گھٹیا کاغذ، رف کتابت و طباعت اور زیادہ سے زیادہ قیمت دیوبند کی کتابوں کا طرۂ امتیاز بن چکا ہے۔ میں تو ایسے افراد کے ذکر سے بھی قلم کو آلودہ نہ کرتا مگر مقصد یہ ہے کہ انصاف پسند اور جماعت کے دردمند حضرات ایسے لوگوں کی گوشمالی کے لیے تیار رہیں اور نیک دل اور سادہ لوح طلبہ اور عوام ان کے فریب سے بچیں۔ اچھے کاموں کی تدابیر سوچیں، ان سے جو کچھ ہو سکے تعاون کرتے رہیں، یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم ذکر خیر سے گریز نہ کریں۔

مجلس برکات کے قیام کے پیچھے کچھ اسی طرح کے حالات و محرکات کار فرما ہیں۔ جو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے بہتر سمجھتا ہوں کہ سرپرست مجلس (امین ملت سید محمد امین برکاتی، مارہرہ شریف) کے ایک مضمون سے نقل کر دوں جو انھوں نے ۲۸ر محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۳ر اپریل ۲۰۰۱ء کو ممبئی میں رقم فرمایا اور بہت سی کتابوں کے ساتھ ایک بار ماہ نامہ اشرفیہ کی بھی زینت بنا۔ وہ فرماتے ہیں:

"اہل سنت کے دینی مدارس میں رائج کتب پر حواشی بالعموم اہل سنت ہی کے تھے جن کی طباعت و اشاعت کا

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، سیدین نمبر، اکتوبر ۲۰۰۲ء۔

اہتمام بھی اہل سنت ہی کرتے۔ انیسویں صدی کے اخیر میں بعض غیر مسلموں نے بھی یہ کام شروع کیا جس میں منشی نول کشور کا نام سرفہرست ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد تجارتی نفع تھا نہ کہ دینی خدمت۔ پھر جب کچھ نئے فرقے اور مدرسے وجود میں آئے تو انھوں نے بھی یہ کام شروع کیا۔ بعد میں انھوں نے یہ ستم ڈھایا کہ بہت سی کتابوں سے سُنّی مصنفین و محشین کے نام اڑا کر چھاپنا شروع کر دیا تاکہ لوگوں کو یہ گمان ہو کہ مصنفین و محشین بھی ناشر ہی کی جماعت کے ہوں گے۔ کچھ نئے حواشی بھی لکھے گئے جن میں اہل سنت کے سابقہ حواشی و شروح کی عبارتیں بعینہ نقل کی گئیں مگر ان کا حوالہ بھی نہ دیا گیا۔ یہ سارا کام تجارتی منفعت اور دنیوی نام آوری کی غرض سے کیا گیا ہے۔ لیکن بعد میں بدمذہب ناشرین نے اس تجارتی نفع اندوزی اور سرقہ و نام آوری کے عمل کو اپنے طبقہ کی ایک علمی و دینی خدمت کے روپ میں شہرت دینا اور یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کیا کہ درسیات کی تحریر و اشاعت کا سہرا صرف ہمارے سر ہے، اہل سنت کا اس میدان میں کوئی حصہ نہیں۔"

اس مسلسل پروپیگنڈے کے باعث نئے سنی طلبہ اور عام قارئین غلط فہمی کا شکار ہونے لگے۔ اب ضرورت تھی کہ ان ناشرین کے چہروں سے تلبیس کی چادر ہٹا دی جائے اور یہ عیاں کر دیا جائے کہ انھوں نے کس چابک دستی سے اہل سنت کی خدمات کو اپنے خانے میں ڈال لیا۔ اسی احساس کے تحت خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ اور اس کے متوسلین نے اہل سنت و جماعت کے ممتاز ترین مرکزی ادارے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کو اس طرف متوجہ کیا، مقام مسرت ہے کہ اس تحریک کے جواب میں اشرفیہ کی طرف سے لبیک کی آواز بلند ہوئی، اشرفیہ کے اکابر علمائے کرام نے "مجلس برکات" کی بنیاد ڈالی اور طے ہوا کہ:

(۱) جن کتب و حواشی سے اہل سنت کا نام اڑا کر شائع کیا جا رہا ہے انھیں اصلی شکل میں لایا جائے۔

(۲) اہل سنت کے جن حواشی کی اشاعت موقوف ہے انھیں پھر شائع کیا جائے۔

(۳) جن کتابوں پر حواشی کی ضرورت ہے ان پر نئے حواشی لکھے جائیں۔ (از مضمون مذکور۔ مختصراً)

الحمد للہ مذکورہ تجاویز کی روشنی میں کام شروع ہو گیا۔ پہلی تجویز کے نمونے کے طور پر تین کتابوں کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

(۱) **هداية النحو:** جس پر مولانا الٰہی بخش فیض آبادی علیہ الرحمۃ نے فارسی میں بہت عمدہ حاشیہ لکھا اور ان کی حیات میں بار بار شائع ہوا۔ ۱۲۷۶ھ اور ۱۲۷۸ھ کے نسخے میری نظر سے بھی گزرے۔ مگر بعد میں حضرت محشی کا نام غائب کر کے مسلسل اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔ مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ حاشیہ تو حاشیہ بین السطور کی تحریریں بھی ان ہی کی ہیں اور نام اس طرح غائب کر دیا گیا ہے کہ کہیں سے سراغ بھی نہ لگے۔

(۲) **کافیہ:** یہ کتاب ایک بہت وقیع عربی حاشیہ کے ساتھ کم و بیش سو سال سے شائع ہو رہی ہے مگر محشی کا نام غائب ہے۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور میں مولانا عبد العلیم سرکار آسی غازی پوری کے مرشد مولانا غلام معین الدین رشیدی کا پڑھا ہوا ایک نسخہ دستیاب ہوا جس کے خاتمۃ الطبع میں ان کے استاذ گرامی مولانا معشوق علی جون پوری متوفی ۱۲۶۸ھ کا نام بطور محشی مذکور ہے اور خاتمۃ الطبع خود انھوں نے ۱۲۶۷ھ میں لکھا ہے۔ اس نسخے کا جب موجودہ نسخوں سے مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا بعینہ وہی حاشیہ مع بین السطور حضرت محشی علیہ الرحمۃ کا نام غائب کر کے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کا نسخہ کون پائے گا اور کس کا ذہن اس طرف جائے گا کہ نئے نسخوں سے مقابلہ کرے اور حقیقت کا سراغ لگائے؟

(۳) **شرح جامی:** درس نظامی کی معروف کتاب ہے اس پر مولانا الٰہی بخش فیض آبادی متوفی ۱۳۰۳ھ کے شاگرد مولانا عبد العلیم آسی مدراسی (وفات ۱۳۲۷ھ) کا بھی بڑا وقیع حاشیہ ہے۔ مولانا آسی کے روابط اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ سے بھی تھے جیسا کہ فتاوی رضویہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرا حاشیہ مولانا برکت اللہ فرنگی محلی نے لکھا جو پہلی بار مطبع قیومی کان پور سے ترتیب قیومی کے نام سے پھر مطبع مجیدی کان پور سے ترتیب مجیدی کے نام سے شائع ہوا مگر دونوں میں محشی کے کا نام واضح طور پر ٹائیٹل پیج کے علاوہ خاتمہ میں بھی موجود ہے۔

ترتیب مجیدی کی کتابت، طباعت بہت عمدہ تھی اس لیے ہندوستان کے نام ور پیشہ وروں نے اس کا ایسا سرقہ کیا کہ ہر صفحہ سے ترتیب مجیدی بھی محو کر دیا اور ابتدا و انتہا سے محشی کا نام بھی اڑا دیا، باقی کتابت و طباعت بعینہ وہی رکھی۔

یہ تینوں کتابیں مجلس برکات سے شائع ہو چکی ہیں مگر حضرات محشی کے اسما مع حالات درج کر دیے گئے ہیں۔

دوسری تجویز کے تحت اصول الشاشی مع احسن الحواشی، دروس البلاغہ مع شرح شموس البراعہ، قدوری مع الحل الضروری، التعلیق المجلی لما فی منیۃ المصلی کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔ الحل الضروری از مولانا عبد الحمید فرنگی محلی ۱۳۱۴ھ میں منظر عام پر آیا اس کے بعد اس سے تھوڑی کمی کر کے دوسرا حاشیہ بنام التنقیح الضروری تیار کر لیا گیا۔ اب وہی شائع ہو رہا ہے۔ اسی طرح احسن الحواشی میں ذرا ذرا سی تخفیف کر کے ایک دوسرا حاشیہ عمدۃ الحواشی بنا لیا گیا اب وہی شائع ہو رہا ہے۔ مولانا رونق علی ردولوی کا مبسوط حاشیہ میر قطبی بھی اسی طرح کے ستم کا شکار تھا اسے بھی اصلی شکل میں مجلس برکات سے شائع کر دیا گیا ہے۔ اور التعلیق المجلی تو حاشیہ نہیں بہت عظیم شرح ہے جو حضرت صدر الشریعہ اعظمی و محدث اعظم کچھوچھوی علیہما الرحمہ کے استاذ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے مخلص دوست علامہ وصی احمد محدث سورتی قدس سرہ کی محدثانہ و فقیہانہ عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ منیۃ المصلی تو ایک ابتدائی کتاب ہے مگر یہ شرح منتہی کتب فقہ و حدیث کے مطالعہ کے لیے کارآمد ہے۔

ہدایہ، شرح وقایہ، موطا، مشکاۃ، ترمذی، بخاری اور مسلم کے اسباق پڑھنے والے اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تیسری تجویز کی روشنی میں شرح عقائد کا عربی حاشیہ جمع الفوائد بانارۃ شرح العقائد (۱۴۲۲ھ) مولانا صدر الوری مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے قلم سے تیار ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اور علم میراث کی مشہور کتاب سراجی کا عربی حاشیہ برکات السراج لحل اصول السراجیۃ (۱۴۲۳ھ) مولانا نصر اللہ رضوی مصباحی استاذ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ کی قلمی و علمی کاوشوں سے ایک اردو عام فہم رسالہ قواعد میراث (یا رسم الفرائض ۱۴۲۲ھ) کے ساتھ عنقریب منظر عام پر آنے والا ہے۔ دیوان متنبی، سبعہ معلقہ، مقامات حریری، شرح ہدایۃ الحکمۃ، موطا امام محمد پر حواشی تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں ان کا کچھ تعارف بعد میں پیش کیا جائے گا۔ جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کا مختصر تعارف اگلے صفحات میں دیا جا رہا ہے۔[1] اب یہ اہل سنت کے مدارس، طلبہ اور علما کی ذمہ داری ہے کہ ان کتابوں کی خریداری اور زیادہ سے زیادہ اشاعت میں حصہ لیں۔ شکوہ و شکایت کا بازار بند کریں۔ قدر دانی و حوصلہ افزائی کی دنیا میں قدم رکھیں۔ واللہ الموفق لکل خیر

۱۳ر رجب ۱۴۲۳ھ/۲۱ر ستمبر ۲۰۰۲ء

❁❁❁❁❁❁

(۱) یہ تعارف یہاں نہ دیا گیا، مجلس برکات کی فہرست میں دیکھ سکتے ہیں۔

چار روزہ فقہی سیمینار کی ایک جھلک[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً ومصلیاً ومسلماً

اسلامی شریعت ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کی ضامن ہے اور ہر دور میں اس نے یہ فریضہ انجام دیا ہے اگرچہ زمانہ کے انقلابات اور نت نئی ایجادات کے ساتھ گوناگوں اور پیچیدہ سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں مگر علمائے اسلام نے اپنی فقیہانہ بالغ نظری سے ہمیشہ ان سوالات کا حل تلاش کیا ہے لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں جس سے ہر عالم عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کے لیے حالات زمانہ پر گہری نظر، اشیائے جدیدہ سے متعلق عمیق مطالعہ پھر شریعت اسلامیہ کے اصول و فروع سے پوری واقفیت، کمال استحضار، قدرت استخراج اور قوت فیصلہ کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ اپنے گوناگوں علوم و فنون کی بنا پر تنہا ایک ایسی اکیڈمی کی حیثیت رکھتے تھے جو بہت سے علوم و فنون کے ماہرین پر مشتمل ہو اس لیے ان کی بارگاہ میں جو سوال پیش ہوتا اس کا ایسا تنقیح شدہ جواب عطا فرماتے کہ کسی صاحب نظر کے لیے مجال اختلاف باقی نہ رہے۔

ان کے مجموعۂ فتاویٰ کے اندر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ متعدد مفتیوں نے فتوے دیے مگر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں وہ پیش ہوئے تو سب کی خامیوں کی مفصل نشان دہی کے ساتھ ایسا مفصل جواب رقم فرمایا جسے دیکھ کر اہل علم عش عش کرنے لگے۔ ریاست بہاول پور کے ہائی کورٹ میں پیش آمدہ ایک مقدمہ سے متعلق چیف جسٹس نے آٹھ مفتیوں سے رجوع کیا۔ مگر ان کے جوابات میں ایسا اختلاف و تضاد نظر آیا کہ انھیں سخت الجھن ہوئی۔ اور یہ لکھا کہ سوال ان تمام جوابات کے ساتھ بریلی حضرت مولانا احمد رضا خان کی خدمت میں بھیجا جائے، اعلیٰ حضرت نے ان جوابات کی علمی و شرعی غلطیاں ظاہر فرمائیں اور اس پیچیدہ سوال کا ایسا واضح جواب عنایت فرمایا جو نہ صرف ایک ناقدانہ و محققانہ جواب ہے بلکہ ایک چیف جسٹس کا متوازن سنجیدہ اور شرعی فیصلہ بھی ہے۔ اس کی بہت سی نظیریں فتاویٰ رضویہ میں موجود ہیں۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) ان کے زمانے میں بہت سے قابل علما جو خاصی شہرت و اہمیت کے حامل تھے حکم شرعی کے استخراج میں خطا کر گئے۔ اس لیے کہ اس کام کے لیے جس وسعت نظر، مہارت علوم اور عظیم بصیرت و نور فقاہت کی ضرورت

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، دسمبر ۱۹۹۳ء

تھی وہ لوگ اس کے حامل نہ تھے۔

(۲) حکم شرعی کی دریافت کے لیے مختلف علوم وفنون میں مہارت بھی چاہیے اور وہ خاص نور فقاہت بھی جس سے امام احمد رضا قدس سرہ کو قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ نوازا تھا۔

آج جب کہ نئے مسائل روز بروز پیش آتے رہتے ہیں اور ایسی جامع ہستیاں ہمارے درمیان ناپید ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف ماہرین مل کر مسائل کو واشگاف کریں۔ اور ان کا ایسا علمی وشرعی حل قوم کے سامنے پیش کریں جس میں شک وتردد کی گنجائش باقی نہ رہے۔

دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کی مجلس شوریٰ کو اس ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ اور ۳ر ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ کی منعقدہ مجلس شوریٰ کی ایک قرارداد کی روشنی میں عزیز ملت حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب دام ظلہ سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ نے ۲۳ر جمادی الآخرہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۲ء شنبہ کو علماے اشرفیہ کی ایک میٹنگ رکھی جس میں مجلس شرعی کا قیام عمل میں آیا۔

پھر ۲۷ر جمادی الآخرہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۲۳ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو مجلس شرعی کے ارکان کی نشست ہوئی جس میں مبادیات اور ضروری اصول وضوابط طے کیے گئے اس کے ساتھ تقریباً چالیس جدید اہم مسائل بھی زیر نظر آئے جن سے متعلق یہ تجویز پیش ہوئی کہ سیمینار منعقد کر کے باضابطہ مذاکرہ ومباحثہ کے بعد ان کا شافی حل تلاش کیا جائے۔

مگر زیادہ مسائل پر یک بارگی بحث نہ ہو سکتی تھی اس لیے پہلی بار صرف تین مسائل سیمینار کے موضوع کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور سیمینار کی تاریخ ۱۱ر تا ۱۴ر جون ۱۹۹۳ء رکھی گئی۔

سیمینار کے موضوعات:

وہ تین مسائل درج ذیل ہیں:

(۱) انگریزی دواؤں کا حکم

(۲) زندگی بیمہ اور عام بیمہ کے احکام

(۳) مشترکہ سرمایہ کمپنی میں شرکت اور اس کے حصوں کی خریداری

مجلس کی قرارداد کے مطابق حضرت مولانا مفتی نظام الدین رضوی نے ان سوالات کی مکمل تشریح، ماہرین کے بیانات کی روشنی میں مذکورہ چیزوں کی تفصیل، پھر ان سے متعلق کچھ فقہی جزئیات کی نشان دہی کرتے ہوئے علی الترتیب ۱۷+۴۳+۲۰= (۸۰) صفحات پر مشتمل سوال نامہ بڑی محنت وجاں فشانی سے تیار کیا۔

اوائل شعبان ۱۴۱۳ھ میں یہ سوالات ملک کے مقتدر مفتیان کرام اور علماے عظام کی خدمات میں سیمینار کے دعوت نامے کے ساتھ ارسال کر دیے گئے۔ مگر شعبان ورمضان کی تعطیلات کے زمانے میں اکثر حضرات کے وطن چلے جانے اور مناسب وقت پر ڈاک موصول نہ ہونے یا دیگر مصروفیات میں لگ جانے کی وجہ سے ایک طویل عرصہ یوں ہی نکل گیا اور متوقع وقت تک موصول ہونے والے مقالات کی تعداد بہت کم نظر آئی اس لیے سیمینار کی تاریخ آگے بڑھا کر ۱۸ر تا ۲۱ر اکتوبر ۱۹۹۳ء مقرر کی گئی اور مقالات بھیجنے کی تاریخ ۳۱ر جولائی ۱۹۹۳ء رکھی گئی۔

بحمدہ تعالیٰ اس مہلت سے بڑا فائدہ ہوا، علماے کرام نے مجلس کو قیمتی مقالات سے نوازا اور سیمینار میں شرکت سے بھی ممنون فرمایا۔

ان مقالات کا خلاصہ، بحثوں کا تذکرہ اور فیصل بورڈ کا فیصلہ آخر میں درج ہوگا۔ پہلے سیمینار کی مختصر رپورٹ نذر قارئین ہے۔

سیمینار کی اجمالی رپورٹ

سیمینار چھ خصوصی نشستوں اور ایک جلسۂ عام پر مشتمل تھا۔ ان کی قدرے تفصیل یہ ہے:

پہلا اجلاس: یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۸ر اکتوبر ۱۹۹۳ء دوشنبہ ۹ تا ۱۱½ بجے شب۔

صدارت اجلاس: شارح بخاری فقیہ عصر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق صاحب امجدی دامت برکاتہم۔ سرپرست مجلس شرعی، ناظم تعلیمات وصدر شعبۂ افتا دار العلوم اشرفیہ مبارک پور۔

نظامت: مولانا محمد احمد مصباحی، استاذ: جامعہ اشرفیہ ورکن مجلس شرعی۔

قرآن حکیم کی تلاوت سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ پھر ایک نعت پاک پڑھی گئی۔ اس کے بعد مندوبین کی خدمت میں مجلس شرعی کے سرپرست حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ نائب مفتی اعظم ہند قدس سرہ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ پھر مجلس شرعی کے صدر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری مدظلہ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے مندوبین وسامعین کو خطبۂ صدارت سے نوازا۔ ان کے بعد مجلس شرعی کے سرپرست دار العلوم اشرفیہ کے سربراہ اعلیٰ، حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب مدظلہ نے علماے کرام کی خدمت میں "عرض مدعا" کے نام سے مجلس شرعی کے قیام کے اسباب اور علماے کرام کی منصبی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔ "خطبۂ استقبالیہ" اور "عرض مدعا" کا متن اسی شمارے میں دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں۔

اس ابتدائی کاروائی کے بعد مندوبین نے انگریزی دواؤں سے متعلق اپنے مقالات پڑھے اور ۱۱½ بجے صلوٰۃ و

سلام اور دعا پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

دوسرا اجلاس: ۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء سہ شنبہ ۸½ تا ۱½ بجے دن۔

صدارت: بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی مصباحی دام ظلہ شیخ الحدیث دار العلوم اہل سنت شمس العلوم گھوسی ضلع مئو۔

نظامت: محمد احمد مصباحی بھیروی۔

اس اجلاس میں سابق الذکر موضوع سے متعلق باقی ماندہ مقالات پڑھے جانے کے بعد مندوبین کو مقالات اور موضوع مقالات پر بحث کی دعوت دی گئی جو بہت خوش گوار ماحول میں جاری رہی۔ موضوع کے بعض گوشے طے ہو گئے اور بعض کو فیصل بورڈ کے حوالے کرتے ہوئے ۱½ بجے صلوٰۃ و سلام اور دعا پر اجلاس ختم کر دیا گیا، پھر نماز ظہر اور طعام کے بعد مندوبین کو کچھ آرام لینے کا موقع دیا گیا۔

تیسرا اجلاس: ۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء منگل ۶؍ تا ۱۰؍ بجے شب۔

صدارت: حضرت مولانا سید ظہیر احمد زیدی قادری مد ظلہ، تلمیذ صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی قدس سرہ سابق استاذ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

نظامت: محمد احمد مصباحی، رکن مجلس شرعی۔

موضوع: انشورنس اور جنرل انشورنس (بیمۂ زندگی و بیمۂ اموال وغیرہ)

حسب سابق اس اجلاس میں بھی تلاوت قرآن حکیم اور نعت پاک کے بعد مندوبین نے موضوع بالا پر اپنے مقالات پڑھے جو آخر وقت تک جاری رہے۔ ۱۰؍ بجے صلوٰۃ و سلام اور دعا پر اجلاس ختم ہوا۔ پھر نماز عشا کی اذان اور جماعت ہوئی بعدہٗ شرکاے اجلاس نے ماحضر تناول فرمایا اور آرام کیا۔

چوتھا اجلاس: ۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۰؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء بدھ ۸½ تا ۱½ بجے دن۔

صدارت: حضرت مولانا مفتی جلال الدین احمد امجدی دام ظلہ مفتی دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف۔ ضلع بستی یوپی۔

نظامت: مفتی محمد نظام الدین رضوی، رکن مجلس شرعی۔

اس اجلاس میں زندگی بیمہ اور بیمۂ اموال سے متعلق مباحثے ہوئے۔ نتیجۂ بحث آگے ملاحظہ فرمائیں۔ ۱½ بجے صلوٰۃ و سلام اور دعا پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

باقی اوقات کے کام حسب سابق انجام پذیر ہوئے۔

پانچواں اجلاس: ۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۰؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء بدھ ۶؍ تا ۱۰؍ بجے شب۔

صدارت: عزیز ملت حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب مد ظلہ، سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ و سرپرست مجلس شرعی۔

نظامت: مفتی محمد نظام الدین رضوی۔ رکن مجلس شرعی و استاذ و نائب مفتی دار العلوم اشرفیہ۔

موضوع: مشترکہ سرمایہ کمپنی میں شرکت اور اس کے حصوں کی خریداری۔

اس اہم موضوع پر متعدد وقیع مقالات پڑھے گئے۔ مگر اس نشست میں سب مکمل نہ ہو سکے اس لیے ۱۰؍ بجے سلام و دعا پر اجلاس ختم کرتے ہوئے باقی مقالات اور مباحثے کو دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

چھٹا اجلاس: ۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۱؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء جمعرات ۸½ تا ۱½ بجے دن۔

صدارت: حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری دامت برکاتہم القدسیہ، جانشین مفتی اعظم ہند قدس سرہ مرکزی دار الافتا بریلی شریف۔

نظامت: مفتی محمد نظام الدین رضوی۔

اس اجلاس میں تلاوت قرآن و نعت کے بعد سابقہ موضوع سے متعلق باقی مقالات پڑھے گئے۔ پھر بحث کا دور شروع ہوا۔ یہ موضوع بہت دقیق اور اہم تھا۔ اس لیے آخر وقتِ اجلاس تک فیصلہ کن مرحلے میں نہ پہنچ سکا اور مزید غور خوض کے بعد آئندہ بحث و فیصلہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ ۱½ بجے سلام و دعا پر اجلاس اختتام ہوا۔ حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری مد ظلہ کی تشریف آوری اسی دن صبح کو ہوئی۔ ان کی آمد سے مجلس شرعی کے ارکان اور مندوبین کرام و شرکاے اجلاس کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہی فیصل بورڈ کے صدر منتخب ہوئے اور ان کے ساتھ حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری و حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد امجدی رکن ہوئے۔ اجلاس نے طے کیا کہ بورڈ کے اصل ارکان اور ذمہ داران یہی تین حضرات ہوں گے۔ لیکن اپنے تعاون کے لیے جن حضرات کی بھی ضرورت سمجھیں ان سے مدد لے سکتے ہیں۔

اجلاس عام: ۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۱؍ اکتوبر ۱۹۹۳ء جمعرات بعد نماز عشا ۹ تا ۱۲½ بجے شب۔

صدارت: حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری مد ظلہ، جانشین مفتی اعظم ہند بریلی شریف۔

یہ اجلاس مندوبین اور علماے کرام کے علاوہ طلبہ و عوام پر بھی مشتمل تھا۔

اس میں حضرت نائب مفتی اعظم علامہ مفتی شریف الحق امجدی دام برکاتہم نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور جامعہ کے سربراہِ اعلیٰ عزیز ملت مولانا عبد الحفیظ صاحب دام ظلہ نے مجلس شرعی کی ضرورت و افادیت پر روشنی ڈالی اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ اسی طرح مجلس شرعی کے صدر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری مد ظلہ نے مندوبین کے شکریہ کے

ساتھ مجلس کی اہمیت بیان کی اور چار روزہ نشستوں کے نتائج سنائے۔ مولانا آل مصطفےٰ مصباحی نے ان نشستوں کی اجمالی رپورٹ پیش کی۔

حضرات مندوبین نے مجلس شرعی اور اس کے سیمینار سے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے جن میں حضرت مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی، حضرت مولانا مفتی جلال الدین احمد امجدی، حضرت مولانا مفتی اختر حسین رضوی اور متعدد حضرات نے خطاب کیا۔ مزید برآں حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری مدظلہ نے بھی اپنے کلمات خیر سے نوازا۔ ان تاثرات کا مختصر خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

مجلس شرعی کا قیام وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور جامعہ اشرفیہ کا ملک کی دیگر علمی و دینی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ اس طرف متوجہ ہونا باعث مبارک باد اور لائق تحسین ہے۔

جامعہ کی خدمات پورے ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں اور اب اس کا دائرۂ عمل دیگر ممالک کو بھی محیط ہو رہا ہے۔ جامعہ اشرفیہ نے ہر میدان میں بہترین افراد پیدا کیے۔ اور اس سیمینار میں بھی اکثر مصباحی حضرات نے ہی مقالات پیش کیے جو اس بات کی دلیل ہے کہ جامعہ نے اپنے طرز تعلیم میں علمی بالغ نظری کے ساتھ قلمی پختگی اور فقہی دقیقہ سنجی بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ سارا فیضان حافظ ملت حضرت مولانا عبد العزیز مرادآبادی قدس سرہ کا ہے جن کی روحانیت آج بھی کارفرما ہے۔ پھر ان کے جانشین حضرت عزیز ملت کے اخلاص عمل اور حسن نیت کا ثمرہ ہے کہ اس وسیع پیمانے پر سیمینار کا انعقاد ہوا اور علمائے کرام کے اعزاز و اکرام اور انھیں راحت پہنچانے میں ہر طرح حسن انتظام اور سلیقہ مندی کا ثبوت پیش کیا گیا۔ سیمینار کی بحثیں نہایت سنجیدہ اور خوش گوار ماحول میں خالص علمی انداز میں جاری رہیں۔ جب تک کوئی مسئلہ منقح نہ ہو گیا فیصلہ نہ کیا گیا۔ یہی اہل علم اور اہل تقویٰ کی شان ہے۔ یقیناً ان تمام امور میں مجلس شرعی کے ارکان اور جامعہ اشرفیہ کے اساتذہ کا خاص حصہ ہے۔ اساتذہ ہی کا یہ فیضان ہے کہ ان کے فارغ شدہ تلامذہ اتنے دقیق علمی مسائل پر بحث کر سکے اور مقالات لکھے۔ ان کے حسن تعلیم و تربیت کو فراموش کرنا بہت بڑی ناسپاسی ہوگی۔

حسن انتظام:

۸۰ ر صفحات پر مشتمل سوال نامے کی کتابت وطباعت ۞ مندوبین کی خدمات میں ان کی ترسیل ۞ ان سے رابطہ و تقاضا ۞ سیمینار کی تیاری ۞ خطبۂ استقبالیہ، عرض مدعا، نظام الاوقات وغیرہ کی کتابت وطباعت ۞ مندوبین کا استقبال ۞ ان کے قیام و طعام کا معقول بندوبست ۞ سیمینار ہال کے لیے سامانوں کی فراہمی ۞ مندوبین کے لیے ضروری امور کا انتظام ۞ وقت پر جلسوں کے آغاز و اختتام کا اہتمام۔

بہت سے کام ہیں جو اس سیمینار کے سلسلے میں سلیقہ مندی اور نظم و ضبط سے انجام پاتے رہے۔ ان میں سے بیش تر امور مجلس کی نشست دسمبر ۱۹۹۲ء کی تجویز کے مطابق حضرت مولانا محمد معراج القادری استاذ و نائب مفتی اشرفیہ و رکن مجلس شرعی کے ذمہ تھے جو انھوں نے بڑی محنت و تن دہی سے انجام دیے۔ حسن انتظام کے سلسلے میں وہ بجا طور سے جملہ مندوبین اور مجلس شرعی کی جانب سے تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔ رب کریم انھیں صحت و عافیت، سلامت روی، استقامت اور مزید محاسن سے نوازے۔ مفتی نظام الدین رضوی کی رفاقت و معاونت اور رہنمائی کا بھی اس میں خاص حصہ ہے۔ انتظامات کے سلسلے میں اسٹاف کے کچھ اور حضرات کا بھی سرگرم تعاون رہا۔ مثلاً: ماسٹر فیاض احمد صاحب نگراں دار الاقامہ، قاری جلال الدین صاحب استاذ شعبۂ قرأت، مولانا زاہد علی سلامی استاذ جامعہ اشرفیہ، مولانا محبوب احمد عزیزی مدیر معاون ماہ نامہ اشرفیہ، ماسٹر حفیظ الرحمٰن صاحب کلرک، مولانا احمد رضا مصباحی وغیرہم۔

اسی طرح جامعہ کے کچھ طلبہ نے بھی بڑی دل جمعی اور محنت و سرگرمی سے انتظامات میں حصہ لیا در اصل یہی سب سے زیادہ قوی معاون اور ہم درد ثابت ہوئے۔ رب کریم ہر فرد کو اپنی بے پایاں نعمتوں سے نوازے اور دارین کی سعادتوں سے شاد کام فرمائے۔ اور یہ سب برکات و ثمرات ہیں اسی اخلاص عمل اور دینی جذبات کے جو اکابر اشرفیہ کے دلوں میں موجزن ہیں جن کی تائیدات سے ہر موڑ پر کارکنوں کو قوت بھی ملی اور ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی ان اکابر سے راقم کی مراد:

(۱) حضرت عزیز ملت سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ و سرپرست مجلس شرعی۔
(۲) حضرت فقیہ عصر، صدر شعبۂ افتا و ناظم تعلیمات جامعہ و سرپرست مجلس شرعی۔
(۳) حضرت شیخ الجامعہ صدر مجلس شرعی۔

مجلس شرعی کا تیسرا فقہی سیمینار[1]

منعقدہ ۱۱ر تا ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ

۲۳ر جمادی الآخرہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے تحت مجلس شرعی کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ نئے مسائل جن کے صریح احکام کتب فقہ میں دستیاب نہیں بحث وتنقیح اور تلاش وجستجو کر کے ان کے جوابات متعین کیے جائیں اور اس بات میں مسلمانوں کی شرعی رہنمائی کی جائے۔

اس مقصد کے تحت مجلس کا پہلا فقہی سیمینار ۱۸ر تا ۲۱ر اکتوبر ۱۹۹۳ء منعقد ہوا جس میں درج ذیل مسائل زیر بحث آئے:

(۱) انگریزی دواؤں کا حکم (۲) بیمہ کے احکام (۳) مشترکہ سرمایہ کمپنی سے متعلق احکام۔

(۱) انگریزی دواؤں سے متعلق ابتلاے عام اور مذہب صاحبین کے پیش نظر جواز کا حکم دیا گیا۔

(۲) بیمہ سے متعلق بتفصیل ذیل فیصلہ ہوا۔

(الف) انجن سے چلنے والی گاڑیوں کا جبری بیمہ حکومت کی جانب سے ایک جبری ٹیکس ہے اس کا ادا کرنے والا معذور ہے گنہگار نہیں۔

(ب) دکانات، مکانات اور ذرائع حمل ونقل کا اختیاری بیمہ ناجائز ہے۔

(ج) ریل گاڑی، ہوائی جہاز کے ٹکٹوں میں جو جبری بیمہ کی رقم دینی پڑتی ہے وہ بھی ٹیکس کی قبیل سے ہے۔ بوجہ جبر اس میں گناہ نہیں۔ مزید تفصیل "صحیفۂ فقہ اسلامی" میں دیکھیں جو ایک سال قبل شائع ہو چکا ہے۔

(۳) مشترکہ سرمایہ کمپنی پر کچھ مقالات ومباحث سامنے آئے مگر فیصلہ دوسرے سیمینار کے لیے ملتوی ہو گیا۔

دوسرا فقہی سیمینار ۱۹ر تا ۲۲ر رجب ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۳ر تا ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء منعقد ہوا جس کے موضوعات یہ تھے: (۱) مشترکہ سرمایہ کمپنی (۲) دوامی اجارہ اور پگڑی کا مسئلہ (۳) دیون اور ان کے منافع پر زکاۃ (۴) چک کی خرید وفروخت۔

اس سیمینار میں مذکورہ موضوعات کے تحت مقالات اور بحثوں کے بعد بھی کچھ ضروری امور تنقیح طلب رہ

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، اکتوبر ۱۹۹۷ء

گئے جن کے لیے مندوبین کو مزید تلاش وجستجو کر کے جوابات فراہم کرنے کی دعوت دی گئی اور مقالات وابحاث کو تنقیح طلب امور کے ساتھ ان کے یہاں چند ماہ کا موقع دے کر ارسال کیا گیا پھر تقاضے بھی ہوئے مگر صرف پانچ چھ حضرات نے جوابات لکھے جب کہ ایک طویل عرصہ گزر گیا اس لیے ارکان مجلس نے طے کیا کہ فقہ وفتویٰ سے دلچسپی رکھنے والے مقامی اور قریبی علما کو جامعہ اشرفیہ میں مدعو کر کے ان تنقیحات اور تنقیح طلب امور پر باقاعدہ مباحثے ہوں تا کہ کام آگے بڑھے۔ اس تجویز کے تحت ۱۱ر تا ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۴ر تا ۱۶ر دسمبر ۱۹۹۷ء تیسرا فقہی سیمینار منعقد ہوا۔ جس میں چھ نشستیں ہوئیں۔ روزانہ صبح ۸ر بجے سے ڈیڑھ بجے دوپہر تک پھر بعد مغرب سے دس بجے رات تک۔ ان نشستوں کی صدارت بالترتیب درج ذیل شخصیات نے فرمائی:

(۱) شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ سرپرست مجلس شرعی

(۲) عزیز ملت حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب دام ظلہ سرپرست مجلس شرعی

(۳) فقیہ ملت حضرت مفتی جلال الدین احمد امجدی دام ظلہ رکن فیصل بورڈ، مجلس شرعی

(۴) محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری دام ظلہ صدر مجلس شرعی

(۵) بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان اعظمی دام ظلہ شیخ الحدیث شمس العلوم گھوسی

(۶) شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ

ان نشستوں میں علماے کرام نے بڑی دل چسپی سے حصہ لیا اور اہم بحثیں ہوئیں، بعض امور فیصل بھی ہوئے لیکن کچھ باقی رہ گئے جن پر گفتگو کے لیے ۲۱ر ۲۲ر رجب ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۳ر ۲۴ر نومبر ۱۹۹۷ء اتوار، پیر کی تاریخیں مقرر کی گئی ہیں، مدعو حضرات کے علاوہ بھی جو اہل علم فقہ وفتوی سے دل چسپی رکھتے ہوں اور تنقیح طلب امور پر اپنی مدلل آرا بھیج سکتے ہوں ان سے گزارش ہے کہ یکم رجب ۱۴۱۸ھ تک اپنے جوابات ارسال فرما دیں۔ ممکن ہے جوابات موصول ہونے کے بعد مجلس انھیں بحث میں شرکت کے لیے دعوت نامہ بھی جاری کرے اس لیے اپنے اوقات میں اس کی بھی گنجائش رکھیں تو کرم بالاے کرم ہوگا۔

اسی مقصد کے تحت تنقیح طلب امور یہاں درج کیے جا رہے ہیں تاکہ جن حضرات تک دعوت نامہ نہ جا سکے ان کے جوابات سے استفادہ کی بھی راہ نکل سکے۔

تنقیح طلب امور:

(۱) مشترکہ سرمایہ کمپنی جس کے ذرائع آمدنی تین ہیں: ۱- ترجیحی حصص۔ ۲- قرض تمسکات۔ ۳- مساواتی حصص۔

ان میں سے پہلے دونوں تو قرض مع سود ہونے کے باعث ناجائز ہیں، تو اِن حصص والوں کی شرکت جائز ہے یا نہیں؟

دیون اور ان کے منافع پر زکات:

(۱) زر پیشگی کرایہ میں وضع ہونے سے پہلے قرض ہے یا کچھ اور؟

(۲) مال معصوم کی تعریف۔

(۳) زر ضمانت قرض محض ہے یا رہن محض ہے یا دونوں؟

(۴) اگر دونوں سے مشابہ ہے تو حکم زکاۃ مشابہت قرض سے متعلق ہوگا یا مشابہت رہن سے؟

(۵) کیا زر ضمانت مال ضمار کے حکم میں ہو سکتا ہے؟

(۶) لیجر بک میں منافع کا اندراج، قبضہ یا ملک ہے یا نہیں؟

(۷) زر ضمانت اگر دَین محض نہیں تو رہن محض بھی نہیں، تو جس طرح دَین محض کے احکام اس پر جاری نہیں ہوتے اسی طرح رہن محض کے احکام بھی جاری نہ ہوں گے؟

چک سے متعلق:

(۱) چک مال متقوم ہے یا نہیں؟ عامة الناس کے تعامل اور "الأمور بمقاصدها" کے پیش نظر اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔

(۲) چک حوالہ ہے یا اقبالہ یا وکالت؟

(۳) عوام کے چک اور شاہی چک کے درمیان فرق ہے یا نہیں؟

ان شاء المولی تعالیٰ تفصیلی رپورٹ اگلے مذاکرات کے بعد اشاعت پذیر ہوگی اس میں طے شدہ مسائل کا بھی تذکرہ ہوگا پھر جملہ مقالات و مباحث یا ان کی مناسب تلخیص الگ کتابی شکل میں شائع کرنے کی بھی کوشش ہوگی۔ تاکہ ان کی افادیت زیادہ عام ہو سکے۔ خدا کرے مجلس شرعی صحت و سلامتی اور تیز روی کے ساتھ اپنے مقاصد حسنہ سے ہم کنار ہوتی رہے۔

❁❁❁❁❁❁

مجلس شرعی اور مسائل جدیدہ[1]

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ — ۱۳۴۰ھ) کی ذات علوم و فنون کا ایسا مخزن تھی جس سے ہر فن کے شناوروں کی رہنمائی اور دست گیری ہوئی، لیکن انھوں نے اصلاح عقائد اور اصلاح اعمال کو اپنے اشہب قلم کی خاص جولان گاہ بنایا۔ اسی لیے ہمیں عقائد و فقہ کے ابواب میں ان کے رشحات قلم کا عظیم ذخیرہ ملتا ہے۔

ان کی بارگاہ میں بہت سے نو پیدا مسائل بھی پیش کیے گئے اور انھوں نے اپنی خداداد فقاہت و بصیرت سے انھیں اس قدر مفصل اور مدلّل طور پر حل کیا کہ دیکھنے والے ماہرین حیران و ششدر رہ گئے۔ یہاں بطور نمونہ درج ذیل رسائل کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں:

(۱) كفل الفقيه الفاهم في أحكام قرطاس الدراهم. ۱۳۲٤ھ

پہلے سونے چاندی کے سکّے اور کسی دھات کے پیسے چلتے تھے۔ جب کرنسی نوٹ معرض وجود میں آیا تو علمائے مکہ مکرمہ نے اس سے متعلق کئی اہم سوالات مرتب کیے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی خدمت میں پیش کیے۔ جواب میں مکہ مکرمہ کے اندر ہی اعلیٰ حضرت نے یہ رسالہ تصنیف کیا جس نے نوٹ سے متعلق تمام گوشوں کا بصیرت افروز حل پیش کیا۔

(۲) الأحلى من السُّكّر لطلبة سُكّر رُوسَر. ۱۳۰۳ھ

رُوسرل کی شکر صاف کرنے میں جاندار کی ہڈیوں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کے باعث اس شکر کی طہارت و نجاست اور حلت و حرمت سے متعلق سوال ہوا۔ جواب تو مختصر ہے لیکن اس جواب کی تمہید و تحقیق میں جو مقدمات سپرد قلم ہوئے ہیں وہ بڑے مفصل، جامع اور حقائق افروز ہیں جن کی روشنی میں فقہا بے شمار دوسرے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

(۳) المنى و الدُّرر لمَن عمد منى آردر. ۱۳۱۱ھ

ڈاک کے ذریعہ روپے بھیجنے کے لیے جب "منی آڈر" کا سلسلہ جاری ہوا تو شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کی حقیقت اور حکم کے بارے میں کئی سوالات رونما ہوئے۔ بعض ابنائے زمانہ ان کے جواب میں بڑی بڑی عجیب عجیب باتیں لکھ گئے۔ لیکن اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا یہ رسالہ منی آڈر سے متعلق تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے سب کا ایسا حکم واضح کرتا ہے جس کے سامنے آج موافق و مخالف سب کی گردنیں خم ہیں۔

(۱) صحیفہ مجلس شرعی، جلد دوم، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، مئی ۲۰۰۹ء۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے بعد بھی نئے مسائل پیدا ہوتے رہے اور ان کے خوان علم سے فیض یافتہ فقہاان کا شافی حل پیش کرتے رہے اور امت مسلمہ ان کے جوابات سے فیض یاب ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رضوی (۱۲۹۶ھ ـــ ۱۳۶۷ھ) اور مفتی اعظم ہند علامہ شاہ مصطفےٰ رضا قادری بریلوی (۱۳۱۰ھ ـــ ۱۴۰۲ھ) رحمهما الله رحمة واسعة کے نام خاص طور سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

لیکن بیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک معیشت، تجارت، صنعت و حرفت، طبّ وجراحت حتّٰی کہ عبادت وغیرہ سے متعلق بھی نئے مسائل کی اس قدر کثرت ہوگئی کہ علمائے عصر کے لیے سب کو سمیٹنا اور ہر ایک کا تشفی بخش حل پیش کرنا دشوار ہوگیا خصوصاً انفرادی طور پر کسی مفتی کا ان سب سے عہدہ برآ ہونا بڑا سنگین مسئلہ بلکہ لاینحل عقدہ بن گیا۔

جب حکومت کے ساتھ تجارت، معیشت، صنعت، طبابت وغیرہ میدانوں میں مسلمانوں کا غلبہ تھا تو اہل اسلام بالعموم کسی پیش قدمی سے پہلے شرعاً اس کے جواز وعدم جواز پر بھی غور کر لیتے۔ اور عموماً اپنا قدم جواز ہی کی راہ میں اٹھاتے۔ اور اگر کسی نے کوئی غلط اقدام کیا تو علمائے عصر کی بروقت تنبیہ سے اس کا خاتمہ یا بڑی حد تک اس کی روک تھام ہوجاتی۔

لیکن جب ان سب میدانوں میں یہود و نصاریٰ کا غلبہ ہوا تو وہ جائز و ناجائز کی پروا کیے بغیر بے شمار نئی نئی اسکیمیں اور نئی نئی صورتیں نکالنے اور دنیا بھر میں انھیں عام کرنے پر کمربستہ ہوگئے۔ ان کے سامنے صرف نفع عاجل کا حصول ہے۔ شریعت سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ مسلم حکومتوں میں بھی شریعت کی گرفت ڈھیلی ہوچکی ہے۔ ساتھ ہی بلند ہمتی، صحیح منصوبہ بندی اور جائز کے ذریعہ ناجائز سے دلیرانہ مقابلے کا بھی فقدان ہے۔ اس لیے شرور و مفاسد کا دائرہ روز افزوں ہے اور حق کی آواز نہایت مدھم اور کمزور۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان حالات میں بھی بہت سے مسلمان جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تفریق کر کے جائز و حلال ہی کو اپنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر ان کے پاس شریعت کا علم نہیں، اس لیے شش و پنج میں مبتلا رہتے ہیں۔

اب شرعی و دینی رہ نماؤں کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ نئی نئی صورتوں کا ماہرانہ جائزہ لیں اور ان سے متعلق شرعی احکام واضح کر کے پریشان حال امت کی دست گیری فرمائیں۔

اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے جامعہ اشرفیہ کے سربراہ اعلیٰ عزیز ملت حضرت مولانا شاہ عبد الحفیظ صاحب دام ظلہ نے جامعہ کے صدر شعبۂ افتا شارح بخاری حضرت مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کو اس طرف متوجہ کیا اور کئی بار کی گفت و شنید اور تحریک و اصرار کے بعد علمائے اشرفیہ کی ایک نشست میں ۲۳ر جمادی الآخرہ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو مجلس شرعی کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت شارح بخاری اس راہ کی مشکلات سے بخوبی آشنا تھے۔ اس لیے پیش قدمی میں انھیں سخت تامل تھا اور بعد کے تجربات نے تو سب پر واضح کر دیا کہ کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کام جاری ہے اور اہل اخلاص و عزیمت کی مساعی جمیلہ بار آور ہو رہی ہیں۔

سراج الفقہا حضرت مفتی نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے جب سے اس کی نظامت کی ذمہ داری سنبھالی ہے جامعہ کے بجٹ پر سیمیناروں کے مصارف کا بار بھی کم ہی آتا ہے۔ ان کی یا حضرت سربراہ اعلیٰ کی مخلصانہ گزارش پر ضرور کچھ ارباب خیر اخراجات کا بار الگ سے اٹھانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ بلکہ بعض علم دوست اور کشادہ دل حضرات از خود اس کی پیش کش بھی کرتے ہیں۔

خود مقالہ لکھنے، دیگر مقالات کی بحثوں کا جائزہ لینے اور حل کی راہیں تلاش کرنے میں بھی حضرت مفتی نظام الدین صاحب کا ابتدا ہی سے کلیدی رول رہا ہے۔ مذاکرات کی نظامت بڑی اہم ہوتی ہے۔ سب کو گفتگو کا موقع دینا، سب کی باتیں سننا، "خیال خاطر احباب" پر کاربند رہنا، بحثوں کو نتیجہ خیز راہ پر لانا، بڑے نازک مراحل ہیں۔ مگر مفتی صاحب سب کو بڑے فرحت بخش اور دل چسپ انداز میں سر کر لے جاتے ہیں۔ اور مذاکرات خوش گوار ماحول میں جاری رہتے اور اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ ان مبارک کاوشوں اور کامیابیوں پر ہم مفتی صاحب کو مجلس شرعی اور جامعہ اشرفیہ بلکہ پوری جماعت کی طرف سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور رب کریم و قدیر کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ مولا تعالیٰ انھیں استقامت، صحت و عافیت اور قوت و توانائی سے ہم کنار رکھے اور ہم سب کو دین و ملت کے لیے نفع بخش اور اہم خدمات انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ جامعہ کے ارکان و مدرسین، فارغین، متعلمین اور جملہ وابستگان اہل سنت و جماعت خیر کی راہوں میں اپنی اپنی وسعت اور مقدور کے مطابق سرگرم عمل رہیں اور ان کی کوششیں دنیا و آخرت میں بار آور اور مقبول ہوں۔ وما ذلك عليه بعزيز.

برادر گرامی مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب کی ایک روایت بار بار یاد آتی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

"پرانے مدرسے میں ایک بار ہم دو تین احباب حافظ ملت کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ عرض کرنے لگے: حضرت! یہ کام ہونا چاہیے، وہ کام ہونا چاہیے، اس میدان میں پیش قدمی کی ضرورت ہے، فلاں جانب توجہ بہت ضروری ہے۔ حضرت سر جھکائے خاموشی سے ہم لوگوں کی باتیں سنتے رہے۔ آخر میں سر اٹھایا اور فرمایا: **ہاں! یہ بھی ہوگا، وہ بھی ہوگا، سب کام ہوگا اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہیں سے ہوگا**، اس زوردار جواب پر ہم لوگ سناٹے میں آگئے اور تھوڑی دیر بعد خاموشی سے واپس چلے آئے۔"

اس گفتگو پر چونتیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ہم نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو حافظ ملت قدس سرہ کا فرمان روز بروز عملی شکل میں نمودار ہوتا جا رہا ہے۔ جامعہ اشرفیہ اور فرزندان اشرفیہ کے ذریعہ ملک و بیرون ملک مختلف میدانوں میں جلیل القدر خدمات بروئے کار آتی جا رہی ہیں۔ جبین اہل سنت شرمندہ نہیں تابندہ و فرخندہ ہو

رہی ہے اور اہل سنت کے مخلص عمائد وعوام جامعہ اشرفیہ کو ہر چہار جانب سے خراج تحسین اور تحفۂ اعتماد واعتبار پیش کر رہے ہیں۔ در حقیقت یہ سب اسی مرد حق آگاہ کا فیضان اور اسی "ابوالفیض" کی دعاے سحر گاہی ونالۂ نیم شبی کی جلوہ باریاں ہیں۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء، والله ذو الفضل العظيم.

مجلس شرعی کے اغراض و مقاصد میں سیمیناروں کے مقالات، ابحاث اور فیصلوں کی اشاعت بھی شامل ہے پہلے سیمینار کے دو موضوعات [الکحل آمیز دوا اور انشورنش] کے مقالات تو شائع ہو گئے۔ بعد کے سیمیناروں کی بحثوں کو کیسٹوں سے قلم بند کرنا بڑا دشوار ہوا، اور تعویق در تعویق ہوتی گئی، یہاں تک مزید سیمیناروں کے ساتھ خود مقالات ہی کا حجم بہت زیادہ ہو گیا۔ ہمتیں جواب دینے لگیں لیکن:

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود   مرد باید کہ ہراساں نہ شود

طے یہ ہوا کہ مقالات کو پانچ پانچ سو صفحات کی جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ نظر ثانی کر کے قابل حذف چیزوں کو حذف کر دیا جائے تاکہ ضخامت کچھ کم ہو سکے اور قارئین بھی تشویش سے بچ سکیں۔ میری مصروفیات اور حال زار پر رحم کرتے ہوئے ارکان نے یہ سب کام ناظم مجلس کے ذمہ رکھا اور حسب ضرورت تعاون کا بھی وعدہ کیا۔ کمپوزنگ دو سال قبل شروع ہو گئی مگر یومیہ معمولات ومشاغل میں کبھی کمی تو ہوتی نہیں، کسی طرح ایک پروف ریڈنگ کے بعد مفتی صاحب نے تھوڑا تھوڑا وقت نکالا اور بڑی حد تک نظر ثانی و ترتیب مکمل کر دی اور اب امروز و فردا میں کاپیاں پریس کے حوالے ہونے والی ہیں۔

مولا تعالیٰ اس مجموعے کو بہتر و مفید بنائے اور بقیہ جلدیں بھی جلد منظر عام پر لانے کی توفیق بخشے اور سب کو قبول عام وخاص سے سرفراز فرمائے۔ آمین یا رب العالمین، بجاہ حبیبك سید المرسلین علیه و علیهم و علیٰ آله و صحبه افضل الصلوات و التسلیم۔

آخر میں جامعہ اشرفیہ کے معزز ارکان، اساتذہ اور دیگر اسٹاف خصوصاً مجلس شرعی کے ارکان، مجلس کے سیمیناروں میں شرکت فرمانے والے علماے کرام، مجلس کے حوصلہ افزا معاونین اور کسی بھی جہت سے مجلس کی عزت افزائی کرنے والے مخلصین کی خدمات میں دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ امتنان وتشکر پیش ہے کیوں کہ مجلس کی فرحت افزا بہاروں میں کم وبیش سبھی کا حصہ ہے۔ رب تعالیٰ سب کو استقامت، عافیت اور دارین کی سعادتوں سے مالا مال فرمائے۔

(۵ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ/یکم مئی ۲۰۰۹ء، قبل نماز جمعہ)

کاش مسلمان اپنی قوت سے آشنا ہوں

اور اپنے دشمنوں کے مددگار نہ بنیں[1]

اسلام دشمن قوتوں میں سرفہرست یہود ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (مائدہ: ۸۲)

"ضرور اہل ایمان کی دشمنی میں تم یہود اور مشرکین کو سب لوگوں سے زیادہ سخت پاؤ گے۔"

قبل اسلام بھی یہود اپنی نافرمانی، سرکشی، انبیاے کرام سے بغاوت اور احکام ربانی سے عداوت میں معروف تھے انھوں نے حضرت عیسیٰ کو سولی دینے کا منصوبہ بنایا اور ان سے قبل خود بنی اسرائیل کے نہ معلوم کتنے نبیوں کو شہید کیا پھر سرور کائنات علیہ الصلوات والتحیات کی بعثت کے بعد یہود کی ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا باقی سب اپنی اسی پرانی روش پر رہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کی دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس وقت سے آج تک ان کی یہ کوشش ایک طویل منصوبہ بند اور منظم سازش کی شکل میں جاری ہے۔ عیسائیت کے ساتھ بھی ان کی سازش یہی رہی کہ اس کو ظاہری قوت اور مذہبی حرارت سے بالکل خالی کر دیں۔ جب عیسائیوں پر ان کا افسوں پوری طرح کام کر گیا تو ان کی جعل سازیوں کے مقابلہ میں مسلمان تنہا رہ گئے۔ سب سے پہلے انھوں نے مسلم حکومتوں یا حکمرانوں کو مسخر کرنے کی کوشش کی۔ ادارۂ اقوام متحدہ کے خوش نما اور دلفریب جال میں ساری دنیا کو پھنسایا، سب کو اپنے تابع بنایا، مسلم حکمرانوں کو اسلام کی روح سے دور کرنے اور مغربی تہذیب وثقافت سے قریب لانے کا سحر چلایا اور بیشتر کو مسحور بھی کر دیا لیکن اسلامی برادری پر اس کا جادو پوری طرح کام نہ کر سکا۔ مسلمانوں میں جو دین کے جاں نثار تھے وہ مغربیت کے شیطانی نظام سے ہمیشہ بیزار اور متنفر ہی نظر آئے اور ہر دور میں اکثریت ان ہی کی رہی۔ اس صورتِ حال نے یہودی دماغوں کو اضطراب و بے چینی میں ڈال دیا، وہ حیران و ششدر رہ گئے کہ جو سحر عیسائیت کو کھوکھلا کر گیا وہ اسلام پر کیوں کامیاب نہ ہو سکا؟ انھیں محسوس ہوا کہ مسلمانوں میں جب تک خدا و رسول کی عظمت و محبت، قرآن کی عقیدت اور آخرت کا یقین باقی ہے دین سے ان کی وابستگی و محبت باقی ہے۔ اس لیے انھوں نے ایسے پر

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، شمارہ جنوری ۱۹۹۹ء

فریب پروگرام اور ایسی دلکش اسکیمیں بنائیں جن کے جال میں پھنسنے کے بعد مسلمان اپنے دین سے خود ہی دور ہو جائیں۔ ان کا دینی عقیدہ ویقین کمزور ہو جائے اور وہ کسی طرح سچے پکے مسلمان نہ رہیں۔

انھوں نے شریعت اسلامیہ کے جائز و ناجائز کا بھی عام مسلمانوں سے زیادہ گہرا مطالعہ کیا۔ تجارت، صنعت، معیشت، معاشرت اور زندگی کے تمام شعبوں میں ایسی پُرفریب چیزوں کو داخل کیا جن سے متاثر ہو کر ایک مسلمان انھیں قبول کرلے اور اسے پتا بھی نہ چلے کہ میں اپنے مذہب سے دور ہو گیا۔ تعلیم کو انھوں نے دینی اور دنیاوی حصوں میں بانٹ دیا اور دنیاوی تعلیم ایسی رکھی جس سے روحانی اور دینی حرارت پیدا ہی نہ ہو سکے بلکہ جو کچھ موجود ہو وہ بھی ختم ہو جائے انھوں نے سنیما، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات ورسائل کا بھرپور استعمال کیا اور ایسے معاشرے کو پھیلانے کی کوشش کی جس میں دین، علم دین، علمائے دین اور احکام دین سے دوری پیدا ہو۔ بچے ماں باپ کی عظمت سے ناآشنا ہوں، اپنے فرائض اور باہمی حقوق سے غافل ہوں۔ لباس آرائش وزیبائش کے وہ نئے نئے سامان فراہم کیے جو مسلم تہذیب وثقافت سے نوجوانوں کو الگ کر دیں۔ وہ منظم طور سے اس کوشش میں لگے ہیں کہ مسلمان حرام وگناہ میں زیادہ سے زیادہ مبتلا ہوں اس لیے کہ انسان جتنا ہی گناہ کرتا ہے اس کی روحانی قوت کمزور ہوتی جاتی ہے، برائی سے الفت اور نیکی سے نفرت بڑھتی ہے تجارت میں سود کا رواج، ناجائز طور پر نفع اٹھانے کا رواج، بیوٹی پارلر، ناخن پالش وغیرہ میں ناپاک چیزوں کی آمیزش وغیرہ وغیرہ کا مقصود یہی ہے کہ مسلمان مرد وعورت حرمت و نجاست کی دلدل میں ایسا پھنسیں کہ یا تو وہ روزہ ونماز وغیرہ کے پابند ہی نہ رہ جائیں یا اگر ادائیگی کی کوشش کریں تو نجاستوں سے آلودگی کی وجہ سے صحت ہی نہ حاصل ہو یا ان میں روحانیت نہ برپا ہو۔ طبی طریقوں میں حلال راہوں کو چھوڑ کر حرام کو اپنانے اور اس پر زیادہ سے زیادہ تحقیق کر کے بہت مفید اور دلکش روپ، سحر انگیز عبارت، اور منفعت نما تقریروں کے ساتھ رواج دینے پر ان کی لابی مسلسل کام کر رہی ہے اور عیسائی دنیا اور نئی مسلم دنیا بھی ان کے طلسم ہوش ربا کا شکار ہو کر ان کی باتیں بے سوچے سمجھے دہرانے میں لگی ہوئی ہے بلکہ اسی کو رواج دینے میں اپنا کمال اور اپنی ترقی تصور کرتی ہے۔ فیا للعجب!

مسلمانوں کی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مغرب کی شاگردی چھوڑ کر خود اپنی استاذی کا حق ادا کریں اور اپنے دین کی روشنی میں اپنی معیشت، معاشرت، طبابت، صنعت وحرفت، ہر قسم کا نظام ترتیب دیں۔ مگر افسوس کہ جو حکمراں اور تعلیم یافتہ طبقہ اس میدان میں پیش قدمی کا سب سے زیادہ ذمہ دار تھا وہ خود سب سے پہلے مغرب کے افسوں کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود مغرب کو اسلام کی ذرا سی قوت اور مسلمانوں کی معمولی سی طاقت بھی سراسیمہ کر دیتی ہے۔ جہاد سے یہودیت آج بھی خوف زدہ ہے۔ اسی لیے عراق وعرب کی جنگی قوتوں کو ختم کرنے اور نام کی مسلم حکومتوں کے بھی

بال و پر کترنے کے لیے اس کا دماغ ہر وقت چکّر کرتا رہتا ہے۔ مسلم ممالک پر حملے اور ان میں طرح طرح کی اذیتوں میں بالواسطہ اور بلاواسطہ گرفتار کرنے کی سازشیں اسی خوف وسراسیمگی اور اضطراب وبے چینی کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہمارا حکمراں طبقہ اپنے ذاتی فائدے کو قربان کر کے امت مسلمہ کے مفاد کو ترجیح دیتا تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ مگر جو مادیت اور منفعت کی اندھی حرص میں پڑ گیا اُس کا دماغ اپنے دین اور اپنی قوم کی منفعت کہاں سوچ سکتا ہے؟

عام مسلمانوں کا جو فریضہ ہے وہ ان پر بہر حال عائد ہوتا ہے اور وہی اس وقت اسلام کی کشتی کسی طرح لے کر چل سکتے ہیں۔ وہ اگر یہودیت کے جال کو سمجھتے ہوئے شیطانی تہذیب سے دوری اور ربانی احکام کی پابندی پر کاربند ہو جائیں تو یہودیت کا خواب پورے طور سے کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

دین حنیف سے مسلمانوں کی وابستگی اور مغربیت کے تیز جھونکوں کی زد پر اسلامی احکام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا چراغ جلانے کی روش ان کی روحانیت کو ضرور قوت دے گی اور ان کے اندر کا طاقتور ایمان اور ان کے پاکیزہ ماحول کا اثر انگیز اسلام شیطانی قوتوں کی تسخیر کے میدان میں ایک دن ضرور رنگ لا کر رہے گا۔

کاش مسلمان اپنی قوت کو پہچانیں، اپنے دین کی قدر کریں، اپنے احکام کی عظمت سمجھیں، اپنے دشمنوں کے پھیلے ہوئے جال سے چوکنّا رہیں۔ نہ ان کی تہذیب اپنائیں نہ روزہ نماز اور دیگر احکام اسلام کو ترک کر کے دشمن کے منصوبے کو کام یاب کریں، نہ اپنی روحانی وایمانی قوت گھٹائیں، نہ اپنا ضمیر اور دل مردہ وخوابیدہ ہونے دیں، بلکہ نفس وشیطان اور ان کے آلۂ کار انسانوں کو خوب پہچان کر ان کے ہر حربے کو ناکام بنائیں، لباس، تہذیب، معاشرت، عادات واطوار، رہن سہن، معاملات ہر راہ سے آج ان کے اوپر حملہ ہو رہا ہے۔ خدارا حملہ آوروں کی مدد کر کے اپنی موت کا سامان نہ کریں بلکہ ایک زندہ قوم اور زندہ وتابندہ اسلامی تشخص کے ساتھ جینے کی تدبیر کریں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ اسلامی حکومتوں کی توانائی کے زمانے میں تو ایک مسلمان کا گناہ صرف اس کی خرابی تک محدود رہ سکتا تھا کیونکہ دوسروں کو بچانے والی قوتیں موجود تھیں مگر آج گناہوں کو اپنانے کا مطلب ہے باطل کے خفیہ منصوبوں کو کام یاب بنانا اور اپنے ہی کو نہیں بلکہ اپنے معاشرے اور اپنی قوم کو بھی تباہی کے دہانے تک پہنچانا۔ آج پہلے سے بھی زیادہ ہمیں اپنے ظاہری وباطنی اسلحوں اور اپنی روحانی قوتوں سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے۔ واللہ المستعان. وعلیہ التکلان. والصلاۃ والسلام علیٰ حبیبہ سیّد الانس والجان وعلیٰ اٰلہ وصحبہ ما تعاقب الملوان.

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

یک روزہ دینی وملی سیمینار

بعنوان: مسلمان اور مستقبل —— اندیشے اور امکانات

بتاریخ ۴؍صفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۴؍اکتوبر ۲۰۱۸ء یک شنبہ
بمقام: رائل پیلس میرج ہال، سمودھی روڈ، پورہ رانی، مبارک پور
زیر انتظام: کنزالدارین آرگنائزیشن۔ مبارک پور۔ اعظم گڑھ۔ یوپی

خطبۂ صدارت

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّي وَ نُسَلِّمُ عَلٰى سَيِّدِ الْعَالَمِيْنَ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ صَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

۲۳؍جمادی الآخرہ ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۲؍مارچ ۲۰۱۸ء کو ایک اجلاس میں شرکت کے لیے بحرالعرفان مفتی آفاق احمد مجددی دام ظلہ نے مجھے قنوج مدعو کیا۔ وہاں حاضری کے بعد معلوم ہوا کہ رات کے اجلاس سے پہلے دن کو ایک سیمینار بھی ہے جس کا عنوان ہے "مسلمان اور مستقبل —— اندیشے اور امکانات" بعد ظہر کی نشست میں تھوڑی دیر کے لیے میں بھی شریک ہوا اور مندوبین کے افکار وخیالات اور ہدایات سن کر متاثر ہوا۔ میرے ساتھ مولانا سلمان شاہد مبارک پوری بھی تھے، یہ اُس سیمینار سے اس حد تک محظوظ ہوئے کہ اسی عنوان پر خود مبارک پور میں ایک سیمینار منعقد کرنے کا ارادہ کر لیا۔ واپسی کے بعد اپنے احباب اور معاونین سے مشاورت اور بحرالعرفان کی اجازت وہدایت کے مطابق ۱۴؍اکتوبر ۲۰۱۸ء کی تاریخ مقرر کرلی۔

میں سیمینار منعقد کرنے والے تمام منتظمین اور معاونین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک دینی وملی موضوع کے تحت پیش قدمی کی، اہل علم اور دردمند حضرات کو جمع کیا اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے اور سننے سنانے کا گراں بہا موقع فراہم کیا۔ فَجَزَاهُمُ اللهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ.

ان شاء المولیٰ تعالیٰ ہم اور آپ اہل قلم کے مفصل یا مختصر خیالات، ہدایات اور تدابیر سے جلد ہی مستفید ہوں گے۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں پر شدائد وآفات اور مصائب ومشکلات کے جو حملے ہو رہے ہیں ان میں حکومتوں کی بدنظمی یا ظلم وتعصب کی ساری کارفرمائی ہے۔ اس سے بالکلیہ انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، مگر اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ خود ہمارے اندر کیا خامیاں ہیں؟ غیر تو ہمیں مسلمان سمجھ کر نشانۂ ستم بناتا ہے مگر اسلام سے ہمارا شغف اور اس کے احکام پر ہمارا عمل کس حد تک ہے؟

ظاہری حکومت کسی کی ہو مگر حاکم حقیقی رب العالمین ہے، اس نے بندوں کو نیست سے ہست کیا اور ہر آن ان کی تربیت اور پرورش فرمانے والا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے بندوں پر کچھ فرائض اور احکام بھی عائد کیے ہیں اور ان سے سرتابی کے خطرناک انجام سے بھی خبردار کیا ہے۔ بندے اس کے ہیں، حکومت اس کی ہے، حکم اس کا ہے، اس لیے ایسے خالق ومالک ورازق احکم الحاکمین کے حکم سے سرتابی بھی کوئی معمولی سرتابی نہیں اس لیے اس کی سزا بھی غیر معمولی ہوگی اور بالکل بجا ہوگی۔

ارشاد ربانی ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ [سورۃ النور، آیت:۶۳]

"ڈریں وہ لوگ جو اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس بات سے کہ انھیں کوئی فتنہ پہنچے یا دردناک عذاب پہنچے۔"

دردناک عذاب تو عذابِ جہنم ہے، فتنہ کیا ہے، اس بارے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں:

(۱) حضرت مجاہد تابعی فرماتے ہیں: فتنہ سے مراد دنیا کی آفت ومصیبت ہے۔
(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے: یہ قتل کی مصیبت ہے۔
(۳) حضرت عطا تابعی نے فرمایا: یہ زلزلے اور خطرناک حوادث ہیں۔
(۴) حضرت جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رب کے حکم کی خلاف ورزی پر آنے والا فتنہ یہ ہے کہ کسی ظالم وجابر بادشاہ کو مسلط کر دیا جائے۔
(۵) حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: وہ فتنہ یہ ہے کہ دل رب کی معرفت سے الگ اور سخت ہو جائے۔

(۶) حضرت جراح رحمہ اللہ تعالیٰ فتنہ اسے بتاتے ہیں کہ بطور استدراج بندے پر نعمتوں کی فراوانی ہوجائے۔

(۷) حضرت ضحاک اور عبدالرحمٰن بن زید رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ فتنہ یہ ہے کہ دلوں پر مہر کردی جائے یعنی ان سے طاعت کی بجاآوری اور سچی نصیحت سننے اور ماننے کی صلاحیت سلب کرلی جائے۔

(مواهب الجليل لتجلية مدارك التنزيل)

ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں۔ قرآن کریم کا لفظ "فتنہ" سبھی کو شامل ہے۔ یہ فتنہ کسی بھی صورت میں رونما ہوسکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے مگر ہماری توجہ اس طرف نہیں ہوتی۔ ہم کسی دنیاوی آفت ومصیبت کو اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ سارا الزام غیروں کے سر ڈالتے ہیں۔ یہ خود ایک مصیبت ہے کہ انسان اپنا اور اپنے اعمال کا محاسبہ نہ کرے اور احکم الحاکمین کی گرفت کا خیال بھی خاطر میں نہ لائے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝

"اور تمھیں جو مصیبت پہنچی وہ اس کے سبب سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور بہت کچھ تو معاف فرمادیتا ہے۔"

اللہ ہدایت دے اور خلاف ورزی سے بچائے۔ بیدہ الخیر، و هو المستعان.

حضرات! ان چند الفاظ میں اہل دل اور ارباب دانش وبینش کے لیے میں نے بہت کچھ عرض کردیا۔ یوں باتیں تو اور بھی ہیں مگر میں قصداً ترک کرتا ہوں۔ جہاں تک ہوسکے ہمیں مندوبین کو موقع دینا ہے اور سنانے سے زیادہ سننے اور عمل کرنے پر توجہ صرف کرنی ہے۔ و أخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

۴؍ صفر المظفر ۱۴۴۰ھ ۱۴؍ اکتوبر ۲۰۱۸ء۔ یک شنبہ

❁❁❁❁❁❁

مدارس اسلامیہ کا تعلیمی معیار (۱)

انحطاط کے اسباب وعلل اور ان کا علاج:

عربی مدارس کسی بھی جماعت کے ہوں سب کا حال یکساں ہے۔ بعض ایسے ہیں جن کا معیار تعلیم بڑی حد تک قابل تحسین وستائش ہے۔ اور زیادہ تر وہ ہیں جن کا حال خراب ہے اور مدارس عربیہ سے ابتر حال بیش تر کالجوں اور اسکولوں کا ہے۔ جس کے نتیجے میں پورے ملک کے طول وعرض میں سند یافتہ نااہلوں کی بہت بڑی بھیڑ جمع ہوتی جا رہی ہے۔ جب کہ ہماری حکومت کا کثیر سرمایہ بھی ان کے اوپر خرچ ہوتا ہے۔ لیکن صورت حال نے دانشوروں کو محو حیرت بنا رکھا ہے۔

بروقت ہمارا موضوع صرف مدارس اسلامیہ سے متعلق ہے اس لیے ان ہی کے حالات پر اپنی گفتگو محدود رکھنا ضروری ہے۔ معیار تعلیم کی بلندی اور پستی میں نصاب تعلیم اور نظام تعلیم دونوں کا دخل ہوتا ہے لیکن بعض حضرات پستی معیار کے سلسلے میں سب سے زیادہ قصور وار نصاب تعلیم کو ٹھہراتے ہیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ موجودہ نصاب قابل ترمیم واصلاح ہے۔ اس کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ نظام تعلیم اگر ابتری وپراگندی کا شکار ہو تو اچھے سے اچھا نصاب بھی بے ثمر اور بے سود ہے۔ اور تعلیم وتربیت کا نظام بہتر ہے تو موجودہ نصاب سے کچھ زیادہ قدیم اور فرسودہ نصاب بھی حیرت انگیز اور افادیت سے لبریز ثمرات ونتائج قوم کے سامنے پیش کرچکا ہے۔ اور اس نے ایسے ایسے سلاطین علم دین پیدا کیے ہیں جن کا تذکرہ آج بھی دنیا کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

تعلیمی مراحل:

مدارس کی تعلیم چند مراحل میں تقسیم ہوتی ہے:

(۱) ابتدائی (پرائمری) تعلیم (۲) عربی وفارسی درجۂ اعدادیہ سے متوسطات (درجۂ رابعہ) تک (۳) درجۂ عالمیت وفضیلت (درجۂ حفظ وقراءت سے سر دست اغماض کیا جاتا ہے، اس کی بہتری وابتری کے اسباب معمولی غور وخوض یا دیگر درجات کے احوال سے دریافت کیے جاسکتے ہیں) مدارس بھی تین قسم کے ہیں: (۱) بعض میں صرف ابتدائی تعلیم ہوتی ہے (۲) بعض میں متوسطات تک (۳) بعض میں فضیلت تک۔

---
(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، شمارہ اکتوبر ۱۹۸۹ء

اجمالی حال:

اور تینوں ہی اقسام میں کچھ معیاری اور عمدہ ہیں اور زیادہ تر غیر معیاری اور پراگندہ حال۔ قصور طریق تعلیم کا ہے جس کی ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ اور ناتجربہ کار اساتذہ کے تقرر کا جرم انتظامیہ پر عائد ہوتا ہے اور انتظامیہ کی بعض مجبوریوں کی ذمہ داری مسلم عوام کے سر جاتی ہے۔

تفصیل و تمثیل:

اس اجمال کی تفصیل کے لیے چند مثالیں درکار ہیں:

(الف) ناظرہ کی تعلیم کے لیے حروف شناسی اور حروف کی صحیح ادائگی پیدا کرنا پہلا کام ہے۔ پھر حروف کی ترکیب اور ان کے صحیح تلفظ اور روانی کے ساتھ از خود پڑھنے کی لیاقت پیدا کرنا دوسرا کام ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بچہ زندگی بھر قرآن غلط پڑھتا رہے گا۔ یا اس میں خود سے پڑھنے کی صلاحیت نہ آسکے گی۔ اور خام کا خام ہی رہ جائے گا۔ اسی طرح اردو قاعدہ، اردو زبان، اور اردو املا و نقل اور حساب وغیرہ جملہ مضامین کو مختصر طور پر سمجھیں کہ اگر معلم نے ہر جگہ صرف بتانے یا رٹانے کی کوشش کی اور طالب علم میں سمجھنے اور خود لکھنے پڑھنے درست کرنے کا ذہن نہیں پیدا کیا تو وہ وقتی امتحانات اگرچہ ادنیٰ یا اوسط نمبروں سے پاس کرلے جائے مگر اگلے معلم کے لیے دردِ سر بنے گا۔

(ب) عربی گرامر اور ابتدائی زبان و ادب کا بھی یہی حال ہے، اگر قواعد کا اجرا نہ ہوا اور زبان کی کتاب میں الگ الگ ہر لفظ اور اس کے معنی کی شناخت پھر ترکیب کی معرفت اور ترجمہ کی مشق طالب علم کے اندر پیدا نہ ہوئی اور معلم نے صرف قواعد رٹا کر اور اپنی زبان سے عبارت و ترجمہ سب کچھ بتا کر چھٹی کر دی تو متعلم کورا ہی رہ جائے گا۔ اور اگلے درجات میں جاکر دردِ سر بنے گا۔

(ج) منطق کی تعلیم میں اصول و قوانین یاد کرانے کے ساتھ کلیات خمسہ کا اجرا، دو کلیوں اور ان کی نقیضوں کے درمیان نسبتوں کی شناخت کے لیے کافی مثالوں کے ذریعہ مشق، اسی طرح قضایا مطلقہ و موجہہ، تناقض و عکوس، پھر اشکال اربعہ یا ثلثہ کی عملی مشق، اسی طرح موادّ اقیسہ پر مثالوں کے ذریعہ بحث اور استدلال کی خوب خوب تمرین ضروری ہے۔ ورنہ قاضی مبارک تک پڑھ لینے کے بعد بھی طالب علم کسی دلیل کے اندر صغریٰ و کبریٰ کی تعیین اور شکل کی تعیین۔ اسی طرح دلیل کی صورت یا مادّہ میں پائے جانے والے سقم کی تعیین سے قاصر ہی رہے گا۔ اس کام کے لیے مروجہ نصابی کتابوں کو تبدیل کرکے ایسی کتابیں لائیں جو ان سب تمرینات پر خود ہی مشتمل ہوں، یا ان ہی کتابوں سے کام چلائیں بہرحال یہ کام ضروری ہے۔

اسی طرح بلاغت و عروض وغیرہ فنون کو بھی سمجھنا چاہیے کہ صرف کتاب کی شاندار اور دل چسپ تقریر کردینا

کافی نہیں۔ بلکہ فنی ملکہ پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم عموماً نوآموز اور غیر تربیت یافتہ (اَن ٹرینڈ) معلّمین کے سپرد کر دی جاتی ہے جن کے لیے کتاب سمجھ لینے کے بعد اسے سمجھا دینا ہی بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ طالب علم کے نفسیات کو سمجھنا، اس کی غلطیوں کے پس پشت خطائے ذہنی کا ادراک کرنا، پھر اس کی اصلاح اور اس میں فنّی لیاقت پیدا کرنا ایسے معلم کے لیے تو محال عادی کا درجہ رکھتا ہے۔ اب خطا معلّم تک محدود نہ رہی بلکہ انتظامیہ کے سر بھی آئی جس نے نہ تو ابتدائی تعلیم کی اہمیت کا ادراک کیا نہ اس کے مطابق مدرس کا تقرر کیا۔ رہا سوال تنخواہ کی زیادتی اور اچھے معلم کے لیے کافی سرمایہ کی فراہمی کا؟ تو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مدارس کے ارکان تعمیر کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور قوم کو یہ اہمیت سمجھا کر اس سے کافی سرمایہ حاصل کرتے اور تعمیری کام میں لگاتے ہیں۔ اگر قابل مدرس کی قدر و قیمت اور اس کے لیے سہولیات فراہم کرنے کی اہمیت بھی انتظامیہ سمجھ لے تو اسے سمجھا کر اس کے لیے بھی سرمایہ حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن ہم نے اب تک نہ سنا کہ کسی صاحب خیر کو یہ بتایا گیا ہو کہ تعلیمی نظام کے استحکام وارتقا کے لیے اعلیٰ ذہن و دماغ کی ہمیں ضرورت ہے۔ اور اس کی خدمات پر ہم کافی سرمایہ صرف کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ بیس سال بعد از کار رفتہ ہونے کے بجائے چالیس سال تک ہمارے ادارے کا ساتھ دے سکے۔ اور قوم کے لائق و فائق افراد پیدا کرتا رہے۔ اگر انتظامیہ یہ اہمیت اپنے معاونین کو ذہن نشین کرائے اور وہ اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو یقیناً یہ خطا انتظامیہ سے منتقل ہو کر ہمارے سرمایہ دار طبقہ کے سر جائے گی۔ جس کی اصلاح سب کی ذمہ داری ہوگی۔

ذمہ داروں کا فرض:

ارکان ہی نہیں مقررین، علما، اہل قلم سب کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو اس کا صحیح منصب و مقام دلائیں۔ اور قوم کا فکری معیار ظاہر کی دل کشی سے بلند کر کے باطن کی ہمہ گیر افادیت کی طرف بھی منتقل کریں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان کے عظیم انقلاب وارتقا کا اصل راز یہ ہے کہ اس نے تعلیم اور ماہرین کی تخریج پر پوری قوت صرف کردی۔ مدرس کے لیے ڈپٹی کمشنر کی صلاحیت اور وزیروں کے برابر سہولیات لازم کر دیں۔ جس کے حیرت انگیز نتائج پوری دنیا کے سامنے ہیں۔

تفصیل مشکلات:

امراض وعلاج اتنے ہی پر بس نہیں، بہت ہیں۔

(ا) ان میں سے درجاتی ترقی اور امتحانی نظام کی بے قاعدگی بھی ہے۔ بہت سے مدارس کا امتحانی نظام بالکل

ڈھیلا اور محض رسمی ہے۔ جس سے طالب علم کی صحیح صلاحیت اور مدرس کی اصل کارکردگی کا کبھی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد بھی ترقی کے لیے ۳۳٪ نمبر حاصل کرنے کی شرط پوری ہو یا نہ ہو ترقی مل جاتی ہے۔ جب کہ راقم الحروف کا نظریہ یہ ہے کہ پرائمری سے عربی و فارسی کی طرف منتقل ہونے والا طالب علم اگر ۵۰٪ سے کم نمبر لایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی وہ اردو حساب وغیرہ میں بہت کمزور ہے۔ اور آگے چل کر عربی درجات میں بھی وہ پریشان کن ہوگا۔ اسی طرح درجۂ اعدادیہ، اولی، ثانیہ کے اندر ابتدائی زبانوں اور قواعد کے پرچوں میں ۳۳٪ نمبر لانے پر طالب علم کو کامیاب اور لائق ترقی تصور کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ دو تہائی سے زیادہ قواعد جو کھو چکا ہو وہ ہرگز اگلی کتابوں میں چلنے کے لائق نہیں۔ اس لیے ابتدائی زبان و قواعد کے پرچوں میں کم از کم ۶۰٪ نمبر حاصل کرنا ترقی کے لیے لازم ہونا چاہیے۔ کیوں کہ بنیاد کمزور ہو جاتی ہے تو آخر تک عمارت کمزور ہی رہتی ہے۔

(۲) مقدار تعلیم کی کمی بھی پستی معیار کا باعث ہے۔ ابتدائی کتب خصوصاً قواعد کی کتابیں مکمل پڑھانا اور ان کا اجرا کرانا ضروری ہے۔ ہدایۃ النحو اگر آدھی، تہائی، دو تہائی پڑھا دی گئی اور طالب علم نے خوب یاد بھی کر لی، جب بھی ابھی سیکڑوں باتیں اس کی نظر سے اوجھل ہی رہیں۔ اگلی کتابوں میں جہاں ان سے سابقہ پڑے گا، طالب علم الجھن میں پڑے گا۔ اس لیے نحو میر اور ہدایۃ النحو اجرا کے ساتھ مکمل ازبر کرانا ضروری ہے۔ اسی طرح علم الصیغہ بھی مکمل ہونی چاہیے۔ تاکہ قواعد کے ساتھ اجرا کا کام بھی ہو جائے۔ ورنہ قواعد میں پختگی بھی نہ ہوگی اور الفاظ کی اصل و مادہ اور تعلیل و تغیر کے فہم میں تیزی بھی نہ آسکے گی، جب کہ دونوں کے بغیر سخت دشواریاں ہوتی ہیں۔ اور فضیلت تک پہنچ جانے کے بعد بھی اس بنائے خام کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے رہتے ہیں۔

ارکان و اساتذہ مذکورہ امور کی طرف بلند ہمتی اور ثابت قدمی کے ساتھ متوجہ ہوں تو معیار تعلیم بڑی حد تک بہتر ہو سکتا ہے۔ کچھ خرابیاں اور رہ جاتی ہیں جن میں بہت سے مدارس مبتلا ہیں۔ ان کی صرف فہرست گنا دیتا ہوں علاج کچھ بھی نہیں، سوا اس کے کہ مزاج تبدیل ہو اور علم و تعلیم کی قدر و قیمت سے دل و دماغ میں غیر معمولی جرأت و ثبات اور حوصلہ مندی پیدا ہو۔ کیوں کہ ان خرابیوں کا سرچشمہ یہی پست فکری اور کم ہمتی ہے۔ جب تک یہ برقرار رہے گی کوئی دوا نہ استعمال میں آئے گی، نہ اثرانداز ہوگی۔

اب فہرست ملاحظہ ہو:

(۱) بعض مدارس میں طلبہ کو غیر تعلیمی امور میں مشغول کرنا۔ مثلاً قرآن خوانی وغیرہ کے لیے بھیجنا جس میں روزانہ کئی قیمتی گھنٹے صرف ہو جائیں۔ فصل کٹنے کے مواقع پر مہینوں یا کم و بیش طلبہ و مدرسین کا تعلیم و تعلم چھوڑ کر غلہ کی وصولی میں لگنا۔ اسی طرح کسی بھی غیر تعلیمی کام میں مدرس کا وقت یا طالب علم کا وقت قابل لحاظ مدت تک

مصروف کرنا۔ یقیناً غیر معمولی انحطاط و پستی کا سبب ہوگا۔ انتظامیہ کی اس قسم کی حرکتوں کا مقصد ادارہ چلانے کے لیے روابط قائم کرنا، رقم حاصل کرنا یا اخراجات کا بچانا ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ چیزیں ضروری ہیں لیکن تعلیم کی ترقی کے لیے اگر ان وسائل کو اس طرح حاصل کیا جائے کہ مقاصد نظرانداز ہو جائیں تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ در اصل رقم فراہم کرنا یا بچانا ہی اصل مقصود ہے۔ اور تعلیم محض بہانہ و وسیلہ۔

(۲) نظام تعلیم کا ڈھیلا پن اور حد سے زیادہ نرمی و رواداری اور تعلقات و محبت کی پاس داری بھی تعلیم کو پستی کی طرف بڑھانے والی چیزیں ہیں۔ اس خصوص میں طلبہ کی کثرت سے غیر حاضری، مدرسین کی رخصتوں کی زیادتی اور ان سب سے ذمہ داروں کی بے اعتنائی اور بہت سی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ مدرسہ میں حاضر ہونے کے باوجود بھی درس سے مدرس یا طالب علم کی غیر حاضری، طلبہ کی آزادروی، سیر و سفر، لہو لعب کی طرف غیر معمولی میلان، نماز و جماعت سے غفلت، مطالعہ و محنت سے دوری، جلسوں اور قسم قسم کے پروگراموں میں روز بروز طلبہ کی شرکت۔ یہ سب خرابیاں خامی نصاب کی نہیں بلکہ ضعف نظام کی پیداوار ہیں۔

(۳) لائبریری، دار المطالعہ اور تعلیمی ترغیب کے اسباب سے دوری بھی بہت سے طلبہ کو بے راہ بنا دیتی ہے۔ اور بہت سے طلبہ کی فکری بلندی و ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اگر لکھنے پڑھنے کا سامان طلبہ کے گرد و پیش جمع ہو اخبارات و رسائل اور دل چسپ صالح کتابوں کی کثرت ہو تو کم استعداد طالب علم بھی دوسرے لہو و لعب کی طرف جانے کے بجائے ان ہی میں مشغول ہوگا اور کسی لائق بن جائے گا۔ اور اچھی صلاحیت والا اپنی استعداد کو خاطر خواہ ترقی دے سکے گا، جو ادارہ اور قوم و ملت، سب کے لیے مفید ہوگا۔

مذکورہ اسباب انحطاط کے پیچھے بھی کچھ اسباب کار فرما ہیں۔ جس کا خواہی نخواہی ارکان و مدرسین کو شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان سب کا مختصر جائزہ اور حل پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

(۱) بہت سے مدارس دوہرے نصاب تعلیم سے زیر بار ہیں۔ گورنمنٹ سے الحاق کی وجہ سے انھیں درس عالیہ کا نصاب بھی پڑھانا پڑتا ہے اور درس نظامی کا بھی۔ اور دونوں کا امتحان، پھر ہر امتحان کی تیاری بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ جب امتحان عالیہ کا وقت آتا ہے تو درس نظامی چھوڑ کر طلبہ و مدرسین اس امتحان کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ نتیجۃً کوئی نصاب مکمل نہیں ہوتا۔ اور استعداد بھی ناقص رہ جاتی ہے۔

(۲) مدارس اسلامیہ صرف تعلیم و تدریس کا مرکز نہیں ہوتے بلکہ مسلمانوں کی دینی و ملی زندگی کا مرجع اور ان کے رہنما بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے مسلمان اپنے تبلیغی جلسوں، فاتحہ، نکاح، جنازہ، حتیٰ کہ جادو آسیب وغیرہ ضرورتوں اور پریشانیوں کے وقت بھی مدارس ہی کا رخ کرتے ہیں۔ اگر ان اوقات میں ان کی دست گیری نہ کی جائے تو عوام کی بددلی اور روابط کی کمی کے ساتھ یہ بھی خطرہ ہوتا ہے کہ دین اور دینی رہنماؤں سے دور ہو کر بے راہ ہو جائیں۔ ان

اندیشوں کے تحت انتظامیہ جیسے بھی ہو عوامی ضرورت پوری کرنے کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اور اپنے مدرسین وطلبہ کو اس میں لگا دیتی ہے۔ جس کا نمایاں اثر تعلیم پر پڑتا ہے۔ اور کام نکل جانے کے بعد کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ انتظامیہ نے کس مجبوری اور خطرہ کے پیش نظر اس جرم کا ارتکاب کیا۔ بلکہ لوگ اسے سند کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنی حاجت روائی کا لائحۂ عمل قرار دیتے ہیں۔ بعض مدرسین اپنے ذاتی تعلقات اور علاقہ گیریا ہمہ گیر مقبولیت و مرجعیت کے باعث براہ راست بھی اس طرح کے حالات کا شکار ہوتے ہیں۔ اور ملی ضرورت کے پیش نظر ادارہ کافی تعلیمی خسارہ سے دوچار ہوتا ہے۔ جس پر کوئی سخت کاروائی بھی نہیں ہو سکتی۔ بعض مدرسین اپنی تنخواہوں کی کمی اور ضروریات کی زیادتی کے باعث بھی تدریس کے ساتھ تقریری یا تجارتی میدان کا رخ کرتے ہیں۔ کبھی اپنی غربت وکم مائیگی کی صعوبتیں دور کرنے سے زیادہ عوام کی نظر میں ایک دولت مند سی عزت پیدا کرنے یا معیار زندگی بلند کرنے کا جذبہ بھی غیر تعلیمی مصروفیات کا محرک ہوتا ہے۔ پھر ایسے مدرسین کو یہ پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ ادارہ نے ہمارے اوپر کوئی کاروائی کی تو ہم کیا کریں گے۔ کیوں کہ ان کا "منفعت بخش اور تابناک مستقبل" ان کے سامنے ہوتا ہے۔ جب کہ انتظامیہ کے لیے کسی لائق مدرس کا حصول ایک اہم مسئلہ ہے۔

(۴) اسی طرح کسی ہنگامی ضرورت یا خسارہ کو پورا کرنے کے لیے غلّہ کی وصولی اور چندے وغیرہ میں انتظامیہ کے لیے مدرسین و طلبہ کو لگانا بھی بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور اس کی قیمت تعلیمی نقصان کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ طلبہ کی علمی بے رغبتی کے پیچھے بھی بہت سے اسباب و عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

اولاً: مسلمانوں کا سرمایہ دار طبقہ دینی تعلیم کی طرف میلان ہی نہیں رکھتا۔ وہ اپنی دولت سے دوسرے مسلم بچوں کی مذہبی تعلیم کا ذمہ لے سکتا ہے لیکن خود اپنی اولاد کے لیے اس تعلیم کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ بیش تر ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو خود دین دار ہیں لیکن اپنی اولاد کو پرائمری تک بھی دینی تعلیم دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اور اپنی عزیز نسل کو غیروں کے زرق برق ماحول میں ڈال کر اس کے لیے الحاد و لادینیت کے سارے وسائل بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ فراہم کر کے خوش رہتے ہیں کہ

شادم از زندگیٔ خویش کہ "کارے دارم"

ثانیاً: متوسط اور معمولی طبقہ جو اونچی دنیاوی تعلیم دلانے سے قاصر ہے یا دین دار ہونے کے ساتھ دینی تعلیم کی ضرورت کا شدید احساس بھی رکھتا ہے اس لیے اپنی اولاد کو مدارس اسلامیہ کے حوالے کرتا ہے۔ ان میں بعض یا نصف کُند ذہن پائے جاتے ہیں اور اکثر تعلیم کی اہمیت سے نابلد ہوتے ہیں۔ سرپرستوں یا اساتذہ کے دباؤ کی وجہ سے مجبوراً تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی منصوبہ اور کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ اب ان کے فکرو

مزاج کی تبدیلی و ترقی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

لیکن پرائمری یا ابتدائی عربی درجات کے سستے اور از کار رفتہ مدرسین بھی اگر لاپروا اور کام چلاؤ قسم کے مل گئے تو پھر ان طلبہ کی آزادی، بے راہ روی اور تباہی کا پورا ہی سامان فراہم ہو گیا۔ ان میں جو ذہین ہوئے اور اپنے مادّی مستقبل پر غور کیا تو ان کو تقریر کا میدان یا کوئی دوسرا میدان زیادہ منفعت بخش نظر آیا۔ اسی میں کوشش کی اور تعلیم میں امتحان پاس کرنے سے زیادہ محنت کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ بہت قلیل تعداد ایسی بچتی ہے جو علم کی جویا اور خدمت دین کی شائق ہو، اسے بھی اگر محنتی، ماہر اور پابند اوقات مدرسین نہ ملے، یا محنت و مطالعہ کی سہولتیں اور تعلیمی ترقی کے وسائل فراہم نہ ہوئے تو یہ بھی خام اور ناقص ہی رہ جاتی ہے۔

ثالثاً: بیش تر مدارس میں لاپروا، کھلاڑی اور شریر طلبہ جمع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنا ایک غالب گروہ اور حاوی ماحول بنا لیتے ہیں۔ جس سے سبھی متاثر اور خراب ہوتے ہیں۔ پھر ادارہ کے ذمہ داروں کی اس ماحول سے بے اعتنائی اسے اور زیادہ مہلک اور تباہ کن بنا دیتی ہے۔

رابعاً: مدارس میں رہائش، غذا اور دیگر ضروریاتِ زندگی سبھی کا انتظام فروتر ہوتا ہے جس میں انتظامیہ اور متعلقہ ملازمین دونوں ہی ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔ اس کے سبب بھی اونچا طبقہ مدارس کا رخ نہیں کرتا۔ اور بہت سے مدرسین بھی اس سے کنارہ کش ہونے کی فکر کرتے ہیں۔ بہت سے جھگڑے اور ہنگامے بھی پیدا ہوتے ہیں ان سب کا بھی تعلیم پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔

خامساً: عموماً مدارس میں یہ منظر بھی سامنے آتا ہے کہ مالداروں یا حکّام میں سے کوئی متوسط قسم کا بھی انسان آگیا تو اس کے لیے سارا عملہ حرکت میں آجاتا ہے۔ اور اگر کوئی عالم بلکہ بڑے سے بڑا عالم بھی آگیا تو اس کا وہ اعزاز و احترام نہیں ہوتا جو اول الذکر کے لیے ہوتا ہے۔ بلکہ اگر اس کا عشر عشیر بھی ہو جائے تو بہت غنیمت ہے۔ کردار کے اس نمایاں فرق کے بعد مذہبی تعلیم اور علم و فن کی جو قدر و منزلت کسی معلم یا متعلم کے ذہن میں پیدا ہوگی۔ وہ محتاج بیان نہیں۔

سادساً: انتظامیہ کے اختلافات، یا رکن و عہدے دار بننے کی ہوس اور اس کے تحت محاذ آرائی، کام کرنے والوں کے کام میں بلا وجہ رخنہ اندازی، عوامی گروہ بندی اور مدارس کی فیلڈ میں آکر ذاتی انتقام جوئی۔ یہ وہ لاعلاج امراض ہیں جو اکثر مذہبی اور غیر مذہبی تعلیمی اداروں کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے جاہ پسندی، مفاد پرستی اور ملی و قومی، علمی و تعلیمی نصب العین سے بے اعتنائی کا جو سنگین مرض کارفرما ہوتا ہے جب تک اس کا علاج نہ ہوا اس سے پیدا ہونے والے مہلک امراض کا علاج ممکن نہیں۔

حل وعلاج:

میرے خیال میں عزم وحوصلہ اور نظم وضبط سے بیش تر دشواریوں اور خرابیوں پر بڑی حد تک کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔اور ہر طرح کی دینی وملی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ تعلیمی ارتقا کا منصوبہ بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

(ا)(الف) بہتر تو یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ گورنمنٹ سے اپنا الحاق ختم کریں۔اس کے اندر نسبۃً زیادہ سلامتی ہے۔

(ب) درس عالیہ کا نصاب ہی مکمل طور سے نافذ کر دیں وہ درس نظامی سے کم نہیں۔بلکہ اب تک یوپی میں جو نصاب ہے وہ بعض جہتوں سے درس نظامی سے زیادہ جامع وبہتر ہے۔

(۲) علاقہ اور ملک کی تبلیغی ضرورت کے لیے ہر مدرسہ دو تین ایسے اچھے اور لائق عالموں کا تقرر لازم کرے جنھیں تقریروں کے لیے باہر بھیجا جاسکے۔تدریس سے ان کا تعلق جزوی ہو اور ان کی غیر حاضری میں دیگر مدرسین کی خالی گھنٹیوں کے ذریعہ متبادل انتظام ابتدا ہی سے نظام الاوقات میں شامل ہو۔ضرورت ہو تو ایسے مقبول مقررین کو صرف مبلغ کے طور پر بھی رکھا جاسکتا ہے۔

(۳) جو مدرسین اپنے طور پر پرگرام کرتے ہیں وہ اس چیز کو ملحوظ رکھیں کہ تعلیمی نقصان کے بغیر لوگوں کی ضروریات یا اپنی ضروریات پوری کی جائیں۔جس ادارے سے وابستہ ہوں اس کی تعلیمی ترقی سے ہمدردی ایک وفا پیشہ ضمیر کے لیے انتہائی ضروری ہے۔تقریر کے لیے ایام تعطیل ہی کو خاص کریں اور مزید چاہیں تو رخصت اتفاقیہ پر مستزاد نہ ہونے دیں، بلکہ ایسے علما پیدا کریں جو اسی میدان کے لیے خاص ہوں یا جو لوگ اس کے لیے خاص ہوں ان کی طرف رجوع کرا دیں۔ان سب سے بھی اگر ضرورت یا شوق کی تکمیل نہ ہو سکے تو اپنی جگہ کسی لائق اور غیر خطیب مدرس کو لانے کا انتظام کریں۔اپنی ذات، اپنے ادارہ اور اپنی قوم تینوں ہی کا مفاد ملحوظ خاطر رہنا چاہیے۔

انسان کا ضمیر اگر انصاف پسند ہو اور اس کا ذہن اگر نظم وتدبر کا حامل ہو تو مشکلات کی بہت سی زنجیریں کٹ سکتا ہے۔ورنہ خود ہزاروں مصائب کی چٹانیں راہ میں حائل کر سکتا ہے۔

(۴) انتظامیہ کا وسیع النظر، بلند حوصلہ اور باتدبیر ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔اپنی خرابیاں اور ان کا علاج کوئی از خود انتظامیہ کو بتانے کی زحمت کیوں کرے گا بلکہ وہ پردہ داری ہی میں عافیت سمجھے گا، تعمیری ترقی، مدرسین و طلبہ کے معیاری انتظام زندگی اور تعلیمی ترقی کے لیے ساری سہولتوں کی فراہمی، ہر سمت ہر گوشہ میں واقع ہونے والی کوتاہی پر نظر اور ان سب کی معقول تدابیر عمل میں لانا انتظامیہ کا فریضہ ہے۔جبھی دوسرا طبقہ بھی ہمارے مدارس کا رخ کر سکے گا۔اور جو طبقہ زیر تعلیم وتعلم ہے وہ کارآمد اور مفید بن سکے گا۔شخصی جاہ ومنزلت اور مال وزر کی قیمت، علم وفن اور بلند تعلیم وتربیت سے زیادہ کبھی نہ سمجھنا چاہیے۔علم وعمل کی بلندی کے لیے جان ومال کو قربان کیا جاسکتا ہے۔لیکن محض مال وزر کی تحصیل یا صرف مالی بچت کے لیے تعلیم وتربیت کو انحطاط وپستی کے تنور میں جھونکا نہیں جاسکتا۔حسن تدبیر اور ہمت واستقامت کے ذریعہ مالیات فراہم کرنے والا عملہ، صحیح تعلیم اور اچھی تربیت دینے والے مدرسین و اتالیق، عمدہ لائبریری نظام، علم وفن سے شغف رکھنے والا ماحول بھی حاصل ہو سکتا ہے۔اس کے لیے کوشش بھی کرنی ہوگی، سختی بھی، نرمی بھی، قانون سازی بھی، قوانین کی تنفیذ اور ان کی نگرانی بھی، مدرسین وطلبہ اور ملازمین کے ذہنوں کی صالح تعمیر بھی، اصلاح پذیر نہ ہونے والوں کی حسب حال سخت سے سخت تادیب بھی، عوام اور معاونین کی ذہن سازی بھی، کہ وہ ادارہ کے تعلیمی وانتظامی معاملات کو بے جا سفارشات وخواہشات سے پیچیدہ نہ بنائیں۔اور پوری قوم کی اصلاح وترقی کے لیے بنے بنائے ہوئے پروگرام کو اپنی ضد اور انا کی تسکین کے لیے ضرر نہ پہنچائیں۔

سب سے مشکل کام ذہنوں کی تعمیر واصلاح ہے۔حالات اور ماحول کی رو میں تیزی کے ساتھ بہنے کا فن تو سب کو آتا ہے۔لیکن قائدین ملت اور مصلحین امت کو اپنے منصب اور مقام سے کسی لمحہ غافل نہ ہونا چاہیے۔انھوں نے بھی اگر برے حالات سے مصالحت کر لی یا ماحول کی رو میں بہنا سیکھ لیا تو پھر سفینۂ ملت کی ناخدائی کے لیے کوئی آسمان سے نازل نہ ہوگا۔

نصاب تعلیم:

نصاب تعلیم کے متعلق اب تک میں نے کوئی خاص نشان دہی نہ کی۔چوں کہ میرا نظریہ ہے کہ نظام تعلیم میں اگر اصلاح وترقی کی اسپرٹ کار فرما ہے تو نصاب تعلیم کی اصلاح وترقی ایک خانگی اور جزوی مسئلہ ہے۔جس پر خود ہی توجہ مبذول ہوگی۔تاہم عمومی حالات کے پیش نظر چند معروضات قلم بند کی جاتی ہیں۔

نصاب تعلیم سے متعلق پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ عصری حالات کس طرح کے علما کے متقاضی ہیں۔پھر یہ کہ ان کے لیے موجودہ نصاب کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔اس سلسلے میں تین نظریے سامنے آتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ عالم کو قدیم عربی نصاب تعلیم ہی تک محدود رکھا جائے۔اگر وہ معقولات ومنقولات پر حاوی نہ ہوا تو فقہ وکلام کی باریکیوں کو حل نہ کر سکے گا۔اور جدید کلامی اور فقہی سوالات کا بھی شافی جواب نہ دے سکے گا۔

(۲) دوسرا یہ کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کو بھی شامل کیا جائے۔تاکہ ہمارا طالب علم مدرسوں سے نکل کر کالج اور یونیورسٹیوں کی طرف بھی جاسکے اور معاش کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہو کر ہماری نمائندگی اور اپنی کفالت کا فریضہ انجام دے سکے۔

(۳) تیسرا یہ کہ آج مستشرقین اور بدمذہب فرقوں کی طرف سے بہت سے ایسے شکوک وشبہات اور سوالات واعتراضات سامنے آتے رہتے ہیں جن کے جوابات سے ہماری نصابی کتابیں خالی ہیں۔ اور یہ بے شمار ایسے نظریات اور ان کے رد وابطال سے بھری ہوئی ہیں جن سے آج ہمارا مقابلہ نہیں۔

اسی طرح آج اسلام کے خلاف پہلے انگریزی اور فرنچ وغیرہ زبانوں میں لکھا جاتا ہے، علما ان زبانوں سے واقف نہیں ہوتے اور جو طبقہ واقف ہوتا ہے وہ جوابات سے مکمل طور پر عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے آج کے نصاب میں جدید علم کلام اور بہت معیاری انگریزی یا فرنچ زبان کا شامل ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جغرافیہ، سائنس، سیاست، تاریخ عالم، تاریخ علوم، تاریخ مذاہب وغیرہ کی ضروری حد تک تعلیم یا ان کا مطالعہ وامتحان ہونا چاہیے۔ ورنہ فکر ونظر میں وہ وسعت نہ آسکے گی جس کی قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔

میرے خیال سے یہ تینوں ہی نظریے اپنے اندر کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان سب کی رعایت کرتے ہوئے ایک جامع نصاب کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے پہلا کام یہ ہوگا کہ دنیا بھر کے مسلم جامعات کے نصابہائے تعلیم اور نصابی کتابیں مکمل فراہم کی جائیں۔ پھر ماہرین کا ایک بورڈ یہ تعیین کرے کہ قدیم نصاب کی کون سی کتابیں باقی رکھی جائیں اور دیگر نصابوں سے کون سی کتابیں ہمارے لیے بعینہٖ کارآمد ہیں اور کون سی قدیم وجدید کتابوں کا متبادل اپنے ملک اور اپنے طلبہ کے مطابق ہمیں خود تیار کرنا ہوگا۔ پھر ایک تصنیفی بورڈ ہو جس کے لیے تمام سہولیات فراہم کی جائیں اور وہ ضرورت کے مطابق کتابیں مرتب کرکے پیش کرے اور ماہرین کی نظر ثانی کے بعد وہ شائع اور شامل نصاب ہوں۔

تربیتی کورس:

اسی طرح ایک تربیتی کورس بھی فارغین کے لیے تعلیم وتدریس کی ٹریننگ کا کام سرانجام ہو اور بعض مدارس کو یہ کورس پڑھانے کے لیے اپنے یہاں اساتذہ کا بھی باقاعدہ بندوبست کرنا ہوگا تاکہ مدارس کو تجربہ کار اور وسیع النظر مدرسین فراہم کیے جاسکیں۔

تدوین نصاب کے سلسلہ میں کثیر اخراجات کا مسئلہ درپیش ہوگا، جو چند باحوصلہ اور ہم مزاج مدارس کے اشتراک عمل سے حل ہوسکتا ہے۔ پیش قدمی اور نمائندگی ونگرانی کے لیے کسی ایک ادارہ کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد عملی اقدام فوراً کسی ایک شخص، پھر متعدد اشخاص کے سپرد کرنا ہوگا۔

نئے نصاب میں علمی وفنی اور تحریری وقلمی ترقیوں کا لحاظ بہرحال ضروری ہے کیوں کہ موجودہ زمانہ فکر وفن اور تحریر وقلم کا زیادہ متقاضی ہے۔ تقریر ہو تو وہ بھی ایسی جو افادیت میں تحریر کے ہم پلہ یا اس سے بالاتر ہو۔ سطحی اور کمزور

باتوں کا جادو تعلیم یافتہ دنیا کو زیر نہیں کرسکتا۔

خلاصۂ مضمون:

یہ مضمون متعدد مصروفیات اور مختلف اوقات میں قلم بند ہوا۔ پھر بھی تقریباً سبھی ضروری باتیں تفصیلاً یا اجمالاً و اشارۃً قید تحریر میں آگئی ہیں۔ جن کا خلاصہ عنوانات کی شکل میں ایک بار پھر ذہن میں تازہ کرلیں۔

(۱) نظام تعلیم کی ابتری:

(۱) مدرسین کی بے اعتنائی یا نااہلی اور اس سے انتظامیہ کی غفلت۔
(۲) طلبہ کی صالح تربیت کا فقدان یا کمی۔
(۳) نظام امتحان کی بے قاعدگی۔
(۴) ترقی درجات اور داخلہ کی بے ضابطگی۔
(۵) مقدار تعلیم کی کمی اور اکثر مسائل فن سے طلبہ کی بے خبری۔
(۶) غیر تعلیمی امور میں طلبہ اور مدرسین کی مشغولیت۔
(۷) لائبریری سسٹم اور دار المطالعہ کا فقدان یا کمی۔

(۲) طلبہ کی بے رغبتی:

(۱) بہت سے ذہین اور بلند ہمت بچوں کی تعلیم یا دینی تعلیم سے دوری۔
(۲) متوسط قسم کے داخل مدارس طلبہ کی مقصد سے دوری۔
(۳) شریر طلبہ کا غلبہ اور ان سے ذمہ داروں کی عاجزی یا بے اعتنائی۔
(۴) مدارس میں غذا اور رہائش کے انتظام کی پستی۔
(۵) اہل ثروت اور اہل اقتدار کی پذیرائی اور اہل علم کی ناقدری

(۳) مدرسین کی بے رغبتی اور دشواری:

(۱) تنخواہوں کی کمی، ضروریات زندگی کی زیادتی۔
(۲) تجارتی اور تقریری میدانوں کی نفع بخشی وعزت افزائی، تعلیمی ماحول کی صعوبتیں، اہل علم وفن کی بے وقعتی۔
(۳) انتظامیہ سے متعلق نااہل یا فرائض تدریس سے غافل مدرسین کا غلبہ، ان کا پاس ولحاظ۔
(۴) تعلیمی مسائل اور مدرسین وطلبہ کی دشواریوں کے حل سے انتظامیہ کی غفلت۔

(۵)لائق، مقصد میں مخلص اور بلند ہمت طلبہ کا فقدان یا انتہائی کمی۔

(۴)انتظامیہ کے حالات و مشکلات:

(۱)اختلافات، گروہ بندی، تعلیمی فکر وذہن سے دوری۔

(۲)سرمایہ کی کمی۔

(۳)مسلم عوام کی دین، علمائے دین اور دینی تعلیم بلکہ مطلق تعلیم سے لاپرواہی۔

(۴) عوامی دل جوئی۔

(۵)دوہرے نصاب تعلیم سے نباہ۔

(۶)لائق مدرسین کی کمی۔

(۷)ماحول کی ناسازگاری۔

(۵)علاج:

(۱)دین وعلم سے الفت، مقصد میں اخلاص، فرض شناسی، عزم وحوصلہ، ثابت قدمی، فکر وتدبر۔

(۲)تمام دانشوروں، قائدوں، عالموں کا دین اور علم کے فروغ کے لیے عوامی فکر وذہن کی اصلاح اور ماحول میں انقلاب و تبدیلی کی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلسل حرکت وعمل۔

(۳)قومی وملی دینی وعلمی مفاد کے لیے ذاتی خواہشات ومفادات کی قربانی۔ اختلافات سے کنارہ کشی۔

امراض وعلاج کے بیان پر مضمون نگار کی ڈیوٹی، بحیثیت مضمون نگار ختم ہوجاتی ہے۔ آگے کا کام ان بے شمار معالجوں کا ہے، جو بیمار مدارس کو موت سے بچانے کے واقعی ذمہ دار ہیں۔ واللہ المستعان وعلیه التکلان.

محمد احمد مصباحی
استاذ الجامعۃ الاشرفیہ رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور اعظم گڑھ

۲۸/۸/۱۴۰۹ھ — ۶/۴/۱۹۸۹ء

❁❁❁❁❁

اسلامی مدارس کی اہمیت[۱]

آج دنیا میں دو طرح کے نظام تعلیم رائج ہیں ایک وہ جس کا مقصد دین ومذہب کی تعلیم وترویج ہے۔ دوسرا وہ جو دین ومذہب کی قید اور دین اسلام سے بہت دور ہے۔

لادینی نظام تعلیم کا واحد مقصد یہ ہے کہ نئی نسل کے دل ودماغ سے دینی ومذہبی اسپرٹ بالکل ختم کر دی جائے اور وہ یہ سمجھ ہی نہ سکیں کہ ہم کیا ہیں؟ ہمارا مقصد وجود کیا ہے؟ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے جابجا نرسری اسکولوں کا قیام عمل میں آرہا ہے جس کا نقد فائدہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچے ابتدا ہی سے اخلاق وتہذیب کے حامل بن جاتے ہیں۔ اور انگریزی میڈیم تعلیم حاصل کر کے سنِ رُشد کو پہنچتے پہنچتے لائق فائق انگریزی داں اور ماہر علوم وفنون ہو جاتے ہیں۔ لیکن باخبر حلقوں سے مخفی نہیں کہ ایسی درس گاہوں کا نصب العین یہ ہے کہ بچے ابتدا ہی سے غیر دینی ماحول میں پرورش پائیں۔ تاکہ ان کے اندر دینی فکر ومزاج پیدا ہی نہ ہوسکے۔

ظاہر ہے کہ یہ مقصد دل فریب فوائد دکھائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے وہ سب انتظامات کیے جاتے ہیں جو مادی نگاہوں کو مسحور کر سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ مسلم اہل ثروت نے بھی ایسی درس گاہوں میں اپنے ننھے بچوں تک کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ بہت جلد سامنے آگیا کہ اہل دنیا کی زبان میں خواہ وہ بچے لائق فائق کہے جاسکتے ہوں مگر مذہب کی نظر میں واجبی فکر وشعور سے یکسر خالی ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل ثروت خود ایسی درس گاہیں قائم کرتے جن میں عصری طرز تعلیم کی بھرپور رعایت کی جاتی ساتھ ہی طلبہ کو اس اخلاق وتہذیب کا حامل بنایا جاتا جس کا تقاضا مذہب اسلام کرتا ہے۔ ان درس گاہوں میں ابتدا ہی سے قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم دے دی جاتی اور عصری علوم بھی پڑھائے جاتے۔ تاکہ ایک طرف وہ بچے مذہبی جذبات وعواطف اور اسلامی اسپرٹ سے سرشار نظر آتے اور دوسری طرف عصری فنون کے ماہر ہو کر ہر عصری ماہر علوم کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بات کرنے کی ہمت اور اسلام کی حقانیت وبرتری ثابت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے۔

(۱)ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، شمارہ مئی ۱۹۸۷ء

لیکن مادی نفع عاجل کی ہوس یہ سب سوچنے اور انتظام کرنے کی مہلت کب دیتی ہے؟ جہاں بھی ہو بچوں کو داخل کرو دنیاوی قدر و منفعت حاصل ہونی ضروری ہے۔ مذہب ہمیں کیا آرام و آسائش دے سکتا ہے کہ اس کی بقا کی فکر کریں؟

یہ ایک عام طرز تصور ہے جو مسلم آبادیوں خصوصاً مال داروں پر عفریت کی طرح چھاتا جارہا ہے۔ بہت کم اللہ کے نیک بندے ایسے ملتے ہیں جو مال و دولت کی آغوش میں پہنچنے کے بعد بھی اسلام کو جان و مال، عزت و وقار اور عیش و آرام سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ رب کریم ان کے امثال زیادہ کرے۔ (آمین)

ایسے افکار و حالات کے پیش نظر آپ تصور کریں کہ دینی درس گاہوں کا قیام کتنا اہم مسئلہ ہے۔ اور اس کے بقا و استحکام میں کیسی کیسی دشواریاں حائل ہیں۔ کہیں تو حکومتیں ادارے چلاتی ہیں اور ان کا ہر خرچ برداشت کرتی ہیں۔ ساتھ ہی تعلیم حاصل کرنے والے بھی فیس کی شکل میں بہت سا خرچ ادا کرتے ہیں۔ اور کہیں ایسا ہے کہ کچھ عاقبت بیں افراد در در کی بھیک مانگتے اور ہر طرح کی تکالیف و مصائب کا سامنا کرتے ہیں پھر کہیں وہ اپنے مدارس کی رمق باقی رکھنے کا سامان کرپاتے ہیں۔

پہلے دینی مدارس کی کفالت بھی حکومتیں کیا کرتی تھیں اور علمائے دین کو شاہانہ عز و وقار بھی حاصل تھا۔ مگر اب وہ دور نہیں خود خاک ہند کے مسلمانوں کو اپنی بقا کا انتظام کرنا ہے۔ اور اپنے ملی وجود و تشخص کی تعمیر کے لیے اپنی متاع بے بہا قربان کرنی ہے ورنہ اس منظر کا تصور بھی ہمارے لیے سوہان روح ہے، جب خدانہ خواستہ اسلامی مدارس یا ان کا اصلی تشخص باقی نہ رہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ جیسی عظیم دینی درس گاہ بھی اپنے بقا و تحفظ میں یقیناً مسلمانان ہند کے تعاون کی محتاج ہے۔ جس کی طرف بھرپور توجہ دینا اہل اسلام کا اہم ترین فریضہ ہے۔ تاکہ نونہالان قوم کی تعلیم و تربیت کا معقول اور عصری تقاضوں کے مطابق عمدہ سے عمدہ انتظام کیا جاسکے۔ واضح رہے کہ الجامعۃ الاشرفیہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم و فنون کی تعلیم کی طرف بھی روز بروز پیش قدمی کرتا جارہا ہے۔

❁❁❁❁❁❁

موجودہ درس نظامی اور جدید نصاب سازی[1]

(۱) اس وقت ہند و پاک اور دیگر ممالک میں تعلیمی اداروں کا نصاب بالعموم وزارت تعلیم کے تحت تیار ہوتا ہے جہاں ماہرین کی ایک ٹیم بھاری تنخواہوں اور دیگر سہولیات کے ساتھ اسی کام پر مامور ہے اور "ہر کہ آمد عمارتے نوساخت" کا عمل جاری ہے۔

پچاس سال یا کچھ اور پہلے جو نصاب جاری تھا اس میں ہر فن کے اصول و مبادی درج ہوتے تھے اور ان کی تفہیم، تسہیل اور اجرا یا مشق و تمرین کا کام مدرس کے ذمہ ہوتا تھا اور اچھے مدرسین ذمہ داری سے یہ کام کرتے کراتے تھے۔

پھر تعلیمی اداروں میں کئی طرح کی خرابیاں در آئیں۔ (۱) اہل، نا اہل ہر طرح کے ماسٹر یا مدرس جگہ پانے لگے۔ (۲) ملکی سیاست اور بیرونی حکومت کی مخالفت میں طلبہ کو استعمال کیا گیا۔ (۳) داخلی حکومت بن جانے کے بعد بھی یہ عمل جاری رہا۔ (۴) مدرسین نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے احتجاج اور اسٹرائک کا راستہ اپنایا۔ (۵) طلبہ نے بھی اپنے مطالبات منوانے کے لیے انھیں کے نقشِ قدم کی پیروی کی۔ (۶) تعلیم کے ایام میں کمی، تعطیل کے ایام میں نمایاں زیادتی ہوئی، ہنگامی بندیوں نے اس میں اور اضافہ کیا۔ (۷) تعلیم ثانوی درجہ میں چلی گئی، اپنے جائز و ناجائز مطالبات کے لیے ہنگامہ آرائی پہلے درجہ میں آگئی۔ تنخواہ لینا اصل کام ٹھہرا اور پابندی سے پڑھانا ضمنی اور فرعی کام ہوگیا۔ کم مدت میں طلبہ کو باصلاحیت اور لائق بنانے کا تصور بہت دور چلا گیا۔ (۸) اوقات کے تحفظ کا احساس نہ مدرسین میں رہا، نہ طلبہ میں۔ (۹) جائز و ناجائز طریقوں سے امتحان پاس کرنا، کرانا اور سندیں حاصل کرنا مطمح نظر بن گیا۔ علم و فن میں کمال اور لیاقت و صلاحیت سے کوئی خاص مطلب نہ رہا۔ الا ماشاء اللہ۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے نصابی کتابوں میں ضرورت سے زیادہ پھیلاؤ، حد درجہ تسہیل یا سطحیت اور بہت ساری تمرینات اور مشقی سوالات کو بڑی فیاضی کے ساتھ جگہ دی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ مثلاً ریاضی کی جو مہارت مڈل کے طالب علم کے اندر پیدا ہو جاتی تھی وہ آج انٹر میڈیٹ پاس کرنے کے بعد بھی نظر نہیں آتی بلکہ زیادہ سچائی اور گہرائی کے ساتھ بات ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ عام طور سے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد بھی وہ صلاحیت مفقود ہی رہتی ہے۔

نصاب میں یہ پھیلاو یک بارگی نہ آیا، بلکہ جوں جوں حالات بگڑتے گئے نصاب پھیلتا اور آسان ہوتا چلا گیا۔ جب دیکھا گیا کہ اس سے زیادہ تسہیل اور پھیلاو کی گنجائش نہیں تو بعض کتابوں میں کچھ اسباق و مضامین کی تقدیم و تاخیر،

---

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، شمارہ فروری ۲۰۰۷ء۔

معمولی حذف و اضافہ، ادبی کتابوں میں منتخب اقتباسات کی تبدیلی وغیرہ کا عمل ہر تین یا پانچ سال پر منظر عام پر آنے لگا، تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ان کرسیوں پر بیٹھنے والوں کو بھاری تنخواہیں صرف ان کرسیوں پر بیٹھے رہنے کے عوض دی جارہی ہیں۔

حالات کی تبدیلی کے باعث نصاب میں تبدیلی کا اصل کام پہلی اور دوسری ٹیم نے کر دیا تھا۔ بعد میں جو ہر تین سال پر تبدیلی کا عمل ہو رہا ہے اس میں طلبہ کی ضرورت سے زیادہ اپنی مصلحت کا دخل ہے۔ اسی کے ساتھ کچھ فرقہ پرستوں نے اپنی فکر، اپنا مزاج اور اپنی غلط ذہنیت نصاب میں داخل کرنے کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

ہندو پاک کے مدارس اسلامیہ کے پاس ایسا کوئی نصاب ساز عملہ کبھی نہیں رہا اس لیے عام طور سے اعترافِ ضرورت کے باوجود عمل کی منزل دور ہی رہی۔ مدارس کی مجلس انتظامیہ اکثر ایسے افراد پر مشتمل ملے گی جو ماہر تعلیم نہیں، بلکہ بہت سے اداروں میں سب ارکان تعلیم یافتہ بھی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انتظامی صلاحیت، تعلیمی مہارت، جذبۂ اعانت، دیانت وامانت وغیرہ کے جامع افراد کا وجود ہماری بستیوں میں عنقا ہے، جو مل جاتے ہیں انھیں سے کام چل رہا ہے۔

مدرسین ہیں تو ان کے اوپر تدریس کے ساتھ تبلیغ و اصلاح، انتظام و انصرام، رابطۂ عام، سرمایہ کی فراہمی وغیرہ کی ذمہ داریاں بھی رہتی ہیں اور اپنی خانگی یا مقامی ذمہ داریاں ان سب پر مستزاد ہیں۔

پھر مدارس کے درمیان باہمی تنظیم بھی نہیں کہ سب ایک نصاب اور ایک انداز پر گامزن ہوں، نہ ان کے اوپر کوئی ایسی قوت حاکمہ ہے جو انھیں کسی نصاب اور مقررہ مقدار کی تکمیل اور بہتر انداز میں تعلیم و تفہیم کا پابند بنا سکے۔ نہ کسی ادارے کا انفرادی، یا چند اداروں کا اجتماعی کوئی ایسا بورڈ ہے جو نصاب پر غور و خوض اور اس میں تسہیل و تجدید کا ذمہ دار ہو۔ انفرادی طور پر کچھ کوششیں ہوئیں مگر وہ سب نامکمل ہیں۔ غور کیجیے، ساری خامیوں کو دور کرنا اور نتیجہ خیز وسائل کو بروے کار لانا کتنا مشکل ہے؟

مدارس کے نصاب میں ترمیم سے متعلق بے شمار مضامین اور تحریریں میری نظر سے گزری ہیں لیکن تہ تک پہنچتے ہوئے کوئی نظر نہ آیا۔ ایسے ماحول میں عملی اقدام کی توقع ایک دل فریب خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

(۲) درس نظامی کی بیش تر منتہی کتابیں ایسی ہیں کہ جامعہ ازہر کے نصاب میں بھی شامل ہیں مثلاً تفسیر میں کشاف، بیضاوی، مدارک، حدیث میں صحاح ستہ، فقہ میں قدوری، کنزالدقائق، ہدایہ، اصولِ فقہ میں توضیح، منطق میں تہذیب المنطق اور رسالۂ شمسیہ، عقائد میں تہذیب الکلام اور شرح مقاصد وغیرہ۔ بعض کتابیں کتب ازہر کا بدل یا نعم البدل بھی قرار دی جاسکتی ہیں۔ لیکن بیش تر ابتدائی کتابیں قابلِ تبدیل یا لائق ترمیم ہیں۔

جامعہ ازہر نے نحو و صرف اور بلاغت کے اصول و مبادی کو نئی شکل میں پیش کیا ہے اور ہر فن کے ساتھ اس فن کی تاریخ کو لازم درس بنایا ہے اسی طرح قواعد فن کو کئی اجزا اور کئی سالوں پر تقسیم کر کے مکمل پڑھانے کا التزام کیا ہے۔

تفسیر، حدیث، فقہ کی کتابیں مکمل کرنے کے لیے اساتذہ وطلبہ کو کچھ اجزا بہ طور درس اور زیادہ حصے بہ طور مطالعہ و خطاب پڑھنے پڑھانے کا پابند کیا ہے۔ کچھ فنون کا اضافہ بھی کیا ہے۔ مثلاً تفسیرِ احکام، اصول دعوت، نئے فقہی مسائل، اسلام و اسلامیات پر نئے اعتراضات و جوابات۔ ان سب کو مطالعہ و خطاب کے طور پر مکمل کرنے کی کوشش کی ہے، امتحانی نظام کو بہت مربوط اور سخت بنایا ہے، تاکہ طلبہ واساتذہ کی محنت کا صحیح اندازہ ہو اور علوم میں زیادہ پختگی پیدا ہو۔

وہاں ۶/ سال پرائمری اور ۳/ سال اعدادیہ اور ۳/ سال ثانویہ کا کورس سب کے لیے لازم ہوتا ہے، اس کے بعد کلیہ کا کورس شروع ہوتا ہے جو مختلف فنون کے لحاظ سے الگ الگ شعبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مثلاً کلیہ اصول الدین، کلیۃ الشریعۃ، کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابھا وغیرہ۔

قرآن و حدیث دیگر علوم سمجھنے اور دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کا ذریعہ ہیں، اس لیے ان دونوں پر اگر زور دیا جاتا ہے تو بالکل بجا ہے۔ تفسیر و حدیث میں اختصاص کرایا جائے تو اس کے بھی فوائد ہوں گے۔ ضروری حد تک تفسیر و حدیث کی جو تعلیم ہوتی ہے اس میں بھی یہ التزام ہونا چاہئے کہ پورے قرآن کی مختصر تفسیر نظر سے گزر جائے۔ اسی طرح حدیث کی ایک دو جامع کتابیں مثلاً مشکاۃ المصابیح اور صحیح بخاری مکمل پڑھانا چاہیے۔

(۴) مصر کا پرائمری نصاب ہندوستان میں چلنے کے لائق نہیں، خود یہاں کا نصاب بہت اچھا ہے، تاہم مصر کے ابتدائی نصاب کو سامنے رکھ کر اس پر نظر ثانی مفید ہوگی۔ اعدادیہ اور اس کے بعد کا نصاب درج ذیل امور کی پابندی کے ساتھ اپنایا جاسکتا ہے۔ (۱) اعدادیہ کا نصاب اردو زبان میں منتقل کیا جائے۔ (۲) نحو و صرف کے تمام ضروری قواعد ایک سال میں مکمل کرا دیے جائیں تاکہ طلبہ جلد از جلد عربی عبارت کو سمجھ کر پڑھنے کے لائق ہو جائیں۔ (۳) ان درجات میں آسان ادبی کتابوں کا حصہ زیادہ رکھا جائے تاکہ طلبہ عربی زبان سے آشنا ہو کر ثانویہ کی کتابیں مصری کورس کے مطابق بعینہ پڑھ سکیں۔ (۴) مختصراً یہ کہا جائے کہ تین سالہ اعدادیہ کا پورا نصاب از سرِ نو تیار کرنا ہوگا۔ (۵) اعدادیہ اور ثانویہ پڑھانے کے لیے اساتذہ کی تھوڑی ٹریننگ بھی ضروری ہوگی۔ (۶) کلیہ کا نصاب پڑھانے کے لیے زیادہ ٹریننگ کی ضرورت ہوگی۔ بہتر یہ ہوگا کہ اولاً جامعہ ازہر یا دیگر معیاری جامعات کے اچھے اور ماہر فارغین کی خدمات حاصل کی جائیں، پھر دیگر اساتذہ ان کا طریقۂ درس اپنائیں۔ (۷) یہ بھی مناسب ہوگا کہ یہاں کے اساتذہ ادارے کے خرچ پر جامعات میں ایک ایک سال رہ کر وہاں کے نظام درس، طریقۂ درس، نظامِ امتحان اور دیگر اصول و ضوابط سے باقاعدہ روشناس ہوں، پھر اپنے اداروں میں ان کی تنفیذ کریں۔ اور بھی چیزیں ہیں جو ابھی لکھنے کے بجائے وقت ضرورت بتانے کے لائق ہیں۔

(۵) مذکورہ امور کی تعمیل و تنفیذ کے لیے ایک فعال بورڈ اور بہت اچھے عملے کا "باضابطہ" سرگرم ہونا بنیادی امر ہے ورنہ سب خواب و خیال ہی ہو کر رہ جائے گا۔

ذمہ داران مدارس کے لیے لمحہ فکریہ (۱)

اس میں شک نہیں کہ آج جو بھی علم کی روشنی نظر آرہی ہے اس میں درس گاہوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ خصوصاً دینی درس گاہوں کا علم کے ساتھ صالح فکر وخیال اور پاکیزہ اخلاق وعمل کی ترویج میں جو اہم کردار ہے اسے ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں جس قدر متحرک وفعال ہونا چاہیے زیادہ تر درس گاہیں اس سے ابھی تک بہت دور ہیں۔ جو درس گاہیں نسبتاً زیادہ فعال ہیں ان کے لیے بھی ترقی کے میدان ابھی کافی وسیع ہیں اور بڑی محنت وجاں فشانی کے بعد ہی وہ دنیا کی عظیم دانش گاہوں کے مقابلہ میں قابل ذکر ہو سکتی ہیں۔

میرا سابقہ طلبہ اور تعلیم یافتہ افراد سے اکثر پڑتا رہتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو، عموماً دین کی ضروری معلومات اور مذہبی افکار واعمال کے لازمی علم سے، بہت دور پاتا ہوں اور یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ آخر ان تک دینی ومذہبی علم کی روشنی کیسے پہنچائی جائے، ان میں بعض طلبہ اور فراغت یافتہ افراد ایسے بھی ملتے ہیں جن کو بہت سے دنیاوی محکموں کی بھی عام معلومات نہیں ہوتی اور صحیح ہندی انگریزی سمجھنا سمجھانا بھی ان کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے افراد پر اور زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ آخر جس علم کی تحصیل میں انھوں نے عمر بسر کی ہے اس میں اس قدر کمزور کیوں ہیں؟ اس طرف ان طلبہ کے اساتذہ، سرپرستوں، درس گاہوں کے ذمہ داروں اور خود ان طلبہ کو انصاف واخلاص کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ طلبہ سے زیادہ میرا تعلق مدارس اسلامیہ کے طلبہ سے رہتا ہے اور ان کے علم وعمل، اخلاق وتہذیب اور فکر وخیال کو قریب سے دیکھنے کے مواقع بھی میسر ہیں۔ اسی طرح جو حضرات کسی درس گاہ سے فارغ ہو چکے ہیں ان سے گفت وشنید بھی اکثر وبیشتر ہوتی رہتی ہے۔ طلبہ کا تو بعض اوقات باضابطہ امتحان بھی لینا پڑتا ہے اور زیادہ تر عام گفتگو اور ملاقاتوں میں طلبہ اور فارغین کی صلاحیتوں کا مختلف جہتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلاشبہ ان میں بعض کی علمی وعملی حالت بڑی مسرت بخش ہوتی ہے۔ مگر اکثر کی جو عام حالت پائی جاتی ہے ذیل میں اس کو ذکر کر کے میں

(۱) ماہ نامہ اہل سنت، اشاہی، بستی، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء

اپنا اصل مدعا پیش کرنا چاہتا ہوں۔

عام حالت یہ ہے کہ آج دینی درس گاہوں سے نکلنے والے فارغین کے متعلق تحریر وقلم سے دوری، تقریروں میں دلائل وحقائق کی کمی، غیر مستند واقعات وروایات کی زیادتی، صحیح روایات میں بھی افسانوی اور اختراعی خیالات وبیانات کی بے جا ملاوٹ، عصر حاضر کے دینی وعلمی تقاضوں سے بے خبری اور ان کی تکمیل سے بے اعتنائی کی شکایت عام ہوتی جارہی ہے۔ لیکن مدارس کے ذمہ داروں کو اپنے طلبہ کی خامیوں کا یا تو بالکل احساس ہی نہیں یا اگر احساس ہے تو ان کے ازالہ کی کوئی فکر اور کارگر جدوجہد نہیں جب کہ ان کا فرض ہوتا ہے کہ اس فکری پستی اور علمی محدودیت کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے فوراً ان کے علاج کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی جہد مسلسل اور سعی پیہم کے ذریعہ حالات کا رخ بدل دیں۔ اس سلسلہ میں درج ذیل نکات پر غور کرتے ہوئے مناسب تجاویز کو فوراً زیر عمل لانے کی ضرورت ہے۔

[۱] ایک وقت وہ تھا جب اسلامی شہروں میں معتزلہ وخوارج جیسے فرقے اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے وہ اپنے پاس ظاہری زہد وتقوی، شجاعت ودلیری، علم ومکالمہ، زبان وبیان کی دل کشی، تحریر وقلم کی دل آویزی، علوم ادبیہ میں مہارت وامامت، حکومتوں کے عہدوں پر تسلط، مال داروں اور حاکموں کے یہاں اثر ورسوخ جیسے ناقابل تسخیر سمجھے جانے والے آلات ووسائل سے لیس تھے۔ ان کے علمی کمالات ومحاسن کی وجہ سے ان کی بہت سی کتابیں بھی عام نصاب میں شامل تھیں۔ بعض آج بھی شامل ہیں۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ باطل فرقے کسی وقت ناپید ہو جائیں گے۔ لیکن علمائے اہل سنت اپنی منصبی ذمہ داریوں سے غافل نہ تھے۔ انھوں نے اعتزالی تفسیروں کے مقابل تفسیریں، کلام کے مقابل کلام، حدیث وفقہ کے مقابل حدیث وفقہ اسی طرح تاریخ وبلاغت وغیرہ فنون کے مقابل ہر فن میں خود کتابیں لکھیں اور اہل باطل کی تلبیسوں اور گمراہیوں کا پردہ چاک کیا۔ ارباب حکومت اور اہل مناصب تک بھی اپنا آوازۂ حق پہنچایا اور نور حقیقت اس قدر عام کیا کہ ظلمتوں نے خود دم توڑ دیا۔

اس کے ساتھ یہودیت ونصرانیت کی جانب سے جو حملے ہو رہے تھے ان کا بھی انھوں نے مقابلہ کیا اور اسلام کی صداقت وحقانیت کا جلوہ ہر دور میں جہاں تاب کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جب بھی کوئی فتنہ سر اٹھاتا ہے تو اہل نظر کو قدیم علما کی تحریروں سے اس کا جواب بھی کسی نہ کسی شکل میں دست یاب ہو جاتا ہے۔

[۲] آج ہم جس ماحول سے گزر رہے ہیں اس میں مدارس اسلامیہ کی ذمہ داریاں پہلے سے زیادہ سخت اور مشکل ہو چکی ہیں۔ کیونکہ آج کچھ ایسے نئے علوم وفنون پیدا ہو چکے ہیں جو ہماری درس گاہوں میں داخل نہیں۔ لیکن ایک عالم دین کو میدان میں اترنے کے بعد ان کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف قدیم اسلامی علوم وفنون بھی اس قدر ضروری ہیں کہ ان کی کامل تحصیل کے بغیر اسلام کی ٹھوس وکالت اور ملت کی صحیح رہنمائی کا فریضہ ادا ہی نہیں ہو سکتا۔

اس لیے آج عصری تقاضوں کے مطابق قدیم وجدید سے ہم آہنگ نصاب نو کی ترتیب اور مدارس میں اس کی

تنفیذ کی ضرورت اتنی اہم ہو چکی ہے کہ اس سے صَرفِ نظر کسی جانی ومالی خسارے سے کم نہیں بلکہ اس سے فزوں تر ہے۔

[۳] نصاب تعلیم کوئی بھی نافذ ہو۔ اس سے ہرگز یہ تصور نہیں کر لینا چاہیے کہ اب طلبہ وعلما کو مزید کچھ دیکھنے اور لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہ رہی۔ ہم نے اپنے نصاب میں اتنا کچھ سمو دیا ہے کہ وہی ساری ضروریات ومطالبات کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ ایسا نہ تو کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی نصاب تعلیم صرف لازمی استعداد اور صحیح فکر ومزاج پیدا کرتا ہے جس کی بنا پر مزید تحقیق ومطالعہ کی راہیں کھل جاتی ہیں اور انسان تمام ضروری آلات ووسائل سے آراستہ ہونے کے قابل بن جاتا ہے۔

نصابی علم میں بھی وسعت ومہارت اور پختگی ومضبوطی خارجی مطالعہ کے بغیر نہیں آسکتی اس لیے کہ کسی بھی نصاب میں گنی چنی محدود کتابیں، محدود مضامین اور محدود علوم وفنون ہی داخل کیے جا سکتے ہیں۔ جب کہ علم وفن کی دنیا اور زمانہ کے حالات ومطالبات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اسے کوئی خاص نصاب اپنے دامن میں سمیٹنے سے عاجز ہے۔

آپ ارباب کمال اور اصحاب تصنیف علما ومحققین کے حالات زندگی پر نظر ڈالیں تو ہر ایک کے بارے میں آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ صرف اپنے نصاب تعلیم کی بنیاد پر صاحب فضل وکمال اور شناور تحقیق وتدقیق نہ بن گئے بلکہ انہوں نے نصابی کتابوں سے باہر بھی بے شمار کتابوں کا بڑی دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے مطالعہ کیا ہے۔ جب کہیں وہ اپنے زمانہ میں امتیازی شان کے حامل اور زمانۂ مابعد میں بقائے دوام کے قابل ہو سکے ہیں۔

[۴] ایک ستم یہ بھی ہے کہ ہر عصری نصاب والا اپنے نصاب سے باہر معلومات ومضامین کے سلسلے میں یہ کہہ کر چھٹی پا جاتا ہے کہ یہ میرا موضوع نہیں رہا۔ میں تو فلاں سبجیکٹ کا ماہر ہوں۔ مگر ایک عالم دین اگر یہی بات کہے تو اس کی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں یہ صرف اس عالم کی کمی شمار نہیں ہوتی بلکہ اس کے مذہب، اس کی درس گاہ، اس کے تعلیمی نصاب، اس کے اساتذہ بھی کا قصور شمار کیا جاتا ہے۔ عصری نصاب والے خود بے شمار ضروری معلومات وعلوم سے نابلد ہوں جب بھی وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور عالم دین اگر چند دنیاوی علوم سے بے بہرہ ہے یا کچھ دینی مسائل اسے مستحضر نہیں تو وہ سب سے بڑا جاہل ہے۔ اس دنیا کے اندر علم وجہل کو ناپنے کے پیمانے بھی بڑے عجیب وغریب ہیں۔

اب لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ مدارس کے طلبہ واساتذہ کو ضروری علوم سے آراستہ کیسے کیا جائے؟ نئے فتنوں کے رد میں مضبوط، وزنی کتابیں منظر عام پر کیسے آئیں؟ جدید نصاب کی تدوین کرنے والے اہل علم وقلم کو کہاں تلاش کیا جائے؟ تقریروں کی غلط بیانیوں کا سدباب کیسے ہو؟ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا اور اسباب ووسائل کو ترک کر کے آسمان سے رجال الغیب کے نزول اور ساری ذمہ داریوں کی کفالت کے وقت کا انتظار کرتے رہنا اہل خرد کا کام نہیں۔ رب کریم نے خود علمائے عصر اور اسلامیان زمانہ کے کاندھوں پر دین وعلم کی اشاعت اور فروغ وترقی کی ذمہ داری رکھی ہے، اسباب ووسائل بھی پیدا فرمائے ہیں، عقل وعلم اور کمال وہنر سے بھی نوازا ہے، انہیں خود اپنی ذمہ

داریوں کی تکمیل کا سامان کرنا ہے اور آج ہی اپنے فرائض کی ادائگی کی تدبیر کرنی ہے۔

[۵] ان حالات میں ضروری ہے کہ خارجی طور پر طلبہ کو تقاضائے وقت کے مطابق لازمی معلومات سے آراستہ کیا جائے اور ان میں قلمی صلاحیت کو بھی فروغ دیا جائے۔ اس کے لیے ہر ادارہ میں ایک ایسی لائبریری اور دار المطالعہ کا ہونا ضروری ہے جس میں مختلف جرائد ورسائل آتے رہیں اور مختلف علوم وفنون مثلاً عقائد وکلام، تفسیر وحدیث، فقہ واصول، تاریخ عالم، تاریخ مذاہب، تاریخ علوم، تقابل ادیان، ردِ فرقِ باطلہ، سیر وسوانح، جغرافیہ وسائنس وغیرہ کی کتابیں طلبہ واساتذہ کے لیے فراہم کی جائیں۔ اور انھیں مطالعہ کا عادی بنایا جائے۔ تقریری وتحریری مقابلے کرائے جائیں۔ اور اس بات کی پابندی کی جائے کہ جو کچھ بھی لکھیں اور بولیں وہ مستند کتابوں سے ماخوذ اور صحیح ومقبول ہو۔

اس طرح انھیں وہ علوم بھی حاصل ہو سکیں گے جو نصاب کی گرفت میں نہیں آتے اور قوم کو ایسے افراد بھی مل جائیں گے جو اپنی تقریروں میں معتبر اور صحیح مواد موثر انداز میں پیش کر کے دین کی تبلیغ اور ملت کی رہ نمائی کا فریضہ بجا طور پر انجام دیں۔

دوسری طرف تعلیم یافتہ افراد کی رہ نمائی کے لیے قابل اعتماد مصنفین کا ایک گروہ پیدا ہو سکے گا۔

تیسری طرف ہر دور میں تقاضائے عصر کے مطابق جدید اور جامع نصاب تیار کرنے والے وسیع النظر اہل قلم بھی مستعد اور تیار ملیں گے اور وسیع النظر اہل قلم کی نایابی یا کم یابی کے باعث جدید نصاب کی تدوین کا مسئلہ تعویق میں نہ پڑ سکے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اہل مدارس جس طرح دوسرے تمام مصارف کے لیے سرمایہ کی فراہمی کر لیتے ہیں لائبریری اور دار المطالعہ کے لیے بھی بخوبی کر سکتے ہیں۔ ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس اولین شرط ہے۔ اگر دین وملت اور علم وادب کی اس اہم ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا، دین وعلم کے فروغ وارتقا کی سچی تڑپ دلوں میں موج زن ہو گئی اور سطحی وغیر علمی ماحول میں انقلاب لانے کا مخلصانہ جذبہ بیدار ہو گیا تو ذمہ داران مدارس، درسیات کی فراہمی اور تعمیرات کے انتظام کے ساتھ دار المطالعہ کے قیام، لائبریری کی توسیع اور اساتذہ وطلبہ کے لیے اسے مفید تر بنانے کا مسئلہ بھی خود ہی بہت جلد حل کر لیں گے۔

[۶] اس کے ساتھ چند باتیں اور ہیں جن کی طرف توجہ ضروری ہے۔

(الف) قواعد کی کتابیں مکمل پڑھائی جائیں۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے طلبہ علم الصیغہ، ہدایۃ النحو، پنج گنج جیسی کتابیں مکمل نہیں کرتے اور آگے کی کتابیں انھیں شروع کرادی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی قواعد سے ناواقفیت کے باعث عبارت خوانی اور ترجمہ بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے پھر وہ کسی لائق نہیں رہ جاتے۔

(ب) عربی فارسی شروع کرانے سے پہلے ابتدائی حساب اور اردو لکھنے پڑھنے کی قدرت پیدا کی جائے، املا

درست کرایا جائے، چھوٹے چھوٹے مضامین اور خطوط لکھنے کی مشق کرائی جائے ورنہ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض طلبہ حساب واملا میں کمزور ہونے کے باعث بعد فراغت بھی بہت سی مشکلات کا سبب بنتے ہیں اور یہ کمزوری خود ان کی رسوائی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

(ج) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتدائی فارسی عربی کے ساتھ حساب اور اردو املا و مضمون نویسی کی ضروری تعلیم دی جائے تاکہ نو داخل طلبہ کی بنیادی کمزوریوں کی تلافی ہو سکے۔

(د) تجوید قرآن سے غفلت عام ہے۔ ناظرہ کی تعلیم عموماً ایسے مدرسین کو سپرد کی جاتی ہے جو طلبہ کو صحت مخارج کے ساتھ حروف کی ادائگی کا عادی نہیں بناتے بلکہ بعض تو خود بھی اس پر قادر نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید ختم کرنے اور اعادہ کرنے کے بعد بھی سوفی صد بچے صحیح ادائگی سے عاجز ہوتے ہیں۔ اب یہ عربی درجات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی قرآن غلط پڑھتے ہیں اور عموماً امامت بھی کرتے ہیں جس سے ان کی نمازوں کے ساتھ دوسروں کی نمازیں بھی باطل ہوتی ہیں۔

اس لیے ایک طرف تو ناظرہ کی تعلیم صحیح خواں اور ذمہ دار و محنتی مدرسین کے حوالہ ہونی چاہیے دوسری طرف ابتدائی عربی کے کسی درجہ میں تجوید لازم کر دینا چاہیے تاکہ دوسری درس گاہوں سے آنے والے نئے طلبہ کی کمزوری دور ہو سکے اور سبھی اس قابل بن سکیں کہ صحت قراءت کے ساتھ اپنی نمازیں صحیح کر سکیں اور دوسروں کی نمازیں بھی ان کی اقتدا میں درست ہوں۔

(ے) اس طرح کے بہت سے مسائل پر میں اپنے مضمون "مدارس اسلامیہ کے انحطاط کے اسباب وعلاج" میں گفتگو کر چکا ہوں اسے ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں دارالمطالعہ، لائبریری اور دوسری چند ضروری باتوں کا تذکرہ شدت احساس اور جذبۂ اخلاص کے تحت زیر قلم آیا ہے۔

قوی امید ہے کہ مخلص و دردمند اور سنجیدہ و وسیع الظرف حضرات مذکورہ نکات پر غور کر کے انہیں بروے کار لانے کی کوشش کریں گے اور رب کریم اپنی توفیق وہدایت اور نصرت واعانت سے ہم کنار بھی فرمائے گا۔ وما ذلك عليه بعزيز.

(ا) الحمد للہ اس سلسلے کے کئی مشوروں کو اب جامعہ اشرفیہ مبارک پور اور متعدد اداروں میں عملی شکل مل چکی ہے اور ابتدائی درجات کے لیے ایک جدید نصاب بھی تیار کر کے شامل درس کیا جا چکا ہے۔

❁❁❁❁❁

تنظیم المدارس اور نیا نصاب تعلیم [1]

تنظیم المدارس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم میں جو ناہمواری اور غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے اسے دور کر کے یکسانی پیدا کی جائے اور تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر ارکان واساتذہ سے اس کی بہتری کی جانب خاطر خواہ توجہ مبذول کرنے کی گزارش کی جائے۔

اس کی روشنی میں بعض نمائندگان مدارس پر مشتمل ایک عبوری کمیٹی بنائی گئی جو نصاب پر نظر ثانی کر کے ایک متوازن اور عمدہ نصاب کا خاکہ تیار کرے۔

نصاب پر غور کرنے کے لیے عبوری کمیٹی کا پہلا اجلاس ۱۷/۱۸/۱۹/ربیع الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶/۲۷/۲۸/مارچ ۲۰۰۸ء بدھ، جمعرات، جمعہ کو الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں منعقد ہوا جو پانچ نشستوں پر مشتمل تھا۔ صبح کی نشست ۸/ بجے سے ۱/ بجے تک اور رات کی نشست بعد مغرب سے ۱۱/ بجے تک وقفۂ نماز عشا کے ساتھ ہوئی۔ جمعہ کے دن ۷/ بجے سے ۱۲/ بجے تک آخری نشست ہوئی اور نصاب کا مسودہ باتفاق حاضرین تکمیل کو پہنچا۔ دو دن میں کام مکمل نہ ہو سکا اس لیے دوسرا اجلاس ۲۴/ ۲۵/ ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء جمعرات، جمعہ، سنیچر کو دارالعلوم وارثیہ، لکھنؤ میں رکھا گیا۔

نصاب کی چند خاص باتیں:

[۱] قرآن کریم تمام علوم کا سرچشمہ اور جملہ عقائد واعمال کا ماخذ ومصدر ہے، مگر سابقہ نصاب کی نوسالہ مدت میں اس کی تعلیم دس بارہ پارے سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اس نصاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ یا تفسیر کے ذریعہ پورے قرآن کریم کا اجمالی یا قدرے تفصیلی درس ومطالعہ ہو جائے۔

[۲] سابقہ نصاب میں صحاح ستہ سے صرف تین کتابیں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور جامع ترمذی زیر درس تھیں۔ اس نصاب میں بقیہ تین کتب سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور ابن ماجہ کے ابواب بھی شامل کیے گئے ہیں تاکہ طالب علم کم از کم صحاحِ ستہ سے ایک حد تک بلا واسطہ روشناس ہو جائے ——— علاوہ ازیں مشکوۃ المصابیح، صحاحِ ستہ اور ان

(۱) تعارف مجلس برکات وفہرست کتب، اپریل ۲۰۱۸ء۔

کے علاوہ متعدد کتب حدیث کے بہت جامع اور نفیس انتخاب پر مشتمل ہے مگر درس میں سوسواسو صفحات سے زیادہ نہ آتے، نصاب میں اسے دو سال زیر درس رکھ کر زیادہ سے زیادہ احادیث کریمہ مطالعہ میں لانے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے کہ حدیث رسول، اسلامیات کا ماخذ دوم اور شارح قرآن حکیم ہے۔

[۳] تصوف کی کوئی کتاب باضابطہ داخل نہ تھی جس سے بڑی کمی کا احساس ہوتا تھا، اس نصاب میں:

(الف) حجۃ الاسلام امام محمد غزالی (۴۵۰ھ-۵۰۵ھ) کی مختصر اور جامع کتاب منہاج العابدین شامل کی گئی ہے۔

(ب) مشکوٰۃ شریف سے کتاب الرقاق مکمل داخل نصاب ہے۔ اس کے مضامین تصوف اور اہل تصوف کا خاص ماخذ ہیں اور اخلاق واحسان کا حامل بنانے میں احادیث کریمہ کا اپنا اہم کردار ہے۔ دل ودماغ میں کلمات رسول علیہ الصلاۃ والسلام کی اثر آفرینی کا ایک خاص امتیاز اور بلند مقام ہے۔

(ج) ریاض الصالحین سے بھی ان ابواب واحادیث کو شامل کیا گیا ہے جو اخلاق وتصوف سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔ ان شاء المولی تعالی طلبہ کی زندگی پر اس اضافے کا بہتر اور نمایاں اثر مرتب ہوگا۔

[۴] فقہ کے درس میں عموماً کتاب الطہارۃ، کتاب الصلاۃ، کتاب البیوع، کتاب النکاح، کتاب الطلاق کے چند ابواب ہوتے تھے تمام فقہی ابواب بطور متن بھی نظر سے نہ گزرتے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے نورالایضاح سے طہارت وعبادات اور قدوری سے بقیہ فقہی ابواب کو شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح کثیر جزئیات سے آگاہی کے لیے ہدایہ کے ساتھ بہار شریعت کا مطالعہ لازم کیا گیا ہے۔ اصول فقہ کی بھی کوئی کتاب مکمل نہ ہوتی تھی اب پوری اصول الشاشی داخل درس کی گئی ہے۔

جدید فقہی مسائل سے آشنائی کے لیے "قضایا فقہیۃ معاصرۃ" اور نئے افکار ومذاہب سے واقفیت کے لیے "افکار زائغۃ معاصرۃ" زیر ترتیب ہیں۔ انھیں مناسب مقام پر شامل کرنے کی کوشش ہوگی۔ ان شاء اللہ الرحمٰن۔

[۵] سابقہ نصاب میں علوم کے ساتھ تاریخ علوم کو جگہ نہ دی گئی تھی۔ اس نصاب میں تدوین قرآن، تدوین حدیث، فن جرح وتعدیل، اسماء الرجال، اصول تفسیر، تاریخ تفسیر، تاریخ اصول حدیث، تاریخ فقہ، تاریخ اصول فقہ، تاریخ ادب عربی، تاریخ مذاہب وملل وغیرہ کو حسب گنجائش جگہ دی گئی ہے۔ بعونہ تعالی ان سب سے طلبہ کی بصیرت اور وسعت نظر میں کافی اضافہ ہوگا۔

[۶] عربی وانگریزی تعلیم میں انشا داخل ہے، مگر اس انشا کا بیش تر حصہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی مشق پر مشتمل ہے۔ مضمون نگاری کیسے ہو؟ خیالات کو مرتب کرنا، چند فقروں یا جملوں کو پھیلا کر مضمون کی شکل دینا، کسی شخصیت، کسی مسئلہ، کسی حادثہ وغیرہ کے گرد حالات، معلومات اور خیالات کو دل چسپ اور مناسب

ربط وترتیب کے ساتھ پیش کرنا، ان سب پر تھوڑی سی توجہ اوپر کے ایک دو درجوں میں دی جاتی ہے جن میں طلبہ کو یہ کاوش عربی یا انگریزی میں کرنی ہوتی ہے۔ اس سے قبل انھوں نے سرے سے مضمون نگاری ہی نہ سیکھی، اب سیکھ رہے ہیں تو ایک دوسری زبان کے مزاج، بلند معیار، اسلوب اور محاورات کو بھی سر کرنا ہے۔ اس دوہرے بوجھ کی وجہ سے زیادہ تر انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر طلبہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اگر ابتدائی درجات میں انھیں اردو ہی میں مضمون نگاری کا عادی بنایا جائے تو یہ بار ہلکا ہوگا پھر جب ان کے اندر اپنی زبان میں افکار وخیالات کی ترتیب کا ملکہ پیدا ہوگیا تو دوسری زبان میں مضمون نگاری کے وقت صرف ایک بار ہوگا اور وہ ہے دوسری زبان کے مزاج ومعیار کا لحاظ، ان شاء اللہ وہ یہ بار بخوبی اٹھالیں گے۔ زیر نظر نصاب میں اس کی رعایت کی گئی ہے اور اردو مضمون نگاری کو داخل درس کیا گیا ہے۔

[۷] اچھے خاصے مقررین اور اہل علم کی گفتگو اور تقریروں میں زبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح بہت سے لکھنے والوں کی تحریروں میں زبان کے ساتھ قواعدِ املا کی بھی بے شمار غلطیاں نظر آتی ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ اردو زبان اور املا کے قواعد نہ انھیں پڑھائے گئے نہ از خود انھوں نے مطالعہ کر کے جاننے اور سیکھنے کی کوشش کی، مزید برآں بعض کو یہ بھی زعم رہا کہ اردو تو ہماری مادری زبان ہے اس کے قواعد سیکھنے کی ہمیں کیا ضرورت؟ اس خیال کی وجہ سے اخیر عمر تک غلطیاں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بالکل صحیح بلکہ نہایت فصیح وبلیغ زبان استعمال کرتے ہیں----- ان حالات کے پیش نظر اردو زبان اور املا کے کچھ ضروری قواعد بھی شامل نصاب کیے گئے ہیں۔

[۸] آج یہ ستم بھی ہو رہا ہے کہ بہت سے مدارس میں کچھ ایسے مدرسین نظر آتے ہیں جو چھ ماہ میں میزان ومنشعب اور نحو میر اور سال بھر میں علم الصیغہ وہدایۃ النحو بھی مکمل نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں سے ہر کتاب کے چند اوراق پڑھا کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے طلبہ اور ادارے پر بڑا احسان کر دیا ہے جب کہ یہ کھلا ہوا ظلم ہے۔ پھر انتظامیہ کی جانب سے اس پر کوئی گرفت بھی نہیں ہوتی اور طلبہ کو ہر سال اگلے درجے کے لیے ترقی ملتی جاتی ہے اور وہ ایک کھوکھلے درخت یا پوست بے مغز کی صورت میں اداروں سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ بہت سارے ہندوستانی اسکولوں، کالجوں کی بیماریاں مدرسوں میں بھی در آئی ہیں۔ ذمہ داری کا احساس اور خدا کا خوف کم وبیش ہر جگہ سے رخصت ہوتا جا رہا ہے۔

اس نصاب میں صرف، نحو، ادب، منطق، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث وغیرہ ہر فن کی بنیادی کتابیں مکمل طور پر شامل کی گئی ہیں کیوں کہ ان کے بغیر ذی استعداد مولوی یا عالم بنانے کا تصور ایک دل چسپ خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ انتظامیہ اور اساتذہ دونوں کی ذمہ داری ہے کہ نصاب کی تکمیل سے غفلت روا نہ رکھیں۔

[۹] فارسی زبان بھی شامل نصاب رکھی گئی ہے جس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ اردو میں فارسی کے بہت سے

الفاظ اور تراکیب داخل ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھنے، بولنے اور لکھنے کے لیے فارسی زبان سے آشنائی ضروری ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بہت سا دینی و علمی ذخیرہ فارسی زبان میں بھی ہے، اس سے استفادے اور اس کی عقدہ کشائی کے لیے فارسی میں مہارت ضروری ہے ______ لیکن نحو وصرف اور منطق وغیرہ کی ابتدائی کتابیں اردو ہی میں رکھی گئی ہیں تاکہ مبتدی طلبہ کے ذہن پر فن کے ساتھ ایک دوسری زبان کا کوئی بار نہ رہے اور وہ اصل مقصود کو کم سے کم وقت میں بہ آسانی حاصل کر سکیں۔

[۱۰] عربی اور انگریزی دونوں کے ادب و انشا کو اوپر کی جماعتوں میں بھی لازم کیا گیا ہے تاکہ دونوں میں مہارت ہو سکے اور ملکی، دینی اور تبلیغی امور ہمارے فارغین کے ذریعہ دونوں زبانوں میں انجام پا سکیں۔

[۱۱] ان سارے اضافوں کے ساتھ اس بات کا شدت سے خیال رکھا گیا ہے کہ اگر اسلامی سال کے تین سو چون ایام میں سے صرف ایک سو پچاس دن بھی تدریسی کام ہو تو نصاب تشنۂ تکمیل نہ رہے۔ ساٹھ دن امتحان ششماہی و سالانہ اور ان کی تیاری کے لیے، ایک سو چوالیس دن رخصت اور تعطیل کے لیے فرض کر لیے جائیں تو بھی اتنے ایام (۱۵۰/دن) بچتے ہیں جن میں نصاب کی تکمیل بخوبی ہو سکتی ہے بشرطے کہ مدرسین اور طلبہ اپنے فرض اور اپنے مقصود سے غافل نہ ہوں۔ واللہ الہادی الی سواء السبیل۔

دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ تنظیم المدارس کے منصوبوں کو جلد پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور مدارس کا علمی، تعلیمی اور عملی معیار بلند سے بلند تر بنائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب الغلمین، و ا لصلا ۃ و ا لسلا م علی سید ا لمر سلین، خاتم النبیین وعلیھم و علی آلہ و صحبہ اجمعین.

[نصاب ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور جون ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مجلس برکات کی فہرست کتب میں بھی شامل ہے۔ اشرفیہ کی ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ مرتب]

❁❁❁❁❁❁

دینی تعلیمی نصاب ضرورت واہمیت[1]

["امت مسلمہ کے ترجیحی مسائل اور ان کے حل پر دوسری کل ہند فکر و تدبیر کانفرنس ۸۳ ویں عرس قاسمی کے موقع پر خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے زیر انتظام بہ عنوان: مسلم معاشرے میں تعلیم: (مسائل اور امکانات) ۱۸ر ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۷ر نومبر ۲۰۰۹ء سنیچر کو دن میں ایک بجے سے سوا پانچ بجے تک منعقد ہوئی۔ حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ العالی نے مندرجہ ذیل فکر انگیز تحریر اسی کانفرنس میں پیش فرمائی تھی۔"]

دینی تعلیم کے کئی مراحل ہیں۔ ایک مرحلہ یہ ہے کہ ابتدا میں بچوں کو تجوید کے ساتھ قرآن کریم پڑھا دیا جائے۔ وضو و نماز کے ضروری مسائل اور دعائیں سکھا کر ان کی عملی مشق کرائی جائے اور پابندی نماز کی عادت پیدا کی جائے۔ پھر اردو زبان سکھا کر اردو کتابوں کے ذریعہ عقائد و اخلاق اور عبادات و معاملات کے ضروری اور عام مسائل کی تعلیم دی جائے۔ اس مرحلے کے لیے نصاب ایسا ہونا چاہیے جو بچوں کی طبیعت اور مزاج سے قریب تر، بہت آسان اور دل چسپ ہو۔

دینی تعلیم کا ایک حصہ وہ بھی ہے جو بعض مسلم اسکولوں اور کالجوں میں اپنایا گیا ہے کہ عصری علوم سکھانے کے ساتھ طلبہ کو دینی تعلیم و تربیت سے روشناس کیا جائے۔ اس شعبے کے لیے بچوں کی عمر کے لحاظ سے نصاب ذرا مشکل تو ہو سکتا ہے لیکن مختصر اور جامع ہونا بہت ضروری ہے تاکہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ اسلامی عقائد و مسائل، اسلامی تاریخ اور اہم دینی شخصیات سے بھی آگاہی ہو سکے اور طلبہ دوسرے ماحول میں جا کر بھی اپنے دین، دینی معاشرہ اور دینی عقیدہ و عمل سے دور نہ ہو سکیں اور بدمذہبوں، بے دینوں کی یلغار سے بھی اپنے کو بچا سکیں۔

لیکن اس کانفرنس میں مجھے جو عنوان دیا گیا ہے اس کا اصل مطمح نظر غالباً وہ دینی تعلیمی نصاب ہے جو مدارس دینیہ عالیہ میں علمائے دین کی تخریج کے لیے مقرر ہے۔

اس نصاب کا بنیادی اور اہم مقصد یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے اور ان سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت پیدا ہو، اسلامی عقائد و احکام کا عرفان ان کے دلائل کے ساتھ ہو، اسلامی مآخذ، اسلامی تاریخ، سیرت رسول اکرم ﷺ، شعائر اسلام اور اہل سنت کے عقائد و معمولات پر غیروں کی جانب سے ہونے والے حملوں کا جواب دینے کی قوت پیدا ہو اور مختلف محاذوں پر امت مسلمہ کی حکیمانہ و مخلصانہ رہ نمائی اور رہبری کی لیاقت بہم ہو۔

(۱) رہنمائے علم و عمل، از: علامہ محمد احمد مصباحی، محمد آباد، ۲۰۱۵ء

میں نے چند جملوں میں جن باتوں کو سمیٹ دیا ہے جب آپ ان کی گہرائی میں اتریں گے اور سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ دینی تعلیمی نصاب نہایت اہم، بہت مشکل، بڑا صبر آزما اور حد درجہ مشقت خیز ہے۔ مزید برآں اس کے ساتھ کسی بڑی مادی منفعت کی توقع بھی وابستہ نہیں۔

آج عصری درس گاہوں نے اپنے علوم و فنون کو اقسام در اقسام کر کے اپنا ہر نصاب بہت آسان اور مختصر بنالیا ہے اور ایک شعبے کو اختیار کرنے والا اگر دوسرے شعبے کی معلومات سے یکسر خالی ہوتا ہے تو یہ اس کے لیے کوئی عار کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن دینی عالم سے یہ توقع رکھی جاتی ہے بلکہ اس کے لیے یہ لازم سمجھا جاتا ہے کہ وہ تمام دینی علوم و فنون میں ماہر کامل ہونے کے ساتھ ریاضی، سائنس، جغرافیہ، تاریخ عالم وغیرہ اور دنیا کی مشہور زبانوں کا بھی شناور ہو۔

دوسری طرف مدارس کا جائزہ لیجیے تو اکثر زبوں حالی کا شکار ہیں۔ ان کے لیے جیسے تیسے ادارہ چلانا ہی دوبھر ہے۔ خصوصاً نصاب تعلیم پر غور و خوض اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کے مطابق نصابی کتابیں تیار کرنے کا ان کے پاس کوئی باضابطہ انتظام نہیں۔ حال ہمارے سامنے ہے اور ماضی قریب بھی اس سے مختلف نہیں۔ ہاں ماضی بعید میں جائیے تو بہت سی تبدیلیاں اور بہت سی کاوشیں نظر آئیں گی، لیکن وہ بھی اجتماعی اور ہمہ جہت نہیں، بلکہ چند مخلص اور متبحر علما کی ذاتی اور انفرادی کاوشیں ہیں جو انھوں نے اپنے علمی رسوخ و استحضار اور ذاتی ذوق و رجحان کی بنا پر بہت آسانی سے اور بہت کم مدت میں انجام دیں اور انھیں بہت سے خطوں میں قبول عام بھی حاصل ہو گیا۔

جب کہ اس وقت دنیا کا یہ حال ہے کہ خود حکومتوں کے تحت وزارت تعلیم کا شعبہ ہوتا ہے جس میں کچھ ماہرین بھاری تنخواہوں پر اسی کام کے لیے مختص ہوتے ہیں کہ نصاب کا جائزہ لیتے رہیں اور حسب ضرورت ترمیم کر کے نیا نصاب سامنے لاتے رہیں۔ اب یہ ان کی ڈیوٹی بن چکی ہے کہ ہر سال نہیں تو کم از کم پانچ سال میں نصابی کتب میں کچھ ترمیم ضرور کریں ورنہ "نصاب بورڈ" ناکارہ و نااہل قرار پائے گا۔ ہمارا ہندستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مگر برصغیر کے مدارس کا حال ساری دنیا سے الگ ہے۔

اولاً: عام مدارس پر نظر ڈالیے تو تعلیم کی عمدگی پر خاطر خواہ توجہ ہی نہیں بس کچھ طلبہ آتے جاتے رہیں، مدرسہ اور مدرسین کا وجود جائز رکھنے کے لیے یہی کافی ہے۔

ثانیاً: جو نصاب جاری ہے اس میں کوئی ترمیم بھی ممکن ہے؟ یہ ان کے تصور سے بالاتر ہے۔

ثالثاً: نصابی کتابوں اور نصابی فنون کا مقصد کیا ہے۔ عام مدرسین کو اس سے بھی سروکار نہیں۔ کون سا فن اور کون سی کتاب ناقص ہو تو طالب علم کی اگلی تعلیم کمزور یا بالکل برباد ہو جائے گی اس کا بھی خیال نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائی، انتہائی، درمیانی کوئی بھی کتاب ہو اگر اس کے چند صفحات کی زیارت سے طالب علم کو سرفراز کر دیا جائے تو ہمارا فرض پورا ہو گیا۔

رابعاً: ان حالات میں بھی بہت سے اہل علم ایسے ہیں جو تعلیم اور نصاب پر غور کرتے ہیں بلکہ آج سے تیس سال قبل مبارک پور میں تنظیم المدارس اور الٰہ آباد میں رابطۂ مدارس کا قیام عمل میں آیا اور نصاب میں ترمیم کی ضرورت کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ پھر ترمیم شدہ نصاب بھی پیش ہوئے مگر مدارس کے باہمی ارتباط اور یکساں نصاب کے نفاذ کا معاملہ آج تک تشنۂ تکمیل ہے۔ مدارس کی جو عام روش چلی آئی ہے اس میں کوئی خوش گوار تبدیلی شاید و باید ہی نظر آتی ہے۔

اب خانقاہ برکاتیہ کی تحریک پر ۲۰۰۷ء میں تنظیم المدارس کی نشأۃ ثانیہ ہوئی تو اس کی نصابی نشست میں ترمیم نصاب پر ذرا وسیع پیمانے پر غور و خوض ہوا، پورے قرآن کو درس یا مطالعہ یا تفسیر کے ساتھ داخل نصاب کیا گیا، تصوف جو عرصۂ دراز سے خارج از نصاب تھا اسے بھی نصاب میں جگہ دی گئی، حدیث و فقہ کے درس میں بھی گراں قدر اضافہ کیا گیا، بعض فنون جن سے مختصر آشنائی بہت آسان ہے اور بالکل ناواقفی سخت مضر انھیں بھی بقدر گنجائش شامل نصاب کیا گیا، فن تجوید کو بھی لازم کیا گیا، انگریزی زبان اور بعض عصری علوم جو جامعہ اشرفیہ کے نصاب میں شامل تھے انھیں بھی برقرار رکھا گیا۔ تفصیل ماہنامہ اشرفیہ شمارہ جون ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔ وسائل کی کمی کے باوجود اس بار کچھ نصابی کتب خود تیار کرنے اور شائع کرنے کی بھی ہمت کی گئی جب کہ ۸۱-۱۹۸۰ء میں اسے بہت مشکل یا ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔ (دیکھیے رابطہ مدارس عربیہ الٰہ آباد کی رپورٹ ص:۹) نصابی کتب کی تیاری کا کام مجلس برکات کے سپرد کیا گیا ہے۔ مجلس برکات کا قیام دس بارہ سال قبل حضرت امین ملت (پروفیسر شاہ محمد امین برکاتی دام ظلہ) کی سرپرستی میں ہوا ہے اور جامعہ اشرفیہ کے زیر انتظام سرگرم عمل ہے۔ اس کا پورا وجود آستانۂ برکات کا فیضان ہے۔

نصاب میں ترمیم کی ضرورت کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر ہمارے معاصرین اور ہمارے اکابر بہت پہلے تسلیم کر چکے ہیں اور پوری دنیا میں اس پر عمل در آمد بھی جاری ہے اور پہلے بھی یہ عمل ہمیشہ جاری رہا ہے۔ ہمارے پر دادا استاذ حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری ثم جون پوری اور حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی علیہما الرحمہ کے یہاں جو نصاب رائج تھا وہ بعینہ ان کے شاگرد حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ کی درس گاہ میں نہ رہا اور ان کی درس گاہ میں جو نصاب تھا وہ بعینہ ان کے تلامذہ محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد لائل پوری، حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز مراد آبادی، صدر العلما مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی، شیخ العلما مولانا غلام جیلانی اعظمی وغیرہم علیہم الرحمہ کی درس گاہوں میں نہ رہا۔ نصاب، معیار داخلہ، معیار فراغت سب میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔

الغرض حسب حالات تبدیلیِ نصاب ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلاف و اخلاف کا عمل خود اس پر شاہد عدل ہے۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ تنظیم المدارس کا نصاب یا کوئی بھی نصاب حرف آخر نہیں۔ اس لیے تنظیم المدارس کے تحت ایک نصاب بورڈ بھی ہوگا جو طلبہ و مدرسین کی شکایات سننے، حالات کا جائزہ لینے اور نئی ترمیم یا اس کی تجویز سامنے لانے کا ذمہ دار ہوگا۔

ہاں اس بات کا ہمیں کھلے دل سے اعتراف ہے کہ جو وسائل حکومتوں کے پاس ہیں ان کا سَواں حصہ بھی مدارس کے پاس نہیں اسی لیے باتیں تو بہت ہوتی ہیں مگر عمل نہیں ہو پاتا۔ میرے عنوان کا دوسرا جز ہے:

طریقۂ تعلیم میں تبدیلی:

اس پر بھی تفصیلی گفتگو ہو سکتی ہے مگر جہاں جمود کا یہ عالم ہو کہ سب کچھ تسلیم ہونے کے باوجود اعضا میں حرکتِ عمل کی آہٹ قریب سے قریب جاکر بھی نہ محسوس ہو وہاں کسی اور تبدیلی کی تجویز بار آور ہونے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

پہلے اساتذہ قواعد یاد کرانے کے بعد زبانی سوالات کے ذریعہ ان کا اجرا کراتے تھے۔ اب عملی مشق اور زبانی و تحریری سوالات کے جوابات لے کر قواعد ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ کوئی بات سمجھانے کے لیے قرطاس و قلم کا سہارا پہلے شاذ و نادر ہی لیا جاتا تھا۔ اب بلا ضرورت بھی تختۂ سیاہ کا استعمال عادت میں داخل ہو چکا ہے۔ پہلے شش ماہی امتحانات کا وجود نہ تھا اور سالانہ امتحانات کے لیے صرف دماغ اور زبان کا استعمال کافی تھا جس کے باعث فعال زبانیں تو بہت پیدا ہوئیں مگر کار آمد ہاتھ کم نکلے۔ اب امتحانات کی کثرت ہے جن میں زبانی امتحانات بہت کم ہیں اور اکثر وہی ہیں جن میں زبان کو ساکن اور ہاتھ کو متحرک رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے فعال ہاتھوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اب ہاتھوں کی زیادہ حرکت بھی دردِ سر بننے لگی ہے -------- خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔

پہلے طلبہ کی تعداد کم ہوتی تھی اور استاذ انفرادی طور پر ہر طالب علم کو زبانی مشق و اجرا کے مراحل سے گزار لیتا تھا۔ اب یہ کام مشکل ہے۔ ہر درس میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اساتذہ بھی عموماً تربیت یافتہ (ٹرینڈ) نہیں ہوتے۔ اس لیے اب نصابی کتابیں ہی اس انداز سے تیار کی جاتی ہیں کہ ان میں مشقی سوالات اور تحریری عمل کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ سوالات و تمرینات کے ذریعہ سبق فہمی کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے اور سبق کو مزید سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ مزید برآں استاذ کچھ باتیں تختۂ سیاہ پر لکھ کر طلبہ کو فوراً سمجھاتا ہے۔ پھر دو چار طلبہ کے ذریعہ بلیک بورڈ پر کچھ عمل کراتا ہے۔

اس طرح کمزور طلبہ کے لیے بھی سبق سمجھنا اور ذہن نشیں کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور بقیہ تمرینی عمل وہ خود

کر کے لاتے ہیں۔ لیکن استاذ نے اگر ہر طالب علم کی کاپی دیکھنے، اس کی کتاب فہمی کا جائزہ لینے اور مناسب ہدایت دینے کی زحمت گوارا نہ کی تو اس طریقۂ درس کی افادیت بہت کم ہو جائے گی۔

فی الجملہ یہ طریقۂ تدریس زیادہ کارگر اور بار آور ثابت ہوا ہے اس لیے مدارس کو بھی اسے اپنانے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً جب کہ قدیم اساتذہ کی طرح زبانی مشق و اجرا اور کثرت تمرین و تفہیم کا عمل بھی کم تر یا مفقود ہو چکا ہے۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مدارس ہوں یا اسکول اور کالج، ان کے اساتذہ، طلبہ اور ذمہ داران یہ سمجھیں کہ تعلیم بڑی اہم چیز ہے، اس پر توجہ دینا، اس میں نکھار لانا اور متعلقہ فن میں طلبہ کے اندر رسوخ و کمال بہم پہنچانا ہماری منصبی ذمہ داری ہے۔

آخر میں نصاب کے متعلق چند باتیں مزید عرض کرنا چاہتا ہوں، ان پر اگر تمام مدارس کاربند ہوں تو میرے خیال میں نتائج زیادہ اچھے ہو سکتے ہیں۔

[۱] درجہ پنجم یا ہشتم تک اسکولوں کے مطابق بچوں کو حساب، سائنس، جغرافیہ، ہندی وغیرہ کی تعلیم اردو زبان اور دینیات کے ساتھ باضابطہ دی جائے تاکہ وہ ضروری حد تک ان علوم سے آشنا ہو جائیں جن کی انھیں زندگی میں قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے اور دین کی بنیادی باتوں سے بھی باخبر ہوں تاکہ وہ اپنے دین پر بآسانی عمل کر سکیں۔ ساتھ ہی اردو زبان سے اتنی آگاہی اور دل چسپی پیدا ہو جائے کہ وہ مزید مطالعہ کر کے اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کر سکیں۔

[۲] براہ راست قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنے کے لیے عربی زبان سے آگاہی ضروری ہے اور عربی سیکھنے کے لیے صرف و نحو اور لغت و ادب کی معرفت لازم ہے۔ اس ذریعہ کو آسان سے آسان اور کم سے کم مدت میں سر کرانا چاہیے۔ اسی کو مقصود بنا کر اس پر زیادہ وقت صرف کرانا آج کسی طرح قرین حکمت و مصلحت نہیں۔ ہاں ضروری نصاب کی تکمیل کے بعد ان علوم آلیہ میں سے کسی علم پر اگر کوئی تحقیق کرے اور اس میں امتیاز و اختصاص پیدا کرے تو بجا ہے۔

[۳] تنظیم المدارس کے نصاب کے مطابق درجۂ عالمیت تک کی تعلیم تمام طلبہ کو مکمل دی جائے پھر فضیلت کا دو سالہ نصاب اس طرح ہو کہ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، کلام وغیرہ میں سے کسی ایک کا غلبہ اور بقیہ کی شمولیت ضروری حد تک ہو یعنی اس نصاب کو متعدد شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر شعبہ میں کسی ایک فن کو اصلی اور باقی کو ضمنی کی حیثیت دی جائے تو مختلف علوم و فنون کے ماہرین پیدا ہو سکیں گے۔ اس میں مضامین اور شعبوں کی کثرت کے باعث زیادہ اساتذہ کی ضرورت پیش آئے گی جو بہت مشکل امر ہے۔ اس لیے چند مدارس مل کر اگر شعبوں کی باہم تقسیم کر لیں تو آسانی ہو سکتی ہے، ورنہ بروقت جو نصاب ہے وہی جاری رکھا جائے۔

[۴] فضیلت کے بعد اختصاص کا دو سالہ کورس مناسب ہے، اسے مزید مستحکم اور زیادہ فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح زیادہ شعبوں میں اختصاص کے انتظام کی صورت بھی پیدا ہونی چاہیے۔

الغرض! بہتری کی شکلیں بہت ہیں لیکن ذمہ داران مدارس میں جب تک فکر و نظر اور ہمت و حوصلہ کی بلندی نہ پیدا ہو کوئی کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان میں فکری و عملی بیداری پیدا کی جائے اور انھیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ آپ تعلیم کا چھوٹے سے چھوٹا اور محدود سے محدود کام بھی اگر کر رہے ہیں تو اسے منظم، مضبوط اور زیادہ نتیجہ خیز بنائیں۔ محض رسمی خانہ پری سے بے شمار صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں جب کہ مسلمانوں میں تعلیم کی طرف توجہ بہت کم ہے اور مدارس کی طرف رخ کرنے والوں کی تعداد تو کم سے کم تر ہے۔ اگر گنتی کے یہ چند افراد بھی کار آمد نہ بنائے گئے تو اس میں دین و ملت کا عظیم اور سنگین خسارہ ہے۔

❁❁❁❁❁❁

طالبان علوم نبویہ سے چند باتیں(۱)

جس نے طلب علم کی راہ میں قدم رکھا اسے سب سے پہلے اپنی نیت کو صاف اور مستحکم کر لینا ضروری ہے۔ صفائی نیت سے مراد یہ ہے کہ طلب علم کو واقعۃً اپنا مقصود بنائے، وقت گزاری یا طلب سند اس کا مقصود نہ ہو اور استحکام نیت کا مدعا یہ ہے کہ طلبِ علم کا شوق اپنے دل میں راسخ کرے۔ اور ایک لمحہ بھی اسے دل سے جدا نہ ہونے دے تاکہ اس کے ثمرات اس کے اعضا پر اور اس کی عملی زندگی میں نمایاں ہوں۔

ظاہر ہے جس کی نیت طلبِ علم نہ ہو ہر گز وہ طالب علم نہیں اور جس کی نیت میں استحکام نہ ہو اس کے اندر علم کی لگن اور اس کی طلب میں مشقتوں کا تحمل نظر نہ آئے گا۔ بار بار اس کا ذہن بیکاری یا آرام طلبی کی طرف مائل ہو گا، اور طلب علم سے روکے گا اور وہ اپنے اوقات اور اپنی تعلیم کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا اور ابتدائی کتب پر بھی عبور حاصل نہ کر سکے گا جس کے باعث انتہا تک کمزور رہے گا یا بار بار ناکام ہو گا یا تعلیم ہی سے خاطر برداشتہ اور متنفر ہو جائے گا اور ایک وقت دیکھے گا کہ عمرِ بے بہا کا بڑا قیمتی حصہ ضائع ہو گیا اور کچھ حاصل نہ ہوا یا جتنا حاصل ہوا وہ اس طویل مدت کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ بعض طلبہ امتحان میں لازمی ۳۳/فیصد حاصل ہونے اور اگلے درجہ میں ترقی پانے کی حد تک کوشش کرتے ہیں۔ اب بنیادی کتابوں سے متعلق جن کی معلومات کا دو تہائی حصہ غائب ہو اور امتحان پاس کر لینے کے بعد بقیہ حصہ بھی غائب ہو جائے تو آئندہ کے لیے ان کی دشواری، انتہائی کمزوری بلکہ ناکامی محتاج بیان نہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ابتدا میں عقل ناپختہ ہوتی ہے، محنت سے نفرت، کھیل سے رغبت، فضولیات سے الفت رہتی ہے اور جب شعور بیدار ہوتا ہے وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ طلبہ کی اکثریت اسی ایک سبب کے باعث کمزور یا بیکار ہو رہی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ابتدائی تعلیم چھوٹے مدارس میں اساتذہ کی سخت نگرانی کے ماحول میں ہو کہ نہ چاہتے ہوئے بھی پڑھنے اور لیاقت پیدا کرنے پر مجبور ہوں تو یہ ان کے لیے اور زیادہ کار آمد اور مفید ہو گا۔ بنیاد ٹھوس اور مضبوط ہو گئی تو آگے کے ہر قفل کی کنجی ہاتھ آ گئی۔

یہ دور جس میں الحاد و بے دینی اور آزاد روی و بے راہ روی اپنے عروج پر ہے، علم دین کی راہ میں قدم رکھنے کے لیے بڑے مضبوط ارادے اور توانا قلب و جگر کی ضرورت ہے۔ عالم دین بننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہر گمراہی سے

(۱) فضل العلم والعلماء، طلبۂ جماعت ثامنہ، جامعہ اشرفیہ ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

نبرد آزمائی کرنی ہوگی اور ہر آزادی وبے راہ روی کا پنجہ مروڑنا ہوگا ____ جس کے لیے بے پناہ قوت علم وعمل اور بے شمار اسلحوں سے آراستہ ہونا لازمی امر ہے۔ جس کا ذہن مغربی تمدن اور اس کی دل فریب رعنائیوں کی طرف مائل ہو اس سے اسلامی تمدن کا تحفظ کبھی کیوں کر ہوگا۔ خطرہ ہے کہ عالم بن کر وہ اپنے زیر اثر دوسرے مسلمانوں کو بھی اسلافِ اسلام کی روش اور ان کی وضع سے ہٹاکر مغربی روش پر ڈال دے۔

یوں ہی جو شخص علم دین اور دین اسلام کی برتری کے یقین سے خالی ہوگا وہ اس میں گہرائی وگیرائی نہ پیدا کر سکے گا۔ نہ ہی ان اسلحوں سے آراستہ ہوسکے گا جن سے وہ الحاد وضلال کی کاٹ کر سکے۔

عصر حاضر کے طالبِ علم دین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے علوم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ مغربی علوم سے بھی ایک حصہ حاصل کرے تاکہ مغرب سے مرعوب نہ ہو اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ ان الزامات کا بھی پتہ لگائے جو دیگر ادیان و مذاہب کی طرف سے اسلام پر لگائے جاتے ہیں تاکہ ان کے دفاع وجواب کی تیاری کر سکے۔ اسی طرح اہل سنت کے حریف جتنے فِرقِ باطلہ ہیں، ان کے شبہات واقوال سے واقفیت حاصل کرکے ان کے تحقیقی والزامی جوابات سے بھی روشناس ہو تاکہ امت مسلمہ کی حفاظت وصیانت کا فریضہ انجام دے سکے۔

ظاہر ہے کہ ہر فن اور ہر بات کی تعلیم خاص نصاب درس ہی میں ہو جانی ممکن نہیں۔ درس نظامی کا مقصود یہ ہے کہ طالب علم میں عربی کتاب خود سے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے، نہ صرف سیرت و تاریخ اور حکایات و واقعات سمجھنے کی لیاقت بلکہ فلسفہ وکلام کی مشکل کتابیں سمجھنے کی بھی لیاقت پیدا ہو۔ اسی لیے درس نظامی میں ایسی کتابیں شامل کی گئی ہیں جو مشکل سے مشکل فن اور کتاب کے حل کا حوصلہ اور اس کی صلاحیت پیدا کرنے والی ہیں۔

لہٰذا ہمارے طالب علم کا ایک فرض تو یہ ہے کہ وہ اپنی درسیات کو پورے اخلاص ومحنت کے ساتھ از خود سمجھ کر پڑھے اور استاذ کے ذریعہ ان میں رسوخ ومہارت حاصل کرے تاکہ دیگر کتب جو شامل نصاب نہیں، ان کے سمجھنے میں کبھی اسے دقت معلوم نہ ہو اور اس نصاب کا مقصود حاصل ہو۔

دوسرا فرض یہ ہے کہ سیرت و تاریخ، ادیان و مذاہب، تقابل ادیان خصوصاً اثبات مذہب اہل سنت اور رد فرقِ باطلہ کی کتابوں کا مطالعہ کرکے ان میں عبور حاصل کرے تاکہ وہ اسلام وسنیت کی صحیح وکالت کر سکے اور غلط باتیں بیان کرکے اپنے مذہب اور اہل مذہب کی رسوائی کا سامان نہ کرے۔ کتابوں کے مطالعہ میں بھی انتخاب ولحاظِ ترتیب ضروری ہے۔
انھی کتابوں کو منتخب کرنا چاہیے جو زیادہ جامع اور مستحکم دلائل ومسائل پر مشتمل ہوں اور ان کو بھی آسان پھر مشکل، پھر مشکل یا الاہم فالاہم کی ترتیب سے دیکھنا چاہیے۔

تیسرا امر یہ ہے کہ تدریس وتعلیم، تقریر ومناظرہ، تحریر وتصنیف، تدبیر وانتظام ہر شعبہ میں کچھ درک ضرور حاصل کرے کیوں کہ عملی میدان میں قدم رکھنے کے بعد ایک ذمہ دار عالم دین کو ہر طرح کے حالات وضروریات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

کسی طالب علم سے ان فرائض کی بجاآوری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے اوقات کو ضیاع سے نہ بچائے اور ایک ایک منٹ کو اپنے مقصود واہم میں صرف نہ کردے، اپنا ایک مرتب نظام الاوقات رکھے جس کی روشنی میں درسی وغیر درسی کتابوں کے مطالعہ کی مہم بخوبی سرانجام دیتا رہے۔ مثلاً فرصت وتعطیل کے ایام خصوصاً تعطیل کلاں میں غیر درسی کتب ومضامین پر بھرپور توجہ صرف کرے۔ اور ایام تعلیم میں درسیات میں منہمک رہے اور صرف ایک گھنٹہ غیر درسی کتاب کے لیے رکھے، تفریح وآرام کا بھی وقت رکھے مگر قدر حاجت سے زائد نہیں کہ عمر کا ایک حصہ تو آرام میں گزر چکا اور باقی ساری عمر میں بھی اس کے مواقع مل سکتے ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ اور اساتذہ سے اکتساب علوم وفیوض کا دور بار بار نہیں ملتا اور گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

عمل کی منزل بڑی سخت ہے اور نفس پر انتہائی گراں مگر عالم دین اگر اس سے خالی ہو تو نہ عالم کہے جانے کا حق دار ہے نہ دین کی سچی حمایت اس سے ہوسکتی ہے۔ اس لیے طالب علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی سیرت کا مطالعہ کرکے اس سے الفت پیدا کرے تاکہ ان کی بے داغ زندگی اور ان کے زاہدانہ کردار کے سامنے نہ مغرب کی جلوہ سامانیاں اسے مرعوب کر سکیں نہ دنیا کی دوسری رعنائیاں ------ جو مسلمان اور عالم ہو کر مغربی تمدن کا دل دادہ ہو اور اس کا باطن مغربی لباس ووضع کی طرف لپکتا ہو یقیناً اس کا ذہن اپنے اسلاف کی روش سے غیر مطمئن، اور مغرب سے مرعوب ہے اور غیر سے مرعوب ذہن کبھی بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایسے افراد مغربی تمدن کی غیر شعوری وکالت تو کر سکتے ہیں مگر اسلامی تمدن کی مخلصانہ حمایت ان سے متوقع نہیں۔ خصوصاً جب کہ ہمارے حریف فرق باطلہ ظاہری اخلاق وعمل سے ہی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رہے ہیں اور اپنے بعض حضرات اپنی بے راہ روی سے لوگوں کو دور ونفور کر رہے ہیں، پہلے تو اپنی ذات سے متنفر کرتے ہیں پھر چونکہ ان کی ذات، ان کے مذہب کے ترجمان کی حیثیت سے متعارف اور ذہنوں میں راسخ ہوتی ہے اس لیے بعض لوگوں کے لیے اپنے مذہب سے بھی بعد ونفرت کا سبب بنتے ہیں۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔
حکم الٰہی کی عظمت کے ساتھ اس ماحول کی نزاکت سمجھ لینے کے بعد عمل کی اہمیت اور بے عملی کی سخت مضرت مبہم نہیں رہ جاتی۔
پھر اسلام کی تعلیمات کا مطالبہ محض لباس ووضع پر بس نہیں۔ احکام ظاہر سے احکام باطن تک نہ جانے کتنی

دشوار گزار منزلیں ہیں جن کی جادہ پیمائی کے بغیر مقصد اصلی تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی، مومن کی ہر منزل سے آگے ایک اور منزل ہے۔ وہ فاروق وصدیق ہو کر بھی سعی پیہم سے باز نہیں آتا اور مزید کی طلب میں لگا رہتا ہے۔

ایک طالب علم اور عالم کا طرز زندگی ہر گز یہ نہ ہو کہ عمل سے گریزاں نظر آئے، صرف رخصتوں کی تلاش میں رہے، عزیمتوں کا خیال بھی ذہن میں نہ لائے اور یہ تو بہت پست حالت ہے کہ معاذاللہ صریح خلاف ورزی اور کھلا گناہ کرنے کے بعد توبہ واعتراف کے بجائے تاویل واصرار میں پڑا رہے۔ "عذر گناہ بدتراز گناہ۔"

محاسبۂ نفس، حسن اخلاق، پختگی کردار وعمل، اخلاق وتقویٰ، جذبۂ خدمتِ دین، شوق اشاعت علم اور ان سب سے صرف خوشنودئ خدا ورسول کی طلب ایک طالب علم اور عالم دین کے لازمی اوصاف ہیں۔

باشعور اور ہوش مند طلبہ سے عرض یہ ہے کہ ان کو اپنی کتب پر عبور کے ساتھ کچھ اور ہمت کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلا:

[۱] جن مدارس کے نصاب میں اب تک ادب عربی یا انگریزی میں سے ایک ہی لازم ہے، دونوں کو اس خیال سے لازم نہ کیا گیا کہ طلبہ پر بار زیادہ ہو جائے گا اور وہ سنبھال نہ سکیں گے، مگر دونوں کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے، کیونکہ جو طلبہ عربی ادب کا نصاب مکمل نہیں پڑھتے وہ حدیث، سیرت وتاریخ اور دوسرے فنون کی بہت سی کتابوں کے بہت سے مقامات حل نہیں کر پاتے یا بہت مشکل سے سمجھ پاتے ہیں، جب کہ مکمل ادب پڑھے ہوئے طلبہ اول نظر میں انھیں سمجھ لیتے ہیں۔

دوسری طرف جو انگریزی نصاب مکمل نہیں کرتے انگریزی کتب ورسائل سے استفادہ سے قاصر رہتے ہیں، قاصر تو وہ بھی رہتے ہیں جو نصاب ہی کی حد تک محدود رہتے ہیں اور مطالعہ کے ذریعہ علم زبان کے فروغ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے لیکن ظاہر ہے کہ جنھوں نے انگلش بک ۳/ کے آگے کچھ دیکھا ہی نہ ہو زیادہ عاجز ہوں گے۔ اس لیے باہمت طلبہ کو میرا مشورہ یہ ہے کہ درس میں اگرچہ کسی ایک زبان کو رکھیں مگر خارجی کسی بھی ذریعہ سے وہ دوسری زبان کی بھی تکمیل کریں اور دونوں زبانوں سے متعلق غیر نصابی کتب ورسائل کثرت سے دیکھیں اور لکھنے اور بولنے کی بھی خوب مشق کریں اس طرح وہ بہت کار آمد انسان بن سکتے ہیں۔

[۲] عالم دین سے لوگ اپنے روز مرہ کے مسائل ضرور پوچھتے ہیں اور اسے خود اپنے عمل کے لیے بھی مسائل سے آگاہی ضروری ہے اس لیے ہر طالب علم کا فرض ہے کہ مکمل "بہار شریعت" کا مطالعہ ضرور کرے اور بار بار مراجعت کرتا رہے تاکہ ضروری مسائل ازبر رہیں۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے کلامی وفقہی رسائل ضرور دیکھے ان میں وہ علمی خزانے ہیں

جو کہیں اور شاید ہی دستیاب ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی کتابیں غور سے نہیں پڑھی ہیں ساری درسیات پڑھنے پڑھانے کے بعد بھی بہت سے مسائل میں ان کی سطحیت بالکل عیاں ہوتی ہے۔

[۳] تجوید وقراءت بقدر ضرورت کم از کم صحت مخارج کے ساتھ قرآن کی قراءت ہر ایک پر فرض ہے اس سے کوئی طالب علم ہر گز عاری نہ ہو۔

[۴] حالات زمانہ سے آگاہی۔ مخالفین کی حرکتوں سے واقفیت کے لیے مختلف کتب ورسائل کا مطالعہ کرتا رہے۔ سیرت، تاریخ، حساب، جغرافیہ وغیرہ کی بنیادی تعلیم جو ابتدائی درجات میں شامل ہے، مطالعہ کے ذریعہ ان میں اور وسعت پیدا کرے۔

[۵] کتب حدیث کی ایک محدود مقدار داخل نصاب ہے مطالعہ میں کم از کم پوری "مشکاۃ المصابیح" ضرور دیکھے۔

[۶] تدریس، تقریر، مناظرہ ہر ایک کا ملکہ پیدا کرے تاکہ وقت ضرورت عاجز نہ رہے اور اس کا دائرہ کار بھی وسیع ہو۔ بعد میں اگر سارے کام بخوبی نبھالیتا ہے تو بہت خوب ورنہ جیسی ضرورت ہوگی ویسا کر سکے گا۔

[۷] تقریر وتحریر کے ذریعہ جو بھی بیان ہو اس کی اچھی طرح جانچ کر لی جائے کہ وہ صحیح ومستند ہے اس کا اصل اور قوی ماخذ ذکر میں نہ آئے تو بھی معلوم ومحفوظ ضرور ہو ورنہ نقل در نقل میں بہت سی ایسی باتیں بھی در آتی ہیں جو منطقی وعقلی اور شرعی اعتبار سے غلط ہیں یا غیر معتبر اور ناقابل بیان ہیں، تنقیدی وتحقیقی نظر پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔

[۸] زبان وبیان کی غلطیوں سے بھی اپنی تحریر وتقریر کو ہر طرح محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ "میں نے آیت پڑھا، تم نے حدیث سنا، خدا کے احکامات، اس امر کی وجوہات، رسومات" وغیرہ جیسی تراکیب والفاظ سے بھی بچنا چاہیے۔ معطوف، معطوف علیہ دونوں عربی یا فارسی یا ایک عربی اور ایک فارسی ہو تو حرف عطف "و" درست ہے مگر کوئی ایک ہندی یا انگریزی ہو تو وہاں "و" کے بجائے "اور" ہونا چاہیے۔ اس طرح کی اور بھی چیزیں ہیں جو اس دور کے معروف قلم کاروں کے یہاں بھی در آئی ہیں۔ شاید کہ بروقت ان کی اصلاح کرنے والا کوئی نہ ملا۔ مبتدیوں کی غلطیاں تو بہت ہیں۔ انھیں اساتذہ سے معلوم کرنا چاہیے۔

بولنے اور لکھنے سے پہلے اپنے سامع وقاری کو متعین کریں اور وہ جس سطح کے ہوں اسی سطح کی گفتگو کریں اور زبان میں بھی اس کی رعایت کریں، مخلوط ہوں تو دونوں کی رعایت کریں۔ اخبار اور عوامی رسائل کے لیے زبان بہت آسان اور عام فہم ہونی چاہیے، ادبی رسائل کے لیے ادبی اور تحقیقی۔ مگر مشکل الفاظ، پیچیدہ تراکیب اور خفی استعارات وکنایات سے احتراز ہر جگہ ضروری ہے۔

[۹] باہمی نزاعات سے دور رہیں اور کسی جگہ کوئی اختلاف رونما ہو تو اصلاح و مصالحت کی تدبیر کریں۔ درد مندی اور اخلاص سے کوشش ہوئی تو کامیاب ہو یا ناکام اس کا اجر ان شاء اللہ ضرور حاصل ہو گا۔

[۱۰] دوسروں کی تنقیص، جماعت میں کام نہ ہونے کا ماتم، اپنی براءت کا اثبات اور دوسروں پر الزام آج کل ایک محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ حالاں کہ اس کا حاصل اپنوں سے بدگمانی اور تضییع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہو سکے تو خود کچھ کریں یا جو لوگ کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

[۱۱] طالب علم اپنے افکار و خیالات، کردار و اخلاق، ہمیشہ پاکیزہ و بلند رکھے۔ پست حرکتوں کا خیال آنے پر بھی اپنا محاسبہ کرے، دین و سنت کی پابندی اور خدا و رسول کی اطاعت ہی میں دنیا و آخرت کا بھلا جانے، آزادوں کی آسائشوں اور رنگینیوں سے کبھی متاثر و مرعوب نہ ہو، نہ ہی ان کے حصول کی خاطر اپنے افکار و اخلاق کی دنیا تاراج کرنے کا خیال دل میں لائے، شریعت کی خلاف ورزی کو زہر قاتل یا آتش مہلک جانے، فرائض و واجبات کی پابندی میں عوام سے کمتر ثابت نہ ہو بلکہ آداب و نوافل میں بھی ان کے لیے نمونہ اور مقتدا بنے۔

[۱۲] عمر انسانی چند روزہ ہے اور کام بے شمار لیکن رب تعالیٰ نے انسان میں قوت و استعداد بے پناہ رکھی ہے، قوت کو فعل کی منزل میں لانے کے لیے جد و جہد در کار ہے، آدمی کو چاہیے کہ خود کو زیادہ سے زیادہ کار آمد بنائے اور کسی بھی بڑے سے بڑے کام کو انجام دینے کی لیاقت اور حوصلہ پیدا کرے، رب تعالیٰ کی نصرت و حمایت کار ساز ہوگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی کسی خدمت پر نہ مغرور ہو نہ احساس کمتری کا شکار ہو کر دست کش ہو۔

[۱۳] کوئی اہم اقدام کرنا ہو، یا ادارہ یا انجمن بنانی ہو تو لوگوں سے مشاورت ضرور کریں تاکہ بے خبری میں اقدام کے بعد رسوائی یا ناکامی کا سامنا نہ ہو رائے دینے والوں میں کئی طرح کے لوگ ہوں گے۔

[۱] زیادہ وہ ہوں گے جو آپ کا منصوبہ اور اس کی افادیت سننے کے بعد فوراً داد و تحسین سے نوازیں گے اور اپنی حمایت کا یقین دلائیں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے سامنے صرف ایک رخ ہو گا، مضرت یا مشقت سے وہ ناآشنا ہوں گے۔

[۲] کچھ وہ تجربہ کار اور سن رسیدہ لوگ ہوں گے جو کام کی اہمیت، راہ کی دشواری اور آپ کی کم سنی و ناتجربہ کاری دیکھ کر آپ سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھیں گے اور کسی طرح اپنے سر سے آپ کو ٹالنے کی کوشش کریں گے۔

[۳] کچھ وہ ہوں گے جو راہ کی مشکلات اور دشواریاں بتا کر آپ کو اس قدر سراسیمہ کر دیں گے کہ آپ اپنے منصوبہ سے دست بردار ہونے ہی میں ہر طرح کی عافیت محسوس کریں گے۔

[۴] کچھ وہ ہوں گے جو کام کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرنے کے ساتھ راہ کی مشکلات اور ان کا مناسب حل

بھی بتائیں گے۔ یہی حضرات آپ کے لیے کار آمد ہوں گے جو بڑی مشکل سے ملیں گے۔ سب کی باتیں سننے اور نوٹ کرنے کے بعد آپ اپنے حالات اور اپنے امکانات کا بے لاگ جائزہ لیں۔ اگر مشکلات کو سر کرنے کے ساتھ کامیابی کی توقع راجح اور غالب نظر آئے تو اقدام کریں ورنہ وسائل اور امکانات پر قابو پانے تک ملتوی کریں یا کسی دوسرے رخ، دوسری صورت یا دوسرے کام پر غور کریں۔ جسے آسانی یا دشواری کے ساتھ مکمل کر سکیں۔

اس پر یقین رکھیں کہ انسان حرکت و عمل ہی سے بقائے دوام پاتا ہے۔ اس لیے خود کچھ کرنے کی صورتیں سوچیں اور عمل میں لائیں۔ دوسروں کا محاسبہ، ان پر نقد و تبصرہ اور ان کی تنقیص کا کوئی خاص حاصل نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی شخص تھوڑا بھی دینی کام کر رہا ہے تو اس کی قدر کی جائے، صرف اپنے کام کی قدر اور دوسروں کے کام کی تحقیر ایک مذموم رویہ ہے جس سے بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ اس بارے میں حافظ ملت حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث مبارک پوری قدس سرہ بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی ذات مشعل راہ ہے۔ وہ ہر عامی و عالم کی، جو کوئی ادارہ چلا رہا ہو یا کوئی بھی چھوٹی موٹی دینی علمی خدمت انجام دے رہا ہو، حوصلہ افزائی کرتے، کلمات خیر سے یاد کرتے، غائبانہ بھی اس کا اچھا تذکرہ کرتے جس کے باعث وہ اپنی خدمت میں اور مستعد ہو جاتا، اسے اور ترقی دیتا اور ملت کا فائدہ، بہر حال ہوتا۔

❁❁❁❁❁❁
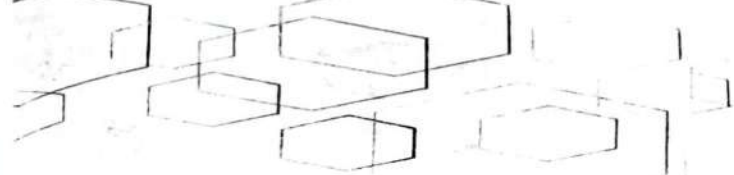
اصلاح معاشرہ کا اسلامی تصور

اصلاح معاشرہ کا اسلامی تصور یہ ہے کہ انسان عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات سب میں راہ راست پر ہو، ہر فرد جب درست ہوگا تو معاشرہ بھی درست ہوگا، اس لیے کہ معاشرہ افراد ہی کی اجتماعی شکل کا نام ہے۔

کون سی خوبیوں سے معاشرہ صالح ہوتا ہے اور کون سے خرابیوں سے معاشرہ فاسد ہوتا ہے؟ ان سب کی کافی تفصیل کتاب وسنت میں موجود ہے، سب کو یک جا کرنا بہت دشوار ہے۔ ایک آیتِ کریمہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارشاد ربانی ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٩٠﴾ [نحل-۹۰]

"بے شک اللہ انصاف اور نیکی اور قرابت دار کو دینے کا حکم فرماتا ہے اور بے حیائی اور بُرائی اور سرکشی سے منع فرماتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت فرماتا ہے تاکہ دھیان دو۔"

مستدرک میں ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "یہ آیت خیر وشر کے بیان میں سب سے زیادہ جامع ہے۔"

اس میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے: (۱) انصاف (۲) نیکی (۳) قرابت دار سے حسن سلوک۔ اور تین باتوں سے روکا گیا ہے: (۱) بے حیائی (۲) بُرائی (۳) سرکشی اور زیادتی۔

(۱) انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر صاحب حق کو اس کا حق دیا جائے۔ ارشاد نبوی ہے: اٰتُوْا كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ. (ہر حق والے کو اس کا حق دو)۔ صحیح بخاری۔

اسلام میں حقوق کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کیوں کہ ان کی ادائگی سے صلاح وفلاح کا وجود ہوتا ہے اور ایک صالح معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے، جب کہ ان کی پامالی سے فساد وبدنظمی اور جنگ وجدال کا ماحول گرم ہوتا ہے اور ایک

کرب ناک منظر سامنے آتا ہے۔

اولاد پر والدین کے حقوق ہیں جن کو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بڑی تاکید سے بیان کیا گیا ہے یہاں تک کہ رب تعالیٰ نے اپنے حق کے بعد والدین کا حق ذکر کیا ہے:

أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ [لقمان - ۱۴]

حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا۔

والدین پر اولاد کے بھی حقوق ہیں، جن کی تفصیل "مشعلة الإرشاد إلى حقوق الأولاد" (از امام احمد رضا قدس سرہ) میں مذکور ہے۔

زوجین، بھائی بہن، پڑوسیوں اور قرابت داروں کے بھی ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ ہر مسلم کا دوسرے مسلم پر حق ہے، ہر شہری کا دوسرے شہری پر حق ہے۔ رعایا اور حکّام کے بھی ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ ان سب حقوق کی جتنی ہی زیادہ رعایت ہوگی اتنی ہی زیادہ خوش گواری پیدا ہوگی اور ان سے جس قدر انحراف ہوگا اسی قدر خرابیاں جنم لیں گی۔

آج نااتفاقی اور باہمی تعلقات کی خرابی کے مناظر جو شب وروز سامنے آتے رہتے ہیں وہ ایک دوسرے کے حقوق کو اچھی طرح نہ سمجھنے اور نہ ادا کرنے ہی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔

باہم عدل وانصاف ہوگا تو حقوق کی ادائگی بھی ہوگی اور انصاف کی پروا، نہ ہو تو حقوق سے بھی بے فکری ہوگی اور دل خراش نتائج بھی سامنے آئیں گے۔

امانتوں کی ادائگی اور لوگوں کے درمیان اقامتِ عدل کا ذکر ایک آیت کریمہ میں یک جا آیا ہے۔ ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ [نساء: ۵۸]

"بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں جن کی ہیں انھیں سپرد کر دو اور یہ کہ جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

عدل کے فقدان سے معاشرہ بھی تہ وبالا ہوتا ہے اور شہری وملکی نظام بھی درہم برہم ہوتا ہے۔

(۲) اب آیئے "احسان" پر نظر کریں۔ احسان کے معنیٰ اچھائی لانا، نیکی کرنا، بھلائی کرنا۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بندے اور رب کے معاملات میں "احسان" یہ ہے کہ بندہ رب کے عائد کردہ فرائض وواجبات کی ادائگی کرے۔ عبادت کرے تو اس طرح کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ تصور حاوی ہو کہ رب مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ صورت صرف نماز ہی نہیں تمام فرائض وواجبات کی ادائگی میں ہو سکتی ہے۔

بندوں کے معاملے میں "احسان" صرف یہ نہیں کہ بھلائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی کی بلکہ پوری نیکی وہ ہے جس کا ذکر اس حدیث پاک میں ہے:

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ، وَ أَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ، وَ أَعْرِضْ عَمَّنْ ظَلَمَكَ. (رواه الإمام أحمد وغيره من عقبة بن عامر رضی الله تعالیٰ عنه)

اور ایک روایت میں ہے:

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ ، وَ أَحْسِنْ إِلیٰ مَنْ أَسَاءَ إِلَيْكَ، وَ قُلِ الْحَقَّ وَ لَوْ عَلیٰ نَفْسِكَ. (جامع صغیر ، امام سیوطی، عن علی کرم الله وجهه)

"اس سے رشتہ جوڑو جو تم سے قطع تعلق کرے، اسے عطا کرو جو تمھیں محروم کرے، اس سے اعراض کرو جو تم پر ظلم کرے، اس کے ساتھ بلائی کرو جو تمھارے ساتھ برائی کرے، اور حق بولو اگرچہ بات اپنے خلاف جائے۔"

اور بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے:

وَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ. (عن أنس رضی الله تعالیٰ عنه مرفوعًا)

اس کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ پورا مومن نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

یہ کمالِ احسان ہے۔ اگر انسان اتنا نہیں کرتا بلکہ عام نیکی ہی کا عادی ہو تو معاشرہ کی درستی یقینی ہے۔ کمزوروں کی دست گیری، ضرورت مندوں کی حاجت روائی، مظلوموں کی فریادرسی، مخفی غربت و مفلسی والوں کی خبرگیری جیسے اوصاف ہی اگر لوگ اپنالیں تو ایک کرب ناک ماحول کی جگہ بڑا فرحت بخش ماحول وجود میں آسکتا ہے۔

(۳) قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک بھی عدل اور نیکی کے ضمن میں شمار کیا جاسکتا ہے مگر اسے خاص طور سے مستقلاً ذکر کیا گیا اس لیے کہ یہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انسان اَجانب اور دور والوں کے ساتھ بد سلوکی کرے تو یہ بھی بُری ہے مگر قرابت دار سے بد سلوکی، بلکہ غفلت اور بے پروائی بھی بڑی اذیت رساں ہے۔

آدمی غیروں سے وہ امید نہیں رکھتا جو اپنوں سے رکھتا ہے۔ اگر اپنے ہی غیر بن جائیں تو انسان کے دل پر کیا گزرے گی؟ اِس کا تصور کیا جاسکتا ہے، لفظوں میں ادا کرنا بہت مشکل ہے۔

منہیات:

اب اُن تین چیزوں کو دیکھیں جن سے روکا گیا ہے۔

(۱) فَحْشَاء - حد سے بڑھی ہوئی برائی جیسے زنا۔

(۲) مُنْکَر - ہر وہ کام جو ناجائز ہے،

جیسے ۱- سرقہ ۲- غصب ۳- شراب نوشی ۴- سود خوری ۵- جھوٹ ۶- چغلی ۷- غیبت ۸- امانت میں خیانت ۹- کسی بھی واجبی ذمہ داری میں خیانت ۱۰- ناپ، تول میں کمی ۱۱- فریب کاری ۱۲- بدعہدی ۱۳- اسراف، فضول خرچی، یعنی ناحق میں صرف کرنا، اگرچہ ایک ہی پیسہ۔ جیسے دیکھا جاتا ہے کہ نام و نمود اور اپنی بڑائی دِکھانے کے لیے شادیوں میں بے دریغ لاکھوں صرف کر دیتے ہیں اور غریبوں، مفلسوں کی حاجت روائی کے لیے ہزار، دو ہزار بلکہ سو، دو سو دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے ناروا کاموں میں دولت لٹاکر فخر کرتے ہیں اور مصارف خیر میں دینے سے بھاگتے ہیں، اگر کسی نے تقاضا کیا تو بڑی ترش روئی، غیظ و غضب اور بد خلقی سے پیش آتے ہیں۔

۱۴- بیٹوں کا باپ کی پوری میراث پر قبضہ کر لینا اور بیٹیوں کو یکسر محروم کر دینا۔ یہ بلا عام ہوتی جا رہی ہے۔ اِرث جبری ہے، اختیاری نہیں کہ جو چاہے لے، جو چاہے چھوڑ دے۔ مورث کے مرتے ہی میراث میں ورثہ کا حق لازم ہو جاتا ہے۔ ہاں میراث تقسیم ہونے اور ہر وارث کا حصہ متعین ہو جانے کے بعد وارث کو اختیار ہے کہ خود لے یا کسی دوسرے کو دے دے۔ مگر تقسیم و تعیین سے پہلے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

۱۵- کسی کا مال یا جائیداد ناحق لینا ۱۶- ناجائز قبضہ کے لیے حکام کو رشوت دینا، جھوٹے گواہ تیار کرنا، جھوٹی دستاویز بنانا، ناجائز مقدمہ بازی میں اپنا اور اپنے فریق کا مال برباد کرنا، کرانا۔

۱۷- فرائض و واجبات ترک کرنا ۱۸- اپنے اوپر دوسروں کے جو حقوق لازم ہیں انھیں ادا نہ کرنا۔

یہ اور اس طرح کی ساری برائیاں "مُنْکَر" کے تحت آتی ہیں جن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی طرح باطنی برائیاں ۱- رِیا ۲- عُجب ۳- حسد ۴- کینہ ۵- تکبر ۶- حرص ۷- بخل ۸- حُبِ دنیا ۹- حُبِ مدح وغیرہا سب "مُنْکَر" کے تحت داخل ہیں۔

(۳) بَغْی - سرکشی، ظلم و زیادتی۔ یہ بھی منکر کے تحت داخل ہے مگر اسے خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔ اس لیے

کہ اس کے نتائج بڑے خطرناک ہیں۔

ظلم اگر گھر تک ہو تو گھر برباد ہوتا ہے، محلّہ اور شہر میں ہو تو محلّہ اور شہر ویران ہوتے ہیں، ملک بھر میں ہو تو پورا ملک شعلوں کی زد پر ہوتا ہے۔

اصلاح معاشرہ کا اسلامی تصور اُسی وقت مکمل ہوگا جب اُن سارے امور کی بجاآوری ہو جن کا حکم دیا گیا ہے اور ان سارے امور سے پرہیز ہو جن سے روکا گیا ہے۔

ربّ قدیر وکریم خیر کو عمل میں لانے اور شر سے دور رہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

باب سوم

سوانحی مضامین

صاحبِ ہدایہ[1]

فقہ حنفی کی مشہور و معروف کتاب ہدایہ سے کون واقف نہیں؟ صدیوں سے علمی دنیا میں اس کی جلالت شان کا ڈنکا بج رہا ہے۔ فقہ کی کسی دوسری کتاب کے ساتھ آج تک اتنا اعتنا نہیں کیا گیا ہوگا جتنا کہ علمانے ہدایہ کے ساتھ کیا۔ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو کر مفید عام ہو چکے ہیں۔ ۱۷۹۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اس مختصر مقالے میں اُسی جلیل الشان کتاب کے عظیم مصنف سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

نام و نسب: اس کے مصنف شیخ الاسلام برہان الدین علی مرغینانی ہیں۔ یہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل سے ہیں۔ مختصر نسب نامہ یہ ہے: شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابو بکر بن عبد الجلیل بن خلیل بن ابو بکر۔

ولادت، تعلیم:

۸/رجب ۵۱۱ھ دوشنبہ کے دن نماز عصر کے بعد بزم گیتی کو رونق بخشی۔ اپنے والد شیخ ابو بکر بن عبد الجلیل اور اس زمانے کے اکابر علما و مشائخ سے استفادہ کیا جن میں سے چند اہم شخصیتوں کے اسمائے گرامی یہاں لکھے جاتے ہیں۔

(۱) مفتی ثقلین شیخ نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد نسفی۔ (۴۶۱ھ - ۵۳۷ھ) صاحب ہدایہ نے اپنے مشائخ کے تذکرے میں ان کو سر فہرست ذکر کیا ہے۔

(۲) شیخ نجم الدین ابو حفص کے صاحب زادے ابو اللیث احمد بن عمر نسفی (م ۵۵۲ھ)

(۳) صدر شہید حسام الدین عمر بن عبد العزیز بن عمر بن مازہ (۴۸۳ھ - ۵۳۶ھ)

(۴) صدر سعید تاج الدین احمد بن عبد العزیز۔

(۵) شیخ ابو عمرو عثمان بن علی بیکندی۔ شاگرد شمس الائمہ سَرَخسی (۴۶۵ھ - ۵۵۲ھ)

(۶) قوام الدین احمد بن عبد الرشید بخاری، والد صاحب خلاصۃ الفتاوی۔

(۷) امام بہاء الدین علی بن محمد بن اسمٰعیل اسبیجابی۔ (۴۵۴ھ - ۵۳۵ھ)

حج و زیارت، وفات:

شیخ الاسلام ۵۴۴ھ میں حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ انور سے سرفراز ہوئے، ۱۴/ذی الحجہ ۵۹۳ھ منگل کی

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، شمارہ مئی ۱۹۷۸ء

رات میں اس دار فانی سے دار بقا کو رحلت فرمائی، اور سمر قند میں مدفون ہوئے، سمر قند میں "تربة المحمديين" نامی ایک قبرستان ہے جس میں تقریباً چار سو ایسے افراد مدفون ہیں جن کا نام "محمد" ہے اور ہر ایک صاحب تصنیف و افتا اور اپنے زمانے کی ایک عظیم جماعت کا استاذ و شیخ ہے، صاحب ہدایہ کا انتقال ہوا تو لوگوں نے انھیں اس میں دفن کرنے سے روکا، غالبًا اس لیے کہ وہ قبرستان "محمد" نام والوں کے لیے مخصوص تھا اور ان کا اسم گرامی "علی" تھا، پھر اسی کے قریب دوسری جگہ آسودۂ خاک ہوئے۔

جلالت علم:

شیخ الاسلام کی منقبت میں محمود بن سلیمان کفوی (متوفی ۹۹۰ھ) کتائب اعلام الاخیار معروف بطبقات کفوی میں رقم طراز ہیں:

كان اماماً فقيهاً حافظاً محدثاً مفسراً جامعا للعلوم، ضابطاً للفنون، متقنا، محققا نظارا مدققا زاهداً ورعاً فاضلا ماهرا اصوليا اديبا شاعرا، لم تر العيون مثله فى العلم والأدب، وله اليد الباسطة فى الخلاف والباع الممتد فى المذهب.

وہ امام، فقیہ، حافظ، محدث، مفسر، علوم و فنون کے جامع و ضابط، حفظ و علم کے پختہ، بحر تحقیق کے شناور، فکر و نظر کے بہت تیز، میدان تدقیق کے شہ سوار، زہد و ورع کے حامل، مرتبۂ کمال پر فائز، فاضل ماہر، فن اصول کے نکتہ داں، ادیب، شاعر سب تھے، علم و ادب میں نگاہوں نے ان کا مثل نہ دیکھا، انھیں خلافیات میں ید طولیٰ اور مذہب میں پوری دسترس حاصل تھی۔

تلامذہ:

بڑے بڑے علما اور جلیل القدر شیوخ کو صاحب ہدایہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ چند حضرات کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں:

(۱) شیخ جلال الدین محمد بن صاحب ہدایہ۔
(۲) شیخ نظام الدین عمر بن صاحب ہدایہ۔
(۳) شیخ امام الدین بن صاحب ہدایہ۔
(۴) شمس الائمہ محمد بن عبد الستار کردری، م ۶۴۲ھ۔
(۵) جلال الدین محمود بن حسین استروشنی۔

تصنیفات:

"ہدایہ" کے علاوہ شیخ الاسلام کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں جو آپ کی جلالت علم اور کمال شان کا بے مثال مظہر ہیں، کتاب المنتهى، نشر المذاهب، التجنيس والمزيد، مناسك الحج، مختارات النوازل اور فرائض میں ایک کتاب، ان سب کا ذکر طبقات کفوی میں موجود ہے، علاوہ ازیں ہدایہ کے ساتھ اور دو کتابیں ایسی ہیں جو رہتی دنیا تک یاد کی جائیں گی، بدایۃ المبتدی اور کفایۃ المنتہی۔

بدایۃ المبتدی:

برہان الملۃ والدین نے اس میں مختصر قدوری اور جامع صغیر کے مسائل یکجا کر دیے ہیں اور اس کی ترتیب تبرکاً وہی رکھی ہے جو امام محمد بن الحسن شیبانی شاگرد امام اعظم (۱۳۲ھ - ۱۸۹ھ) نے اپنی کتاب جامع صغیر میں رکھی ہے، طبقات کفوی میں ہے:

قال فى أول البداية قال ابو الحسن على بن ابى بكر بن عبدالجليل كان يخطر ببالى عند ابتداء حالى أن يكون كتاب فى الفقه فيه من كل نوع، صغير الحجم كبير الرسم، وحيث وقع الاتفاق بتطواف الطرق، وجدت المختصر المنسوب إلى القدورى أجمل كتاب فى حسن إيجاز وإعجاب ورأيت كبراء الدهر يرغبون الصغير والكبير فى حفظ جامع الصغير فهممت ان اجمع بينهما ولا أتجاوز فيه عنهما إلا مادعت الضرورة إليه، وسميته بداية المبتدى ولو وفقت لشرحه سميته بكفاية المنتهى.

برہان الدین ہدایہ کے شروع میں رقم طراز ہیں: ابو الحسن علی بن ابو بکر بن عبد الجلیل کہتا ہے، ابتداءً میرے دل میں یہ خیال ہوتا تھا کہ فقہ میں ایک ایسی کتاب ہونی چاہیے جس میں ہر نوع کے مسائل ہوں، ضخامت میں چھوٹی اور فوائد و مضمون کے لحاظ سے بڑی ہو اور جب بہت ساری راہ پیمائیوں کا اتفاق ہوا تو یہی دیکھا کہ (ابو الحسین احمد بن محمد بغدادی، قدوری (۳۶۲ھ - ۴۲۸ھ) کی مختصر قدوری ایجاز و اختصار اور پسندیدگی کے اعتبار سے نفیس ترین کتاب ہے اور یہ بھی دیکھا کہ اکابر زمانہ، چھوٹے بڑے ہر شخص کو امام محمد کی جامع صغیر حفظ کرنے کی ترغیب کیا کرتے ہیں، تو میں نے چاہا کہ دونوں کے مسائل یک جا کر دوں اور کسی خاص ضرورت کے بغیر ان دو کتابوں سے تجاوز نہ کروں۔ ان مسائل کو یکجا کر کے میں نے مجموعہ کا نام "بدایۃ المبتدی" رکھا اور اس کی شرح کی توفیق ارزانی ہوئی تو اس کا نام "کفایۃ المنتہی" رکھوں گا۔

کفایۃ المنتہی:

اس ارادے کے مطابق توفیق ربانی نے مصنف کی یاوری کی اور انھوں نے "بدایۃ المنتہی" کی "کفایۃ المنتہی" نامی شرح تصنیف فرمائی جو اسّی جلدوں پر مشتمل تھی، ملا احمد آفندی بن مصطفیٰ معروف "بطاش کبری زادہ" (م ۹۶۲ھ) مفتاح السعادہ میں لکھتے ہیں: یہ کتاب نادر الوجود ہے، دوسرے حضرات نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ کتاب اس وقت مفقود ہے، کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا، لیکن ہدایہ دیکھنے والے یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کتاب کتنی مبسوط اور کتنے مباحث، دلائل اور مسائل کی جامع ہوگی۔

ہدایہ:

شیخ الاسلام نے کفایۃ المنتہی نامی شرح کے بعد "ہدایہ" لکھنے کی ضرورت محسوس کی اور چہار شنبہ کے دن ظہر کے وقت ذی قعدہ ۵۷۳ھ میں اس کی تصنیف شروع کی، ہدایہ کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

وقد جرىٰ على الوعد فى مبدا بداية المبتدى أن أشرحها بتوفيق الله شرحا أرسمه بكفاية المنتهى فشرعت فيه والوعد يسوغ بعض المساغ، وحين أكاد أتكأعنه اتكاء الفراغ تبينت فيه نبذا من الإطناب، وخشيت أن يهجر لأجله الكتاب فصرفت عنان العناية الى شرح أخر موسوم بالهداية أجمع فيه بتوفيق الله تعالى بين عيون الرواية و متون الدراية، تاركاً للزوائد فى كل باب، معرضاعن هذا النوع من الاسهاب، مع أنه يشتمل على أصول ينسحب عليها فصول.

"بدایۃ المبتدی" کے شروع میں قلم سے یہ وعدہ سرزد ہو گیا تھا کہ بتوفیق الٰہی اس کی ایک شرح لکھوں گا جو "کفایۃ المنتہی" سے موسوم ہوگی میں نے یہ شرح شروع کردی، اور ایفاے وعدہ کی ذمہ داری ایسے اہم کام میں ہاتھ لگانے کا ذرا جواز پیدا کر دیتی ہے اب اس شرح سے آرام فراغ حاصل کرنے والا ہی تھا کہ میں نے اس میں کچھ طول واطناب عیاں دیکھا، اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اس کی وجہ سے کتاب کہیں متروک نہ ہو جائے اور کوئی اس کے مطالعہ کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ تو میں نے زمام توجہ ایک اور شرح کی طرف پھیری جو ہدایہ سے موسوم ہو۔ میں بتوفیق الٰہی ہر باب میں زوائد کو ترک اور اس نوع اسہاب و تطویل سے اعراض کرتے ہوئے بہترین دلائل نقلیہ اور قوی دلائل عقلیہ دونوں ہی یکجا کروں گا۔ اس کے باوجود کتاب ایسے اصول پر مشتمل ہوگی جن سے بہت سی فروع برآمد ہو سکیں گی۔"

چنانچہ شیخ الاسلام نے اسی شان سے ہدایہ تصنیف کی اور جب یہ تصنیف ہو کر منظر عام پر آئی تو ساری دنیا

اس کی طرف جھک پڑی۔ بے شمار شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔ مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ علماے فقہ و فتوی نے اپنا مرجع و معتمد بنایا۔ اور اُسے وہ قبول تام حاصل ہوا جو فقہ کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہ ہو سکا۔

ہدایہ کی خصوصیت:

دیباچہ ہدایہ کی سطور بالا سے معلوم ہوا کہ ہدایہ میں صرف بیان مسائل پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر مسئلہ کی دلیل بھی مذکور ہے۔ اگر صرف دلیل نقلی یا عقلی کا موقع ہے تو وہی۔ ورنہ عموماً نقلی و عقلی دونوں طرح کی دلیلیں یکجا ہیں۔ مثلاً (۱) وضو میں پہلے گٹوں تک دونوں ہاتھ دھونے کے مسنون ہونے پر دلیل نقلی پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: لقوله عليه السلام إذا استيقظ أحدكم من منامه فلا يغمسن يده فى الإناء حتى يغسلها ثلاثا فإنه لا يدرى أين باتت يده.

"اس لیے کہ ارشاد رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے کہ جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو ہرگز اپنا ہاتھ برتن میں نہ ڈالے، جب تک اسے تین بار دھو نہ لے، اسے کیا پتہ رات کو اُس کا ہاتھ کہاں رہا۔"

(یہ حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے۔ تخریج زیلعی ۱۲ حاشیہ ہدایہ)

اس کے بعد عقلی دلیل پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ولأن اليد آلة التطهير فتسن البداية بتنظيفها وهذا الغسل إلى الرسغ لوقوع الكفاية به فى التنظيف. "اور اس لیے کہ ہاتھ دوسرے اعضا کو پاک کرنے کا ذریعہ ہے تو پہلے خود اُسے صاف کر لینا مسنون ہوگا۔ اور یہ دھونا بس گٹے تک ہے کیونکہ کار تنظیف کے لیے اتنا حصہ کافی ہے۔

(۲) دو آدمیوں نے ایک مقرر دام پر کوئی چیز آپس میں بیچی خریدی۔ اب کوئی اس بیع پر پچھتا رہا ہے اور ختم کرنا چاہتا ہے تو دونوں کا جو دام طے تھا وہی لے دے کر بیع فسخ کر سکتے ہیں۔ الإ قالة جائزة فى البيع بمثل الثمن الأول کے تحت صاحب ہدایہ نے اس مسئلہ کی دلیل نقلی میں یہ حدیث پیش کی۔ جسے ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: لقوله عليه السلام من أقال نادماًبيعته اقال الله عثراته يوم القيمة.

"اس لیے کہ ارشادِ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہے کہ جس نے کسی شرمندہ اور پچھتانے والے شخص کی بیع ختم کردی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی لغزشیں ختم کر دے گا۔"

پھر دلیل عقلی پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولأن العقد حقهما، فيملكان رفعه، دفعالحا جتهما. (ہدایہ، ص:۵۲، ج:۳)

"اور اس لیے کہ عقد دونوں کا آپسی حق ہے۔ تو اپنی ضرورت کے پیش نظر دونوں مل کر اُسے ختم کر لینے کے مالک و مختار ہوں گے۔"

اسی پر بس نہیں، انھوں نے مسائل میں ائمہ کے اختلافات، ان کی عقلی و نقلی دلیلیں، جوابات، ترجیح و تصحیح سب ذکر کی ہے اگر سب کے نظائر پیش کروں تو مضمون طویل اور بہت سے قارئین کے لیے اکتاہٹ کا باعث ہوگا۔ ہدایہ کا مطالعہ کرنے والے اس کی ان سب خصوصیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے باعث ہدایہ صدیوں سے داخل نصاب ہے۔ اور صحت، جامعیت، اختصار، بیان مذاہب، ذکر دلائل وغیرہ میں اب تک کوئی کتاب اُس کے مثل نہ پیش کی جا سکی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی (۱۲۷۶ھ۔۱۳۴۰ھ) تحریر فرماتے ہیں: من المتون مع أنها شرح بالصورة (فتاویٰ رضویہ اول حاشیہ، ص:۸۱۰)

باوجودے کہ ہدایہ شرح کی شکل میں ہے مگر اس کا شمار متون میں ہے۔

شیخ الاسلام کے فرزند شیخ عماد الدین ہدایہ کی منقبت میں فرماتے ہیں:

کتاب الهداية يهدى الهدىٰ
الى حافظيه ويجلو العمىٰ
فلازمه واحفظه ذا الحجىٰ
فمن ناله نال أقصى المنىٰ

"ہدایہ اپنے حفظ کرنے والوں کو ہدایت کا ہدیہ پیش کرتی ہے اور بے بصیرتی و نابینائی دور کرتی ہے۔ تو اے صاحب ہوش و خرد! اسے پابندی سے اختیار کر اور حفظ کر لے کہ جس نے اُسے پا لیا اپنی آخری اور انتہائی امید و آرزو کے حصول سے شاد کام ہوا۔"

قبول ہدایہ کا سبب:

جس طرح صحیح بخاری شریف کے قبول عام اور صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کے افاضۂ تمام کا خاص سبب یہ ہے کہ اُسے امام محمد بن اسمٰعیل بخاری (۱۹۴ھ - ۲۵۶ھ) نے سولہ برس کی مدت میں چھ لاکھ صحیح احادیث سے منتخب کر کے جمع فرمایا ہے اور ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کر کے دو رکعت نفل نماز پڑھی ہے اور پھر اس کے تراجم (ابواب کے عنوانات) نبی کریم ﷺ کی قبر انور اور منبر اطہر کے درمیان اس طرح تحریر کیے ہیں کہ ہر ترجمہ لکھنے

سے پہلے دو رکعت نماز نفل پڑھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خیرات و حسنات کا التزام کیا جس کے باعث اس کے برکات و اثرات بھی زیادہ ہیں۔

اسی طرح ہدایہ کی مقبولیت کے کچھ روحانی اسباب بھی ہیں۔ شیخ الاسلام علیہ الرحمہ نے اس کتاب کی تصنیف میں تیرہ برس صرف کیے ہیں۔ اس طویل مدت میں لازماً ہر دن روزہ رکھا۔ سوائے ایام ممنوعہ کے کبھی بھی دن میں کچھ نہ کھایا پیا۔ اس پر بھی ان کی پوری کوشش یہ ہوتی کہ ان کے روزے سے کوئی باخبر نہ ہو۔ خادم دن کا کھانا لے کر حاضر ہوتا تو اس سے فرماتے "خلّه ورُح" کھانا رکھ کر تم چلے جاؤ۔ خادم چلا جاتا تو کسی طالب علم یا حاضرین میں سے دوسرے کسی آدمی کو کھلا دیتے، دوبارہ اُن کا خادم حاضر ہوتا تو برتن خالی دیکھ کر سمجھتا حضرت نے کھانا تناول فرما لیا۔ اور برتن لے کر چلا جاتا۔

یقیناً مصنفین عظام کی یہ روحانی مشقیں اور ان کا اخلاص بکھر اس رنگ لایا۔ قرنہا قرن گزر گئے، صدیاں بیت گئیں۔ کتنے باجبروت سلاطین کی بساطیں اُلٹ گئیں۔ مگر ان علمائے قدس کے نقوش تحریر کی جہانگیر حکومتیں اُسی طرح رخشندہ و تابندہ ہیں جیسے اُن کے عُصور حیات میں تھیں۔ یا اُس سے بھی زیادہ۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء.

احادیث ہدایہ:

ہدایہ میں صرف احادیث پیش کی گئی ہیں۔ ان کی سند یا حوالہ درج نہیں۔ کیونکہ اختصار مقصود تھا۔ اس سے بعض حضراتِ شافعیہ کو موقع ملا اور انھوں نے یہ جرح کر دی کہ صاحب ہدایہ نے ضعیف اور غیر معتبر حدیثیں ذکر کر دی ہیں۔ مگر یہ الزام مصنف کی جلالتِ شان اور علم حدیث میں ان کی رتبۂ بلند سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ اسی جرح و طعن کے پیش نظر بعض گرامی قدر علما نے ہدایہ میں ذکر کردہ احادیث کریمہ کی اسنادی حالت واضح کرنے کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اور ہر حدیث کے حسن، صحیح، ضعیف یا قوی ہونے کی صراحت کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ فلاں حدیث فلاں کتاب میں مروی ہے۔ شیخ محی الدین عبد القادر بن محمد قریشی مصری (۶۷۶ھ یا ۶۹۶ھ - ۷۷۵ھ) نے اس مقصد کے تحت "العناية بمعرفة أحاديث الهداية" لکھی۔ شیخ علاء الدین نے "الكفاية فى معرفة أحاديث الهداية" اور شیخ جمال الدین عبد اللہ بن یوسف زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) نے "نصب الراية لأحاديث الهداية" تصنیف کی جس کی تلخیص امام الحفاظ احمد بن علی معروف بابن حجر عسقلانی شافعی (۷۷۳ھ-۸۵۲ھ) نے کر کے اس کا نام "الدراية فى منتخب أحاديث الهداية" رکھا۔ یہ کتاب موجودہ مطبوعاتِ ہدایہ کے حاشیہ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک حدیثی بحث اور خاتمہ:

صاحب ہدایہ نے اپنے شیخ، صاحب خلاصہ کے والد شیخ احمد بن عبد الرشید علیہ الرحمہ کی سند سے ایک حدیث روایت کی ہے۔ برہان الاسلام زرنوجی شاگرد صاحب ہدایہ اپنی کتاب "تعلیم المتعلم" کی "فصل" بدایۃ السبق میں لکھتے ہیں ہمارے استاذ شیخ الاسلام برہان الدین سبق شروع کرانے کو بدھ پر موقوف رکھتے اور اس بارے میں یہ حدیث روایت کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

ما من شیئ بدئ یوم الأربعاء إلا تم "بدھ کے دن جس کام کا آغاز ہو وہ ضرور انجام کو پہنچے۔"
اور اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ بھی کیا کرتے۔

بعض محدثین نے اس حدیث کی صحت میں کلام کیا ہے۔ شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی شافعی (ربیع الاول ۸۲۱-شعبان ۹۰۲ھ) "المقاصد الحسنة فی الأحادیث المشتهرة علی الألسنة" میں فرماتے ہیں:

لم أقف له علی أصل و یعارضه حدیث جابر مرفوعا یوم الأربعاء یوم نحس مستمر رواه الطبرانی فی الأوسط وهو ضعیف.

"میں اس کی کسی اصل پر مطلع نہ ہوا۔ اور اس کے معارض حضرت جابر کی مرفوع حدیث ہے کہ چہار شنبہ دائمی نحوست کا دن ہے۔ اسے طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور یہ ضعیف ہے۔"

لیکن ظاہر ہے کہ جب صاحب ہدایہ نے یہ حدیث اپنی معتبر سند کے ساتھ روایت کی ہے تو اگر امام سخاوی جن کی ولادت وفاتِ شیخ الاسلام کے ۲۲۷ سال ۳ ماہ بعد ہے۔ کسی دوسری جگہ اُس کی اصل نہیں پاتے تو صاحب ہدایہ کی روایت کردہ حدیث پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ رہا ان کا یہ فرمانا کہ اس کے معارض اوسطِ طبرانی (ابو القاسم سلیمان بن احمد ۲۶۰ھ-۳۶۰ھ) کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے تو اس کے ظاہر معنی مراد لینے کے باعث خود علامہ سخاوی پر تنقید کی گئی ہے۔ مجدد اسلام ملا علی قاری بن سلطان محمد ہروی (متوفی ۱۰۱۴ھ) اپنے رسالہ "المصنوع فی معرفة الموضوع" میں رقم طراز ہیں: إن معناه کان یوما نحسا مستمرا علی الکفار فمفهومه أنه سعد مستقر علی الأبرار.

"اس کے معنی یہ ہیں کہ چہار شنبہ کفار پر دائمی نحوست کا دن ہے۔ جس کا مفہوم یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ سعد کا دن ہے۔"

مزید فرماتے ہیں، امام حافظِ حدیث ابن حجر عسقلانی شافعی (۷۷۳ھ - ۸۵۲ھ) کا بیان ہے کہ بعض صالحین سے جن کی ملاقات کا ہمیں شرف حاصل ہے۔ مجھے خبر پہنچی ہے کہ چہار شنبہ نے بارگاہ خداوندی میں شکایت کی کہ لوگ

مجھے منحوس جانتے ہیں تو خدائے تعالیٰ نے اسے یہ شرف عطا فرمایا کہ اس میں جس چیز کی ابتدا ہو، ضرور پوری ہو۔

صرف یہی دو حضرات نہیں ایک جماعت محدثین نے طبرانی کی حدیث مذکور کے یہی معنی لیے ہیں۔ جن میں شیخ حلیمی بھی ہیں، وہ اپنی کتاب شعب الایمان میں یہی حدیث ذکر کر کے فرماتے ہیں:

أی علی المفسدین لا علی المصلحین کالأیام النحسات کانت نحسات علی الکفار من قوم عاد لا علی نبیهم ومن أمن به منهم.

"یعنی چہار شنبہ مفسدین کے لیے نحس ہے مصلحین کے لیے نہیں جیسے قرآن میں مذکور "ایام نحسات" قوم عاد کے کفار کے لیے تو نحس تھے، مگر اس قوم کے نبی اور مومنین کے لیے نحس نہ تھے۔

اس تاویل کی تائید اور روز چہار شنبہ کی فضیلت میں ایک حدیث ہے، جس سے صاحب ہدایہ کی روایت کردہ حدیث کی اصلیت ثابت ہوتی ہے۔

امام بخاری نے الادب المفرد، امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ - ۲۴۱ھ) اور ابو بکر احمد بزار (متوفی ۲۹۲ھ) نے اپنی اپنی سند سے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے:

دعا رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فی هذا المسجد مسجد الفتح یوم الإثنین و یوم الثلاثاء و یوم الأربعاء، فاستجیب له بین الصلوتین. أی الظهر والعصر من یوم الأربعاء قال جابر ولم ینزل بی أمر مهمّ الا توخیت تلك الساعة فدعوت الله فیه بین الصلاتین یوم الأربعاء فی تلك الساعة إلا عرفت الإجابة.

"رسول اللہ ﷺ نے اس مسجد، مسجد فتح میں دوشنبہ، سہ شنبہ چہار شنبہ کو دعا کی۔ تو چہار شنبہ کے دن ظہر وعصر کے درمیان دعا مقبول ہوئی۔ حضرت جابر فرماتے ہیں مجھے جب بھی کوئی اہم امر درپیش ہوا، میں اسی ساعت کی جستجو میں رہا۔ اور روز چہار شنبہ ظہر وعصر کے درمیان دعا کی تو نشان قبول ضرور دیکھ لیا۔"

نویں صدی کے مجدد، خاتم الحفاظ علامہ جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابو بکر سیوطی شافعی (متوفی ۹۱۱ھ) اپنے رسالہ "سهام الإصابة فی الدعوات المستجابة" میں فرماتے ہیں اسناده جید۔ اس کی سند عمدہ ہے۔ نور الدین علی بن احمد سمہودی (م ۹۱۱ھ) "وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ" میں فرماتے ہیں: رجاله ثقات اس کے رجال ثقہ ہیں۔

اس حدیث سے مستفاد ہوا کہ چہار شنبہ کے دن اجابتِ دعا کا ایک وقت ہے اس لیے علما نے بہتر سمجھا کہ سبق کی ابتدا اسی دن ہو۔ کیونکہ جب بھی کوئی شخص اہم کام شروع کرتا ہے تو عموماً ختم کی توفیق اور اتمام کی تعجیل کے لیے دعا

کرتا ہے اور اُس روز و وقت میں دعا شرف قبول سے سرفراز ہوتی، اور کام مکمل ہوتا ہے۔

اور چہار شنبہ کے اہل اسلام کے لیے سعد ہونے کی اہم دلیل تو یہی ہے کہ گزشتہ اقوام کفار کے لیے جب یہ نحس اور نزول عذاب کا دن تھا، تو ظاہر ہے کہ مومنین کے لیے انعام و نجات کا دن ہوا۔ اور اس امت کریمہ کے لیے خاص کر سعد ثابت ہوا کیونکہ اسی دن رحمت عالم ﷺ کی مبارک دعا قبولیت سے سرفراز ہوئی۔

بہرِ حال یہ تھی ایک ذیلی تفصیل جو صاحب ہدایہ کی روایت کردہ حدیث پر جرح کی وجہ سے پیش کی گئی۔ اس باب میں مزید تفصیلات و افادات امام احمد رضا قادری بریلوی رضی المولیٰ تعالیٰ عنہ کے رسالہ "منیر العین فی تقبیل الإبهامین" اور اسی میں مندرج رسال "الهاد الكاف لأحاديث الضعاف" اور بعض دیگر رسائل کے جستہ جستہ مقامات سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

مضمون کے مآخذ:

مقدمۂ هدایه، الفوائد البهية فی تراجم الحنفية، التعليقات السنية على الفوائد البهية مولانا عبدالحی فرنگی محلی (۱۲۶۴ھ - ۱۳۰۴ھ) العطايا النبوية فی الفتاوى الرضوية، امام احمد رضا قادری بریلوی (۱۲۷۲ھ - ۱۳۴۰ھ) طبقات کفوی تلخیص شدہ در فوائد بہیہ، ہدایہ، حاشیہ ہدایہ مولانا فرنگی محلی۔

❁❁❁❁❁❁

شیخ الاسلام عزّ الدین بن عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ [1]

تاریخ اسلام کی اُن مقتدر ہستیوں میں آپ کا نام گرامی ہے جن کے دم سے عظمت دین اور سطوت علم قائم رہی۔ جن کے سامنے تبلیغ اسلام اور اصلاح زمانہ کی راہ میں عظیم الشوکت فرماں رواؤں کا اقتدار ہیچ تھا۔ جنھوں نے ایک عالم کو ایمان و یقین کی روشنی بخشی اور ایک جہان اُن کے وجود کی برکتوں سے مالامال ہوا۔

ولادت، تعلیم اور علمی جلالت:

شیخ عز الدین عبد العزیز بن عبد السلام، غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے سترہ برس بعد ۵۷۸ھ میں سرزمین دمشق میں پیدا ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق آپ نے عہد شباب میں تحصیل علم کا آغاز کیا مگر اپنے وفور شوق اور غیر معمولی جد و جہد کے نتیجے میں بہت جلد تکمیل کر کے معاصر علما پر سبقت لے گئے اور سب نے آپ کی جلالت شان کا اعتراف کیا۔ ۶۳۹ھ میں مصر پہنچے تو بلند پایہ محدث علامہ عبد العظیم منذری (م ۶۵۶ھ) صاحب کتاب "الترغیب والترھیب" نے افتا سے دستبرداری ظاہر کر دی اور فرمایا "جس شہر میں شیخ عز الدین جیسا جلیل القدر فقیہ موجود ہو، وہاں دوسرے کے لیے کار افتا درست نہیں۔"

قاضی مجیر الدین علیمی اپنی کتاب "تاریخ المعتبر فی أبناء من عبر" میں شیخ کی عظمت شان کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: إن سيدنا الشيخ عز الدين بلغ رتبة الإجتهاد مع الزهد حتیٰ ظهر حاله فی المكاشفات، وانه لقب بسلطان العلماء، وكان حسن المحاضرة بالنوادر والأشعار۔ [2]

"سیدنا شیخ عز الدین درجۂ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے، اسی کے ساتھ پیکر زہد ورع بھی تھے یہاں تک کہ مکاشفات میں ان کا حال و مقام ظاہر ہو گیا، انھیں "سلطان العلما" کا لقب ملا، نادر باتیں اور اشعار پیش کرنے میں بڑے حاضر جواب تھے۔"

---

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، فروری ۱۹۷۶ء

(۲) قلائد الجواہر، الشیخ محمد بن یحییٰ الحنبلی، ص: ۱۶۷

علمی وقار اور عالمانہ اوصاف:

شیخ بڑی پر جلال اور باوقار شخصیت کے مالک تھے، بادشاہوں کی دربار حضوری قطعاً پسند نہ تھی، خود ان کے بلانے پر اگر کبھی گئے تو "جی حضوری" یا خاموشی نہیں اختیار کی بلکہ ان کی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں پر بروقت تنقید و تنبیہ کی اور اپنے خلوص قلب اور عالمانہ رعب و جلال کی وجہ سے اثر انداز بھی ہوئے۔

مجاہدانہ کردار:

اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ، "فتنۂ تاتار" ہے۔ جس کے متواتر حملوں نے ممالک اسلامیہ کی بنیادیں ہلادیں، مسلمانوں کے دلوں میں خوف و ہراس گھر کر گیا، یہاں تک کہ تاتاریوں کی شکست ناممکن خیال کی جانے لگی، اور یہ فقرہ لوگوں کے زبان زد ہو گیا۔ إذا قيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق اگر کوئی تمھیں تاتاریوں کی شکست خوردگی کی خبر دے تو سچ نہ مانو۔

اس دور میں سب سے پہلے سرفروش حضرت شیخ عزالدین ہیں جنھوں نے تاتاریوں کے مصر کی طرف رخ کرنے کی خبر سنتے ہی لوگوں میں ولولۂ جہاد اور جذبۂ استقامت پیدا کیا، اور سلطانِ مصر سے فرمایا تم جہاد کے لیے صف آرا ہو جاؤ، فتح کی ضمانت میں لیتا ہوں۔ مالیاتی قلت کی وجہ سے مصارف جہاد کے انتظام کے لیے سلطان نے تاجروں سے قرض لیے جانے کی تجویز پیش کی، تو شیخ نے فرمایا "پہلے شاہی محل کے جواہرات، بیگمات کے زیورات اور ارکان سلطنت کے وہ زیورات نکالے جائیں جو شرعاً حرام ہیں پھر اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جائے۔"

زر پرست اذہان کے لیے یہ تجویز بہت گراں بار تھی مگر شیخ کی شخصیت کا اثر اتنا تھا کہ تمام زیورات و جواہرات حاضر کر دیے گئے، جو مصارف جہاد میں لگائے گئے اور دوسری سلطنتوں کے برخلاف مسلمانوں کو پہلی بار تاتاریوں کے مقابلے میں فتح حاصل ہوئی جس کے بعد تاتاری پسپا ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی شوکت و سطوت کا خاتمہ ہو گیا۔

جرأت بے باک:

حکم شرعی کے نفاذ میں شیخ کسی کے منصب و اقتدار سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوتے اور جو بات حق ہوتی اُسے نہ صرف کہہ کے سنا دیتے بلکہ کر کے دکھا دیتے۔

الملک الصالح نجم الدین ایوب (م ۶۴۷ء) کے زمانے میں آپ قاضی اور مساجد کے مہتمم تھے۔ اس وقت فخر الدین عثمان نامی ایک شخص قصر شاہی کا مہتمم تھا مگر عملاً نائب السلطنت اور حکومت کے سارے کاموں میں دخیل تھا۔ اس نے ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ بنوا دیا۔ شیخ نے مطلع ہونے کے بعد فوراً حکم صادر کر دیا کہ شرعاً یہ تعمیر جائز نہیں لہٰذا وہ عمارت منہدم کر دی جائے، اور اس جرم میں فخر الدین عثمان کو ساقط الشہادۃ قرار دیا پھر عہدۂ قضا سے مستعفی بھی ہو گئے۔ سلطان نے اگرچہ آپ کو دوبارہ عہدۂ قضا پر مامور نہیں کیا مگر اس کی نگاہ میں اس واقعہ سے شیخ کی عظمت کچھ کم نہیں ہوئی۔

ادھر عالم اسلام میں شیخ کی علمی سطوت کا اثر یہ تھا کہ اسی زمانے میں مصری سفارت کوئی پیغام لے کر خلیفۂ بغداد کے پاس پہنچی خلیفہ نے دریافت کیا یہ پیغام تم نے خود بادشاہ کی زبانی سنا ہے یا کسی کے توسط سے؟ انھوں نے کہا ہم نے یہ پیغام قصر شاہی کے مہتمم فخر الدین کی زبانی سنا ہے۔ خلیفہ نے کہا اُسے تو شیخ عزالدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے اس لیے تمھارا پیغام لائق قبول نہیں۔ نتیجۃً سفارت پھر مصر واپس آئی اور بادشاہ کی زبانی پیغام سن کر دوبارہ بغداد جا کر پیغام پہنچایا تو مسموع ہوا۔

بے مثال شجاعت: مصر میں کچھ امراے سلطنت بیت المال کی ملک اور غلام تھے۔ یہ شرعی طریقہ پر آزادی حاصل کیے بغیر حکومت کے بڑے بڑے عہدوں کے مالک ہو گئے اور اطراف حکومت میں اپنا اثر و اقتدار جما لیا۔ ان میں ایک وزیر اعظم اور نائب السلطنت بھی تھا۔

شیخ نے فتویٰ دے دیا کہ "یہ امرا بیت المال کی ملک ہیں جب تک شرعی طریقہ پر آزاد نہ کیے جائیں ان کے معاملات درست نہیں" شیخ کا فتویٰ سن کر مسلمانوں نے ان امرا سے معاملات ترک کر دیے اور وہ سخت دِقت و پریشانی میں مبتلا ہو گئے انھوں نے ہر چند منت و سماجت کی اور سلطان نے بھی سفارش کی مگر آپ حکم شرعی پر قائم رہے۔ شیخ نے بتایا کہ میں ان سب کو نیلام کروں گا، ان کی قیمت مسلمانوں کے کام میں صرف ہوگی اور آزاد ہونے کے بعد ان کے معاملات درست ہوں گے۔

کسی خوشامد پر شیخ نے اپنا فتویٰ واپس نہیں لیا تو نائب السلطنت اپنے نیلام اور ذلت کے تصور سے غضبناک ہو گیا۔ ننگی تلوار لیے اپنے عملہ کے ہمراہ شیخ کے گھر پہنچا دروازہ کھٹکھٹایا تو صاحبزادے باہر نکلے اور صورت حال دیکھ کر والد بزرگوار کو مطلع کیا۔ شیخ نے فرمایا "بیٹا! تمھارے باپ کا مقدر کہاں کہ راہ مولا میں شہید ہو۔" یہ فرمایا اور اٹھ کر دروازے پر آ گئے۔ نائب السلطنت نے دیکھا تو اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی، اس نے روتے ہوئے گفتگو کی اور آخر کار عرض کیا۔ میرے آقا! آپ جو حکم فرمائیں میں راضی ہوں۔

شیخ نے تمام امرا کو نیلام کیا اور ان کے اعزاز میں دام بہت زیادہ کہا پھر یہ آزاد ہو کر اپنے گھر گئے۔ طبقات میں ابن السبکی فرماتے ہیں: "ایک عالم دین کے رعب و دبدبہ کی یہ انتہائی مثال ہے جو کہیں اور سننے میں نہیں آتی۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شیخ کا فکری موقف:

علماے حق پر سب سے بڑی ذمہ داری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے اس ذمہ داری کو شیخ نے جس

پابندی اور پامردی سے ادا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں شیخ نہایت سخت مسلک فکر پر عامل تھے اپنے اسی علمی و فکری موقف کا اظہار کرتے ہوئے الملک الاشرف کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

و بعد ذلك فإننا نزعم أننا من جملة حزب الله وأنصار دينه وجنده وكل جندي لايخاطر بنفسه فليس بجندي. "ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم جماعت الٰہیہ کے افراد، دین خدا کے مددگار اور لشکر ہیں۔ اور جو لشکری اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ ہو وہ لشکری نہیں۔"

ایک دوسرے خطبہ میں بڑی صفائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہ بیان علمائے زمانہ کے لیے درس عبرت و بصیرت ہے۔ فرماتے ہیں: قد أمرنا الله بالجهاد فى نصرة دينه، ألا إن سلاح العالم علمه ولسانه، كما أن سلاح الملك سيفه فكَما لايجوز للملوك إغماد أسلحتهم عن الملحدين والمشركين لايجوز للعلماء إغماد ألسنتهم عن الزائغين و المبتدعين۔ (طبقات الشافعیہ ابن السبکی، ج:۸)

ہمیں اللہ نے اپنے دین کی مدد میں جہاد کا حکم دیا ہے یقین کرو کہ جس طرح بادشاہ کا ہتھیار شمشیر و سنان ہے اسی طرح عالم کا ہتھیار اس کا علم اور زبان ہے اور جس طرح بادشاہوں کے لیے بے دینوں اور مشرکوں سے اپنے ہتھیار روک کر نیام میں کرنا جائز نہیں اسی طرح علما کے لیے کج رؤوں اور بدمذہبوں سے روک کر اپنی زبانیں نیام میں کرنا جائز نہیں۔

شریعت کے معاملے میں شیخ اپنی بھی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی فتوے میں ان سے غلطی ہو گئی تو اپنے غیر معمولی منصب واثر کا لحاظ کیے بغیر اعلان کر دیا کہ "ابن عبد السلام نے جسے فلاں فتویٰ دیا ہو وہ اس پر عمل نہ کرے اس لیے کہ وہ غلط ہے۔"

آپ عالم شریعت ہونے کے ساتھ شیخ طریقت بھی تھے۔ شیخ المشائخ حضرت شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمہ (م ۶۳۲ھ) سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

تصنیفات:

شیخ نے نہ صرف اپنے زمانے میں اصلاحی اور تجدیدی کارنامے انجام دیے ہیں بلکہ بعد والوں کے لیے کتابوں کا گراں قدر ذخیرہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔ آپ کی تصنیفات القواعد الكبرىٰ، الإمام فى أدلة الأحكام، مجاز القرآن، كنز الفوائد سے علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) وغیرہ استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وفات: الملك الظاهر بيبرس (م ۶۷۶ھ) کے عہد حکومت میں بتاریخ ۱۰ر جمادی الاولی ۶۶۰ھ علم و فن، صلاح و تقویٰ اور اصلاح و ارشاد کا یہ سلطان اس دار فانی کو خیرباد کہہ گیا۔ إنا لله و إنا إليه راجعون.

علامہ فضل حق خیر آبادی[1]

عظیم فلسفی یا زبردست اسلامی متکلّم؟

علامہ فضل حق خیر آبادی (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء - ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) نے علم و فن کی مختلف شاخوں اور زندگی کے متعدد شعبوں میں اپنے فضل و کمال کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ منطق و فلسفہ، فقہ و کلام اور شعر و ادب ہر میدان میں ان کی علمی برتری کے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ مدت العمر رہا۔ لیکن ایسا نہیں کہ وہ صرف درس گاہ میں محصور اور لائبریری میں گوشہ نشین ہو کر عوامی زندگی اور ملکی سیاست سے بے تعلق رہے ہوں۔ نہیں۔ بلکہ سرزمین وطن کو ظالم حکمرانوں سے بچانے اور ابنائے وطن کو غیروں کی غلامی سے آزاد رکھنے کی راہ میں انھوں نے جو مجاہدانہ کردار پیش کیا ہے وہ ان کی زندگی کا ایسا درخشاں باب ہے جو تمام اہل ہند کی جانب سے ہزارہا خراج تحسین اور شکر و سپاس کا مستحق ہے۔ مگر یہاں میری گفتگو ان کی علمی زندگی اور فکری و قلمی آثار سے متعلق ہے۔ جس کی کچھ تفصیل آئندہ سطور میں رقم ہوگی۔

مشہور یہ ہے کہ "وہ زبردست فلسفی اور اپنے دور میں معقولات کے یکتائے روزگار شناور تھے۔" لیکن فلسفیوں کو عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ وہ اہل یونان کے فضلات اور ارسطو و ابن سینا کے رشحات سے کسی باب میں انحراف نہیں کر سکتے۔ وہ یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے کہ فلسفہ کہاں تک قابل قبول ہے اور کہاں ہفوات و فضول، اور کہاں محض الحاد و زندقہ اور ناقابل قبول۔ اہل یونان کی بنیادیں مضبوط کرنے کی خاطر دفتر کے دفتر سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ بھی لحاظ نہیں ہوتا کہ خدا اور رسول کی بارگاہ میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ اور علم و تحقیق کی اعلیٰ میزان میں اس کا وزن کیا ہوگا۔ فلاسفۂ یونان کے قواعد و مزعومات پر اگر کوئی اعتراض نظر آ گیا تو اس کا سخیف سے سخیف اور طویل سے طویل جواب لکھتے چلے جاتے ہیں اور اسے اپنی حیات مستعار کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ گویا اسی کے لیے وہ پیدا ہوئے تھے اور آخرت کے لیے وہی توشہ لے کر جانا ہے۔

لیکن اگر کہیں اسلامی اصولوں پر اعتراض ہوا، خدا کی شان میں بکواس کی گئی، رسول اعظم علیہ صلاۃ ربہ الاکرم کی

[1] ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، دسمبر ۲۰۰۱ء۔

عظمتوں کو نشانہ بنایا گیا، انبیاے کرام کی تنقیص ہوئی، معصوم ملائکہ، مقدس صحابہ اور مبارک اولیا کی اہانت ہوئی تو ان فلسفیوں میں کوئی حرکت نظر نہیں آتی، اسلام کا کلمہ ضرور پڑھتے ہیں مگر نہ ان کی غیرتِ اسلامی جنبش میں آتی ہے، نہ حمیت دینی کو جوش آتا ہے، نہ فکر علمی و ایمانی کا تقاضا انھیں کسی حرکت و عمل پر آمادہ کرتا ہے بلکہ وہ خود اسلامی اصولوں سے جابجا ٹکراتے اور الجھتے ہیں اور اس کے لیے ہر جتن کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

اس کے برخلاف ہم علامہ فضل حق خیر آبادی کو دیکھتے ہیں کہ جب تقویت الایمان نامی کتاب لکھ کر توحید کے نام پر توہین رسالت کا پُر فریب دام پھیلایا گیا تو وہ کھل کر میدان میں آئے، مؤلف کتاب کی پرزور مخالفت کی، مجمع عام میں اس کا رد کیا، اور سب کے سامنے اس پر حجت تمام کردی، پھر اس سلسلے میں "تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" نامی کتاب بھی تصنیف فرمائی جس سے فقہ و کلام اور قرآن و سنت میں علامہ کی وسعت نظر، دقتِ نگاہ اور جولانی فکر عیاں ہے۔

یہ دین اسلام کی حمایت، اور ناموس رسول کی حفاظت میں ان کی غیرت ایمانی، حمیت دینی، اور جوش اسلامی کا ایک ایسا دل کش منظر ہے، جو ارسطو و ابن سینا کے وفاداروں میں ناپید ہے۔ اسی طرح حب وطن، غیرت قومی، جوش ملی اور سیاست ملکی کے میدان میں انھوں نے جو مجاہدانہ کردار پیش کیا ہے وہ اغیار کے ریزہ خواروں اور اپنی قوم کے بے غیرت غداروں کے یہاں کبھی نظر نہیں آسکتا۔

ان اجمالی اشارات کے بعد اب میں آپ کو خالص علمی ماحول میں لے جانا چاہتا ہوں جہاں آپ دیکھیں گے کہ علامہ نے فلسفہ کو کہاں تک قبول کیا ہے اور کہاں تک اس کی موافقت روا رکھی ہے اور کہاں صراحۃً اس کی تردید فرمائی ہے۔ پہلے یہ ذہن نشین رہے کہ تمام موجودات کے واقعی حالات کی تحقیق کو فلسفہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس لیے فلاسفہ نے واجب الوجود تعالی و تقدس کی ذات و صفات اور تمام ممکنات کی تحقیق و تفتیش میں اپنی دماغی توانائیاں صرف کی ہیں۔ فلسفہ کو اولاً دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں نظری اور عملی۔ پھر نظری کو الٰہی، ریاضی، طبعی تین شعبوں میں اور عملی کو تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنیہ تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں پھر ریاضی کو خاصی وسعت دے کر حساب، ہندسہ، ہیأت، موسیقی چار خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ انسانی دماغ کی اعلیٰ کاوش ہے جو ہزارہا سال کی عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے اور اس کے بے شمار اصول و قواعد ہیں جن پر موجودہ سائنس آج بھی عمل پیرا ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ فلسفہ کُل کا کُل قابل انکار نہیں، اس میں بہت سی باتیں اہل حق سے اخذ کر کے بھی شامل کی گئی ہیں اور انھیں عقل و استدلال کا رنگ دے دیا گیا ہے اور بہت سی چیزیں صرف ذہنی و فکری کاوش پر مبنی ہونے کے باوجود بجا و درست ہیں لیکن بہت سے مزعومات وہ بھی ہیں جو سراسر باطل اور غلط ہیں اور بہت سے وہ ہیں جو غلط ہونے کے ساتھ اسلامی عقائد سے متصادم بھی ہیں۔

خصوصاً الٰہیات کے باب میں فلسفہ کا زیادہ تر حصہ محض باطل و غلط ہے۔ اور فلکیات کا شعبہ بھی کثیر ظلمات پر مشتمل منطق و ریاضی اخلاق و سیاست کی بنیادی باتیں عموماً بجا و درست ہیں اور شریعت سے متصادم نہیں۔

۴۔ البتہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے فلسفہ میں "ہدیہ سعیدیہ" تصنیف کی ہے جس سے فلسفہ میں ان کی مہارت اور مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ ان کی اسلامی غیرت اور دینی رسوخ بھی عیاں ہے۔ وہ جابجا صراحۃً و اشارۃً یہ بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جو کچھ بیان ہو رہا ہے وہ فلاسفہ کے مطابق ان کی نظریات کی تقریر و توضیح ہے، خود اپنا نظریہ کیا ہے اس کا تذکرہ دوسری کتابوں میں ہے۔ لیکن ہدیہ سعیدیہ میں بھی بعض مقامات پر اباطیل فلاسفہ پر نقد سے کتاب خالی رکھنا مناسب نہ سمجھا اور چند سطروں میں ان کی خامیوں کی ضروری نشان دہی کردی ہے۔ اس کی تائید کے لیے مناسب ہے کہ اصل کتاب سے چند نظائر و شواہد پیش کردوں تاکہ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ مکمل طور پر روشنی میں آجائے۔ مزید تفصیل کے لیے ایک بار اسی نقطۂ نظر سے اصل کتاب کی مراجعت کرلی جائے۔

(۱) ماہیتِ جسم کے بیان میں حکما کے مذاہب بتاتے ہوئے مشائیہ کا مذہب بتاتے ہیں کہ ان کے نزدیک جسم ہیولی اور صورت نامی دو جوہروں سے مرکب ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

"ونحن نريد تقرير مذهبهم وبيانه على حسب مطلبهم في هذا المختصر، وأما تحقيق ما هو الحق فقد أحلناه على كتب أخر" (ص:۲۱)

"اس مختصر میں مشائیہ کے مذہب کی تقریر اور ان کے حسب مطلب اس کا بیان ہمارا مقصود ہے، مگر حق کیا ہے اس کی تحقیق دوسری کتابوں کے حوالے ہے۔"

(۲) فن ثانی فلکیات کے خاتمے میں لکھتے ہیں:

"فلاسفہ کہتے ہیں کہ افلاک نو ہیں، ایک کواکب سے خالی ہے اسی لیے اسے فلک اطلس کہا جاتا ہے وہی فلک الافلاک ہے جس سے سمتوں کی تعیین ہوتی ہے وہ تمام اجسام کو محیط ہے۔ اس کے نیچے علی الترتیب فلک ثوابت، فلک مشتری، فلک مریخ، فلک شمس، فلک زہرہ، فلک عطارد، اور فلک قمر ہیں۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ تمام ستارے یومیہ حرکت سے مشرق سے مغرب کی جانب حرکت کرتے ہیں، اس لیے ان کے لیے ایک ایسا فلک مانا جو تمام افلاک اور ستاروں کو محیط ہے جس کی اصلی حرکت کے تابع ہو کر دوسرے تمام افلاک اور ستارے بالواسطہ و بالعرض حرکت کرتے ہیں۔ یہی فلک اعظم ہے جس سے سمتوں کی تحدید اور تعیین ہوتی ہے۔ پھر محسوس کیا کہ کچھ ایسے ستارے بھی ہیں جو ٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ثوابت کہے جاتے ہیں مگر وہ بھی بڑی سست رفتاری سے مغرب سے مشرق کی جانب حرکت کرتے ہیں اس لیے ایک فلک ان ثوابت کے لیے بھی مانا، یوں ہی ساتوں سیاروں کو دیکھا

کہ یہ مختلف حرکتوں سے حرکت کرتے ہیں اس لیے ہر سیارہ کے لیے ایک ایک فلک مان لیا، اس طرح ان کا زعم یہ ہے کہ افلاک نو ہیں۔ انھوں نے فلک اعظم سے متعلق جو احکام مانے ہیں مثلاً بسیط ہونا، کروی ہونا، اس کے لیے حرکت اَینی اور خرق والتئام (پھٹنا جڑنا) محال ہونا اور اس کے علاوہ بہت سی باتیں جو ماسبق میں تفصیلاً بیان ہوئیں۔ وہ سب احکام دیگر افلاک کے لیے بھی ٹھہرائے ہیں اور جتنی ساری اٹکل پچو باتیں اور اوہام وخیالات ان کے نفس نے انھیں سوجھائے سب پر یقین کیے بیٹھے ہیں۔ انھیں یہ پتہ نہیں کہ اگر ان کی دلیل مان لی جائے اور اعتراض و خلل سے سلامت رہ جائے تو بھی وہ زیادہ سے زیادہ فلک اعلی کی سطح بالا میں راست آسکتی ہے اس کے علاوہ کسی اور فلک کی سطح یا جسم میں وہ دلیل جاری نہیں ہو سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مقام پر ان کے جتنے مزعومات ہیں محض اٹکل پچو ہیں اور یہ بڑی لاعلاج بیماری ہے۔" (ص:۷۵)

(۳) ظاہری حواس پانچ ہیں۔ لامسہ، ذائقہ، شامہ، سامعہ، باصرہ۔ شیخ بو علی سینا نے شفا میں کہا کہ سامعہ اور باصرہ کو مناسب نامناسب چیز کو سننے دیکھنے سے کوئی لطف والم نہیں حاصل ہوتا، بلکہ جو بھی لذت وکلفت ہوتی ہے وہ نفس کو ہوتی ہے۔ اور لامسہ، ذائقہ، شامہ کو خود بھی لذت والم کا حصول ہوتا ہے۔ شیخ کے اس قول پر متعدد اعتراضات ہوئے جن کے جواب میں امام رازی نے شیخ کا دفاع کرتے ہوئے چند باتیں پیش کیں۔ مگر علامہ خیر آبادی نے وہ سب ذکر کرنے کے بعد لکھا:

یہ کلام بڑی متانت کا حامل ہے مگر اس سے اس اشکال کا حل نہیں نکلتا کہ کیا وجہ ہے کہ لامسہ، ذائقہ اور شامہ تو اپنے محسوسات سے متاثر ہوتے ہیں اور سامعہ، باصرہ متاثر نہیں ہوتے؟ آگے یہ فرماتے ہیں کہ لذت والم اگر مناسب ونامناسب کے ادراک کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ ادراک نفس کا کام ہے اور لذت والم اگر حواس میں حاصل ہونے والی مناسب ونامناسب صورت کا نام ہے تو یہ بات دیگر حواس کی طرح باصرہ وسامعہ میں بھی ہوتی ہے۔ اس لیے یا تو یہ کہیں کہ پانچوں حواس کے احساسات سے لذت والم صرف نفس کو ہوتا ہے، یا یہ کہیں کہ لامسہ، ذائقہ، شامہ کی طرح سامعہ، باصرہ کو بھی لذت والم کا حصول ہوتا ہے۔ ان کے درمیان فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ بہر حال شیخ نے ان حواس کے لذت والم سے متعلق جو جداگانہ حکم لگایا ہے وہ ایسا غلط ہے جسے فطرت سلیمہ قبول نہیں کر سکتی "ولم نخلق لأن نومن بما فی دفتی الشفاء" اور ہم اس لیے پیدا نہ ہوئے کہ شفا کے اوراق میں جو کچھ رقم ہو گیا اس پر ایمان لائیں۔" (ص:۱۶۱ تا ۱۶۶ ملخصا)

اس سے فلسفہ میں علامہ خیر آبادی کی ناقدانہ بصیرت عیاں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فلاسفہ کی عام باتیں بھی ان کے نزدیک اسی وقت قابل قبول ہوں گی جب وہ عقل واستدلال کی میزان پر پوری اتریں ورنہ انھیں بے دریغ رد کر دینا ان کی بے جا تاویلات کے مقابل زیادہ دانش مندانہ عمل ہوگا۔

(۴) فصل فی کائنات الجو کے آخر میں لکھتے ہیں:

"أعلم أن تكون هذه الآثار بل سائر الكائنات والأشياء إنما هو بتقدير قدير فعال لما يشاء، و حكم حكيم بديع، بديع الإنشاء، فى الارض والسماء، لايحتاج فى تكوين الأشياء إلىٰ مادة ومدة ولا إلى مُعِدّ وعدة، لكن حكمته الكاملة ربطت كائنات بأسباب عادية، وقدرته الشاملة كونت مواد عناصر وأعدتها لتكوين أشياء مادية، ورتبت عليها مصالح و غايات، وجعلتها على عظمته وحكمته أدلة و آيات، فخلق الله سبحانه بسائط، وركب منها أبخرة وأدخنة، وجعلها مواد وأسبابا، وقدر منها مطراً وماء وسحابا، وأخرج حبا و نباتا، وقدر لكل منها فصولا و أوقاتا، وجعلها أرزاقا وأقواتا، فتبارك الله أحسن الخالقين."

"معلوم رہے کہ ان آثار کا وجود، بلکہ دیگر تمام اشیا اور کائنات کا وجود ایک قدرت والے کی تقدیر اور حکم سے ہوتا ہے، وہ جو چاہتا ہے تخلیق فرماتا اور بناتا ہے، وہ حکمت والا، از سر نو ایجاد فرمانے والا، زمین وآسمان میں انوکھی ایجاد والا ہے، وہ اشیا کو وجود بخشنے میں کسی مادہ ومدت، اور کسی ذریعہ وسامان کا محتاج نہیں۔ مگر اس کی حکمت کاملہ نے کچھ وجود پانے والی چیزوں کو کچھ اسباب عادیہ سے مربوط کر دیا ہے اور اس کی ہمہ گیر قدرت نے عناصر کے مادے پیدا کر کے انھیں کچھ مادی چیزوں کے بنانے کے لیے تیار کر دیا ہے اور اس پر بہت سے مصالح ومقاصد مرتب فرمائے ہیں۔ اور ان سب کو اپنی عظمت اور حکمت کے لیے دلیل ونشان بنا دیا ہے۔ تو اللہ سبحانہ وتعالی نے بسائط کی تخلیق فرمائی، ان سے کچھ بخارات ودخانات ترکیب دیے۔ پھر انھیں مادہ وسبب بنا کر ان سے بارش، پانی اور ابر کو وجود بخشا، اور ان سے اناج اور پودے اگائے اور ہر ایک کے لیے موسم اور وقت مقرر کر دیا، اور ان کو رزق اور خوراک بنا دیا۔ تو بڑی برکت والا ہے اللہ جس کی تخلیق سب سے بہتر ہے۔"

یہ خالص اسلامی نظریہ اور ایمانی نظر ہے جو اسباب ومسببات کے تعلقات میں الجھ کر رک نہیں جاتی، بلکہ مسبب الاسباب تک پہنچتی ہے اور یہ دیکھتی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے در اصل اسی کی تقدیر وتخلیق سے ہو رہا ہے اور اسباب میں جو کچھ صلاحیت واستعداد جلوہ نما ہے وہ سب اسی کا فیضان، اسی کی عطا، اور اسی کی بخشش ہے۔ جب کہ خالص فلسفی کا دماغ مادہ وعناصر اور اسباب ظاہر کی "بھول بھلیاں" سے کبھی باہر نہیں نکلتا۔

(۵) فلاسفہ نباتات کے لیے بے شعور نفس مانتے ہیں جس سے آلات وقویٰ کے ذریعہ مختلف کام انجام پاتے

ہیں۔اور نفس نباتی کے لیے حسب ذیل قوتیں ثابت کرتے ہیں۔

(۱)جاذبہ (۲)ماسکہ (۳)ہاضمہ (۴)دافعہ (۵)غاذیہ (۶)نامیہ (۷)مولدہ (۸)مصورہ۔

ہدیہ سعیدیہ میں ہر ایک کی تعریف و توضیح اور اس سے متعلق کام رقم کرنے کے بعد ان قویٰ کے ماننے پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ تحریر کیے ہیں۔ان کا کچھ اقتباس درج ذیل ہے۔

(۱) غور کریں تو نباتات میں بڑی دلکش، عمدہ اور حسین و جمیل ترتیب و تقدیر پائی جاتی ہے جس میں عقل و فہم حیرت زدہ ہے۔ اس میں جو منافع و مصالح ودیعت ہیں ان کے ادراک میں ذہن و دماغ سرگرداں ہے، اس کے ابتدائی اصول سمجھنے سے فکر و نظر درماندہ ہے، انتہا و غایت تک رسائی سے عاجزی کے باوجود انسان کی خلقت و ایجاد میں ودیعت کردہ جن منافع اور حکمتوں کا حکما کی ضعیف و کمزور عقل و فہم استخراج کر سکی ہے ان کی تعداد پانچ ہزار ہے، جو علم تشریح میں مذکور ہے۔ جب کہ اب تک جو کچھ دریافت ہوا ہے وہ نامعلوم اسرار کی بہ نسبت کم سے کم تر ہے۔

تو جسے ذرا بھی دانش و بینش کا حصہ ملا ہے وہ ایک بے شعور قوت سے ایسی صورت گری صادر ہونے کا کیسے قائل ہو سکتا ہے جو بڑی انوکھی اور دقیق حکمتوں، دلکش عظیم مصلحتوں اور خوش نما حیرت انگیز دیدہ زیب صورتوں اور شکلوں وغیرہا پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہی مان لیا جائے کہ وہ قوت بسیط نہیں بلکہ مرکب ہے۔ اور مادے مختلف استعداد اور صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

(ب) بے شعور نبات کے اندر ہونے والے حیرت انگیز، دل کش اور محکم افعال کو مذکورہ قویٰ کی جانب منسوب کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ اسی طرح یہ ماننا کہ بدن اور اس کے اجزا و اعضا کو بنانا نفس حیوانی یا نفس انسانی یا اس کی کسی قوت کا فعل ہے۔ یہ بھی کھلی ہوئی جہالت اور گمراہی ہے۔ نفس کی قوت کا فعل تو اس لیے نہیں ہو سکتا کہ وہ بے شعور ہے اور اس سے ان محکم حکمتوں کا صادر ہونا محال ہے اور خود نفس کا فعل اس لیے نہیں ہو سکتا کہ فلسفہ کے نزدیک وہ بدن کے پیدا ہونے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی اپنے علوم کے کامل ہونے اور اپنے ادراک کی آخری حد تک پہنچ جانے کے بعد بھی اعضا کی کیفیت، ان کی مقداروں، ان کے حالات و حرکات، غذا طلبی، صحت و بیماری وغیرہ کی کیفیات اور ان کے اجزا و عوارض سے آشنا نہیں ہوتا، اگر کچھ جانتا ہے تو علم تشریح وغیرہ کی مہارت کے بعد بہت قلیل مقدار میں جانتا ہے وہ بھی محض ظن و تخمین کے طور پر ہوتا ہے، جزم و یقین کا حصول نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ نفس اپنے وجود پذیر ہونے کی ابتدا میں اتنی ساری تفصیلات سے آشنا ہے کہ ان اعضائے بدن سے متعلق تمام مصالح اور حکمتوں کی رعایت کر لیتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب نفس کی قوت پورے کمال کو پہنچ جاتی ہے اس وقت بھی وہ بدن کی کسی صفت کو وجود

بخشنے پر قدرت نہیں رکھتا پھر اپنے وجود کے آغاز اور شدت ضعف کے عالم میں ان بدیع صفات کے بنانے پر کیسے قادر ہو سکتا ہے؟

تو لامحالہ یہ ماننا ہوگا کہ بدن کو تخلیق کرنے، بنانے اور اس میں عظیم حکمتیں ودیعت فرمانے کا کام ایک عالم خبیر، حکیم قدیر کا ہے، جس نے پیدا کیا تو بہت عمدہ بنایا اور جیسے چاہا حکمتیں ودیعت فرمائیں، وہی ہے جو رحم میں اپنی مشیت کے مطابق صورتیں بناتا ہے۔

اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بدن و اجزائے بدن میں جاذبیت، اور پکانے پختہ کرنے والی حرارت، مدافعت وغیرہ صفات نہ ہوں اس لیے کہ یہ ساری چیزیں اسی حکیم خلاق، قدیر، مختار علی الاطلاق نے بدن میں پیدا کر دی اور ودیعت فرما دی ہیں۔ ساری علوی و سفلی مخلوقات میں اس کے سوا اور کسی کی تاثیر حقیقت میں نہیں۔ اگرچہ بطور عادت بعض اشیا بعض کے لیے سبب ہوتی ہیں چوں کہ خالق کائنات کی جانب سے عادت اور دستور یوں ہی جاری ہے جس میں بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں کار فرما ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ فعال قدیر اپنے بندوں میں سے جن کو عظیم سعادتوں سے سرفراز فرماتا ہے ان کی کرامت اور اعزاز کے طور پر عادۃً تخلیق پانے والی چیزوں سے زیادہ بدیع اور انوکھی چیز پیدا فرما دیتا ہے۔ هذا هو التحقيق، وهو سبحانه ولي العصمة والتوفيق۔ (ص: ۱۲۳ تا ۱۳۹ ملخصاً)

اس طرح کی بہت سی مثالیں خود ہدیہ سعدیہ میں موجود ہیں جن میں علامہ نے صراحۃً اسلامی موقف کی ترجمانی فرمائی ہے۔ اور فلاسفہ کے باطل نظریات سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ اور اشارۃً عندہم، وغیرہ الفاظ کے ذریعہ ان کے غلط خیالات سے اپنی براءت تو بہت سے ایسے مقامات پر بھی کرتے گئے ہیں جہاں خود فلاسفہ کے نظریات اور ان کے دلائل کا بیان ہو رہا ہے۔ اس طرز نگارش سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ کو فلسفہ میں انہماک نہ تھا۔ اور نہ فلسفہ پر ان کا ایمان تھا، وہ اسلام کو پختہ دلائل اور قوی براہین کی روشنی میں حق مانتے تھے اور اس سے متصادم ہر نظریہ کو تار عنکبوت کی طرح تار تار کرنے کی عظیم صلاحیت کے حامل تھے۔ اس لیے میں انھیں ایک فلسفی کہنے کے بجائے زبردست اسلامی ترجمان، عظیم متکلم، پر جوش داعی، درد مند ہادی، اور ملکی سیاست کے باب میں غیرت مند مجاہد اور دور اندیش رہنما کہنا پسند کرتا ہوں۔ بلاشبہہ یہی ان کے شایان شان ہے اور یہی حقیقت کے مطابق بھی ہے۔

علامہ کی دیگر تصنیفات مثلاً حاشیہ قاضی مبارک سے بھی رد فلسفہ اور تائید اسلام کی مثالیں پیش کرنے کا ارادہ تھا مگر طولِ مضمون اور قارئین کے ملال خاطر کے خیال سے چھوڑ دیا، توفیق ملی تو آئندہ کبھی ان گلستانوں کی سیر کی جائے گی۔ والله الموفق وهو خير معين.

سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہروی قدس سرہ[1]

۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء ــــــــــ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

مفتی اعظم حضرت مولانا مصطفےٰ رضا خاں بریلوی قدس سرہ کے مرشد گرامی سید المشایخ[2] حضرت شاہ ابو الحسین احمد نوری قدس سرہ، حضرت سید شاہ ظہور حسن (وصال/۱۲۶۶ھ) قدس سرہ کے فرزند ارجمند، حضرت علامہ سید شاہ آل رسول بن سید آل برکات قدس سرہما (وصال/۱۲۹۶ھ) کے پوتے، مرید و خلیفہ اور سجادہ نشین تھے۔ علم و فضل میں نابغۂ روزگار، تصوف و سلوک میں یکتائے زمانہ، التزام شریعت و طریقت میں فرد وقت، اخلاق و اعمال میں نمونۂ سنت اور کرامات و تصرفات میں بے مثال تھے۔ عہد طفلی سے عہد پیری تک علم و فن، ریاضت و مجاہدہ، ذکر و عبادت اور تصنیف و تبلیغ میں مصروف رہے۔ ایک جہان نے آپ سے فیض پایا۔ اور ایک عالم آپ کے انوار باطنی سے سیراب ہوا۔ ان ہی خوش بختوں میں ایک سیدی مفتی اعظم آل الرحمٰن محی الدین جیلانی، مولانا شاہ مصطفےٰ رضا خاں قدس سرہ ہیں۔

حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کی ولادت سے پہلے ہی سید المشائخ علیہ الرحمۃ نے مارہرہ شریف میں اعلیٰ حضرت کو ان کے تولد و سعادت کی بشارت دے دی تھی۔ اور ولادت کے چھ ماہ بعد بریلی تشریف آوری ہوئی تو بیعت سے نوازا۔ پھر خلافت و اجازت بھی مرحمت فرمائی[3]۔ سید المشائخ کی رحلت ۱۱/رجب ۱۳۲۴ھ/۳۱/اگست ۱۹۰۶ء شنبہ کی شام کو ہوئی۔ اس وقت حضور مفتی اعظم قدس سرہ کی عمر مبارک چودہ (۱۴) سال ہوگی۔

سلسلۂ نسب:

حضرت سید شاہ ابوالحسین احمد نوری ملقب بہ میاں صاحب ابن (۱) سید شاہ ظہور حسن ابن (۲) سید شاہ آل رسول

---

(۱) ماہ نامہ استقامت، کان پور، مفتی اعظم نمبر، مئی ۱۹۸۳ء

(۲) اس مضمون میں ہر جگہ سید المشائخ سے میری مراد صاحب تذکرہ سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہ ہیں۔ ۱۲ محمد احمد مصباحی

(۳) قبل ولادت و بعد ولادت عہد طفلی و شیر خوارگی میں کسی کو داخل سلسلہ کرنے اور خلیفہ و مجاز بنانے کا مسئلہ میر عبدالواحد بلگرامی قدس سرہ (۹۱۵ھ-۱۰۱۷ء) سبع سنابل شریف میں منقح فرما چکے ہیں۔ ۱۲ منہ

ابن (۳) سید آل برکات عرف ستھرے صاحب ابن (۴) سید شاہ حمزہ ابن (۵) سید شاہ آل محمد ابن (۶) سید شاہ برکت اللہ، صاحب سلسلۂ برکاتیہ، ابن (۷) سید شاہ اویس ابن (۸) سید شاہ عبدالجلیل ابن (۹) سید عبدالواحد، صاحب سبع سنابل شریف، ابن (۱۰) سید ابراہیم شاہ ابن (۱۱) سید شاہ محمد قطب الدین ابن (۱۲) سید شاہ محمد ماہرو شہید ابن (۱۳) سید شاہ بڈھ ابن (۱۴) سید شاہ کمال الدین ابن (۱۵) سید قاسم ابن (۱۶) سید حسین ابن (۱۷) سید نصیر ابن (۱۸) سید حسین ابن (۱۹) سید عمر ابن (۲۰) سید محمد صغری جد اعلیٰ قبائل سادات بلگرام ابن (۲۱) سید علی ابن (۲۲) سید حسین ابن (۲۳) سید ابوالفرح ثانی ابن (۲۴) سید ابوالفراس ابن (۲۵) سید ابوالفرح واسطی جد اعلیٰ قبائل سادات زیدیہ بلگرام وغیرہ ابن (۲۶) سید داؤد ابن (۲۷) سید حسین ابن (۲۸) سید یحییٰ ابن (۲۹) سید زید سوم ابن (۳۰) سید عمر ابن (۳۱) سید زید دوم ابن (۳۲) سید علی عراقی ابن (۳۳) سید حسین ابن (۳۴) سید علی ابن (۳۵) سید محمد ابن (۳۶) سید عیسیٰ ملقب بہ مؤتم الاشبال ابن (۳۷) حضرت زید شہید ابن (۳۸) امام زین العابدین علی ابن (۳۹) حضرت امام حسین شہید کربلا ابن (۴۰) حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ ورضی اللہ تعالیٰ عنہ وعنہم، زوج (۴۱) سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت (۴۲) سید الانبیا احمد مجتبیٰ، محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔

خاندانی حالات:

حضرت امام زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما (۳۸ھ - ۱۲/محرم ۹۴ھ) کے فرزند زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تابعی مدنی ہیں۔ ۷۵ھ میں ولادت ہوئی۔ جب بنی امیہ کا ظلم و ستم اور فسق و فجور حد سے آگے بڑھا تو حضرت زید نے ہشام بن عبدالملک مروانی کے خلاف کوفہ میں علم جہاد بلند کیا۔ پھر اس کے عامل یوسف بن عمر ثقفی کی اجازت سے مدینہ منورہ لوٹ آئے۔ لیکن دوبارہ بہت سے اہل کوفہ اپنی نصرت و وفا کا یقین دلا کر حضرت کو باصرار کوفہ لے گئے۔ وہاں پہنچنے کے بعد پندرہ ہزار کوفیوں کی جمعیت ان کے ہمراہ ہوگئی۔ مگر بعد میں ساتھ چھوڑنے کی یہ تدبیر نکالی کہ حضرت سے کہا: آپ ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر تبرا کریں۔ حضرت نے فرمایا: ہم اس سے براءت ظاہر کرتے ہیں جو حضرات شیخین پر تبرا کرے۔ کوفیوں نے کہا: اِذَنْ نَرْفُضُكَ تب ہم آپ کو چھوڑتے ہیں۔ فرمایا: دور ہو جاؤ، تم رافضی ہو۔ اسی وقت سے اس لقب کی ابتدا ہوئی۔ اب حضرت کے ساتھ بہت مختصر جماعت رہ گئی جو ظالم وقت کے مقابلے کے لیے کافی نہ تھی۔ ایک وقت آیا کہ ظالموں نے حضرت کو سخت اذیتوں کے ساتھ شہید کر دیا۔ یہ ۱۲۱ھ کا واقعہ ہے۔ پھر بد بختوں نے قبر شریف سے حضرت کی نعش مبارک نکال کر اسے سولی دی اور ان مظالم و شقاوت کا مظاہرہ کیا جن کا تصور بھی ایک مسلمان کو لرزہ براندام کر دینے کے لیے کافی ہے۔

مدینہ منورہ سے واسط تک:

ان کے فرزند حضرت عیسیٰ (ابتدائی نام عسارہ بن زید) جن کا لقب موتم الاشبال (شیر کے بچوں کو یتیم کرنے والے) تھا۔ حکومت کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہنے کی خاطر زیادہ تر واسط وغیرہ کے جنگلوں میں رہتے۔ منصور عباسی برابر آپ کو تلاش کراتا رہا لیکن ناکام ہوا۔ کوفہ کے اندر ۱۶۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ ایک قول یہ ہے کہ والد گرامی حضرت زید کی شہادت (۱۲۱ھ) کے وقت آپ کی عمر ایک برس تھی۔ مگر چوں کہ آپ اپنے والد ماجد سے حدیث روایت کرتے ہیں اس لیے یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ تحقیق یہ ہے کہ ۱۰۶ھ کے اواخر یا ۱۰۷ھ کے اوائل میں آپ کی ولادت ہوئی۔

آپ کے اخلاف کرام حکومتوں کے ظلم و تعدی سے پریشان ہو کر اپنے عزیز آبائی وطن مدینہ منورہ و مکہ معظمہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اور حضرت موتم الاشبال کے پڑپوتے حضرت علی عراقی نے عراق کے مشہور شہر واسط میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

واسط سے سرہند تک:

پھر ان کی نسل میں سید ابو الفرح واسطی کو واسط بھی چھوڑنا پڑا۔ جس کا سبب صرف یہ ہوا کہ فرماں روائے واسط کو کسی خلاف شرع امر سے روکا اور وہ باز بھی آگیا۔ مگر کم بخت مصاحبین کے اکسانے پر بعد میں حضرت کو اپنی قلم رو سے باہر ہونے کا حکم دے دیا۔ حضرت اپنے بیٹے، پوتوں، لڑکیوں، نواسے، نواسیوں، دامادوں، غرض پورے کنبے قبیلے کو لے کر سلطان محمود غزنوی کے عہد سلطنت میں غزنی پہنچے۔ وہاں حضرت کی ولایت کا امتحان لینے اور ان سے روشناس ہونے کے بعد لوگوں نے بڑا اعزاز و اکرام کیا اور نیاز مندانہ پیش آئے۔

پھر حضرت وہاں سے ہندوستان تشریف لائے۔ جب آپ سرہند کے قریب پہنچے اور حاکم سرہند کو اطلاع ملی تو حاضر خدمت ہو کر اعزاز و اکرام کے ساتھ لے گیا۔ اور کئی مواضع بطور جاگیر دیے۔ ایک عرصہ تک ان مقامات میں حضرت اپنے اہل خاندان کے ساتھ مقیم رہے۔ بعد میں حاکم واسط اپنے فعل پر پشیماں ہوا۔ اور معافی مانگ کر حضرت کو پھر واسط بلایا۔ وہیں حضرت کی وفات ہوئی۔ مگر آپ کے فرزندوں میں سے سید معز الدین کے سوا باقی اہل قبیلہ ہندوستان میں رہ گئے۔ جن کی اولاد قنوج، سندیلہ، بلگرام، بارہا، مارہرہ وغیرہ مقامات میں آج بھی موجود ہیں۔

سرہند سے بلگرام تک:

سید ابو الفرح قدس سرہ کے پڑپوتے، سید ابو الفرح ثانی کے فرزند سید حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلگرام کا قصد

کیا۔ اور موضع "پینوٹی" میں خیمہ زن ہوئے۔ تسخیر بلگرام کے اسباب اسی وقت پیدا ہو چکے تھے۔ تھوڑی معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ لیکن اس کام کی تکمیل آپ کے پوتے سید محمد صغریٰ بن سید علی کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کا اصل نام سید محمد ہے۔ اور صاحب الدعوۃ الصغریٰ لقب تھا۔ کثرت استعمال سے جزء اول حذف ہو کر صرف جزء آخر صغریٰ زبان عوام پر باقی رہ گیا۔ اور نام کے ساتھ بولا جانے لگا۔

سید محمد صغریٰ حضرت خواجہ بختیار کاکی قدس سرہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ سلطان شمس الدین التمش کی رفاقت و ملازمت کے پردے میں اپنے باطنی کمالات نگاہ عوام سے مخفی رکھتے۔ انھوں نے ۶۱۴ھ میں بلگرام فتح کیا۔ اور علامہ میر عبد الواحد بلگرامی قدس سرہ تک خاندان برکاتی کے اجداد کرام وہیں سکونت پذیر رہے۔

بلگرام سے مارہرہ:

سب سے پہلے سید شاہ عبد الجلیل ابن سید عبد الواحد بلگرامی قدس سرہما باشارۂ غیبی و رضائے نبوی مارہرہ تشریف لائے۔ بہت سے اہل خاندان اور سادات زیدیہ بلگرام ہی میں مقیم رہے۔ حضرت شاہ عبد الجلیل قدس سرہ بتاریخ ۱۰؍ رجب ۹۷۲ھ بروز پنج شنبہ اول وقت ظہر بلگرام میں رونق افزائے فرش گیتی ہوئے۔ اور بعد نماز فجر بروز دو شنبہ بتاریخ ۱۸؍ صفر المظفر ۱۰۵۷ھ مارہرہ شریف میں محبوب حقیقی سے جا ملے۔ وہیں اپنی خانقاہ کے صحن میں مدفون ہوئے۔

اس خاندان عالی میں سبھی ارباب فضل و کمال نظر آتے ہیں۔ اور بعض حضرات کو شہرت و مقبولیت حاصل ہے چند اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) سیدنا زید شہید مدنی تابعی، جو سیدنا امام زین العابدین علی کے بعد اس خانوادے کے جد اعلیٰ اور تاریخ اسلام کی ناقابل فراموش شخصیت ہیں۔ (۲) سید علی عراقی، جو عراق میں سکونت کے باعث اہل حجاز کے نزدیک عراقی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ۱۳۰۰ھ میں سید شاہ اسمٰعیل حسن مارہروی قدس سرہ سفر حج کے درمیان قرنطینہ کے لیے جزیرۂ کامران میں اترے۔ تو انھیں تھوڑے فاصلے پر ایک مزار نظر آیا۔ تفتیش پر معلوم ہوا کہ یہ سید علی عراقی کا مزار مبارک ہے۔ حضرت فاتحہ و زیارت سے شرف یاب ہوئے۔ (۳) ابو الفرح واسطی جو خاندان میں سب سے پہلے ہندوستان تشریف لائے۔ (۴) سید محمد صغریٰ قدس سرہ (وصال ۶۴۵ھ) جد اعلیٰ قبائل سادات بلگرام وغیرہ۔ (۵) سیدنا میر عبد الواحد بلگرامی قدس سرہ صاحب سبع سنابل شریف و تصانیف کثیرہ مبارکہ، (۶) سیدنا عبد الجلیل قدس سرہ (۷) آپ کے پوتے سیدنا برکت اللہ مارہروی قدس سرہ (۱۰۷۰ھ - ۱۰؍ محرم ۱۱۴۲ھ) صاحب سلسلۂ برکاتیہ۔

سید المشائخ کی ولادت، تعلیم و تربیت:

سیدنا شاہ ابو الحسین احمد نوری قدس سرہ بروز پنج شنبہ بتاریخ ۱۹؍ شوال المکرم ۱۲۵۵ھ مطابق ۲۶؍ دسمبر ۱۸۳۹ء

مارہرہ مقدسہ میں پیدا ہوئے۔ ڈھائی برس کے تھے کہ والدہ ماجدہ علیہا الرحمہ نے رحلت فرمائی۔ اور جدہ ماجدہ نے تمام کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ عمر شریف کا گیارہواں سال تھا کہ والد گرامی سید شاہ ظہور حسن علیہ الرحمۃ کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ مگر یہ حضرت کی خوش نصیبی ہے کہ پورے اکتالیس برس اپنے جد گرامی سیدنا شاہ آل رسول احمدی کی خصوصی تربیت اور تعلیم وہدایت سے سرفراز ہوئے اور ان کے زیر عنایت رہ کر سلوک وعرفان کی منزلوں پر فائز ہوئے۔

اساتذۂ علوم ظاہری:

سب سے پہلے حضرت خاتم الاکابر علامہ شاہ آل رسول احمدی قدس سرہ نے حسب قاعدہ سورۂ اقرأ شریف کی چند آیتیں پڑھائیں۔ سینۂ مبارک سے لگایا، رَبِّ يَسِّرْ وَلَاتُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَيْرِ کے ساتھ خاص دعائیں دیں۔ پھر درگاہ شریف کے مدرسۂ فارسی میں داخل کردیا۔

حضرت شیخ المشائخ نے "الصلوٰة البهية علىٰ أساتذتي وأساتذة أجدادي" میں اپنے جن اساتذۂ کرام کے اسما تحریر فرمائے ہیں ان میں سے اکثر حضرات کے متعلق یہ سراغ نہیں ملتا کہ حضرت نے ان سے کیا پڑھا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ حضرات چوں کہ بارگاہ معلّیٰ کے مدرسہ میں رہتے تھے۔ اس لیے باضابطہ نہ سہی، اتفاقاً ہی کچھ اخذ تعلّم کا موقع آیا ہوگا۔ ان بزرگوں کے طرز عمل سے یہ کبھی ظاہر نہ ہوا کہ استاد ہیں۔ بلکہ شیخ المشائخ سے ہمیشہ خادمانہ و مودبانہ ملتے ہی دیکھے گئے۔ یہ حضرات ان ارشادات کو پیش نظر رکھتے تھے:

وَلَا تؤمّوا قريشاً وائتمّوها ولا تعلّموا قريشاً و تعلّموا منها فَإنّ أمانة الامين من قريش تعدلُ أمانة أمينين.[1]

ترجمہ: قریش کو اپنا تابع نہ بناؤ۔ ان کی اتباع کرو۔ قریش پر دعوی استادی نہ رکھو، اور ان کی شاگردی کرو کہ قریش میں ایک امین کی امانت دو امینوں کے برابر ہے۔

قاضی القضاۃ مولانا شہاب الدین دولت آبادی قدس سرہ رسالہ "مناقب السادات" میں فرماتے ہیں:

ہر کہ پیش شاگرد پدر خود خواند شاگرد نہ باشد و او را نشاید کہ بنظر استاذی نگرد، از آں کہ نعمتے کہ او را از پدرش رسیدہ بود ہماں نعمت بہ پسرش رسانیدہ امین و مبلغ باشد نہ ولی نعمت۔ فَهِمَ مَنْ فَهِمَ وَجَهِلَ مَنْ جَهِلَ

ترجمہ: جو اپنے باپ کے شاگرد سے پڑھے شاگرد نہ ہوگا۔ پڑھانے والا اپنے کو استاذ نہ سمجھے اور اسے نظر استاذی سے نہ دیکھے کیوں کہ جو نعمت اس کے والد سے ملی تھی وہی اس کے فرزند کو پہنچا کر وہ امین و مبلغ ہوا۔ محسن و

(۱) حدیث نبوی، ابن عساکر، بروایت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ

آقائے نعمت نہ ہوا۔ جس نے سمجھا، سمجھا۔ جو نادان بنا، نادان رہا۔

لیکن یہ شرافت نفس اور علو ہمت کی بات ہے کہ حضرت شیخ المشائخ نے کسی سے اگر کچھ بھی سیکھ لیا تو کوئی چیز ہویا نہ جانتا ہوا سے اپنے اساتذہ میں ذکر فرمایا۔ ان کی نظر میں یہ ارشادات تھے:

(۱) مَنْ عَلَّمَنِیْ حَرْفاً فَقَدْ صَیَّرَنِی لَهٗ عَبْداً، اِنْ شَاءَ بَاعَ وَاِنْ شَاءَ اَعْتَقَ.[1]

ترجمہ: جس نے مجھے ایک حرف پڑھا دیا بہ تحقیق اس نے مجھے اپنا بندہ وغلام بنالیا۔ اگر چاہے فروخت کرے اور اگر چاہے آزاد کرے۔

(۲) مَنْ عَلَّمَ عَبْداً آیَةً مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ هُوَ مَوْلَاهُ.[2]

ترجمہ: جس نے کسی بندہ کو کتاب اللہ کی کوئی آیت سکھا دی تو وہ اس کا آقا ہو گیا۔

(۳) تَعَلَّمُوْا العِلْمَ وَتَعَلَّمُوْا لِلْعِلْمِ السَّکِیْنَةَ وَالوَقَارَ وَتَوَاضَعُوا لِمَنْ تَعَلَّمُوْنَ منه.[3]

ترجمہ: علم حاصل کرو اور علم کے لیے سکون و وقار سیکھو اور جس سے علم حاصل کرو اس کے سامنے تواضع و عاجزی اختیار کرو۔

(۴) مَا کَتَبْتُ عَنْ اَحَدٍ حَدِیْثاً اِلَّا کُنْتُ لَهٗ عَبْداً مَا اَحْیٰ.[4]

ترجمہ: میں نے جس سے ایک حدیث بھی لکھی تا دم زیست اس کا بندہ وغلام ہو گیا۔

مگر اب تو وہ زمانہ ہے کہ بعض حضرات شرف استاذی پر فخر کرتے نہیں تھکتے۔ اور بعض حضرات باضابطہ اخذ و تعلّم اور ممنون تربیت ہونے کے باوجود بھی اپنے واقعی اساتذہ کو استاذ بتاتے ہوئے کسر شان سمجھتے ہیں۔ باقی آداب استاذی وشاگردی کا لحاظ تو دور کی بات ہے۔ حضرت شیخ المشائخ نے اپنے اساتذہ کی ایک طویل فہرست تحریر فرمائی ہے، یہاں چند اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں:

(۱) میاں جی رحمت اللہ صاحب علیہ الرحمۃ، غالباً یہ حضرت کے پہلے استاذ ہیں۔

(۲) مولانا محمد سعید صاحب عثمانی بدایونی، مدرس اول مدرسہ عربیہ درگاہ معلّیٰ۔ حضرت نے آپ سے ابتدائی رسائل صرف ونحو پڑھے۔ ۲۴؍ ربیع الآخر ۱۲۷۷ھ کو بدایوں میں وصال ہوا۔

(۱) مولائے کائنات کرم اللہ تعالیٰ وجہہ۔ طبرانی شریف

(۲) حدیث نبوی، طبرانی شریف

(۳) حدیث نبوی، طبرانی وابن عدی

(۴) محدث جلیل حضرت شعبہ بن حجاج، مقاصد حسنہ، از امام سخاوی

(۳) میاں جی جمال روشن صاحب

(۴) حافظ و قاری محمد فیاض صاحب رام پوری، حضرت کے معلم قرآن کریم ہیں۔ مدرسہ قرآنیہ درگاہ معلیٰ میں ایک عرصہ تک صدر نشیں رہے۔ رام پور میں انتقال فرمایا۔

(۵) مولوی فضل اللہ صاحب جالیسری، مدرس مدرسہ عربیہ درگاہ معلیٰ۔ بماہ ذو الحجہ ۱۲۸۳ھ جالیسر میں انتقال ہوا۔

(۶) استاذ الاساتذہ مولانا نور محمد صاحب بدایونی۔ بمقام بدایوں ۱۳۰۱ھ میں وصال ہوا۔

(۷) محب رسول مولانا عبد القادر عثمانی بدایونی، سید المشائخ نے اساتذہ کی فہرست میں ان کا نام درج نہیں کیا ہے۔ غالباً بطور درس ان سے کچھ نہیں پڑھا تھا لیکن برابر انھیں استاذی کہا کرتے۔ جس کا سبب یہ رہا ہوگا کہ حسب ہدایت حضرت خاتم الاکابر قدس سرہ سید المشائخ مسائل دینیہ میں علامہ سے مشورہ کرتے اور ان کے مشورہ و معاینہ کے بغیر اپنی تصانیف شائع کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی استفادہ کو شاگردی سے تعبیر کیا۔ اور علامہ کو ہمیشہ استاذی کہہ کر پکارا۔ علامہ رد وہابیہ و رد تفضیلیہ میں یکتائے زمانہ تھے۔ امام احمد رضا نے قصیدۂ مدحیہ میں آپ کی محبت کو علامتِ سنت قرار دیا ہے۔ علامہ سے اعلیٰ حضرت قبلہ کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اکثر مسائل و معاملات دینیہ میں باہم مشورہ بھی ہوا کرتا تھا۔ بتاریخ ۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۹ھ بدایوں شریف میں انتقال فرمایا۔

اساتذۂ باطنی:

حضرت شیخ المشائخ کو علم باطن میں اپنے جد امجد سیدنا شاہ آل رسول احمدی قدس سرہ سے باقاعدہ تعلیم حاصل ہے۔ مگر علم ظاہر کی طرح علم باطن میں بھی جن بزرگوں سے حضرت شیخ المشائخ نے کسی مسئلہ یا وِرد و دعا میں کوئی استفادہ کیا اور کوئی فیض پایا۔ ان کے کچھ اسما ذکر فرمائے۔ چند نام تبرکاً یہاں بھی لکھے جاتے ہیں:

(۱) حضرت سید غلام محی الدین قدس سرہ۔ سید المشائخ کے چھوٹے دادا ہیں۔ ان سے اجازتِ اوراد و اشغال اور اکثر خاندانی چیزیں حاصل ہوئیں۔ فن تکسیر بھی اولاً آپ ہی سے سیکھا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۲) حضرت شاہ شمس الحق عرف تنکا شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ان سے بعض اعمال و اشغال ملے۔ (۳) مفتی سید عین الحسن بلگرامی قدس سرہ نہایت مرتاض اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ درگاہ شریف کے مدرسہ حقائق میں تصوف و حقائق کے معلم اور سید المشائخ کے استاد تھے۔ (۴) مولانا احمد حسن صاحب مرادآبادی علیہ الرحمۃ، سید المشائخ نے آپ سے علم تصوف کے بعض قواعد حاصل کیے۔ اور ۶ر شعبان ۱۲۸۵ھ کو سند مسلسل بالاولیت بھی حاصل کی۔ ۱۶ر صفر ۱۲۸۸ھ یکشنبہ کے دن اشراق کے وقت

وصال ہوا۔ (۵) حضرت حافظ شاہ علی حسین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمۃ، انھیں خاندان برکاتی سے خلافت و اجازت بھی حاصل ہوئی۔ آپ سے سید المشائخ کو اجازت حرز یمانی و سلسلۂ قادریہ منوریہ اور سند تسبیح حاصل ہوئی۔ مرادآباد میں انتقال فرمایا۔ اور محلہ کنگر میں دفن ہوئے۔

تصانیف:

اگرچہ تصنیف اور شہرتِ مصنفی سے حضرت کو خاص دل چسپی نہ تھی لیکن ضرورت و ہدایت کے پیش نظر بعض کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے بیشتر شائع ہو چکی ہیں۔ چند نام یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) العسل المصفّٰی فی عقائد أرباب سنة المصطفیٰ. بیان عقائد اہل سنت، (مطبوعہ)

(۲) سوال و جواب: اردو، ردّ تفضیلیہ (مطبوعہ)

(۳) تحقیق التراویح: بیس رکعت تراویح کا ثبوت۔

(۴) دلیل الیقین من کلمات العارفین. حضرات صوفیہ کرام کا مسلک بھی تفضیل شیخین ہی ہے۔ (مطبوعہ)

(۵) عقیدۂ اہل سنت (محاربین جمل و صفین و نہروان کے بارے میں) (غیر مطبوعہ)

(۶) لطائف طریقت، کشف القلوب، بیان سلوک، مع بعض اوراد و اشغال۔ (مطبوعہ)

(۷) النور والبہاء فی أسانید الحدیث و سلاسل الأولیاء. اسانید حدیث، سلاسل اولیا، بعض اوراد و ادعیہ۔

(۸) سراج العوارف فی الوصایا والمعارف. فقہ، کلام، حدیث، تصوف، سیر اور سلوک کے متفرق فوائد کا خزینہ۔ (مطبوعہ)

(۹) الجفر. علم جفر کا ایک خاص قاعدہ۔ (غیر مطبوعہ)

(۱۰) النجوم. علم نجوم سے متعلق وہ معلومات جن کا جاننا عامل و جفّار کے لیے ضروری ہے۔

(۱۱) اسرار برکاتیہ. آخری تصنیف مبارک، صدہا نکات و اسرار پر مشتمل۔ (غیر مطبوعہ)

(۱۲) تخییل نوری. عربی، فارسی، اردو اشعار کا مجموعہ (جو اتفاقیہ نظم ہوئے) (مطبوعہ) نورؔ اور نوریؔ تخلص فرماتے۔ چند اشعار یہ ہیں:

دور آنکھوں سے ہیں اور دل میں ہے جلوہ ان کا
ساری دنیا سے نرالا ہے یہ پردہ ان کا

حشر کے غم میں مبارک ہو عدو کو ماتم
عید ہے ہم کو کہ دیکھیں گے تماشا ان کا

نگاہوں میں سب ہیں جو پردے میں تو ہے
چھپے سب نظر سے کہ تو رو برو ہے
موحد ہیں نوؔر، اتحادی ہیں ملحد
نہ سب تو ہی تو ہے کہ بس تو ہی تو ہے

دل عشاق میں اے جاں مکیں کیوں نہ ہوئے
یہ بھی تو عرش ہے تم عرش نشیں کیوں نہ ہوئے
نام جب دیکھتے ہیں تیرا، خطوں میں عاشق!
رشک کرتے ہیں کہ قرطاس ہمیں کیوں نہ ہوئے
غم فُرقت کی بلاؤں میں پھنسا ہے نورؔی
حیف صد حیف کہ تم اس کے امیں کیوں نہ ہوئے

خلفا:

سید المشائخ کے خلفا پچاس سے زائد ہیں، یہاں چند اسماذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ-۱۳۴۰ھ)
(۲) حضرت سید شاہ مہدی حسن برکاتی قدس سرہ۔
(۳) سید شاہ ظہور حیدر مارہروی قدس سرہ (۱۸ر شعبان ۱۳۳۴ھ)
(۴) سید شاہ حامد حسن مارہروی قدس سرہ۔
(۵) سید ابن حسن مارہروی قدس سرہ (وصال یکم ربیع الاول ۱۳۴۷ھ)
(۶) سید شاہ اسمٰعیل حسن مارہروی قدس سرہ۔
(۷) سید شاہ فقیر عالم مارہروی قدس سرہ۔
(۸) حضرت سید محمد میاں اولاد رسول مارہروی قدس سرہ
(۹) مفتی اعظم حضرت علامہ شاہ مصطفےٰ رضا بریلوی قدس سرہ۔

عام حالات:

یہ خاندان عالی ہمیشہ اہل سنت کے مسلک محقق ومنقح کا پابند رہا ہے۔ اکابر خاندان خصوصاً سیدنا میر عبد الواحد بلگرامی قدس سرہ کی تصانیف جلیلہ سبع سنابل شریف وغیرہ اس پر روشن دلیل ہیں۔ وہابیت تو بعد کی پیداوار ہے۔ اور اس کی ضلالت اتنی عیاں ہے کہ کسی ولی اللہ کا اس سے تعلق ہونا ممکن نہیں۔ بعد کے اکابر خاندان نے اس فرقہ کے رد وابطال میں نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ خصوصاً فرقۂ تفضیلیہ کا رد بلیغ اس خاندان عالی کا مبارک شعار رہا ہے۔ جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تفضیلیہ کے بعض شبہات ایسے ہیں جن کا کما حقہ رد ان ہی سادات کرام کا حصہ ہے۔ مثلاً تفضیلیہ کا یہ کہنا کہ:

(۱) ہم اولاد علی ہیں۔ لہٰذا ان کی محبت فطری امر ہے اور یہ محبت ان کی تفضیل کی مقتضی ہے۔
(۲) جملہ سلاسل کے مرجع وہی ہیں۔ لہٰذا سب سے افضل وہی ہیں۔
(۳) فرزند کو اپنے پدر کی برتری ماننا بجا ہے۔
(۴) فضیلت نسب وغیرہ وغیرہ

اکابر مارہرہ قُدِّست اَسْرَارھُمْ جملہ اصول وفروع میں اہل سنت کے بالکل موافق ہیں۔ حتیٰ کہ یزید کے بارے میں بھی مسلک امام اعظم ہی کے قائل ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں خود شیخ المشائخ تحریر فرماتے ہیں: "دریں زمان مردمان اہل سنت وجماعت از محاورات رافضیاں وصحبت ایناں از حال امیر معاویہ وغیرہ صحابہ سوء ظن می دارند ایں خود رفض جلی است۔"[1]

ترجمہ: اس دور میں کچھ اہل سنت وجماعت رافضیوں کی صحبت اور ان کی باتوں سے متاثر ہوکر حضرت امیر معاویہ وغیرہ صحابہ کی بارگاہ میں سوء ظن رکھتے ہیں۔ یہ خود کھلا ہوا رفض ہے۔

سید المشائخ نے اس سلسلے میں محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا، بدایونی دہلوی قدس سرہ کی کتاب مبارک فوائد الفواد شریف سے سند بھی ذکر فرمائی ہے۔ حضرت نے مراسم تعزیہ داری کی بھی سخت تردید فرمائی ہے۔ اور اپنے جد امجد سید شاہ آل رسول مارہروی قدس سرہ کے ارشادات نقل کیے ہیں۔

یہ حضرات صرف فضیلت شیخین ہی نہیں بلکہ تفضیل سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھی قائل ومعتقد ہیں۔ سید المشائخ فرماتے ہیں:

آں کہ می داند کہ افضلیت بر ترتیب خلافت است غلط است، بلکہ خلافت بر ترتیب افضلیت است وہم چنیں

---

(۱) سراج العوارف، ص:۲۹

واقع شدہ، یعنی ہر افضل بر غیر خود در خلافت مقدم شد، بدلیل آں کہ افضلیت ایشاں بہ ہمیں ترتیب در عہد رسول ﷺ متحقق بود، حالاں کہ دراں زمانہ ہیچ یکے از ایناں خلیفہ نہ بودند۔ پس چوں بہ ترتیب معلوم بعد رسول اللہ ﷺ خلیفہ شدند بظہور پیوست کہ خلافت بہ ترتیب افضلیت واقع شد۔ نہ آں کہ افضلیت بہ ترتیب خلافت باشد۔ (۱)

ترجمہ: یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ افضلیت بترتیب خلافت ہے غلط ہے۔ بلکہ خلافت بترتیب افضلیت ہے۔ یعنی واقع ہوا ہے کہ ہر افضل خلافت میں غیر افضل سے مقدم ہوا، دلیل یہ ہے کہ ان حضرات کی افضلیت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اسی ترتیب پر متحقق تھی۔ جب کہ ان میں سے کوئی خلیفہ نہ تھا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ لوگ بترتیب معلوم خلیفہ ہوئے تو ظاہر ہوا کہ خلافت افضلیت کی ترتیب پر واقع ہوئی نہ یہ کہ افضلیت خلافت کی ترتیب پر رہی ہو۔

سید المشائخ نے ایک بار اپنے عقائد سے متعلق اشتہار شائع فرمایا۔ جس میں لکھتے ہیں:

"امابعد فقیر حقیر سید ابوالحسین احمد نوری الملقب بہ میاں صاحب قادری، برکاتی بخدمت کافۂ انام اہل اسلام و خصوص مریدان خاندان و مریدان ذات خاص یہ خطاب کرتا ہے کہ: عقیدہ اس فقیر کا اور اسلاف فقیر کا اور اساتذۂ فقیر کا وہی ہے جس کو فقیر بے سروپا "عَسلِ مصفّیٰ (۲)" اور "دلیل الیقین" میں ظاہر کر چکا۔ اب جو صاحب کہ خلاف اس کے ہوں فقیر ان سے بری ہے۔ وما علینا الا البلاغ. تحریر ۳؍ ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ از مقام گجرات، بڑودہ۔

خدام سے ارشاد ہوتا: کسی بدمذہب سے دوستی، بری بات اور حرام ہے۔ ان لوگوں کی مجالس مذہبی اور خاص صحبتوں میں ہرگز شرکت نہ کرو کہ کم از کم یہ مورث مداہنت وسستی اعتقاد ہے۔ سراج العوارف میں فرماتے ہیں:

واجب اول: تصحیح عقائد مطابق مذہب اہل سنت و جماعت کہ حق منحصر دراں است، بعزت و جلال خداوندی کہ ما و مشائخ ما و سائر اولیاے کرام در ظاہر و باطن و خلوت و جلوت بر مذہب اہل سنت و جماعت بودہ اند ہستند و خواہند بود، ہمبریں زئیم و ہمبریں میریم و ہمبریں برانگیختہ شویم، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ (ملخصًا)

ترجمہ: پہلا فرض: مذہب اہل سنت و جماعت کے مطابق عقائد درست کرنا کہ حق اسی میں منحصر ہے۔ خداے عزّ و جل کے عزّ و جلال کی قسم! ہم اور ہمارے مشائخ اور تمام اولیاے کرام ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت میں اسی مذہب اہل سنت و جماعت پر تھے اور ہیں اور رہیں گے۔ اسی پر جئیں گے، اسی پر مریں گے اور اسی پر اٹھیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

---

(۱) سراج العوارف

(۲) یہ رسالہ بزم قادری برکاتی کانپور سے شائع ہو گیا ہے۔ ۱۲

اعمال:

اس مختصر تحریر میں اعمال کی تصویرکشی سخت مشکل ہے مختصر یہ کہ ظاہر شریعت کی پابندی کے ساتھ طریقت و سلوک کی پابندیوں کے بھی حامل تھے۔ التزام شریعت کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) وقت بیعت نہ کبھی مریدہ کا ہاتھ چھوتے، نہ کبھی رُو برو آنے کی اجازت دیتے۔

(۲) آیات اسما لکھ کر چراغ جلانے کی اجازت نہ دیتے، فلیتہ میں صرف اعداد تحریر فرماتے۔

(۳) زبان سریانی کی وہ دعائیں عمل میں لاتے جن کے معانی معلوم ہوں۔ باقی سے ممانعت فرماتے۔

(۴) بعض مشائخ نے کچھ نقوش خون سے لکھنا تجویز کیے ہیں، سید المشائخ خون سے کبھی نہ لکھنے دیتے، مشک اور زعفران سے لکھتے۔

(۵) حمایت ظالم سے بہت بیزار تھے۔ حضرت کے مرید خاص مولوی غلام شبّر بدایونی علیہ الرحمۃ، اپنے ایک پیر بھائی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ غازی آباد ضلع میرٹھ میں ملازم تھے۔ ان پر مقدمہ فوج داری چلا۔ حضرت کی خدمت میں انھیں لے کر پہنچے، ابھی عرض حال کر ہی رہے تھے کہ حضرت لیٹے سے اٹھ بیٹھے، اور جلال میں فرمایا: تم لوگوں کو جس وقت کوئی ظاہری حکومت مل جاتی ہے تو خدا کو بھول جاتے ہو اور غربا پر سخت ظلم کرتے ہو۔ جب خدا پکڑتا ہے اس وقت فقرا کے پاس دوڑتے ہو۔ کیا یہ لوگ خدا کے پکڑے ہوئے کو بچا سکتے ہیں؟ کیا یہ کچھ زبان ہلا سکتے ہیں؟ اس معاملہ میں حکم ہو چکا، ظالم کو قید ہوگی۔ اب کیا کہتے ہو؟ مولوی غلام شبّر صاحب بعد میں حضرت سے اکیلے ملے۔ تو اب وہ غصہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی یہی فرمایا: بہت افسوس ہے کہ اس نے غریبوں پر بہت ظلم کیا۔ اور حکم سزا ہو گیا۔ مجبوری ہے۔ نتیجہ یہی ہوا کہ سخت کوشش کے باوجود سزا ہو گئی۔

دوسرا واقعہ موصوف ہی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت کے ایک مرید نے اپنے بعض اہل قرابت کی شکایت کرتے ہوئے درخواست کر ڈالی کہ کوئی ایسا عمل مرحمت ہو جس سے میرے مخالفین کو تکلیف پہنچے۔ فرمایا: متنازع فیہ معاملات میں ان کا کچھ شرعی حق ہے یا نہیں؟ بولے ضرور ہے، مگر اس پر تمادی قانون عارض ہے۔ عرصہ سے قبضہ نہیں۔ اتنا سننا تھا کہ جلال آگیا۔ فرمایا: فقرا ظالم کو بھی ایذا دینا گوارا نہیں کرتے۔ چہ جائے کہ صاحب حق کو طلبِ حق پر ایذا پہنچائیں۔ ہم سے کبھی ایسا سوال نہ کرنا۔

لکھتے ہیں کہ: خادم عاجز نے ہر چند کوشش کی کہ حضرت کا غصہ کم ہو جائے۔ لیکن جب کسی پہلو سے ان کا تذکرہ آتا فوراً ان کا وہ سوال یاد آجاتا۔ اور فرماتے: یہ وہی ہیں جنھوں نے ناجائز، خلاف شریعت درخواست کی تھی۔ اور اس

معاملہ میں ہم سے معاونت چاہی تھی۔ شیخ کی اس برہمی مزاج کا یہ نتیجہ ہوا کہ سائل مذکور تین برس سخت امراض میں مبتلا، محتاج ضروریات، صاحب فراش رہ کر انتقال کر گئے۔

سید المشائخ کو دینی کتابوں کے مطالعہ سے خاص شغف تھا۔ کوئی وقت بے کار نہ جانے دیتے۔ روزانہ اوراد اشغال حسب معمول رکھتے۔ خدام کی خبر گیری، سائلوں کی حاجت روائی، مہمانوں کا انتظام، تمام امور بخوبی وقت پر انجام پاتے۔ رب کریم نے وقت میں کافی برکت رکھی تھی۔ روزانہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور قلیل دائم کو پسند فرماتے۔ حافظ قرآن ہونے کے باوجود ہمیشہ دیکھ کر بآواز تلاوت کرتے، حروف و سطور پر انگلیاں بھی چلتی جاتیں۔ تاکہ زبان، آنکھ، کان، ہاتھ، سب برکتِ تلاوت سے بہرہ ور ہوتے جائیں۔ سہولت کے لیے ۲۳ منزلیں مقرر فرمائی تھیں۔ تاکہ روزانہ کچھ ہوتا رہے۔ پاروں کے بجائے سورتوں پر تلاوت ختم کرتے۔ سورۂ اعراف تک ایک ایک سورہ پر منزل کرتے پھر انفال و توبہ، پھر دو چار سورتوں کی ایک ایک منزل، پھر سورۂ قیامہ سے آخر قرآن تک ایک منزل۔[1]

اطوار طریقت میں بھی چند نمایاں باتیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) اخفائے حال حد درجہ تھا۔ تعلیم و ہدایت کے لیے اگر تذکرہ کرتے تو اس طرح کہ عام سامعین سمجھتے کسی دوسرے کا ذکر ہے مگر راز آشنا خدام اکثر سمجھ جاتے کہ خود اپنا تذکرہ فرما رہے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: مریدین حضور خاتم الاکابر قدس سرہ میں اس شخص کو جانتے ہیں کہ وہ نتیجۂ شغل میں اپنے جسد کو بے روح معاینہ کرتا۔ اور فلاں شغل کے زمانہ میں اس کو عالم ناسوت اس قدر تنگ اور مختصر نظر آتا کہ اگر چاہے ایک مشت دست میں لے لے۔

(۲) توحید میں حسب صوفیۂ کرام وحدتِ وجود کے قائل تھے۔ لیکن فرماتے یہ مسئلہ حالی ہے قالی نہیں۔ بطور قال وحدت شہود والوں کا مسلک خوب بیان ہو سکتا ہے البتہ اتحاد کے منکر تھے اور اتحادیوں سے بیزار۔ فرماتے ہیں:

موحد ہے نور، اتحادی ہے ملحد
نہ سب تو ہی تو ہے کہ بس تو ہی تو ہے

(۳) ہمہ وقت یاد الٰہی سے دل کو آباد رکھنا، فرماتے ہیں:

مدام بیاد الٰہی مشغول باشند، از خدا بجز خدا طلب نہ کنند، چوں خدا را یافت ہمہ اشیا را یافت۔ یک لمحہ از یاد او تعالیٰ غافل نہ مانند۔ "ترجمہ: ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہیں، اور خدا سے صرف خدا کو طلب کریں۔ جب خدا کو پا لیا سب پالیا۔ ایک لمحہ بھی یاد الٰہی سے غافل نہ رہیں۔

(۱) سراج العوارف

(۴) راضی بقضا ہونا: اپنے مرید خاص مولانا غلام شبّر بدایونی کے نام ایک خط میں بڑودہ سے تحریر فرماتے ہیں:

"اس سال سفر حج میں ہمارے خاص اعزہ تھے، حضرت پھوپھی صاحبہ مکرمہ، خالہ صاحبہ محترمہ، ہمشیرہ صاحبہ، یہ ب اسی سفر مبارک میں مقامات متبرکہ میں انتقال کر گئیں۔ رضينا بقضاء الله تعالىٰ. ہم یکہ و تنہا ہیں۔ "بڑا فر" درپیش ہے۔ دعا کرو انجام بخیر ہو۔

تصرفات و کرامات:

حضرت سید المشائخ قدس سرہ کو اگرچہ ہمیشہ اخفائے حال منظور و ملحوظ تھا۔ مگر کچھ حالات و اسباب ایسے درپیش ہوتے ہیں کہ کرامات و تصرفات کا انکشاف ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بہ طور نمونہ صرف دو واقعے درج کرتا ہوں:

ڈاکٹر محمد ناصر خان مارہروی کسی موضع میں بسلسلۂ علاج تشریف لے گئے تھے۔ ایک شخص نے ان کے یہاں حاضر ہو کر کہا قریب ہی ایک موضع میں ایک مریض کی حالت سخت خراب ہے آپ چل کر دیکھ لیں۔ معقول فیس بھی پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب اس کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ چند کوس چلنے کے بعد کنارۂ دریا پر واقع ایک وحشت ناک جنگل میں پہنچے۔ شخص مذکور نے یہاں تھم کر آواز دی اور فوراً دو شخص لاٹھیاں لیے ہوئے آ گئے۔ تینوں بدمعاشوں نے چاہا کہ ڈاکٹر صاحب کا سامان اور نقد چھین لیں اور قتل کر کے دریا میں ڈال دیں۔ ڈاکٹر صاحب کو سخت خوف لاحق ہوا، قریب الموت ہو گئے۔ حضرت سید المشائخ قدس سرہ کو دل میں یاد کر کے استغاثہ کیا کہ للہ مدد فرمائیے۔ اس خیال کے ساتھ ہی دیکھا کہ حضرت ایک جانب سے تشریف لائے اور اشارہ فرمایا: گھبراؤ نہیں ہم آ گئے۔ حضرت کے آنے سے وہ تینوں دفع ہو گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب پریشان تھے کہ اس اندھیری رات میں کہاں جاؤں۔ ارشاد ہوا ہمارے ساتھ چلے آؤ۔ تھوڑی دیر میں اسی آبادی کے قریب پہنچ گئے جہاں سے وہ بدمعاش لے گیا تھا۔ آبادی کے قریب پہنچ کر حضرت نے فرمایا تم آبادی میں چلو اور خود علیحدہ ہو گئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ شاید رفع حاجت کے لیے ٹھہرے ہیں۔ راستہ بھر ہیبت واقعہ کے سبب حضرت سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ گاؤں میں پہنچ کر سخت بخار اور غشی میں مبتلا رہے۔ دوسرے دن وہاں سے روانہ ہو کر اپنے گھر مارہرہ شریف پہنچے۔ معلوم ہوا کہ آج صبح سے کئی بار حضرت کے خادم آ کر دریافت کر گئے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب آئے یا نہیں۔ یہ بھی حکم ہے کہ آنے کے بعد فوراً خدمت اقدس میں حاضر ہوں۔ حسب حکم حاضر خدمت ہوئے۔ اور قدم بوس ہو کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے متبسمانہ ارشاد فرمایا: الحمد للہ انجام بخیر ہوا۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ بات قابل تذکرہ نہیں۔ عرض کیا اگر یہ قصہ اپنے دوستوں سے نہ کہوں گا مر جاؤں گا۔ فرمایا جب ہم مارہرہ سے چلے جائیں مختصراً کہنا۔ یہ تمھارا اعتقاد اور حضرات پیران سلسلہ کا کرم تھا۔

ایک بار شاہ جہاں پور حضرت سید المشائخ کی تشریف ارزانی ہوئی۔ ایک خادم کے مکان پر دعوت تھی۔ قریب ہی قاضی محمود رضا شیعی کا مکان تھا۔ یہ صاحب شاہ جہاں پور میں وکالت کرتے تھے۔ حضرت کی دعوت کا حال معلوم کر کے مشائخ پر طعن کیا۔ اور ان کے تصرفات سے منکر ہوئے۔ یہ بات حضرت تک پہنچی تو وکیل مذکور کو بلا کر ارشاد فرمایا: ہر چند کہ ہم میں قابلیت نہیں لیکن بزرگ خاندان سے منسوب ہیں۔ کہو کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے قلت آمد اور کثرت خرچ کا حال ذکر کر کے خرچ نہ چلنے کی شکایت کی۔ فرمایا: اچھا یہ نقش کھدوالو۔ یہ چراغ اس ترکیب سے جلاؤ، یہ پڑھو۔ تعمیل حکم پر ان کی آمدنی بڑے بڑے وکلا سے بڑھ گئی۔ اور فارغ البال ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد مطمئن ہو کر وظیفہ چھوڑ دیا۔ اور چراغ باندھ کر اندرونی دالان کے اندر ایک بلند طاق پر رکھ دیا۔ ایک دن علی الصباح ایک کوا آیا اور دالان میں جاکر چراغ اٹھالے گیا۔ ان کے کام کاوہی پہلے سا حال ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد سید المشائخ پھر شاہ جہاں پور میں رونق افروز ہوئے۔ تو وکیل مذکور حاضر ہو کر بکمال تواضع اس نقش کے طالب ہوئے، حضرت نے فرمایا: الحمد للہ تم نے اکابر مارہرہ کا تصرف دیکھ لیا۔ تم نااہل ثابت ہوئے اس لیے ہم معذور ہیں۔

اخلاق حسنہ:

سید المشائخ قدس سرہ کی سیرت میں یہ باب بہت وسیع ہے۔ اور حالات زمانہ کے پیش نظر اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے تفصیل سے بیان کیا جائے۔ لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ اعمال کی طرح اخلاق میں بھی التزام سنت آپ کی فطرت ثانیہ تھی۔ مساکین پر رحم، غربا کی قدر، امرا سے استغنا، سخاوت کا کمال؛ بخل سے ملال، اہل تعلق کا خیال وغیرہ اخلاق حسنہ کے جامع تھے۔ تبرکاً و تعلیماً چند واقعات بھی لکھے جاتے ہیں:

نذر و ہدیہ میں جو کچھ آتا صرف ہو جاتا۔ کبھی جمع کر کے نہ رکھتے۔ موروثی مکان کے حصہ سے دست بردار ہو گئے۔ فرمایا: ہمارے قیام کو خانقاہ شریف کافی ہے۔ کسی جگہ خود کوئی مکان تعمیر نہ کرایا۔ ایک سوداگر نے ایک عمدہ گھڑی نذر کی۔ صاحب زادہ صاحب کو پسند آگئی مگر سوچا کسی دوسرے وقت مانگ لوں گا۔ شام کو حضرت سے دریافت کیا، گھڑی کہاں ہے؟ فرمایا: وہ تو دے دی۔ تم نے اسی وقت کیوں نہ لے لی۔ اس طرح کے واقعات روزانہ پیش آتے۔ کبھی کچھ ذخیرہ نہ کرتے۔ غربا کی ہم نشینی محبوب تھی۔ جو شفقت و بے تکلفی ان کے حصہ میں آتی امرا اس سے محروم تھے۔ قبول دعوت میں امرا پر غربا کو ترجیح ہوتی۔ فرماتے: ہمارے فلاں خادم نے بڑے خلوص و کوشش سے سامان کیا ہے اس کی دل شکنی اور نقصان ہوگا۔ خاندان کے مرید امرا ہمیشہ کوشش کرتے کہ حضرت ان کے مکان پر رونق افروز ہوں۔ لیکن ان کے یہاں تشریف ارزانی کا اتفاق بہت کم ہوتا۔ جن امرا کو بیعت نہ ہوتی ان کے یہاں نہ

جاتے، ان کا نذرانہ نہ قبول کرتے۔

خانوادۂ برکاتیہ کے دیرینہ خادم سید سردار علی خاں صاحب کے یہاں ممبئی میں ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں سید المشائخ نام پذیر تھے۔ سید صاحب نے عرض کیا: بزرگان مارہرہ کے تصرفات میں نے بہت سنے ہیں لیکن آنکھوں سے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ حضور نظام بادشاہ دکن (میر محبوب علی خاں متوفیٰ ۱۹۱۱ء) میرے والد مرحوم اور مجھ سے ناخوش ہیں۔ آپ سے میری استدعا ہے کہ وہ بمبئی تشریف لائیں اور میرے مکان پر ٹھہریں، میری خطا معاف کریں۔ حضرت نے فرمایا ہم نے کب آپ سے کہا کہ ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ ہی نہیں۔ سید صاحب مصر ہوئے تو فرمایا: ممکن ہے کہ وہ بمبئی تشریف لائیں۔ اس میں کوئی تعجب بھی نہیں کیوں کہ وہ اکثر سیر و سفر کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی بعید نہیں کہ آپ کے مکان پر ٹھہریں۔ آخر آپ بھی معزز متوسل سلطنت ہیں۔ کچھ انتظار کیجیے۔ لیکن ضرور ہے کہ اگر نظام تشریف لائے اور آپ کے حسب مراد نتیجہ نکلا تو ہمارے ایک خادم کی سفارش کر دیجیے گا۔ سید صاحب نے وعدہ کر لیا۔ چند روز کے بعد سید صاحب کے نام بادشاہ دکن کا تار آیا۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے کوئی بزرگ تمھارے مکان پر تشریف فرما ہیں۔ تم انھیں لے کر فوراً حیدر آباد پہنچو۔ سید صاحب نے تار حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ارشاد فرمایا: جواب دے دو، فقیر کو حیدر آباد حاضری کی کوئی ضرورت در پیش نہیں۔ جلد وطن واپسی کا قصد ہے۔ یہ جواب دکن پہنچا تو وہاں سے دوسرا تار آیا کہ ہم خود بمبئی آتے ہیں۔ حضرت کو مقیم رکھو۔ نظام فوراً اسپیشل ٹرین سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب سید صاحب کو اطلاع روانگی کا تار ملا تو پورے مطمئن ہو گئے۔ اور سید المشائخ سے کیے ہوئے وعدے پر غور کرنے لگے۔ آخر یہ قصد کیا کہ حضرت کو کیا خبر ہوگی۔ عرض کر دوں گا کہ میں نے کہہ دیا۔ دوسرے دن تار پہنچا کہ حضور نظام بمبئی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ لیکن فلاں اسٹیشن سے بذریعہ اسپیشل ٹرین حیدر آباد کو واپس ہو گئے۔ یہ معلوم کر کے سید صاحب بہت مایوس ہوئے اور حاضر ہو کر عرض حال کیا۔ سید المشائخ نے ارشاد فرمایا: سید صاحب! فقیر کو آپ کی معاونت در کار نہیں۔ لیکن حال معلوم ہو گیا، خیر چندے اور انتظار کیجیے، نظام ضرور تشریف لائیں گے۔

کچھ وقفہ کے بعد نظام تشریف لائے۔ اور سید صاحب کے اسی مسافر خانہ میں ٹھہرے جس میں سید المشائخ فروکش تھے۔ دوسرے دن بادشاہ نے ایک مصاحب کے ذریعہ خدمت اقدس میں استدعا بھیجی کہ سلام کو حاضر ہونا چاہتا ہوں، تخلیہ کی ضرورت ہے۔ حضرت نے جواب دیا فقیر ہر وقت تخلیہ میں ہے۔ میرے یہاں حاجب و دربان نہیں، نہ کسی آنے والے کے لیے روک ٹوک ہے ہر شخص کو اجازت ہے۔ جس وقت چاہیں تشریف لائیں۔ نظام آئے بکمال ادب ملے اور حضرت کے پائیں چار پائی پر بیٹھے۔ حضرت نے کرسی طلب فرمائی اور یہ کہہ کر باصرار اس پر بٹھایا

کہ آپ سلطان اسلام ہیں۔ ہر مسلمان کو آپ کی عزت کرنا ضروری ہے۔ مزاج پرسی وغیرہ کے بعد نظام نے عرض کیا۔ میں حضور کو حیدر آباد چلنے کی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ فرمایا: مجھ کو وطن میں کچھ ضرورتیں ہیں۔ اس وقت معذور ہوں۔ فرمائیں کہ اس تکلیف سفر کی وجہ اور فقیر سے کیا غرض ہے؟

نظام نے عرض کیا کہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خانوادۂ برکاتیہ میں دعاے سیف الرحمٰن ہے اور حضور اس کے حاکم ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اجازتِ دعا مرحمت ہو۔ فرمایا: یہ سچ ہے کہ میرے گھر میں دعا ہے۔ نیز اپنے اکابر سے مجھ کو اجازت ہے، اور میں پڑھتا ہوں۔ لیکن یہ چیز فقرا کے کام کی ہے، بادشاہوں کے لائق نہیں۔ دعا ترک خلائق چاہتی ہے اور آپ کے دامن دولت سے ایک عالم وابستہ ہے۔ تاہم مجھ کو دعا کی اجازت دینے میں کوئی عذر نہیں۔ اگر صرف اجازت قراءت درکار ہے، میں اجازت دیتا ہوں آپ پڑھیے۔ اگر باقاعدہ اجازت عمل مطلوب ہو تو آپ کو تکلیف ہوگی۔ اس دعا کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ طالب، اجازت دینے والے کے پس پشت کھڑا رہے۔ یہ سن کر حضور نظام فوراً حضرت کے پس پشت کھڑے ہوگئے۔ سید المشائخ نے وظائف میں سے دعاے سیف الرحمٰن نکال کر قراءت فرمائی۔ درمیان قراءت بادشاہ کو رعشہ پیدا ہو گیا تھوڑی دیر بیٹھ گئے۔ پھر باادب کھڑے ہوگئے۔ حضرت نے دعا ختم کر کے حسب قاعدہ خرقہ کے ساتھ حضور نظام کو مرحمت فرمائی۔

بادشاہ نے آداب عرض کر کے شکریہ ادا کیا اور ایک بڑی شاندار نذر پیش کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا: میرے آباو اجداد قدست اسرارہم مریدوں سے نذر لیتے تھے۔ اور میں بھی لیتا ہوں۔ لیکن آپ مرید نہیں۔ اور آپ نے مجھ سے دعاے یمانی (اسی دعا کا ایک نام یہ بھی ہے) کی اجازت لی ہے۔ فقیر دعا کو فروخت نہیں کرتا۔ اب یہ قیمت دعا ہو جاتی ہے۔ اگر طلب دعا سے پہلے فقیر کو کچھ مرحمت ہوتا، عذر نہ ہوتا کہ شاہان اسلام فقرا پر مہربانیاں کرتے اور ان کے مصارف کی کفالت فرماتے رہے ہیں۔ لیکن میں اس شاہانہ عطیہ کے قابل نہیں ہوں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ البتہ فاتحہ اکابر شرط اجازت ہے۔ اپنے خادم سے فرمایا: شیرنی حاضر ہوگئی۔ حضرت نے فاتحہ کی اور اس میں سے ایک حصہ سلطان کو بھی مرحمت فرمایا۔ حضور نظام نے بکمال ادب و اخلاص حصہ لیا اور اسی وقت تناول فرمایا جو قطعاً دستور سلطنت کے خلاف تھا۔

اس واقعہ سے کئی سبق حاصل ہوتے ہیں:

(۱) بادشاہ دکن میر محبوب علی خان نظام حیدر آباد کو سلطنت اور علو مرتبت کے باوجود مشائخ کرام کے ساتھ حد درجہ اخلاص و ادب ملحوظ تھا۔

(۲) انھوں نے ایک فقیر کی بارگاہ میں حاضری دی تو آج کے لوگوں کی طرح کسی دنیاوی غرض کے طالب نہ

ہوئے، بلکہ فیض و دعا کے طالب ہوئے۔

(۳) اپنے دولت کدہ پر سید المشائخ کی حاضری کے لیے مصر نہ ہوئے بلکہ ضرورت تھی تو خود حاضر ہوگئے۔

(۴) سید المشائخ کو درباروں کی حاضری سے گریز تھا۔

(۵) غیر مرید سے نذر قبول نہ فرمائی۔

(۶) نظام کی آمد، واپسی، پھر آمد وغیرہ میں حضرت کے تصرف کو ضرور دخل تھا۔ بایں ہمہ اخفاے حال کے لیے حتی الامکان کوشاں رہے۔

(۷) سید سردار علی خاں رئیس بمبئی کے اخلاص کا امتحان ہوجانے کے باوجود انھیں نظر انداز نہ کیا بلکہ معافی ان کی استدعا پوری کی۔ اور نظام سے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ سید سردار علی خاں جو آپ کا نمک خوار قدیم ہے اس کی خطا معاف کی جائے۔ حسب حکم حضور نظام نے خطا معاف کر کے انھیں اپنی ملازمت میں لے لیا۔

ضروری نوٹ: مسترشد کی عظمت سمجھنے میں عظمتِ مرشد کی معرفت بھی درکار ہوتی ہے۔ اسی لیے برادر گرامی مولانا عبد المبین نعمانی زید فضلہ وفیضہ رکن المجمع الاسلامی مبارک پور و صدر المدرسین دار العلوم قادریہ چریاکوٹ نے راقم الحروف سے تذکرۂ سید ابوالحسین احمد نوری کے عنوان پر کچھ لکھنے کا حکم دیا۔ افسوس کہ مجھے فرصت بہت کم رہتی ہے۔ اور وقت میں برکت کا بھی وہی حال معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ہفتہ عشرہ بدایوں، اور مارہرہ شریف میں قیام کر کے خود حضرت سید المشائخ کی تصنیفات اور دیگر مراجع و مآخذ سے استفادہ کرتا تو اس مضمون کی شان کچھ اور ہی ہوتی۔ سلسلہ کے کوئی فاضل اس طرف توجہ کریں اور جدید طرز پر ایک ضخیم سوانح مرتب کریں، تو ان کا بڑا کرم ہوگا۔ جو پی ایچ ڈی کرنے والے اپنے مقالۂ تحقیق کا موضوع حضرت سید المشائخ اور اکابر مارہرہ کی شخصیات کو منتخب کریں تو یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے۔ میں نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس میں خاندانی حالات تاج العلما حضرت مولانا سید محمد میاں برکاتی، مارہروی قدس سرہ کی اصح التواریخ (۱۳۴۷ھ) سے اور سید المشائخ قدس سرہ کے حالات ان کے قریبی خادم مولانا غلام شبّر بدایونی کی "نور مدائح حضور" سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب پروفیسر محمد ایوب صاحب کے تحشیہ و تقدیم سے ۱۹۶۸ء میں مکتبۂ علویہ رضویہ کراچی سے پہلی بار تذکرۂ نوری کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ وہی نسخہ راقم کے پیش نظر تھا۔ جہاں تک ہو سکا اختصار در اختصار کی کوشش کی ہے۔ اصل مقصود عام قارئین کی تعلیم وافادہ ہے۔ خدا کرے یہ مقصد بر آئے اور یہ حقیر کاوش بارگاہ کریم میں بارِ قبول پائے۔ آمین

صدر العلماء علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی(۱)

حضرت ممدوح کو صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، آپ کے جلیل القدر رفقاے درس میں چند نمایاں حضرات کے اسماے گرامی یہ ہیں:

۱۔ ابوالفضل مولانا سردار احمد گورداس پوری علیہ الرحمہ محدث اعظم پاکستان
۲۔ ابوالفیض حافظ ملت مولانا عبد العزیز مراد آبادی علیہ الرحمہ، شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ مبارک پور
۳۔ مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمہ، رئیس اعظم اڑیسہ
۴۔ شمس العلماء مولانا قاضی شمس الدین احمد جعفری جونپوری علیہ الرحمہ
۵۔ شیخ العلماء مولانا غلام جیلانی اعظمی علیہ الرحمہ
۶۔ خیر الاذکیاء مولانا غلام یزدانی اعظمی علیہ الرحمہ
۷۔ مفتی اعظم کانپور مفتی رفاقت حسین مظفر پوری علیہ الرحمہ
۸۔ مولانا محمد سلیمان اشرفی بھاگل پوری علیہ الرحمہ
۹۔ مفتی عبد الرشید خاں فتح پوری علیہ الرحمہ

میں یہاں حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کی کچھ وہ خوبیاں ذکر کروں گا جن میں آپ کے رفقاے درس بھی شریک ہیں اور کچھ وہ جو خاص آپ سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱) حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے استاذ مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری کو علامہ فضل حق خیر آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے استاذ حدیث حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی علیہ الرحمہ کا سلسلۂ حدیث دو واسطوں سے مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ تک پہنچتا ہے۔ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کو ارادت اور خلافت و اجازت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ سے حاصل تھی اور فتویٰ نویسی اعلیٰ حضرت ہی سے سیکھی تھی۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا ایک سلسلۂ تلمذ بحر العلوم علامہ عبد العلی فرنگی محلی علیہ الرحمہ سے

(۱) صدر العلماء محدث میرٹھی، حیات و خدمات، جلد اول، ادارہ ترویج و اشاعت مسجد نور الاسلام بولٹن، ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

بھی ملتا ہے، اس لحاظ سے صدر الشریعہ کی ذات تیرہویں صدی ہجری کے تینوں علمی مراکز خیر آباد، دہلی اور فرنگی محلی کا سنگم تھی اور ان کے تلامذہ ان تینوں اسکولوں کے علمی فیضان سے بہرہ ور تھے۔

(۲) صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے اس وقت جو نصاب درس رکھا تھا اس میں تینوں اسکولوں کا عکس صاف نمایاں تھا۔ صحاح ستہ کی تعلیم کے ساتھ فن حدیث کے نکات اور احادیث کریمہ سے مستنبط فقہی مسائل پر محدثانہ اور ماہرانہ گفتگو رہتی تھی۔ فقہ میں ہدایہ کی چار جلدیں مکمل پڑھائی جاتی تھیں۔ معقولات کی بھی بہت ساری کتابیں شامل نصاب تھیں مثلاً سلم العلوم اور اس کی شروح ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک وغیرہ، اسی طرح رسالہ میر زاہد، ملا جلال، علامہ دوانی کے حواشی قدیمہ و جدیدہ، فلسفہ میں صدرا، شمس بازغہ، پھر امور عامہ، تحریر اقلیدس اور خیالی، شرح مواقف، شرح مقاصد، حواشی ملا عبد الغفور وغیرہ بر شرح جامی۔ الغرض مختلف علوم و فنون کی منتہی اور مشکل کتابیں جن کی صورت اور نام سے بھی موجودہ طلبہ اور علما کم ہی آشنا ہوتے ہیں۔ پھر ان کتابوں کی جتنی مقدار پڑھائی جاتی تھی آج کے دور میں اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ جو طلبہ ایک سال میں قدوری ختم نہیں کر پاتے اور جو اساتذہ چھ ماہ میں کبھی ہدایۃ النحو یا کافیہ مکمل نہ کرا سکے ان کے لیے یہ اندازہ لگانا انتہائی دشوار ہے کہ اب سے پچھتر (۷۵) سال پہلے ہدایہ، مشکاۃ اور جلالین جیسی ضخیم کتابیں پوری پوری کیسے پڑھی پڑھائی جاتی تھیں۔

غور کیا جائے تو اب اس نصاب کی نصف کتابیں رہ گئی ہیں اور مقدار تعلیم کے لحاظ سے نصف کا نصف بلکہ بعض کتابوں کا ربع (چوتھائی حصہ) بھی باقی نہ رہا۔ اس کے ساتھ ابناے زمانہ کی جد و جہد یہ ہے کہ نصاب کی کچھ کتابیں کم کر کے عصری علوم سائنس، حساب، جغرافیہ وغیرہ کو شامل کیا جائے۔ اس تجویز پر کسی حد تک عمل بھی ہوا ہے مگر مزید مانگ جاری ہے۔

علما کا لقب ان حضرات کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا اور آج کے فارغین کے ساتھ بھی یہی ٹائٹل لگا ہوا ہے۔ بلکہ ٹائٹل کے معاملے میں ہم ان سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ اُس وقت "مولوی" کہنے میں بھی اعزاز سمجھا جاتا تھا مگر اب کسی فاضل کو مولوی فلاں کہہ دیں تو وہ اپنی تحقیر سمجھے گا۔ اسٹیجوں کے اناؤنس سنیے تو ہر کس و ناکس کے لیے مولانا کے ساتھ علامہ کا بھی پیوند سنائی دے گا کیوں کہ اس کے بغیر اکرام و اعزاز میں کمی کا خدشہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن پہلے دور کا کوئی عالم اگر آج اٹھ کر آ جائے تو کسی کو "مولوی" ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہوگا۔ اگرچہ بزعم خویش کوئی "علامہ" سے کم نہیں۔

بس مجھے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کا جو دور تعلیم تھا وہ اتنا بلند و بالا تھا کہ اِس دورِ انحطاط میں اس کا صحیح اندازہ بھی مشکل ہے۔

(۳) حضرت ممدوح اور ان کے رفقائے کرام علیہم الرحمہ میں دہلی، خیرآباد اور فرنگی محل کی درس گاہوں کے فیوض اور ان کی خصوصیات جمع تھیں اور آج نظر اٹھا کر دیکھیے تو پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی درس گاہوں میں اکثر وبیشتر علما وہی ملیں گے جن کا علمی سلسلہ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے ان ہی تلامذہ تک پہنچتا ہے۔ اس لحاظ سے میں کہتا ہوں کہ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی علمی درس گاہ سے ان رفقائے کرام کی جماعت ایسی باکمال اور بافیض نکلی جس نے اپنے استاذ اور ان کے علمی سلسلوں کا فیضان ہر طرف عام کیا اور اس دور انحطاط میں بھی دینی علوم کی آبرو باقی رکھی۔ آج برصغیر سے باہر بھی جو دینی اداروں اور تنظیموں کی چہل پہل نظر آرہی ہے وہ ان ہی حضرات کی کیمیا اثر نگاہوں کا ثمرہ ہے۔

اب آیئے، ہم خود حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کی کچھ خصوصیات پر نظر ڈالیں۔

(۱) مجھے یاد آتا ہے کہ مبارک پور میں دار العلوم اشرفیہ کا جلسۂ دستار بندی تھا، حضرت ممدوح بھی مدعو تھے اور ان کے رفیق درس مولانا محمد سلیمان اشرفی بھاگل پوری، سابق استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور بھی۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ کے زمانے میں امتحان سالانہ کے لیے ان رفقائے کرام میں سے دو تین حضرات ضرور مدعو ہوتے تھے بلکہ کبھی زیادہ بھی ہوتے۔ مولانا محمد سلیمان اشرفی علیہ الرحمہ نے رات کے اجلاس میں ایک مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے فرمایا کہ پہلے مولانا سید احمد اشرف کچھوچھوی علیہ الرحمہ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے متعلق فرماتے تھے کہ "یہ علم کی لائبریری ہیں۔" اور اب میں مولانا غلام جیلانی صاحب کے متعلق کہتا ہوں کہ "یہ علم کی لائبریری ہیں۔"

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری علیہ الرحمہ نے صدر الشریعہ کے نام اپنے ایک مکتوب ۲۰ر ستمبر ۱۹۳۲ء میں لکھا ہے: "اس وقت سنی حنفی کوئی مدرس ایسا نہیں ہے جو معقول و منقول صحیح استعداد کے ساتھ پڑھا سکتا ہو، میرے علم میں مولانا (وصی احمد) محدث سورتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور استاذ (مولانا ہدایت اللہ رام پوری) علیہ الرحمہ کے آپ ہی یادگار ہیں۔"

مولانا سید سلیمان اشرف علیہ الرحمہ بڑے بڑے کج کلاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اگر حدیث و فقہ کے کسی معرکۃ الآرا مسئلہ میں بحث ہو رہی ہے اور کوئی تاریخ داں "علامہ" درمیان میں بول پڑے تو منہ پر برملا جھڑک کہہ دیتے کہ "آپ سیرت اور تاریخ دیکھیے، یہ مسئلہ آپ کے بولنے کا نہیں۔" اس لحاظ سے صدر الشریعہ علیہ الرحمہ سے متعلق ان کا جملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح حضرت ممدوح علیہ الرحمہ سے متعلق ان کے ایک رفیق درس کا جملہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ دار العلوم فیضیہ نظامیہ باراہاٹ، بھاگل پور کے ایک اجلاس میں حافظ ملت نے مولانا محمد سلیمان بھاگل پوری علیہ الرحمہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا: "یہ ایک متبحر اور زبردست عالم ہیں، انھوں نے

جو کتابیں پڑھی ہیں وہ آج کے لوگوں نے دیکھی بھی نہیں ہیں۔ "ضلع کے عوام تو انھیں بس ایک مولانا اور ایک زمین دار اور رئیس کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن ان کی امتیازی حیثیت سے حافظ ملت نے لوگوں کو روشناس کرایا اور بہت کچھ بتایا۔ یہ پینتیس سال پہلے کی بات ہے۔

معاصرین کی شہادت بجائے خود بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لحاظ سے مولانا بھاگل پوری کے ارشاد کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ممدوح کو علم و فن سے کیسا شغف اور کیسا زبردست علمی استحضار تھا کہ انھیں "علم کی لائبریری" کہنا راست اور بجا نظر آیا۔

(۲) حضرت ممدوح نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ آپ کے علمی تبحر کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ بخاری شریف کی شرح صرف باب بدء الوحی کی شائع ہوئی ہے اور تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف علوم و فنون کے جواہر زواہر ہیں۔ ساتھ ہی عربی زبان میں فیض الباری کا زبردست علمی تعاقب بھی ہے۔ فن نحو میں آپ کو امامت کا درجہ حاصل تھا۔ البشیر الکامل، بشیر الناجیہ اور البشیر کے ذریعہ آپ نے اس فن کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور ایسی نادر تحقیقات پیش کی ہیں جو عام متداول کتابوں میں نظر نہیں آتیں، ساتھ ہی مدرسہ دیوبند کے بلند بانگ مسند نشینوں کی جو خبر گیری کی ہے وہ ان مسند نشینوں کے علمی افلاس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

عوام کے لیے لکھی ہوئی کتاب "نظام شریعت" بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتی ہے۔ مسائل کی تفہیم کے ساتھ واعظانہ اور ناصحانہ اسلوب بھی دل چسپ ہے۔

(۳) سمنانی کتب خانہ کے ذریعہ آپ نے بیش قیمت اشاعتی کام انجام دیا ہے۔ فلسفۂ قدیمہ کے رد میں امام احمد رضا قدس سرہ کا رسالہ "الكلمة الملهمة فی الحكمة المحكمة لوَهَاء فلسفة المشئَمة" (۱۳۳۸ھ) پہلی بار اسی کتب خانے سے شائع ہوا۔ اس کتاب نے فلسفہ کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ زبردست محقق اور ماہر علوم علامہ شبیر احمد خاں غوری نے اسے عہد حاضر کا "تہافت الفلاسفہ" قرار دیا ہے۔ مگر اس میں بے شمار تحقیقات وہ بھی ہیں جو رد فلسفہ کی قدیم کتابوں میں دستیاب نہیں۔ ابطال جزء لایتجزی پر فلاسفہ کی بیشتر دلیلوں سے قدیم کتابیں خاموش نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر ان کے براہین ہندسیہ کا کوئی جواب نہ دیا گیا، لیکن "الكلمة الملهمة" نے ہندسی، غیر ہندسی کوئی دلیل سلامت نہ رکھی اور ایک ایک کر کے ساری دلیلوں کو باطل کر دیا۔

فتاویٰ رضویہ دوم، انوار آفتاب صداقت، الصبح المنير، كفاية المتحفظ وغیرہ بہت سی علمی کتابیں آپ نے شائع کیں، یہ اس دور کی بات ہے جب کتابت، تصحیح، طباعت، اشاعت کی راہ میں دشواریاں آج کی بہ

نسبت کئی گنا زیادہ تھیں اور پورے ملک میں دو چار کتب خانے تھے جو اپنی چند کتابوں پر قانع اور زیادہ اشاعت سے قاصر تھے۔ خریداری کافی صد بھی افسوسناک حد تک کم تھا۔

(۴) مدرسۂ سمنانی میرٹھ میں آپ صدرالمدرسین تھے اور منتہی کتابوں کا درس دیتے تھے، مگر طلبہ کو دستار فضیلت یا سند فضیلت دینے میں بڑے سخت اصول پر کاربند تھے۔ پورے دور تدریس میں شاید دو بار آپ نے فارغین کو دستار دی ہے۔ وہ یہ فرماتے تھے کہ جب تک معقولات و منقولات کی تمام نصابی کتب پڑھنے کے ساتھ طالب علم ان کے پڑھانے پر بھی قادر نہ ہو جائے وہ دستار کا اہل نہیں ہوتا۔ وہ دیوبند کے اس رویے سے سخت نالاں تھے کہ جو آیا دورۂ حدیث میں اس کا داخلہ لے لیا اور دو چار کتابوں کا دور کرا کے سند فضیلت عطا کر دی۔ وہ فرماتے تھے کہ جاہلوں کو سند دے دے کر ان لوگوں نے علم اور علما کا وقار ملیامیٹ کر دیا۔

(۵) حضرت ممدوح اپنے رفقا اور معاصرین کے بھی قدر داں تھے۔ حافظ ملت کا بھی محبت سے ذکر کرتے تھے۔ مولانا رحمت اللہ عزیزی بلرام پوری نے انوار القرآن بلرام پور سے حضرت مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کے زمانۂ صدارت میں فراغت حاصل کی۔ اس سے قبل میرٹھ میں حضرت ممدوح سے تعلیم حاصل کی۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ صدر العلما علیہ الرحمہ حافظ ملت کا ذکر خیر کرتے اور فرماتے کہ زمانۂ طالب علمی میں ہم لوگوں کے بعض اوقات تفریح کے لیے خاص تھے۔ کبھی کبھی ہم لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے مگر حافظ صاحب ہم لوگوں کی ایسی مجلس میں کبھی شریک نہ ہوئے۔ وہ مطالعہ سے خالی ہوتے تو قرآن مجید کی تلاوت کرتے یا استاذ کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہاں کمرے کی صفائی، لالٹین کی صفائی، کمرے کی چیزوں کو سلیقے سے رکھنا، وقت پر جو کام نظر آتا وہ کرتے، کبھی یہ سب ہو چکا ہوتا اور وقت خالی بچتا تو دیواروں کی صفائی میں لگ جاتے، گرد و غبار، دھبّے وغیرہ صاف کرتے، ہنسی مذاق میں شریک نہ ہونے پر خفا ہو کر ایک ساتھی نے حافظ صاحب کا کمرہ باہر سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی کہ نکلنے کے لیے جب کھلوائیں گے تو خوب مزہ آئے گا، انھوں نے کمرے میں بیٹھ کر تلاوت شروع کر دی، بند کرنے والا انتظار کرتے کرتے خود ہی اکتا گیا اور کنڈی کھول کر کہیں چلا گیا۔

(۶) میرٹھ میں ان کے قیام سے گرد و نواح میں بلکہ پورے مغربی یوپی میں اہل سنت کا ایک علمی دبدبہ قائم تھا۔ دیوبند کی باتیں ان تک پہنچتی رہتی تھیں اور وہ جواب دیتے تھے۔ اہل دیوبند اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے سے عاجز ہیں اس لیے ہمیشہ جھوٹ اور غلط پروپیگنڈہ سے اپنا کام چلاتے ہیں اور اہل سنت کو جاہل بتاتے ہیں۔ حضرت ممدوح جس زمانے میں البشیر الکامل لکھ رہے تھے ایسا ہی ایک طعن جہالت ان کے کانوں تک پہنچا تو البشیر الکامل کا ایک مقدمہ لکھا، جس کی سرخی ہے "دیوبندی ترکیب کی خامیاں"۔ اس میں حضرت نے دیوبند کی علمی تشہیر کا پردہ اچھی طرح چاک کیا ہے۔ افسوس کہ ان کے بعد میرٹھ یا اس کے اطراف میں حضرت کا کوئی علمی جانشین نہ رہا۔

الغرض وہ بہت سی خصوصیات کے حامل تھے۔ ایک زمانے تک ان کا فیض ابر کرم بن کر برستا رہا اور ان شاء اللہ ان کا علمی فیضان ان کی تصانیف اور ان کے تلامذہ کے ذریعہ آئندہ بھی برستا رہے گا۔ ربّ کریم ان کے مرقد پر رحمت و انوار کی بارش فرمائے اور ہم سب کو توفیق خیر سے نوازے۔ آمین

❁❁❁❁❁❁

علامہ مفتی احمد یار خاں بدایونی علیہ الرحمہ[۱]

(۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء - ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء)

حضرت علامہ مفتی احمد یار خاں علیہ الرحمہ برصغیر ہندو پاک کی ان مقتدر شخصیتوں میں سے ہیں جن کے دم سے علم و عمل کی بہاریں قائم ہیں۔ اور اپنے پیچھے جنھوں نے عظیم تصنیفی سرمایہ چھوڑا۔ ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قابل قدر اُن کا وہ خلوص عمل اور جذبۂ دل ہے جس نے دین کی خاطر انھیں زندگی بھر متحرک وفعّال رکھا۔

وہ تنہا تھے، مگر ان کی گوناگوں خوبیوں، اور عظیم کارناموں کے پیش نظر بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک فعال اکیڈمی، اور ایک زندہ تنظیم کی حیثیت رکھتے تھے۔

ولادت ونسبت:

وہ ماہ شوال ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں بمقام اوجھانی ضلع بدایوں (یو، پی) پیدا ہوئے۔ اوجھانی ریلوے اسٹیشن بدایوں شہر سے تیرہ کلو میٹر دوری پر واقع ہے۔ اُن کا خاندان یوسف زئی پٹھان قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس کے کچھ افراد غالباً مُغل دور میں افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔

اُن کے والد گرامی ملا محمد یار خاں بن منور خاں بستی کے معزز شخص تھے۔ دینداری، اور نماز و جماعت کی انتہائی پابندی ان کا نشانِ زندگی رہا۔ اپنے گھر ہی پر فارسی کی ابتدائی تعلیم کا مکتب قائم رکھا تھا۔ جس میں بستی کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ بہت سے ہندو بھی ان کے شاگرد تھے۔

تعلیم:

(۱) مفتی صاحب نے بھی قرآن مجید، دینیات، فارسی، اور درسِ نظامی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے پائی۔

(۲) (تقریباً ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) گیارہ برس کی عمر میں اوجھانی سے نکل کر بدایوں شہر کے مدرسہ شمس العلوم میں داخل ہوئے، وہاں تین سال (۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء تا ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) پڑھتے رہے۔ اُس وقت وہاں علامہ قدیر بخش بدایونی مدرس تھے۔ اسی دوران ایک بار امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کی زیارت کے لیے بریلی شریف

(۱) مرآۃ المناجیح شرح مشکوۃ المصابیح، مطبوعہ کان پور، سنہ اشاعت ندارد

حاضری دی۔ فرماتے ہیں:

"میری عمر اُس وقت کوئی دس بارہ کے لگ بھگ ہوگی، اور میں بدایوں میں تھا۔ اُن دنوں ۲۷ر رجب قریب تھی۔ اور اعلیٰ حضرت کے ہاں تقریب معراج کی تیاریاں زوروں پر تھیں، آپ اس تقریب کے لیے بڑا اہتمام فرماتے۔ اس مصروفیت کے باعث ہمیں صرف ایک مجلس میں حاضری نصیب ہو سکی جس میں اعلیٰ حضرت کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔"[۱]

(۳) بدایوں کے بعد حضرت مفتی صاحب نے ریاست مینڈھو میں والیان ریاست کے قائم کردہ ایک دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ مفتی صاحب کے دورِ طالب علمی میں یہ مدرسہ دیوبندی مسلک کا حامل تھا۔ اور اس کے اثرات مفتی صاحب پر بھی مرتب ہوئے تھے۔ مینڈھو ہی کے دور طالب علمی سے متعلق خود فرماتے ہیں:

"دیوبندی اساتذہ کے پاس ایک عرصہ تک پڑھنے سے میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ علمی تحقیق کا کمال تو بس اسی گروہ میں پایا جاتا ہے لیکن جب صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی قدس سرہ سے ملاقات ہوئی، اور انھوں نے مجھے اعلیٰ حضرت کا ایک رسالہ "عطَایا القدیر فی حُکمِ التَّصوِیر" مطالعہ کے لیے دیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے مذکورہ رسالے کا مطالعہ کیا تو میں اس کے لکھنے والے کے تبحر علمی اور دِقّتِ نظر کے کمال کا گرویدہ ہوگیا۔ سچ یہ ہے کہ اس رسالے نے میری ذہنی اور اعتقادی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔"[۲]

مینڈھو میں مفتی صاحب کی طالب علمی کا زمانہ قریباً چار برس رہا۔ مفتی صاحب کے والد عقیدۃً متصلّب سنی تھے، انھیں اس مدرسہ میں اُن کا رہنا پسند نہ ہوا۔ ان دنوں مفتی صاحب کے ایک چچا زاد بھائی کی مراد آباد میں ملازمت تھی۔ ایک بار وہ گھر آئے تو مفتی صاحب پر زور ڈالا کہ آپ میرے ساتھ مراد آباد چل کر صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب قبلہ سے ملاقات کریں۔ مفتی صاحب ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔

(۴) صدر الافاضل نے مفتی صاحب سے امتحانی سوالات کیے، اور ان کے صحیح جوابات سے خوش ہوئے۔ پھر مفتی صاحب جامعہ نعیمیہ میں داخل ہوگئے۔ انھیں صدر الافاضل خود درس دیتے۔ مگر صدر الافاضل کی مصروفیات گوناگوں تھیں، جس سے مفتی صاحب کے اسباق کا ناغہ ہونے لگا۔ اسی لیے ایک بار وہ مراد آباد سے چل کھڑے ہوئے۔ صدر الافاضل کو معلوم ہوا تو انھیں واپس بلوایا اور علامہ مشتاق احمد کان پوری کو بلا کر استاذ رکھا۔ موصوف معقولات وریاضیات کی تعلیم کے ماہر تھے۔

(۱) قاضی عبد النبی کوکب شاگرد مفتی احمد یار خاں علیہ الرحمہ، حیاتِ سالک، ص:۲۷

(۲) ایضاً، ص:۲۸، و ص:۱۱۸

(۵) تھوڑے عرصے کے بعد علامہ موصوف میرٹھ تشریف لے گئے تو مفتی صاحب صدر الافاضل کی اجازت سے ان کے ساتھ وہیں منتقل ہو گئے، ان کا یہ آخری تعلیمی دور تین برس رہا ہوگا۔

بیس برس کی عمر میں میرٹھ ہی سے سند فراغت حاصل کی، حضرت صدر الافاضل نے دستار فضیلت باندھی۔ مفتی صاحب کے چچا زاد بھائی جناب عزیز خاں مرحوم نے ایک فارسی قطعۂ تاریخ میں ان کا سال فراغت لَقَد فَازَ فَوْزاً عظِیماً مستخرج کیا تھا۔

طرز تعلم: مفتی صاحب کا طرزِ تحصیل وہی تھا جو ایک سچے خواستگارِ علم کا ہونا چاہیے۔ آنے والے ہر سبق کا شب میں بڑی محنت و جاں فشانی سے مطالعہ کرتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ چراغ کے لیے مدرسہ سے ملا ہوا تیل نصف شب تک ختم ہو جاتا تو وہ گلی میں لگی ہوئی بتی کی روشنی میں جاکر کتاب دیکھتے۔ ایک بار رات کو طلبہ کے شور وغل کے سبب مطالعہ نہ کر سکے، صبح کو سبق سمجھ میں نہ آیا تو مضطرب ہو گئے۔ استاذ گرامی کو معلوم ہوا تو ان کی قیام گاہ الگ کر دی، اور سبق میں باوضو شرکت کرنے کی ہدایت فرمائی۔ مفتی صاحب نے ہمیشہ اس کی پابندی کی۔

سبق پڑھنے کے بعد تکرار سبق کی بھی پابندی کرتے۔ اور اس طرح کہ استاذ کی پوری تقریر رفقائے درس کو سنا دیتے۔ مزید اعتراضات و جوابات بھی پیش کرتے ہیں۔ کہیں شبہہ ہوتا تو استاذ کی مجلس میں حاضر ہو کر رفع شکوک کرا لیتے۔ اگر ان کی بیان کردہ بات غلط ثابت ہوتی تو ساتھیوں میں آکر اس کا برملا اعتراف کرتے۔ اس سلسلے میں خود فرمایا کرتے: "میں جب تک اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کر لیتا میرے ذہن میں ایک ہیجانی کیفیت برپا رہتی ہے۔"

دور تدریس: (۱) دستارِ فضیلت باندھنے کے بعد ہی حضرت صدر الافاضل نے جامعہ نعیمیہ میں مفتی صاحب کو تدریسی خدمات سپرد کر دیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مفتی صاحب کی تدریسی قابلیت لوگوں کے سامنے نمایاں ہو گئی اور افتا کی خدمت بھی انھیں کے سپرد کر دی گئی۔

(۲) قریبًا ایک سال بعد درالعلوم مسکینیہ دھوراجی (گجرات) سے صدر الافاضل کے پاس ایک ایسے عالم دین کے لیے درخواست آئی جو تدریس، فتویٰ اور خطابت وغیرہ کی خدمات عمدہ طریقے سے انجام دے سکیں، حضرت صدر الافاضل نے مفتی صاحب کو وہاں بھیج دیا، اس دارالعلوم میں مفتی صاحب نے نو سال تک دینی خدمات انجام دیں، متعدد بار دورۂ حدیث کرایا، اور بیسوں طلبہ ان کی درس گاہ فیض سے فارغ التحصیل ہوئے۔

ایک مرتبہ مدرسہ مسکینیہ مالی مشکلات کا شکار ہوا اور مفتی صاحب کو کچھ دوسری پریشانیاں بھی لاحق ہوئیں، جن کے باعث مدرسہ چھوڑ کر اپنے وطن اوجھانی چلے گئے اور صدر الافاضل کو خط لکھ دیا۔

(۳) صدر الافاضل نے دوبارہ انھیں جامعہ نعیمیہ میں بلا کر تدریسی خدمات سپرد کر دیں۔

(۴) قریبًا ایک سال پھر وہاں مدرس رہے ہوں گے کہ شیخ المشائخ حضرت شاہ سید علی حسین صاحب اشرفی میاں علیہ الرحمہ نے مدرسہ اشرفیہ کچھوچھہ شریف کے لیے صدالافاضل سے ایک قابل مدرس طلب کیا، صدر الافاضل نے وہاں مفتی صاحب کو بھیج دیا، انھوں نے یہاں ربیع الاول ۱۳۳۵ھ/۱۹۳۵ء سے جمادی الآخرہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۸ء تک علمی و دینی خدمات انجام دیں، پھر بعض وجوہ کی بنا پر مدرسہ چھوڑ کر اپنے وطن اوجھانی چلے گئے اور صدر الافاضل کی خدمت میں اطلاع بھیج دی۔

(۵) اس کے بعد صدر الافاضل نے علامہ سید ابوالبرکات علیہ الرحمہ (م ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء) کی وساطت سے مفتی صاحب کو بھکھی ضلع گجرات (پاکستان) میں مولانا سید جلال الدین شاہ کے دارالعلوم میں روانہ کیا، مگر مفتی صاحب کو یہاں کوئی دلبستگی نہ پیدا ہو سکی، اس لیے وہ لاہور پہنچ کر وطن جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

(۶) مگر سید محمود شاہ رحمۃ اللہ علیہ، سید ابوالبرکات صاحب قبلہ کی وساطت سے مفتی صاحب کو انجمن خدام الصوفیہ (گجرات پاکستان) کے دارالعلوم کے لیے آمادہ کر کے گجرات لے گئے، پھر وہ گجرات کے اور گجرات ان کا ہو گیا۔ علم المیراث کے علاوہ مفتی صاحب کی تمام تصنیفات اسی دارالعلوم میں تصنیف ہوئیں اس لیے یہ دور اہم خصوصیت کا حامل ہے۔

شعر و سخن:

شعر و سخن سے مفتی صاحب کو تعلق تھا، سالک تخلص فرماتے تھے، ان کا مجموعۂ کلام "دیوان سالک" کی شکل میں پاکستان سے شائع ہو چکا ہے، فن شعر سے ان کی وابستگی کا واقعہ بھی خاصا دلچسپ ہے، ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۵ء میں جب وہ کچھوچھہ شریف شیخ الحدیث کی حیثیت سے پہنچے تو حکیم سید نذر اشرف صاحب فاضلؔ سے ملاقات کے لیے گئے، حکیم صاحب نے ابتدائی ذکر و تعارف کے بعد برملا سوال کیا "آپ کو شعر و سخن سے بھی لگاؤ ہے؟" مفتی صاحب نے نفی میں جواب دیا تو بولے "آپ نصف عالم معلوم ہوتے ہیں"، حکیم صاحب کی یہ بات اس انداز سے مفتی صاحب کے دماغ پر چھا گئی کہ انھوں نے باقاعدہ فن شعر گوئی کی تحصیل کی اور حکیم صاحب سے برابر اصلاح لیا کرتے، اس طرح جلد ہی ایک باکمال شاعر بھی ہو گئے۔ [1]

بیعت و ارادت:

مفتی صاحب نے حضرت صدرلافاضل سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل کیا اور خلافت حضرت مولانا الحاج سید شاہ محی الدین اشرف عرف اچھے میاں علیہ الرحمہ سے پائی۔ شیخ المشائخ حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ

(۱) سید حسن مثنی انور، ماہ نامہ المیزان کچھوچھہ شریف، شوال ۱۳۹۱ھ، نومبر ۱۹۷۱ء، اداریہ۔

سے بھی براہ راست اکتساب فیض کیا تھا۔ اگر چہ اس کی مدت پانچ ماہ سے زیادہ نہ رہی (کیوں کہ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ میں مفتی صاحب کچھوچھہ تشریف لائے اور ۱۱ر رجب ۱۳۵۵ھ کو اشرفی میاں علیہ الرحمہ کا وصال ہوگیا) لیکن اس کے باوجود حضرت کی نگاہ میں مفتی صاحب کا ذوق عرفان ایسا راسخ ہوچکا تھا کہ آخری غسل اور تجہیز وتکفین کے لیے حضرت مفتی صاحب ہی کو سربراہ بنانے کی وصیت فرمائی، یہ ایک ایسا اعزاز تھا جس پر اکابر علما و مشائخ دم بخود تھے۔

خانگی زندگی:

مفتی صاحب کی شادی ان کے دھوراجی کے زمانۂ قیام میں شیخوپور ضلع بدایوں کے ایک معزز افغان خاندان میں عبداللطیف خاں کی صاحب زادی سے ہوئی، خطبۂ نکاح حضرت صدرالافاضل نے پڑھا، مفتی صاحب کی تمام اولاد ان ہی معزز خاتون کے بطن سے ہیں، یہ نہایت دین دار، نیک دل اور پارسا خاتون تھیں، خانگی مصروفیات اور نماز وعبادت کے ساتھ محلے کے بچے بچیوں کی ابتدائی تعلیم کا کام بھی کرتیں، مفتی صاحب کے فرائض منصبی کا انھیں اچھی طرح احساس تھا اس لیے تمام تر گھریلو ذمہ داریاں خود سنبھالتیں اسی لیے مفتی صاحب کے لیے گھر کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا، یہ اپنے آبائی وطن سے ہزاروں میل دور مفتی صاحب کے ساتھ گجرات میں بھی رہیں اور وہیں ۲۳ر مئی ۱۹۴۹ء کو اس دار فانی سے رحلت کی، ان کی جدائی کا مفتی صاحب کو بے حد قلق رہا۔

ایک عرصے کے بعد احباب کے مشورے اور اصرار پر حضرت مفتی صاحب نے گجرات ہی میں دوسرا نکاح کیا، یہ خاتون بھی نیک نفس اور دین دار تھیں، ان کے بطن سے مفتی صاحب کی کوئی اولاد نہ ہوئی مگر پہلی اہلیہ کی اولاد ہی کو انھوں نے اپنی پیٹ کی اولاد مانا۔

مفتی صاحب کے دو صاحب زادے ہیں مولانا مفتی مختار احمد خاں اور مفتی اقتدار احمد خاں، ہر دو حضرات دینی خدمات میں مصروف اور اپنے والد گرامی کے کے لائق جانشین ہیں، چار صاحب زادیاں ہوئیں، جن میں دو منجھلی صاحب زادیاں فوت ہوگئی تھیں۔

مفتی صاحب نے اپنے لڑکے لڑکیوں کو بھی علم وفن سے آراستہ کیا اور ان کی مذہبی تربیت کی طرف بھی پوری توجہ صرف کی، زندگی کے آخری سالوں میں انھیں یہ احساس زیادہ ستانے لگا تھا کہ خواتین میں علم دین کا فقدان ہوتا جارہا ہے، اس لیے انھوں نے خواتین کو دینی تعلیم دینے والی ایک ٹیم خود اپنے گھر میں پیدا کردی، اپنی بڑی بہو اور چھوٹی صاحب زادی کو مشکاۃ وبخاری کا ترجمہ چار سال میں پڑھایا، صرف ونحو کے ضروری قواعد اور عربی بول چال کی کچھ مشق بھی کراتے رہے، انھیں وعظ کہنے کا بھی طریقہ سکھایا، آگے چل کر ان بیٹیوں نے دیگر خواتین اور طالبات کی کلاسیں لگا کر انھیں پڑھانا شروع کیا، یہ طریقہ اس قدر فیض رساں ثابت ہوا کہ مفتی صاحب کی وفات تک چار سو

بچیاں اور خواتین ان کے گھر سے اس "مدرسہ دینیات" میں پڑھ کر فارغ ہوچکی تھیں۔

ان احوال کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ مفتی صاحب کا گھر اس قرآنی دعا کا ثمرہ یا نمونہ ہے۔ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا. اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا بنا۔

معمولاتِ زندگی:

مفتی صاحب کے اعمال واشغال، تدریس، تصنیف، مطالعہ، درس قرآن، عبادات، تلاوت، اخبار بینی، تفریح ملاقات وغیرہ تھے۔ ان تمام کاموں کے لیے انھوں نے اپنے اوقات کو بڑے سلیقے سے تقسیم کر رکھا تھا اور ہر کام کو اس کے مقررہ وقت پر ہی انجام دیتے، نماز وجماعت کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ تکبیرۂ اولیٰ فوت نہ ہونے دیتے، سفر وحضر ہر حالت میں تہجد بھی پڑھا کرتے۔ اکثر وبیشتر درود شریف کا ورد کیا کرتے۔ یہ ان کے لیے روحانی غذا کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں ذرا موقع پاتے درود کا ورد جاری کر دیتے، یہاں تک کہ گفتگو کے دوران جب ان کا مخاطب بات کرتا تو اس وقفے میں وہ درود پڑھ لیا کرتے۔

زیارت روضۂ اقدس سے بھی اُن کو خاص شغف تھا۔ زندگی میں پانچ بار حج وزیارت سے شرف یاب ہوئے۔ ایک بار دھوراجی کے زمانۂ قیام میں اور چار بار گجرات کے دور میں۔ عوامی زندگی سے بھی اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت وحکمت کے ملے جلے انداز میں کلام کرتے۔ لوگوں کے ماحول پر نظر رکھتے۔ اور ان کی اصلاح وہدایت کی طرف توجہ مبذول فرماتے، عوامی تقریبات کی شرکت میں بھی پیش قدمی کرتے اور مُسرفانہ وغیر شرعی رسوم سے لوگوں کو روکتے۔ مفتی صاحب کی بے نظیر کتاب "اسلامی زندگی" اُن کے اسی ذہن وفکر کی آئینہ دار ہے۔ لوگوں کے آپسی تنازعات کا تصفیہ کرنے میں بھی ان کو خداداد ملکہ حاصل تھا، لوگ آپس میں لڑ کر کٹنے مرنے کے لیے آمادگی کی حالت میں ہوتے، لیکن جب معاملہ مفتی صاحب کی "عدالت" میں پہنچتا تو ایسا شاندار فیصلہ فرماتے کہ فریقین خوش ہوکر آپس میں مل جل کر زندگی گزارنے کا حوصلہ لے کر اٹھتے۔

تلامذہ:

مفتی صاحب نے ۱۳۴۴ھ تا ۱۳۹۱ھ تقریباً نصف صدی کارِ تدریس انجام دیا۔ اس مدت میں نہ جانے کتنے افراد نے اُن سے تحصیلِ علم کی ہوگی۔ یہاں چند تلامذہ کے اسما "حیات سالک" سے پیش کیے جاتے ہیں۔

مولانا سید مختار اشرف کچھوچھوی عرف محمد میاں مدظلہ۔ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، لاہور۔ مولانا آل حسن

اشرفی نعیمی سنبھل، بھارت۔ مولانا عبد الکریم صاحب، ملفت گنج، بنگلہ دیش۔ مولانا عبد القدیر صاحب، چٹاگانگ۔ صاحبزادہ مفتی مختار احمد خاں نعیمی۔ صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خاں نعیمی۔ قاضی عبد النبی کوکب۔ مولانا لیاقت حسین صاحب، بنگلہ دیش۔ مولانا مسعود الحسن صاحب، چورہ شریف۔ مولانا سید جلال الدین شاہ صاحب، بھکھی گجرات۔ مولانا ریاض الحسن صاحب، سنبھل بھارت۔ مولانا نذر محمد صاحب، خطیب سلانوالہ۔ مولانا محمد ادریس صاحب، ماریشس افریقہ۔ مولانا غلام علی صاحب، اوکاڑوی۔ مولانا سید غنی شاہ صاحب، گجرات۔ مولانا حامد علی شاہ صاحب، چورہ شریف۔ مولانا سید محمود شاہ صاحب، گجرات۔ مولانا حکیم غلام سرور صاحب، سرگودھا۔ مولانا سید فضل شاہ صاحب، گجرات۔ مولانا نذیر حسن صاحب، خطیب شاہدولہ گجرات۔ مولانا عبد اللطیف صاحب، خطیب سائیں کانواں والا۔ سید محمد قاسم صاحب، خطیب ہری امام راولپنڈی۔ مولانا محمد بشیر ضیائی، خطیب اوقاف گجرات۔ مولانا حافظ غلام محی الدین سائل فاروقی۔ مولانا زاہد صدیقی، لاہور۔

تصنیفات:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے بعد تصنیف و تالیف کے ذریعہ آپ نے دین متین کی جو زریں خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اب تک جن کتابوں کی اطلاع ہو سکی ہے ان کی فہرست مع مختصر تعارف پیش کی جاتی ہے۔

(۱) علم المیراث: علم فرائض اور قانون وراثت میں ہے۔ یہ مفتی صاحب کی پہلی تصنیف ہے جو ۱۳۵۲ھ میں دھوراجی کے زمانۂ قیام میں ظہور پذیر ہوئی۔ پہلے اس کا گجراتی ایڈیشن شائع ہوا پھر اردو۔

(۲) شان حبیب الرحمن بآیات القرآن: اُن آیات قرآنیہ پر مختصر بحث کی گئی ہے جن سے صراحۃً نعت سرور کائنات علیہ الصلوات والتحیات ثابت ہوتی ہے۔ چھوٹے سائز میں ضخامت قریباً ۴۵۰ صفحات ہے۔ ۱۸/ جمادی الاولیٰ تا ۳/ شعبان ۱۳۶۱ھ صرف ڈھائی ماہ میں تصنیف ہوئی۔ پھر محرم ۱۳۶۵ھ میں ایک ضمیمہ شان اولیا و شہدا میں لکھا گیا جو در حقیقت شانِ مصطفیٰ ہی ہے علیہ وعلیہم الصلوۃ والسلام۔

(۳) جاء الحق اوّل: اہل سنت اور وہابیہ کے درمیان مختلف فیہ عقائد و معمولات پر فیصلہ کن کتاب ہے۔ ہر مبحث میں دو باب ہیں۔ باب اول میں مسلک اہل سنت کا قرآن و حدیث، اجماع و قیاس اور اقوال علما وغیرہ سے اثبات ہے۔ پھر باب دوم میں اس پر اعتراضات اور ان کے شافی جوابات تحریر کیے گئے ہیں، اس کی تکمیل ۶/ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ کو ہوئی۔ سال ابتدا معلوم نہ ہو سکا، بعد میں "قہر کبریا بر منکرین عصمت انبیا، تلاقی الأدلة فی حکم الطلاق الثلثة۔ اور لمعات المصابیح علی رکعات التراویح مستقل تین رسائل اور بہت سے دلائل

کا مختلف مقامات پر اضافہ ہوا، پوری کتاب قریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴) سلطنتِ مصطفیٰ: موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ذی قعدہ ۱۳۶۲ھ میں لکھی گئی۔ جاء الحق کے طرز پر ہے، قریباً اسی صفحات ہیں۔

(۵) رحمتِ خدا بوسیلۂ اولیا: بطرز جاء الحق مسئلۂ استمداد و توسُّل پر مفصل بحث۔

(۶) رسالۂ نور: سرور عالم ﷺ کے نور ہونے کا ثبوت۔ جاء الحق کے طرز پر ہے، ربیع الاول ۱۳۷۵ھ میں تصنیف کی گئی۔ رحمتِ خدا، رسالۂ نور، سلطنت مصطفیٰ تینوں کی ضخامت قریب قریب ہے۔

(۷) امیر معاویہ پر ایک نظر: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت کا اظہار و اثبات۔ اور ان پر کیے جانے والے رافضیانہ اعتراضات کے جوابات۔ ۲۱/ رجب تا ۹/ شعبان ۱۳۷۵ھ صرف ۱۹/ دن میں تصنیف ہوئی۔ تقریباً سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۸) جاء الحق دوم: احناف اور غیر مقلدین کے درمیان مختلف فیہ مباحث پر مفصل تصنیف۔ حصۂ اول کے طرز پر پہلے مسلکِ احناف کا اثبات پھر اعتراضاتِ غیر مقلدین کے جوابات ہیں۔

(۹) اسلامی زندگی: شادی بیاہ، ختنہ، عقیقہ، وغیرہ مختلف تقریبات میں رائج رسوم کا تفصیلی ذکر کر کے ان کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں۔ پھر ان کا جائز اور اسلامی طریقہ بتایا گیا ہے۔ ۲/ صفر تا ۲۲/ صفر ۱۳۶۳ھ صرف ۲۵ دن میں تصنیف ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات ہیں۔ غیر شرعی اور مُسرفانہ رسم و رواج کے رد اور اصلاح میں بے مثال کتاب ہے۔

(۱۰) اسرار الاحکام بانوار القرآن: مختلف اسلامی مسائل کی عقلی حکمتیں سوال و جواب کے انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ ۲۱/ جمادی الاولی تا ۲۵/ جمادی الآخرہ ۱۳۶۸ھ ایک ماہ پانچ دن میں تصنیف ہوئی، تقریباً پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۱) مواعظ نعیمیہ: (۳ حصص) مفتی صاحب کی مختلف تقریروں کا مجموعہ۔ تین جلدوں پر مشتمل ہے، کل قریباً پانچ سو صفحات ہیں۔

(۱۲) نئی تقریریں: مواعظ نعیمیہ کے بعد تازہ تقاریر کا مجموعہ۔ ڈیڑھ سو صفحات ہوں گے۔

(۱۳) سفرنامۂ ایران، عراق، حجاز و شام وغیرہ: اُس موقع پر لکھا گیا جب خشکی کے راستے سے حج کے لیے گئے۔

(۱۴) سفرنامۂ حجاز: (۱) سفر حجاز کی علیحدہ یادداشت۔

(۱۵) سفرنامۂ حجاز: (۲) آخری حج کی ڈائری۔ شاید یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

(۱۶) الکلام المقبول فی طهارة نسب الرسول: موضوع نام سے ظاہر ہے۔

(۱۷) فتاوی نعیمیہ: مفتی صاحب کے فتووں کا مجموعہ، ۱۳ تا ۱۷ چاروں کتابیں میری نظر سے نہیں گزریں۔

(۱۸) نعیم الباری فی انشراح البخاری: بخاری شریف پر عربی حاشیہ۔ غیر مطبوع ہے۔

(۱۹) نور العرفان فی حاشیۃ القرآن: قرآن مجید پر مختصر اور جامع تفسیری حواشی۔ ترجمۂ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ہندو پاک میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں آیات سے ثابت و مستنبط عقائد و مسائل کی ایک فہرست بھی شامل ہے۔

(۲۰) تفسیر نعیمی: "اشرف التفاسیر" (۱۳۶۳ھ) مفتی صاحب کی شاہکار تصنیف۔ دس پاروں کی تفسیر دس جلدوں میں مکمل ہے۔ گیارہویں پارے میں آیت کریمہ اَلا اِنَّ اَوْلِیاءَ اللہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْہِم وَلاھُم یَحزَنُونَ کی تفسیر مکمل لکھ چکے تھے اس کے چند دنوں بعد وصال فرما گئے۔ یہ تفسیر طبع ہو چکی ہے۔ مطالب اعلیٰ اور علمی، زبان عام فہم، فرق باطلہ اور غیر اسلامی مذاہب کا رد بھی ہے۔ آیات و سُور کا باہمی ربط بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تصنیف ۱۳۶۳ھ میں شروع ہوئی، اسی لحاظ سے اس کا تاریخی نام "اشرف التفاسیر" ہے۔[۱]

(۲۱) مرآۃ المناجیح اردو شرح مشکوٰۃ المصابیح: مفتی صاحب کا دوسرا شاہکار۔ احادیث مشکوٰۃ شریف کا لفظی ترجمہ، پھر ان کی آسان شرح، عقائد و مسائل کا دلکش بیان، آٹھ یا نو جلدوں میں مکمل۔ آٹھ جلدیں پاکستان سے شائع ہو چکی ہیں۔[۲]

(۲۲) درس القرآن: چند آیتوں کی تفسیری تقریریں، تقریباً ۲۵۰ صفحات پر مطبوعہ ہیں۔

(۲۳) علم القرآن لترجمۃ الفرقان: دور حاضر کے گمراہ فرقوں کے غلط تراجم قرآن کے پیش نظر قرآنی اصطلاحات کا محققانہ بیان، پھر قواعد ترجمہ اور مسائل قرآنیہ کا ذکر۔ ترجمہ قرآن کے شائقین اس کا مطالعہ ضرور کریں۔ ۲۲ر رمضان ۱۳۷۱ھ کو اس کی تصنیف کا آغاز ہوا اور ۵ر ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ کو ایک ماہ بارہ دن میں مکمل ہوئی۔ قریباً سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے"۔

اکثر نصابی کتب پر حواشی — سب غیر مطبوعہ ہیں۔

وفات: مفتی صاحب نے قریباً نصف صدی دینِ حق کی اعلیٰ خدمات میں صرف کی۔ اخیر ایام زندگی میں وہ بیمار ہو کر لاہور ہسپتال میں داخل ہوئے۔ مگر ان کا مرض ختم نہ ہوا۔ آخر ۳ر رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو گجرات میں ان کا وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر اس کمرے میں بنائی گئی جہاں انھوں نے کئی برس درس قرآن دیا تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسِعۃً وکثرأمثالھم۔

❁❁❁❁❁❁

(۱) ہندوستان میں اس کی تمام جلدیں مکتبہ الحبیب الہ آباد کے زیر اہتمام طبع ہو رہی ہیں۔ ۱۲ نعمانی غفرلہٗ

(۲) ہندوستان میں اس کی اشاعت کا سلسلہ پہلی بار ادارہ استقامت، کانپور نے شروع کیا ہے۔ پہلی جلد ہدیۂ ناظرین ہے دیگر کا پروگرام ہے۔ منہ

مولانا حافظ عبد الرؤف علیہ الرحمۃ اور سنی دار الاشاعت[۱]

باسمہ وحمدہٖ والصلوٰۃ علیٰ نبیہٖ وجنودہٖ

جامع معقول و منقول علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی ثم مبارک پوری علیہ الرحمۃ گوناگوں خوبیوں کے مالک اور مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے، ان کے فضائل و کمالات کی تصدیق کے لیے سب سے نمایاں اور تشفی بخش ثبوت یہ ہے کہ ان کی علمی و فنی مہارت کا چرچا صرف ان کے تلامذہ کی زبانوں پر نہیں بلکہ ان کے اساتذہ اور ان کے وہ اکابر جن سے موصوف کو رشتۂ تلمذ بھی نہیں اور ان کے معاصرین (جب کہ معاصر اپنے معاصر کے کمال کا اعتراف بآسانی نہیں کرتا) سب کے سب ان کے زمانۂ حیات ہی سے ان کی علمی برتری، فنی مہارت، تدریسی کمال، انتظامی و تعمیری فکر و تدبر اور قومی و ملی دل سوزی و محنت کا برملا ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں جاننے پہچاننے والے کم تھے اس لیے کہ ان کی زندگی پر سادگی، کم گوئی، جلسوں اور تقریروں سے کنارہ کشی اور نمود و ریا کے ہر دل کش موقع سے دوری کی دبیز چادر پڑی ہوئی تھی، اس لیے ان کو سمجھنا اُن عوام اور کم سواد علما کے بس کی تو بات ہی نہ تھی جن کے نزدیک ظاہر کی دل کشی ہی سب کچھ ہے۔

مجھے ان کی شخصیت سے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ باآں فضل و کمال ان کی یہی سادگی و بے نفسی ہے اور بھی چند باتیں ہیں جن سے میں بہت متاثر ہوں، ان ہی امور کا تذکرہ یہاں مقصود ہے۔

(ا) وہ دار العلوم اشرفیہ میں نائب شیخ الحدیث تھے، صدارت حافظ ملت علیہ الرحمۃ کی تھی لیکن تعلیمی نظم و نسق زیادہ تر حضرت حافظ جی[۲] علیہ الرحمۃ سے ہی متعلق تھا۔ اس خصوص میں ان کا کمال یہ تھا کہ طلبہ کے معاملات تو فیصل کرتے ہی تھے مگر مدرسین کے درمیان بھی کوئی اختلاف، شکر رنجی اور بد مزگی نہ پیدا ہونے دیتے، جہاں چند ہم پایہ اساتذہ ہوں کچھ باہمی اختلاف و رنجش بعید نہیں لیکن کم از کم اتنا میں پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمۃ کی حیات تک اساتذہ کا کوئی اختلاف طلبہ کی نظروں تک نہ آسکا اور گروپ بندی کا تو کسی طالب علم کو

(۱) تذکرہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی، از مولانا قمر الحسن بستوی، المجمع الاسلامی، محمد آباد، جنوری ۱۹۹۳ء

(۲) اس وقت طلبہ، مدرسین اور اہل مبارک پور میں اسی لقب سے وہ معروف تھے۔ ۱۲ مصباحی

وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں حافظ ملت کے مشروط استعفا کے بعد ایک اختلاف کھل کر سامنے آیا لیکن یہ تعطیلات کے زمانہ میں ہوا، اگرچہ آرا کا یہ تعارض مشتہر ہو گیا لیکن استعفا کی نامنظوری اور حافظ ملت کی واپسی کے بعد سارے معاملات اپنی رَوِش پر آ گئے اور ۱۹۷۱ء تک اساتذہ میں رواداری، عالی ظرفی، صلح و آشتی، مفادِ ادارہ کے لیے ذاتی جذبات و خواہشات کی قربانی، باہمی شکوہ و شکایات اور نمایاں اختلاف اور غیظ و غضب سے کنارہ کشی کی روایات پوری طرح برقرار رہیں، لیکن حافظ جی علیہ الرحمۃ کے وصال کے بعد خود حافظ ملت کی نگاہوں تک ایسے معاملات آئے جو عالی ظرفی، رواداری اور مفادِ ادارہ سے ہمدردی کے نقطۂ نظر سے طلبہ کے سامنے بھی نہ آنا چاہیے تھے کیوں کہ ہر سطحیت اور پستی فکر و عمل کا ان کے ذہن پر بھی اثر پڑتا ہے جو ان کے مستقبل کے لیے خطرناک اور مضر ہوتا ہے۔

جن مدارس میں اساتذہ کے درمیان اتفاق و اتحاد ہو وہاں طلبہ کے اندر بھی اساتذہ کا ادب و احترام نظر آئے گا۔ اصول و ضوابط کی پابندی، کردار و عمل کی درستی زیادہ ہوگی، لیکن جہاں اساتذہ میں عداوت و اختلاف برپا ہو وہاں طلبہ کی آوارگی، قانون شکنی، اعلیٰ کردار و عمل سے دوری، تعلیم و تعلم سے بیزاری، اساتذہ کی گستاخی و بے ادبی، بلکہ ان کے درمیان مزید اشتعال انگیزی اور خود طلبہ کی گروپ بندی وغیرہ کے مناظر آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نکتہ کوئی ایسا باریک نہیں جس سے کسی ادارہ کے اساتذہ بے خبر ہوں۔ لیکن طلبہ، ادارہ اور تعلیم کی خاطر اپنے شعلہ زن جذبات کو برف آلود کرنا بڑا زہرہ گداز عمل ہے۔ اپنی تسکینِ اَنا کے لیے ہر وسیع تر مفاد قربان ہو سکتا ہے لیکن قومی مستقبل کی تعمیر کے لیے اپنے مفاد کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمۃ اس خطرناک فکر و عمل سے زندگی بھر نبرد آزما رہے اور انھوں نے اپنی بے پناہ صلاحیت و مقبولیت کے اثر سے اپنے رفقا اور متعلقین کو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر گامزن رکھا۔

(۲) وہ اپنے اصول کے بڑے پابند تھے، درس و مطالعہ کی پابندی کے علاوہ اپنے اوپر کچھ اور پابندیاں بھی انھوں نے لگا رکھی تھیں مثلاً یہ کہ بازار سے سودا خود خریدتے، غلہ، سبزی، ترکاری کا تھیلا خود اپنے کاندھے پر گھر تک لے جاتے، اس زمانہ کے بعض طلبہ کا بیان ہے کہ ہم نے حضرت کو غلّے کا تھیلا لے کر جاتے دیکھا، ہر چند کوشش کی کہ ہمارے حوالے کر دیں مگر کامیابی نہ ہوئی، ان کا یہ عمل صرف ماہ، دو ماہ، یا سال، دو سال پر مشتمل نہ تھا، بلکہ مبارک پور میں ان کی ساری زندگی اسی شکل میں دیکھی گئی۔

(۳) وہ اپنے اساتذہ کے ادب شناس اور فرماں بردار تھے خصوصًا حافظ ملت علیہ الرحمۃ کے ساتھ ان کی خیر خواہی، اخلاص و ہمدردی اور وفاداری اپنی مثال آپ ہے۔ حافظ ملت علیہ الرحمۃ جب مبارک پور چھوڑ کر ناگ پور تشریف لے گئے تو تعلیم کے لیے حافظ جی علیہ الرحمۃ بھی وہیں پہنچے۔ حافظ ملت نے جب اشرفیہ کو وسیع پیمانے پر لے جانا چاہا اور مشکلات حائل دیکھ کر بجائے مبارک پور کے کسی دوسرے شہر کا انتخاب کیا تو حافظ جی علیہ الرحمۃ نے حافظ

ملت اور اشرفیہ دونوں کی ہمدردی کا حق ادا کر دیا۔ اپنے جملہ رفقا کو ہم خیال بنا کر ایسی سرگرم کوششیں کیں جن کے نتیجے میں حافظ ملت کو کہیں اور جانے کا خیال ترک کرنا پڑا اور مبارک پور ہی کی سرزمین آج حافظ ملت کے اس عظیم ادارہ کی امین بن کر سرفراز ہے۔

(۴) وہ اپنے احباب و رفقا کے معاون و مددگار بھی تھے، علمی مسائل اور درسی اشکالات کے حل میں وہ اشرفیہ کے اساتذہ اور دیگر بلند پایہ علما کی دست گیری میں ضرب المثل تھے۔ فتاویٰ کے سلسلہ میں حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ طلبہ کی موجودگی میں بے تکلف ان سے رجوع کرتے اور وہ ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی سے ان کی رہنمائی فرماتے۔ اس سے جہاں ان کی وسعت نظر اور ان کا علمی استحضار عیاں ہوتا ہے وہیں ان کی نفع رسانی کا جذبہ، ان کی فراخ دلی اور ان پر اکابر علما کا اعتماد بھی واضح ہوتا ہے۔ فتاویٰ کے سلسلے میں یوں بھی ان کو ہمیشہ تیار رہنا ضروری تھا کیوں کہ فتاویٰ پر ان کی تصدیق بالعموم ضروری تھی۔

(۵) سنی دارالاشاعت کا قیام، اور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت ان کا عظیم کارنامہ ہے اس پر متعدد جہتوں سے اور تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(الف) ایک کتاب جو مطبوعہ ہے عکس لے کر بعینہٖ اسے شائع کر دینا کسی خاص علمی صلاحیت کا محتاج نہیں، تھوڑا پڑھا لکھا آدمی بھی اسے کر سکتا ہے۔ بقدر ضرورت سرمایہ ہونا چاہیے پھر کتاب ایسی ہے جو مارکیٹ میں خوب چلی ہوئی ہے اور مانگ زیادہ ہے تو سرمایہ لگانا بھی آسان ہے۔

(ب) لیکن کوئی کتاب جو مسودہ کی شکل میں ہے اسے کتابت کرا کے شائع کرنے میں کم از کم کتابت کی تصحیح اور مسودہ سے مطابقت کا کام علمی صلاحیت اور تجربہ کا طالب ہے، مسودہ بالکل صاف ستھرا اور اطمینان بخش ہے تو تصحیح کا تھوڑا تجربہ بھی کفایت کر سکتا ہے۔

(ج) لیکن مسودہ پرانا اور ناصاف ہو تو اس کی عبارتوں اور معانی و مطالب سمجھنے کی لیاقت بھی چاہیے جس کی مدد سے ناصاف عبارتوں کی تصحیح و تعیین ہو سکے۔

اب تصحیح کی لیاقت کا معیار مسودہ کے مندرجات کے معیار سے جانچا جائے گا۔ مسودہ اگر افسانوں اور اختراعی قصوں پر مشتمل ہے تو صرف زبان و ادب میں کمال کارِ تصحیح کے لیے کافی ہے۔

(د) مسودہ اگر سیرت و تاریخ سے تعلق رکھتا ہے تو اس فن سے تعلق ہونا ضروری ہے لیکن مندرجات عام متداول کتابوں سے صرف اخذ و اقتباس کی شکل میں ہیں تو کام آسان ہے ورنہ اس میں دشواریوں کا دائرہ بڑھتا جائے گا۔

(ہ) مسودہ کسی ایسے عالم کا ہے جس سے زیادہ صلاحیت خود مصحح کے پاس ہے اور اسے حذف و اضافہ

اور اصلاح کا حق بھی حاصل ہوا ہے تو بھی اس کے لیے کچھ آسانی ہے، بلکہ مصنف پر خاص مہربانی بھی کیوں کہ جابجا تجھ کار کے علم وصلاحیت سے کتاب میں حسن وکمال پیدا ہوگا۔ مگر قاری سب کچھ مصنف ہی کی کاوش سمجھے گا اور اگر مصحح کی محنت کا کچھ تصور بھی کرے گا تو مبہم طور پر، کیوں کہ بعد تصحیح کتابت وطباعت وغیرہ سے گزر کر کتاب جب منظر عام پر آتی ہے تو ایسا کوئی نمایاں نشان شاید ہی کسی کتاب میں رہتا ہو جس سے اصل مسودہ اور اصلاح وترمیم میں فرق کیا جا سکے۔

(و) مسودہ کسی بلند پایہ جامع علوم وفنون شخصیت کا ہے جس کی نگارشات میں متعدد فنون کی مہارت کار فرما ہے تو ایسے ناصاف مسودہ کو تبییض وتنقیح اور کتابت وتصحیح وغیرہ سے گزار کر شائع کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

(ز) یہاں بھی اگر مزاج سہل پسند ہے تو یہ ہوگا کہ جو آسانی سے سمجھ میں آیا بنا دیا ورنہ جیسا تیسا چھوڑ کر کام آگے بڑھایا۔ اشاعت کے بعد قارئین سر مغزی کرتے رہیں کہ کیا ہے، کیا ہونا چاہیے؟

(ح) لیکن محتاط اور جفاکش انسان سخت سے سخت راہ طے کرنے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔ جس میں بعض اوقات اسے اپنی کسی تصنیف سے زیادہ اس بلند پایہ شخصیت کے مخطوطہ کی تصحیح میں محنت وصلاحیت صرف کرنی پڑتی ہے۔

(ط) مسودہ دینی عقائد واحکام، نصوص قرآن وحدیث، عبارات ائمہ وعلما پر مشتمل ہے تو یہ بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ذرا سی غفلت وسستی سے جائز کا ناجائز، ناجائز کا جائز نہ بن جائے اور نصوص کی عبارتوں میں خطا نہ واقع ہو۔

(ی) خود مصنف کی عبارت میں بھی فرق نہ آنے پائے کہ اس کی تحریر بجائے خود ایک سند ہے۔ ذرا بھی تبدیلی ہوگئی تو بہت ممکن ہے جو گہرائی وگیرائی ان الفاظ میں پنہاں تھی وہ رخصت ہو جائے اور کسی قاعدہ یا جزئیہ سے تعارض بھی نمودار ہو جائے یا کسی اعتراض وایراد کی گنجائش نکل آئے جب کہ مصنف کے اصل الفاظ میں تعارض واعتراض کی گنجائش نہ تھی بلکہ اسی تعارض وایراد سے بچنے کے لیے اس نے ایک مخصوص تعبیر اور کچھ خاص الفاظ اختیار کیے تھے۔

امام احمد رضا قدس سرہ کی جامع فنون شخصیت، فتاویٰ رضویہ کی علمی حیثیت اور مسودہ کی سقیم حالت کو سامنے رکھ کر اس کی تصحیح وتبییض اور کتابت وطباعت میں صرف ہونے والی محنت وصلاحیت کا اندازہ کیجیے پھر جس زمانے میں کام کی ابتدا ہوئی ایسی علمی کتاب کی اشاعت سے متعلق حالات مایوس کن تھے اسی لیے سنی دار الاشاعت کی تاسیس اور طباعت واشاعت کے حوصلہ مندانہ اقدام کی بھی داد دیجیے۔ مسودہ کی حالت اور اس کی تصحیح میں احتیاط سے متعلق مولانا حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمۃ کا بیان پڑھیے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"مسودہ مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم کے پاس بریلی تھا اس کے مبیضہ کے لیے مولانا مجیب الاسلام صاحب نسیم اعظمی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس طرح فتاویٰ رجسٹروں کا حال ہوتا ہے کہ ریکارڈ کے دفتر میں سوال وجواب دونوں درج کر لیے جاتے ہیں اور اصل سائل کو بھیج دی جاتی ہے وہی فتاویٰ رضویہ کا بھی حال تھا کہ مسائل مبوّب

مفصل نہ تھے پھر یہ بھی نہیں کہ وہ نقل ہو جو پہلی دفعہ تیار ہوئی تھی، بلکہ نقل در نقل ہوتے ہوتے موجودہ رجسٹر اور نقل ہے، ہم مولانا موصوف کے بڑے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کتاب کو اپنی بساط بھر مبوب ومفصل کر کے مبیضہ کیا، بعض اوراق کیڑوں نے بری طرح چاٹ لیا تھا، ان میں جہاں جہاں اور کتابوں کی مدد سے تصحیح ممکن تھی کر دی گئی، جہاں تک ماسبق اور مالحق سے عبارت بن سکتی تھی بنا دی گئی اور جہاں مجبوری تھی بیاض چھوڑ دی گئی ہے۔"(1)

"مبیضہ کا اصل سے مقابلہ، پھر مبیضہ سے کاپی کی تصحیح، بعدہٗ پروف کی مطابقت میں پوری عرق ریزی اور نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے، مزید براں جہاں عربی عبارتیں نقل کی گئی ہیں، ان کی تصحیح متعلقہ کتابوں سے حتی الامکان کر لی گئی ہے، الغرض نقطہ نقطہ، شوشہ شوشہ کی صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور بھر پور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب صحیح اور مسودہ کے عین مطابق شائع ہو۔"(2)

غور فرمایئے! فتاویٰ رضویہ میں حوالوں کی کمی نہیں۔ ہر عبارت کو اصل ماخذ سے ملانا کتنا مشکل کام ہے، ماخذ کی جلد اور صفحہ یا باب وفصل کی نشان دہی کتاب میں موجود ہو جب بھی ہر ہر عبارت کی متعلقہ کتابوں سے مطابقت کرنا بڑا طویل اور دشوار گزار عمل ہے، لیکن ناظرین کو معلوم ہوگا کہ بالعموم فتاویٰ رضویہ میں باب وفصل یا جلد وصفحہ کی نشان دہی نہیں۔ اب مسئلے کی عبارت ٹھیک متوقع محل میں مل گئی تو خیر، ورنہ نہ معلوم کتنے مقامات پر تلاش کرنا پڑے، اور کتنی مدت صرف ہو جائے، کوئی نہیں جانتا۔ کتب حدیث میں الفاظ حدیث تلاش کرنا، کتب فقہ میں فقہی عبارتوں کی بہ نسبت عموی طور پر زیادہ ہی مشکل ہے۔ فتاویٰ رضویہ میں احادیث بھی ہیں، فقہی عبارات بھی، تاریخ وسیر کے اقتباسات بھی، اور دوسرے فنون کی کتابوں کے مندرجات بھی، ان سب کو اصل ماخذ سے تلاش کر کے نکالنا اور مطابقت کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔

پھر مسودہ وہ نہیں، جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو بلکہ کہیں ان کی تحریر ہے کہیں کسی ناقل کی، کیوں کہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ استفتا کسی کاغذ پر آیا اس پر مفتی نے خود جواب لکھا یا کسی سے لکھوا کر نظر ثانی کی یا پڑھوا کر سن لیا اور دستخط کر دیے۔ پھر کسی ناقل نے فتاویٰ کے رجسٹر میں اسے نقل کر دیا۔ ناقل نے اپنی نقل پر نظر ثانی کر لی تو اس کی مہربانی ورنہ کوئی بات نہیں اور نظر ثانی اگر برق رفتاری سے ہوئی تو چھوٹے ہوئے کسی لفظ وحرف کا گرفت میں آنا مشکل ہی ہے ماہرین نقل وتصحیح کا معاملہ الگ ہے۔

(1) تفصیلی چارٹ عرض حال کے بعد درج ہے۔
(2) فتاویٰ رضویہ، ج:۳، عرض حال، ص:ر، ش محررہ ۱۱ر صفر ۱۳۸۱ھ/ جولائی ۱۹۶۱ء

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فتاویٰ رضویہ میں جو فتاویٰ نقل ہوئے ان پر نظر ثانی نہیں ہوئی، یا ناقلین تغافل کیش تھے یا مہارت و صلاحیت سے خالی تھے کیوں کہ جس عمل کی تفصیلی حالت کی تحقیق نہ ہو اس کے بارے میں حتمی طور پر نفیاً یا اثباتاً کوئی دعویٰ کر دینا یقیناً دانش مندی سے بعید امر ہے لیکن حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کا بیان یہ ہے کہ جو نقل خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے زمانے میں تیار ہوئی تھی بعینہ وہی دست یاب نہ ہوئی۔ اس کی نقل ملی، بعض وہ بھی نہیں، جو ملی وہ بھی کِرم خوردہ، ناصاف حالت میں، اب اس قسم کے مسودہ کی تحقیق و تصحیح جتنی مشکل ہے اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھیں کام سے پالا پڑا ہو۔

امام احمد رضا قدس سرہ کے حاشیۂ شامی کی نقل کو اعلیٰ حضرت کے اصل قلمی نسخے سے مقابلے کا کام جب راقم الحروف اور مولانا عبد المبین نعمانی انجام دے رہے تھے تو بہت سے مقامات پر بڑی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خصوصاً جلد ثانی کا مقابلہ بہت دشوار ہوا جس میں راقم کے ساتھ مولانا نصر اللہ بھیروی تھے۔ کثرتِ استعمال سے بہت سے حواشی کی کچھ عبارتیں محو ہو گئی ہیں اور کچھ تعیین نہ ہو سکی کہ یہاں کیا عبارت لائی جا سکتی ہے۔

جب کہ ہمارے کام میں اصل مراجع سے مطابقت کا التزام نہیں تھا۔ جہاں اصل حوالوں کو دیکھنے کی خاص ضرورت محسوس ہوئی وہیں مراجعت کی گئی پھر بھی اس میں سخت محنت و دشواری سے گزرنا پڑا۔ "مقامع الحدید علی خد المنطق الجدید" کا مبیضہ بہت صاف تھا مگر نقل در نقل کی وجہ سے متعدد مقامات پر اصل مراجع کی جانب رجوع کرنا پڑا اور کافی وقت و محنت صرف کرنے کے بعد میں اسے خاطر خواہ تبییض و کتابت کے مراحل سے گزار کر منظر عام پر لا سکا پھر بھی ایک دو غلطیاں رہ گئیں۔

فتاویٰ رضویہ کی ضخیم جلدوں میں حوالوں کی جو کثرت ہے محتاج بیان نہیں۔ ان تمام حوالوں کو اصل کتابوں سے ملانا کتنا صبر آزما اور طویل عمل ہے۔ کوئی صرف دس بیس صفحات کر کے اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کے پیش نظر استاذ محترم علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی ہمتِ مردانہ، کاوشِ مجاہدانہ، اور احتیاط بلند کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انھوں نے فتاویٰ رضویہ کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں جو سعی بلیغ فرمائی ہے راقم الحروف سے خود ایک بار اس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"اتنی محنت کے بعد اتنی ضخیم کتاب خود لکھی جا سکتی تھی۔ یہ حقیقت ہے، میں فخریہ نہیں کہتا۔"

خود مجھے جب اس قسم کے کاموں سے سابقہ پڑا تو حضرت کا یہ مقولہ حرف بحرف درست نظر آیا اور میری تفصیلات سے قارئین خود بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔

جلد سوم اور جلد چہارم کی اشاعت خود ان کی حیات میں ہو گئی۔ جلد پنجم کے کئی سو صفحات کی کتابت بھی انھوں

نے کرائی، جلد ششم، ہفتم، ہشتم کے مسودات پر نظر ثانی اور تبییض کا انتظام بھی انھوں نے کیا۔ مزید جو رسائل، مضامین و ابواب کے لحاظ سے ان جلدوں میں شامل ہونا چاہیے ان کو بھی یادداشتوں میں لکھ دیا۔

طریق کار یہ تھا کہ ایک بار پوری ایک جلد کا مسودہ خود پڑھتے، ناصاف عبارتوں کو حاشیہ میں پنسل یا قلم سے صاف لکھ دیتے۔ اصل حوالوں کی مراجعت کرتے پھر جو مبیضہ ہوتا اس کا اصل سے مقابلہ کرتے پھر کتابت کا مبیضہ سے مقابلہ کرتے اور کتابت کی تصحیح کر کے کاتب کو واپس کرتے۔ کاتب اپنا نہ تھا بلکہ پریس کا تھا۔ پروف کی تصحیح میں کاتبوں کا حال معلوم ہے کہ بہت کچھ بناتے ہیں اور کچھ چھوڑ بھی دیتے ہیں یہ سانحہ فتاویٰ رضویہ کے ساتھ بھی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ تلمیذ صدر الشریعہ حضرت علامہ الحاج مبین الدین امروہوی سابق شیخ الحدیث دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف نے اپنے جامعہ نعیمیہ مراد آباد کے زمانۂ تدریس میں جلد سوم کے مطبوعہ نسخے پر نظر ثانی فرمائی تو کئی صفحات کا صحت نامہ تیار ہو گیا، حافظ عبد الرؤف صاحب کا معاملہ لکھنؤ کے پریس سے تھا اور کاتب وہیں رہتا۔ اگر ان کا اپنا کاتب رہتا اور پروف کو دوسری تیسری بار دیکھنے کا موقع ملتا تو یقیناً اتنے لمبے صحت نامے کی گنجائش نہ نکل پاتی۔

انھوں نے جو طویل مجاہدہ کیا اس میں ان کا کوئی مستقل معاون نہ تھا، تبییض کا کام مفتی مجیب الاسلام صاحب نسیم اعظمی اور مولانا سبحان اللہ امجدی بنارسی کے ذریعہ ہوتا، باقی کام خود کرتے۔ مقابلے کے لیے طلبہ میں سے چند ذی استعداد ہی افراد کو باری باری ساتھ کر لیتے، اساتذہ یا علما میں سے کسی کا اس سلسلے میں مستقل یا طویل تعاون نہ تھا اگرچہ ممکن ہے کہ چند گھنٹے کسی کسی زمانے میں کسی نے ساتھ دیا ہو لیکن ایک گراں بار اور طویل عمل میں چند گھنٹے یا چند ایام کی رفاقت کا اگر کچھ اعتبار ہے تو اس میں ان طلبہ کا حصہ بہت زیادہ ہے جو اکثر و بیشتر بلکہ بحیثیت مجموعی ہمیشہ شریک کار ہوتے اور ان کے شاہدوں کی کمی نہیں۔ اس زمانے میں جو طلبہ دار العلوم میں زیر تعلیم اور مقیم تھے سبھی اس کا مشاہدہ کرتے۔

یہ سارا کام غیر درسی اوقات میں ہوتا۔ حافظ جی علیہ الرحمہ درس و مطالعہ کی بڑی سختی سے پابندی کرتے اور اوقاتِ تعلیم میں کوئی خارجی کام قطعاً روا نہ رکھتے اگرچہ وہ ادارہ اور جماعت کے لیے کوئی بڑا اور اہم کام کیوں نہ ہو لیکن تعلیمی نقصان، مقدار تعلیم کی کمی، طلبہ و ادارہ کے بنیادی مقصود اور اپنے فرائض سے بے توجہی انھیں کسی طرح گوارا نہ تھی۔ اس زمانہ میں دیگر مدرسین بھی اسی روش پر کاربند تھے۔

فتاویٰ رضویہ کے سلسلہ میں ان کی علمی کاوشوں کا جو سب سے زیادہ گراں قدر اور تابناک گوشہ ہے اس پر کم لوگوں کی نظر جاتی ہے لیکن میرے نزدیک سارے کام کی جان اور سب سے بیش بہا جوہر وہی ہے۔ اسے میں ذرا تفصیل سے عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔

وہ اہل نظر جن کا کسی مخطوطے کی تحقیق سے سابقہ پڑ چکا ہو یا ایسے ماحول کے پروردہ ہوں جہاں ایڈٹ کا کام

ہوتا ہے اوراسے خاطر خواہ اہمیت دی جاتی ہے تو وہ بہر حال مذکورہ کام کی قدر و منزلت کا اندازہ کرسکتے ہیں اوراسے قرار واقعی درجہ دے سکتے ہیں لیکن ایسے افراد کو شاید انگلیوں پر گننے کی بھی ضرورت نہ پڑے خصوصاً اس زمانے میں جب استاذِ محترم یہ کام انجام دے رہے تھے۔

عوام تو عوام اکثر خواص اور علما کا یہ حال ہے کہ ناول سائز کے سو بچاس صفحات پر مشتمل کوئی کتاب اگر کسی نے لکھ دی اور وہ دوسرے کی اصلاح و نظر ثانی اور محنت و کوشش کے بعد شائع ہوئی۔ جب بھی اسے لکھنے والے کا ایک کارنامہ شمار کرتے ہیں اور اصلاح والے کو تو قطعاً کسی خانے میں نہیں رکھتے۔ اسی طرح مصنف کے پانچ چھ سو صفحات کا مسودہ اگر کسی نے نئے انداز سے عنوانات، فہرست، پیراگراف کی تبدیلی، عبارتی نشانات وغیرہ سے آراستہ کرکے شائع کیا تو یہ بھی کسی خانے میں شمار نہیں ہوتا، کام صرف مصنف ہی کا شمار ہوتا ہے۔ مزید براں کسی بڑے مصنف کے مخطوطے کو تحقیق و تفتیش کے ساتھ منظر عام پر لانا بھی کوئی زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور ایڈٹ کرنے والے نے اپنے حزم واحتیاط، بلند پایہ ذوق تحقیق کے تحت مصنف کے دیے ہوئے حوالوں اور عبارتوں کی اصل سے مراجعت بھی کر ڈالی تو یہ قطعاً مذکورہ حضرات کے لیے کوئی محسوس ہونے والی چیز ہی نہیں۔ اس لیے اسے کچھ شمار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس ماحول میں ہم دیکھتے ہیں کہ علمی قابلیت اور قلمی صلاحیت رکھنے والے حضرات خود کوئی کتاب لکھنا اور اسے کتابت، تصحیح، طباعت و اشاعت، ترسیل و مراسلت وغیرہ کے تمام مراحل سے گزارنا تو گوارا کرلیتے ہیں لیکن اپنے اکابر میں سے کسی بلند پایہ شخصیت کے مخطوطات پر دماغ سوزی اور جاں فشانی انھیں قطعاً گوارا نہیں، کیوں کہ وہ جس ماحول میں رہتے ہیں اس طرح کا کام بالعموم صفر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اُن میں بعض حضرات کے پیش نظر یہ خیال بھی ہوگا کہ جن موضوعات پر لکھا جاچکا ہے اور جو کام مسودہ کی حد تک ہوچکا ہے وہ کبھی بھی اور کسی کے ذریعہ بھی منظر عام پر آسکتا ہے۔ لیکن جو شعبے اب تک تشنۂ تحریر ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اگلی نسل سے زیادہ توقع نہیں کہ وہ خاطر خواہ ان موضوعات سے عہدہ برآ ہوسکے اس لیے خود کچھ لکھ کر جانا چاہیے۔

لیکن کیا سارے اہل قلم ایسے ہی ہیں اور سارے ارباب صلاحیت کے اندر یہی جذبہ کار فرما ہے؟ نہیں بلکہ اکثر میں یہی ذوق ملے گا کہ اپنی بقا کے لیے اپنی تحریر منظر عام پر لانا ہی ضروری ہے۔ مجھے اس ذوق کی تحقیر قطعاً مقصود نہیں۔ یقیناً اہل علم اور اہل دین کے لیے ہر علمی و دینی کام خواہ وہ کسی کے قلم سے ہو نفع بخش اور جماعتی وقار کا ذریعہ ہے جس پر توجہ اور محنت کی ضرورت سے انکار یقیناً سفاہت و جہالت کے دائرے میں شمار ہوگا۔ ساتھ ہی ایک قابل قدر کام کی ناقدری اور کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا بھی حامل ہوگا۔

مجھے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اپنی تصنیف اور اس کی اشاعت میں مصنف کے لیے بہت سے حوصلہ افزا جذبات مہمیز کا کام کرتے ہیں لیکن کسی قدیم تصنیف پر اپنی تصنیف کے برابر یا کم و بیش محنت صرف کرکے اسے شائع کرنے میں قطعاً اس قسم کے جذبات کی ہم نوائی نہیں ہوتی، جس کے باعث وہ بڑا ہی صبر آزما، ہمت شکن اور جان سوز کام بن جاتا ہے جو کسی ایسی ہی بلند خیال، عزیمت کیش اور پر عزم شخصیت کے خانۂ اعمال میں شامل ہوسکتا ہے، جسے اخلاص و بے نفسی، دینی امنگ، سرمایۂ علمی سے محبت، اکابر سے عقیدت، جماعت سے ہم دردی، اپنی نامور ی اور عزت و شہرت کے نفع بخش اور ہمت افزا تصورات سے کنارہ کشی کا وافر حصہ قدرت نے ارزانی کیا ہو۔

میرا جہاں تک اندازہ اور مشاہدہ ہے وہ یہی کہ استاذ محترم نے جس زمانے میں کام کیا ہے، ماحول کما حقہ قدر شناس کا نہ تھا اور ان کی جو کچھ پذیرائی ہوئی وہ ان کی محنتوں کے تناسب سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ عرصۂ دراز سے اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی قلمی کتابیں منظر عام پر آنا بند تھیں۔ ایک قلمی کتاب جو بہت ساری چھوٹی کتابوں پر بھاری ہے فتاویٰ رضویہ، اسے مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ نے شائع کردیا مگر اشاعت کی دشواری اور اس طویل سفر کی سرگزشت، اس کے خارزار مراحل کیا ہیں اور کس طرح سر ہوئے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنے اور اس پر ناشر کو مبارک باد دینے والوں کی تعداد پورے بر صغیر میں سو بلکہ پچاس افراد تک بھی نہ رہی ہوگی۔

انتہا یہ ہے کہ ان کے قریبی رفقا کو بھی اس راہ میں شب و روز کی مشقتوں، محنتوں اور قربانیوں کا کوئی تجربہ اور صحیح اندازہ نہ تھا، بحر العلوم حضرت مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی کے یہ الفاظ چشم بصیرت سے پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں:

"مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمۃ اکیلے ہی سب کام کرلیا کرتے تھے۔ اس لیے ہم لوگوں کو کچھ احساس نہیں ہوتا تھا لیکن اب جب کہ کام سے سابقہ پڑا تو معلوم ہوا کہ کام کتنا مشکل اور زہرہ گداز ہے۔"

جس دور میں متبحر قسم کے ارباب فضل و کمال کو کسی عظیم مخطوطہ کی تحقیق و اشاعت کی راہ میں پیش آنے والی دشواریوں اور جاں گداز مراحل کا اندازہ نہ ہو اس وقت کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ عام اہل علم کی طرف سے کما حقہ کوئی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہوئی ہو، پذیرائی اور ہمت افزائی اسی وقت بروئے کار آسکتی ہے جب اس کے پیچھے قدر آشنائی اور عمل شناسی موجود ہو۔

الحاصل ان حالات میں حضرۃ الاستاذ کے طویل مجاہدہ کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اب بلاشبہہ ماحول بدل چکا ہے اور علم و فن، تجربہ و عمل کی ترقی کے ساتھ قدروں اور قدر دانیوں میں بھی ترقی آئی ہے اس لحاظ سے تمام تر دشواریوں کے باوجود مردانِ کار کی تسلی و ہمت افزائی کے لیے بفضلہٖ تعالیٰ بہت کچھ سامانِ پذیرائی فراہم ہوچکا ہے، ہمت کرکے اس قسم کے مشقت خیز کاموں کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

فتاویٰ رضویہ کے سلسلے میں اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ اس میں صرف ہونے والی علمی صلاحیت اور صلہ وستائش سے دور رہ کر مخلصانہ سعی ومحنت کا جائزہ ہے لیکن حضرت کی بے نفسی اور جاں فشانی کا یہ صرف ایک رخ ہے۔ انہماک ودل سوزی کا ایک رخ اور ہے، جو بڑا ہی درد انگیز اور عبرت خیز ہے۔

کسی محقق طبع اور بلند حوصلہ عالم وفاضل کے لیے کسی علمی وتحقیقی کام میں ایک روحانی سرور اور علمی جوش وولولہ کار فرما ہوتا ہے جو اس سے بڑی سے بڑی تحقیقات کرالیتا ہے ایسی تفتیش وجستجو بھی جسے آنے والی دنیا نہ جان سکے نہ اس پر کوئی داد دے سکے لیکن محقق کا ذوق تحقیق ہوتا ہے، جو ساری محنتوں سے اسے مردانہ وار گزار دیتا ہے، لیکن کسی بلند رتبہ عالم کے لیے ایسا کوئی کام سرانجام دینا بڑا مشکل ہوتا ہے جس میں کسی علمی سرور اور ذہنی تسکین کا سامان بھی نہ ملتا ہو مثلاً کتابت کے لیے کاتبوں سے معاملہ کرنا، اُجرتوں کی تعیین، کتاب کے تقاضوں اور لین دین کے مراحل سے گزرنا، پریس جانا، کاغذ خریدنا، پریس پہنچانا، کتاب چھپ گئی تو پارسل بنوانا، حمل ونقل کے ذرائع سے معاملہ کرنا، اپنے شہر میں لانا، مستقر تک ڈھونا یا پہنچوانا، پھر کتاب کی نکاسی اور دوسری کتاب کی تیاری کے لیے خریداروں کو مطلع کرنا، اشتہارات نکالنا، آرڈر آگئے تو پارسل بنانا، بل تیار کرنا، پتے درج کرنا، اِرسال کرنا، منی آرڈر وصول کرنا، بقایا رقم کے لیے تقاضے کے خطوط لکھنا، حسابات درج کرنا، یہ سب ایسے مراحل ہیں، جن سے نفس علم وتجربہ میں تو اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن عموماً ان سب کا کسی علمی کام کے خانے میں نہ شمار ہوتا ہے نہ دماغ سوز محققین کو ان سے کوئی علمی سرور حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ ان کے لیے اور ان کے کاز کے لیے بسا اوقات مضر ہوتا ہے، اس لیے اس سے پریشاں خاطری اور بعض لوگوں کے اندر چڑچڑاپن بھی پیدا ہو جاتا ہے اور جو اوقات اس میں صرف ہوتے ہیں وہ علمی کام میں صرف ہوں اور اسے دوسرے لوگ انجام دیں تو یہ عالم ومحقق کی صلاحیتوں کا مناسب اور بہتر استعمال ہوگا اور جو تحقیقی کاموں کی استعداد نہیں رکھتے مگر معاملات میں ہوشیار وتجربہ کار ہیں ان کا بھی ایک دینی، علمی، تبلیغی شعبے سے قریب اور مناسب مصرف نکل آئے گا اور وہ اگر حسنِ نیت سے اس کاز کو آگے بڑھائیں تو اجر عظیم کے مستحق بھی ہوں گے۔

اب آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی اور درد والم بھی کہ مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ نے فتاویٰ رضویہ کے ساتھ صرف علمی وتحقیقی محنتیں ہی نہیں صرف کی ہیں، بلکہ وہ سارے مراحل طے کیے ہیں جو ایک ماہر حساب کلرک، ایک ماہر معاملہ کار، (طباعت، ترسیل ومراسلت کرنے والے ذمہ دار) کو کرنا چاہیے تھا مگر سنی دارالاشاعت کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ دو مستقل ملازموں کی گنجائش نکل پاتی نہ ہی اشرفیہ کی بھری بزم میں کوئی ایسا مونس وغم خوار، جو اس قسم کی غیر علمی جاں فشانی اپنے ذمہ لے سکے۔ علمی کاموں کے لیے عذر یہ تھا کہ ان کے لیے جو صلاحیت ودیدہ وری درکار ہے اس کے لائق آپ ہی کی ذات گرامی ہے اور غیر علمی کاموں کے لیے یہ عذر کہ ہمیں نہ اس کا کوئی

تجربہ ہے، نہ یہ کام ہماری شانِ والا کے لائق مگر جس نے کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے تو بہرحال ہر "ہفت خواں" سر کر کے ہی گزرنا ہے۔ استاذ گرامی مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ جلد پنجم کے ابتدائیہ میں رقم طراز ہیں:

"واقعہ یہی ہے کہ مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ سنی دارالاشاعت کی اسکیم بنانے والے تنہا تھے۔ اس کے بعد چندہ وصول کرنے میں وہی پیش پیش، بریلی شریف سے فتاویٰ کا مسودہ وہی لائے۔ مبیضہ انھوں نے کرایا، دونوں کا مقابلہ حرف بحرف انھوں نے ہی کیا، پریس والوں سے معاملہ انھیں کا کام تھا، کاپی، پروف، فہرست وعنوان کی تیاری، بار بار لکھنؤ جانا، حتی کہ کتاب بھی خود ہی لانا اور یہاں طالب علموں کے ساتھ مل کر بنڈل ڈھونا، کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ کتاب چھپ گئی تو لوگوں کو خطوط لکھنا، آرڈر بک کرانا، ان کے لیے پارسل سینا، اس کو بھیجنا، کون سا کام ہے جو تنہا مولانا نے نہ کیا ہو اور اس خاموشی اور بے نیازی سے کہ نہ صلے کی خواہش، نہ داد کی پروا۔"

یہی خاموشی وبے نیازی ان کے کام کی جان اور ان کی روحانیت کا اصل روپ ہے، جسے دیکھ کر استاذ محترم علامہ عبدالرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ کے استاذ الاستاذ حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ کی وہ کاوشیں اور غیر علمی محنتیں یاد آتی ہیں جو انھوں نے مطبع اہل سنت بریلی شریف سے تصانیف امام احمد رضا اور دوسری علمیات کی اشاعت کے تعلق سے تدریس وافتا اور فیصلہ وقضا وغیرہ کی عظیم ذمہ داریوں کے ساتھ سرانجام دیں جن پر آج داد دینے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا مگر ابنائے زمانہ کے لیے جائے عبرت ہے کہ اشاعت دین کی راہ میں وسائل کی کمی، مخلصانہ تعاون کی قلت اور خالص علمی جدوجہد سے سرمایہ داروں کی بے خبری وبے توجہی کے باعث ایک بلند پایہ عالم بلکہ راس العلما کو اپنے اونچے منصب سے بہت نیچے اتر کر بھی نہایت دل سوزی وجاں فشانی کے ساتھ بہت کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن اخلاص وللّٰہیت کا جذبۂ فراواں اور خدمت دین کا سوز دروں ایک ایسا سرشتہ ہوتا ہے جو بلند وپست دونوں قسم کے کاموں کو رب قدیر وکریم کے حضور خاص اور قرب جاں نواز میں ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے اور اس کی قدر داں، قدر افزا، اور فضل فرما سرکار میں مخلصین کی کوئی بھی محنت وکاوش رائیگاں نہیں جاتی۔ اللھم ارزقنا نصیبا منہ.

سنی دارالاشاعت کی حیثیت:

یہ تو متعین ہے کہ سنی دارالاشاعت کا قیام ایک قومی ادارہ کی حیثیت سے عمل میں آیا اس کے لیے ملک کے مختلف گوشوں سے باضابطہ عوامی چندہ فراہم کیا گیا۔ حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز مرادآبادی علیہ الرحمہ شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ نے جامع مسجد مبارک پور میں اس کی تاسیس اور ضرورت واہمیت کا ذکر فرماتے ہوئے چندے کی

اپیل کی اور دوسرے متعدد مقامات پر اس کے لیے تعاون حاصل کیا گیا۔ چندے کا کام عموماً وفد کی صورت میں ہوتا۔ جس میں حافظ ملت بھی شریک ہوتے اور اشرفیہ کے بعض اساتذہ بھی، مولانا عبدالرؤف علیہ الرحمۃ رقم طراز ہیں:

”طباعت کے سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی سوال سرمایے کا تھا اور عوام اہل سنت کی غربت کی وجہ سے نہایت مشکل بھی، اس لیے اراکین سنی دارالاشاعت کو بے حد جدوجہد کرنی پڑی اور یوپی، بہار، بنگال بھی جگہ دورہ کرنا پڑا تب جاکر رقم فراہم ہوئی، بریلی میں محترم ساجد علی خاں صاحب، مولانا شریف الحق صاحب اور مولوی مجیب الاسلام صاحب، جمشید پور میں علامہ ارشد القادری صاحب، ضلع گونڈہ میں تلسی پور، لوکہوا، بلرام پور، اوڑاجھار، علاقہ بھانبھر میں پیچپڑوا، رام نگر، ناوڈیہ، بستی میں خلیل آباد، براؤں، امرڈوبھا، مہنداول، ضلع اعظم گڑھ میں مبارک پور، خیرآباد، ابراہیم پور، محمد آباد، سگڑی، مئو، ادری، گھوسی وغیرہ مختلف دیار وامصار کے احباب اہل سنت نے ہر طرح مدد کی جس کے لیے ہم سبھی احباب کے شکر گزار ہیں۔“(۱)

اس تفصیل کی روشنی میں یہ امر واضح ہے کہ سنی دارالاشاعت مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمۃ کا ذاتی ادارہ نہ تھا بلکہ خود مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمۃ کی تحریروں سے یہ بھی واضح ہے کہ سنی دارالاشاعت دارالعلوم اشرفیہ ہی کا ایک شعبہ ہے۔

جنوری تا دسمبر ۱۹۵۹ء کی کارکردگی پر مشتمل دارالعلوم اشرفیہ کی سالانہ روداد کے صفحہ ۱۴ پر یہ رپورٹ درج ہے:

سنی دارالاشاعت:

یہ مستقل شعبہ دارالعلوم کے حوصلہ مند مدرسین کی نگرانی میں قائم ہوا ہے۔ اس کے لیے ابتدائی سرمایہ دس ہزار روپے طے کیا گیا ہے جس میں سات ہزار روپے بذریعہ چندہ فراہم ہو چکے ہیں، ادارہ کی سب سے پہلی اشاعت اعلیٰ حضرت محدث بریلوی قدس سرہ العزیز کی فتاویٰ رضویہ جلد ثالث (کتاب الصلوٰۃ) ہوگی اگر قوم نے ادارے کی ہمت افزائی کی تو یہ مفید ادارہ اہل سنت کی بیش بہا تصانیف شائع کرتا رہے گا۔“

تیسری جلد چھپ کر منظر عام پر آئی تو دارالعلوم کی روداد میں یہ رپورٹ شائع ہوئی:

”دارالعلوم کے حوصلہ مند مدرسین کی نگرانی میں قائم ہونے والا یہ اہم ادارہ ہے جس کی طرف سے پہلی معرکۃ الآراکتاب فتاویٰ رضویہ جلد سوم مارکیٹ میں آگئی ہے۔ تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحہ پر پھیلا ہوا علم ومعرفت اور علوم اسلامیہ کا یہ بیش بہا خزانہ دارالعلوم کے عظیم کارناموں کی ایک تازہ مثال ہے اگر قوم نے اس کی اشاعت میں ہاتھ بٹاکر ہماری ہمت افزائی کی تو اس کی بقیہ جلدیں منظر عام پر آجائیں گی۔ چوتھی جلد کی طباعت کے

(۱) فتاویٰ رضویہ جلد سوم، عرض حال، ص: ش

انتظامات ہو رہے ہیں۔“(۱)

سنہ مذکور تک حاجی محمد عمر صاحب ناظم اعلیٰ تھے اس کے بعد جب مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب ناظم اعلیٰ اور مرتب روداد ہوئے تو ان کی نظامت میں ہی سنی دارالاشاعت سے متعلق مذکورہ بالا رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ ۸۱، ۸۲ھ کی روداد ص: ۵۰ پر بعینہ وہی الفاظ درج ہیں جو اوپر نقل ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳۸۲، ۸۳ھ کی رپورٹ میں صرف یہ ترمیم ہے کہ ”بلکہ اس کا (جلد سوم کا) پہلا ایڈیشن ختم ہو رہا ہے۔ چوتھی جلد کی طباعت شروع ہوگئی ہے، الخ“ ۱۳۸۳، ۸۴ھ کی رپورٹ میں بھی یہی الفاظ ہیں، ۱۳۸۴، ۸۵ھ کی روداد میں جلد چہارم سے متعلق کام کی دشواری کا ذکر ہے۔ باقی خبر حسب سابق ہے۔ الغرض سالہائے مذکور اور دیگر سالوں کی رپورٹوں میں اس بات کی واضح صراحت موجود ہے کہ یہ دارالعلوم ہی کا ایک مستقل شعبہ ہے اور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت دارالعلوم ہی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

مزید براں جب جلد چہارم منظر عام پر آئی تو ۱۳۸۶، ۸۷ھ مطابق ۱۹۶۶، ۶۷ء کی روداد میں خود ناظم سنی دارالاشاعت کی طرف سے یہ اطلاع شائع ہوئی:

”فتاویٰ رضویہ جلد چہارم صفحات ۷۵۰، سائز 18X22/1X4 کاغذ گلیز، کتابت، طباعت معیاری، قیمت مجلد ۲۴ر روپے، غیر مجلد ۲۰ر روپے۔ ملنے کا پتا: سنی دارالاشاعت اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی۔

دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور اپنی نمایاں دینی خدمات کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں رہا۔ شعبۂ تعلیم اور دارالافتا کے ساتھ ساتھ فتاویٰ رضویہ کی طباعت ادارہ کی غیر معمولی خدمت ہے۔“

۱۳۸۷، ۸۸ھ کی روداد میں بھی جلد چہارم کا اشتہار اور جلد پنجم کے انتظام کی اطلاع دی گئی ہے۔ ان سب سے یہ معاملہ بالکل واضح ہے کہ ناظم سنی دارالاشاعت حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب بلیاوی علیہ الرحمۃ نے اپنی تمام توانائیاں صرف کرنے کے باوجود سنی دارالاشاعت کو دارالعلوم ہی کا ایک شعبہ اور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کو دارالعلوم ہی کا ایک کارنامہ قرار دیا۔

مالِ دنیا کی طمع، اور شہرت وناموری کی حرص استاذ مرحوم کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہ دے سکی، وہ اپنی عسرت کے باوجود ہمیشہ قومی سرمایے کے امین اور مادر علمی کے دردمند مخلص کی صورت میں جلوہ گر رہے۔ ہر پست حرص وطمع کو انھوں نے ہمیشہ یہ کہتے ہوئے ٹھوکر ماری:

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

۱۴ر شوال ۱۳۹۱ھ جمعہ کو جب استاذ محترم کا وصال ہوا تو اس وقت دارالعلوم اشرفیہ کے سابق شیخ الحدیث

(۱) ص ۱۴، روداد، رجب ۱۳۸۰ھ تا جمادی الآخرہ ۱۳۸۱ھ/دسمبر ۱۹۶۰ء تا دسمبر ۱۹۶۱ء

استاذنا الکریم حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ اشرفیہ کے سربراہ اعلیٰ اور تمام شعبوں کے مرجع تھے، حافظ عبدالرؤف صاحب کی اچانک رحلت کے بعد بقول استاذ گرامی مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ: "سنی دارالاشاعت کی بے گور وکفن لاش پڑی رہی۔" "سنی دارالاشاعت کے ارکان کا کہیں پتہ نہ تھا، نہ اس ادارہ کی کوئی فکر، خیال آیا تو اسی کو جو تمام شعبوں کا مرجع وماویٰ تھا۔

حافظ ملت نے اسے نشاۃ ثانیہ بخشی۔ ناظمان دارالعلوم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب کو اس کام پر مامور فرمایا۔ ان لوگوں نے حساب کتاب کرکے گاڑی کو ایک رخ پر لگایا۔ چوں کہ یہ حضرات مدرسہ کے انتظامات میں مصروف رہتے تھے اس لیے انھوں نے حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ کو آمادہ کیا اور انھوں نے اس کی بہت ساری ذمہ داریاں اپنے سر اٹھالیں۔

جب سنی دارالاشاعت کی تاسیس ہوئی اس وقت بھی حافظ ملت قدس سرہ نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا اور نہ صرف یہ کہ خوشی ظاہر کی بلکہ اس کے لیے خون کی فراہمی اور مالیاتی دوروں میں بھی حصہ لیا۔ سرمایہ کے حصول میں ان کے اثر ورسوخ اور ان کی شخصیت پر قوم کے عظیم اعتماد کا بھی بہت بڑا دخل ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب چھپ کر آگئی تو مایوس کن حالات میں اس کی نکاسی کے لیے بھی زبردست جدوجہد کی۔ تقریری جلسوں میں اس ضخیم کتاب کی جلدیں ساتھ لے کر جاتے، اہل علم اور اہل ثروت کو ترغیب دے کر خریدواتے اور واپس آکر قیمت ناظم ادارہ کے حوالہ کرتے۔ بظاہر یہ کام بڑا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن کسی بلند پایہ شخصیت کو ایسی ضخیم کتابوں کی "مفت باربرداری" سے سابقہ پڑے تو پتہ چل سکے گا کہ اس کے لیے کتنی ہم دردی ومحنت اور ہمت واخلاص کی ضرورت ہے۔

اب یہ شعبہ مکمل طور پر حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ کے زیر تصرف ہے جس کی ابتدا ماسبق میں ذکر ہوچکی ہے۔ حضرت ممدوح کے زیر اہتمام ششم، ہفتم، ہشتم شائع ہوئیں اور پنجم کا بھی اکثر حصہ انھوں نے ہی مکمل کراکے شائع کیا۔ تقریباً بیس سال سے وہ یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں، کام کی جو دشواری اور صعوبت ہے اس پر سیر حاصل گفتگو شروع میں ہوچکی ہے --- موصوف خود ایک متبحر عالم، صاحب طرز اہل قلم اور کہنہ مشق مصنف ہیں وہ چاہتے تو اسے چھوڑ کر خود اپنی کتابیں منظر عام پر لاتے مگر اپنی بہت سی تصانیف ناتمام چھوڑ کر اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے رشحات قلم کی تحقیق واشاعت میں وقت اور محنت صرف کرنا تمام اہل علم کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ اس میں جو ایثار ہے اسے بہت کم لوگ سمجھ پاتے ہیں کیوں کہ اب بھی ایسے افراد زیادہ تعداد میں ملیں گے جو تصنیف کو بہت اہم خدمت شمار کرتے ہیں اور تحقیق واشاعت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے حالاں کہ نہ ہر تصنیف اہم اور مشکل ہوتی ہے نہ ہر اشاعت سہل اور آسان --- اب تو ایسی ایسی غیر معیاری اور سطحی کتابیں دیکھنے کو ملتی ہیں جنھیں تصنیف کا باوقار نام دینا ہی بے جا ہے --- اور کسی جامع علوم اور ماہر فنون کے قلمی مسودے کی تحقیق کرکے

اسے صحت کے ساتھ شائع کرنا ایسا دشوار گزار عمل ہے جس میں اچھے اچھے علما ناتجربہ کار ثابت ہوتے ہیں اور ان کی شائع کردہ کتابوں میں قاری کو بے شمار الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کا فرق ہرگز نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

بہر حال امام احمد رضا قدس سرہ کے فتاوائے مبارکہ کی تحقیق واشاعت وہ اہم خدمت ہے جس پر مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمۃ کے بعد بحر العلوم کے بھی ہم بے پناہ ممنون ہیں۔ رب کریم انھیں سبھی اہل علم کی جانب سے جزائے فراواں عطا فرمائے۔ آمین

۲۵ رجب ۱۴۱۰ھ / ۲۲ فروری ۱۹۹۰ء پنج شنبہ

محمد احمد مصباحی
رکن المجمع الاسلامی
استاذ دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور

❁❁❁❁❁❁

حافظ ملت ایک جہان کمالات و محاسن[1]

میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ حافظ ملت جن بلند، راسخ اور بے تصنع کمالات واخلاق کے جامع تھے اس درجہ رسوخ پر ان میں سے ایک کمال بھی کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ اسے آسمانِ قبول وعظمت کی رفعتوں تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔

وہ ایک بلند پایہ عالم تھے۔ ایسے عالم جن کے علم وفضل کا چرچا ان کے دور طالب علمی ہی میں ہوا۔ مولانا فضل حق رام پوری جیسے متبحر، محقق اور مصنف علامہ نے درس نظامی کی منتہی ومشکل کتاب ”امور عامہ“ کے ایسے مقام کا امتحان لیا جو نہ شامل امتحان تھا اور نہ وہاں تک درس ہوا تھا۔ مگر جواب ایسا صحیح ودرست اور اطمینان بخش پایا کہ فرمایا:

”اسی سے آپ کی ہر کتاب کا امتحان ہو گیا۔“

علم کے ساتھ استحضار علم کا کمال یہ تھا کہ مبارک پور کے ابتدائی زمانۂ تدریس میں جب کہ تیرہ کتابوں کا روزانہ درس دیتے اور دوسری دینی مصروفیات میں ہمہ تن مشغول رہتے۔ بعض ایام میں مطالعے کا وقت بالکل نہ مل سکا۔ اور ترمذی شریف کا درس بلا مطالعہ جاری رہا۔ قاری اسد الحق صاحب جو بریلی شریف میں حافظ ملت کے ہم مدرسہ طالب علم رہ چکے تھے، مبارک پور میں حضرت سے ترمذی شریف پڑھ رہے تھے۔ کئی دنوں بعد حضرت نے فرمایا: مطالعہ کا وقت نہیں مل پاتا اور بلا مطالعہ پڑھا رہا ہوں۔ قاری اسد الحق صاحب حیران وششدر رہ گئے۔ عرض کیا: ہمیں تو امتیاز بھی نہ ہو سکا۔ اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں جو استحضار علم کی بین دلیل ہیں۔

وہ عظیم مناظر تھے۔ ایسے مناظر کہ تمام درسی مصروفیات کے ساتھ ساڑھے چار ماہ تک شبانہ تقریریں جاری رکھیں اور احقاق حق اور ابطال باطل کا حق ادا کر دیا۔ واضح رہے کہ مناظر کے لیے صرف درسگاہی علم ومطالعہ کافی نہیں ہوتا اس کے لیے مختلف علوم وفنون کا وسیع مطالعہ، ان کا استحضار، کمال اظہار، حسنِ تفہیم، قوت استدلال سبھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور حافظ ملت کے اس مناظرہ سے ان سبھی کمالات کا ثبوت فراہم ہو گیا۔

اسی کمال مناظرہ کا زندہ ثبوت ”العذاب الشدید“ ہے جو آج تک لاجواب ہے۔ حافظ ملت فرماتے تھے: اللہ

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، انوار حافظ ملت نمبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء

کے عذاب کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ ”مقامع الحدید“ منظر عام پر آنے کے بعد صرف ایک ہفتہ میں ”العذاب الشدید“ کا مسودہ مکمل ہو گیا۔ اس سے علم اور استحضار علم دونوں کا اندازہ کیجیے۔

وہ شاندار خطیب تھے۔ ایسے خطیب کہ زمانۂ طالب علمی میں ہی ان کا دعویٰ تھا کہ کوئی بھی موضوع دیا جائے، بغیر کسی تیاری کے فوراً اس موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کر سکتا ہوں۔ امتحان کے لیے ایک بار دعاے قنوت کو عنوانِ خطاب تجویز کیا گیا اور انھوں نے اپنے دعوے کی تصدیق مکمل طور پر فراہم کر دی۔

بڑی بڑی کانفرنسوں میں جہاں مقررین بولتے ہوئے سہمتے ہوں انھوں نے حیرت انگیز اور اثر آفریں تقریریں کیں۔ ان کی خطابت بھی عصر حاضر کے بعض مقررین کی طرح محض خطابت نہ تھی بلکہ الفاظ کے ساتھ معانی، بیان کے ساتھ علم وفکر اور شوکت خطابت کے ساتھ قوت استدلال کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بھی نظر آتا۔ مواد کی فراوانی اس قدر ہوتی کہ بعض مقررین کہتے تھے کہ ہم ان کی ایک تقریر بغور سن لیتے ہیں اسی سے تین تقریریں بن جاتی ہیں اور کسی مطالعہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ نکات اتنے جامع اور فکر انگیز ہوتے کہ ماہر مقررین نے ان کے بعض نکات میں سے کسی ایک کو لے کر پوری تقریر تیار کر لی۔

وہ باکمال مدرس تھے، اور تدریسی کمال پر ایسا عبور تھا کہ ایک بار مجھ سے فرمایا: دار العلوم اشرفیہ میں کسی وقت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے تلمیذ شہیر ملک العلما مولانا ظفر الدین احمد بہاری علیہ الرحمہ کو صدر المدرسین کی حیثیت سے لانے کی تجویز ہوئی۔ حافظ ملت نے سنا تو فرمایا بڑی خوشی ہے وہ تشریف لائیں۔ میں خادم ہوں خدمت کرتا رہوں گا۔ میں نے دس سال تک صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی کفش برداری کی ہے حضرت مولانا تشریف رکھیں گے اور میں ان کے سامنے درس دوں گا۔

ماہرین تدریس جانتے ہیں کہ یوں طلبہ کے سامنے تقریر وتفہیم آسان ہوتی ہے۔ لیکن کسی متبحر وماہر عالم کے سامنے کمزور علم والے کا آتا ہوا مضمون بھی غائب ہو جاتا ہے۔ اور گرمی تقریر وتفہیم سرد ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر حافظ ملت اس میدان کے بھی باکمال شہسوار تھے۔

میں نے صرف ”بلند پایہ عالم“ کہا۔ علم کی مختلف شاخوں کو لے لیجیے وہ بلند پایہ محدث، مفسر، مفتی، اصولی کلامی، معقولی سبھی کچھ تھے اور ہر ایک کے شواہد موجود ہیں۔

وہ عالم گر تھے ایسے عالم گر کہ آج بر صغیر کی مشہور درسگاہوں کے اہم عہدوں پر ان کے تلامذہ جلوہ گر ہیں۔ وہ خطیب گر تھے اور ایسے خطیب گر کہ میدان خطابت میں ان کے تلامذہ کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ اسی طرح مناظرہ واِفتا، تصنیف وتحریر ہر شعبے میں ان کی درسگاہ فیض کے تربیت یافتہ ماہرین ضوفشاں ہیں۔

وہ صرف عالم ہی نہیں، علم پر پورے طور سے عامل بھی تھے۔ ایسے عامل کہ فرائض وواجبات تو فرائض وواجبات ہیں جن آداب و مستحبات کو انھوں نے اپنالیا تا زیست ترک نہ ہونے دیا۔ افضل الاعمال ادومہا پر کاربندی دیکھنا ہو تو کوئی حافظ ملت کی زندگی دیکھے۔

نماز تہجد کو اپنایا تو سفر میں بھی کبھی قضا نہ ہونے دیا۔ سو رکعت نماز نصف شعبان کو اپنایا تو زندگی کے آخری سال تک جاری رکھا۔ روایت میں اختلاف ہوا تو ۲۹/اور ۳۰/دونوں کے حساب سے دو دن بعد مغرب سو، سو رکعتیں ادا کیں۔ عمامہ سر پر باندھا تو سال دس سال نہیں زندگی بھر التزام رہا۔ سنن مؤکدہ و غیر مؤکدہ جن کا التزام کیا سفر میں بھی ترک نہ ہونے دیا حالاں کہ سفر میں جب فرار و عدم قرار کی حالت ہو، سنن مؤکدہ معاف ہیں۔ کسی جلسہ کا وعدہ کر لیا تو بیماری کے باوجود اس کی پابندی کی۔ علامہ ارشد القادری سے فیض العلوم کے سالانہ جلسۂ شب برات کا وعدہ کیا تو اسے تاحیات نبھایا۔ یہاں تک کہ دو سال تک داعی خود ہندوستان سے باہر برطانیہ میں، مگر حضرت جلسہ میں موجود۔ اس طرح کے بے شمار واقعات حافظ ملت کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ اور اس پابندی کے ساتھ کہ عقل دنگ ہے، مشاہدہ محو حیرت ہے۔ ایک واقعہ قاری عبدالحکیم صاحب عزیزی کے مضمون میں چڑیوں کو غذا رسانی کی پابندی سے متعلق پڑھا۔ اور حیران و ششدر رہ گیا۔

میں صفر ۱۳۹۳ھ میں مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہ سے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ رضویہ میں بریلی شریف میں بیعت ہوا۔ پابندی سے شجرہ خوانی کی تاکید تھی مگر کوشش کے باوجود کبھی کبھی مجھ سے ناغہ ہو جاتا تھا۔ میں حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ کم مشاغل کے باوجود شجرہ پڑھنا مجھ سے چھوٹ جاتا ہے ہمارے پیران بزرگ جو دن رات کاموں اور متنوع لوگوں کے ہجوم میں رہتے ہیں کیسے پابندی کرتے ہوں گے؟۔ شاید ان کے لیے کچھ رخصت ہو؟۔ ۲۹/صفر ۱۳۹۴ھ کو میں اور برادر گرامی مولانا عبدالمبین نعمانی سلسلۂ قادریہ معمریہ میں داخل ہونے کے لیے حافظ ملت کے یہاں پرانے مدرسہ بعد ظہر حاضر ہوئے۔ اس سلسلے میں طالب ہونے کا اشتیاق اس لیے تھا کہ حافظ ملت کے مرشد حضرت شاہ علی حسین صاحب اشرفی میاں علیہ الرحمہ سے غوث پاک تک اس میں صرف چار واسطے ہیں۔ حضرت حافظ ملت نے ہمیں سلسلۂ معمریہ میں داخل کیا اور فرمایا کہ "شجرہ کی پابندی کرتے رہنا، میں جب سے بیعت ہوا کبھی شجرہ خوانی کا ناغہ نہ ہوا۔"

اس ارشاد سے شجرہ خوانی کے بارے میں میرے مذکورہ بالا خیال کی تردید ہوگئی۔ اور حضرت کی پابندیِ معمولات کا ایک اور نقش ذہن میں مرتسم ہوگیا۔ مزید فرمایا کہ "بریلی شریف میں بھی یہ سلسلہ ہے مگر اس میں ایک واسطہ زیادہ ہوجاتا ہے۔" اس جملے کا میرے مذکورہ خیال سے کوئی ربط نہ تھا اس لیے میں نے یہی سمجھا کہ ہماری معلومات میں اضافے کے لیے اپنے سلسلہ کی مزید ایک خصوصیت بتادی ہے۔ مگر باہر آنے کے بعد مولانا نعمانی

صاحب نے بتایا کہ حضرت کے یہاں سلسلہ معمریہ میں داخل ہونے کے لیے آپ کے کہنے پر میں آگیا۔ لیکن بار بار مجھے یہ خیال آتا تھا کہ یہ سلسلہ بریلی شریف میں بھی ہے۔ اگر وہیں ہم لوگ اس سلسلے میں داخل ہوتے تو بہتر ہوتا کہ سلسلۂ بیعت اور سلسلۂ طلب دونوں ایک ہی جگہ سے منسلک رہتے لیکن حضرت نے جب یہ فرمایا کہ وہاں ایک واسطہ زیادہ ہوجاتا ہے تو میرا انقباض دور ہوگیا۔ اور خوشی ہوئی کہ اس طرح ایک واسطہ کم ہوگیا۔

میں نے خواطر پر کلام کرتے ہوئے حافظ ملت کو بارہا پایا۔ میں تو اسے فراست ایمانی اور روشن ضمیری ہی سمجھتا ہوں۔ کوئی چاہے تو محض حسن اتفاق بھی کہہ سکتا ہے۔ مجھے اس پر اصرار نہیں۔ اصل کرامت استقامت علی الشریعۃ ہے جو حافظ ملت میں بدرجۂ کمال موجود تھی۔

مگر اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ وہ عظیم روحانیت کے حامل تھے اور متعلقین پر ان کا تصرف اور ان کی روحانی دستگیری دوریوں کے باوجود جاری رہتی تھی۔ خود مجھے ان کے وصال کے وقت تو کرب و غم کے سوا کچھ پتہ نہ چلا لیکن جب چالیس دن پورے ہوگئے تو اپنے اندر "انکرنا قلوبنا" کی کیفیت میں نے بیّن طور پر محسوس کی۔ یہ ایک سچے نائب رسول عظیم، صاحبِ روحانیت اور کریم دست گیر کے فیضانِ حیات سے محرومی کا کرشمہ تھا جو کشت زارِ دل کی پژمردگی کی صورت میں عیاں ہوا۔

شعبان ۹۵ھ میں حافظ ملت شب براءت کے اجلاس میں شریک تھے۔ لوگوں نے فیض العلوم اور جمشید پور کی مختلف ضروریات ذکر کیں، اور عرض کیا کہ اب علامہ ارشد القادری کی طویل غیر موجودگی سے معاملات بگڑتے جارہے ہیں۔ حافظ ملت نے بڑی ہمدردی سے سنا اور فرمایا کہ میں ان کو لکھوں گا کہ واپس آجائیں۔ اجلاس کی تقریر میں بھی فرمایا کہ آپ لوگ پریشان نہ ہوں میں ان کو بہت جلد بلاؤں گا۔ وہ آئیں گے۔ میں اس سال مولانا فضل حق غازیپوری کی کچھ ضرورت سے تعطیل کے بعد ان کے مدرسہ دارالقرآن میں مقیم رہا۔ غالباً ان کی روداد مرتب کرنی تھی یا وہ فن فرائض کی مشق کر رہے تھے۔ چند دنوں بعد مولانا کے بڑے صاحبزادے غلام ربانی نے خبر دی کہ ابا کا ٹیلی گرام موصول ہوا ہے۔ وہ پرسوں برطانیہ سے یہاں واپس پہنچ رہے ہیں۔ علامہ ارشد القادری واپسی کے دو ماہ بعد ماہ شوال میں مبارک پور آئے، اس موقع پر لال چوک کے پاس ایک جلسۂ عام میں بیان کیا کہ "حافظ ملت نے مجھے کوئی خط تو نہیں لکھا البتہ میرے دل پر تصرف کیا۔ مجھے شب براءت کے بعد واپسی کی بے قراری ہوگئی۔ اہلیہ کی علالت کا ایک خط مجھے ملا تھا وہی میں نے سبب بتا کر لوگوں سے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا اور ویزا وغیرہ لے کر واپس آگیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۲۲/شعبان کو وہ جمشید پور پہنچ گئے۔

اس طرح کے بہت واقعات متعلقین کے ساتھ پیش آئے ہیں جو قلمبند ہوکر سامنے آئیں تو اس بات کی

شہادت کے لیے کافی سے زیادہ ہوں گے کہ حافظ ملت عظیم روحانیت اور عظیم تصرفات کے مالک بھی تھے۔

وہ بہترین مدبر تھے۔ ان کے ناخنِ تدبیر سے سیکڑوں مشکل مسائل کی گتھیاں سلجھیں۔

وہ ایک دوراندیش اور معاملہ فہم منتظم تھے۔ جن کی دوراندیشی سے بہت سے معاملات کا حل اور بہت سے مسائل کا جواب پہلے ہی موجود ہوتا۔

وہ عظیم قوت فیصلہ اور بے پناہ قوت ارادی کے مالک تھے۔ علمی مسائل ہوں یا انتظامی معاملات منٹوں اور سیکنڈوں میں انھیں مستحکم فیصلے سناتے دیکھا گیا ہے۔ اور جو فیصلہ کر دیتے اس پر یوں قائم رہتے کہ بعض اوقات پوری بالادست انتظامیہ اور عوام کی کثیر جماعت بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتی۔ قوت ارادی کا حال یہ تھا کہ جس کام کا عزم کر لیتے اسے مکمل کر کے ہی دم لیتے۔ انھوں نے آندھیوں کی زد پر چراغ جلائے اور دنیا محو حیرت دیکھتی ہی رہی۔

ان کے حسن تدبر، دوراندیشی، معاملہ فہمی، سرعت فیصلہ اور قوت ارادہ کا اعتراف اپنوں نے بھی کیا، غیروں نے بھی کیا۔ ان عنوانات پر واقعات وشواہد بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔

وہ عظیم سیاسی بصیرت اور ایمانی حکمت وقیادت میں بھی منفرد مقام رکھتے تھے۔ محدود ماحول میں تو اس کی بہت مثالیں ہیں۔ ملکی پیمانے پر ان کی فکرِ رسا کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی کتاب ”الارشاد“ دیکھنا چاہیے۔

وہ ایک انقلاب آفریں اور عہد ساز شخصیت تھے اس کے ثبوت کے لیے مبارک پور کی سرزمین اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ گواہ ہے۔ انھوں نے علم وآگہی، دین وحکمت، قرطاس وقلم اور تحریک وتنظیم کی جو جوت جگائی ہے، آج چہار سو نظر آ رہی ہے۔

انھوں نے مبارک پور کے گمنام قصبہ سے عظمت دین اور اشاعت علوم کا جو صور پھونکا ہے، آج ہندوستان کے چپہ چپہ سے اس کی آواز بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ انھوں نے بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ کر خدمت دین کی راہ میں ایثار وقربانی، اور استقلال واستقامت کا جو درس دیا ہے ان کے تلامذہ کے ذریعہ ملک وبیرون ملک مختلف تحریکوں، تنظیموں اور اداروں کی زندگی میں اسی درس کا فیضان آج بھی کار فرما ہے۔

اب ان کے اخلاق گراں مایہ کو دیکھیے۔ علم وفن کی گہرائی، تحقیق وتدقیق کی گیرائی اور تعلیم وتدریس کی جولانی صرف اہل نظر کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن اخلاق ومروت کی شمیم جانفزا ہر خاص وعام کے دل میں گھر کرتی ہے۔ اخلاق وکردار ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان کے باطن وضمیر کا عکس بہت صاف دکھائی دیتا ہے۔ حافظ ملت ہمدردی وغم گساری، تواضع وخاکساری، بلند ہمتی، وعالی ظرفی، چشم پوشی ورواداری، صاف دلی وقدر افزائی، سخاوت

وفیاضی، شجاعت وپامردی وغیرہ، ہر وصف میں اس درجہ کمال پر فائز تھے کہ اس کمال کے ساتھ ایک وصف بھی کسی میں اتر آئے تو اسے امتیاز واختصاص کے آسمان پر پہنچانے کے لیے کافی ہو۔ میں یہاں چند اوصاف سے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو کر رہا ہوں

ہمدردی وغم گساری:

انسان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفع وضرر اور راحت والم کی فکر رکھے وہیں اس کا اخلاقی فریضہ ہے کہ دوسروں کا بھی خیال رکھے۔ اس کے بغیر اجتماعی ومعاشرتی زندگی بے کیف بلکہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ آج تمام قومیں اس ضرورت کو محسوس کر رہی ہیں اور ہر چہار جانب یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ خود نبی برحق صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں اس پر کافی زور دیا، انھوں نے جو معاشرہ تشکیل دیا اس میں یہ باتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ صحابہ کرام کے درمیان عقد مواخات اس نیک جذبۂ انسانی کا ایک ایسا مظہر ہے جس کی مثال اقوام عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آج بھی کسی نہ کسی حد تک باہمی ہمدردی کا جذبہ اہل اسلام اور دوسری اقوام کے اندر پایا جاتا ہے۔ لیکن عملی دنیا میں جس کے اندر اس جذبے کا دائرہ جس قدر وسیع ہوگا اسی قدر اسے شرف وکمال اور امتیاز وافتخار حاصل ہوگا۔ عموماً انسان اپنے قرابت داروں، دوستوں، تجارت ومعاملت یا کسی صنعت وحرفت، ضرورت اور حاجت کے تحت تعلق رکھنے والوں کے دکھ سکھ میں حصہ لیتا ہے لیکن زیادہ باوقار اور باعظمت انسان وہ ہوتا ہے جس کا صاف وشفاف دل اور جس کا موثر وطاقتور ضمیر اسے بے غرض اور بے نمود ہمدردی وغم گساری کے لیے آمادہ وتیار رکھتا ہو اور جو اپنوں کی طرح دوسروں کے لیے بھی سرگرم عمل نظر آتا ہو۔

حافظ ملت کی مثالی زندگی پر منصفانہ نظر رکھنے والے اگر سرسری طور سے بھی اپنے مشاہدات اور یادداشتوں کا جائزہ لیں تو اس وصف کے تعلق سے انھیں واقعات وشواہد اتنی وافر مقدار میں دستیاب ہوں گے جو اس گراں بہا صفت میں بھی حافظ ملت کے مقام عظمت وامتیاز کے اعتراف کے لیے کافی سے زیادہ ثابت ہوں گے۔

ہمدردی وغم گساری کا لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس کے دامن میں متعدد اوصاف واخلاق جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ بیماروں کی عیادت، جنازوں میں شرکت، پس ماندگان کی تعزیت، غریبوں کی امداد، کسی بھی آفت ومصیبت میں گرفتار ہونے والوں کی تسکینِ خاطر یا حسب وسعت اعانت ودستگیری، یہ سب اسی ہمدردی وغم گساری کی شاخیں ہیں۔ آئیے حافظ ملت کی زندگی میں ہم ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

عیادت:

حافظ ملت عوامی زندگی سے بہت قریب تھے اور لوگوں کے مرض والم سے باخبر ہونے میں انھیں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ لیکن زیادہ حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ اگر کسی کی بیماری و پریشانی سے متعلق واسطہ در واسطہ بھی خبر مل جاتی یا بر سبیل تذکرہ بھی کسی کی بیماری سن لیتے تو کوئی نہ کوئی وقت نکال کر بہت جلد اس کی عیادت کو پہنچ جاتے۔ اس میں نہ کسی عالم و فاضل کی تخصیص تھی نہ کسی امیر و غریب کی، نہ مرید و شاگرد کی، نہ عزیز و رشتہ دار کی، نہ عقیدت کیش و نیاز مند کی، اگر کچھ خصوصیت تھی تو ایسے افراد کی جو دین دار اور دین پرور ہوں۔ وہ ایسے بیماروں کے یہاں بھی چلے جاتے تھے جنھیں یہ توقع بھی نہ ہوتی کہ ہمارے گھر کو اس موقع سے کبھی حافظ ملت کی آمد کا شرف حاصل ہوگا۔

مبارک پور کی سرزمین سے تو ایسے بے شمار واقعات وابستہ ہیں، کاش وہ قید تحریر میں بھی آئیں۔ اطراف و جوانب مثلاً خیر آباد، محمد آباد، بھیرہ، گھوسی، ادری وغیرہ کے لوگوں سے بھی حسب اطلاع اسی قسم کا معاملہ تھا۔ اگر کہیں باہر تشریف لے گئے اور وہاں کسی مریض کو جان لیا تو اس کی عیادت کے لیے بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔ ربیع الآخر ۱۳۹۵ھ کی بات ہے۔ میں مدرسہ فیض العلوم جمشید پور میں تھا۔ مدرسہ کے کچھ طلبہ شام کو ایک محلہ میں قرآن خوانی کے لیے گئے، اتفاقاً جس گھر پر طلبہ تھے اس کے پاس سے غیر مسلموں کا ایک جلوس گذرا۔ جلوس والوں نے الزام لگایا کہ اس گھر سے ہمارے جلوس پر پتھر آیا ہے جس کے نتیجہ میں پولیس نے گھر والوں خصوصاً طلبہ کو زدوکوب کیا اور تھانے لے گئے۔ رات گئے کچھ لوگوں کو معلوم ہوا تو طلبہ کو تھانے سے چھڑا کر مدرسہ لائے، اس وقت علامہ ارشد القادری صاحب برطانیہ میں تھے، خیر یہاں زخمی طلبہ کی مرہم پٹی ہوئی اور علاج و معالجہ ہوتا رہا اس وقت حافظ ملت علیہ الرحمہ مدرسہ سے تقریباً آٹھ کلومیٹر دور محلہ جگسلائی میں گیارہویں شریف کے جلسوں کے سلسلے میں قیام پذیر تھے، طلبہ سے متعلق خبر ملی تو دھتکی ڈیہہ عیادت کے لیے تشریف لائے، طلبہ کو دیکھا اور انھیں تسلی دیتے ہوئے مؤثر کلمات سے نوازا اور واپس ہوئے۔

دور طالب علمی میں ایک بار میں اشرفیہ میں بیمار پڑا۔ کسی طرح حضرت کو معلوم ہو گیا۔ اچانک دیکھتا ہوں کہ حضرت خلاف معمول نیچے میرے کمرے میں تشریف لا رہے ہیں، قریب آئے، حال پوچھا۔ ہدایت کی اور دعائیں دے کر تشریف لے گئے۔

اسی طرح ایک بار بیمار ہو کر گھر آگیا اور ایک ہفتہ کے بعد واپس ہوسکا تو وقت ملاقات فرمایا: تمھارے لیے بہت دعائیں کیں، مجھے معلوم ہو جاتا تو جانے نہ دیتا، یہیں علاج ہو جاتا۔ ایک بار میرے والد صاحب کی علالت سن لی تو

محمد آباد ایک جلسہ میں جاتے ہوئے خیر آباد سے رکشہ چھوڑ کر پیادہ بھیرہ تشریف لائے پھر پیادہ محمد آباد گھاٹ سے شریف لے گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی زندگی میں عیادت کے واقعات ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے جب کہ مصرفیات اس قدر تھیں کہ دس پانچ منٹ بھی خالی رہنا مشکل تھا۔ مگر عزم و ہمت اور تدبیر و حکمت سے وہ سب کچھ کر لیا کرتے تھے۔ صالح اور سچا عزم و اخلاص ہو تو تائید غیبی بھی یاوری کرتی ہے۔

شرکت جنازہ:

نہ معلوم کتنے افراد ہیں جن کے جنازوں میں حافظ ملت نے شرکت کی اور زیادہ تر وہی ہیں جن سے نہ تو دوستی کا رشتہ ہے نہ ارادت و شاگردی کا، اور نہ ہی قرابت کا تعلق، صرف دین و ایمان کا رشتہ ہی وہ قوی محرک تھا جو بیماروں کے گھروں کی طرح انھیں مرنے والوں کے جنازوں تک بھی کھینچ لاتا۔ بعض اوقات اس کے لیے سخت صعوبت و پریشانی بھی اٹھانی پڑتی۔ خود بیان فرمایا کہ موضع املو (جو حافظ ملت کی قیام گاہ سے ایک کلومیٹر دوری پر واقع ہے) وہاں کے ایک شخص نے وصیت کی تھی کہ میرا جنازہ حضرت پڑھائیں۔ بعد وفات لوگوں نے اطلاع دی۔ گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کا وقت، چلچلاتی ہوئی دھوپ، اور اس زمانے میں سواری نایاب مگر صرف ایک مسلمان کی وصیت کی تکمیل اور اس کے جنازہ میں شرکت کے لیے بلا توقف پیادہ تشریف لے گئے۔

مضافات مبارک پور اور قریبی علاقوں سے بھی اگر کسی کے جنازے کی خبر آجاتی تو اس زمانے میں سواریوں کی تمام تر صعوبتوں کے باوجود شرکت فرماتے۔

تعزیت:

اس سنت کا التزام تھا۔ جنازہ میں شرکت فرمائی تو بعد جنازہ میت کے گھر آکر پس ماندگان کو کلمات تسلی سے نوازتے اور اگر بعد میں اطلاع ملی تو بھی کم از کم تعزیت سے باز نہ رہتے۔ مجھ سے پہلے میرے آٹھ نو بھائی بہن کمسنی ہی میں انتقال کر گئے۔ میرے والدین کا بیان ہے کہ جب بھی کسی بچے کا انتقال ہوا اس کے بعد حضرت ضرور تشریف لائے اور آتے تو آیات و احادیث کی روشنی میں ایسی دلنشین باتیں فرماتے جن سے بڑا صبر و سکون ملتا۔ اور کافی حد تک پے بہ پے صدمے کا غم غلط ہو جاتا۔

حاجت مندوں کی امداد:

حافظ ملت کوئی بڑے دولت مند اور صاحب ثروت تو نہ تھے لیکن جو کچھ رکھتے تھے اسے ضرورت مندوں پر خرچ کرنے سے دریغ نہ تھا۔ قدرت نے اس دلِ درد مند میں جو سوز و گداز ودیعت فرمایا تھا اس سے ممکن نہ تھا کہ کسی پریشان

حال کو دیکھ کر اس کی فکر نہ ہو۔ اور زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بعض اوقات بہت سے لوگوں کی ضرورت وپریشان حالی سے ان کے قریبی احباب بھی آشنا نہ ہو پاتے لیکن حافظ ملت کی نگاہیں بہت جلد اس کا اندازہ کر لیتیں۔ پھر ہو کا تو خود یا کسی اور کے ذریعہ حاجت روائی فرماتے۔ یہ چند سال کا معمول یا چند افراد کے ساتھ خصوصی برتاؤ نہ تھا بلکہ زندگی بھر کی عادت کریمہ اور ایک عام طریقہ تھا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ اس امداد واعانت کا اپنی زبان سے تذکرہ تو دور کی بات ہے کسی اور ذریعہ سے بھی اس کا اظہار ممکن نہ تھا، بلکہ لینے والا اگر خود نہ بتائے تو کوئی جان بھی نہ سکتا تھا۔

مولانا قاری محمد حسین صاحب اعظمی امام جامع مسجد جگسلائی جمشید پور نے ایک بار اپنے ساتھ حضرت کی عنایتوں کا حال بیان کیا (مجھے یاد آتا ہے کہ انھوں نے یہ اس تعزیتی اجلاس میں بیان کیا تھا جو حافظ ملت کی رحلت کے چند دنوں بعد جگسلائی جامع مسجد میں منعقد ہوا تھا۔)

وہ کہتے ہیں کہ جب میں اشرفیہ میں زیر تعلیم تھا، ایک وقت والد صاحب نے خانگی پریشانیوں کی وجہ سے مجھے تعلیم چھوڑنے کے لیے کہا لیکن حافظ ملت کو معلوم ہوا تو انھوں نے تکمیل کا حکم دیا اور میری کفالت خود اپنے ذمہ کر لی۔ بعد میں والد صاحب نے میری شادی کر دی کہ شاید اس وجہ سے ترک تعلیم پر مجبور ہو مگر حافظ ملت نے میرے ساتھ میری اہلیہ کے اخراجات کا بھی ذمہ لے لیا اور کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ میری فراغت ہو گئی۔

اس واقعے سے جہاں حافظ ملت کی ہمدردی اور بے لوث سخاوت کا علم ہوتا ہے وہیں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں تعلیم کی کس قدر اہمیت تھی اور اپنے طلبہ پر کس درجہ شفیق ومہربان تھے کہ خود کو بڑی ثابت قدمی اور خوش دلی سے صعوبت ومشقت اٹھانے کے لیے آمادہ کر لیتے لیکن کسی عزیز کی دینی تعلیم کا جو سلسلہ جاری ہے اس کا منقطع ہونا گوارا نہ فرماتے۔

قاری صاحب موصوف ہی بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں میں حافظ ملت کے گھر (پرانے مدرسہ) رہتا تھا ایک بار مبارک پور میں کاروبار پر سخت انحطاط آیا۔ یوں تو کساد بازاری ہوتی رہتی تھی لیکن اس وقت مندا اتنا زیادہ تھا کہ بہت سے گھروں میں فاقہ کی نوبت آ گئی تھی، لوگ طرح طرح کی پریشانیوں سے دوچار تھے۔ کچھ لوگ حضرت کے گھر تنہائی کے وقت آتے۔ حضرت ان کی سقیم حالت دیکھ کر سمجھ جاتے اور کچھ کہے بغیر اندر سے دال چاول وغیرہ اور کچھ نقد لا کر چپکے سے دے دیتے۔ یہ معاملہ میں نے بہت سے لوگوں کے ساتھ دیکھا اور بارہا دیکھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ حافظ ملت کا یہ سلوک ایسا تھا جس سے پاس پڑوس کے لوگ اور لینے والوں کے قریبی آشنا ورشتہ دار بھی واقف نہیں ہو سکتے تھے اس لیے کہ حافظ ملت تو اسے کبھی زبان پر لا ہی نہ سکتے تھے ہر طرح اخفا ہی کی کوشش کرتے اور لینے والے بھی اپنی عزت کے خیال سے اس کا ذکر نہیں کر سکتے تھے۔ خود میں اگر گھر کے ایک فرد کی طرح وہاں قیام پذیر نہ ہوتا تو مجھے بھی اس کی کوئی خبر نہ ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دردوغم حافظ ملت کے رگ وپے میں کس طرح

کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ معیشت کی خرابی کا اثر اشرفیہ اور مدرسین پر بھی ضرور پڑا ہوگا۔ بلکہ خود اشرفیہ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسے ایام میں مدرسین کو سخت پریشانیوں اور صبر آزما مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں خود اپنی ضروریات اور اپنے متعلقین کی کفالت کا انتظام ہی بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ دوسرے حاجت مندوں کی طرف التفات کا سامان کرنا، تو اور بھی مشکل ہے۔ لیکن حافظ ملت کے اخلاص وتقوی اور دردمندانہ کردار وعمل کو دیکھ کر ان آیات کریمہ کی تفسیر محسوس شکل میں نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا. وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ. [1]

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ. [2]

اور جو خدا کا تقوی رکھتا ہو اللہ اس کے لیے کشادگی کی راہ پیدا کر دے گا اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے۔

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

سخاوت وفیاضی:

غالباً اسے الگ سے بیان کرنے کی ضرورت نہ رہی، گزشتہ واقعات وشواہد سے ان کی کشادہ دلی اور بذل وسخا کے مناظر خود ہی عیاں ہیں۔ البتہ اس کا اعلان واظہار کم ہی ہو پاتا۔ بہت سے ضرورت مند طلبہ کو وہ ان کے خرچ کے لیے اکثر وبیشتر خفیہ طور پر دے دیا کرتے تھے، یہ اس لیے کہ قرآن وحدیث میں اسے زیادہ اچھا قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی لینے والے کی خودداری اور عزتِ نفس کا پاس ولحاظ بھی ملحوظ خاطر ہوتا۔ مدارس ومساجد کے چندوں میں بھی وہ مالی اعانت سے حصہ لیتے اور کبھی کبھی اس کا اعلان بھی ہو جاتا۔ قرآن میں اسے بھی دوسروں کی ترغیب کے پیش نظر اچھا قرار دیا گیا ہے۔ جامعہ اشرفیہ کی تعلیمی کانفرنس پھر جشن افتتاح کے مواقع پر حافظ ملت، ان کے برادران اور متعدّد افراد خانہ کے تعاون کا اعلان بھی ہوا۔

اعزہ ومتعلقین سے حسنِ سلوک:

کشادہ دلی کا اس میں بھی دخل ہوتا ہے۔ حافظ ملت کے چھوٹے بھائی حافظ عبدالرشید صاحب مرحوم ایک بار حضرت کے حسن سلوک کا ذکر فرمانے لگے کہ حافظ ملت کی عادت ہے کہ گھر پر ہم لوگوں کو کوئی سامان یا کھانے

---

[1] سورۂ طلاق: ۳-۲

[2] سورۂ اعراف: ۹٦

پینے کی چیز لاکر دیا کرتے ہیں۔ اور انکار کرنے پر اصرار کر کے فرماتے ہیں کہ "ملتے کو انکار نہیں کرتے۔" مزید فرمایا کہ "انھوں نے ہم لوگوں کو کبھی کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی۔ خدا ان کا سایہ دراز فرمائے۔ ہمیں ان کا صدمہ نہ دکھائے۔ ہمارے بہت بعد تک انھیں باقی رکھے۔" مگر مشیت ایزدی میں کسے چارہ ہے؟ حافظ ملت کا وصال پہلے ہوا۔ لیکن حافظ عبد الرشید صاحب فراق کا صدمہ زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکے، یکم جمادی الآخرہ ۱۳۹۶ھ مطابق ۳۱/ مئی ۱۹۷۶ء دو شنبہ گزار کر رات کو حافظ ملت کا وصال ہوا اور حضرت کے برادر عزیز ممدوح جون ۱۹۷۹ء میں تین سال بعد ہی ان سے جا ملے۔ رحمهما الله رحمة واسعة.

جمشید پور تشریف لاتے تو علامہ ارشد القادری کے بچوں کو اس دور کے لحاظ سے کم و بیش ایک ایک دو دو روپیہ ہر ایک کو ضرور دیتے، اس معمول میں بھی کبھی فرق نہ آیا، کئی سال علامہ موجود نہ تھے مگر حضرت کا سلوک اپنی جگہ برقرار رہا۔ ایک بچی جو ذرا ہوشیار ہو گئی تھی ڈر کی وجہ سے نہ آئی تو حضرت اسے بھولے نہیں۔ چلتے چلتے اسے بلوایا اور دیا۔ واپسی پر اس نے قدم پر ہاتھ لگا کر چومنا چاہا تو حضرت نے سخت ناگواری ظاہر کی اور اس کے بڑے والد کا نام لے کر فرمایا کہ وہیں سے یہ تم لوگوں نے سیکھا۔ انھوں نے تمھاری عادت بگاڑ دی۔

عموماً بڑے لوگوں کو چھوٹے اور بہت چھوٹے لوگوں کی دلجوئی کا خیال کم ہی آتا ہے مگر اس خصوص میں بھی حافظ ملت کا کردار عام بڑے لوگوں سے مختلف تھا۔ کوئی سفر میں ساتھ ہے تو اس کی ضرورت اور کھانے پینے کا پورا خیال رکھتے۔ دعوت میں کوئی ساتھ گیا اور کھانے کے وقت دسترخوان پر حاضر نہیں یا لوگوں نے ناواقفی میں اسے پیچھے کر دیا تو خود یاد فرماتے اور جب تک بلا نہ لیتے کھانا شروع نہ فرماتے۔ اس طرح کے واقعات میرے ساتھ بھی گزر چکے ہیں۔ صرف ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں۔

جمشید پور محلہ آزاد نگر کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے حضرت تشریف لے گئے تھے۔ قیام دھتکی ڈیہ مدرسہ فیض العلوم میں تھا۔ دونوں محلوں میں قریباً آٹھ کیلو میٹر فاصلہ ہوگا، جلسہ میں شرکت کے لیے ایک سامع کی طرح میں بھی پہنچ گیا۔ اختتام کے بعد روڈ کی طرف آیا کہ کوئی سواری ملے تو دھتکی ڈیہ جاؤں، رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ سواری ملنے میں پریشانی لازمی امر تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ٹیکسی جانے والی ہے اس کی طرف بڑھا قریب پہنچا تو یہ دیکھا کہ اس سے حافظ ملت اور دوسرے بزرگ علما تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس وقت میں فیض العلوم میں سینیر مدرس تھا مگر کم عمری کی وجہ سے میری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہ تھی، اس لیے معزز مہمانوں نے پہچاننے کے باوجود التفات کی کوئی ضرورت نہ سمجھی، میں بھی مطمئن تھا کہ اور بھی سامعین آئے ہیں کسی ٹیکسی والے کو تیار کر ہی لیا جائے گا۔ اتنے میں حافظ ملت نے مجھے دیکھ لیا اور فرمایا بیٹھ جاؤ۔ میں نے عرض کیا اس میں تو جگہ نہیں

ہے۔" فرمایا: "جگہ تو دل میں ہوتی ہے۔" حضرت کی زبان سے یہ سننا تھا کہ بزرگ ہم نشینوں کو خیال ہوا اور آسانی سے میرے لیے جگہ نکل آئی۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر ایسے ہی واقعات سے معاشرہ میں رواداری، کشادہ قلبی اور خرد نوازی کا امتحان ہوتا ہے۔

حافظ ملت کے اخلاق و محاسن کے عنوانات اور ان سے متعلق شواہد و واقعات بہت ہیں سب کو سمیٹنا سب کی ذمہ داری ہے۔ میں چند واقعات و حالات اور پیش کرتا ہوں ان کے مناسب عنوانات ناظرین خود قائم کر لیں۔

تواضع و بے نفسی:

(۱) حافظ ملت نے مجھ سے ایک بار بیان فرمایا کہ حضرت شاہ علی حسین صاحب اشرفی میاں علیہ الرحمہ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں اجمیر شریف پہنچے ان کے پاس سلسلۂ معمریہ تھا جس میں غوث اعظم تک صرف چار واسطے ہیں۔ ہم چالیس رفقائے درس ایک ساتھ اس سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ اور سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ میں طالب ہوئے۔ بعد میں جب میں مبارک پور آیا اور یہاں حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ کی تشریف آوری ہوئی تو مجھے خلافت بھی دے دی، میں نے عرض کیا: حضور میں تو اس کا اہل نہیں، فرمایا:

"داد حق را قابلیت شرط نیست"

حافظ ملت کو حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب اعظمی قدس سرہ سے بھی سلسلہ قادریہ برکاتیہ میں خلافت حاصل ہے۔ مگر قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ حافظ ملت ان لوگوں میں نہیں جو خود مطالبہ کر کے خلافت حاصل کریں بلکہ انھیں خلافت دی گئی تو یہ عرض کیا کہ میں تو اس کا اہل نہیں اور جواب وہ ملا جو ایک تمغۂ امتیازی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اب تو ہمہ تن نااہلی کے باوجود کسی کے سر ہو کر خلافت لینے دینے کا سلسلہ چل پڑا ہے جو حد درجہ افسوس ناک ہے۔

(۲) غالباً ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے کہ مولانا عبد الستار صاحب پرولیاوی اور مولانا ناصر صاحب وغیرہ نے اپنے کچھ متعلقین کی خواہش پر ضلع رانچی میں کوٹام نامی ایک مقام پر حافظ ملت کو ایک جلسہ میں مدعو کیا۔ حضرت نے تقریر فرمائی اور اسٹیج سے اتر کر قیام گاہ کے لیے روانہ ہوئے، اناؤنسر صاحب نے اب حضرت کے محاسن و مراتب بیان کرتے ہوئے لوگوں کو داخل سلسلہ ہونے کی دعوت دی۔ حضرت نے واپس جاتے ہوئے راستے میں یہ باتیں سن لیں اور درمیان راہ سے واپس آئے۔ اناؤنسر کو سخت ناگواری کے ساتھ اس اعلان سے روکا اور خود مائک پر آکر فرمایا کہ میں قطعاً اس طرح کی تحریک پسند نہیں کرتا اور جو کچھ ہوا میری مرضی اور اطلاع کے بغیر ہوا۔

الغرض حافظ ملت کا کردار ان لوگوں سے بہت مختلف ہے، جو خود اس طرح کی تحریک کر کے لوگوں کو اپنا مرید بناتے ہیں اور اس کام کے لیے لوگوں کو خاص طور سے استعمال کرتے ہیں۔ یوں بھی حافظ ملت نے اپنے کو کبھی پیر

کے روپ میں نہیں پیش کیا۔ جو لوگ حضرت سے بیعت ہوتے وہ حضرت کے علم وفضل، کردار وعمل، تقویٰ اور اتباع سنت سے متاثر ہوکر اپنی خواہش ومرضی سے بیعت ہوتے۔ حافظ ملت نے پیری مریدی کو کبھی بھی کاروبار کے طور پر استعمال نہیں کیا۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے مشائخ سے بیعت ہوتا تو حافظ ملت کو اس سے ذرا بھی کبیدگی نہ ہوتی بلکہ خوشی کا اظہار فرماتے اور بعض اوقات مبارکباد بھی دیتے۔ راز الہٰ آبادی نے مفتی اعظم سے بیعت ہونے کی خبر دی تو حضرت نے بے ساختہ فرمایا مبارک ہو۔ بہت بڑے شیخ کا دامن تھاما ہے۔ اور تھوڑی ہی عرصہ کے بعد جب راز صاحب کو ایک جلسہ میں دیکھا کہ داڑھی رکھ لی ہے تو اسٹیج پر برسرعام فرمایا کہ یہ مفتی اعظم کی کھلی ہوئی کرامت ہے۔ راز صاحب کی زندگی عموماً غزل ومشاعرہ میں آزادانہ گزری۔ نعت کی راہ سے مذہبی جلسوں اور دینی عالموں کے قریب آئے تو حضرت مفتی اعظم قدس سرہ سے غایت عقیدت ومحبت پیدا ہوئی اور داخل سلسلہ ہوگئے۔

(۴) ۱۹ر ۲۰ر شوال ۱۳۹۲ھ کو الجامعۃ الاشرفیہ کی درسگاہ بلڈنگ کا جشن افتتاح تھا۔ جس کے لیے مفتی اعظم قدس سرہ خاص طور پر مدعو تھے۔ ۲۰ر شوال کی شب میں بعد نماز مغرب درس بخاری شریف کے آغاز سے حضرت مفتی اعظم افتتاح کرنے والے تھے۔ درجۂ فضیلت کے طلبہ، اشرفیہ کے شیخ الحدیث حضرت شمس العلما قاضی شمس الدین احمد جعفری علیہ الرحمہ، دیگر علما ومشائخ اور عوام حاضر تھے۔ حافظ ملت نے افتتاح سے قبل حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کا تعارف کراتے ہوئے ایک مختصر تقریر کی جس میں ان کی عظمت علم وفضل بیان کرتے ہوئے فرمایا: مفتی اعظم بلاشبہ ولی کامل ہیں۔ آج جو ان سے ایک سبق پڑھے گا وہ آئندہ اس پر فخر کرے گا۔ جو داخل سلسلہ ہوگا آئندہ اس پر فخر کرے گا کہ میں ان سے بیعت ہوں۔ جو دست بوسی کرے گا اسے فخریہ بیان کرے گا۔ جو زیارت کرے گا آئندہ فخر سے کہے گا کہ میں نے مفتی اعظم کو دیکھا ہے۔

حافظ ملت بیان فرماتے جارہے تھے اور حضرت شمس العلماء اس کی تصدیق فرماتے جارہے تھے۔ حافظ ملت اپنے تمام اکابر سے عقیدت، اپنے تمام معاصرین سے الفت اور سبھی علمائے اہل سنت سے محبت رکھتے اور موقع بموقع ان کے واقعی کمالات اور دینی خدمات کو نجی مجلسوں اور عام محفلوں میں بیان کرتے اور سراہتے۔

حضرت شاہ یار علی صاحب علیہ الرحمہ (براؤں شریف) کے پہلے عرس کا دعوت نامہ حضرت کو موصول ہوا تو ہم لوگ درس گاہ میں اپنی کتاب پڑھنے کے لیے حاضر تھے۔ حضرت نے خط پڑھا اور بآواز بلند فرمانے لگے: ان شاء اللہ شرکت کروں گا، ضرور حاضر ہوں گا۔ ہم لوگ کچھ نہ سمجھے مگر حضرت کو سمجھانا اور بتانا ہی مقصود تھا۔ شاہ صاحب کا نام لیا اور ان کے محاسن بتانے لگے۔ اسی وقت مجھے پہلی بار حضرت شاہ صاحب کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ چالیس سال تک ان کی جماعت تو جماعت تکبیرۂ اولیٰ بھی فوت نہ ہوئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ.

(۵) مشائخ اور بزرگوں کی دست بوسی کوئی نئی بات نہیں لوگوں میں ہمیشہ یہ معمول رہا ہے۔ حافظ ملت کے علم وعمل سے صرف ان کے تلامذہ اور مریدین ہی متاثر نہ تھے بلکہ ان کے مذہبی حریفوں اور دشمنوں کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ اور واقف کار اہل سنت تو سب کے سب نہ صرف یہ کہ متاثر تھے بلکہ معتقد تھے زہد وتقویٰ اور (الا ماشاء اللہ) اور اس عقیدت کی بنا پر لوگ حضرت کی دست بوسی بھی کرتے مگر ملنے والوں میں ایسے لوگ بھی آتے جو دست بوسی کی رسم سے آشنا ہی نہ ہوتے یا تکلف سمجھ کر قصداً ترک کردیتے۔ ایسے موقع پر عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنی دست بوسی کرانے کے عادی ہوتے ہیں اگر کوئی شخص ان سے ملا اور دست بوسی ترک کردی تو چہرہ متغیر ہوجاتا ہے اور غیظ وغضب کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں اور چہرہ کی حالت سے باطن کی کیفیت طشت ازبام ہوجاتی ہے۔ مگر حافظ ملت کے چہرے پر دست بوسی سے مسرت وخوشی اور ترک سے تغیر وکبیدگی کبھی دیکھنے میں نہ آئی۔ ہاں اہل تعلق خصوصاً دین دار ودین پرور لوگوں کی آمد ہی کے ساتھ حضرت کے چہرے پر انبساط ومسرت کی عبارت آسانی سے پڑھی جاسکتی تھی۔ اور ان کے نزدیک مسرت کا اصل سبب دین سے تعلق اور خدمت دین سے تعلق تھا۔ محض اپنی خدمت وعقیدت کی بنا پر وہ کسی ترجیح کے قائل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی کی دینی خدمت سے انھیں اطلاع ہوتی اس پر خوشی کا اظہار فرماتے، خواہ حضرت سے اس کی کوئی راہ ورسم ہو یا نہ ہو۔

خیر دست بوسی تک تو حضرت گوارا کرلیتے تھے مگر قدم بوسی سے نفرت تھی اور اپنے لیے اسے بالکل پسند نہ فرماتے۔ اس سے متعلق ایک واقعہ بھی ضمناً تحریر کرچکا ہوں۔

(۶) حافظ ملت بارہا یہ تعلیم دیتے کہ قرآن فرماتا ہے: "وھو معکم اینما کنتم" جب خدا تمھارے ساتھ ہے تو تمھیں کسی سے ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ وعظ صرف گرمی محفل کے لیے نہ تھا بلکہ خود ان کا اس پر یقین تھا۔ انھوں نے ہر طرح کے ماحول میں زندگی گذاری، بے شمار سفر تنہا کیے اور نصرت الٰہی وحفظ خداوندی پر اعتماد وتوکل ہمیشہ ساتھ رہا۔

ایک بار محلہ حیدرآباد میں محفل میلاد سے فارغ ہوئے تو کافی رات گزر چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قصبہ میں بجلی کی لائن نہ آئی تھی۔ اور رات کو چوری وغیرہ کی واردات معمول میں داخل تھیں۔ حضرت پرانے مدرسہ کے لیے تنہا واپس ہونے لگے تو صاحب خانہ کو تشویش ہوئی چونکہ خاصا فاصلہ ہے اس لیے عرض کیا میں حضرت کو پہنچا دیتا ہوں، حضرت نے فرمایا پھر میں تم کو پہنچاؤں، اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہے؟ جاؤ آرام کرو، میں نہیں ڈرتا، تنہا چلا جاؤں گا۔

(۷) حضرت کی زندگی سے غیر مسلم بھی متاثر تھے۔ جب حضرت کو بلاتصویر پاسپورٹ کے سفر حج کی اجازت مل گئی تو قصبہ میں لوگ اس کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ پرانے مدرسہ سے نئے مدرسہ آتے ہوئے ایک حلوائی کی دکان اور مکان ہے، کچھ لوگ بغیر تصویر پاسپورٹ کا حلوائی کی دکان پر ذکر کر رہے تھے اس نے درمیان کلام سے سنا تو بڑے غصہ سے کہا کون ہے جو بین الاقوامی قانون کے برخلاف بلاتصویر پاسپورٹ سے دوسرے ملک کا سفر

کر سکے؟ لوگوں نے حافظ ملت کا نام لیا۔ یہ سننے کے بعد وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور نرمی و سنجیدگی کے ساتھ کہا وہ جا سکتے ہیں۔ میں تیس سال سے ان کو اس راستہ سے آتے جاتے دیکھ رہا ہوں مگر ہمیشہ یہی دیکھا کہ نظر نیچی کیے آتے ہیں اور جاتے ہیں، تیس سال میں کبھی بھی انھیں سر اٹھا کر چلتے ہوئے یا دائیں بائیں نظر کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ بغیر فوٹو کے جا رہے ہیں تو جا سکتے ہیں۔

ایک بار کا واقعہ خود حضرت نے بتایا کہ ہولی کا دن تھا، دوپہر کو مدرسہ کے لیے آ رہا تھا۔ ہولی کا جلوس راستہ ہی میں مل گیا۔ مجھے معلوم ہوتا تو دوسرے راستہ سے جاتا۔ لاعلمی میں حسب معمول اسی راستہ سے آیا۔ اس دن عموماً ہندو نشہ اور رنگ میں مست رہتے ہیں مگر مجھے دیکھتے ہی ان میں سے کچھ لوگ چلا کر دوسروں کو روکنے لگے کہ ٹھہرو ٹھہرو، مولانا آرہے ہیں، رک جاؤ، راستہ دے دو، خیر میں آسانی سے نکل آیا اور رنگ کی ایک چھینٹ بھی میرے اوپر نہ پڑ سکی۔

حافظ ملت کے کردار و عمل اور اخلاق و محاسن کو کہاں تک یاد کیا جائے اور جزئی واقعات کو کہاں تک بیان کیا جائے۔ وہ کردار کی پختگی، اتباع سنت اور اخلاص و تقویٰ کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ انھیں دیکھ کر اسلاف کی پاکیزہ زندگی اور بلند کردار و عمل کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ ان کی حیات سے تاریخ صالحین کے حیرت انگیز واقعات وحالات کی تصدیق ہوتی تھی اور اسلام کے مرد مومن اور مثالی انسان کو دیکھنے کی اگر کوئی آرزو کرے تو انھیں پیش کیا جاسکتا تھا۔ افسوس اب ایسے کسی پیکر علم و عمل اور مجسمۂ عزیمت و استقامت کے دیدار کے لیے آنکھیں ترستی ہیں، دل تڑپتے ہیں، آرزوئیں مچلتی ہیں، تمنائیں بے قرار ہیں مگر صبح آرزو کا اجالا کہاں؟

مجھے مولانا شاہ غلام آسی صاحب مدظلہ کی ایک بات یاد آتی ہے اور بار بار یاد آتی ہے۔ انھوں نے آج سے بہت پہلے اس وقت کہا تھا جب حافظ ملت، مجاہد ملت، اور مفتی اعظم علیہم الرحمہ باحیات تھے کہ "ان تینوں بزرگوں سے تقویٰ کا بھرم باقی ہے۔ اگر کوئی تقویٰ اور اصحاب تقویٰ کو دیکھنا چاہے تو ان حضرات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔"

اب اگر میں یہ کہوں تو شاید بیجا نہ ہو کہ افسوس! ان حضرات کی روحوں کے ساتھ ہمارا یہ افتخار و اعزاز بھی جاتا رہا، اب کون ہے جس کے قد موزوں پر نیابت رسول کی قبا راست کہی جائے؟ جمال تقویٰ کا طالب اپنے دیدار کی تشنگی کہاں دور کرے، علم و عمل کامل کس گلی میں تلاش کیا جائے؟ عزیمت و استقامت اور ورع و تقویٰ کا نازک پیرہن بڑی حسرت و امید کے عالم میں کسی قامتِ زیبا کا منتظر ہے۔ اتاح اللہ رجالاً. یحققون آماله.

۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ / ۱۷ر دسمبر ۱۹۹۰ء

❁❁❁❁❁❁

حافظ ملت تعلیمی ماحول میں (۱)

حافظ ملت کی حیات و خدمات پر متعدد جہات سے نظر جاتی ہے، اور ہر اعتبار سے وہ بلند پایہ قابلِ اتباع اور پس رووں کے لیے مشعل راہ نظر آتے ہیں، اور ہر پہلو کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے اجالے میں لایا جائے اور اس سے اکتساب فیض و نور کا سامان کیا جائے، گویا:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا ست

لیکن تمام گوشوں اور شعبوں سے بآسانی وباختصار عہدہ برآ ہونے کی بروقت کوئی صورت ذہن میں نہیں آئی، اس لیے میں نے درسگاہی ماحول میں ان کے کردار و عمل پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ وہ صرف اسی ماحول کے پابند نہ تھے۔ ان کی خانگی زندگی، شہری زندگی، عابدانہ زندگی، دعوتی و تبلیغی زندگی، سیاسی زندگی وغیرہ ہر ایک پر بسط و تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

تعلیمی ماحول میں انھیں تین طرح سے دیکھا جاسکتا ہے:

(۱) بحیثیت استاذ و مدرس

(۲) بحیثیت صدر المدرسین

(۳) بحیثیت صدر مجلس عاملہ و سربراہ اعلیٰ (بحیثیت طالب علم کہیں ضمناً بیان کروں گا اسی کو مستقل سمجھیں)

بحیثیت مدرس:

ایک مدرس کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا پابند ہو، متعلقہ اسباق پوری ذمہ داری سے پڑھائے، نصاب کی تکمیل کرے، کتاب کے مضمون کو دلنشین اور موثر طور پر طلبہ کے ذہن میں اتارے، طلبہ کی علمی ترقی، اخلاقی بلندی، عملی میدان میں کامیابی اور دینی و عملی خدمات میں فعالی کے لیے کوشاں رہے۔ اور ان کے ذہن و فکر، قلب و مزاج، اخلاق و کردار ہر ایک کی اصلاح کے ساتھ انھیں مردانِ کار کی صف میں نمایاں مقام پر لا کھڑا کردے۔

---

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، انوار حافظ ملت نمبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء

پابندیِ اوقات:

حافظ ملت کو ہم نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ جب وہ مبارک پور تشریف فرما ہوتے، ٹھیک وقت پر مدرسہ تشریف لاتے اور آتے ہی کام میں لگ جاتے، تضییع اوقات اور خوش گپیوں کے لیے ان کی عام زندگی میں بھی کوئی خانہ نہ تھا، تعلیمی اوقات میں اسے کب روا رکھتے۔ طلبہ بھی وقت پر درسگاہ میں حاضر ہوجاتے اور تین چار منٹ تاخیر بھی حضرت پر سخت گراں گزرتی۔ ایک بار مدارک شریف کے سبق میں ہم لوگ تین چار منٹ کی تاخیر سے پہنچے تو سخت برہم ہوئے اور باز پرس فرمائی کہ، دیر کیوں کی؟ جواب کسی کے پاس نہ تھا اس لیے کہ کسی ضروری کام میں مصروفیت یا کوئی معقول عذر تو تھا نہیں جسے پیش کرسکتے، چار منٹ کا وقفہ ان کی درسگاہ کے سامنے ہی بیکاری میں گذرا تھا۔ میں نے تو سمجھا نہ کوئی اس سوال کا جواب دے گا نہ اس کے بغیر حضرت سبق پڑھائیں گے، اور آج یوں ہی واپس جانا ہوگا۔ خیر ہمارے ایک رفیق درس (مولانا نصیر الدین صاحب) کو آخر بات سمجھ میں آگئی۔ عرض کیا ”معاف فرمائیں آئندہ ایسا نہ ہوگا۔“ اتنا سننے کے بعد حضرت کا چہرہ بدل گیا، ”ہاں“ کہا اور سبق شروع کرادیا، ایسے ہی ایک بار ملا حسن کے درس میں مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ کے یہاں تاخیر ہوگئی تھی، انھوں نے بھی اس کا بڑا سخت نوٹس لیا۔ بس یہی دو اتفاق ایسا ہوا اور سخت تنبیہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان ذمہ دار اساتذہ کو نہ اپنے وقت کا ضیاع گوارا تھا، نہ طلبہ کے وقت کی بربادی وہ دیکھ سکتے تھے۔ ان حضرات کا بڑا زبردست مجاہدہ یہ تھا کہ ادارہ کے غیر تعلیمی کاموں کو ہمیشہ غیر درسی اوقات میں ہی نپٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ خواہ اس کے لیے جو بھی صعوبت جھیلنی پڑے، مگر اسباق کا ناغہ گوارا نہ تھا۔

طریقۂ تعلیم:

حافظ ملت کا طریقۂ درس یہ تھا کہ کسی طالب علم سے پہلے عبارت پڑھواتے، عبارت خوانی میں کوئی غلطی ہوتی تو اس پر تنبیہ فرماتے۔ کوئی بڑی غلطی ہوتی تو بہت خفا ہوتے، عبارت خوانی کے بعد پورے سبق کی ایک مختصر اور جامع تقریر کرتے، اسی تقریر سے بہت سے اعتراضات اور شکوک وشبہات کا جواب بھی ہوجاتا۔ اس کے بعد عبارت کا سلیس ترجمہ حسب موقع توضیح وتنبیہ کے ساتھ مکمل کردیتے۔ اگر کوئی طالب علم کوئی سوال کرتا تو بہت مختصر الفاظ میں تشفی بخش جواب دے دیتے، جو کتاب پڑھاتے پوری مہارت اور ذمہ داری سے اس کا حق ادا کرتے۔ اور جو سوال ہوتا فوراً اس کا جواب بھی دیتے، ایک بار خود فرمایا: ”کبھی ادھار نہ رہا“ بعد میں اس کی وضاحت فرمائی کہ ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم نے کوئی ایسا سوال کردیا جس کا معقول اور تشفی بخش جواب مدرس کے ذہن میں نہیں تو کہہ دیتا ہے ”کل

بتاؤں گا۔“ حضرت نے فرمایا کہ میرے یہاں ”کل بتاؤں گا“ والا معاملہ کبھی نہ ہوا۔

اس استحضار اور مہارت کے پس منظر میں وہ بتاتے کہ دور طالب علمی میں میرا طریقہ یہ تھا کہ جتنے اسباق پڑھنے ہوتے سب مطالعہ میں حل کرتا، اس کے متعلق اعتراضات وجوابات پر غور کرتا، پھر درسگاہ میں حاضری ہوتی اور وہاں جو بتایا جاتا بغور سنتا، جو سوال ذہن میں ہوتا اگر درس سے اس کا جواب حل نہ ہوا تو پوچھ کر جواب حاصل کرتا، پھر روزانہ ہر سبق کا اعادہ اور اس کی تکرار رفقائے درس کو کراتا، پھر آئندہ سال وہ اسباق نیچے والی جماعت کے طلبہ کو بطور اعادہ و تکرار پڑھاتا، اس طرح ہر کتاب اور ہر سبق پڑھنے ہی کے زمانے میں متعدد بار نظر سے گزر چکا ہے، دوبار مطالعہ و درس کے طور پر، اور دوبار تکرار اور پڑھانے کے طور پر۔

ان کے درس میں اصلاح وتربیت کا عنصر بھی کارفرما ہوتا، اور علمی نکات کے ساتھ عمل کے جذبات بھی طلبہ میں منتقل کرتے، فکری اور اعتقادی رسوخ اور پختگی بھی ان کا مطمح نظر ہوتا، اسلام کی صداقت، اہل سنت کی حقانیت، منکرین اسلام کی بے ثباتی اور گمراہ فرقوں کا بطلان وہ بڑے موثر، مدلل اور واشگاف طور پر بیان فرماتے۔

تکمیل نصاب کی فکر:

درسی تقریر کے ایجاز اور جامعیت کے باعث تقریری جلسوں سے متعلق ناغوں کے باوجود ان کے یہاں مقدارِ تعلیم زیادہ ہوتی، خصوصاً بخاری شریف کی دونوں جلدیں ہمیشہ ختم کراتے اور یہ ختم بھی اس طرح نہ ہوتا جیسا کہ بعض درس گاہوں کا رواج ہے کہ محض عبارات احادیث کی قراءت ہوجاتی اور کسی نے پوچھ لیا تو بتادیا گیا، ورنہ عبارت خوانی ہی پر درس مکمل ہوگیا۔ بلکہ حافظ ملت ہر سبق کی مناسب اور جامع تقریر کرتے، بخاری کے آخری پاروں میں جہاں احادیث عموماً سابقہ پاروں میں بار بار گزری ہوئی ملتی ہیں کم از کم ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت اور تطبیق چند لفظوں میں ضرور بتادیتے۔

حاضری پر نظر:

طلبہ، خصوصاً پڑھنے والے طلبہ کی حاضری پر بھی نظر رکھتے۔ ایک بار جمعرات کے بجائے جمعہ کی صبح کو گھر جارہا تھا، جوں ہی گیٹ کے قریب ہوا حافظ ملت سے ملاقات ہوگئی، نہ معلوم کس ضرورت سے اس دن جمعہ کو مدرسہ تشریف لانا ہوا، فرمایا، آج جارہے ہو تو پھر کل؟ میں نے عرض کیا رات کو مشقی بزم میں شرکت کے پیش نظر کل نہ جاسکا (اس وقت ہم چند رفقائے درس عنوانات کے تحت تقریر وتحریر کی مشقی بزم چلاتے تھے اور ذمہ داری کی وجہ سے رکنا پڑا) دوسرے دن سنیچر کو میں گھر سے بہت سویرے چلا، سواری تو دن میں بھی کبھی ملتی کبھی نہ ملتی، اتنی صبح سویرے

ملنے کا تصور بھی نہ تھا، اس لیے ابراہیم پور چھوڑ کر ایک دوسرے شارٹ راستہ سے چلا، پہلی گھنٹی حضرت ہی کے یہاں تھی، عبارت خوانی کے دوران پہنچ گیا، سبق کے بعد حضرت نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے موجود پایا، اور بہت خوش ہوئے۔ یوں بھی ناغے کی عادت نہ تھی۔ مبارک پور کے پورے تین سالہ ایام تعلیم میں کل غیر حاضری بیس دن سے زیادہ نہ ہوگی جس میں دو تین دن کسی ضرورت کے تحت اور باقی سخت علالت کے تحت ہے۔

صلاحیتوں سے آگاہی کا شوق:

حافظ ملت کو اس کی بھی فکر ہوتی کہ طلبہ میں اچھی صلاحیت پیدا ہو اور صلاحیت کا جائزہ لینے کے دو موقع ہوتے تھے امتحان ششماہی جو دار العلوم کے مدرسین لیتے اور امتحان سالانہ جس کے لیے ہمیشہ ماہر و متبحر علما کا انتخاب کیا جاتا۔ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی تشریف آوری ضروری تھی، بعض اساتذہ یہ چاہتے کہ ان کے زیر تدریس کتابیں صدر الشریعہ کے یہاں امتحان کے لیے نہ جائیں اس لیے کہ دوران امتحان اگر طلبہ نے اچھے جوابات نہ دیے تو وہ پوچھتے کس کے یہاں پڑھا ہے اور پھر وہیں مدرس کو طلب کر کے فرماتے کیا پڑھایا ہے؟ کوئی ٹھکانے کا جواب دینے والا نہیں۔

مگر حافظ ملت کی کتابیں صدر الشریعہ کے یہاں جاتیں اور خود انھیں طلبہ کے جوابات سننے کا شوق ہوتا، تاکہ طلبہ کی صلاحیت کا بھی اندازہ ہو اور اس کی روشنی میں آئندہ تدریس و تربیت کی ارتقائی راہ بھی متعین ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صرف ڈیوٹی نبھانے اور کسی طرح وقت گزارنے سے مطلب نہ تھا، بلکہ وہ ایک بلند مقصد، وسیع میدان عمل اور عظیم تعلیمی و تربیتی نظریے کے تحت اس شعبے کے ایک بیدار مغز اور متحرک و فعال رکن کی حیثیت سے جادہ پیما تھے۔

طلبہ کی ہمدردی و غم گساری:

انفرادی طور سے بھی طلبہ کو تحصیل کمال کی راہیں بتاتے اور اجتماعی طور سے بھی ان میں تعلیم و عمل کا شوق بیدار رکھتے۔ طلبہ کے شہری و خانگی حالات، ثروت و غربت، ضرورت و حاجت کا بھی اندازہ رکھتے اور ایک شفیق باپ کی طرح ان کی ہمدردی و غم گساری بھی فرماتے، بعض طلبہ کی پوری کفالت بھی اپنے ذمہ لے لیتے، جس کی کچھ تفصیل ایک دوسرے مضمون میں لکھ چکا ہوں۔

رجحانات سے آگاہی اور مناسب رہ نمائی:

طلبہ مختلف ذوق و رجحان کے حامل ہوتے ہیں، بعض کو شعر و سخن سے ذوق ہوتا ہے، بعض تقریر و خطابت

کے دلدادہ ہوتے ہیں، بعض تجوید و قراءت کی مہارت چاہتے ہیں۔ بعض تصنیف و تحریر کا شوق رکھتے ہیں۔ عام مدرسین کو ان رجحانات و خواہشات کا اندازہ نہیں ہوتا مگر حافظ ملت کی نگاہ ایسی باریک بیں اور ذہن اتنا دور رس تھا کہ وہ کسی نہ کسی گوشے سے ان رجحانات کو بھانپ لیتے اور زمانۂ طالب علمی میں تو شاعری سے منع کرتے لیکن باقی شعبوں کے لیے حوصلہ افزائی اور مناسب رہنمائی سے نوازتے، مقصد یہ تھا کہ طلبہ کی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر لگایا جائے اور ہر میدان کے آدمی پیدا کیے جائیں۔

حوصلہ افزائی:

آج تمام ماہرین تعلیم و تربیت کا اس پر اتفاق ہے کہ مار پیٹ کر پڑھانے اور زد و کوب کے ذریعہ سدھارنے کا طریقہ فرسودہ ہی نہیں، مضر اور غلط بھی ہے۔ بچوں کی نفسیات کا جائزہ لیا جائے، تعلیم و درستی سے ان کے انحراف کے اسباب معلوم کیے جائیں۔ اور ان اسباب کا علاج کیا جائے جن سے فاسد صورت رونما ہو رہی ہے۔ طلبہ کے فکر و مزاج کو صحیح ماحول میں ڈھالا جائے اور اجتماعی و انفرادی طور پر ہر ایک کے لیے مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ وہ خود ہی اچھی روش پر آجائیں گے اور میدانِ عمل کے فعال رکن بن سکیں گے۔ ان تدابیر میں طلبہ کو مایوسی و پست ہمتی سے بچانے اور ان کے حوصلے بڑھانے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

حافظ ملت کی زندگی میں حوصلہ افزائی کے شواہد بڑی کثرت سے ملیں گے، بعض کم فہم لوگوں کو ان کے ہمت افزا کلمات سے اپنے بارے میں غلط فہمی بھی پیدا ہو جاتی۔ اور بعض جان بوجھ کر بھی مناسب فائدہ اٹھانے کی راہ نکالتے۔ مگر بالغ نظر اور بلند حوصلہ افراد ہمیشہ اس کا مطلب یہی سمجھتے کہ حضرت یہ اس لیے فرما رہے ہیں کہ ہم کچھ کرتے رہیں اور کسی لائق بنیں۔ تاہم اس کا عام فائدہ یہ ہوتا کہ کوئی مایوسی کا شکار نہ ہوتا، اور محنت و عمل کے جذبات کو بڑی توانائی ملتی، اور یہ خیال قطعاً نہ ہوتا کہ نہ میں کسی لائق ہوں نہ ہو سکتا ہوں۔ دراصل یہ تصور ہر ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے جب کہ ہمت و حوصلہ ترقی کا بہت مضبوط زینہ ہے۔

جوہر آشنائی:

دوسری چیز یہ ہے کہ ہر انسان میں کوئی خوبی اور کوئی کمال بھی ہوتا ہے، ہر شخص کی کوئی انفرادی خصوصیت اور اس کا کوئی خاص درجہ بھی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میری خوبی سے لوگ آشنا ہوں، میرے درجہ اور کمال کا اعتراف کم از کم میرے مخلص و مہربان افراد کی زبان سے ادا ہو۔ مگر انسان کی انفرادی خوبی کا پتہ لگانا، اس کے خاص درجہ سے آگاہ ہونا، اس کے بعد سینے میں اتنی وسعت، زبان میں اتنی بلاغت کہ مناسب انداز و الفاظ میں اس خوبی و رتبہ کا اظہار

بھی ہو، بڑی دقت نظر اور وسعت ظرف والوں ہی کا حصہ ہے، اور اس خصوص میں حافظ ملت کا مقام بہت بلند ہے۔

میں بڑی سچائی کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ حافظ ملت کا کمال یہ تھا کہ وہ راکھ کے ڈھیر سے بھی سونے کے ٹکڑے چن لیتے تھے اور ہمارا کمال یہ ہے کہ سونے کے ڈھیر میں بھی راکھ کے ذرے دیکھ لیتے ہیں، اور ان ہی کو کریدتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ عجیب کمال تھا کہ ہر شخص کا خاص جوہر وہ پہچان لیتے، اس کی خوبیوں سے آگاہ ہوجاتے، اور داد و تحسین سے بھی نوازتے، طلبہ کے حسن و قبح سے بھی وہ آشنا ہوتے اور غلطیوں کی اصلاح، خوبیوں کی تحسین دونوں ہی میں ان کا انداز کچھ ایسا نرالا تھا کہ اس سے فائدہ ہی ہوتا، نقصان نہ ہوتا۔ کیوں کہ تحسین اگر مناسب و برمحل نہ ہو تو بے سلیقہ زجر و توبیخ کی طرح وہ بھی مضر بن جاتی ہے، حکمت واعتدال ہر عمل کا جزو اعظم ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے بچوں اور اپنے طلبہ کے معاملے میں عموماً لوگ افراط و تفریط کے شکار ہیں، کچھ لوگ انھیں خود رُو پودوں کی طرح "بے ہنگم" بڑھنے کے لیے بالکل ہی آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس قدر قید و بند، تخویف و تہدید اور ضرب و کرب سے گزارتے ہیں کہ ان کی صلاحیت، ان کے طبعی رجحانات اور مناسب رعایت و آزادی کا بھی پاس و لحاظ نہیں رکھتے، حافظ ملت کے یہاں اس باب میں بھی حکیمانہ اعتدال نظر آتا ہے۔

شخصیت کی دل آویزی:

طالب علم کی اصلاح و تربیت میں معلم کی شخصیت کو بڑا دخل ہوتا ہے، معلم کے افکار و اطوار اور اخلاق و کردار سے طالب علم کا متاثر ہونا فطری بات ہے، حافظ ملت کی شخصیت علم و تقویٰ کی جامع، اخلاص و بے نفسی کی حامل، تواضع و خودداری سے مرصع، دین و علم کی ترویج واشاعت کے بے کراں جذبات سے لبریز تھی، جس کا اثر ان کے تلامذہ پر بھی پڑا، خواہ کوئی ان کے کمال کو نہ پہنچے، اور ان کے محاسن کا جامع نہ ہوسکے، لیکن ہر ایک کے سامنے ایک آئیڈیل اور مثالی شخصیت کا نقشہ ضرور رہتا، اور اسے بہر حال یہ سوچنا پڑتا کہ علم دین کی راہ میں قدم رکھا ہے اور نیابتِ رسول کا منصب حاصل کرنے کی تڑپ ہے تو شخصیت ایسی ہی دل آویز اور علمی و عملی کمالات و محاسن کی جامع بنانا ہوگی۔ جبھی بجا طور سے عالم دین اور نائب رسول شمار ہوسکتے ہیں، ورنہ درخت بے برگ یا شجر بے ثمر سے زیادہ کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ آج نئی نسل میں جو بے راہ روی در آئی ہے، اس میں مناسب تعلیم و تربیت کے فقدان کے ساتھ علمائے سو کی کمزوریوں، کوتاہیوں بلکہ اس سے بھی آگے بے باکیوں اور بے حیائیوں کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ حفظنا اللہ والمسلمین من شرورھم.

(۲) بحیثیت صدر المدرسین:

صدر المدرسین کا عہدہ بڑا نازک اور اس کی ذمہ داریاں بڑی پیچیدہ ہوتی ہیں۔ لیکن حافظ ملت کی عملی زندگی کے آخری سات سال کو چھوڑ کر سارا عرصۂ حیات اسی عہدہ کے ساتھ گزرا ہے۔ صدر المدرسین کو ایک طرف مجلس انتظامیہ کی ہدایت اور احکام کے تحت مدرسین وطلبہ کو کاربند بنانا پڑتا ہے دوسری طرف مدرسین وطلبہ کے مطالبات و ضروریات کی طرف انتظامیہ کو متوجہ کرنا ہوتا ہے، تیسری طرف مدرسین وطلبہ کی نگرانی اور ان کے کاموں میں درستی و ترقی لانا، علمی و عملی فضا قائم کرنا اور تعلیمی ماحول کو موثر و فعال بنانا بھی اس کا اہم فریضہ ہوتا ہے، اور کسی مدرس وطالب علم کی خامیوں سے متعلق سب سے پہلے اسے نوٹس لینا اور جواب دہ ہونا بھی پڑتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حافظ ملت نے ان پر پیچ ذمہ داریوں کو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے نبھایا ہے، بلکہ اپنے فرض سے زیادہ انھوں نے کام کیا ہے۔ دار العلوم کے تعلق سے عوامی ارتباط میں انتظامیہ سے زیادہ حافظ ملت کا کردار رہا ہے۔ اور اشرفیہ کی ملک گیر شہرت، نیک نامی اور مسلمانوں کے اندر اشرفیہ کے لیے جذبۂ ایثار و تعاون کی فراوانی میں حافظ ملت کی مساعی جمیلہ اور ان کی دل آویز شخصیت کا بہت بڑا دخل ہے۔

دار العلوم اشرفیہ کی تعمیر کے موقع پر مسلمانان مبارک پور کا جوش و حوصلہ حافظ ملت کی مخلصانہ جد و جہد کا ہی ثمرہ ہے، اساتذہ کا انتخاب بھی لیاقت و صلاحیت کی بنیاد پر ہوتا۔ اور حافظ ملت کے خلوص و محنت کا اثر سب پر پڑتا اور سبھی اپنے فرائض ذمہ داری سے انجام دینے کی کوشش کرتے۔

طلبہ کے اندر علمی و عملی اسپرٹ تیز کرنے کے لیے وہ ہر دو تین ماہ بعد ایک آدھ گھنٹے کے لیے انھیں جمع کر کے خطاب کرتے، یہ خطاب بڑا موثر ہوتا، اور "از دل خیزد، بر دل ریزد" کا عکس صاف دکھائی دیتا، اس میں عموماً جو کچھ وہ بیان فرماتے اس کا مفہوم اور حاصل حسب ذیل ہوتا۔

اشرفیہ میں قابل اساتذہ کا ایک متحرک و فعال کارواں جمع ہے جن کی یہ یہ خصوصیات اور خوبیاں ہیں۔ (مدرسین کے ناموں کے ساتھ ان کے کمالات بتاتے اور یہ حافظ ملت کا خاص فن تھا کہ وہ ہر شخص کے قرار واقعی فضل و کمال سے خود بھی آشنا رہتے اور دوسروں کو بھی آشنا کراتے) اس کے بعد فرماتے کہ ان سے اکتساب فیض اور تحصیل کمال تمھارا فریضہ ہے، تم نے طلب علم کی راہ میں قدم رکھا ہے تو اسی میں منہمک رہنا چاہیے، اور اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے، ایک تاجر اپنی تجارت کے فروغ اور دولت کے حصول کے لیے دن رات ایک کر دیتا ہے۔ کبھی سر پر بوجھ بھی لاد کر چلتا ہے اور کبھی سخت سست بھی سنتا ہے۔ ذلت بھی اٹھاتا ہے مگر اپنے مقصد اور اپنے کام سے دست

بردار نہیں ہوتا،ایک درزی اپنے کام کی تکمیل کے لیے ہر وقت لگا رہتا ہے۔دکان دار صبح بیٹھ جاتا ہے تو شام کو اٹھتا ہے کھانے سے اور راحت وآرام سے بھی بے پرواہو جاتا ہے،بنکر اپنی بنائی کے کام میں لگا رہتا ہے اور ہر طرح کی زحمت وصعوبت برداشت کرتا ہے۔جب سب کام والے اپنے کام میں بھرپور دلچسپی اور محنت سے لگے رہتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ طالب علم اپنے کام سے غافل رہے،اور اپنا وقت برباد کرے۔دینی طلبہ پر مجھے افسوس ہے کہ یہ تحفظِ وقت کا خیال نہیں رکھتے۔ایک بار میں کلکتہ کی ایک بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا تھا،قریب کے کمرے میں ایک بنگالی طالب علم کا قیام تھا۔وہ کچھ دیر سوتا اور پھر اٹھ کر پڑھنے لگتا،رات بھر زیادہ تر اس نے پڑھتے ہوئے ہی وقت گذارا،اسے اپنی تعلیم سے اس قدر لگن اور اس کے لیے اتنی محنت تھی تو ہمارے طلبہ میں ایسی لگن اور محنت کیوں نہیں آتی۔انھیں بھی اپنی تعلیم سے شغف،اپنے مقصد کے ساتھ اخلاص،اپنے وقت کی قدر شناسی،اپنے کام سے دلچسپی ہونا چاہیے(اس مضمون کو کبھی متعدد شواہد وواقعات کے ذریعہ مزید مؤثر انداز میں بیان کرتے۔)

علم کے بعد عمل کی ترغیب پر آتے تو فرماتے:عالم کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اگر اس میں عمل نہیں تو وہ نہ عند اللہ مقبول ہو سکتا ہے اور نہ عند الناس۔ایک مقرر ردوہابیہ میں تقریر کر رہے تھے اور ٹھوس دلائل مضبوط شواہد اور دل نشیں انداز بیان کے ساتھ بولتے جا رہے تھے،تقریر بڑی کامیاب ہوئی۔تقریر ختم ہوتے ہی ایک شخص مجمع سے اٹھا اور کہا مولانا ذرا اپنے سر کے بال تو دیکھیے دیکھا تو سر پر انگریزی بال تھا،دوسرا کھڑا ہوا اور اس نے کہا مولانا ذرا اپنا پاجامہ تو دیکھیے،پاجامہ ٹخنے سے نیچے تھا۔ان کے اعتراضات سے مولانا کی تقریر کا جواب تو نہ ہوا،جو حقائق انھوں نے بیان کیے وہ غلط تو نہ ہو گئے۔مگر ان کی ذاتی اور عملی خامیوں کی وجہ سے ان کی تقریر بے اثر ہو گئی۔

ہم نے صدر الشریعہ سے علم سیکھا اور عمل بھی سیکھا،ہر بات وہ بتاتے نہ تھے۔ہم نے تو انھیں دیکھ دیکھ کر سیکھا ہے،انھیں عمامہ باندھتے دیکھا تو عمامہ باندھنا سیکھ لیا،انھیں سر جھکا کر وقار سے چلتے ہوئے دیکھا تو چلنا سیکھ لیا،انھیں کھاتے ہوئے دیکھا تو کھانے کا طریقہ سیکھ لیا(ظاہر ہے کہ یہ وہی کہہ سکتا ہے جو خود علم وتقویٰ کا جامع اور سنت نبوی کا پابند ہو،ان کا مقصد یہ تھا کہ تلمذ اور شاگردی کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم کے ساتھ ہمارا کردار وعمل بھی حاصل کرو،اور علم وعمل کے جامع بنو،جب ہی تم خدا اور رسول کی خوشنودی اور اپنی دینی خدمات کے میدان میں کامیابی وکامرانی سے ہم کنار ہو سکتے ہو)اس طرح کی تقریروں کا اثر یہ ہوتا کہ طلبہ میں ایک علمی وعملی لہر پیدا ہو جاتی۔اور کھیلنے والوں میں بھی کچھ سیکھنے،کچھ کرنے کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔

وہ طلبہ کو خارج بھی کرتے تھے مگر حتی الامکان ان کی اصلاح کی کوشش کرتے،اور اس طرح نہیں کہ معاف کرکے علی حالہ چھوڑ دیا بلکہ طالب علم کے لیے ایسا ماحول اور ایسے اسباب فراہم کرتے کہ وہ صحیح روش پر آجائے اور بیکار

ہونے کے بجائے کام کا آدمی بن جائے۔

وہ ادارہ کی کامیابی کے لیے مدرسین میں اتحاد واتفاق اور ہر ایک کے اعزاز واکرام کو ضروری سمجھتے تھے،اور ان کے زمانے میں یک جہتی یا کم از کم رواداری اور انس والفت کی فضا برابر دیکھنے میں آتی۔

طلبہ کی ضروریات کے معاملہ میں بھی بہت حساس تھے۔اور ایسا نہیں کہ جب طالب علم ان کے پاس درخواست لے کر آئے اور بار بار تقاضا کرے جبھی اس کی ضرورت پر غور وخوض ہو بلکہ کسی طرح بھی حافظ ملت کو ضرورت کا علم ہو جانا کافی تھا۔اس کے بعد وہ از خود اس کی تکمیل کی طرف فوراً توجہ کرتے،فیصلہ میں دیر اور کام میں ٹال مٹول تو وہ جانتے ہی نہیں تھے،جو کرنا ہوتا فوراً کرتے اور باسلیقہ وصائب اور مکمل طور پر کرتے۔یوں ہی جو ان کی رائے ہوتی اس کے دوٹوک اظہار سے بھی ان کے لیے کوئی مانع نہ تھا اس میں ان کے فہم وتدبر کا بھی دخل تھا اور جرأت واستقامت کا بھی،پیرایۂ بیان کی ندرت وبلاغت کا بھی اور عدل پسندی اور صاف گوئی کا بھی۔

اگر مطبخ سے متعلق کسی خرابی کا علم ہوا تو فوراً ذمہ داروں کو اس کے تدارک کی طرف متوجہ کرتے،دوسری کسی پریشانی کا پتہ چلا تو فوراً اس کے ازالے کی کوشش کرتے،ایک بار قحط کی وجہ سے کنوؤں کا پانی بہت کم ہو گیا۔طلبہ کی ضروریات کے لیے دار العلوم میں ایک ہی کنواں تھا،جو صبح دو گھنٹوں میں خالی ہو جاتا،اور پھر کیچڑ آنا شروع ہو جاتی،طلبہ مسجدوں میں جاتے تو وہاں بھی لوگوں کی ترش روئی اور سخت کلامی کا سامنا کرنا پڑتا،اس صورتِ حال کا ایک بار یوں ہی مولانا شمس الحق صاحب مرحوم نے حافظ ملت سے ذکر کر دیا۔حضرت نے سن لیا اور مولانا کے جانے کے بعد ناظم اعلیٰ کو بلایا۔اور ان سے ضرورت وپریشانی بتانے کے ساتھ ہی فرمایا کہ آپ ٹیوب ویل لگوائیے۔ناظم اعلیٰ نے قبول کر لیا،اگرچہ بعد میں مولانا شمس الحق صاحب سے خاصی افسردگی سے ساتھ فرمایا کہ آپ کی وجہ سے مدرسے کا اتنے ہزار روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔خیر ٹیوب ویل لگا اور بہت سی صعوبتوں کا خاتمہ ہوا۔اسی طرح طلبہ کی شرارتوں کا محض انھیں علم ہو جانا کافی تھا،پھر وہ خود ہی ان کی سزا واصلاح کی فکر کرتے،اور فضا کو علمی وعملی رخ سے پاکیزہ وبہتر بنانے میں ذرا بھی تغافل وبے پروائی روا نہ رکھتے۔اور اگر شکایات بیجا ومبالغہ آمیز ہوتیں تو ان کا جواب بھی متانت وسنجیدگی کے ساتھ خود ہی دے کر معاملہ رفع دفع کر دیتے۔

(۳)بحیثیت سربراہ اعلیٰ:

۱۹۷۰ء میں وہ مجلس انتظامیہ کے صدر اور ادارہ کے سربراہِ اعلیٰ کی حیثیت سے منتخب ہوئے،مگر ان کے اوپر اس منصب کا کوئی جاہ وجلال نظر نہ آیا،انھوں نے بارہا فرمایا کہ "میں کل بھی ادارہ کا خادم تھا اور آج بھی ادارہ کا خادم ہی

ہوں۔" جہاں تک منصبی ذمہ داریوں کی انجام دہی کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ الجامعۃ الاشرفیہ کی فلک بوس عمارت، اس کی تا حد نظر وسیع و عریض زمین، اس کی نوع بہ نوع عمارتیں سب حافظ ملت کے منصب صدارت کا عطیہ ہیں۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنے منصوبوں کو عملی شکل دینا چاہتے تھے، مگر کوئی بھی بڑا کام متحرک وفعال رفقائے کار کی تن دہی اور سرگرمی کے بعد ہی پورا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے جامعہ کی عمارت بننے کے بعد ہی لائبریری کو مستقل حیثیت دی۔ اس کے لیے مولانا عبد المبین نعمانی جیسے باخبر، ملت کے درد مند، علم وفن کے شیدا اور متحرک وفعال شخص کو لائبریرین مقرر کیا، مولانا نے دیکھتے دیکھتے کتابوں کے گودام کو ایک باضابطہ لائبریری میں تبدیل کر دیا اور اس کی ثروت وترقی کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔

باضابطہ شعبۂ تجوید قائم کیا اور اس کے لیے اپنے احباب کے انتخاب پر شیخ القراء قاری محب الدین صاحب کی خدمت میں ایک عالم کو بھیج کر تجوید کی تکمیل کرائی، اسی طرح جامعہ کا ترجمان "ماہ نامہ اشرفیہ" جاری کیا اور مولانا بدر القادری کو بلا کر اس خدمت پر لگایا پھر خود اس کی توسیع واشاعت کے لیے سرگرم رہے۔ سنی دار الاشاعت حضرت مولانا عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کے اچانک انتقال سے بے یار ومددگار ہو چکا تھا، اس کے لیے مفتی عبد المنان صاحب اعظمی کو منتخب کیا، انگریزی تعلیم کے لیے ماسٹر آفتاب احمد صاحب کو جو جامعہ ملیہ دہلی میں کام کر رہے تھے بلا کر اشرفیہ کا استاذ مقرر کیا، طلبہ میں عربی لکھنے بولنے کی مہارت پیدا کرنے کے لیے مولانا یٰسین اختر اعظمی اور مولانا افتخار احمد قادری کی خدمات حاصل کیں، ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ جامعہ ازہر سے رابطہ قائم کیا جائے، اور وہاں کچھ لوگوں کو بھیج کر تعلیم دلائی جائے، پھر اشرفیہ میں ان کی خدمات حاصل کی جائیں، اس سلسلے میں علامہ ارشد القادری نے برطانیہ جاتے ہوئے ازہر کے ذمہ داران سے ملاقات کر کے کچھ سلسلہ جنبانی بھی کی مگر کام آج تک مؤخر ہی ہوتا جا رہا ہے۔

یہ سب داخلی اور معنوی طور پر اشرفیہ کو سنوارنے اور بڑھانے کی کوششیں تھیں، جو شاید عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوں، ظاہری طور پر تعمیرات کے سلسلے میں انھوں نے باوجود پیری وضعیفی کے ملک بھر کے دورے کیے اور اشرفیہ کو لوگوں کی امیدوں کا مرکز اور دلوں کی دھڑکن بنا دیا، اسے کون نہیں جانتا۔

وہ مدرسین کی ضروریات اور ان کی پریشانیوں سے باخبر تھے، انھوں نے خود عمر کا بیش تر حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گزارا تھا اگرچہ انھوں نے اپنے استاذ کے حکم کے مطابق ادارے کا کام ہمیشہ خدمت کی نیت سے کیا اور تنخواہ کی کمی بیشی سے کوئی مطلب نہ رکھا، نہ کبھی اضافۂ تنخواہ کی درخواست ارکان عالیہ کی خدمت میں گزاری لیکن وہ جانتے تھے کہ سات سات ماہ اور گیارہ گیارہ ماہ تک تنخواہیں موقوف رہنے سے مدرسین پر کیا گزری، دوسرے مدرسین کے اضافوں کی فکر سے بھی وہ غافل نہ ہوتے، نہ ہی کبھی کوئی منفی رویہ اختیار کرتے۔

سربراہ اعلیٰ ہونے کے بعد وہ بلا درخواست اضافہ کی راہ نکالتے، ایک بار حضرت کی مجلس میں لوگوں نے اپنے کاروبار کی پریشانی اور گرانی کی زیادتی کا تذکرہ کیا جیسا کہ عموماً ایسے موقعوں پر ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی پوری لسانی وفکری صلاحیت کے ساتھ آٹا، دال، چاول، سوت، ریشم، مسرائز کا بھاؤ اور بازار کا اتار چڑھاؤ بتانے لگتا ہے اور کوئی گوشہ تاریک نہیں چھوڑنا چاہتا، حضرت کے سامنے بھی لوگ بیان کرتے رہے اور حضرت یہ ساری باتیں بڑی متانت اور دردمندی سے سنتے رہے، بتانے والوں میں زیادہ تر مجلس عاملہ کے ارکان ہی تھے، آخر میں فرمایا کہ جب گرانی کا یہ حال ہے تو مدرسین کی تنخواہوں میں اضافہ ضروری ہے، دوسرے دن میٹنگ طلب کی اور بغیر کسی درخواست اور تحریک کے تمام مدرسین کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا، کسی رکن میں اختلاف کی مجال بھی نہ تھی کیوں کہ ایک دن پہلے خود ہی سب کچھ سنا چکے تھے۔ یہ واقعہ حضرت نے ایک موقعے پر خود مجھ سے بیان کیا۔

مولانا یٰسین اختر صاحب بتاتے ہیں کہ ہم لوگ بہت سی پریشانیوں اور بے التفاتیوں کا شکار رہتے مگر حضرت کی مجلس میں پہنچتے تو ان کا ایک ہی جملہ ہمارے سارے غم والم کافور کر دیتا۔ وہ فرماتے: اشرفیہ آپ کا ہے، آپ کو رہنا اور کام کرنا ہے۔ ۳۱ر مئی ۱۹۷۶ء کو ان کا وصال ہوا تو پورے مبارک پور ہی نہیں پورے ملک میں افسردگی اور غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی، اشرفیہ کے در و دیوار کی پژمردگی اور اداسی کا کیا حال رہا ہوگا، اس منظر کو اشرفیہ کی فضا میں سانس لینے اور شب و روز گزارنے والے حساس شاعر نے دیکھا اور محسوس کیا تو اسے الفاظ کے قالب میں اس طرح ڈھالا ہے:

سہمی سہمی سی فضا ہے تھرتھراتا ہے جگر
رہ نمائے ملت اسلامیاں جاتا رہا
سوز وجذب اندروں سے جس کے اٹھتا تھا دھواں
قوم کا غم خوار وہ قلب تپاں جاتا رہا
گلستان جامعہ پر چھا گئی پژمردگی
خون دل سے سینچنے والا کہاں جاتا رہا
جامعہ کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے یہ سوال
ہائے اختر میرا وہ محسن کہاں جاتا رہا

❁❁❁❁❁❁

مفتی اعظم عوام و خواص کا مرکز عقیدت[1]

مفتی اعظم مولانا شاہ مصطفےٰ رضا قادری بریلوی قدس سرہ کو ایک علامۂ اجل اور ایک ولی باکمال کی حیثیت سے آج دنیا جانتی اور پہچانتی ہے۔ میں نے جب سے شعور کی آنکھیں کھولیں ان کی عظمت و بزرگی کے تذکرے سنتا رہا، مگر میں نے ان کی سب سے حیرت انگیز اور امتیازی خصوصیت جو دیکھی وہ یہ ہے کہ ان کے معاصر علما و اکابر بھی برملا ان کی جلالتِ شان اور عظمت و برتری کا اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ شرف اسی کو حاصل ہوتا ہے جو خدا کی بارگاہ میں قبول خاص سے سرفراز ہو چکا ہو۔ اور جس کا سینہ عداوت و حسد، بغض و عناد، دوسروں کی تحقیر اور اپنی تعلّی سے پاک ہونے کے ساتھ علم و اخلاص کا مخزن ہو، جس کی زبان غیبت و بدگوئی سے دور اور شریعت و طریقت کی پابندی سے آراستہ و مزین ہو، جس کا قلم نفسانی آویزشوں کے بجائے معارف و حقائق کی سچی عقدہ کشائی سے سرشار ہو، جس کا تفقہ و تدبر اس پایے کا ہو کہ اس کے کردار و گفتار اور زبان و قلم سے بجائے اس کے کہ امت میں کہیں بیجا اختلاف و افتراق یا نفاق و شقاق کی راہ کھلے، اتفاق و اتحاد کے سوتے پھوٹیں، بکھرے ہوئے شیرازے مجتمع ہو جائیں اور لوگوں کے دل وحدتِ ملی کے درد و غم سے بیقرار و مضطرب نظر آئیں۔

میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ مفتی اعظم اپنی حیات مبارکہ میں ایسے ہی تابناک نقوش کے حامل رہے جن کے نتیجے میں وہ نہ صرف یہ کہ "تاجدار اہل سنت" کہلائے بلکہ ان کی حیات تک امت میں بڑی حد تک اتفاق و اتحاد کا قابل صد رشک جلوہ کار فرما رہا۔ میں اس اجمال کی تفصیل میں چند شواہد بھی پیش کروں گا۔ سب سے پہلے ان کے بارے میں چند شہادتیں ملاحظہ کیجیے۔

(۱) محدث اعظم مولانا سید محمد کچھوچھوی علیہ الرحمہ بلاشبہہ مفتی اعظم کے معاصر، مولانا وصی احمد محدث سورتی اور امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کے شاگرد جلیل تھے مگر مفتی اعظم سے متعلق ان کے خیالاتِ عظمت و برتری کا ایک منظر آج بھی ایک فتوے کے ذیل میں محفوظ ہے جس پر محدث اعظم نے ان الفاظ میں تصدیق کی ہے:

"ھٰذا قول العالم المطاع، وما علینا إلّا الاتباع"

ان جاندار الفاظ میں جو اعترافِ عظمت کار فرما ہے وہ اہل علم پر عیاں ہے۔

(۱) انوار مفتی اعظم، مرتبہ علامہ محمد احمد مصباحی، رضا اکیڈمی ممبئی، اکتوبر ۱۹۹۲ء

(۲) حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز مرادآبادی علیہ الرحمہ سابق سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے جامعہ اشرفیہ کی نئی درس گاہی بلڈنگ کے جشن افتتاح کے موقع پر ۱۶/۱۷/ نومبر ۱۹۷۳ء کے لیے مفتی اعظم قدس سرہٗ کو دعوت دی تھی۔ حضرت تشریف لائے، افتتاح کا کام حضرت ہی کے ہاتھوں انجام پانے والا تھا جس کے لیے پہلے دن بعد مغرب نئی عمارت میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ یہ ابتدائی سال تھا اور شوال کی ۱۹/۲۰/ تاریخوں کی درمیانی شب تھی۔ اس وقت شیخ الحدیث حضرت مولانا قاضی شمس الدین احمد جعفری رضوی علیہ الرحمہ تھے، درجۂ فضیلت کے طلبہ کو درس بخاری شریف شروع کراکے افتتاح کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ اس موقع پر افتتاح سے قبل حافظ ملت نے ایک مختصر تقریر کی تھی جس کا حاصل کچھ اس طرح ہے:

"حضرت مفتی اعظم مدظلہ سے اس عمارت کا افتتاح اور ان سے بخاری شریف کا ایک سبق پڑھ لینا بہت بڑی سعادت ہے۔ وہ بلاشبہہ ولی ہیں۔ آج جو ان سے سبق پڑھ رہا ہے کل اسے اس پر فخر ہوگا کہ میں نے مفتی اعظم سے سبق پڑھا ہے۔ جو ان سے بیعت ہوگا اسے اس پر فخر ہوگا کہ میں مفتی اعظم سے بیعت ہوا ہوں۔ جو ان سے مصافحہ کرے گا وہ فخر کرے گا کہ میں نے ان سے مصافحہ کیا ہے۔ جو ان کی زیارت کرے گا وہ اس پر فخر کرے گا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے۔ وہ علم و فن کا سمندر ہیں، خود ایک بار فرمانے لگے کہ جب کوئی مسئلہ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو نوک قلم پر علمی مضامین کی اس قدر بارش ہونے لگتی ہے کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی ذات ہمارے لیے بہت غنیمت ہے۔ ان سے سبق پڑھنا آپ کی بہت بڑی سعادت ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سروں پر دراز فرمائے۔"

حضرت قاضی شمس الدین احمد علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"جہاں تک مجھے علم ہے حضرت نے کسی کو بخاری شریف شروع نہ کرائی۔ یہ سعادت ان طلبہ کا مخصوص حصہ ہے۔" اس کے ساتھ وہ حافظ ملت کے بیان کی تصدیق بھی کرتے جا رہے تھے۔

(۳) میں رمضان ۱۳۹۰ھ میں رانچی پہنچا۔ اس وقت مدرسہ غریب نواز رانچی کے بانی مولانا شاہ عبد الحق چشتی امجدی اعظمی وہیں تشریف فرما تھے۔ دو دن ان کے مدرسہ میں میرا قیام رہا۔ اس دوران ان سے بہت سے موضوعات پر گفتگو رہی، انھوں نے مجھ سے پوچھا تم کسی سے مرید ہو یا نہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا: "مرید ہونا ہے تو مفتی اعظم سے مرید ہونا۔ سیادت اپنی جگہ ہے مگر تقویٰ میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں۔

شاہ صاحب علیہ الرحمہ خود بہت بڑے پیر اور سید تھے مگر مفتی اعظم سے ان کی عقیدت اور ان کی طرف اپنے ایک ہم وطن کی مخلصانہ رہنمائی اس سطوت و شوکت کا پتہ دیتی ہے جو ان بزرگ پیروں کے دلوں پر بھی حکمرانی کر رہی تھی۔ وہ محفل سماع کے عادی تھے مگر جب کبھی مفتی اعظم اجمیر شریف پہنچ جاتے شاہ صاحب بہت محتاط ہو جاتے

اور کہتے کہ انھوں نے اگر دیکھ لیا تو پھر خیر نہیں۔

(۴) حضرت مولانا غلام آسی بلیاوی جو ایک سلسلے کے معروف پیر اور درس نظامی کے جید فاضل ہیں، ان سے جمشید پور وغیرہ میں اکثر میری ملاقات اور گفتگو رہتی۔ ایک بار فرمانے لگے کہ اس وقت تین اکابر ہیں۔ مفتی اعظم، حافظ ملت، مجاہد ملت (مولانا شاہ حبیب الرحمٰن قادری اڑیسوی علیہ الرحمہ) ان کے دم سے تقویٰ کا بھرم باقی ہے۔ خدا ان کا سایہ دراز کرے۔ ان کے بعد پھر کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔

مجھے موصوف کی یہ بات بار بار یاد آتی ہے اور اس وقت سے آج تک برابر میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ "ان کے دم سے تقویٰ کا بھرم باقی ہے" انھوں نے بڑی تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا تھا اور خود میں بھی جب غور کرتا ہوں تو ان کا قول حرف بحرف صحیح نظر آتا ہے۔ یہ تو اکثر حضرات کو علم ہے کہ مفتی اعظم قدس سرہ کی حیات تک جب کسی مسئلہ میں کوئی خلجان ہوتا یا کوئی اختلاف نظر آتا تو مفتی اعظم کا فیصلہ حرفِ آخر سمجھا جاتا اور تمام علما ان کی فقہی و کلامی باریک بینی کے قائل نظر آتے۔ صرف لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھانے کے مسئلے میں بعض علما نے ان سے اختلاف کیا اور اپنے اختلاف پر قائم رہ گئے مگر مفتی اعظم نے جو دلائل پیش کیے ان کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔ اور جمہور علما نے حضرت ہی کی تائید کی۔

اس اختلاف کا خاص پہلو یہ ہے کہ اس خصوص میں مفتی اعظم نے اپنی تحریروں میں صرف مسئلے کا اثبات کیا اور کسی کی ذات یا علم و فن کو طنز و تعریض کا نشانہ ہرگز نہ بنایا، نہ ہی اس اختلاف کو علمی اختلاف کی سرحدوں سے کسی طرح متجاوز ہونے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف کرنے والے بھی حضرت کے ادب و احترام سے دور اور ان کی عظمت و عبقریت کے اعتراف سے منحرف نہ ہو سکے اور قلم کی متانت و شرافت بھی آلودہ نہ ہو سکی۔ اس صورت حال سے مفتی اعظم کا اخلاص عمل، ان کی سنجیدگی، ان کی بالغ نظری اور حکمت و تدبر بھی عیاں ہے۔ یقیناً اس میں ہمارے لیے بہت عظیم درس عبرت ہے۔

ان کی حیات کا بہت روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کسی خلاف شرع قول و فعل کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے بلکہ اس پر نکیر ضروری تھی۔ اس کردار کے خلوص میں ان کا التزام، ان کی جسارت، ان کا قلبی اضطراب اور ان کا حسن اخلاص دیکھ کر دل بے اختیار گواہی دیتا کہ بلا شبہہ یہ سچے نائب رسول اور واقعی وارث علوم انبیا ہیں۔ رسول کے سامنے اگر کسی نے کوئی کام کیا یا کوئی بات کہی اور رسول نے اس پر سکوت اختیار کیا، انکار نہ فرمایا تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ فعل یا قول درست اور صحیح ہے اگر چہ غیر رسول کی یہ شان نہیں مگر سچے نائب رسول کی یہ ذمہ داری ضرور ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو منکر (برائی) سے روکے اور معروف (نیکی) کا حکم دے لیکن انکارِ منکر سے عالم کو اگر فتنے کا

اندیشہ یا جان و عزت کا خطرہ ہو یا اس منکر کی برائی سے مرتکب اور دوسرے بھی آگاہ ہوں ساتھ ہی منع کرنے سے باز آنے کی توقع بھی نہ ہو تو بعض حالات میں عالم کے لیے سکوت کی رخصت مل جاتی ہے۔

مگر مفتی اعظم بجائے رخصت کے عزیمت پر عامل تھے اور ان کی جلالت و سطوت یہ تھی کہ کوئی کیسا ہی صاحب ثروت یا صاحب اقتدار کیوں نہ ہو مگر حضرت کی زبانِ شریعت ترجمان کے آگے مجال دم زدن نہ تھی۔ انھوں نے بڑے بڑے قد آور اور نامور خطبا کو بھی بر سرِ عام ٹوک دیا۔ اور بعض صورتوں میں توبہ بھی کرائی ہے مگر عموماً ان کی یہ اصلاح بڑی آسانی سے اور خندہ پیشانی سے قبول کر لی جاتی اور تقریر کرنے والے اپنی ممنونیت کا اعتراف و اعلان کرتے۔ آج کسی کے لیے یہ کام بڑا مشکل ہے۔

ایک طرف تقریروں کی سطحیت اور بازاری پن کا یہ حال ہے کہ تاریخی واقعات و حکایات میں بے سروپا ملاوٹ اور تہ بہ تہ غلطیاں تو الگ رہیں احادیث کے متن میں اس قدر آمیزش کی جاتی ہے کہ قول رسول کی اصل صورت ہی مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ فقہ و عقائد اور علم و فن کے لحاظ سے غلط، نادر اور تکلیف دہ جملوں اور عبارتوں کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے اسی پر بس نہیں بلکہ اس قسم کی تقریروں کو چھاپ کر فروخت بھی کیا جا رہا ہے اور جہالت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ نئی نسل ان غلط سلط تقریروں کو رٹ کر عوام سے داد و تحسین اور زر و مال کے انبار لوٹ رہی ہے اور کسی کو ہمت نہیں کہ ان چرب زبانیوں پر کوئی قدغن لگا دے۔ اگر کسی نے جرأت کی تو انجام اور زیادہ خطرناک ہے۔ مقرر صاحب بجائے اس کے کہ ممنون ہوں اور توبہ و اعتراف کر کے دنیا میں اپنی غلطیوں سے باز آئیں اور آخرت میں اپنی نجات کا سامان کریں، الٹے اپنے بزرگ محسن ہی کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیں گے اور اعترافِ قصور میں اپنی ذلت محسوس کرتے ہوئے اس بزرگ کی تذلیل و تحقیر کے درپے ہو جائیں گے۔ اور اسی میں اپنے وقار، اپنے شرف اور اپنی مقبولیت کا سارا راز مضمر سمجھیں گے۔

یہ وہ المیہ ہے جس سے ہم مفتی اعظم کی حیات کے بعد دوچار ہیں۔ صد افسوس کہ آج کی دنیا علم، عمل، انصاف اور اعترافِ حقائق سے کس قدر دور ہوتی جا رہی ہے۔ اور کوئی ایک شخصیت تو کیا علما کی کوئی ایک مجلس یا یونین بھی ایسی نہیں جو ہمارے اس خلا کو اس طرح پُر کر دے کہ نہ کوئی اختلاف ہو نہ کوئی فتنہ برپا ہو یا کوئی ایسی تدبیر بروئے کار لائی جائے جس سے عوام اس قابل ہو جائیں کہ غلط بولنے والے مقررین کو گوارا نہ کر سکیں یا مقررین اتنے ذمہ دار بن جائیں کہ بغیر تیاری اور کافی علم و آگہی کے لب کشائی کی زحمت نہ کر سکیں یا کم از کم اپنے دل میں ایمان و انصاف اور اخلاص و امانت کا اتنا جوہر ضرور رکھتے ہوں کہ اعتراف خطا کو اپنی ذلت کے بجائے اپنی عزت، اپنی عافیت اور اپنی نجات تصور کریں۔ بہر حال آج درد مندان ملت اور دانشوران قوم کا یہ فریضہ ہے کہ اس طرح کے امراض کا علاج

تلاش کریں، بیماریوں سے مصالحت کو بیماریوں کا علاج ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مفتی اعظم کی ایک عظیم امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے حلقۂ ارادت میں علما اس کثرت سے داخل ہوئے کہ بہت سے پیروں کے مریدین کی مجموعی تعداد بھی ان کے برابر نہ ہوگی۔ ان علما کو بھی دیکھیے تو ان میں ایک قابل ذکر تعداد ایسے علما کی مل جائے گی جو اپنے علم وفضل اور تدین وتقوی کے لحاظ سے نہ معلوم کتنے پیروں پر بھاری ہوں گے۔ ایسے علما جس کے ہاتھ پر بیعت ہوں وہ اپنے علم وفضل اور اخلاص وتقویٰ میں یقیناً یکتاے روزگار ہوگا۔

مفتی اعظم کے مریدین میں عوام کی بھی بڑی تعداد ہے ان میں اہل ثروت بھی بکثرت ہوں گے مگر حضرت کی زندگی کا لمحہ لمحہ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے مریدین کو کبھی بھی اپنی منفعت بخش "جائداد" تصور نہ کیا، نہ کبھی اس کی کوشش ہوئی کہ کوئی دولت مند حلقۂ ارادت میں داخل ہو جائے۔ ان کا فیضان عام تھا، غریب وامیر یکساں ان کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا خصوصاً اپنے والد گرامی بلکہ اپنے رسول عظمت مآب علیہ التحیات والصلوات کی سنت کریمہ پر عمل کرتے ہوئے غریب کی دلداری کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھتے۔ اور کسی امیر کی رعایت میں کسی غریب کی دل شکنی ہرگز گوارا نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ جس کا دل حبّ دنیا سے پاک ہو، جو مریدوں کی دولت کے بجاے اپنے مولیٰ کی رحمت پر بھروسا رکھتا ہو، جو کسی ناروا قول وفعل کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتا ہو، جو عوام، تو عوام علما کو بھی علمی وعملی خطاؤں پر نظر انداز کر دینا مصلحت اندیشی کی تاریخ کا جرمِ عظیم تصور کرتا ہو، جس کے اخلاص وعزیمت کے آگے علما واکابر کی گردنیں کم ہوں، جس کے فقہ وفتوی اور ورع وتقویٰ کی ستائش میں اَجِلّۂ زمانہ رطب اللسان ہوں، جس کی جلوتوں کے ساتھ اس کی خلوتیں بھی سنت رسول کی آئینہ دار اور یاد خدا اور رسول سے آباد وسرشار ہوں وہی علماے زمانہ کا امام، ملت اسلامیہ کا بے باک رہنما اور گروہِ اولیا کا سرخیل کہا جا سکتا ہے۔ عوام وخواص کی مرجعیت کا تاج اسی کے سر زیب دیتا ہے۔ امت کی نباضی ورہنمائی کا فریضہ اسی کی زبان وقلم کا بے داغ گوہر آبدار ہے۔ بلا شبہہ وہ تمام اہل حق اور تمام ارباب علم وفن کا بے بدل تاجدار ہے۔ رحمه الله تعالىٰ و رحمنا به رحمةً واسعةً.

❁❁❁❁❁❁

باب چہارم

تاثراتی مضامین

صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کا عالمانہ مقام(۱)

صدر الشریعہ، شریعت و طریقت دونوں کے جامع تھے۔ حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز مراد آبادی علیہ الرحمہ نے بارہا فرمایا "صدر الشریعہ مجمع البحرین ہیں۔" شیخ العلماء حضرت مولانا غلام جیلانی اعظمی گھوسوی علیہ الرحمہ اپنے مضمون "صدر الشریعہ" میں لکھتے ہیں:

"آپ شریعت و طریقت دونوں علموں کے جید عالم اور عامل تھے۔ اتباع سنت میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، معاملات کی صفائی، لوگوں کے خطا و قصور کو معاف کر دینا آپ کا طریقۂ کار تھا۔ ظاہر و باطن، قول و فعل، خلوت و جلوت میں آپ یکساں تھے۔ آپ کے مواعظ و نصائح حکیمانہ ہوتے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر مؤثر طور پر فرماتے۔ اکل حلال و صدقِ مقال آپ کا شیوہ تھا۔ سادگی و تواضع کے ساتھ صاحبِ رعب و جلال بھی تھے، کسی جری و بے باک کو بھی آپ کے روبرو بے باکی کے ساتھ کلام کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

حسن اخلاق، صبر و شکر، توکل و قناعت، خودداری و استغنا، آپ کے امتیازات و خصوصیات میں سے تھے۔ آپ زہد و اتقا کے بلند مدارج پر فائز تھے۔ بلا شبہہ آپ ولی کامل تھے۔" (ماہنامہ فیض الرسول، مارچ ۱۹۶۶ء)

بعد وصال صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی یہ کرامت گھوسی اور قریب کے بے شمار لوگوں نے دیکھی کہ برسات کے سبب قبر مبارک کا ایک حصہ کھل گیا تو جس باغ میں مدفون ہیں وہ پورا باغ خوشبو سے معطر ہو گیا۔ مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب بیان کرتے ہیں جو خوشبو یہاں سونگھنے میں آئی وہ دنیا کے کسی عطر و گلاب میں نہ ملی۔ باغ کی یہ خوشبو موافق، مخالف سب نے محسوس کی، بلکہ ایک مخالف عالم نے یہ برملا کہا۔

"مولوی امجد علی مرنے کے بعد بھی اپنی کرامت ظاہر کرنے سے باز نہ آئے۔"

اگر چہ خرق عادت کا صدور معیار ولایت نہیں، لیکن مومن متقی سے خارق عادت کا ظہور نشان ولایت ضرور ہے۔ اور کچھ نہ بھی ہو تو قرآن مقدس ولی کی تعریف میں جو فرماتا ہے: "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْن" یعنی جو ایمان کامل اور تقویٰ کے حامل ہوں، یہ امر حضرت صدر الشریعہ میں پورے طور پر نمایاں رہا۔ یہ ایمان و تقویٰ بجائے خود وہ بنیادی معیار ولایت ہے جس سے کسی منکر قرآن ہی کو انکار ہو سکتا ہے۔

---

(۱) اسلامی اخلاق و آداب، تعارف مصنف، المجمع الاسلامی، ۷ ۱۴۰ھ/۱۹۸۶ء

علم طریقت میں بھی صدر الشریعہ کو کمال حاصل تھا۔ اسی لیے حضرت اپنی کتاب "بہارِ شریعت" کے خاتمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"بلکہ اپنا ارادہ تو یہ تھا کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اسی نہج پر ایک دوسری اور کتاب بھی لکھی جائے گی جو تصوف اور سلوک کے مسائل پر مشتمل ہوگی۔ جس کا اظہار اس سے پیشتر نہیں کیا گیا تھا۔ ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ چند سال کے اندر متعدد حوادث پیہم ایسے در پیش ہوئے جنھوں نے اس قابل بھی مجھے نہ رکھا کہ بہارِ شریعت کی تصنیف کو حد تکمیل تک پہنچاتا۔" (بہارِ شریعت، حصہ:۱۷،ص:۱۰۱)

علم شریعت اعمالِ ظاہر کی صفائی و صحت کے قوانین کا مجموعہ ہوتا ہے۔ (اگر چہ یہ قوانین بھی باطن کی بنیاد پر ہوتے ہیں) اور علم طریقت باطن کے تزکیہ کے اصول بتاتا ہے۔ زیادہ مشکل اور اہم باطن کی طہارت ہے۔ صدر الشریعہ علیہ الرحمہ دونوں کے جامع تھے اس لیے ان کی درس گاہ فیض سے جو بھی گوہرِ آب دار نکلا، علم ظاہر کے ساتھ علم باطن کا بھی حامل نظر آیا۔ خوف خدا اور اخلاص و تقویٰ اگر مومن کی حیات میں پورے طور پر جگہ بنالے تو وہی صاحب باطن ہو جاتا ہے اور اس کی شریعت بھی طریقت کی جلوہ گاہ ہوتی ہے، اور طریقت، شریعت کی امانت دار۔ اگر چہ ظاہر بیں کو یہی نظر آئے گا کہ اس کی عبادت اور معاملت ویسی ہی ہے جیسی میری۔ مگر کہاں وہ نماز جو صرف جسموں کے پیچ و خم پر مبنی ہو اور کہاں وہ نماز جو مشاہدۂ ذات، اخلاص کامل اور خشوع تام کا مخزن ہو۔ کہاں وہ معاملت جس کا مطمح نظر دنیا کے آرام اور دولت کی ذخیرہ اندوزی سے زیادہ نہ ہو اور کہاں وہ معاملت جو کامل خوف خدا کے ساتھ اس طرح ہو کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے شاگرد حضرت امام محمد بن حسن شیبانی کے بقول مومن کو ولی بنادے۔

حضرت صدر الشریعہ کی زندگی نگاہ ظاہر میں درس و تدریس، تصنیف و اشاعت، کتابوں کی ترسیل و تجارت میں گھری ہوئی تھی لیکن یہ سب کام ایسے پاک جذبے، اور بلند نصب العین کے تحت ہو رہے تھے جہاں حرص مال، ہوسِ شہرت اور کبر و نخوت پامال ہو کر رہ گئے اور جہاں دنیاداری کا گزر ہی نہیں۔ جو سراسر دین، آخرت اور رضاے مولیٰ کے لیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے ان کے فیض کو دوام بخشا ہے اور ان کے دبستانِ علم کا جلوہ آج بھی عام ہے۔ذلك فضل الله يوتيه من يشاء. والله ذو الفضل العظيم

❁❁❁❁❁

صدر الافاضل ایک جہانِ کمالات و محاسن[۱]

حضرت صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ (ولادت ۲۱ر صفر ۱۳۰۰ھ یکم جنوری ۱۸۸۳ء- وصال ۱۸ر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء) کی شخصیت بڑے عظیم کمالات و صفات اور متعدد جہات کی حامل تھی، ہر پہلو ایک مستقل مضمون بلکہ کتاب کا متقاضی ہے، برادر گرامی مولانا یٰسین اختر مصباحی نے ان پر کام شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصے میں تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات تیار ہو گئے۔ اب ان کی کمپوزنگ بھی ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ شائقین کو جلد ہی اس کتاب کے مطالعہ کا موقع بھی نصیب ہوگا۔

میں نے حضرت کی حیات پر باضابطہ کوئی تحقیق تو نہیں کی ہے لیکن جہاں تک پڑھا اور سنا ہے اس کی روشنی میں محض حصول برکت اور صفِ واصفاں میں شرکت کی خاطر چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) وہ ایک بلند پایہ مدرس تھے۔ ان کی درس گاہ فیض سے متعدد نامور اساتذہ اٹھے۔ اسی لیے انھیں اس دور میں "استاذ العلما" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا، جیسے ان سے پہلے مولانا لطف اللہ علی گڑھی علیہ الرحمہ (۱۲۴۴ھ - ۱۳۳۴ھ) کو "استاذ العلما" کہا گیا۔ صدر الافاضل کے تلامذہ کے تلامذہ کا سلسلہ آج بھی بر صغیر کے اطراف و اکناف میں جاری ہے۔

(۲) وہ ایک زبان آور خطیب بھی تھے۔ خطابت میں شہرت و مقبولیت کے باعث غیر منقسم ہندوستان کے مختلف خطوں اور دور دراز علاقوں میں ان کے تقریری دورے بھی ہوتے تھے۔ ان کی تقریروں سے نہ صرف عوام مستفید ہوتے بلکہ نکتہ رس اور دقیقہ سنج علما بھی مستفید ہوتے۔

(۳) وہ زبردست مناظر بھی تھے۔ اپنے علمی تبحر اور معقول گرفت کی وجہ سے حریف کو بہت جلد سپر انداز اور لاجواب کر دیتے۔

(۴) وہ ایک پر جوش مبلغ بھی تھے جس کا مظاہرہ اس وقت بخوبی ہوا جب شدھی تحریک سے متاثر ہو کر

(۱) یہ مضمون مولانا نور الحسن مصباحی ازہری کی فرمائش پر لکھا گیا، وہ صدر الافاضل کی حیات و خدمات پر ایک مجموعۂ مقالات کی اشاعت کا ارادہ رکھتے تھے۔

منحرف ہونے والوں کو حلقۂ اسلام میں واپس لانے کی کوششیں ہوئیں۔ سرکار مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفےٰ رضا قادری (۱۳۱۰ھ – ۱۴۰۲ھ) شیر بیشہ اہل سنت مولانا حشمت علی خاں لکھنوی پیلی بھیتی (۱۳۲۰ھ — ۱۳۸۰ھ) اور دیگر مقتدر علما علیہم الرحمہ کے ساتھ صدر الافاضل نے بھی جماعت رضاے مصطفےٰ کے پلیٹ فارم سے تبلیغی دورے کیے اور لوگوں کو دامن اسلام سے وابستہ کیا۔ اس کے علاوہ آریوں سے ان کے مناظروں میں بھی شکوک و شبہات کے بادل صاف کیے۔

⑤ صحافت سے بھی ان کی طویل وابستگی رہی۔ ایک دور تھا جب "الہلال" اور "البلاغ" میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ پھر خود انھوں نے مرادآباد کی سرزمین سے ماہنامہ "السواد الاعظم" جاری کیا جس کے تقریباً سو شمارے حاصل کرکے پروفیسر مسعود احمد صاحب نے ایک وقیع اور تاریخی کتاب "تحریک آزادی ہند اور ماہنامہ السواد الاعظم" مرتب کی۔ اس میں "السواد الاعظم" کی اثرانگیزی آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

⑥ وہ ایک عظیم سیاسی مدبر اور قومی رہنما بھی تھے۔ ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء میں غیر منقسم ہندوستان کے پانچ سو علما و مشائخ کو جمع کرکے بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا انعقاد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

دین و علم کے فروغ کے لیے وہ ایک بہترین منتظم اور باکمال مہتمم بھی تھے۔ اسی لیے انھوں نے مرادآباد میں مدرسہ اہل سنت و جماعت قائم کیا، جو بعد میں "جامعہ نعیمیہ" کے نام سے معروف و مشہور ہوا۔ مدرسہ اہل سنت و جماعت میں استاذنا الجلیل حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز محدث مرادابادی (۱۳۱۲ھ — ۱۳۹۶ھ) صدر العلما مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی (۱۳۱۷ھ — ۱۳۹۸ھ) شمس العلما مولانا قاضی شمس الدین احمد جعفری جون پوری (۱۳۲۲ھ – ۱۴۰۲ھ) اور ان کے متعدد رفقا نے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ بعد میں ان حضرات نے دار العلوم عثمانیہ معینیہ اجمیر شریف کا رخ کیا۔ صدر العلما نے بشیر القاری کے مقدمے میں ان حضرات کا ذکر کیا ہے رحمهم الله تعالىٰ۔

⑧ اس قدیم دور میں جامعہ نعیمیہ کی کشادہ اور باسلیقہ عمارت حضرت صدر الافاضل کے تعمیری ذوق اور فنی نفاست و نزاکت سے بھی روشناس کرتی ہے۔ ہر باب میں ان کی ایک امتیازی شان نظر آتی ہے۔

کسی بڑے ادارے کے قیام کے لیے قلب شہر میں وسیع و عریض زمین حاصل کرنا، اس پر شاندار عمارت بنانا، تدریسی و غیر تدریسی عملہ کا انتظام کرنا، پھر ادارے کو مضبوط بنیادوں پر کامیابی سے چلانا اور خطیر مصارف کی فراہمی کرنا، صرف اسی ایک میدان کو دیکھا جائے تو بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مگر صدر الافاضل نے اسے بھی بڑی ہنرمندی سے سر کیا، اور صرف اسی کے ہو کر نہ رہے بلکہ دوسرے قومی ملی جماعتی محاذوں پر بھی سرگرم عمل رہے۔

⑨ اہل سنت کی اشاعتی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لیے انھوں نے اپنے شہر میں پریس بھی قائم کیا جس

سے اہل سنت کی گراں بہا کتابیں شائع ہوئیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ – ۱۳۴۰ھ) کے ترجمۂ قرآن "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن (۱۳۳۰ھ)" کی پہلی اشاعت (بلا تفسیر) صدر الافاضل ہی کے اہتمام میں ہوئی۔

پھر اس ترجمے پر ان کی تفسیر خزائن العرفان بھی انھیں کے یہاں سے شائع ہوئی۔ اس تفسیر کی خوبیاں ایک مستقل مقالے کی طالب ہیں۔ امید ہے کہ کسی صاحب قلم نے اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہوگی۔

کتابت و طباعت کے سلسلے میں بھی صدر الافاضل کا ذوق بہت نفیس اور اعلیٰ تھا۔ ان کے زمانے کی اطیب البیان اور الکلمۃ العلیا وغیرہ دیکھیے۔ عربی عبارتوں اور ان کے اردو ترجموں اور حوالوں کا انداز کتابت ایک نرالی شان رکھتا ہے۔

⑩ تصنیف (معیاری تصنیف) بڑی وسعت نظر، جودت قلم اور ذوق قارئین سے مناسبت کی طالب ہوتی ہے۔ علمی تبحر کے ساتھ صحافت اور مناظرہ و خطابت سے وابستگی نے صدر الافاضل کے ذوق تصنیف میں بڑی شگفتگی اور بلندی پیدا کر دی تھی۔ جو لکھ دیتے وہ ہر جہت سے دیدنی ہوتا۔ ان کی تصانیف کو ان کے دور کی روشنی میں دیکھا جائے تو جدت و جودت کے دل کش مناظر جابجا نظر آئیں گے۔

⑪ ان متنوع کمالات کے ساتھ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کا دیوان "ریاض نعیم" شائع ہو چکا ہے جو اپنے محاسن کے اظہار کے لیے کسی صاحب فن کی توجہ کا منتظر ہے۔ امید ہے کہ کسی کا رہوار قلم اس گلشن دل کشا کی جانب بھی منعطف ہوا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر الافاضل کی شخصیت ایک جامع کمالات اور کثیر الجہات شخصیت تھی جس پر باضابطہ ریسرچ اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ آج بھی مخلص اہل قلم کی محنتوں سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مولا تعالیٰ مردان کار کو توفیق جمیل اور تائید غیبی سے بامراد و کامیاب فرمائے۔ و ما ذلك عليه بعزيز۔

محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

۹ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ یکم مارچ ۲۰۱۵ء یک شنبہ

❁❁❁❁❁❁

علامہ شمس الدین احمد جعفری

شمس العلما حضرت علامہ شمس الدین احمد جعفری جون پوری علیہ الرحمہ (۱۳۲۲ھ — ۱۴۰۲ھ/۱۹۰۵ء — ۱۹۸۱ء) اپنی درسی جماعت میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے، یہی وہ جماعت تھی جس سے صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رضوی علیہ الرحمہ کا دینی و علمی فیضان اندرونِ ملک و بیرونِ ملک زیادہ عام و تام ہوا، اور دبستانِ امجدی سے نسبت رکھنے والے عموماً اسی جماعت کے کسی عظیم فرد سے بلاواسطہ یا بالواسطہ منسلک نظر آتے ہیں۔

بقول استاذنا الکریم حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز مرادآبادی علیہ الرحمہ (۱۳۱۲ھ — ۱۳۹۶ھ): "ان حضرات نے درسیات میں جو کتابیں پڑھی تھیں اب نئے دور کے علما عموماً ان کتابوں کے نام سے بھی ناآشنا ہیں۔" ان حضرات کی مجلسوں خصوصاً درس گاہوں میں بیٹھنے والے ان کی علمی جلالت اور فنّی سطوت و عظمت کا اندازہ خوب کرتے تھے۔

ایک زمانے میں میرے والد صاحب بنارس میں زیرِ علاج تھے اُس دور میں شمس العلما کی مجلس میں راقم کو کبھی کبھی جامعہ حمیدیہ رضویہ، بنارس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا، حالات زمانہ سے آگاہ، تجربات سے لبریز اور علمی حقائق و دقائق سے آشنا نظر آتے۔ معلومات کا سمندر تھے، جب کسی موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے تو وہ بولتے رہتے اور سننے والا سنتا ہی رہتا۔

ان کا ایک امتیازی کمال یہ ہے کہ اُس زمانے میں جب کہ خطوط پر پتا صرف اردو میں کافی ہوتا، تحصیل اور کچہریوں کے کاغذات بھی اردو میں لکھے جاتے، وہ انگریزی سے بھی بخوبی واقف تھے، پہلے انھوں نے جون پور کے ایک کالج میں تعلیم پائی تھی، اس لیے انگریزی بولتے تو خوب بولتے۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں جب وہ صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث تھے، جامعہ کے انگریزی کے استاد ماسٹر آفتاب احمد خاں مبارک پوری سے جب موڈ میں ہوتے تو انگریزی میں باتیں کرتے۔

مولانا محمد احمد شاہدی غازی پوری علیہ الرحمہ کی روایت ہے کہ غازی پور کی کسی کورٹ میں ایک شرعی مسئلہ کی وضاحت کے لیے قاضی صاحب کا جانا ہوا، جج انھیں دیکھ کر خائف ہوا، اور اپنے ہم نشین سے انگریزی میں کچھ کہا، جس

کا مفہوم یہ تھا کہ "یہ آدمی بڑا بھیانک معلوم ہوتا ہے" قاضی صاحب نے سُن لیا اور انگریزی ہی میں جواب دیا، جس پر وہ بڑا شرمندہ ہوا، کیوں کہ یہ کورٹ کے آداب کے بھی خلاف تھا کہ کوئی معاملہ سامنے آئے بغیر جج کسی کے بارے میں اپنی اس طرح کی رائے ظاہر کرے۔

دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور میں اپنے زمانۂ تدریس سے پہلے وہ ہمیشہ منتہی کتابوں کے امتحان کے لیے تشریف لاتے، کتابوں کے مباحث گویا پیش نظر ہوتے، پیچیدہ سوالات کرتے اور نمبر صلاحیت کے لحاظ ہی سے دیتے۔ میں ان کے سامنے بیضاوی شریف کا امتحان دینے بیٹھا تو کتاب کھولنے سے پہلے ہی "أسماء الله تعالیٰ تو خذ باعتبار الغايات" کی بحث چھیڑ دی، میں نے جواب دینے کی کوشش کی، خیر انھوں نے نوے (۹۰) نمبر دیے، جس میں ان کی عنایت کا بھی دخل ہوگا۔

تدریس ان کی زندگی بھر کا مشغلہ رہا، تصنیف کی طرف زیادہ توجہ نہ دی، پھر بھی قانون شریعت، قواعد النظر فی مجالی الفکر، قواعد الاعراب وغیرہ ان کی قلمی یادگاریں ہیں، ان میں سے قانون شریعت کی اشاعت تو ان کے زمانۂ حیات سے اب تک جاری ہے، باقی شاید ایک دوبار سے زیادہ شائع نہ ہوئیں۔

ایک زمانے میں وہ دارالعلوم اشرفیہ کی "مجلس علما" کے بھی رکنِ رکین تھے، ان میں اور حافظ ملت میں بڑی یگانگت اور مودّت تھی، مشکل حالات میں بھی وہ حافظ ملت کے حامی و دمساز رہے۔

اپنی جماعت میں یہ امتیاز بھی میرے علم کی حد تک صرف انھی کو حاصل ہے کہ وہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے براہ راست شرفِ ارادت رکھتے تھے، دیگر رفقا نے زمانہ تو پایا مگر داخل بیعت نہ ہو سکے۔ رحمهم الله تعالیٰ رحمة واسعة.[1]

محمد احمد مصباحی

۱۴ر صفر ۱۴۴۰ھ/ ۲۴ر اکتوبر ۲۰۱۸ء

۞۞۞۞۞۞

(۱) غالباً مولانا کمال احمد علیمی شمس العلما کے حالات پر کوئی کتاب مرتب کر رہے تھے، اسی زمانے میں قاری نورالہدیٰ گورکھ پوری نمائندہ سہارا اردو کے ذریعہ کئی بار کچھ تاثرات کا تقاضا ہوا، تو مختصراً درج بالا سطور لکھ کر ارسال کی گئیں۔

آہ! مولانا قاری محمد عثمان اعظمی(۱)

قارئین کو بہت حزن وغم کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ جماعت کے نامور عالم، مشہور خطیب اور استاذ القرا حضرت مولانا قاری محمد عثمان اعظمی طویل علالت کے بعد اپنے وطن مالوف محلہ حسین پور گھوسی میں جمعہ کا دن گزار کر سنیچر کی رات کو ساڑھے بارہ بجے انتقال فرما گئے۔ دوسرے دن بتاریخ ۱۴/ ربیع النور ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۲/ اگست ۱۹۹۵ء سنیچر کو بعد ظہر تین بجے نماز جنازہ اور تجہیز وتکفین عمل میں آئی اور اپنے مکان سے قریب ہی محلہ حسین پور کا قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ موسم کی ناخوش گواری اور بارش کے باوجود ہزاروں افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی جن میں علما و مشائخ کی بھی بڑی تعداد تھی۔ حضرت مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب نے امامت فرمائی۔ عمر پچاسی سال سے زیادہ تھی۔

حضرت مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے، ان کی دینی خدمات کا دائرہ ساٹھ سال سے زیادہ عرصے کو محیط ہے۔ ابتدائی تعلیم گھوسی ہی میں پائی پھر کئی سال دار العلوم مئو میں پڑھا پھر دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا اور یہیں سے فراغت پائی۔ اشرفیہ میں ابتداءً کئی سال تک تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ یہاں انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ کا قیام اور ۱۲/ ربیع الاول کو جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدا ان ہی کے علمی و دینی جوش وولولہ کا ثمرہ ہے۔

فن قراءت میں مولانا قاری محمد یحییٰ مبارک پوری، علامہ ارشد القادری، علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دامت برکاتہم جیسے سن رسیدہ اور بزرگ علما کو ان سے تلمذ حاصل ہے۔ وہ درس نظامی کی بھی اچھی مہارت رکھتے تھے اور مختلف درس گاہوں میں مختلف ابتدائی وانتہائی کتابوں کا درس دے چکے تھے۔ خطابت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا اور مشکل علمی باتوں کو بھی آسانی سے عوام کے ذہن میں اتار دینے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ لوگ دل چسپی سے ان کا وعظ سنتے اور مشتاق رہتے۔ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ اور ہر قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے۔ میں نے ان کی نظموں پر مشتمل ایک دو کتابچے بھی دیکھے جو خاص عنوانات وتقریبات کے تحت تھے۔ صحافت ان کی فطری غذا تھی۔ میں نے دیکھا کہ جب موقع ملتا کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ بلند علمی مضامین بھی لکھتے۔ عام اصلاحی موضوعات پر بھی اظہار خیال کرتے۔ مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ لکھنے کے بعد تبییض کرنا، نقل رکھنا، کسی رسالہ کو بھیجنا یا کتابی شکل میں شائع کرنا

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، شمارہ ستمبر ۱۹۹۵ء، ص: ۳۸

میرے لیے بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے سیکڑوں مضامین لکھے اور رکھے رہ گئے۔ اپنے صحافتی ذوق کے تحت بنارس سے چند سال تک "ماہنامہ اسلام" نکالتے تھے اس کے متعدد شمارے میں نے اپنے بچپن میں پڑھے تھے۔ سورۂ فاتحہ کی ایک تفسیر بھی انھوں نے لکھ کر شائع کی تھی اور ارادہ تھا کہ اسی طرح قسط وار دو تین جز میں پورے قرآن کی تفسیر لکھتے اور شائع کرتے رہیں گے۔ مگر غالباً یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ میں جب فیض العلوم جمشید پور میں تھا اس وقت موصوف وہاں تقریروں کے سلسلے میں پہنچے، دو تین ماہ قیام رہا اسی عرصے میں ایک کتاب "چند اختلافات کا جائزہ" لکھی اور میرے حوالے کی، وہ اعجاز بکڈپو کلکتہ سے شائع ہوئی، ابتداءً جب وہ خود فیض العلوم جمشید پور میں مدرس تھے تو میلاد وقیام کے موضوع پر ایک کتاب شائع کی تھی مگر اس کی پہلی طباعت غالباً اس سے قبل معارف پریس اعظم گڑھ سے ہوئی تھی۔ دونوں ایڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں۔

عمدہ خطاط اور خوش نویس بھی تھے، کانپور قیام کے دوران ان کی کتابت کردہ بعض کتابیں شائع بھی ہوئیں۔ اس سے قبل وبعد بھی وقتاً فوقتاً یہ مشغلہ اپنا لیا کرتے تھے۔ خوش آوازی کے باعث جلسوں میں تقریروں کے درمیان ترنم سے نعتیں بھی پڑھتے۔ مزاج میں سادگی اور بے تکلفی تھی۔ ہر طرح گزر بسر کر لیتے۔ ظرافت اور خوش طبعی بھی اچھی خاصی تھی۔

معاملہ فہمی، اصابت رائے اور اچھے تدبر کے بھی مالک تھے۔ عرصے تک دار العلوم اشرفیہ کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے اور رکنیت سے قبل بھی دار العلوم سے خلوص وہمدردی کے باعث مختلف مواقع پر مشاورت کے لیے حافظ ملت علیہ الرحمہ نے ان کو دعوت دی۔ جامعہ اشرفیہ کی تعلیمی کانفرنس پھر افتتاحی کانفرنس دونوں میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ مدرسہ شمس العلوم گھوسی سے متعلق بھی ان کی خدمات بہت ہیں۔ اخیر زندگی میں قریباً ۱۷/ سال تک اس کی انتظامیہ کے صدر بھی رہے۔

بکثرت مدارس ومساجد کو ان سے فیض پہنچا۔ طبیعت میں آزادی تھی۔ اگر کوئی جگہ ناپسند ہوئی تو چھوڑنے میں دیر نہ لگتی۔ کسی جگہ کے لوگوں نے اصرار کیا اور ان کو جگہ پسند آگئی تو جانے میں بھی دیر نہ ہوتی۔ جہاں سے چلے آتے وہاں کے لوگ برابر مشتاق اور دوبارہ آمد کے متمنی رہتے۔ بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ کا یہ حال کیوں ہے؟ استقلال کے ساتھ ایک جگہ کیوں نہیں رہتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ قدرت نے ہمارا رزق روئے زمین کے مختلف خطوں میں چھینٹ دیا ہے اسے چن رہے ہیں۔

حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئے اور مدینۂ منورہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے خلیفہ حضرت مولانا ضیاء الدین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے دست پاک پر بیعت سے سرفراز ہوئے۔ ان کے حالات، خدمات اور کارنامے مختلف دیار میں پھیلے ہوئے ہیں۔ قلمی کاوشیں بھی منتشر اور زیادہ تر مسودات کی شکل میں رہیں،

جن میں سے اکثر ضائع بھی ہو چکی ہوں گی۔ اس لیے ان کے سوانح وحالات کی تفصیلی نگارش بہت دشوار گزار عمل ہے جس سے سخت مجاہدہ کیش ہمت مردانہ کے بعد بھی کما حقہ عہدہ برآ ہونے کی صورت نظر نہیں آتی۔ ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ خدا کسی کو توفیق بخشے تو کچھ مبسوط حالات منظر عام پر آسکتے ہیں۔

پس ماندگان میں اہلیہ، صاحبزادے مولوی رضوان احمد صاحب (جو زمانۂ طالب علمی سے ہی تجارت سے وابستہ ہو گئے) اور دو لڑکیاں ہیں۔ رب تعالی سب کو صبر جمیل، اجر جزیل اور توفیق خیر سے نوازے۔ اور حضرت کے ساتھ رحمت و غفران اور رفع درجات کا معاملہ فرمائے۔ آمین۔

❁❁❁❁❁❁

حضرت احسن العلما: کچھ یادیں کچھ باتیں[1]

سید العلما حضرت مولانا سید شاہ آل مصطفیٰ برکاتی مارہروی علیہ الرحمہ سے آگاہی تو بچپن ہی میں ہو گئی تھی مگر ان کے برادر عزیز حضرت احسن العلما والمشائخ سید مصطفیٰ حیدر حسن میاں علیہ الرحمہ سے اس وقت واقفیت ہوئی جب حضرت سید العلما کے وصال کو کئی سال گزر چکے تھے۔ ان کی مجلسوں میں حاضری اور گفت و شنید کا موقع بھی کم ہی نصیب ہوا، پہلی بار مخدوم گرامی حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ کی معیت میں عرس قاسمی کے موقع پر ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء مارہرہ شریف حاضری کے وقت شرف نیاز حاصل ہوا۔ آخری بار رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ میں ممبئی کھڑک مسجد کے اندر ملاقات و زیارت نصیب ہوئی۔ درمیان میں ایک بار اور عرس قاسمی کے موقع پر دیدار ہوا۔ اس لحاظ سے حضرت کے حالات و عادات پر روشنی ڈالنا میرے لیے بہت دشوار ہے لیکن جہاں تک دیکھا، سنا اور جانا ہے محض خراج عقیدت کے طور پر چند سطروں میں رقم کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

احسن العلما والمشائخ اپنے اکابر کی روایت کے امین اور ان کے جادۂ مستقیم پر شدت کے ساتھ گامزن تھے۔ بزرگوں کے حالات بہت دل چسپی اور بسط و تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے۔ ان کی روایت سے وہ سارے حالات قلم بند ہو جاتے تو معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا۔ بے دینوں اور بدمذہبوں سے نفرت و بیزاری مشائخ مارہرہ کا وہ امتیازی نشان تھا جس نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کو خانقاہ برکاتیہ کی طرف مائل کیا اور سیدنا شاہ آل رسول علیہ الرحمہ کی ذات میں انھیں وہ مرشد برحق ملا جو علم ظاہر و باطن کے حامل ہونے کے ساتھ دین میں کسی مداہنت کو روا نہ رکھتا۔ یہ امتیاز بعد کے مشائخ میں بھی قائم رہا اور حضرت احسن المشائخ نے بھی پورے طور سے اس کو برقرار رکھا۔ دین میں صلابت، عقائد میں اخلاص، الحب للہ والبغض فی اللہ میں صداقت ہی کا یہ اثر تھا کہ اعلیٰ حضرت اور مفتی اعظم قدست اسرارہما کا ذکر بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ کرتے، ان کے فتاوی کو حرز جان بناتے، ان کی عظمتوں کا تذکرہ ہوتا تو بس سنتے جائیے، کوئی مرید باصفا یا محب بے ریا جو بیان کرتا اس سے زیادہ اس جانشین پیران بزرگ کی زبان حق ترجمان سے چرچا ہوتا۔ سچی بزرگی کی نشانی یہی ہے کہ اہل فضل کے کمالات کا اعتراف کیا جائے اور مذہب میں صلابت و صداقت کی پہچان یہ ہے کہ اس مذہب کے فروغ و اشاعت کے لیے زندگی وقف کرنے والے کی مدح

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، سید ین نمبر، اکتوبر ۲۰۰۲ء

وثنا کی جائے اور اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ اس کی عظیم خدمات جہاں دین کے لیے نفع بخش اور ملت کے لیے راہ نما تھیں وہیں ہمارے لیے بھی فیض رساں اور باعث امتنان و تشکر تھیں مگر جہاں صداقت و اخلاص کا فقدان ہوتا ہے وہاں اپنی ذات اور اپنے نفس کے سوا کوئی صاحب کمال نظر ہی نہیں آتا۔

مارہرہ شریف کے اندر تفویض خلافت کے معاملے میں بڑی سخت احتیاط ہوتی، اس روش کو حضرت احسن المشائخ نے بھی برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خلفا کی تعداد زیادہ نہیں اور جو خلفا ہیں ان میں اکثر حضرات وہ ہیں جو آج جماعت علما میں امتیازی شان کے حامل ہیں۔ دوسرے جو حضرات ہوں گے وہ بھی کسی بڑی خصوصیت کے حامل ہوں گے۔ میں نے عرس قاسمی میں حضرت احسن المشائخ سے مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ کے لیے مطلقاً تفویض خلافت کا اعلان سنا مگر ان کے ساتھ دو اور حضرات کے لیے اعلان کیا تو بڑی صراحت کے ساتھ "بشرائط معلومہ" کی قید بھی ذکر فرمائی۔ یہ اسی احتیاط پسندی کے سبب ہوا جو یہاں کا خاص امتیاز رہی ہے۔

جود و سخا اور مہمان نوازی میں اپنے بزرگوں کے صحیح وارث تھے، عرس کا ازدحام کتنا عظیم ہوتا ہے مگر یہ گوارا نہ تھا کہ ہمارے زائرین قصبے میں کہیں دور جائیں یا کسی ہوٹل کا سہارا لیں۔ سب کے قیام و طعام کا انتظام اپنی جانب سے کرتے۔ کوئی دینی و علمی کام سن لیتے تو اس کے لیے مالی تعاون میں حصہ لینے کی کوشش فرماتے، ۱۴۱۴ھ میں ممبئی میں میری حاضری کی غرض یہ تھی کہ امام احمد رضا قدس سرہ کا حاشیۂ شامی جد الممتار جلد ثانی جس کی تحقیق و تعلیق وغیرہ کا کام ایک سال قبل مکمل ہو چکا تھا، اب رضا اکیڈمی کے تعاون سے اس کی طباعت کا کام مکمل ہو۔ جناب محمد سعید نوری سے میری گفتگو پہلے ہو چکی تھی اس لیے جانے کے بعد ہی کمپیوٹر والے سے رابطہ ہوا اور کام کا آغاز ہو گیا۔ حضرت احسن المشائخ کے یہاں کھڑک مسجد میں شرف نیاز کے لیے جب حاضر ہوا اور انھیں علم ہوا کہ جد الممتار کے سلسلے میں ممبئی آنا ہوا ہے تو اس کے لیے از خود ایک ہزار روپے عنایت کیے۔ میں نے عرض کیا حضرت کی بارگاہ میں اس لیے حاضر نہیں ہوا، نہ ہی ممبئی میں چندہ کرنا مقصود ہے۔ کام تو رضا اکیڈمی کے توسط سے جاری ہے مگر حضرت واپس لینے پر راضی نہ ہوئے، فرمایا پھر بھی اسے رکھو، اس طرح کے نہ معلوم کتنے کام ہیں جن میں از خود پیش قدمی کر کے حصہ لیا۔ یہ مزاج کسی کاروباری پیر میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس وقت دنیائے سنیت میں ان کی ذات تمام علمائے اکابر و اصاغر کے لیے مرجع و مقتدا کی حیثیت رکھتی تھی۔ مفتی اعظم قدس سرہ کے زمانے میں جب کوئی سنگین اختلاف رونما ہوتا تو فیصلہ کے لیے نگاہیں مفتی اعظم کی طرف اٹھتیں۔ ان کے بعد یہ اعزاز صرف حضرت احسن المشائخ کے حصے میں آیا۔ اس وقت ہماری صفوں میں جو انتشار و افتراق رونما ہوا ہے اس کے سلجھاؤ کے لیے متفق علیہ فیصل کی حیثیت سے اگر کوئی ذات شمار ہوتی تھی تو وہ حضرت ہی

کی ذات تھی، افسوس کہ ان کے دم کے ساتھ ہمارا یہ نقطہ التقا اور مرکز اجتماع بھی جاتا رہا۔

اب کون ہے جو اس انتشار بکف ملت کی زلف برہم سنوارے؟ اب کون ہے جو اس بکھرے ہوئے گلے کو یکجا کرے، اب کون ہے جس کے اندر سب کو راہ راست پر لانے کی سچی تڑپ، بچھڑے ہوؤں کو ملانے کا جذبہ، بدکنے والوں کو اپنانے کا فن اور بہکنے والوں کو تھامنے کا یارا ہو؟ وہ کیا گئے یہ سب جاتا رہا۔

فما کان قیس هلكه هلك واحد
و لكنه بنيان قوم تهدما

❁❁❁❁❁❁

شارح بخاری ایک گلدستۂ محاسن[1]

حضرت شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی (ولادت ۱۱؍ شعبان ۱۳۳۹ھ / ۲۰؍ اپریل ۱۹۲۱ء ۔ وفات ۶؍ صفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۱؍ مئی ۲۰۰۰ء) ایک عہد کے امین اور ایک تاریخ کے عینی شاہد تھے۔ انھوں نے جب سن شعور میں قدم رکھا تو یہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے خلفا اور تلامذہ کی قیادت کا دور تھا۔ انھوں نے صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خان بریلوی علیہم الرحمہ کو قریب سے دیکھا اور صدر الشریعہ سے فتویٰ نویسی کی مشق بھی کی، حافظ ملت مولانا عبد العزیز مرادآبادی سے دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں منتہی کتابوں کا درس لیا۔ صدر العلما مولانا سید غلام جیلانی علی گڑھی ثم میرٹھی سے بھی میرٹھ میں بعض کتابیں پڑھیں اور محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد لائل پوری علیہ الرحمہ سے دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف میں ایک سال کتب حدیث کا درس حاصل کر کے شعبان ۱۳۶۲ھ میں سند فضیلت پائی۔

متعدد مدارس میں انھوں نے ایک کامیاب استاذ کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں لیکن ان کا زیادہ تابناک زمانۂ تدریس وہ ہے جو ۱۳۷۵ھ سے ۱۳۸۶ھ تک مظہر اسلام بریلی شریف میں گزرا۔ وہاں ان سے علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی پورنوی، مولانا مفتی مجیب اشرف اعظمی، بانی و مہتمم دار العلوم امجدیہ ناگ پور، مفتی عبید الرحمن رشیدی سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جون پور جیسے ارشد تلامذہ نے درس لیا اور وہیں ۱۳۷۸ھ میں حضرت مفتی اعظم قدس سرہ نے انھیں رضوی دار الافتا کا باضابطہ مفتی مقرر کیا۔ جہاں تقریباً پچیس ہزار فتاویٰ ان کے قلم سے صادر ہوئے پھر جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ سے آخری حیات (چوبیس سال) تک وہ تدریس و افتا کے بجائے صرف افتا، اصلاح فتاویٰ اور تربیت فتاویٰ کی خدمات سے وابستہ رہے۔ ان کی علمی وجاہت اور معتمد شخصیت کے باعث اطراف ہند کی طرح، اکناف عالم سے بھی ان کے پاس سوالات آتے اور ان کی پوری کوشش یہ ہوتی کہ سائلین کو جوابات جلد سے جلد بھیج دیے جائیں۔ اندازہ ہے کہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں انھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ فتاویٰ صادر فرمائے اس لحاظ سے وہ بلاشبہہ سب سے عظیم مرجع فتاویٰ تھے۔

قرطاس و قلم سے ان کا شغف عہد طالب علمی ہی سے تھا۔ دبدبۂ سکندری وغیرہ میں ان کے مضامین منظر عام پر آتے رہتے تھے۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے کتابی شکل میں ان کی پہلی کاوش "اشک رواں" کے نام سے ربیع

(۱) ماہ نامہ کنز الایمان، دہلی، شارح بخاری نمبر، اپریل ۲۰۰۱ء

الاول ۱۳۶۴ھ میں شائع ہوئی۔ جو ان کی تحریری صلاحیت کے ساتھ علمی، دینی اور سیاسی بصیرت و ژرف نگاہی کی بھی آئینہ دار ہے۔ یہ ان کی فراغت کے صرف دو سال بعد کی تصنیف ہے جسے ان کے اساتذہ اور اساتذہ کے اساتذہ نے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اگرچہ اکثر حضرات کو اس کے سیاسی موقف سے اتفاق نہ تھا مگر مصنف نے اس خطرناک اور پیچیدہ موضوع کو جوش شباب کے باوجود اکابر کے ادب و احترام کے ساتھ جس خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا ہے وہ بہر حال قابل تحسین اور آج ہمارے لیے قابل تقلید ہے۔

مختلف دینی و علمی موضوعات کو انھوں نے عنوان قلم بنایا اور جس موضوع پر لکھا اس کا حق ادا کر دیا۔ پہلی بار جب خلابازوں کے چاند پر پہنچنے کی خبر نشر ہوئی تو مذہبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ مفتی صاحب نے اس موضوع پر ایک مختصر مضمون نوری کرن بریلی میں شائع کرایا جس میں یہ ثابت کیا کہ چاند، سورج اور تمام ستارے آسمان کے نیچے ہیں اور انسان کے لیے چاند تک پہنچنا ممکن ہے۔ اس مضمون کی تردید بھی کی گئی جس کے بعد انھوں نے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت محسوس کی اور "اسلام اور چاند کا سفر" لکھ کر شائع کیا۔

ضبط تولید اور نسبندی کا مسئلہ سامنے آیا تو اس کی حرمت پر انھوں نے ایک قرآنی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اپنا مضمون شائع کیا۔ ارض مقدس میں یہودی حکومت کے قیام سے لوگوں میں شکوک و شبہات پھیلے تو ایک تحقیقی مضمون "ارض مقدس اور یہودی تغلب" لکھ کر انھوں نے ازالۂ شبہات کی جانب توجہ فرمائی۔ خلافت معاویہ و یزید نامی کتاب منظر عام پر آئی جس میں یزید کو خلیفۂ برحق دکھانے کی ناروا جسارت کی گئی تو اس موضوع پر بھی حضرت مفتی صاحب کا لاجواب مضمون پاسبان الہ آباد میں شائع ہوا جسے پڑھ کر میں پہلی بار حضرت کی علمی جلالت سے روشناس ہوا۔ سیرت نبوی کا سلسلہ بھی انھوں نے شروع کیا تھا مگر صرف مقدمہ اور ابتدائی حصہ ہی رقم ہو سکا اور مبارک پور پہنچنے کے بعد شرح بخاری کا کام شروع ہو گیا جو بعونہٖ تعالیٰ مکمل ہوا اور حضرت کی قلمی خدمات کا شاہ کار قرار پایا۔

دعوت و اصلاح اور تقریر و خطابت سے بھی ان کا رشتہ دور طالب علمی سے ہی قائم رہا اور ملک کے طول و عرض میں ان کی تقریروں نے اپنا اثر دکھایا۔ وہ جو بیان فرماتے دلیل کے ساتھ بیان فرماتے اور انداز ایسا عام فہم اور دل نشیں ہوتا کہ سامع متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ تفہیم و تاثیر کا عنصر ان کی تحریروں میں بھی بخوبی نمایاں ہے۔ مختصر الفاظ میں مدلل طور پر اپنے موقف کو دل و دماغ میں اتار دینا ان کا خاص کمال ہے جو ان کی تقریر و تحریر کے ساتھ تدریس اور مجلسی باتوں میں بھی عیاں تھا۔ فن مناظرہ، حاضر جوابی اور مخالف کو جلد سے جلد سرنگوں کرنے میں بھی وہ یکتائے روزگار تھے۔ اس کا نمونہ ان کی تحریروں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

حضرت صدر الشریعہ اعظمی علیہ الرحمہ سے بیعت و خلافت اور کتب حدیث کی اجازت حاصل تھی۔ حضرت مفتی اعظم قدس سرہ نے جملہ سلاسل طریقت کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ احسن العلما مولانا سید مصطفیٰ حیدر حسن میاں

مارہروی علیہ الرحمہ نے بھی خلافت سے نوازا تھا۔ جس کے بعد بہت سے افراد حضرت مفتی صاحب سے بیعت ہوئے اور بہت سے جید اور جلیل القدر علما نے ان سے احادیث کی اجازت لی اور بہت سے علما خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔

وہ تعلیمی اور انتظامی امور میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اسی لیے جامعہ اشرفیہ کے ارباب حل وعقد ان کے مشوروں سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہے، خصوصاً اخیر دور میں جب کہ وہ جامعہ کی انتظامیہ کے رکن اور ناظم تعلیمات ہو چکے تھے تعلیمی وانتظامی امور میں ان کا مشورہ ضروری تھا۔ انھوں نے ایک حساس اور دردمند دل پایا تھا اس لیے ہر پہلو پر سنجیدگی، دور بینی اور اخلاص کے ساتھ غور کرتے اور مشورہ طلب کیے بغیر بھی ایک معمر اور شفیق مربی کی طرح ہدایت و نصیحت فرماتے رہتے۔

قومی و ملی ضروریات پر بھی ان کی نظر تھی اور اس سلسلے میں وہ برابر ہدایت دیتے رہتے۔ "مجلس شرعی" کے مذاکرات میں بھی وہ سرگرم حصہ لیتے۔ فقہی مباحث تو ان کی خاص جولان گاہ تھے اس لیے وہ مجلس کے سرپرست بھی نامزد ہوئے لیکن اس سے ان کی دل چسپی اس لیے بھی تھی کہ اس کا قیام نئے مسائل کے حل اور نئی صورت حال میں مسلمانوں کی دینی وعلمی رہنمائی کے لیے عمل میں آیا اس کی کارکردگی جس قدر بہتر ہوگی مسلمانوں کے مسائل کا حل بھی اتنا ہی جلد ہوگا۔

بہت سے اداروں کے وہ معتمد اور سرپرست بھی تھے جہاں ان کے اثر ورسوخ اور اخلاص و دردمندی کے باعث پیچیدہ مسائل اور دشواریوں کے حل میں بڑی آسانیاں تھیں، افسوس کہ حضرت کی رحلت سے ان کے تلامذہ اور وابستہ علما وطلبا کی طرح یہ ادارے بھی یتیم ہوگئے۔ مولیٰ تعالیٰ موصوف کو اپنی بے کراں رحمتوں کے سایے میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو صبر و شکیب اور ثبات و استقامت سے نوازے۔ آمین

❁❁❁❁❁

مولانا تحسین رضا بریلوی سے چند ملاقاتیں (۱)

روز جمعہ مبارکہ ۱۸ر رجب ۱۴۲۸ھ/ ۳ر اگست ۲۰۰۷ء کو بے شان وگمان ان کی حادثاتی رحلت کی خبر سن کر دل کو صدمہ پہنچا، ہمیں اب بھی ان کی ضرورت تھی۔ ان سے علمی و دینی فیض حاصل کرنے والوں کی ایک اچھی تعداد تھی جو ان کی آمد کے لیے نگاہیں فرش راہ رکھتے مگر جو مقدر ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

ان کی تاریخ ولادت غالباً ۱۴ر شعبان ۱۳۴۷ھ/ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۰ء ہے۔ اس لحاظ سے بتاریخ ہجری ان کی عمر اسی سال اور بتاریخ عیسوی ساڑھے ستہتر سال ہوتی ہے، مولیٰ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کا سایہ دراز سے دراز تر فرمائے۔ یہ یاد نہیں کہ میں کب ان سے واقف ہوا۔ غالباً ۱۹۷۳ء سے بریلی شریف عرس رضوی میں حاضری ہو رہی ہے۔ ان کے والد ماجد کی زیارت انھیں ایام میں ہوئی۔ اگرچہ کتابوں کے ذریعہ مولانا حسنین رضا خان علیہ الرحمہ سے میری آشنائی بہت پہلے سے تھی۔ اندازہ ہے کہ حضرت مولانا تحسین رضا خان سے بھی ۱۹۷۴ء تک میں واقف ہو چکا تھا۔ اس کے کئی سال بعد ملاقات میں ان سے میرا تعارف ہوا، میں نے اپنا نام "محمد احمد مصباحی" بتایا تو وہ بولے "ابن مفتی عبد المنان صاحب" میں نے عرض کیا نہیں، نہیں میں مفتی صاحب کا شاگرد ہوں۔ ان کے فرزند میرے ہم نام ہیں۔ نام و نسبت اور ضلع وغیرہ کی مشارکت کی وجہ سے یہ اشتباہ آج بھی کچھ لوگوں کو ہو جاتا ہے۔...

صدر العلما سے ملاقاتیں تو بار بار ہوئیں مگر اطمینان سے بیٹھ کر باہم گفت وشنید کا موقع دو تین بار سے زیادہ میسر نہ آیا۔ شعبان ۱۴۰۳ھ اواخر مئی یا اوائل جون ۱۹۸۳ء میں جد الممتار جلد ثانی کی نقل کا اصل سے مقابلہ کرنے کے لیے غالباً دو ہفتے بریلی شریف میں میرا قیام رہا۔ مولانا نصر اللہ رضوی بھیروی بھی تھے۔ ان دنوں ایک بار بعد عصر کانکر ٹولہ حضرت کے مکان پر میری حاضری ہوئی، حاضری دو مقصد سے تھی ایک تو یہ کہ حضرت کا مکتبہ، مکتبۂ مشرق کچھ دنوں قبل قائم ہو گیا تھا اور المجمع الاسلامی سے معاملات رہتے تھے، اس سلسلے میں مولانا عرفان الحق منیجر مکتبہ سے کچھ حساب کرنا تھا۔ دوسرے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے رسالہ "فوز مبین در رد حرکت زمین" کی اصل حضرت کے یہاں ہے، یہ رسالہ پہلے ماہ نامہ "الرضا" میں قسط وار شائع ہوا تھا، اس کے مدیر حضرت کے والد گرامی مولانا حسنین رضا خاں علیہ الرحمہ تھے، اعلیٰ حضرت کی حیات میں فوز مبین کے صرف ۹۳ر صفحات "الرضا" میں شائع ہو سکے پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے وصال کے کچھ قبل یا بعد میں ماہ نامہ بند ہو گیا اور رسالہ فوز مبین حضرت مولانا حسنین رضا خاں علیہ الرحمہ کے یہاں رہ گیا۔ وہ بعد میں بھی بقیہ صفحات کی الگ یا

(۱) سال نامہ تجلیات رضا، بریلی، صدر العلما محدث بریلوی نمبر، ۲۰۰۷ء۔

پورے رسالے کی یک جا اشاعت نہ کر سکے، حضرت صدر العلما سے گفتگو کے بعد یہ تحقیق ہوگئی کہ یہ رسالہ مکمل موجود ہے، البتہ بروقت تلاش کر کے نکالنا دشوار ہے۔ اس دن ہم لوگ بعد مغرب تک رہے اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

پھر کئی سال بعد ایک موقع سے علامہ ازہری صاحب کے یہاں "مرآة النجدية" دیکھنے کے لیے میرا قیام تھا، غالباً انھیں دنوں کسی وقت اتفاقاً صدر العلما بھی تشریف لائے اور باتیں ہونے لگیں، شعر و سخن کا بھی تذکرہ آگیا انھوں نے اپنی ایک نعت سنائی جس کا مطلع ہے:

جس کو کہتے ہیں قیامت حشر جس کا نام ہے
در حقیقت تیرے دیوانوں کا جشن عام ہے

اس نعت کے اشعار میں اظہار و بیان کا بانکپن اور طرز ادا کا حسن جھلکتا نظر آیا مگر یہ شعر بڑا انوکھا اور زور دار معلوم ہوا:

آ رہے ہیں وہ سر محشر شفاعت کے لیے
اب مجھے معلوم ہے جو کچھ میرا انجام ہے

انھوں نے بتایا کہ یہ نعت حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کی تھی۔ حضرت نے ہر شعر پر صحیح کا ایک نشان لگایا ہے لیکن اس پر دو نشان لگائے اور فرمایا: چچا میاں (استاذ زمن مولانا حسن رضا بریلوی) کا انداز ہے۔

گزشتہ سال ماہ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ میں جسپور ضلع نینی تال میں حضرت سے ملاقات رہی، جہاں مدرسہ بدر العلوم حضرت کی سرپرستی میں چل رہا ہے اور ہر سال حضرت وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان کی تدریسی خدمات کا دائرہ نصف صدی سے زیادہ عرصے کو محیط ہے۔ نہ معلوم کتنے تشنگان علوم ان کی بارگاہ فیض سے سیراب ہوئے اور آج مختلف دینی و علمی خدمات میں مصروف ہیں۔

سادگی، کم گوئی، تقویٰ و پرہیز گاری، علمی پختگی، فیض رسانی، خوش اخلاقی و انکساری وغیرہ ان کی وہ صفات ہیں جو ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ ان کی درسی تقریروں، علمی نکات، مجلسی افادات کو بھی قید تحریر میں لانے اور شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دنیا ان کے کمالات سے کما حقہ آشنا ہو سکے۔ واللہ الموفق لکل خیر.

محمد احمد مصباحی

۳؍ شعبان ۱۴۲۸ھ

❁❁❁❁❁❁

بحر العلوم...... بحر محاسن و مفاخر(۱)

بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مبارک پوری علیہ الرحمہ سے میں کب روشناس ہوا، اس کی تعیین مشکل ہے۔ اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آٹھ سال کی عمر (۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء) تک میں ان سے ضرور متعارف ہو چکا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ میرا ننھیال مبارک پور میں ہے اس لیے والد گرامی (جناب محمد صابر اشرفی) کے ساتھ بھیرہ سے مبارک پور آمد و رفت بچپن ہی سے جاری تھی۔ والد صاحب مبارک پور آتے علمائے اشرفیہ خصوصاً حافظ ملت، مفتی عبد المنان صاحب، قاری محمد یحییٰ صاحب اور مولانا مفتی علی احمد صاحب سے ملاقات اور کچھ گفت و شنید ضروری تھی۔ میں والد صاحب کے ساتھ آتا تو میری بھی حاضری ہوتی۔ اسی طرح بھیرہ میں جب انجمن اہل سنت کا اجلاس ہوتا تو اول الذکر تین بزرگوں کی تشریف آوری لازمی تھی۔ جب یہ حضرات بھیرہ آتے تو والد صاحب کی گزارش پر ہمارے گھر بھی آتے۔ اس طرح مجھے انھیں قریب سے دیکھنے، سننے اور جاننے، پہچاننے کا موقع میسر آتا۔

☆ بحر العلوم کے جن اوصاف سے میں متاثر ہوں ان میں ان کی سادگی، بے تکلفی اور بذلہ سنجی بھی ہے جس کے ابتدائی نقوش میرے ذہن میں عہد طفلی سے ہی مرتسم ہیں۔

☆ عقل و عمر اور فہم و شعور میں کچھ اضافہ ہوا تو ان کی تقریروں سے اثر پذیری کا دور آیا، جب باقاعدہ علمی میدان میں قدم رکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ سادہ و بے تکلف تقریریں بہت سے علمی و فنی محاسن پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں موضوع کے لحاظ سے دلائل کی سطوت بھی ہوتی ہے، ترتیب کا حسن بھی، تفہیم و تاثیر کی رعنائی بھی، حسب موقع اشعار کی دل کشی بھی، ان سب کے ساتھ زبان و بیان کی شوکت اور اردوے معلیٰ کی نزاکت بھی۔ اگر ان کے کچھ خطبات ٹیپ ریکارڈ سے منقول ہو کر زینت قرطاس بن چکے ہوں تو کسی ژرف نگاہ ادیب و خطیب کے اشہب قلم کی عمدہ جولان گاہ بن سکتے ہیں۔ ان کی سنجیدہ، مدلل اور اثر انگیز تقریریں عقائد حقہ کی تفہیم، اعمال صالحہ کی ترویج اور اخلاق عالیہ کے فروغ میں ضرور کارگر اور معاون ثابت ہوئیں۔ اور ان کے ذریعہ عظیم دینی خدمات انجام پذیر ہوئیں۔

☆ فتاویٰ کے ذریعہ جو دینی، علمی، شرعی کام ملک گیر پیمانے پر نفع رساں ہوا اس کی تفصیلات سے آگاہی کے لیے "فتاویٰ بحر العلوم" کی چھ ضخیم جلدوں کا مطالعہ کافی ہے۔

(۱) سال نامہ تجلیات رضا، بریلی، بحر العلوم نمبر، ۲۰۱۳ء

☆ ان کی برجستگی، بے تکلفی اور شائستگی کا اثر ان کی تدریس میں بھی نمایاں تھا۔ طلبہ بصد شوق ان کے درس میں پابندی سے حاضر ہوتے اور اپنی علمی تشنگی کا مداوا پاکر مسرور ہوتے۔

☆ فتاویٰ رضویہ کا ڈنکا آج پوری علمی دنیا میں بج رہا ہے اور غواصان علم وفن ان سے مختلف علوم وفنون کے ہزارہا ہزار موتی نکالتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ بکرمِ سیدی مفتی اعظم وتقویت حافظ ملت قدست اسرارہما صدقہ ہے استاذنا العلام مولانا عبد الرؤف بلیاوی کی ہمت مردانہ وسعی پیہم کا اور حضرت بحر العلوم کی شبانہ روز کاوشوں کا، جن کے ذریعے جلد سوم تا ہشتم گوشۂ نارسا سے میدان افادہ واِفاضہ میں جلوہ نما ہوئیں۔

☆ بحر العلوم ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے جس پر ان کی تحریریں شاہد عدل ہیں۔ ان کی قلمی سحر طرازی کا ایک دور وہ تھا جب وہ قرآن کریم کی کوئی سورہ یا کوئی رکوع لے کر اس کا توضیح وتفسیر آمیز ترجمہ اردوئے معلّٰی کے رنگین ادبی قالب میں ڈھالتے۔ زبان وبیان کی دل کشی، معانی قرآن کی اثر آفرینی اور سلاست وروانی کا حسن دل ودماغ کو اپنی زنجیروں کا اسیر بنالیتا۔

☆ ان کی حیات اور کارناموں کے بہت سے ابواب ہیں جو اہل علم وقلم کی توجہات کا مرکز بن سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ حسب ذوق وبساط بہت سے حضرات طبع آزمائی کر چکے ہوں گے اور آئندہ بھی مختلف جہتوں سے کوششیں ہوتی رہیں گی۔ واللہ خیر موفق و معین

محمد احمد مصباحی
صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ
۱۳ر صفر المظفر ۱۴۳۴ھ/ ۲۷ر دسمبر ۲۰۱۲ء

❁❁❁❁❁❁

مفتی اعظم راجستھان[۱]

باسمہ وحمدہ تعالیٰ و تقدس

حضرت علامہ مفتی محمد اشفاق حسین نعیمی سنبھلی سرپرست وشیخ الحدیث دار العلوم اسحاقیہ جودھ پور راجستھان کی ذات میں کئی ایسی خصوصیات اور نمایاں صفات ہیں جن سے میں بہت متاثر ہوں بلکہ ان کے عقیدت مندوں کی صف میں شامل ہو گیا ہوں، ان صفات کو یہاں چند سطور میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

(۱) تقریباً پچاس سال یا زیادہ عرصے سے دار العلوم اسحاقیہ کی آبیاری اور اسے ملک کے باوقار اداروں کی صف میں لانا وہ بھی اپنے صوبے سے بہت دور ایک ایسے صوبے میں جہاں ہمیشہ غیر مسلموں کی اکثریت رہی اور مسلمانوں میں جہالت وناخواندگی یا کم خواندگی کا دور دورہ رہا۔ لیکن موصوف کی مساعی جمیلہ سے کثیر علما اس ادارے سے فارغ ہوئے، صوبے کے بے شمار مقامات پر ان کے ذریعہ مدارس ومکاتب اور دینی وعلمی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ خصوصاً دار العلوم کے فارغین نے "باسنی" کی سرزمین سے سنی تبلیغی جماعت کے تحت جو علمی وعملی بیداری پیدا کی ہے وہ ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے اور تمام خطوں کے لیے نمونۂ عمل اور نمونۂ عبرت ہے۔

(۲) دیگر صوبوں کے مدارس کے درمیان باہمی ربط وتعاون بہت کم نظر آتا ہے مگر راجستھان میں حضرت مفتی صاحب کی قیادت میں تمام علما اور مدارس دار العلوم اسحاقیہ سے مربوط نظر آتے ہیں اور مرکز سے برابر ان کی رہنمائی، ہمت افزائی اور مناسب تعاون کا کام بھی جاری رہتا ہے۔ دار العلوم کے جلسۂ سالانہ ۱۴۲۲ھ میں اتفاقیہ حاضری کے موقع پر نمائندگانِ مدارس کے اجتماع اور مشاورتی نشست میں اس امر کو خصوصی طور پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا اور ایک صالح قیادت کے دور رس اثرات کے چشم سر سے مشاہدے کا موقع ملا۔

(۳) صوبے کے علما اور عوام پر حضرت مفتی صاحب کا ایک دوسرا اثر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ وہاں اشرفی، رضوی کشمکش نہیں۔ جب کہ دوسرے بھی صوبے کم وبیش اس اختلاف کی لپیٹ میں گزشتہ پندرہ برسوں سے نمایاں طور پر آچکے ہیں۔ حضرت نے ابتدا ہی میں رفع نزاع کی کوشش کی جس میں ان کو کامیابی حاصل نہ ہوئی لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم راجستھان کی حد تک وہ اپنی چھاپ ڈالنے میں پوری طرح کامیاب ہیں، وہاں کے مدارس اور انجمنوں میں اشرفی، رضوی دونوں مشرب کے افراد سرگرمی کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کے

(۱) معارف مفتی اعظم راجستھان، جودھ پور، فروری ۲۰۰۷ء

اتفاق واتحاد کو ہر نظر بد سے بچائے اور ہر طرح کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین

(۴) معاصرانہ چشمک سے دوری کے ایک مشاہدے نے ان کی اعلیٰ ظرفی کا ایک گہرا نقش میرے دل پر ڈالا جس کا قصہ یہ ہے کہ نزہۃ القاری شرح بخاری کی تکمیل پر رضا اکیڈمی ممبئی نے شوال ۱۴۲۰ھ میں ایک جشن تہنیت کا اہتمام کیا جس میں شارح بخاری حضرت مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کے حالات و سوانح پر مشتمل ایک ضخیم دستاویز "معارف شارح بخاری" کا اجرا عمل میں آیا۔ ایک خصوصی اجلاس حج ہاؤس میں منعقد ہوا، ایک عام اجلاس کھلے میدان میں ہوا۔ خانوادۂ برکاتیہ مارہرہ شریف سے امین ملت ڈاکٹر سید محمد امین میاں، ان کے برادر صغیر حضرت سید محمد اشرف میاں اور ان حضرات کے برادر اکبر حضرت سید حسنین میاں نظمی شہزادۂ سید العلماء نے بہت جوش و خروش اور محبت و مسرت کے ساتھ جشن میں شرکت کی، دوسرے بہت سے عالی مرتبت خطبا بھی پوری فرحت و بہجت کے ساتھ شریک ہوئے مگر معاصرین یا معاصر شمار ہونے والوں میں سے صرف حضرت مفتی محمد اشفاق حسین صاحب دام ظلہ کی ذات تھی جب کہ ان کے پاس بس دعوت نامہ ارسال ہوا تھا۔ کوئی اصرار نامہ یا بار بار شرکت کی پیش کش نہ تھی۔ مگر وہ تشریف لائے مبارکبادی دی اور اپنے خطاب میں شارح بخاری کی عظمت اور نمایاں خدمات کا بڑی مسرت کے ساتھ اعلان و اعتراف کیا، ان کی اس شرکت اور خطاب کے باعث حضرت مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی جو اہمیت میرے دل میں تھی اس میں تو کوئی اضافہ نہ ہوا لیکن حضرت مفتی اعظم راجستھان کی قدر و منزلت اور ان کی عالی ظرفی کا نقش ضرور گہرا ہو گیا۔

اس موقع پر شارح بخاری کو چاندی سے تولا گیا، دینی و علمی خدمت کی پذیرائی اور ہمت افزائی کا یہ منظر قابل دید تھا مگر موصوف نے اس چاندی سے ایک حبہ بھی اپنے لیے نہ رکھا، دو تہائی گہوارۂ علمی و مادر علمی جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے لیے، ایک تہائی بمد اشاعت رضویات رضا اکیڈمی ممبئی کے لیے وقف کر دیا۔ اس ایثار نے ان کی عظمت و اہمیت کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ اور ہر شخص نے محسوس کر لیا کہ یہ جشن کسی معمولی شخصیت کا نہ تھا، نہ ہی مفتی اعظم راجستھان اور دیگر علما و مشائخ کی شرکت بے معنی تھی۔

(۵) بعض ملاقاتوں میں حضرت مفتی اعظم راجستھان سے جو گفتگو ہوئی اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ جو لوگ بھی دینی و علمی خدمت کر رہے ہیں موصوف انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان سے محبت رکھتے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں خواہ وہ ان کے تلامذہ اور محبین و متعلقین سے ہوں یا نہ ہوں۔ سادگی، تواضع، اصاغر نوازی، وغیرہ صفات میں بھی وہ نمایاں اور ممتاز ہیں۔

رب تعالیٰ موصوف کا سایۂ عاطفت دراز فرمائے اور ان کے بہتر اخلاف و امثال پیدا کرے۔ وما ذلك علیه بعزیز.

اکبر المشائخ چشتی[1]

مولانا سید محمد اکبر چشتی (۱۳۴۶ھ - ۱۴۲۹ھ) خانوادۂ صمدیہ کے چشم و چراغ، جامعہ صمدیہ پھپھوند شریف کے بانی، اتباع سنت و شریعت کے پیکر اور دور آخر میں اسلاف کے کردار و عمل کا نمونہ تھے۔ میں ان کے اوصاف جمیلہ میں سب سے زیادہ جس چیز سے متاثر ہوا وہ بآں شانِ سیادت و جلالت ان کی سادگی و خاکساری ہے۔

زگردن فرازاں تواضع نکوست
گدا گر تواضع کند خوے اوست

(۱) ۱۴۲۳ھ میں حافظ بخاری مولانا سید عبد الصمد چشتی مودودی رضی اللہ عنہ کے صد سالہ عرس کے موقع پر پھپھوند شریف میں کثیر علمائے کرام کا اجتماع تھا، حضرت ممدوح (سید محمد اکبر میاں) نے اپنے مکان پر علمائے کرام کے عصرانہ کی دعوت رکھی، راقم بھی حاضر تھا، دیکھا کہ حضرت بنفس نفیس صحنِ مکان میں کھڑے، اشیاے خوردنی کے حمل و نقل میں لگے ہوئے ہیں، جب کہ فرزندانِ گرامی اور خدام ہی کا اہتمام و اشتغال کافی زیادہ تھا مگر طبعی خاکساری اور تکریم مہمانان کے جذبۂ دلی نے انھیں ایک منٹ بھی بیٹھنے نہ دیا۔

آج دیکھتا ہوں تو ان کے ذی شان فرزندوں میں بھی اس کا عکس بڑی حد تک موجود ہے۔ الولد سِرٌّ لأبیه.

(۲) اب تو ایسا دور آ گیا ہے کہ باضابطہ کنبہ پروری کے ارادے سے مدراس کا قیام عمل میں آتا ہے مگر حضرت ممدوح نے جامعہ صمدیہ قائم کیا تو شرط کر دی کہ میرے گھر کا کوئی فرد اگر ادارے کی تدریس، یا انتظام، یا اور کسی خدمت میں شریک ہوگا تو اسے کوئی مالی عوض نہ دیا جائے گا۔ اگر خالصًا لوجہ اللہ خدمت کر سکتا ہے تو کرے، ورنہ الگ رہے۔ جامعہ صمدیہ میں ان کے اس ارشاد کی پابندی اب بھی جاری ہے۔

(۳) ان کے زمانے میں یہ دستور تھا کہ جامعہ صمدیہ سے حفظ کی دستار پانے والے طلبہ سے جلسۂ عام میں باضابطہ یہ عہد لیا جاتا کہ میں تراویح میں قرآن سنانے پر کوئی اجرت ہرگز نہ لوں گا۔ میرے سامنے حضرت کے پوتے کی دستار بندی ہوئی تو انھوں نے بھی یہی عہد کیا۔

---

(۱) حیات اکبر المشائخ، از مفتی انفاس الحسن چشتی، جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، مارچ ۲۰۱۷ء

(۴) مزارات پر عورتوں کی حاضری اور اعراس میں ان کی شرکت ایسا طوفانِ بلا ہے جو تھمنے کی بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بعض اعراس جو پہلے اس وبا سے خالی تھے، اب اس گردابِ بلا کی زد میں نظر آتے ہیں۔ ناظمانِ عرس کو اس طوفان کو روکنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ اور جن کی نظر میں عورتوں کی حاضری، مرد و زن کا اختلاط کوئی معیوب امر نہیں، انھیں تو اس بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔

سنا ہے کہ حافظ بخاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عرس میں بھی تقریباً ۷۵؍ سال تک عورتوں کی آمد و شرکت ہوا کرتی تھی اور اسے یک لخت روک دینا کسی جہادِ اکبر سے کم نہ تھا۔ مگر حضرت ممدوح کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ یہ رسمِ بد ختم ہونی چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے باضابطہ منصوبہ بنایا، پہلے جمعے میں اس کا اعلان کیا پھر خصوصی خطوط لکھ کر احبابِ سلسلہ کو خبردار کیا، پوسٹر اور خطوط کے ذریعہ متنبہ کیا کہ اب عرس میں عورتوں کی شرکت پر پابندی عائد کی جاتی ہے، اس لیے کوئی مریدِ سلسلہ، عورتوں کو عرس میں نہ لائے اور دوسروں کو بھی آگاہ و خبردار کر دے کہ اب کوئی شخص ایسی جرأت و ہمت نہ کرے ورنہ ناکام واپسی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر ایامِ عرس میں پھپھوند شریف میں داخلے کے سارے راستوں پر رضا کار جوان متعین کیے کہ عرس میں آنے والی عورتوں کو قصبے میں نہ آنے دیں۔ ان کے عزمِ محکم، ہمتِ مردانہ، تدبیرِ فرزانہ اور جہدِ مخلصانہ کا اثر یہ ہوا کہ پچہتر سالہ ریکارڈ ٹوٹ گیا اور عرس میں عورتوں کی آمد کا سلسلہ محض ایک سال یا چند ماہ کی کوشش سے بند ہو گیا۔ اس مہم میں ان کے فرزندانِ عالی وقار بھی پوری طرح ان کے دست و بازو بنے۔ یہ ایسا عزیز الوجود کارنامہ ہے جس کی مثال مجھے دور دور تک نظر نہیں آتی۔ رسمِ کہن سے جنگ اور اس پر فتح کسی مردِ آہن کی تیغِ عزم کے بغیر ممکن نہیں۔

مرید ایسا ہونا چاہیے جو اپنے شوقِ بے جا کو پیر کی مرضی پر قربان کر دے اور پیر ایسا ہونا چاہیے جسے حکمِ شریعت برپا کرنے کی راہ میں نہ مریدوں کی ناراضی کی فکر ہو، نہ ہجومِ عاشقاں کی قلت کا اندیشہ، نہ حطامِ دنیا سے تہی دستی کی پروا۔

(۵) حضرت ممدوح میں دینی خدمات کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا جذبہ بھی موج زن تھا، اسی لیے انھوں نے یہ پروگرام بنایا کہ ہر تین سال پر کسی علمی و دینی شخصیت کو اس کی خدمات کے اعتراف میں "حافظ بخاری ایوارڈ" پیش کیا جائے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس منصوبے کی تعمیل میں غالباً ۱۴۱۷ھ میں فقیہ ملت مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ کو پہلا ایوارڈ اور استاذِ گرامی بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی کو ۱۴۲۰ھ میں دوسرا ایوارڈ دیا گیا اور صد سالہ عرس کے موقع پر ۱۴۲۳ھ میں تیسرا ایوارڈ راقم سطور کو عطا ہوا۔ میں نے اسی وقت جلسۂ عام میں عرض کر دیا کہ

احقر اس کا اہل نہ تھا مگر: ؏

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

سراج الفقہا مفتی محمد نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتا و تدریس جامعہ اشرفیہ مبارک پور کو بھی ماضی قریب میں یہ ایوارڈ موجودہ صاحب سجادہ حضرت شاہ محمد اختر میاں چشتی کے ہاتھوں تفویض ہو چکا ہے۔ یعنی موصوف اور ان کے برادرانِ عزیز بھی والد ماجد کے نقش قدم پر گام زن ہیں۔

(۶) حضرت ممدوح کی سادگی، خاکساری اور بے تکلفی دیکھ کر مجھے بارہا وہ واقعہ یاد آیا جو ملفوظ مصابیح القلوب میں ان کے جدِ امجد سید اخلاص حسین سہسوانی علیہ الرحمہ سے متعلق پڑھا تھا کہ حضرت محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایامِ عرس میں دہلی پہنچ گئے۔ اُس وقت کے دہلی اسٹیشن پر آج کی طرح روشنی اور چہل پہل نہ تھی، نہ قلیوں، رکشوں اور دیگر سواریوں کی بہتات۔ موصوف کو خیال آیا کہ رات کی ٹرین سے کوئی زائرِ عرس آیا تو قلی نہ ملنے کی وجہ سے سامانوں کے ساتھ درگاہ تک پہنچنے میں اُسے سخت پریشانی کا سامنا ہو گا۔ اسٹیشن پہنچ گئے۔ کسی آنے والے زائر نے اندھیرے میں صدا لگائی: کوئی قلی ہے؟ فوراً پہنچ گئے، سامان سر پر اٹھایا، درگاہ پہنچا دیا، اجرت لینے دینے کی باری آئی تو کچھ لینے کو تیار نہ ہوئے پھر کسی طرح عقدہ کھلا کہ زائر نے کیسے مخدوم کو خادم بنایا تو پیر پر گرا، معافی تلافی کی نوبت آئی، مگر اس مردِ قلندر کی شان یہ تھی کہ حضرت محبوب الٰہی کے مہمان کی خدمت یا اپنے نفس کی تذلیل سے لذت کی خاطر ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا۔ ؏

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

حضرت ممدوح کے بھی سادہ لباس اور بے تکلف وضع قطع کو دیکھ کر ناواقف کے لیے یہ اندازہ کرنا نہایت مشکل تھا کہ یہ کوئی شیخ اکبر ہے یا مرید اصغر؟

(۷) اوائلِ محرم ۱۴۳۰ھ میں حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کے عرس چہلم میں جب راقم سطور شریک ہوا تو اپنی تقریر میں تمام متوسلین سے، اور بعد میں حضرت کے فرزند گرامی مولانا سید محمد انور میاں چشتی زید مجدہ سے عرض کیا تھا کہ بڑی بڑی قد آور شخصیتوں کے ساتھ ہمارا سلوک یہ رہا ہے کہ زندگی میں تو ان سے خوب فائدہ حاصل کیا اور بڑی عقیدت و جاں نثاری کا اظہار کیا مگر بعد وصال کوئی ضخیم سوانح حیات تو در کنار، چند صفحات بھی لکھنے اور شائع کرنے کی راہ نہ نکالی، جس کے باعث عوام تو عوام بہت سے خواص بھی ان کی خدمات اور حالات سے نابلد ہیں۔ حضرت

ممدوح علیہ الرحمہ کے ساتھ یہ سلوک نہ ہونا چاہیے۔ اپنی زندگی میں تو وہ اس کے روادار نہ ہوتے، نہ کسی کو اس کی اشاعت کی اجازت دیتے۔ مگر بعد وصال ہمارا یہ فرض ہوتا ہے کہ انھیں مرنے نہ دیں اور ان کے حالات اور کارناموں سے آنے والی نسل کو سبق حاصل کرنے کا موقع فراہم کریں۔

خدا کا شکر ہے کہ حضرت کے مرید باصفا، عالم معقول و منقول مفتی انفاس الحسن چشتی نے اس راہ میں کوشش کی اور ایک قابل قدر کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اگر دیگر اہل علم و اہل عقیدت مزید حالات و واقعات کی فراہمی میں مخلصانہ تعاون کریں تو مجھے امید ہے کہ اس کتاب میں گراں بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔ واللہ الموفق لکل خیر، وھو المیسّر لکل صعب۔

محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

۲۶؍ جمادی الاولی ۱۴۳۷ھ / ۷؍ مارچ ۲۰۱۶ء، دوشنبہ

❁❁❁❁❁❁

تاج الشریعہ علامہ اختر رضا ازہری[1]

صد حیف! میر کارواں جاتا رہا

تاج الشریعہ علامہ اختر رضا خاں ازہری کی رحلت کا غم صرف ایک خاندان، ایک شہر یا ایک ملک کا نہیں، بلکہ ان کی جدائی پر پوری ملت سوگوار ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک اور بے شمار خطوں میں ان کے وصال کے بعد ہی سے تعزیتی جلسوں اور فاتحہ و ایصالِ ثواب کا سلسلہ جاری ہے۔ آج ۷؍ ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۱؍ جولائی ۲۰۱۸ء سنیچر کی صبح کو الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں بھی تلاوت قرآن، ایصال ثواب اور تعزیت کی محفل دیر تک منعقد ہوئی پھر علما و طلبہ کی کثیر تعداد نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے بریلی شریف روانہ ہو گئی، اور جامعہ میں آج اور کل کی تعطیل کر دی گئی۔

میں اپنے متعلقہ تمام اداروں کی طرف سے حضرت تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے اہل خاندان کو خصوصًا اور پوری ملت کو عمومًا تعزیت پیش کرتا ہوں۔ مولا تعالیٰ سب کو صبر جمیل و اجر جزیل سے نوازے اور حضرت کے روحانی و علمی فیضان سے سب کو مستفیض و مستنیر فرمائے۔

شریک غم: محمد احمد مصباحی

---

(۱) ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (۲) صدر مجلس شرعی، مبارک پور (۳) نگراں مجلس برکات، مبارک پور (۴) نگراں المجمع الاسلامی، مبارک پور (۵) صدر انجمن امجدیہ و مدرسہ عزیزیہ خیر العلوم، بھیرہ ولید پور، مئو (۶) سرپرست مرکزی دار القراءت، ذاکر نگر، جمشید پور۔

(۱) داستان غم یعنی یادِ اختر ازہری، مؤلف: مفتی فاروق خان مہائی مصباحی، ص: ۴۶-۴۷

بحر العرفان مفتی آفاق احمد مجددی

باسمہ وحمدہ تعالی و تقدس

بحر العرفان اس دور قحط الرجال میں ایک نادر روزگار ہستی تھے۔ بڑے محاسن و کمالات کے حامل اور عوام و خواص کے لیے قابل تقلید نمونہ تھے۔ ان کی متعدد خصوصیات اور خوبیوں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوں:

(۱) دین کا درد اور عوام کی فلاح و بہبود کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

(۲) اخلاق حسنہ کے پیکر، متواضع، منکسر المزاج اور بہت ملنسار تھے۔

(۳) لوگوں کے دکھ درد اور خوشی و غمی میں شرکت ان کی فطرت تھی۔

(۴) قنوج میں انھوں نے قدم رکھا تو دینی و تعلیمی چہل پہل سے وہ بڑی حد تک خالی تھا، انھوں نے اپنی ثابت قدمی اور جہد مسلسل سے اسے علم و عمل کا گہوارہ بنا دیا۔

(۵) شہر میں الجامعۃ الاحمدیہ قائم کیا جس میں ابتدا سے فضیلت تک تعلیم ہونے لگی اور وہ دور و نزدیک کے کثیر طلبہ کا مرجع و ماویٰ بن گیا۔

(۶) بنات کے لیے بھی ادارہ بنایا جہاں وہ زیور علم سے آراستہ ہونے لگیں۔

(۷) کئی اسکول قائم کیے جن میں دینی ماحول میں عصری تعلیم کے شائقین کی تعلیم و تربیت جاری ہوئی۔

وہ دینی و عصری دونوں طرح کی تعلیم کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے اور مسلم نسل کی ہر میدان میں ترقی کے لیے کوشاں رہتے۔

(۸) عوام و خواص عموماً علم تو حاصل کر لیتے ہیں مگر باطنی تربیت، ذکر و فکر اور مراقبہ وغیرہ سے غافل رہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے خانقاہ مجددیہ قائم کر کے تزکیۂ قلب اور معمولاتِ صوفیہ کی عملی تربیت کے لیے اپنی مساعی جمیلہ صرف کیں۔

(۹) قرب و جوار کے علما اور عوام سے رابطہ رکھتے ہوئے مشکلات میں ان کی رہ نمائی و دست گیری کے لیے سرگرم رہے۔

(۱۰) حکام اور سماج کے سربرآوردہ افراد سے بھی کسی قدر رابطہ رکھ کر لوگوں کے مسائل اور پیچیدہ معاملات میں مناسب امداد بہم پہنچانے کی سعی جمیل فرمائی۔

(۱۱) اتنے سارے مشاغل کے ساتھ تعلیم و تدریس سے بھی رابطہ استوار رکھا اور طلبہ کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے توجہ صرف کرتے رہے۔

صحیح بخاری شریف کا درس پابندی سے دیتے اور اس شان سے کہ دونوں جلدیں مکمل ختم کراتے۔ اسفار اور تبلیغی دوروں کے باعث تکمیل بخاری کے لیے اوقات نکالنے میں بڑی مشقت بھی پیش آتی مگر کتاب کا درس ناتمام نہ چھوڑتے۔ ان کی یہ خصوصیت انھیں اس زمانے کے شیوخِ حدیث سے ممتاز کرتی ہے۔

استاذ گرامی حافظ ملت علامہ شاہ عبد العزیز مرادآبادی علیہ الرحمہ جب تک دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں شیخ الحدیث و صدر المدرسین رہے، ہر سال حرفاً حرفاً تکمیل بخاری کا اہتمام کیا۔ اب تو مدارس میں اس اہم کتاب کی تدریس بھی دوسری بہت سی کتابوں کی طرح صرف بطور تبرک یا بطور نمونہ رہ گئی ہے۔

(۱۲) حیرت یہ ہے کہ مذکورہ جملہ مصروفیات کے باوجود مفتی صاحب نے قرطاس و قلم سے بھی رشتہ مضبوط رکھا۔ تقریباً پچاس کتابیں لکھیں، جو تصوف و طریقت سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ دیگر موضوعات و علوم پر تو بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں لیکن آدابِ ذکر و مراقبہ اور اسرارِ تصوف کی طرف توجہ کم ہے، اس لیے اپنے قلم کا محور اسی کو بنایا۔

(۱۳) ہر سال وہ شہر قنوج میں ایک عظیم الشان کانفرنس بھی منعقد کرتے جس میں علما و خطبا کے ذریعہ عوام کے لیے ہدایت و موعظت کا سامان فراہم کیا جاتا۔ آخری دو برس میں بیرونی ممالک کے بھی متعدد مندوبین کی شرکت رہی۔

(۱۴) چند سالوں سے انھوں نے دن میں سیمینار منعقد کرنے کا بھی سلسلہ جاری کیا جس میں منتخب اہل قلم اور دانشوروں کے ذریعہ مسلمانوں کے دینی قومی تعلیمی سماجی مسائل و مشکلات پر تبادلۂ خیالات ہوتا، قیمتی مقالات پیش ہوتے اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے مناسب رائیں سامنے آتیں تاکہ لوگوں کی زندگی صحیح سمت میں سرگرم سفر ہو۔

(۱۵) وہ مسلمانوں کے معاملات و مسائل کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے اور بغیر کانفرنس اور سیمینار کے بھی ارباب علم و دانش سے تبادلۂ خیالات اور مناسب تجاویز جاننے اور عمل میں لانے کی کوشش کرتے۔

میری نظر میں ایسا دردمند، ایسا مخلص، ایسا منکسر، بے تصنّع اور اتنی خوبیوں کا جامع انسان ملنا بہت مشکل ہے۔ خدا کا فضل شامل حال ہو تو کچھ افراد مل کر ان کے کاموں کا تسلسل باقی رکھ سکتے ہیں۔ رب کریم توفیق خیر سے نوازے۔

مولا تعالیٰ موصوف کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، پس ماندگان کو صبر جمیل و اجر جزیل سے نوازے، ان کے نقوش قدم پر گام زن رکھے اور ان کے قائم کردہ تمام اداروں بلکہ ان کے سارے مشن کو قوت و توانائی کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق جمیل مرحمت فرمائے۔ وهو المستعان، وعليه التكلان.

شریک غم

محمد احمد مصباحی

۱۳ر ذی قعدہ ۱۴۴۰ھ / ۱۷ر جولائی ۲۰۱۹ء چہار شنبہ

◈ ◈ ◈ ◈ ◈ ◈

مفتی حبیب یار خاں

مبسملًا وحامدًا ومصلّیا

مفتی حبیب یار خاں صوبہ ایم پی، شہر اندور کی مشہور و معروف علمی و دینی شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے اپنے شہر اور صوبہ کے مختلف علاقوں میں دین و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ حضرت مفتی رضوان الرحمن علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد دار العلوم نوری اندور کی ذمہ داریاں سنبھالیں، دار العلوم کو بڑھایا، پھیلایا، ترقی دی اور اس کا دائرۂ کار وسیع کیا۔

انھوں نے ۲۰۱۰ء میں مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ یوپی کا ۱۷واں فقہی سیمینار بہت تزک و احتشام اور حسنِ انتظام کے ساتھ اپنے دار العلوم نوری میں منعقد کیا۔ اُس وقت یہ دیکھنے میں آیا کہ اہل شہر موصوف سے اور دار العلوم سے گہری محبت رکھتے ہیں اور بڑے خلوص اور دل چسپی کے ساتھ ہر طرح کے انتظام میں سرگرم ہیں۔

موصوف نے دینی، علمی، سماجی مختلف قسم کی خدمات کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، ان کی رحلت سے بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ رب کریم ان کے اخلاف اور متعلقین کو توفیق دے اور توانائی بخشے کہ ان کی خدمات کا سلسلہ جاری رکھیں بلکہ مزید قوت و وسعت پیدا کریں۔ وما ذلك عليه بعزيز

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی
۲۲ر ذی قعدہ ۱۴۴۰ھ
۲۶ر جولائی ۲۰۱۹ء

مفتی محمد ظہیر حسن قادری

بسم الله الرحمٰن الرحيم حامداً و مصلياً و مسلماً

مفتی محمد ظہیر حسن قادری ادروی دار العلوم اشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ یوپی کے قدیم فارغین سے تھے۔ ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۹ء میں انھوں نے دار العلوم اشرفیہ سے فضیلت اور تجوید و قراءت کی تعلیم مکمل کر کے سند حاصل کی اور ۱۹۶۰ء سے ۲۰۱۸ء تقریباً ۶۰ر سال تک ملک کے مختلف اداروں میں تدریس سے وابستہ رہے۔ اس طویل عرصے میں ان سے تعلیم یافتہ افراد کی تفصیل ملنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ جہاں بھی رہے محنت، خلوص اور لگن سے اپنے فرائض بخوبی انجام دیے۔

مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ (حالیہ ضلع مئو) میں وہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک مدرس رہے۔ میں وہاں نمبر ۱۹۷۸ء میں صدر المدرسین کی حیثیت سے پہنچا، اُس وقت لوگ مفتی ظہیر حسن صاحب کے دورِ تدریس کا ذکر کرتے تھے کہ موصوف پابندی کے ساتھ مسجد میں آتے اور طلبہ کو بھی نماز و جماعت کا پابند رکھنے کے لیے کوشش کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں اِس کا بڑا اہتمام تھا اور اب آپ کے دور میں ہے۔

ادری کے لوگ بتاتے ہیں کہ علالت اور کمزوری کی حالت میں بھی موصوف مسجد پہنچ کر باجماعت نماز ادا کرتے۔ سخت مجبوری و معذوری کے وقت ہی ان سے مسجد کی حاضری ترک ہوتی، ورنہ وہ حتی الامکان مشقت اٹھا کر جماعت کے وقت مسجد پہنچ جاتے۔ یہ وہ عزیمت ہے جو انھیں صفِ علما میں ممتاز کرتی ہے۔

میں ان کے اخلاق و کردار، تواضع و انکسار سے بہت متاثر ہوں، ان کے فرزند **مولانا خالد کا ٹرین حادثے** میں انتقال ہوا تو ۲۵ر نومبر ۲۰۱۶ء کو ان کی تدفین ہی کے دن میں موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بعونہ تعالیٰ اِس کبر سنی میں بھی انھوں نے جوان بیٹے کا غم بڑے صبر و استقلال سے برداشت کیا۔ وقت ملاقات میں نے ان پر اضمحلال اور جزع فزع کا کوئی اثر نہ دیکھا۔

موصوف یادگار سلف تھے ۲۲ر ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ کو ہم سے جدا ہو گئے۔ مولا تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و غفران کا معاملہ فرمائے، ان کی نیکیوں کا نرخ بالا کر کے انھیں اعلیٰ درجات سے نوازے اور ان کے تلامذہ اور پس ماندگان کو ان کی نیک روش پر گام زن فرمائے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ وآلہ وصحبہ اجمعین۔

شب یکم محرم الحرام ۱۴۴۲ھ ۲۰ر اگست ۲۰۲۰ء

مفتی مجیب اشرف رضوی - کچھ یادیں

مفتی مجیب اشرف رضوی اعظمی اپنے دور کے علما، فقہا، خطبا اور مشائخ میں نمایاں شان کے حامل تھے۔

تعلیم و تدریس سے تا عمران کا رشتہ استوار رہا۔ فقہی مجالس میں شرکت کرتے تو بحثوں کو بہت غور سے سنتے اور اپنی مناسب رائے پیش کرتے۔ خطابت، علمی اور عام فہم ہوتی، زبان کی شیرینی اور حسن تفہیم کی چاشنی دلوں پر گہرا اثر چھوڑتی۔ ان کا حلقۂ بیعت و ارشاد بھی بڑا وسیع تھا، مہاراشٹر، گجرات، کرناٹک وغیرہ صوبوں کے دور دراز خطوں تک ان کے مریدین پھیلے ہوئے ہیں، یہ مقامات ان کی خطابت اور اور ارشاد دونوں سے معمور ہیں۔

تقریباً نصف حیات کے بعد ہر سال حج و زیارت کو اپنا معمول بنا رکھا تھا۔ اپنی زندگی میں انھوں نے چالیس سے زیادہ حج کیے۔

ان کی انتظامی ہمت اور مہارت یہ ہے کہ انھوں نے ناگپور شہر کے قلب میں دارالعلوم امجدیہ قائم کیا، پروان چڑھایا اور عروج تک پہنچایا۔ جامعہ عربیہ ناگ پور کے زوال کے بعد یہی ادارہ ناگ پور اور کئی صوبوں کی دینی، علمی، ملی ضروریات کا کفیل ہوا، اس کا دینی و علمی فیضان آج بھی جاری ہے۔

اس کی توسیع کرتے ہوئے شہر سے باہر ایک عظیم ادارہ "الجامعۃ الرضویہ" کا منصوبہ تیار ہوا تو مفتی مجیب اشرف صاحب اس میں بھی پیش پیش تھے۔ ۱۹۹۶ء میں الجامعۃ الرضویہ کے افتتاح کے موقع پر ناظم ادارہ مفتی غلام محمد رضوی ناگ پوری اور مفتی مجیب اشرف اعظمی نے مجھے دعوت دی تو میں بڑی خوشی سے حاضر ہوا، جشنِ افتتاح میں مختصر خطاب بھی کیا۔ اس وقت تقریباً دو دن میرا قیام مفتی مجیب اشرف صاحب کے مکان ہی پر رہا، انھی کی توسط سے اپنے کچھ پرانے رشتہ داروں سے ملاقات کی، جو محلہ سیفی نگر کے باشندے تھے۔ اور اب بھی وہی رہتے ہیں۔

مفتی صاحب اگرچہ ناگ پور کے باضابطہ شہری ہو گئے تھے مگر وطن اور اہل وطن سے تعلق ہمیشہ برقرار رکھا، سال میں کم و بیش چار پانچ بار گھوسی ضرور آتے۔ اور ہمارے دیار میں ناگ پور کی بجائے گھوسی کی نسبت سے مشہور تھے۔ یہاں ان کی خدمات بھی ہیں۔

شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی سے انھیں ابتدا تا فراغت خصوصی تلمذ حاصل تھا، اس لیے جب آتے ان سے ملاقات ضرور کرتے، اگر گھوسی میں ملاقات نہ ہوتی تو جامعہ اشرفیہ مبارک پور آکر ملتے، اس طرح میری بھی

ان سے ملاقات ہوجاتی۔

ممبئی میں جشن تکمیل شرح بخاری سے قبل، مبارک پور میں ایک مختصر "جشن شارح بخاری" حافظ ملت قدس سرہ کے عرس سے پہلے منعقد ہوا تھا، اس میں بھی مفتی مجیب اشرف صاحب نے شرکت کی اور شارح بخاری کے متعلق اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا، شارح بخاری کے وصال کے بعد ایک تعزیتی اجلاس غوثیہ مسجد کے پاس مبارک پور میں منعقد ہوا تو اس میں بھی شرکت کی اور ایک آیت قرآنیہ کی روشنی میں مختصر تقریر بھی کی۔

عرس حافظ ملت کے ایام میں اگر اِس دیار میں ہوتے تو عرس اور جلسۂ دستار بندی میں ضرور شرکت کرتے۔

مہاپولی، بھیونڈی میں مجلس شرعی، جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا سیمینار ہوا تو اس میں بھی شرکت فرمائی۔ ایک نشست کی صدارت بھی ان کے سپرد تھی، اس وقت باضابطہ اپنا تحریری خطبۂ صدارت پیش کیا جو ماہ نامہ اشرفیہ میں شائع ہوا۔

جامعہ البرکات علی گڑھ میں مجلس شرعی کا سیمینار ہوا تو اس میں بھی شرکت کی، جامعہ البرکات اور جامعہ اشرفیہ سے متعلق اپنے جرأت مندانہ تاثرات بھی پیش کیے۔

اس سیمینار میں جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ موجودہ دور میں چلتی ٹرین پر فرض و واجب نمازوں کی ادائیگی کے بعد اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟ تو طویل بحثوں کے بعد طے ہوا کہ اعادہ کی حاجت نہیں۔ مفتی مجیب اشرف صاحب نے بحثوں کو بہت غور سے سنا اور فیصلے سے اتفاق کیا اور اپنے تائیدی دست خط بھی ثبت کیے۔

ہم وطن ہونے کی وجہ سے ان سے میری ملاقاتیں ہر سال ہوتی رہیں، اپنے حج کے دونوں سفر (اپریل ۱۹۹۶ء، ستمبر ۲۰۱۴ء) میں بھی ان سے ملاقات رہی، پہلے سفر میں کئی دن طویل ملاقاتیں رہیں، انھی کی معیت میں منیٰ ٹرنگ کے راستے سے پیادہ جانا ہوا۔ دوسرے سفر میں ان کے تلمیذ خاص مولانا غلام مصطفیٰ رضوی سورتی کے توسط سے ایک بار ملاقات ہوئی، دوسری بار مدینہ منورہ میں مولانا افتخار احمد قادری کے گھر دعوت میں ہوئی، آخری بار مارہرہ شریف میں عرس قاسمی ۲۰۱۹ء میں مولانا غلام مصطفیٰ رضوی کے ساتھ ہوئی۔

ان ساری یادوں، ملاقاتوں اور موصوف کے بیش بہا کارناموں اور کمالات و محاسن کو سمیٹنا مجھ جیسے کم زور اور کم فرصت شخص کے لیے بہت مشکل ہے۔ کچھ اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ مولا تعالیٰ ان کی یادیں باقی رکھے اور مریدین، معتقدین و متعلقین کو ان کے فیوض و برکات سے ہمیشہ بہرہ ور فرمائے۔ آمین

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

شب یکم محرم الحرام ۱۴۴۲ھ/ ۲۰ر اگست ۲۰۲۰ء

مفتی شبیر حسن رضوی

مبسلاً وحامداً ومصلیاً ومسلماً

حضرت مولانا مفتی شبیر حسن بستوی مصباحی دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور ضلع اعظم گڑھ یوپی سے ۱۹۶۸ء میں فارغ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حافظ ملت قدس سرہ ادارے میں شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے۔

مفتی شبیر حسن صاحب نے فراغت کے بعد تقریباً ۹؍ سال مدرسہ عزیز العلوم نان پارہ میں میں تدریس وافتا کی خدمات انجام دیں لیکن ان کی علمی شہرت اس وقت زیادہ ہوئی جب وہ الجامعۃ الاسلامیہ روناہی ضلع فیض آباد میں تشریف لائے۔

معقولات کی منتہی کتابوں کی تدریس سے انھیں خاصا شغف تھا۔ طلبہ ان کی تدریس سے بہت متاثر ہوتے۔ جو طلبہ ذوق وشوق سے مشکل کتابیں ان سے پڑھنا چاہتے ان کے لیے وہ تیار رہتے اور ادارے کی جانب سے اجازت ہوتی، اس طرح کثیر طلبہ ان سے کسبِ علم کر کے لائق وفائق ہوئے اور مختلف دیار میں عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

الجامعۃ الاسلامیہ کے صدر المدرسین مولانا محمد نعمان خاں قادری مصباحی مفتی صاحب کے اس وصف کی ستائش کرتے اور ان کی خدمات سے بہت مسرور رہتے۔

انتظامیۂ ادارہ کی بھی یہ قدر شناسی ہے کہ مفتی صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد بھی انھیں شیخ الحدیث کی حیثیت سے برقرار رکھا اور تادمِ آخر وہ تعلیم وتدریس سے وابستہ رہے۔

مجلس برکات جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں جب درسیات پر کام شروع ہوا تو مفتی صاحب کے ذمہ ہدایۃ الحکمۃ خیر آبادی پر تحشیہ کا کام سپرد کیا گیا، یہ کتاب بے حاشیہ تھی اور اس پر حاشیہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، موصوف نے اس پر حواشی مکمل کیے جو مجلس برکات سے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

موصوف نے اور بھی کئی کتابیں لکھیں جن سے ان کے علمی وتحریری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج وہ ہم میں نہیں لیکن ان کے فیض یافتہ بے شمار تلامذہ اور ان کی علمی وتعلیمی خدمات کے ذریعے ان کی یادیں زندہ وتابندہ ہیں۔ رب تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے تمام تلامذہ اور متعلقین کو خدمات جلیلہ سے نوازے، آمین۔

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور اعظم گڑھ یوپی
۲۹؍ ربیع الاول ۱۴۴۲ھ
۱۶؍ نومبر ۲۰۲۰ء دوشنبہ

امین ملت ایک انجمن

باسمہ وحمدہ تعالیٰ وتقدس

وابستگانِ خانقاہ برکات کا یہ اقدام قابل تحسین ہے کہ انھوں نے امین ملت کی سجادگی کے ۲۵ سال پورے ہونے اور یونیورسٹی سے ان کی سبک دوشی پر ایک یادگار کتاب شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔

امین ملت کے ۲۵ سالہ دور سجادگی میں بہت سی ترقیاں ہوئیں اور بہت سے کارہائے نمایاں انجام پذیر ہوئے۔ سب کی تفصیل وہی لوگ کرسکتے ہیں جو قریب رہ کر کاموں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انھیں محفوظ رکھتے ہیں۔ میں یہاں چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

۱-احسن العلما علیہ الرحمہ کے دور میں عرس قاسمی کا اجلاس درگاہ شریف کے اندر سامنے کے صحن میں مکمل ہوجاتا تھا۔ ان کے وصال کے بعد اچانک تنگی ہوئی تو اجلاس درگاہ شریف کے باہر کشادہ صحن میں لایا گیا۔ چند سال بعد یہ جگہ بھی تنگ ہوگئی تو ایک وسیع وعریض زمین خرید کر اسے اجلاس کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اب یہ میدان بھی عموماً تیسرے روز، قُل کے وقت ایسا فُل ہوجاتا ہے کہ مزید آنے والوں کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ۲۵ سال میں خانقاہ برکاتیہ کی کشش اور عوام وخواص میں اس کی شہرت کہاں سے کہاں پہنچی۔ یقیناً اس میں جہاں بزرگوں کی روحانیت کارفرما ہے وہیں امین ملت کی مقبولیت اور ان کے حسنِ انتظام کو بھی دخل ہے۔

۲-زائرین کی کثرت کے ساتھ قیام گاہوں کی قلت کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ پہلے قرب وجوار کے اکثر لوگ آخری دن قُل سے پہلے آتے اور شام تک واپس ہوجاتے، دور ونزدیک کے قلیل افراد ایک دورات قیام کرتے توان کے لیے اہل خانقاہ کے خام مکانات اور کمرے کافی ہوتے۔

بعد میں دور سے آنے والے اور ایک دن سے تین دن تک قیام کرنے والے زائرین کی کثرت ہوئی تو قیام گاہوں کی تعمیر ناگزیر ہوئی۔ بہت سی عمارتیں بنیں اور اب بھی سلسلہ جاری ہے۔ زائرین کو بہت سی سہولتیں حاصل ہوئیں اور مزید کی کوشش جاری ہے۔ عمارتوں کی تفصیل شاید ایک مستقل مضمون کی طالب ہے۔

۳-اب عرس کی تقریبات پر نظر ڈالیں تو ان میں مقصدیت اور افادیت صاف دکھائی دے گی، کوشش یہ ہوتی ہے کہ نعتیں اور مناقب معیاری ہوں، تقریروں سے عوام کے عقائد واعمال کی اصلاح ہو، وہ جائیں تو کوئی درس اور کوئی پیغام لے کر جائیں، جمعہ کی شام سے اتوار کی دوپہر تک برابر مختلف نشستیں ہوتی رہتی ہیں جن سے سامعین کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

کثیر ہجوم کے باوجود نماز وجماعت کی پابندی کا اہتمام ہوتا ہے۔ خانقاہ کے قریب کی مسجدیں نمازیوں سے بھر جاتی ہیں اس لیے جلسہ گاہ میں بھی پنج وقتہ جماعت کا انتظام ہوتا ہے۔

انہی مصروفیات کے ہجوم میں ارباب علم ودانش کی کوئی مشاورتی نشست بھی ہوتی ہے جس میں ملکی، قومی اور جماعتی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا ہے اور طے شدہ تجاویز کو حسب وسعت عمل میں لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ کئی سال تک "فکر وتدبیر کانفرنس" کا انعقاد اسی سلسلے کی ایک یادگار کڑی ہے۔

ان سرگرمیوں سے یہ درس ملتا ہے کہ روایتی مراسم سے آگے بڑھ کر عرس کو قوم وملت کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد بنایا جاسکتا ہے اور یہ سالانہ تقریب بہت نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔

۴-اسی ۲۵ سالہ دور میں خانقاہ برکاتیہ سے یہ نعرہ بلند ہوا " آدھی روٹی کھائیے، بچوں کو پڑھائیے "۔ تعلیم مسلمانوں کی دینی علمی سماجی ملکی پس ماندگی کا مؤثر علاج ہے، اس لیے اس طرف پوری توجہ دی گئی۔

بارہا تلقین کی گئی — اور اب بھی جاری ہے — کہ جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں وہ کچھ غریبوں ناداروں کے بچوں کو بلاعوض تعلیم دینے کے لیے خود وقت نکالیں، جو لوگ خوش حال اور مالدار ہیں وہ کچھ یتیموں محتاجوں کے تعلیمی اخراجات اٹھا کر انھیں جہالت اور پس ماندگی سے بچائیں۔

جہاں تک مجھے علم ہے، بہت سے بے سہارا بچوں کی کفالت خود خانقاہ کے ذریعہ ہوتی ہے اور کچھ اہل خیر کو بھی اس کارِ خیر سے وابستہ کیا گیا ہے۔ کچھ ہونہار طلبہ کو ان کی نمایاں کامیابی پر انعامات دے کر ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔

فروغ تعلیم کا باب پوری قوم سے توجہ کا طالب ہے، اس راہ میں جتنی ہی کوشش ہو ان شاء المولی الرحمن، بہتر ثمرات مرتب ہوں گے۔ واللہ الموفِق.

۵-فروغ تعلیم ہی کا ایک اہم اور مثالی نشان جامعہ البرکات علی گڑھ ہے، جس میں ٹھوس عصری تعلیم کے ساتھ مضبوط دینی تربیت کا انتظام ہے۔ یہ جہاں اسکولوں اور کالجوں کی قطار میں اپنا ایک امتیازی مقام رکھتا ہے وہیں مدارس دینیہ کو بھی بہت کچھ درس دیتا ہے۔

چند برسوں سے اس کے تحت ایک ایسا شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے جس میں مدارس دینیہ کے فارغین کو دو سالہ

نصاب کے تحت تعلیم دی جاتی ہے اور یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ میدانوں میں کام کے لائق بن جائیں۔

اس ادارے کے تصور اور اس کی تاسیس و تعمیر سے لے کر اب تک اس پر امین ملت کی خاص توجہ اور محنت کار فرما ہے۔

۶- ضلع ایٹہ اور اس سے متصل کئی اضلاع میں دینی عربی تعلیم کا کوئی قابل ذکر ادارہ نہ تھا، اس لیے اس دیار کے جو بچے دینی تعلیم کے شائق ہوتے وہ مختلف دشواریوں کے باعث محروم رہ جاتے، جب کہ علم دین مسلمانوں کی زندگی کا لازمی عنصر ہے جس کے بغیر ان کی عبادات اور معاملات کسی کی صحت کی ضمانت نہیں۔

اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے چند سال پہلے امین ملت کی سرپرستی میں خود مارہرہ شریف کی سرزمین پر جامعہ احسن البرکات کا قیام عمل میں آیا۔ حسینی منزل میں کچھ تعمیر و انتظام کے اضافے کے بعد فوری طور پر وہیں تعلیم شروع کر دی گئی پھر ایک دوسری دو منزلہ ذرا وسیع عمارت تیار ہوئی تو تعلیم اور قیام گاہیں وہاں منتقل ہو گئیں، مستقل تعلیم گاہ کی چار منزلہ عمارت جلسہ گاہ کی شمالی جانب قریب التکمیل ہے۔ اسی سے قریب قیام گاہوں کی بھی تعمیر کا منصوبہ ہے۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے اعدادیہ، اولی، ثانیہ کے درجات سے تعلیم کا آغاز ہوا تھا اور صرف تین مدرسین تھے، اب سال رواں سے درجۂ سابعہ کا آغاز ہو چکا ہے اور سال آئندہ درجۂ تکمیل یعنی فضیلت کی باری ہے، اسی حساب سے مدرسین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

یہاں عمدہ اور پختہ تعلیم کے ساتھ بہتر تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور طعام و قیام کا مفت انتظام بھی عام مدارس سے بہت عمدہ و بالا ہے۔ یہ ادارہ مارہرہ شریف میں ہے اس لیے مارہرہ پبلک اسکول کی طرح اس کی بیش تر نگرانی کا سہرا رفیق ملت حضرت نجیب حیدر میاں کے سر ہے۔ اندازہ ہے کہ مستقبل قریب میں جامعہ احسن البرکات معاصر مدارس کی صفِ اول میں شمار ہوگا۔

۷- امین ملت کا ایک اہم کارنامہ ”مجلس برکات“ کا قیام بھی ہے، جس سے واقف تو سبھی اہل علم ہیں مگر اس کا تذکرہ دیکھنے میں کم آتا ہے، میں نے ہی اپنے کئی مضامین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ شاید لوگ اسے ایک چھوٹا کام سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔

ذرا اُس دور کا تصور کیجیے جب ہمارے پاس اپنے مدارس کی درسی کتابوں کی اشاعت کا کوئی انتظام نہ تھا، ہماری اپنی کتابوں پر غیروں کی طباعت کی مہر لگی ہوتی، ہمارے بہت سے مصنفین، شارحین اور محشین کے نام غائب کرکے لوگ اپنی کتابیں بناکر شائع کرتے اور ہمیں طعنہ دیتے کہ ہم اگر کتابیں چھاپ کر تمھیں نہ دیں تو تمھارے پاس پڑھنے پڑھانے کو کچھ نہیں (یہ دور کوئی دس بیس سال نہیں بلکہ ستر (۷۰) سے زیادہ سالوں پر محیط ہے۔)

اس طعن کا عملی جواب صرف اور صرف یہ تھا کہ ہم خود کفیل ہوں اور اپنی درسی کتابیں خود شائع کریں، لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا، اس کے لیے نہ تنہا ”علم“ کافی تھا، نہ تنہا ”دولت“ کافی تھی، دونوں کا اجتماع، اس کے بعد ہمت اور محنت و سرگرمی کی ضرورت تھی۔

اس ”ہفت خوان“ کو امین ملت اور ان کے عزیز رفقا نے سر کیا۔ آج مجلس برکات اپنے مستقل وجود کے ساتھ قائم ہے اور ہم یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ درسیات کے میدان میں اہل سنت اپنے حریفوں کے دست نگر نہ رہے۔ تفصیل کسی اور مقام پر ملاحظہ کر لیں گے — مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جماعت کے لیے یہ ایک عظیم احسان ہے جسے نظر انداز کرنا تو در کنار، کبھی فراموش بھی نہ کرنا چاہیے۔

۸- عرس قاسمی میں یہ منظر بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جو لوگ نمایاں دینی و علمی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی پذیرائی اور ہمت افزائی ہوتی ہے۔ بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ کو چھ جلدوں میں فتاوی بحر العلوم کی اشاعت کے بعد چاندی سے تولا گیا۔ بہت لوگوں کو ایوارڈ دیے گئے، بعض حضرات کو اعتراف خدمات اور اعزاز و تکریم کی سندیں دی گئیں، قراءت کے مقابلوں میں اول آنے والے طلبہ کو عمرہ کے اخراجات دیے گئے۔

یہ اقدام اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ احساس ہو کہ افراد کی خدمات سے جماعت کو سربلندی اور سرخ روئی حاصل ہوتی ہے اور جماعت کی سربلندی خود ہماری سربلندی ہے۔ بے حسی، ناقدری، نفرت، بغض و کینہ اور حسد کے ماحول میں ایسی پیش قدمی کبھی نہیں ہو سکتی۔

۹- اپنے زیر انتظام اداروں کے لیے تگ و دو کے ساتھ دوسرے اداروں کی سرپرستی اور حسب موقع ان کی معاونت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مریدین کو بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنے فعال اداروں کا خیال رکھیں اور حسب مقدور ان کا تعاون کرتے رہیں۔ جب کہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ اگر خود کوئی ادارہ چلا رہے ہیں تو دوسروں سے صاف کہہ دیتے ہیں کہ بھائی! ہمارے لیے اپنے ادارہ ہی کا انتظام مشکل ہے، دوسری طرف ہم کیسے توجہ دے سکتے ہیں؟

۱۰- بہت سے پیروں کے یہاں یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی صاحبِ ثروت شخص داخلِ سلسلہ ہو گیا اور داد و دہش شروع کر دی تو اس کی ایسی ناز برداری ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرید نہیں، مراد ہے، تابع نہیں متبوع ہے، محکوم نہیں حاکم ہے۔ الحمد للہ اس دور انحطاط میں بھی خانقاہ برکاتیہ نے اپنا وقار محفوظ رکھا ہے۔ یہاں مرید، مرید ہی رہتا ہے مراد نہیں بنتا۔

۱۱- خانقاہ برکاتیہ کا ہمیشہ سے یہ شیوہ رہا ہے کہ یہاں سے مذہب اہل سنت کی ترویج اور اہل باطل کی تردید ہوتی رہی ہے۔ اپنے رشتے ناطے والوں سے قطعِ تعلق گوارا ہے مگر مذہب و مسلک سے انحراف کبھی گوارا نہ ہوا۔ اس باب کی پوری تاریخ کتابوں میں مذکور ہے — الحمد للہ آج بھی اس روش میں کوئی فرق نہ آیا۔

۱۲- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں امین ملت کی سرگرمیاں اور ان کے اثرات ونتائج کیا تھے یہ کسی باخبر صاحب قلم کے مضمون میں ملاحظہ کریں۔

۱۳- یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ امین ملت کے برادران گرامی (شرف ملت سید محمد اشرف میاں، سید محمد افضل میاں، رفیق ملت سید نجیب حیدر میاں) پوری طرح ان کی موافقت اور معاونت کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔ ہر اہم کام کے لیے فکری و دماغی محنت، پھر اس کی تکمیل کے لیے مناسب تگ ودَو یہ حضرات خود کرتے ہیں، اس لیے سارے کام بہت حسن وخوبی سے انجام پذیر ہوتے ہیں اور کسی کو حرف گیری کا موقع شاید ہی کہیں ملتا ہو۔

ایسے عظیم تعلیم یافتہ اور مقتدر حضرات کی مشاورت اور معاونت بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے لیے بڑے بھائی کی طرف سے شفقت، محبت، قدر دانی، دل جوئی اور چھوٹے بھائیوں کی جانب سے مرتبہ شناسی، ہم دردی اور اطاعت و محبت کا اجتماع ضروری ہے — رب قدیر اس الفت و محبت کو آسیب روز گار سے بچائے اور ملت کو ان کے ثمرات وبرکات سے ہمیشہ مستفید بنائے۔ آمین۔

میرے ان اشارات سے کم از کم اتنا واضح ہوجاتا ہے کہ امین ملت ایک فرد فرید ہونے کے ساتھ ایک انجمن، ایک ادارہ اور ایک جامعہ ہیں جس سے بہت سی انجمنیں آباد اور بہت سے افراد اور ادارے محو پرواز ہیں۔ مولا تعالیٰ ان کا سایۂ عاطفت سلامت رکھے۔

مجھے احساس ہے کہ کچھ باتیں رہ گئیں اور بہت سی باتیں بڑے اختصار سے درج ہوئیں مگر امید ہے کہ دیگر مضامین سے میری خامیوں کی تلافی ہوجائے گی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

۲۴؍ ذوالحجہ ۱۴۴۰ھ / ۲۶؍ اگست ۲۰۱۹ء

❁❁❁❁❁❁

مولانا قمر الزماں اعظمی (۱)

مبسملاً وحامدًا ومصلّیًا

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے مولانا قمر الزماں اعظمی کے نام اور شکل وصورت سے میں اُس وقت آشنا ہوا جب حافظ ملت قدس سرہ نے دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم سے انھیں دستارِ فضیلت دی۔ غالباً یہ ۱۰؍ شعبان ۱۳۸۴ھ کی تاریخ تھی اور میں اُس وقت مدرسہ ضیاء العلوم خیر آباد ضلع اعظم گڑھ میں ابتدائی عربی کا طالب علم تھا۔

پھر جب میں نے اشرفیہ میں داخلہ لیا تو مبارک پور اور قرب وجوار میں ان کی تقریریں سننے کا بارہا اتفاق ہوا۔ پوسٹروں میں اُن کے نام کے ساتھ الجامعۃ الاسلامیہ رَونا ہی ضلع فیض آباد، درج ہوتا۔ اسی ذریعہ سے رونا ہی اور الجامعۃ الاسلامیہ سے آشنائی ہوئی، ورنہ ہمارے دیار میں نہ قصبہ رَونا ہی معروف و مشہور تھا نہ الجامعۃ الاسلامیہ۔ البتہ مولانا کی تقریروں کا شہرہ اُن کی فراغت کے بعد دس سال کے اندر اندر ملک کے دور دراز اطراف واکناف میں ہوچکا تھا۔ اُن کی تقریریں مدارس کے طلبہ وعلما کے ساتھ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ واساتذہ میں بھی مقبول تھیں۔

اُس دور کے اکابر مثلاً سرکار مفتی اعظم قدس سرہ، برہانِ ملت مولانا سید شاہ برہان الحق جبل پوری، سید العلما مولانا سید شاہ آل مصطفیٰ مارہروی صدر سنی جمعیۃ العلما ممبئی، حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز محدث مراد آبادی شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ مبارک پور، مجاہد ملت مولانا شاہ حبیب الرحمن قادری رئیس اعظم اڑیسہ علیہم الرحمۃ والرضوان اور اواسط مثلاً شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی، بلبل ہند مفتی رجب علی نانپاروی، پیر طریقت مولانا سید شاہ عبد الحق اعظمی مصباحی، فیض العارفین مولانا غلام آسی بلیاوی، رئیس القلم علامہ ارشد القادری مصباحی، سحبان الہند مولانا ابو الوفا فصیحی غازی پوری، مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی، خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی، علیہم الرحمہ۔ پھر اُن کے بعد کے بے شمار علما اور اصاغر سبھی مولانا قمر الزماں اعظمی کی علمی وایمان افروز تقریروں کے قدر داں اور اُن کی نیک طبعی، سلامت روی، حمیت دینی، بصیرت علمی اور قومی وجماعتی دردمندی وغیرہ کمالات ومحاسن سے متاثر تھے۔

جسے ان بزرگوں سے سند قبول حاصل ہوچکی ہو اس کے لیے میرے ستائشی کلمات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی،

---

(۱) ....

حالاں کہ میں خود ان کے متعدد اوصاف و خدمات سے بہت متاثر ہوں۔ خالص پور، مبارک پور، جمشید پور، محمد آباد گوہنہ وغیرہ مقامات پر بہت سی تفصیلی ملاقاتیں اور باتیں بھی رہی ہیں۔ بہت قریب سے میں نے انھیں دیکھا، جانچا پرکھا اور سمجھا ہے۔ ورلڈ اسلامک مشن برطانیہ کے لیے جوائنٹ سکریٹری پھر جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اُن کا انتخاب بھی یاد ہے ــــــ اپنے مخلصانہ جذبات و خدمات، مذہبی و قومی سربلندی کے جوش و ولولہ، کردار و اخلاق کی بلندی و پاکیزگی، علمی گہرائی اور وسعت نظر وغیرہ متعدد فضائل و محاسن کے اعتبار سے وہ نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ بہت سے پیش رووں سے بھی مجھے فائق اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ مگر اِن سب کی تفصیل کے لیے فرصت درکار ہے۔ اور وہی میرے لیے عنقا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مجھے عفو و کرم سے نوازے۔

میں اِس فکر میں ہوں کہ کچھ محنتی اور بالغ نظر اہل قلم پوری احتیاط کے ساتھ مولانا کے حالات و خدمات قید تحریر میں لائیں اور سلیقے سے مرتب کر کے پیش کریں تاکہ مناسب اور باوقار تعارف بھی ہو سکے اور نئی نسل اس سے اثر پذیر بھی ہو۔ و ما توفیقی الا باللہ.

یہ خبر باعث مسرت ہے کہ رضا اکیڈمی ممبئی علامہ قمر الزماں اعظمی مصباحی کی خدمات کے اعتراف میں اعزازی اجلاس اور ایوارڈ کا اہتمام کر رہی ہے، اور ان کی خدمات سے متعلق تاثرات اور مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع کرنا چاہتی ہے ــــــ اِس باب میں رضا اکیڈمی کا سابقہ رکارڈ بھی بہت شاندار اور ممتاز ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جماعت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اسلام و سنیت کی مخلصانہ خدمات انجام دینے والوں کے قدر داں اور معتقد و معترف بھی ہیں اور ان کی ہمت افزائی کے لیے آمادہ و تیار بھی، ساتھ ہی اُن کے امتیازی مقام سے دوسروں کو متعارف کرانے کے لیے سرگرم بھی، تاکہ اُن کے تابندہ نقوش کی ضیا عام سے عام تر ہو سکے۔ زادھم اللہ خیرًا و إحسانًا و کثر أمثالھم فینا.

محمد احمد مصباحی
صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

۵ ربیع الآخر ۱۴۳۲ھ / ۱۰ مارچ ۲۰۱۱ء

❁❁❁❁❁❁

ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی[1]

باسمہ وحمدہ تعالیٰ وتقدس

مولانا محمد عاصم اعظمی اپنی عمر کی ستر (۷۰) بہاریں دیکھ چکے ہیں اور علمی دنیا میں اپنے رشحات قلم سے پہچانے جاتے ہیں۔ اول اول جب انھوں نے مدرسے کی تعلیم سے فراغت حاصل کی تو دیکھا کہ لوگ بی اے، ایم اے، پی ایچ ڈی وغیرہ کی ڈگریوں سے اہل علم کا قد ناپتے ہیں۔ مولانا نے کوشش کی اور کسی کالج میں داخلہ لیے بغیر اپنی محنت اور مطالعہ سے امتحانات دیے، تحقیقی مقالہ لکھا اور یہ سب ڈگریاں حاصل کر لیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے جب لکھ پڑھ کر ڈگری حاصل کی تو محض گائڈ بکوں کے ذریعہ پرانے پرچے حل کر کے امتحانات پاس کرنے والوں سے بدرجہا بلند اور فائق ثابت ہوئے۔ مطالعہ نے ان کا علمی افق بھی وسیع کیا اور محنت نے انھیں نئے آفاق سر کرنے کا حوصلہ بھی بخشا۔

اہل نظر ہمیشہ کسی کے علمی و تحقیقی کام سے اس کا درجہ و مقام متعین کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی مولانا کا قد بہت اونچا نظر آتا ہے۔ محنت و مطالعہ اور تحریر و نگارش کا انھوں نے فطری ذوق پایا تھا، اسے جلا بخشی اور ہمیشہ قرطاس و قلم کی آب یاری سے شغف رکھا۔ متعدد فارسی کتابوں کے اردو ترجمے لکھے، علم میراث میں ایک رسالہ لکھ کر اس فن میں اپنی جدید و قدیم آگاہی اور درسی مہارت کا ثبوت فراہم کیا۔ تذکرہ نگاری اور تاریخ نویسی سے خاص شغف رکھا اور اس میدان میں بھی کچھ نئے گوشوں کی تلاش اور بہت سے علمی فوائد و نکات کو ملحوظ رکھا جس کے باعث ان کی نگارشات نے اہل علم کی نظریں اپنی طرف مبذول کر لیں۔

جو باذوق طلبہ ان سے قریب ہوئے ان کے ذوق تحریر کو روشنی ملی اور موصوف کی توجہ اور رہ نمائی سے وہ اچھے انشا پرداز بن گئے۔ در اصل انسان کا فطری ذوق اور اس کا عملی جذبہ ہی اصل محرک ہوتا ہے مگر کسی استاذ کی تربیت اس ذوق اور جذبے کو بہت جلد عمومی عیوب و نقائص سے پاک و صاف نگارش کے لائق بنا دیتی ہے ورنہ صرف ذاتی مشق و ممارست ہو تو عرصۂ دراز تک زبان و انشا کی غلطیاں آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ اس کا تجربہ

(۱) حیات مورخ اسلام، بیت الحکمت، گھوسی، اگست ۲۰۱۹ء۔

شاعری کی دنیا میں بھی ہوتا ہے۔

مولانا اپنے معاصرین میں اپنی علمی و تحریری خدمات کے باعث ایک امتیازی مقام کے حامل ہیں، وہ محنت، مطالعہ، وسعتِ نظر، استحضار اور تربیتِ لوح و قلم کی وجہ سے طلبہ و علماسب کے لیے ایک عمدہ اور قابل تقلید نمونہ ہیں۔ ربّ کریم ان کے امثال زیادہ کرے۔

محمد احمد مصباحی

۱۳؍ شوال ۱۴۴۰ھ / ۱۷؍ جون ۲۰۱۹ء

❁❁❁❁❁❁

باب پنجم

تبصرہ اور مکالمہ

تذکرۂ محدث اعظم پاکستان[1]

ہمارے دیرینہ کرم فرما علامہ عبدالحکیم شرف قادری اور مولانا محمد منشا تابش قصوری کے ذریعہ زیر تبصرہ تذکرہ موصول ہوا۔ یہ تذکرہ ایسی اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے عوام و خواص کو روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اس کا مطالعہ بھی کر سکیں اور اسے اپنے لیے نمونۂ عمل بھی بنا سکیں۔ اسی جذبے کے تحت یہ چند صفحات نذر قارئین ہیں۔
محمد احمد مصباحی غفرلہ، رکن المجمع الاسلامی واستاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور۔ ۲۸/ر/ ۱۴۱۰ھ/ ۳۱/ ۸/ ۱۹۸۹ء

کتاب: محدث اعظم پاکستان مولانا ابوالفضل محمد سردار احمد چشتی، قادری
مؤلف: مولانا محمد جلال الدین قادری
صفحات: جلد اول ۶۲۶، جلد ثانی ۵۱۲، مکمل ۱۱۳۸
قیمت: ایک سو پچاس روپے
ناشر: مکتبہ قادریہ، لاہور ۸ (پاکستان)

صدر الشریعہ علامہ محمد امجد علی اعظمی (۱۲۹۶ھ - ۱۳۶۷ھ) کا علمی و دعوتی فیضان ان کے چند متبحر اور فعّال تلامذہ کے ذریعہ پورے بر صغیر کو محیط ہو کر دنیا کے مختلف گوشوں تک پہنچ چکا ہے۔ ان مقتدر شخصیتوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور بافیض حضرت محدث اعظم پاکستان اور حافظ ملت حضرت شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی (۱۳۱۲ھ - ۱۳۹۶ھ) بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی قدآور اور دل آویز شخصیتیں ہیں۔ دونوں حضرات کے تلامذہ سے ہند و پاک کی علمی، تنظیمی، تبلیغی اور تدریسی انجمنیں ہر طرف آباد اور جلوہ بار ہیں۔

ان کے حالات و سوانح کی تدوین ملت اسلامیہ پر عموماً اور ان کے اخلاف و تلامذہ پر خصوصاً ایک عظیم قرض تھا۔ یہ دیکھ کر بے پناہ مسرت ہوئی کہ مولانا محمد جلال الدین قادری نے ایک شخصیت کا قرض بڑی حد تک اتار دیا ہے۔ اور تمام وابستگان ابوالفضل کے تشکر و امتنان کا واجبی حق حاصل کر لیا ہے۔ لیکن اس مشقت خیز اور طویل عمل میں جن بلند ہمت، بے ریا اور بے غرض ہستیوں کی یاوری کار فرما ہے، ان سے یک لخت صرف نظر بڑی ناسپاسی ہوگی

(۱) ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، دسمبر ۱۹۸۹ء

اور ان کے مخلصانہ تعاون کے قابل تقلید پہلو سے بے التفاتی اور محرومی بھی۔ کام کی تفصیل مولانا محمد منشا تابش قصوری نے یوں رقم کی ہے:

"حضرت مولانا مفتی محمد عبد القیوم ہزاروی مدظلہ ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ لاہور نے حضرت محدث اعظم پاکستان کے مبسوط تذکرہ کی جمع و تدوین کا بیڑا اٹھایا۔ بارہ سال قبل جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں آپ نے شعبۂ تصنیف و تالیف قائم فرمایا۔ (جس کے اغراض و مقاصد میں تذکرہ محدث اعظم پاکستان کی ترتیب بھی شامل تھی)

لہٰذا عملاً اس کام کو شروع کر دیا گیا۔ حضرت محدث اعظم علیہ الرحمۃ سے متعلق مضامین کے حصول کے لیے تگ و دو کی جانے لگی۔ حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمۃ سے جس طرح بھی کسی سے کسی کی نسبت دیکھی، سنی مفتی صاحب اس سے بڑی دل چسپی لیتے۔ انتہائی دل چسپی سے حالات و واقعات معلوم کرتے۔ ان کے خاندانی افراد و شخصیات سے احوال دریافت کرتے۔ قدیم تلامذہ سے گفتگو کا محور یہی موضوع ہوتا۔ علما و باشندگان بریلی شریف سے جہاں تک ممکن ہوتا، حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمۃ کی زندگی سے متعلق باتیں پوچھتے۔ نیز حضرت کے قدیم خدام و رفقا سے جو کچھ بن آتا حاصل کرتے۔ انھیں اس عظیم شخصیت کے سوانح قلم بند کرانے کی طرف توجہ دلاتے۔ اور حاصل شدہ مواد محفوظ کرتے چلے جاتے۔

اراکین شعبۂ تصنیف و تالیف نے اس سلسلہ میں مفتی صاحب سے تعرض جاری رکھا۔ خصوصاً حضرت مولانا عبد الحکیم شرف قادری مدظلہ اور راقم السطور محمد منشا تابش قصوری نے ایسے جرائد و رسائل و کتب جن میں حضرت محدث اعظم علیہ الرحمۃ سے متعلق کوئی بھی مضمون دیکھا، مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیے۔ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں علمائے کرام، مشائخ عظام اہل سنت و جماعت کے افراد کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لہٰذا مفتی صاحب نے ان سے بھی پورا پورا استفادہ فرمایا۔ اور اتنا مواد جمع فرما لیا، جس سے ضخیم تذکرہ تیار کیا جا سکتا تھا۔

اسی اثنا میں مورخ لاہور جناب محمد دین کلیم سے رابطہ قائم کیا جنھوں نے فیصل آباد پہنچ کر (اپنے چار سالہ دوران قیام میں) حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ کے متعلقین سے انٹرویوز لیے تھے اور نہایت مفید معلومات حاصل کی تھیں۔ انھوں نے جملہ مُسَوَّدات مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیے۔"(۱)

"اب یہ فکر ہوئی کہ ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے اس مواد کو کون ترتیب دے۔ اس کام کے لیے مفتی صاحب مدظلہ نے حضرت محدث اعظم کے شاگرد اور متعدد کتابوں کے مصنف حضرت مولانا محمد جلال الدین قادری مدظلہ کو منتخب فرمایا۔ اور واقعی یہ صحیح ترین انتخاب تھا۔ انھوں نے ناسازئ طبیعت اور کثرت مشاغل کے باوجود تقریباً چار سال کے عرصے میں یہ کام مکمل کر لیا۔ ترتیب میں جاں گسل محنت سے کام لیا۔ دور دراز کے کئی سفر کیے۔ علما کو سیکڑوں خطوط لکھے اور نہ جانے کتنی راتیں بیدار رہ کر اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ حضرت محدث اعظم

(۱) جلد دوم، ص:۵۰۱-۵۰۲

قدس سرہ کے فرزند اکبر اور جانشین حضرت صاحب زادہ قاضی محمد فضل رسول حیدر رضوی مدظلہ نے نہ صرف خاندانی حالات فراہم کیے اور حضرت کی ذاتی یاد داشتوں کے مطالعہ کی اجازت عطا فرمائی بلکہ از راہ کمال مہربانی تمام کتاب مؤلف کی زبانی سماعت بھی فرمائی۔"(۱)

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام و خواص کسی علمی کام کی اہمیت، طریقۂ کار، اور اس سلسلے میں صبر آزما محنت و اخلاص کا صحیح اندازہ کریں۔ کسی عظیم کام کے لیے اپنی شخصیت نمائی سے بالاتر ہو کر کام کی حوصلہ افزائی اور بے غرض تعاون کا سبق سیکھیں پھر کہیں اپنی حسین آرزوؤں کی تکمیل کا دن دیکھنا نصیب ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ بعض حضرات شکایات کے انبار لگانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ایسے مرد میداں شاید و باید نظر آتے ہیں، جو کاموں کی اہمیت کا ادراک کر کے معقول تدابیر، صبر آزما جہد و عمل یا کم از کم بے غرض تعاون اور حوصلہ افزائی ہی کا مظاہرہ کر سکیں۔ رب کریم ہمیں توفیق خیر سے نوازے۔

کتاب کے مشتملات:

یہ کتاب سوانح کے ترقی یافتہ معیار اور عصری تقاضوں سے ہر طرح عہدہ برآ ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اتنی محنت و جامعیت کے ساتھ ایسی کسی شخصیت کا کوئی تذکرہ اب تک مرتب نہ ہوا۔ جہاں یہ کتاب محدث اعظم قدس سرہ کا دلکش اور ہمہ گیر تعارف کراتی ہے، وہیں دوسرے تذکروں کے لیے بھرپور رہنمائی کرتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ ممتاز ارباب علم و قلم اور بلند حوصلہ مخلصین کی بارہ سالہ محنتوں اور کاوشوں کا عطر جاں نواز ہے۔

ابواب کی اجمالی فہرست کچھ اس طرح ہے:

باب	عنوان	صفحات
باب-۱:	ابتدائی حالات، ج:۱، ص:۲۵ تا ۵۴	
باب-۲:	اساتذۂ کرام، ج:۱، ص:۵۵ تا ۱۳۶	
باب-۲:	سلاسل و اسناد، عقیدتِ اساتذہ و مشائخ، ج:۱، ص:۱۳۷ تا ۱۹۹	
باب-:۲	تلامذہ، اخلاف، معاصرین، مکتوبات، ج:۱، ص:۲۰۰ تا ۲۶۸	
باب-۳:	تعلیمی خدمات، علمی خصوصیات، ج:۱، ص:۲۶۹ تا ۴۸۰	
باب-۴:	دینی اور تبلیغی خدمات، ج:۱، ص:۴۸۱ تا ۵۹۲	
---	عکس و نوادرات، ج:۱، ص:۵۹۳ تا ۶۱۵	
باب-۵:	ملی و سیاسی خدمات	جلد دوم، ص:۵ تا ۶۴
باب-۶:	بیعت و خلافت	جلد دوم، ص:۶۵ تا ۱۳۸

(۲) مولانا عبد الحکیم شرف قادری، جلد اول، ص:۱۷-۱۸

ابتدا میں • دعائیہ کلمات: از: علامہ غلام رسول رضوی • ابتدائیہ از: مولانا محمد عبد الحکیم شرف قادری • توثیق و تصدیق: از: پیر طریقت قاضی محمد فضل رسول حیدر۔ آخر میں • تکمیل آرزو: بقلم مولانا محمد منشا تابش قصوری۔

یہ سوانح صرف ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک دور کی تاریخ ہے۔ حضرت کے بعض اساتذہ کا تعارف بھی بڑی وسعت نظر اور جامعیت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جو اپنی جگہ انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جو لکھا گیا ہے بڑے نادر مآخذ سے چھان بین، مکمل حوالوں اور تحقیق و تنقید کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ کوزہ میں سمندر بند کرنے کی مثل بھی ہر سمت راست ہوتی نظر آرہی ہے۔ رطب و یابس ملا کر تطویل بے جا سے مکمل اجتناب ملحوظ خاطر رہا ہے۔ جتنا کثیر مواد فراہم کیا تھا اس کی صرف گیارہ سو صفحات میں تدوین بلا شبہہ مولانا محمد جلال الدین قادری کی قلمی مہارت اور فکری و علمی برتری کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔ اور زبان و بیان کی چاشنی اور سہل ممتنع کا مزہ ان سب پر مستزاد ہے۔ جَزَاهُمُ اللهُ خَيْرَ الجَزَاء.

اہم نوادر اور مقامات و آثار کا عکس جمیل بھی قابل دید اور لائق مطالعہ ہے۔ اس عظیم تذکرہ کی تدوین و اشاعت پر علامہ مفتی عبد القیوم ہزاروی اور مؤلف تذکرہ مولانا محمد جلال الدین قادری کے ساتھ ان کے تمام مخلصین و معاونین (جن کا ذکر ہوا) کی خدمات میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ادا ہونے والی پر خلوص مبارک باد پیش ہے۔ ان کے لیے نہ صرف زبان و قلم بلکہ دل و دماغ بھی قدر شناسی اور اعتراف عمل کے بے کراں جذبات سے سرشار ہیں۔ كَثَّرَ اللهُ اَمْثَالَهُمْ.

❁❁❁❁❁❁

انٹرویو:

جماعت اہل سنت کے تعلیمی و تحریری امور و معاملات(۱)

سوالات: از بعض طلبۂ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

جوابات: از علامہ محمد احمد مصباحی، صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

میں نے آپ کے سوالات پر ایک نظر ڈال لی، بنیادی طور پر چند باتیں ذہن نشین کر لیں ان سے آپ کو ہر معاملے میں بہت کچھ روشنی ملے گی۔

(۱) جب کوئی نئی جماعت یا نئی پارٹی وجود میں آتی ہے تو اس کے اندر اپنے بڑھاؤ اور پھیلاؤ کے لیے جوش عمل بہت زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) جو جماعت جتنی ہی چھوٹی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ منظم ہوتی ہے۔ منکرین اسلام میں اس کی مثال یہود ہیں اور مدعیان اسلام میں قادیانی۔

(۳) جو جماعت جتنی بڑی ہوتی ہے اس کی تنظیم اتنی ہی زیادہ مشکل ہوتی ہے اور اس میں انتشار و افتراق اسی حساب سے سہل اور آسان ہوتا ہے۔

(۴) اہل حق کی راہ میں شیطان طرح طرح کے موانع پیدا کرتا ہے جب کہ اہل باطل کے لیے اشاعتِ باطل کی راہ میں زبردست محرک بلکہ معاون بھی بنتا ہے۔ ہاں خدا کے مخلص بندوں پر اس کا زور نہیں چلتا اور انھیں کے دم قدم سے حق کی بقا وابستہ ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے: من عمل ببدعة خلاه الشيطان فى العبادة والقى عليه الخشوع والبكاء (ابو نصر والديلمى عن انس رضى الله عنه. كنز العمال) جو کسی بدمذہبی پر کاربند ہو جاتا ہے شیطان اس کو عبادت گزاری میں چھوڑ دیتا ہے اور اس کے اوپر خشوع اور گریہ و زاری کی کیفیت ڈال دیتا ہے۔"

بدمذہبوں کی یہ کیفیت دیکھ کر کتنے ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ شیطانی منصوبے کے عین مطابق ہے۔

یہ میں نے جو ابتدائی باتیں ذکر کی ہیں اب حالات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیجیے۔

---

(۱) ماہنامہ کنز الایمان، دہلی، شمارہ جنوری ۲۰۰۴ء، ص:۱۳تا۲۱

آج زیادہ فعال اور متحرک جتنے فرق باطلہ ہیں سب سو، ڈیڑھ سو سال کے اندر کی پیداوار ہیں۔ اہل سنت کے مقابلے میں ان کی افرادی تعداد بھی کم ہے۔ مگر جوش عمل اور فروغ مذہب کے لیے ان کی کاوشیں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ سب سے چھوٹی جماعت قادیانی ہے اس کے یہاں تنظیم سب سے زیادہ ملے گی۔ بیشتر ممالک اور شہروں میں ان کے فعال دفاتر قائم ہیں۔ سرمایہ کاری اور مالی توانائی کا زبردست انتظام ہے، لٹریچر کی بہتات ہے، ہر مذہب کے ماہرین ان کے مراکز میں تیار رکھے گئے ہیں۔ اسلام کا نام سب زیادہ وہ لیتے ہیں، غیر مسلموں کے خلاف سب سے زیادہ وہ لکھتے اور چھاپتے ہیں، دیگر فرقوں میں بھی کسی قدر تنظیم اور حرکت ملے گی، اپنی جماعت کو بڑھانے پھیلانے کا جذبہ اور دوسروں کو جلد سے جلد اپنا بنانے کا حربہ ان میں ہر وقت سرگرم عمل نظر آئے گا۔ مثلاً وہ:

(۱) ادارے کثرت سے کھولتے ہیں۔ اس کے لیے بجٹ کی فراہمی بھی بڑی مہارت سے کرتے ہیں، معلم بھی عموماً اچھے چنتے ہیں۔

(۲) اہل سنت کے اداروں، مسجدوں اور انجمنوں کو بھی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے لیے ہر جھوٹ اور فریب روا رکھتے ہیں۔

(۳) اپنے افراد کو عصری اور دینی دونوں طرح کی تعلیموں میں لگاتے ہیں۔

(۴) ان کے عوام بھی ایک فعال مبلغ کا کام انجام دیتے ہیں، سنی، غیر سنی، جس کو پا جائیں تبلیغی اجتماع میں شرکت پر زور دیتے ہیں۔ اپنی مسجد میں پہنچنے کی دعوت دیتے ہیں، غریب سنیوں کو تلاش کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہمارے حوالے کر دیں ہم ان کی بہترین تعلیم کا انتظام کریں گے اور سارے اخراجات بھی ہم برداشت کریں گے اس طرح بے شمار افراد اور گھرانے ان کی گود میں پہنچ گئے۔

(۵) تفسیر، حدیث، سیرت، تاریخ وغیرہ کی کتابیں لکھتے ہیں اور ان میں اپنی بدمذہبی کا زہر پوری چابکدستی سے شامل کر دیتے ہیں۔ پھر ایک مفسر، محدث، مؤرخ کی حیثیت سے اپنی تشہیر کرتے ہیں، اپنی کتابوں کی تشہیر کرتے ہیں، غیر جانبدار آدمی ان کی کتابیں پڑھے یا نہ پڑھے لیکن اتنی بات مان لیتا ہے کہ انھوں نے اسلام کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ اس طرح وہ ان پر اعتماد کرنے لگتا ہے اور ان کا زہر بھی آسانی سے پی جاتا ہے۔

(۶) اہل سنت سے ملتے ہیں تو اتحاد کی بات کرتے ہیں اور طرح طرح سے یہ بتاتے ہیں کہ اس وقت عالم اسلام اور مسلمانوں کو بیرونی چیلنجوں کا سخت مقابلہ ہے اس لیے اندرونی اختلافات ختم کر کے ہم سب کو متحدہ کوشش کی ضرورت ہے۔ اس طرح وہ عوام کو عقائد میں مذبذب بنا دیتے ہیں اور خواص کا رخ بھی پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف عملی میدان میں ان کا کردار یہ ہے کہ کسی سنی کو کسی ادارے میں دیکھنا نہیں چاہتے مثلاً علی گڑھ میں

بعض سنی مدارس کی اسناد کی منظوری کے لیے کاغذات پہنچے توانھوں نے پہلی کوشش یہ کی کہ وہ معادلہ بورڈ کی میٹنگ میں پہنچنے ہی نہ پائیں۔ پہنچ گئے تو بڑی باریک بینی سے کاغذات میں نقص بتا کر روک دیا۔ منظوری کا مرحلہ قریب آگیا تو ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ منظور نہ ہوں۔ منظور ہو گئیں تو یہ کوشش کی کہ طلبہ کو نا اہل بتا کر داخلہ سے محروم کر دیا جائے۔ کسی لکچرر یا ریڈر یا پروفیسر کی جگہ نکلی تو اولاً یہ کوشش کہ کوئی سنی امیدوار پہنچنے نہ پائے، پہنچ گیا تو کسی طرح انٹرویو میں ناکام ہو جائے، اس میں بھی کامیاب ہو گیا تو بااختیار افراد پر زور ڈال کر اسے روک دیا۔

تفسیر، حدیث، فقہ کسی بھی فن میں اہل سنت کی جو خدمات ہیں ان کا تذکرہ کسی طرح نہ آنے دیں گے۔ کوئی اگر ان کی کتابیں دیکھنا ہی چاہے تو پوری کوشش یہ کریں گے کہ وہ دیکھنے نہ پائے۔ الغرض مسلکی تعصب کے معاملے میں وہ انتہا پسندی کے حامل ہیں اور ہر طرح کی رذالت پر اتر آتے ہیں۔ ساتھ ہی اتحاد کا نعرہ بھی بلند کرتے ہیں۔ اور اہل سنت کی تشہیر فسادی اور جھگڑالو کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

(۷) ان کے پاس مکائد اور شیطانی فکر کی کمی نہیں، دورغ بافی ان کا مذہب ہے۔ خدا کے لیے کذب ممکن مانتے ہیں۔ تقیہ شیعوں کا مذہب ہے مگر تقیہ پر عمل کے میدان میں شیعوں کو ان سے بہت پیچھے پائیے گا۔ بہت پہلے انھوں نے عصری درسگاہوں پر قبضہ جما لیا اور ہمارے پرانے لوگ جو وہاں تھے انھوں نے آئندہ کے لیے اپنے کسی جانشین کی فکر نہ کی، انھوں نے یہ سمجھا ہو گا کہ اصول وضوابط کی روشنی میں جو اہل ہو گا وہ جگہ پائے گا۔ انھیں کیا خبر کہ یہ گھس پیٹھ والی قوم جب سامنے آئے گی تو اصول وضوابط کی مٹی پلید ہو جائے گی۔

اس کے برخلاف اہل سنت کا حال یہ ہے کہ گنے چنے مخلصین کو چھوڑ کر اکثر وبیشتر شیطانی مکائد کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً کوئی تنظیم بنی تو قطع نظر اس کے کہ تنظیم کے مقاصد کیا ہیں اور ہم اس کے لیے وقت دے پائیں گے یا نہیں؟ اس کی کامیابی کے لیے کس قدر جد وجہد اور معاونت کی ضرورت ہے؟ ہمارا نام اگر نمایاں طور پر اس میں شامل نہیں تو اس کی مخالفت ضروری ہے، بہت رعایت سے کام لیا تو یہ کہ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، اس کے لیے کوئی کلمۂ خیر کہنے کو تیار نہیں، البتہ اس سے متعلق تشکیک اور اندیشوں کا اظہار ضروری ہے۔

کسی گروپ، کسی ادارہ، کسی شخص سے اپنی انا کو ذرا ٹھیس پہنچی تو معافی تلافی، صلح ومصالحت کی کیا بات، اس سے سخت سے سخت انتقام لینا اور اس راہ میں ہر پست سے پست سطح سے گذر جانا فرض منصبی میں داخل ہے۔

ضرورت کی جگہوں پر دعوت وتبلیغ کے لیے وقت نہیں، سرمایہ نہیں، وسائل نہیں، مگر انتقام کے لیے وقت بھی ہے، سرمایہ بھی ہے، وسائل بھی ہیں، توانائی بھی ہے۔ گویا اسی کام کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اسی راہ میں جینا اور مرنا ہے۔ یہ کوئی دو چار افراد کا حال نہیں بلکہ یہ صورت حال ہمارے درمیان برابر رونما ہوتی رہتی ہے۔ اب آپ سمجھ لیجیے

اس تناظر میں جماعت اور ملت کا کام کیسے ہوگا۔

جماعت کو بڑھانے، پھیلانے، اتحاد اور تنظیم کے لیے سوچنے کی بھی فرصت نہیں، اگر کبھی سوچا تو مشکلات کا تصور کر کے سپر انداز ہو گئے۔ یہ بھی نظر آئے گا کہ خود کو ذمہ داری سے مستثنیٰ ٹھہرائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کام تو فلاں فلاں کو کرنا چاہئے۔ ان کے پاس قوت ہے، وقت ہے، وسائل ہیں ہم تو بالکل تہی دامن ہیں۔ تدافع اور تواکل کی اس کیفیت نے ملت کو بہت پیچھے ڈال دیا ہے۔

اور بالفرض کوئی آگے بڑھا اور اس نے کچھ کام شروع کر دیا تو اس کی معاونت، حمایت یا کم از کم زبانی موافقت اور قلبی ہمدردی کی بجائے اس کا انتظار ہوگا کہ کب وہ ٹھوکر کھا کر گرے اور ہمیں ایک فرحت بخش منظر دیکھنے کو ملے۔ یہ بھی کم ہے، کچھ تو اس کوشش میں ہوں گے کہ وہ کام ہی نہ کر سکے ورنہ وہ نیک نام ہو جائے گا، پھر ہماری حیثیت گھٹ جائے گی، اہل حق کے اندر تباغض و تحاسد اور اختلاف و نزاع کی ان لاعلاج بیماریوں کا تذکرہ احادیث میں بھی موجود ہے، مستثنیٰ وہی مخلصین ہیں جن کے بارے میں ابلیس بھی اعتراف کرتا ہے۔

لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (سورۂ حجرات - آیت:۳۹-۴۰)

”ضرور ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا مگر تیرے مخلص و منتخب بندوں پر میرا بس نہیں چلے گا۔“ (یہاں قراءت متواترہ میں مخلصین بکسرِ لام و بفتح لام دونوں ہے۔ اس لیے دونوں حجت ہے)

ان ہی مخلصین کے دم قدم سے حق کی بقا اور سرفرازی وابستہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ یہ حدیث بھی برحق ہے۔ إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر. (بخاری و مسلم)

بے شک اللہ فاجر شخص سے بھی اس دین کو قوت پہنچاتا ہے۔

فاجر کا لفظ اپنے معنی عام کے لحاظ سے فاسق، بدمذہب، کافر سب کو شامل ہے۔ اس لیے ان کے ذریعہ اگر دین کا کوئی کام ہو رہا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ احکم الحاکمین غیروں سے بھی کام لیتا ہے، حقانیت کا معیار عمل نہیں عقائد صحیحہ ہیں۔ اور رب تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا معیار عقائد صحیحہ راسخہ اور اعمال حسنہ خالصہ دونوں کا حسین اجتماع ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔

سوال نمبر ۱: ہماری جماعت میں اچھے قلمکاروں کی کمی کے کیا اسباب ہیں؟

جواب: اس کے ساتھ یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ اچھے مقرر ہماری ہی جماعت میں زیادہ کیوں ہوتے ہیں؟ تقریر اور تحریر دونوں چیزیں مشق اور کثرتِ عمل سے جلا پاتی ہیں۔ اور کثرت عمل کے محرکات کیا ہیں؟ اظہار کے تقاضے یا پھر اظہار کے سہل اور عمدہ مواقع! پھر اس پر ہمت افزائی کے مظاہر! مثلاً آپ ایک چھوٹی سی بستی میں رہتے ہیں اور وہاں

مہینے میں کم از کم ایک بار کسی نہ کسی کے یہاں محفل میلاد ضرور منعقد ہوتی ہے۔ اور تقریر کے لیے آپ کے علاوہ وہاں کوئی نہیں، لامحالہ لوگ آپ کو دعوت دیں گے اور آپ کے لیے بھی منظوری کے سوا چارۂ کار نہیں۔ اگر شہر ہے تو ایک دن میں متعدد مجالس ہوں گی اور متعدد مقررین کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح جمعہ کے دن بھی لوگوں کی ہدایت و موعظت کے لیے پابندی سے کچھ نہ کچھ بیان کرنے کا اتفاق ضرور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس سے تفہیم و تقریر کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا، ہو سکتا ہے کہ آپ کی تقریر زیادہ کامیاب ہونے لگے تو دوسرے شہروں کے لوگ بھی مدعو کرنے لگیں اور آپ انکار نہ کر سکیں پھر اس کے ساتھ عزت افزائی اور نقد داد و دہش کا جو سلسلہ منسلک ہو جاتا ہے وہ بالعموم انسان کا خلوص بھی سلب کر لیتا ہے اور منفعت جوئی کا میلان اور حرصِ دنیا کا مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ جب کہ آپ کافی محنت کر کے کوئی مضمون لکھیں یا کتاب لکھیں تو خود اس کی اشاعت کی راہ پیدا کرنی ہوگی۔ لکھنے کے لیے کتابوں کی ضرورت ہے تو اپنے پاس سے خریدیں یا لائبریریوں کا چکر لگائیں۔ جو کچھ خرچ ہوگا خود برداشت کریں۔ اس کے بعد بھی مضمون اگر رسالے کے معیار یا مزاج سے ہم آہنگ نہیں تو اشاعت پذیر بھی نہ ہوگا، شائع بھی ہو گیا تو اس پر کوئی پذیرائی نہ ہوگی۔ ہاں! کافی مشق و مشقت اور عرصۂ دراز تک صبر مسلسل کے بعد آپ ایک باکمال اور مشہور قلم کار ہو گئے تو کچھ پذیرائی اور ہمت افزائی ہوگی مگر وہ نہیں جو تقریر کے میدان میں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سہل، عزت افزا اور منفعت بخش کام کو چھوڑ کر اس مشکل، صبر آزما اور حرف گیری و رسوائی کے خطرات سے لبریز مجاہدہ کے لیے توانا قلب و جگر کتنے لوگوں کے پاس ہوگا؟ ہزار میں دس بیس بھی ایسے مل جائیں تو بہت سمجھیں۔

الغرض تقریر کے لیے محرکات و اسباب ہمارے یہاں زیادہ فراہم ہیں اور تحریر کے لیے کم۔ اس لیے دونوں کے نتائج بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ دوسروں کے یہاں تقریر کے مواقع اور تقاضے کم سے کم تر ہیں اس لیے وہ اپنے مقاصد کے لیے بالعموم تحریر کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کام سے شغف زیادہ ہوگا اور جس کا عمل و اظہار زیادہ ہوگا اس میں عمدگی اور مہارت بھی زیادہ ہوگی۔

تاہم میں اس سے متفق نہیں کہ اچھے قلم کار صرف دوسروں میں ہیں ہم میں نہیں ہیں۔ البتہ اس طرح کا پروپیگنڈا زیادہ ہے۔

سوال نمبر ۲: اچھے قلم کار اور ادبا کیسے پیدا ہوں گے؟

جواب: آپ کا یہ سوال زیادہ اہم ہے۔ لکھنے کا کام پرائمری درجات سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور معلم اگر خود قابل و باصلاحیت ہو اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کا اس میں احساس ہو تو درجۂ سوم کے آخر میں طالب علم اس لائق ہو سکتا ہے کہ املا صحیح لکھے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنے گھر، اپنے ماں باپ، اپنے پڑوس کے بچوں، نوجوانوں اور

بوڑھوں سے متعلق آسان اور صحیح اردو زبان میں کچھ بولنے اور لکھنے لگے۔ پھر استاذ کی توجہ رہی تو درجۂ چہارم میں وہ خط نویسی پر اچھا قابو پا سکتا ہے اور درجہ پنجم میں آسان مضمون نویسی بھی آسکتی ہے، اس کے بعد سلسلہ برقرار رہا اور رہنمائی واصلاح کا عمل جاری رہا تو عالمیت یا درجہ سادسہ تک وہ قابل ذکر مضمون نگار بن سکتا ہے۔

لیکن وہی عمل جو پرائمری درجہ سوم میں ہونا تھا درجۂ عالمیت میں شروع ہوا اور محنت ومشقت جاری رہی تو امید ہے کہ فضیلت کے اختتام پر اس کا اردو املا صحیح ہو جائے گا اور کچھ اچھے جملے بھی لکھنے لگے گا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح لیتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوگی اور اگر اس کے کسی ہمسر یا ذرا سینئر نے از خود اصلاح دے دی تو ہو سکتا ہے کہ اس سے آمادۂ جدال بھی ہو جائے۔ ہاں! اگر اس میں فطری صلاحیت اخذ ونقد کی ہے تو برابر لکھتے پڑھتے کسی لائق ہو سکتا ہے بشرطیکہ صبر اور ہمت سے کام لے۔ سستی شہرت اور زیادہ مالی منفعت کے چکر میں نہ پڑے۔ پھر اس کے بعد اگر اس کے سینے میں قومی وملی خدمت کا جذبہ اور جماعتی منفعت کے لیے کام کا حوصلہ ہے تو وہ بہت سے میدانوں میں اچھے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔

سوال نمبر ۳: دینی رسائل وجرائد بہت کم تعداد میں نکلتے ہیں اور جو نکلتے ہیں ان میں بیشتر بند ہو جاتے ہیں یا غیر معیاری اور فرسودہ مضامین اور مقالات کی اشاعت کے شکار اور عصر جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے اور عصری تعلیم یافتہ حضرات کو متاثر بھی نہیں کر پاتے۔ اس سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اس کے بہت سے اسباب ہیں:

اولاً: رسائل وجرائد کا معاملہ کتابوں سے مختلف ہے۔ کتاب چھپنے کے بعد دس پانچ سال تک اصل قیمت پر بلکہ نرخ بڑھنے کی صورت میں زیادہ قیمت پر نکلتی رہتی ہے۔ اور اس لیے متروک نہیں ہوتی کہ یہ سال دو سال پہلے کی چھپی ہے مگر اخبار جس دن کا ہے اس دن نہ نکل سکا تو دوسرے دن اسے کوئی پوچھنے یا خریدنے والا نہ ہوگا، رسالہ جس ماہ کا ہے اس ماہ کے اندر نہ نکل سکا تو اگلے ماہ وہ اصلی قیمت پر ہرگز نہ نکل سکے گا خواہ کتنے ہی مفید یا قیمتی مضامین پر مشتمل ہو۔ کبھی کبھی بعض لائبریریاں یا بعض اشخاص کسی اہم رسالے کی پوری فائل جمع کرنا چاہتے ہیں اور زیادہ قیمت پر لینے کو تیار ہو جاتے ہیں ایسی صورت کم آتی ہے اور ایسے افراد بھی کم سے کم تر ہوتے ہیں، اس لیے رسالہ نکلنے کے معاملہ میں یہ استثنائی صورت قابل ذکر نہیں۔

ثانیاً: کتاب کی ایک بار عمدہ ترتیب وکتابت ہوگئی۔ اسی کا عکس بار بار چھپتا رہتا ہے، رسالے میں یہ بات نہیں ہوتی۔

ثالثاً: ہر ماہ رسالے کے اندر وقت اور حالات کے لحاظ سے مناسب مضامین شامل کرنا ضروری ہوتا ہے اس لیے مدیر خود لکھے یا دوسرے قلمکاروں سے لکھائے یا کہیں سے اخذ وانتخاب کرے۔ بہر حال نئی کاوش اور نئی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

رابعاً: رسالے کا انحصار اس کے مضامین میں دلچسپی اور قارئین کی کثرت پر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے ذوقِ عوام کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اب عوامی ذوق کا جائزہ لیجئے تو افسانے، ناول، دلچسپ کہانیوں اور عریاں تصویروں کی رغبت زیادہ ملے گی۔ اسی لیے آزاد رسائل بڑی تعداد میں ریلوے بک اسٹالوں اور کتب فروشوں کے یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ اور اردو کے مقابلہ میں ہندی یا انگریزی کے رسائل زیادہ نکلتے ہیں، اردو پڑھنے والوں کی تعداد اس ملک میں کم ہے۔ اور مذہبی وشرعی دلچسپی رکھنے والے کم سے کم تر ہیں۔ اس لیے دینی خصوصاً اہم تحقیقی وعلمی رسائل کے خریداروں کی فراہمی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ ایسے جو رسائل عرصۂ دراز سے نکل رہے ہیں وہ اپنا خرچ خود نہیں پورا کرتے بلکہ کسی ادارہ سے ان کی کفالت ہوتی ہے اور تعداد اشاعت بھی بہت کم ہے مگر یہ طے کر رکھا ہے کہ اشاعت کم سے کم تر سہی ہم اسی معیار کے ساتھ اسے جاری رکھیں گے۔ وہ چند اہل علم واہل تحقیق کے استفادہ کو لاکھوں عوام کی خریداری پر ترجیح دیتے ہیں۔

خامساً: صحافت ایک فن ہے، اس میں زبان وبیان پر قدرت اور علمی تنوع کے ساتھ حالات سے باخبری بہت ضروری ہوتی ہے۔ خصوصاً یہ لحاظ رکھنا کہ بات کس پیرایے میں بیان کی جائے کہ لوگ دلچسپی سے پڑھیں، سرخیاں کیسی ہوں کہ قارئین فوراً متوجہ ہوں، مضمون کی ابتدا کیسی ہو کہ آگے دیکھنے کا اشتیاق برانگیختہ ہو، انتہا کیسی ہو کہ قاری کے ذہن پر اس کی یاد اور اس کا تاثر آئندہ بھی باقی رہے۔ جن رسائل میں ان امور کا لحاظ نہ ہوگا وہ زیادہ دن نہ چل سکیں گے۔

رہ گیا عصری تعلیم یافتہ افراد کو متاثر کرنا تو میرے خیال سے ان کو مطمح نظر بنا کر کوئی رسالہ جاری ہی نہیں ہوا، بالعموم سنی عوام وخواص کی افتادِ طبع کے لحاظ سے رسائل جاری ہوئے، ایک ہی رسالہ سب کے مزاج ومعیار کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ تعلیم یافتہ افراد کی جستجو اور مزاج کو سامنے رکھ کر کوئی رسالہ جاری ہو اور اس کے لیے اخراجات کا کوئی مسئلہ سامنے نہ ہو بلکہ ہزار پانچ سو افراد پر قناعت کے ساتھ بھی وہ چل سکتا ہو تو ناکام نہ ہوگا۔ فہم عوام سے قریب کرنے کے لیے زبان سہل وآسان اور طرز تفہیم دلچسپ رکھا جائے تو بہت سے عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے اور اس کی تعدادِ اشاعت بھی کچھ زیادہ ہو جائے گی، مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے علمی وتحقیقی رسائل میں یہ بات شاید و باید ہی ملے گی۔

مختصر یہ کہ بیشتر رسائل وقتی جوش وجذبہ کے تحت جاری ہوگئے، صحافت کے شرائط ملحوظ نہ رکھے گئے نتیجۃً ناکامی کا سامنا ہوا۔

یہ امر سنی رسائل ہی کے ساتھ خاص نہیں دوسرے شخصی رسائل کا بھی انجام ایسا ہی ہوا البتہ جو کسی ادارہ سے منسلک ہیں اور ان کے لیے مناسب افراد رکھنے کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ جاری ہیں۔

سوال نمبر۴: اہل سنت وجماعت کے مخالفین کی ایک بڑی تعداد اس دنیا میں موجود ہے، مگر کیا بات ہے کہ ہمارے مدارس سے بدمذہبوں کے علاوہ متشدد ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کے اعتراضات اور پروپیگنڈوں کے جوابات دینے والے نہیں نکلتے۔ ہماری پوری طاقت داخلی اختلافات میں صرف ہو جاتی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خارجی فرقوں سے مقابلہ کے لیے چند افراد بھی مشکل سے ملتے ہیں۔ اس تعلق سے آپ کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: اسے ایک مثال سے آپ سمجھیں۔ ایک آگ وہ ہے جو گھر کے اندر پہنچ گئی ہے اور نہ بجھائی گئی تو پورے گھر اور مال ومتاع کی بربادی یقینی ہے۔ ساتھ ہی ایک آگ باہر فاصلے پر لگی ہوئی ہے جو گھر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے مگر پہنچ نہیں پاتی۔ بارہا کسی آندھی یا بارش کی وجہ سے بجھ بھی جاتی ہے پھر بڑی محنت ومشقت سے تازہ کی جاتی ہے۔ آپ کے سامنے ایسی صورت حال پیدا ہو تو آپ گھر کے اندر کی آگ بجھانے پر توجہ دیں گے یا باہر کی آگ بجھانے پر اپنی توانائی صرف کریں گے؟

فرق باطلہ کی آگ ہر مسلمان کے گھر میں یا اس کے دروازہ تک پہنچ گئی اس لیے ہر شخص اس کو بجھانے میں لگ گیا۔ بجھانے والے اور بجھانے کی طاقت رکھنے والے افراد بھی کم ہیں، اتنی بڑی تعداد نہیں کہ اندرونی وبیرونی دونوں محاذ پر لگ سکے اس لیے زیادہ خطرناک اور زیادہ مضر پر توجہ مرکوز ہونا ایک فطری امر ہے۔

البتہ آگ لگانے والوں کے پاس تعداد بھی زیادہ ہے، وسائل اور توانائیاں بھی زیادہ ہیں، مکائد اور ہلاکت خیز منصوبہ بندی کی بھی صلاحیت ہے۔ اس لیے انھوں نے کچھ لوگوں کو گھروں کے اندر آگ لگانے پر مامور کر رکھا ہے، کچھ کو دور فاصلہ پر لگا رکھا ہے کہ اتفاقاً اگر اس طرف کوئی آجائے تو وہی نشانہ بن جائے۔

الغرض قصداً بیرونی آگ سے اغماض نہیں ہوا ہے بلکہ اندرونی آگ نے بیرونی آگ کی طرف توجہ کی نہ مہلت دی، نہ ہی اس کی قوت فراہم ہو پائی۔

ہاں! اب اگر وسائل ساتھ دیں اور کچھ لوگ بیرونی محاذ کے لیے مختص ہو جائیں تو بہت اچھا ہے۔ اس کے لیے صحیح منصوبہ بندی، لائق افراد کی تیاری، ان کی مالی کفالت، کام کو فروغ دینے اور عالمی پیمانے پر کام کرنے کے لیے سرمایہ کی فراہمی سبھی امور پر نظر رکھنی ہوگی۔ سوچنے سے لے کر کرنے تک بہت مراحل ہیں سب کا حل اگر پہلے سے تیار نہ ہو تو قدم قدم پر رکاوٹ یا ناکامی کا سامنا ہو سکتا ہے۔

سوال نمبر۵: سیاست میں علما کی شرکت مفید ہے یا نہیں؟

جواب: میں سیاست میں علمائے اہل سنت کی شرکت کی سخت ضرورت محسوس کر رہا ہوں مگر ہر کام کے لیے کچھ لوازم اور شرائط ہوتے ہیں ان کی پابندی ضروری ہے۔

ایک سیاسی تنظیم ایسی ضرور ہونی چاہئے جس کے ارکان بیدار مغز، روشن خیال، جماعت کے لیے مخلص اور متحرک وفعال ہوں۔ اس تنظیم کا ایک منشور ہو، دفتر ہو، عملہ ہو، بجٹ ہو اور صوبائی وضلعی شاخیں ہوں تاکہ عوام تک اپنی آواز جلد سے جلد پہنچا سکیں اور ہر موقع پر ان کی مناسب رہنمائی کر سکیں۔

شرائط میں اہم شرط یہ ہے کہ اپنا تصلب اور تشخص برقرار رکھیں، کوئی غیر اسلامی یا غیر شرعی تجویز سامنے آئے تو حتی الامکان اسے روکنے یا اس کی اصلاح کے لیے کوشش کریں۔ مخالفین کی دسیسہ کاریوں اور ریشہ دوانیوں پر نظر رکھیں۔ انفرادی شرکت کے وہ فوائد نہیں جو تنظیم کے ہیں اور تنظیم کوئی امر محال نہیں۔ ہمت، اخلاص، اور محنت کی ضرورت ہے۔

سوال نمبر۶: مدارس کے فارغین معاشی طور سے پریشان رہتے ہیں۔ اس کا کیا علاج ہے؟

جواب: معاشی پریشانی فارغین مدارس ہی کا خاصہ نہیں، آپ نے شاید ملازمتوں کے لیے انٹرویو کے مواقع پر بی۔اے، ایم۔اے کی ڈگریاں رکھنے والوں کی قطاریں نہیں دیکھیں۔ گورنمنٹ ملازمتوں کو تو چھوڑیئے پرائیویٹ مدرسوں کے پرائمری درجات کی معلمی کے امیدواروں میں آپ عصری درس گاہوں کے فارغین کی تعداد زیادہ پائیں گے۔ جب کہ بے شمار علما کو آپ خوش حال، فارغ البال یا کم از کم اپنی ضروریات کا کفیل دیکھیں گے۔

معاشی خوش حالی یا بدحالی کا انحصار تعلیم پر نہیں، ملک کی اکثریت عصری ودینی دونوں تعلیموں سے خالی ہے پھر بھی اس میں بڑے بڑے اہل ثروت موجود ہیں، متوسط الحال بھی ہیں، بدحال بھی، ہاں بڑی بڑی ڈگریوں والے عموماً کسی اچھی ملازمت سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور اچھی صلاحیتوں کے لیے جگہیں بالعموم فراہم ہو ہی جاتی ہیں البتہ بی۔اے، ایم۔اے کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور صلاحیت کمزور ہے تو کیسی بھی ڈگری ہو معیاری جگہوں کے لیے ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔

خیانت کار افسروں کے یہاں خصوصی تعلقات اور رشوت کے ذریعہ نااہلوں کو ضرور کامیابی مل جاتی ہے مگر کچھ ایسی بھی جگہیں ہوتی ہیں جن کے لیے صلاحیت ہی کارگر ہو پاتی ہے۔

فارغین مدارس میں بھی جو اچھی صلاحیت رکھتے ہیں ان کو خوش آمدید کہنے والے بہت ہوتے ہیں اور وہ بڑی عزت کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتے ہیں مگر جس نے تحصیل علم کا قیمتی زمانہ بڑی بے دردی کے ساتھ لہو ولعب میں برباد کیا ہو وہ اگر فراغت کے بعد پریشان حال نظر آیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ علاج یہ ہے کہ طالب علم اپنے مستقبل پر نظر رکھے اور جس میدان کو اپنانا چاہتا ہے اس میں امتیاز واختصاص پیدا کرنے کے لیے دور طالب علمی سے ہی جدوجہد شروع کر دے، وقت کبھی برباد نہ کرے نہ ہی محنت سے جی چرائے۔ اگر اس طرح کی پابندی کر لی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مستقبل میں پریشان حال نظر آئے یا اس کی کوششیں رائیگاں چلی جائیں۔

سوال نمبر۷: مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ جب یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں تو کیا بات ہے کہ وہ مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی مذمت کرتے ہیں اور یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے اتنا وقت بیکار کر دیا، منطق و فلسفہ کے تو وہ بے حد مخالف نظر آتے ہیں۔

جواب: یہ تو انھیں سے پوچھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نئے ماحول سے ان کی مرعوبیت کا نتیجہ ہو یا مغرب کی اس دسیسہ کاری کا حصہ جس نے ساری ملازمتوں کی بنیاد عصری تعلیم کو قرار دے کر مدرسی تعلیم پر ایک ضرب کاری لگائی۔ ورنہ اسی تعلیم کی بنیاد پر بہت سے اعلیٰ عہدے انگریز دور حکومت کے شروع میں ملتے تھے اب دوسری کوشش یہ ہے کہ مدارس کی تعلیم کھوکھلی کر دی جائے، وہاں کے فارغین نہ مکمل عالم بن سکیں نہ اچھے گریجویٹ۔ اس لیے اب بے شمار مضامین اور مذاکرات مدارس کو روزی روٹی سے جوڑنے کے لیے ہو رہے ہیں۔ اور یہ امر قطعیات یا کم از کم مسلمات سے ہو گیا ہے کہ جس نے مدرسہ کی تعلیم حاصل کی وہ بھوکوں مرا اور جس نے عصری تعلیم حاصل کی وہ دنیا کی جنت ہی جنت میں رہا۔ حقیقت سے اس کا واسطہ ہو یا نہ ہو لیکن پروپیگنڈا اتنا زور دار ہے کہ اس کی بازگشت خود مدارس کے فارغین سے سنی جارہی ہے۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں، بہت سے وہ ہیں جو یونیورسٹی میں پہنچ کر بھی مدرسہ کی تعلیم پر فخر کرتے ہیں اور اسی تعلیم کی بنیاد پر وہاں نمایاں مقام حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے وہ بھی ہوں گے جو مدرسہ میں رہ کر بھی یہ سوچتے ہوں گے کہ افسوس مجھے ذرائع میسر نہ ہوئے ورنہ میں مولوی بننے کے بجائے گریجویٹ بنتا، کرتے پاجامے کی جگہ پینٹ شرٹ سے آراستہ ہوتا، داڑھی بڑھانے کے بجائے روزانہ اس کا صفایا کرتا، بوسیدہ درس گاہ کے فرش و مسند کی جگہ کسی بنگلے میں جج یا کلکٹر کی کرسی پر رونق افروز ہوتا۔

اس میں مغربی تعلیم سے زیادہ مغربی تہذیب سے محبت کار فرما ہے۔ جس کا یقین اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب پر کمزور ہو، جس کے دل میں مغربی تہذیب سے مرعوبیت جاگزیں ہو اس کے خیالات اس طرح کے ہو جائیں تو بعید نہیں۔ ایک مسلمان کا یقین اس بات پر راسخ ہونا چاہیے کہ اس کے لیے دین، دینی تعلیم، دینی تہذیب بہر حال ضروری اور دنیا و آخرت میں نفع بخش ہے۔ رہ گیا معاش کا مسئلہ تو رزاق رب تعالیٰ ہے، وہ بے علم کو دولت کی فراوانی دیتا ہے تو پھر عالم دین اس کی رحمت سے ناامید کیوں ہو؟ بالفرض اسے چند روزہ دنیا کی آسائش نہ ملی تو آخرت کی دائمی آسائش تو اس کا مقدر ہے۔ جس کے مقابلے میں ہفت اقلیم کی بادشاہت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

سوال نمبر۸: حکومت ہند ایک خطیر رقم اردو زبان و ادب کے فروغ پر صرف کرتی ہے، تقریباً سبھی ریاستوں میں فروغ اردو کے لیے سرکاری تنظیمیں قائم ہیں جہاں سے اردو رسائل و جرائد نکلتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ اپنے لوگ ادھر توجہ نہیں دیتے؟

جواب: یہاں وجہ پوچھنے کی ضرورت نہیں، کوئی شخص اگر اثر اور صلاحیت رکھتا ہے تو اسے آگے بڑھ کر حصہ لینے کی ضرورت ہے۔

سوال نمبر۹: مسلم پرسنل لا بورڈ میں اپنے لوگ برابر کے شریک رہے پھر نامزد ممبران کی وفات کے بعد کوئی دوسرا ان کی جگہ نہ آیا۔ آخر ایسا کیوں؟

جواب: مسلم پرسنل لا بورڈ قاری طیب مہتمم دار العلوم دیوبند اور ان کے چند رفقا نے قائم کیا۔ صرف ایک سنی عالم کو نائب صدر کی جگہ نامزد کیا، جس کا دو مقصد تھا ایک حکومت کو یہ بتانا کہ اس میں تمام مسلم جماعتوں کی شرکت ہے، دوسرے اس نام کے ذریعہ سنی عوام کو اپنے قریب کرنا۔ ایسے ہی دو رخے فوائد ملحوظ رکھ کر وہ اپنی بہت سی مجلسوں اور جلسوں میں سنی علما کے نام دکھاتے ہیں۔
اہل سنت کو خود سیاسی و مذہبی تنظیمیں قائم کر کے عوام کی نمائندگی و رہنمائی کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسروں سے یہ شکوہ ہی فضول ہے کہ انھوں نے اپنی تنظیم میں ہمیں کما حقہ جگہ نہ دی۔

سوال نمبر۱۰: مدارس کے فارغین جو تحقیق و ریسرچ کے لیے یونیورسٹیوں کا رخ کرنا چاہتے ہیں مگر معاشی حالات سے مجبور ہوتے ہیں ایسے طلبہ کے وظیفہ وغیرہ کا انتظام ہو جائے تو ان طلبہ کی بڑی تعداد یونیورسٹیوں میں جا سکتی ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

جواب: وظائف کے حاجت مند تو ہر معیار کے ملیں گے بعض وہ ہیں جو دینی تعلیم کے لیے بھی وظائف کے محتاج ہیں۔ بعض حضرات ان کی کفالت بھی کرتے ہیں۔ عصری تعلیم کے لیے بھی کچھ ایسا معاملہ ہے۔ مگر کوئی باضابطہ اور منظم طور پر انتظام نہیں۔ لوگ متوجہ ہوں تو بڑی اچھی بات ہے۔

سوال نمبر۱۱: مصنفین کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ کتاب کی اشاعت کا ہوتا ہے جو لوگ صاحب اثر ہوتے ہیں وہ تو خود اکیڈمی قائم کر لیتے ہیں یا کسی صاحب ثروت کے ذریعہ اپنی کتاب شائع کرا لیتے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ جو ان میں سے کچھ بھی نہیں کر سکتے وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر نہیں کر پاتے۔ اس کے لیے کوئی صورت آپ کے پاس ہے؟

جواب: یہ دشواری ہمیشہ پیش آتی رہی ہے مگر اہل قلم نے اس کا حل بھی تلاش کیا ہے، مثلاً پہلے انھوں نے معروف رسائل و جرائد کو دیکھا، ان کا مزاج اور معیار پہچانا اور ایسے مضامین لکھے جو ان کے لیے باعث کشش ہوں۔ چنانچہ اعزاز کے ساتھ وہ شریک اشاعت ہوئے۔ اس طرح مضمون نگار اپنے خاص اسلوب تحریر اور انداز فکر کے ساتھ متعارف بھی ہو گیا اور جب اس نے کوئی کتاب لکھی تو ناشرین اس کی اشاعت کے لیے تیار بھی ہو گئے۔ اپنی تحریر اولاً دل کش، مفید اور مؤثر بنانا ضروری ہے۔ پھر اشاعت کی دشواری نہ ہوگی۔ غلطی یہ ہے کہ ابتدا میں ہی آدمی

اپنے کو کامل سمجھنے لگے اور جو کچھ لکھ دے چاہے کہ خواہ مخواہ لوگ اسے قبول بھی کریں۔

سوال نمبر ۱۲: تحریک دعوت اسلامی کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: میں اسے مفید اور ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر اس میں کچھ خامیاں ہوں تو اصلاح کی جائے۔ تحریک دعوت ہی کو مسترد نہ کیا جائے۔ جو لوگ انتہا پسندی کے ساتھ اس کی مخالفت کر رہے ہیں ان سے سوال یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کا سیلاب جو ہماری اچھی اچھی آبادیوں کو نگلتا جا رہا ہے اس پر بند باندھنے کا آپ نے کیا انتظام کیا؟ اس پر روک لگانے اور بھولے بھالے سنیوں کو بچانے کا آپ کے پاس کیا فارمولا ہے اور کیا عمل ہے؟ مگر وہ اس کا کوئی جواب نہ دیں گے اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا فرض صرف اپنوں کی مخالفت ہے، غیروں کے سیلاب سے قوم کا تحفظ کسی اور کی ذمہ داری ہے۔ جو شاید آسمان سے نازل ہوگا یا قیامت گذر جانے کے بعد پیدا ہوگا۔

سوال نمبر ۱۳: کوئی بھی اچھی تحریک اٹھتی ہے تو اس کے مخالفین پیدا ہو جاتے ہیں اس کا اصل سبب کیا ہے؟

جواب: اس کا سبب میری تمہید میں گذر چکا۔

سوال نمبر ۱۴: اہل سنت و جماعت کے تصنیفی و اشاعتی تعطل کو ختم کرنے اور کتابوں کی تصنیف و اشاعت کی غرض سے آج سے ۳۶ سال قبل آپ حضرات نے "المجمع الاسلامی" قائم فرمایا تھا مگر اس کی ترقی میں اتنی تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟

جواب: ترقی اور کامیابی کس چیز کا نام ہے، ایک اشاعتی و تصنیفی ادارہ سے آپ کیا توقع رکھتے ہیں؟ کیا "المجمع الاسلامی" کے زیر اہتمام جو کتابیں لکھی گئیں اور کتابیں شائع ہوئیں وہ کسی خانے میں رکھنے کے لائق نہیں؟ تدوین قرآن، فضائل قرآن، اسلام اور امن عالم جیسی جامع کتابیں دوسروں کے پاس بھی نہیں۔ امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات، حدوث الفتن اور تحقیقِ جد الممتار وغیرہ کو اس دور کے اہم معیاری کاموں میں جگہ دینی چاہئے مگر دوسروں سے کیا گلہ جب اپنوں ہی کو اپنے کام کی حیثیت کا علم نہیں۔ اس کا اپنا کام تو اپنی جگہ ہے اس کے ذریعہ ایک فکری و تحریری انقلاب بھی برپا ہوا ہے اور اس ایک چراغ سے بہت سے چراغ جلے ہیں۔ یہ سب بھی نظر میں رکھنا چاہئے۔ شاید آپ المجمع الاسلامی کی کارکردگی سے پورے طور پر واقف نہیں اس لیے آپ نے یہ سوال کر دیا۔ وسائل کی کمی ضرور ہے اور اس کے متعدد اسباب ہیں۔ اسے کوئی ملکہ بھوپال یا ریال و ڈالر میسر نہیں نہ اس کے ارکان میں کوئی ایسا پیر یا خطیب ہے جس کی ایک آواز پر بہت سے اہل ثروت کی تجوریاں کھل جائیں۔ ادارہ بھی وہ نہیں جسے عام طور سے مستحق سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً مسجد اور مدرسہ کو تو عوام جانتے ہیں مگر تصنیفی و اشاعتی ادارہ کیا ہے؟ تصنیف و اشاعت کیا ہے؟ اور اس راہ کی ضروریات کیا ہیں؟ اس سے وہ نابلد ہیں، عوام ہی نہیں بیشتر خواص کو بھی اس کا نہ کوئی تجربہ ہے نہ آشنائی۔ جیسا کہ عموماً بات چیت سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ مگر ہمیں ان سب کا شکوہ نہیں، شکوہ اپنی عدیم الفرصتی کا ہے کہ سب کو سمجھانے کے لیے ہمارے پاس کما حقہ نہ وقت ہے نہ ذرائع۔ واللہ ولی التوفیق.

سوال نمبر ۱۵: مدارس کے نصاب تعلیم میں ترمیم سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: نصاب تعلیم میں ترمیم کی گنجائش ہے اور کافی ترمیم ہو چکی ہے، لیکن اب بھی کالج، یونیورسٹی کے بعض فضلا یہی شور مچا رہے ہیں کہ مدارس میں دو سو سال پرانا نصاب جاری ہے اس میں عصری علوم کی شمولیت بالکل نہیں۔ منطق و فلسفہ کی کتابوں کا انبار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس کام کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے کہ مدارس اور ان کے نصاب کو ہمیشہ اپنی تردید کا نشانہ بناتے رہو۔ اس میں جو صالح مواد ہیں یا جو اصلاحات ہوں ان کا ذکر نہ کرو۔ ہمیشہ کوئی ایسی بات زیادہ سے زیادہ موثر انداز میں سامنے لاؤ جس کے باعث مدارس سے دوری اور نفرت میں اضافہ ہو۔ وہ یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ مدارس میں عصری علوم داخل کیے جائیں مگر یہ بولنے کی ضرورت کبھی نہیں سمجھتے کہ کم از کم مسلم اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کو داخل کیا جائے۔ یا ایسے ادارے قائم کر کے نہیں دکھاتے جن کے تعلیم یافتہ افراد تفسیر، حدیث، عقائد و کلام، فقہ و اصول فقہ اور اردو و عربی زبان و ادب میں مہارت کے ساتھ عصری علوم کی بھی تمام اصناف میں ماہر کامل ہوں۔ صرف مشورے دینا کافی نہیں، کسی کو آگے بڑھ کر عملی نمونہ بھی پیش کرنا چاہیے۔

ہمارے نصاب کی بنیاد اس پر ہے کہ طالب علم کو قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ اور عقائد و کلام میں مہارت حاصل ہو۔ یہ عربی زبان میں مہارت کے بغیر ممکن نہیں۔ اور عربی زبان میں مہارت کے لیے نحو، صرف، ادب اور بلاغت کی تعلیم ناگزیر ہے۔ عقائد و کلام کے لیے منطق لازمی یا مفید ضرور ہے۔ فلسفہ کی کتابیں اکثر خارج ہو چکی ہیں۔ دو تین کتابیں بعض فوائد و مصالح کے پیش نظر باقی ہیں۔

فارسی زبان کی تعلیم اس خصوص میں ضروری نہیں مگر اب تک وہ اکثر مدارس میں درج ذیل فوائد کے تحت تھوڑی ہی سہی مگر باقی ہے۔

(۱) آج بھی اردو زبان میں بیش تر الفاظ اور ترکیبیں فارسی کی موجود ہیں۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھ لینے کے بعد ان الفاظ و تراکیب کے سمجھنے میں دقت نہیں رہ جاتی۔ جب کہ اس سے بالکل نابلد رہنے میں بہت سی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔

(۲) اسلامیات اور ادبیات کا ایک بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں ہے۔ اس سے استفادے کے لیے اس زبان سے آشنائی ضروری ہے۔

(۳) عربی قواعد، طب، ہیئت، تاریخ وغیرہ کی بعض اہم اور عمدہ کتابیں فارسی میں ہیں۔ فارسی پڑھ لینے کے بعد ان سے استفادہ کی راہ کھل جاتی ہے۔

اب آپ ہمارے نصاب کا جائزہ لیں توان خطوط سے باہر نظر نہ آئے گا۔ رہ گئے عصری علوم توابتدائی حساب، سائنس، جغرافیہ، ہندی وغیرہ کی تعلیم پرائمری درجات میں ہوجاتی ہے۔ مزید برآں کچھ حساب کی تعلیم اعدادیہ میں بھی موجود ہے۔ تاریخ ہند، تاریخ اسلام، سیرتِ نبوی، سیرتِ خلفا، مبادی سیاسیات، دستور ہند، دنیاکی حکومتیں، جدید علم سائنس وغیرہ بھی شامل نصاب ہیں۔ درجہ ہشتم تک کی انگریزی لازم ہے۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی انگریزی بطور اختیاری مضمون داخل ہے۔ اور ان سب کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے، امتحانات ہوتے ہیں، انشااور مضمون نگاری کی خاصی مشق کرائی جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود پروپیگنڈا یہی ہے کہ مدارس میں عصری علوم کی شمولیت بالکل نہیں اور کتب عقلیہ کاایک انبار لگاہوا ہے۔ مدارس اپنی افادیت کھوچکے ہیں۔ اتنے سے بھی تسکین نہیں ہوتی تواس کے ساتھ روزی روٹی کامسئلہ بھی جوڑ دیتے ہیں اور یہ زبان پر نہیں لاتے کہ لاکھوں گریجویٹ وہ ہیں جن کو کوئی بافراغ ملازمت حاصل نہیں، کسی طرح معمولی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہزاروں وہ ہیں جو اغوا، پاکٹ ماری، چوری، رہزنی، نیتاؤں کی کاسہ لیسی کے ذریعہ اپناپیٹ پال رہے ہیں۔ ان کو اپنے شاگردوں کی فکر نہیں۔ بس فارغین مدارس کے غم میں گھلے جارہے ہیں۔

خیر! ترمیم و اصلاح بڑی حد تک ہوچکی ہے۔ رہ گئی مزید اصلاح وتنقیح اور ترمیم کی بات تو یہ بہت غور طلب مسئلہ ہے۔ اولاً بہت سی کتابیں وہ ہیں جن کابدل موجود نہیں۔ اور ان کو باقی رکھناضروری ہے۔ مثلاً ترجمۂ قرآن، صحاح ستہ، ہدایہ وغیرہ۔ ثانیاً بعض قابل تبدیل کتب کابدل داخل ہوچکا ہے۔ ثالثاً بعض کتابوں میں کلی یاجزوی ترمیم کی ضرورت ہے۔

مگر ہندوستانی مدارس کا معاملہ غیر ہندوستانی مدارس اور عصری جامعات سے مختلف ہے۔ بیشتر ممالک میں وزارت تعلیم کے تحت نصابی کتب تیار ہوتی ہیں اور ان کے لیے بھاری تنخواہوں پر ایک اچھاخاصا عملہ بارہ مہینے موجود رہتا ہے۔ ترمیم کی ضرورت نہ ہو پھر بھی اسے کچھ نہ کچھ ترمیم کرکے اپنی تنخواہ کا استحقاق ظاہر کرنا ہے، جب کہ مدارس ہند کو کسی حکومت کی جانب سے ایسی کوئی سرپرستی حاصل نہیں۔ نصابی کتب تیار کرنا کوئی ایساآسان کام بھی نہیں کہ کسی نوفارغ یاکم سواد کو چار پانچ ہزار روپے ماہانہ دے کر اطمینان کرلیاجائے کہ وہ مطلوبہ معیار پر کام کرکے دکھادے گا۔ بڑے بڑے ماہر مدرس بھی جن کو لکھنے اور نصاب سازی کی خاصی مہارت نہ ہو اس میدان میں ناکام ہوجائیں گے۔ کچھ لوگ ہر طرح لائق اور اہل ثابت ہوگئے تو مدارس کے ذمہ داران نے ان کے سراتنے کام لگارکھے ہوں گے کہ اس کام کے لیے خالی کرنے میں یہ محسوس کریں گے کہ ہماراادارہ ہی تباہ ہوجائے گا۔

پھر نصاب تیار ہوجانے کے بعد اس کی صحیح کتابت، طباعت اور اشاعت کا مسئلہ اپنی جگہ ہے۔ ناشرین جانتے ہیں کہ عربی درسیات کی رفتارِ اشاعت کیا ہے؟ بہر حال یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا عموماً وہ لوگ سمجھتے ہیں جن کو اس

طرح کا کوئی تجربہ نہیں۔

تاہم انفرادی طور پر بہت کچھ ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں مناسب صورتوں کی تلاش بھی جاری ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان.

سوال نمبر ۱۶: طلبۂ اسلام کے لیے آپ کے کچھ ارشادات؟

جواب: طلبہ سے متعلق بہت سی باتیں گذر چکیں، ان سے وہ بہت کچھ اخذ کرسکتے ہیں، تاہم آپ کے سوال پر مزید کچھ بیان کرتا ہوں۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ اپنے اوقات اور اپنی تعلیم کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ ابتدائی کتابوں پر عبور حاصل نہیں کرتے جس کے باعث انتہا تک کمزور رہتے ہیں یا بار بار ناکام ہوتے ہیں اور تعلیم ہی سے خاطر برداشتہ اور متنفر ہوجاتے ہیں۔ کچھ امتحان میں ۳۳ فیصد حاصل ہونے اور اگلے درجہ میں ترقی پانے کی حد تک کوشش کرتے ہیں مگر بنیادی کتابوں سے متعلق جن کی معلومات کا ۲/۳ حصہ غائب ہو اور امتحان پاس کرلینے کے بعد ۱/۳ بھی غائب ہوجائے، آئندہ کے لیے ان کی دشواری، انتہائی کمزوری بلکہ ناکامی محتاج بیان نہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ابتدا میں عقل ناپختہ ہوتی ہے۔ محنت سے نفرت، کھیل سے رغبت، فضولیات سے الفت ہوتی ہے۔ اور جب شعور بیدار ہوتا ہے وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ طلبہ کی اکثریت اسی ایک سبب کے باعث کمزور یا بیکار ہو رہی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ابتدائی تعلیم چھوٹے مدارس میں اساتذہ کی سخت نگرانی کے ماحول میں ہو کہ طلبہ نہ چاہتے ہوئے بھی پڑھنے اور لیاقت پیدا کرنے پر مجبور ہوں تو یہ زیادہ کار آمد اور مفید ہوگا۔ بنیاد ٹھوس اور مضبوط ہوگئی تو آگے کے ہر قفل کی کنجی ہاتھ آگئی۔

باشعور اور ہوش مند طلبہ سے متعلق عرض یہ ہے کہ ان کو اپنی نصابی کتب پر عبور کے ساتھ کچھ اور ہمت کرنے کی ضرورت ہے۔

(ا) مثلاً ہمارے یہاں درجۂ خامسہ سے فضیلت تک ادب عربی یا انگریزی میں سے ایک ہی لازم ہے۔ دونوں کو اب تک اس خیال سے لازم نہ کیا جاسکا کہ طلبہ پر بار زیادہ ہوجائے گا اور وہ سنبھال نہ سکیں گے۔ مگر دونوں کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جو طلبہ عربی ادب کا نصاب مکمل نہیں پڑھتے وہ حدیث، سیرت و تاریخ اور دوسرے فنون کی بہت سی کتابوں کے بہت سے مقامات حل نہیں کرپاتے یا بہت مشکل سے سمجھ پاتے ہیں جب کہ مکمل ادب پڑھے ہوئے طلبہ اول نظر میں انھیں سمجھ لیتے ہیں۔

دوسری طرف جو انگریزی نصاب مکمل نہیں کرتے انگریزی کتب و رسائل سے استفادہ سے قاصر رہتے ہیں۔ تاہم تو وہ بھی رہتے ہیں جو نصاب ہی کی حد تک محدود رہتے ہیں اور مطالعہ کے ذریعہ علم زبان کے فروغ کی طرف

متوجہ نہیں ہوتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جنھوں نے انگلش بک III کے آگے کچھ دیکھا ہی نہیں وہ زیادہ عاجز ہوں گے۔ اس لیے باہمت طلبہ کو میرا مشورہ یہ ہے کہ درس میں اگر چہ کسی ایک زبان کو رکھیں مگر خارجی کسی بھی ذریعے سے دوسری زبان کی بھی تکمیل کریں اور دونوں زبانوں سے متعلق غیر نصابی کتب ورسائل کثرت سے دیکھیں اور لکھنے اور بولنے کی بھی خوب مشق کریں اس طرح وہ بہت کار آمد انسان بن سکتے ہیں۔

(۲) عالم دین سے لوگ اپنے روز مرہ کے مسائل ضرور پوچھتے ہیں اور اسے خود اپنے عمل کے لیے بھی مسائل سے آگاہی ضرور ہے اس لیے ہر طالب علم کا فرض ہے کہ مکمل "بہار شریعت" کا مطالعہ ضرور کرے اور بار بار مراجعت کرتا رہے تاکہ ضروری مسائل ازبر رہیں۔

اسی طرح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے کلامی وفقہی رسائل ضرور دیکھے۔ ان میں وہ علمی خزانے ہیں جو کہیں اور شاید ہی دستیاب ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ کی کتابیں غور سے نہیں پڑھی ہیں ساری درسیات پڑھنے پڑھانے کے بعد بھی بہت سے مسائل میں ان کی سطحیت بالکل عیاں ہوتی ہے۔

(۳) تجوید و قرأت بقدر ضرورت، کم از کم صحتِ مخارج کے ساتھ قرآن کی قراءت ہر ایک پر فرض ہے اس سے کوئی طالب علم ہرگز عاری نہ ہو۔

(۴) حالات زمانہ سے آگاہی، مخالفین کی حرکتوں سے واقفیت کے لیے مختلف کتب و رسائل کا مطالعہ کرتا رہے۔ سیرت، تاریخ، حساب، جغرافیہ وغیرہ کی بنیادی تعلیم جو ابتدائی درجات میں شامل ہے مطالعہ کے ذریعہ ان میں اور وسعت پیدا کرے۔

(۵) کتب حدیث کی ایک محدود مقدار داخل نصاب ہے مطالعہ میں کم از کم پوری "مشکوٰۃ المصابیح" ضرور دیکھے۔

(۶) تدریس، تقریر، مناظرہ ہر ایک کا ملکہ پیدا کرے تاکہ وقت ضرورت عاجز نہ رہے اور اس کا دائرۂ کار بھی وسیع ہو۔ بعد میں اگر سارے کام بخوبی نبھالیتا ہے تو بہت خوب ورنہ جیسی ضرورت ہوگی ویسا کر سکے گا۔

(۷) تقریر و تحریر کے ذریعہ جو بھی بیان ہو اس کی اچھی طرح جانچ کر لی جائے کہ وہ صحیح و مستند ہے اس کا اصل اور قوی ماخذ ذکر میں نہ آئے تو بھی معلوم و محفوظ ضرور ہو۔ ورنہ نقل در نقل میں بہت سی ایسی باتیں بھی در آتی ہیں جو منطقی و عقلی اور شرعی اعتبار سے غلط ہیں یا غیر معتبر اور نا قابل بیان ہیں۔ تنقیدی و تحقیقی نظر پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔

(۸) زبان و بیان کی غلطیوں سے بھی اپنی تحریر و تقریر کو ہر طرح محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ میں نے آیت پڑھا، تم نے حدیث سنا، خدا کے احکامات، اس امر کی وجوہات، رسومات وغیرہ جیسی تراکیب و الفاظ سے بھی بچنا چاہئے۔ معطوف معطوف علیہ دونوں عربی یا فارسی یا ایک عربی اور ایک فارسی ہو تو حرف عطف "و" درست ہے مگر

کوئی ایک ہندی یا انگریزی ہو تو وہاں "و" کی بجائے اور ہونا چاہیے۔ اس طرح کی اور بھی چیزیں ہیں جو اس دور کے معروف قلمکاروں کے یہاں بھی در آئی ہیں۔ شاید کوئی بروقت ان کی اصلاح کرنے والا کوئی نہ ہوا۔ مبتدیوں کی غلطیاں تو بہت ہیں۔ انھیں اساتذہ سے معلوم کرنا چاہئے۔

بولنے اور لکھنے سے پہلے اپنے سامع و قاری کو متعین کریں اور وہ جس سطح کے ہوں اسی سطح کی گفتگو کریں اور زبان میں بھی اس کی رعایت کریں۔ مخلوط ہوں تو دونوں کی رعایت کریں۔ اخبار اور عوامی رسائل کے لیے زبان بہت آسان اور عام فہم ہونی چاہئے۔ ادبی رسائل کے لیے ادبی اور تحقیقی کے لیے تحقیقی۔ مگر مشکل الفاظ، پیچیدہ تراکیب، اور بہت خفی استعارات و کنایات سے احتراز ہر جگہ ضروری ہے۔

(۹) باہمی نزاعات سے دور رہیں اور کسی جگہ کوئی اختلاف رونما ہو تو اصلاح و مصالحت کی تدبیر کریں۔ دردمندی اور اخلاص سے کوشش ہوئی تو کامیاب ہو یا ناکام، اس کا اجر ان شاء اللہ ضرور ملے گا۔

(۱۰) دوسروں کی تنقیص، جماعت میں کام نہ ہونے کا ماتم، اپنی براءت کا اثبات اور دوسروں پر الزام آج کل ایک محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ حالاں کہ اس کا حاصل اپنوں سے بدگمانی اور تضییعِ اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہو سکے تو خود کچھ کریں یا جو لوگ کچھ کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

(۱۱) طالب علم اپنے افکار و خیالات، کردار و اخلاق، ہمیشہ پاکیزہ و بلند رکھے۔ پست حرکتوں کا خیال آنے پر بھی اپنا محاسبہ کرے، دین و سنت کی پابندی اور خدا و رسول کی اطاعت ہی میں دنیا و آخرت کا بھلا جانے، آزادوں کی آسائشوں اور رنگینیوں سے کبھی متاثر و مرعوب نہ ہو، نہ ہی ان کے حصول کی خاطر اپنے افکار و اخلاق کی دنیا تاراج کرنے کا خیال دل میں لائے، شریعت کی خلاف ورزی کو زہر قاتل یا آتش مہلک جانے، فرائض و واجبات کی پابندی میں عوام سے کمتر ثابت نہ بلکہ آداب و نوافل میں بھی ان کے لیے نمونہ اور مقتدا بنے۔

(۱۲) عمرِ انسانی چند روزہ ہے اور کام بے شمار لیکن رب تعالیٰ نے انسان میں قوت و استعداد بے پناہ رکھی ہے؛ قوت کو فعل کی منزل میں لانے کے لیے جد و جہد درکار ہے، آدمی کو چاہیے کہ خود کو زیادہ سے زیادہ کار آمد بنائے اور کسی بھی بڑے سے بڑے کام کو انجام دینے کی لیاقت اور حوصلہ پیدا کرے، رب تعالیٰ کی نصرت و حمایت کار ساز ہوگی، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی کسی خدمت پر نہ مغرور ہو نہ احساس کمتری کا شکار ہو کر دست کش ہو۔

(۱۳) کوئی اہم اقدام کرنا ہو، کوئی تنظیم یا ادارہ یا انجمن بنانی ہو تو لوگوں سے مشاورت ضرور کریں تاکہ بے خبری میں اقدام کے بعد رسوائی یا ناکامی کا سامنا نہ ہو۔ رائے دینے والوں میں کئی طرح کے لوگ ہوں گے:

(ا) زیادہ وہ ہوں گے جو آپ کا منصوبہ اور اس کی افادیت سننے کے بعد فوراً داد و تحسین سے نوازیں گے اور اپنی حمایت

کا یقین دلائیں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے سامنے صرف ایک رخ ہوگا، مضرت یا مشقت سے وہ نا آشنا ہوں گے۔

(۲) کچھ وہ تجربہ کار اور سن رسیدہ لوگ ہوں گے جو کام کی اہمیت، راہ کی دشواری، اور آپ کی کم سنی و نا تجربہ کاری دیکھ کر آپ سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھیں گے اور کسی طرح اپنے سر سے آپ کو ٹالنے کی کوشش کر لیں گے۔

(۳) کچھ وہ ہوں گے جو راہ کی مشکلات اور دشواریاں بتا کر آپ کو اس قدر سراسیمہ کر دیں گے کہ آپ اپنے منصوبہ سے دست بردار ہونے ہی میں ہر طرح کی عافیت محسوس کریں گے۔

(۴) کچھ وہ ہوں گے جو کام کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرنے کے ساتھ راہ کی مشکلات اور ان کا مناسب حل بھی بتائیں گے۔ یہی حضرات آپ کے لیے کار آمد ہوں گے جو بڑی مشکل سے ملیں گے۔

سب کی باتیں سننے اور نوٹ کرنے کے بعد آپ اپنے حالات اور اپنے امکانات کا بے لاگ جائزہ لیں، اگر مشکلات کو سر کرنے کے ساتھ کامیابی کی توقع راجح اور غالب نظر آئے تو اقدام کریں ورنہ وسائل اور امکانات پر قابو پانے تک ملتوی کریں یا کسی دوسرے رخ، دوسری صورت یا دوسرے کام پر غور کریں جسے آسانی یا دشواری کے ساتھ مکمل کر سکیں۔

اس پر یقین رکھیں کہ انسان حرکت و عمل ہی سے بقاے دوام پاتا ہے، اس لیے خود کچھ کرنے کی صورتیں سوچیں اور عمل میں لائیں۔ دوسروں کا محاسبہ، ان پر نقد و تبصرہ اور ان کی تنقیص کا کوئی خاص حاصل نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی شخص تھوڑا بھی دینی کام کر رہا ہے تو اس کی قدر کی جائے، صرف اپنے کام کی قدر اور دوسروں کے کام کی تحقیر ایک مذموم رویہ ہے جس سے بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ اس بارے میں حافظ ملت حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث مبارک پوری بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی ذات مشعل راہ ہے۔ وہ ہر عامی و عالم کی، جو کوئی ادارہ چلا رہا ہو یا کوئی بھی چھوٹی موٹی دینی علمی خدمت انجام دے رہا ہو، حوصلہ افزائی کرتے، کلمات خیر سے یاد کرتے، غائبانہ بھی اس کا اچھا تذکرہ کرتے جس کے باعث وہ اپنی خدمت میں اور مستعد ہو جاتا، اسے اور ترقی دیتا اور ملت کا فائدہ بہر حال ہوتا۔ وفقنا اللّٰہُ وإیاکم لمثلہٖ واللّٰہ ذو الفضل العظیم.

مسئلۂ اجتہاد و تقلید پر تحریری مکالمہ (۱)

سوال (۱):

قیاس و اجتہاد کی حقیقت کیا ہے؟ اور کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت کیوں پڑی؟

جواب:

قیاس کے لغوی معنی اندازہ کرنا اور برابری دکھانا اور فقہا کی اصطلاح میں قیاس یہ ہے کہ جو حکم کسی امر کے لیے کسی علت کی بنیاد پر نص سے ثابت ہے وہی حکم اسی علت کی بنیاد پر دوسرے ایسے امر کے لیے ثابت کرنا جس کے بارے میں نص وارد نہیں۔ اجتہاد کے لغوی معنی کوشش و محنت صرف کرنا اور فقہا کی اصطلاح میں فقیہ کا کسی حکم شرعی نظری کے استخراج کے لیے پوری طاقت صرف کرنا۔

کتاب و سنت سے بے واسطۂ قیاس استخراج احکام پر بھی اجتہاد کا اطلاق ہوتا ہے اور منصوص کی روشنی میں علت کی بنیاد پر قیاس کے ذریعہ غیر منصوص کا حکم نکالنے کو بھی قیاس کہا جاتا ہے۔

قیاس کے ارکان و شرائط کی تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، یہاں خاص طور سے بتانے کی بات یہ ہے کہ قیاس کسی ایسے ہی معاملہ میں ہو سکتا ہے، جس کا حکم کتاب و سنت میں صراحۃً بیان نہ ہوا ہو، ائمہ کرام نے قیاس سے اسی وقت کام لیا ہے جب کتاب و سنت، اجماع امت یا فقہاے صحابہ کے اقوال سے مسئلہ کا حل دست یاب نہ ہوا ہو۔

کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے قیاس و اجتہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف اصول و کلیات اور بعض جزئیات صراحۃً بیان ہوئے ہیں، اصول کی روشنی میں فروع کا بیان اور جزئیات کی تفصیل قرآن نے بیان رسول اور فکر مجتہدین کے سپرد کر دی ہے، ارشاد ہے: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (سورہ نحل۔ آیت ۴۴)" اور اے رسول ہم نے تم پر یہ ذکر نازل فرمایا تاکہ لوگوں کے سامنے تم اسے واضح کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور کہیں وہ خود بھی فکر کریں۔"

واقعہ بھی یہی ہے کہ احادیث کریمہ میں اگرچہ بے شمار احکام اور اصول و فروع کا ذکر ہوا، پھر بھی عہد صحابہ سے ہی روز بروز ایسے مسائل پیش آتے رہے جن کا جواب صحابہ کرام کو بھی حدیث نبوی میں نہ ملا اور قیاس و اجتہاد کا

(۱) ماہ نامہ جام نور، دہلی، اجتہاد و تقلید نمبر، اپریل ۲۰۰۷ء۔

سلسلہ جاری ہوا، یعنی منصوص کی روشنی میں غیر منصوص امور کے احکام کا استخراج ہونے لگا۔

سوال (۲):

مجتہدین کے مختلف طبقات کے کیا معنی ہیں؟ اور کیا آج بھی مجتہدین کا کوئی طبقہ موجود ہے؟

جواب:

ہر فقیہ کی علمی وسعت اور اجتہادی قوت یکساں نہیں، علمی صلاحیت اور احکام کے استخراج و بیان کے لحاظ سے فقہا میں فرق مراتب ہے، فقہا کے طبقات اور ان کی مثال میں فقہا کے نام ذکر کرتے ہوئے اسی فرق مراتب کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ ہمارے فقہائے کرام کی دیانت وامانت ہے کہ جو فقیہ جس درجے کا تھا، اسی حد پر رہ کر اس نے اپنا کام کیا اور بعد کے فقہا نے اس فقیہ کے کام کی نوعیت اور اس کا دائرۂ عمل دیکھ کر اس کے مرتبے کا تعین کیا، لیکن اگر کوئی شخص اپنا مرتبہ اپنی حیثیت سے ہزار گنا اونچا باور کر چکا ہو تو ممکن ہے اسے یہ تعین مراتب اور تفریق درجات پسند نہ آتی ہو اور اپنے کو امام اعظم کا ہم پلہ جتانے اور بالکل مساوی وہم قامت بتانے کی راہ میں اسے بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہو۔ مگر حق یہی ہے کہ سب فقہا و مجتہدین ہم پلہ اور ہم رتبہ نہیں۔

علامہ محمد امین بن عابدین شامی نے شرح عقود رسم المفتی میں فقہا کے سات طبقات ابن کمال پاشا کے حوالے سے بیان کیے ہیں:

اول: مجتہدین فی الشرع، جیسے ائمہ اربعہ اور ان کے اَمثال جنھوں نے اصولی قواعد وضع کیے اور اَدِلّہ اربعہ (کتاب، سنت، اجماع، قیاس) سے احکام نکالنے کے اصول مقرر کیے اور اصول وفروع میں کسی مجتہد کی تقلید نہ کی۔

دوم: مجتہدین فی المذہب جیسے امام ابویوسف، امام محمد اور دیگر تلامذۂ امام اعظم، یہ اپنے استاذ کے مقررہ قواعد کے مطابق ادلہ اربعہ سے استخراج احکام پر قادر ہوتے ہیں، یہ اصولی قواعد میں اپنے استاذ کے مقلد ہوتے ہیں اگرچہ بعض فروع میں استاذ سے اختلاف کرتے ہیں۔

سوم: مجتہدین فی المسائل، یہ اصول وفروع کسی میں امام کی مخالفت کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہ آئی ہو، ان کے احکام اپنے امام کے مقررہ اصول وقواعد کے مطابق استنباط کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جیسے امام ابو جعفر طحاوی، امام کرخی، فخر الاسلام بزدوی وغیرہم۔

چہارم: اصحاب تخریج، جیسے ابوبکر جصاص رازی وغیرہ، یہ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن اصول سے پوری آگاہی اور مآخذ سے کامل آشنائی رکھتے ہیں، اس لیے امام یا ان کے اصحاب سے منقول کسی مجمل قول کی تفصیل یا کسی محتمل حکم کی توضیح اپنی رائے اور وسعت نظر کی بنیاد پر کر سکتے ہیں۔

پنجم: اصحاب ترجیح جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ، ان کا کام بعض روایات کو بعض دیگر روایات پر ترجیح دینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ لاتے ہیں: هذا أولى، هذا أصح رواية، هذا أوضح، هذا أوفق للقياس، هذا أرفق للناس.

ششم: اصحاب تمیز، یہ اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اقوی، قوی، ضعیف، ظاہر الروایہ، ظاہر المذہب اور روایت نادرہ میں امتیاز کرلیں۔ جیسے صاحب کنز الدقائق، صاحب مختار، صاحب وقایہ وغیرہم مصنفین متون معتبرہ، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں نامقبول اقوال اور ضعیف روایات نقل نہ کریں۔

ہفتم: مقلدین، جو تمیز کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور جو پا گئے حاطب اللیل کی طرح کتاب میں جمع کر دیتے ہیں، فالويل لمن قلدهم كل الويل. انتهى.

ہو سکتا ہے کلی نہیں تو جزوی اصحاب تمیز آج بھی موجود ہوں، اور آئندہ بھی ہوتے رہیں۔

سوال (۳):

امام اعظم ابو حنیفہ اور دوسرے تینوں ائمہ کا اصل علمی کارنامہ کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ پوری امت انھی چاروں کی تقلید پر متفق ہو گئی؟

جواب:

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں لوگ قرآن وسنت کی عام ہدایات اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کاربند تھے۔ خلوت وجلوت میں خوف خدا، عدل، امانت، عام نصیحت وخیر خواہی، دعوت خیر، منع شر، کار خیر میں تعاون، کار شر سے کنارہ کشی وغیرہ عام اصول تھے جس پر ہدایت قرآنی مشتمل تھی، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی فضائل ومحاسن پر صحابہ کرام کی تربیت فرمائی، جزئی امور میں صحابہ کرام کو اگر کوئی اشکال پیش آتا تو سرکار کی بارگاہ میں رجوع کرتے یا اکابر صحابہ سے معلوم کرتے۔ تمدن کی وسعت اور اسلامی رقبہ کے پھیلاؤ کے بعد واقعات ومعاملات کی بے پناہ کثرت ہوتی گئی اور افراد بھی اچھے برے، حق کوش، ناحق کوش، عدل پرور، ظلم شیوہ ہر طرح کے پیدا ہونے لگے، ایسے ماحول میں اقامت خیر اور دفع شر کے لیے مبسوط اصول وقوانین اور مفصل جزئیات مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ان قوانین کی روشنی میں افراد اپنے معاملات کی صحت وسقم کو سمجھ سکیں اور جہاں حکومت کی مداخلت کی ضرورت ہو وہاں حکومت ان قوانین کے تحت رعایا کے معاملات حل کر سکے۔

اس طرف باضابطہ اور ہمہ گیر توجہ سب سے پہلے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مبذول فرمائی اور ایک فقہی مجلس کی شکل میں اپنے تلامذہ کو جمع کر کے مسلسل جدوجہد کی، اسی روش پر دیگر ائمہ بھی چلے اور اصول فقہ اور

فقہ کی شکل میں دو مستقل فن وجود میں آئے، ان سب پر مفصل گفتگو اور مستقل تبصرہ کا موقع نہیں، مگر چند باتوں کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے، مثلاً

(۱) ان حضرت نے کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں نظر کر کے یہ واضح فرمایا کہ احکام کی مشروعیت کا ہدف پانچ چیزوں (نفس، دین، عقل، مال، نسب) کا تحفظ ہے۔ اور سارے احکام اسی محور پر گردش کرتے ہیں۔

(۲) طلب اور ممانعت کے مدارج و مقاصد اور دلالت کے احوال و مراتب پر غور کیا، یعنی کس چیز کا مطالبہ لازمی طور پر شدت کے ساتھ ہے، پھر اس مطالبہ سے کون سا اہم امر مقصود ہے، جس آیت سے یہ مطالبہ مفہوم ہو رہا ہے، اس کی دلالت، اس پر بہت واضح اور نمایاں ہے یا دقیق اور مبہم یا محتمل ہے، بلفظ دیگر قطعی و جزمی ہے یا ظنی و احتمالی؟ اگر حدیث سے کسی فعل کا مطالبہ سمجھ میں آ رہا ہے تو خود اس حدیث کا ثبوت کس درجہ کا ہے۔ وہ حدیث متواتر ہے یا مشہور یا آحاد ہے؟ صحیح ہے یا حسن یا ضعیف وغیرہ؟ پھر طلب واضح ہے یا مبہم؟ ان امور پر نظر کے نتیجے میں احکام کے بھی درجات و اقسام طے ہوئے۔ مثلاً فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت غیر موکدہ، مستحب، حرام، مکروہ تحریمی، اساءت، مکروہ، تنزیہی، خلاف اولیٰ، مباح۔

(۳) اصول و قواعد کی تاسیس کے بعد جزئیات کی تفریع و تدوین کا مرحلہ آتا ہے، اس سلسلے میں فقہائے امت کی جانکاہی و عرق ریزی جاننے کے لیے فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر اس کی فہرست پر نظر ڈال لیے آپ کو معلوم ہوگا کہ طہارت اور عبادت سے لے کر نکاح و معاملات، وقف، میراث، حدود و تعزیرات وغیرہ تمام ابواب سے متعلق احکام کا ذخیرہ نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کر دیا گیا ہے، دنیا کے بڑے بڑے ماہرین قانون بھی ایسے جامع اور مستند مجموعے پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

ائمہ اربعہ کے مذاہب پر اتفاق امت کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر باب کے احکام مدون کر دیے اور بعد کے اہل نظر متبعین حالات کے مطابق ان کی تنقیح اور ان میں اضافہ کرتے رہے۔ عام آدمی جو خود اجتہاد و استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا، شرعی زندگی گزارنے کے لیے کوئی ایسا ہی مذہب اپنا سکتا ہے، جس میں ضرورت کے تمام مسائل مدون اور مرتب شکل میں موجود ہوں، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد، امام ابن جریر طبری وغیرہم کے مذاہب مدون اور محفوظ و منقول نہ ہوئے، اس لیے امت انھیں اپنانے بلکہ جاننے سے بھی قاصر رہی۔

سوال (۴):

کیا حضرات محدثین و مفسرین بھی مقلد تھے؟ اگر ہاں تو کیوں؟

جواب:

محدثین و مفسرین سے مراد صحاح ستہ وغیرہ کے مصنفین اور مشہور کتب تفسیر کے مرتبین ہیں تو بلا شبہہ وہ مقلد

تھے، جس کی وجہ یہ ہے کہ استخراج احکام کے لیے صرف حفظ حدیث کافی نہیں اور بھی بہت سے لوازم ہیں جن کے بغیر کار اجتہاد کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ان لوازم کا فقدان ان خدا ترس حضرات کے لیے اجتہاد سے مانع اور تقلید کا باعث ہوا۔

سوال (۵):

اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر ان عبقری علمائے مقلدین کی علمی خدمات کو کیا نام دیں گے جن پر آج بجا طور پر امت کو فخر کرنے کا حق ہے؟

جواب:

اولاً ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے۔ تحقیق کا عمل برابر جاری ہے اور جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا فقہائے مقلدین کی حیرت انگیز علمی و تحقیقی خدمات اس پر شاہد عدل ہیں اور اگر یہ کہیں کہ تقلید نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تو یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں۔ جو شخص اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے، اس کے لیے تقلید جائز نہیں، اسی لیے ائمہ کرام نے اجتہادی صلاحیت رکھنے والے اپنے تلامذہ سے یہ فرمایا کہ "ہم نے جس ماخذ سے احکام اخذ کیے ہیں، اسی سے تم بھی اخذ کرو۔" یا یہ فرمایا کہ "ہمارے بیان کردہ احکام پر تمھارے لیے عمل جائز نہیں، جب تک یہ نہ جان لو کہ ہم نے یہ احکام کہاں سے اخذ کیے۔"

ظاہر ہے کہ اس طرح کے ارشادات کے مخاطب کوفہ و بغداد اور مدینہ و مصر کے وہ دکاندار اور کاشت کار یا صنعت کار نہیں جو کتاب و سنت اور اخبار و آثار کی تصریحات، اشارات، دلالات اور اقتضاءات سے نابلد اور اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، وہ فوجی اور ملازمت پیشہ بھی نہیں جو تلاوت و قراءت سے زیادہ کی صلاحیت نہیں رکھتے، اہل اجتہاد کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور نا اہل کے لیے شروع ہی سے بند ہے۔

ثانیاً اگر کوئی طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اہلیت اجتہاد ہو یا نہ ہو اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لیے چوپٹ کھلا رہنا چاہیے تو بہت صفائی کے ساتھ عرض ہے کہ جو دروازہ صرف اہل حضرات کے داخلے کے لیے کھلا اگر اس سے صرف نا اہلوں کی آمد و رفت ہونے لگے تو اسے سختی کے ساتھ بند کر دینا ہی عقل و دانش اور ایمان و حکمت ہر ایک کا تقاضا ہے، اسی میں متاع گراں مایہ کی حفاظت ہے اور خلاف ورزی میں کھلی ہوئی بربادی۔

تجربہ شاہد ہے کہ آج اہلیت اجتہاد تو درکنار ارشادات ائمہ کے مصادر و مآخذ سے کامل آشنائی بھی مفقود ہے، اہلیت کے بغیر منصب اجتہاد پر تمکن کا شوق اور اس کی جسارت ناروا ایسے ہی دلوں میں ہوتی ہے جو خوف الٰہی سے عاری ہوں۔

سوال (٦):

امام اعظم ابو حنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شرعی احکام کی تخریج واستنباط کے لیے اصول وضع کیے، دوسرے ائمہ مجتہدین بھی کسی نہ کسی طور سے ان کے فیض یافتہ ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ غیر مقلدین حضرات سب سے زیادہ انھیں کے خلاف صف آرا رہتے ہیں؟

جواب:

امام اعظم سے عداوت کوئی نئی چیز نہیں، خود ان کے زمانے کا واقعہ ہے، جسے خطیب نے بھی بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے بیروت میں حضرت عبداللہ بن مبارک شاگرد امام ابو حنیفہ کی ملاقات ہوئی، انھوں نے پوچھا یہ کوفہ میں ابو حنیفہ کنیت رکھنے والا کون مبتدع پیدا ہوا ہے؟ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں: میں اپنے گھر واپس آیا فاقبلت على كتب أبي حنيفه امام ابو حنیفہ کی کتابیں دیکھنی شروع کیں (اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی لکھی ہوئی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں) ان کے کچھ مسائل منتخب کر کے لکھے اور سرخی یہ ڈالی: قال النعمان بن ثابت، پھر امام اوزاعی کے پاس گیا، مجھ سے وہ اوراق انھوں نے لے لیے اور مطالعہ کے بعد پوچھا یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ ابن مبارک نے کہا ایک شیخ ہیں، جن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی، فرمایا: هذا نبيل من المشائخ، ابن مبارک نے بتایا: یہ وہی ابو حنیفہ ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔ بعد میں امام اوزاعی کی ملاقات امام ابو حنیفہ سے مکہ میں ہوئی اور عبداللہ بن مبارک کے پیش کردہ مسائل اور دیگر مسائل پر گفتگو کے بعد انھوں نے امام اعظم کے تبحر علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے قول سے استغفار کیا اور عبداللہ بن مبارک سے فرمایا: ابو حنیفہ کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا تھا، میں نے انھیں اس کے برخلاف پایا، تم ان کی بارگاہ فیض سے وابستہ رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عصر ہی میں وہ حاسدین کی عداوتوں اور غلط پروپیگنڈوں کا نشانہ تھے۔

مگر اس تاریخی حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ابو حنیفہ وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے استنباط کے اصول و قواعد وضع کیے اور فقہی احکام کی تدوین کی۔ دیگر ائمہ نے بھی ان سے استفادہ کیا، امام ابن حجر ہیتمی شافعی نے الخیرات الحسان میں یزید بن ہارون کی روایت لکھی ہے کہ امام سفیان ثوری نے کسی حیلے سے امام ابو حنیفہ کی کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس سے استفادہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم کی ایک تصنیف کتاب الرہن بھی تھی۔

بالفرض امام اعظم نے خود کوئی کتاب نہ لکھی، یا لکھی اور ناپید ہو گئی، ان کا مذہب ان کے تلامذہ نے قلم بند کیا یا ثقات نے زبانی طور پر اس کی روایت کی تو اس سے امام اعظم کی فقہی خدمات اور علمی جلالت پر حرف نہیں آتا۔ اجلہ صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت **عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم** کی کوئی کتاب نہ آج

دستیاب ہے نہ پہلے کسی زمانے میں تھی لیکن تفسیر وحدیث اور فقہ میں ان حضرات کی عظمت شان سے کسی باخبر منصف مزاج کا انکار نہیں۔ آخر امام شافعی نے سارے لوگوں کو امام ابو حنیفہ کی عیال کیوں بتایا؟ خود اپنی یا اپنے استاذ امام محمد یا امام مالک رحمہم اللہ کی عیال نہیں بتایا؟ کیا امام شافعی بھی امام ابو حنیفہ کی تقلید جامد یا اندھی عقیدت میں مبتلا تھے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اہل انصاف جس امر کو امام اعظم کی اولیت اور عظمت شان کی دلیل سمجھتے ہیں، وہی اہل عناد کی عداوت و مخالفت کی بنیاد ہے، امام اعظم نے آزادانہ اجتہاد سے کام نہ لیا۔ بلکہ پہلے اجتہاد کے اصول وضوابط مقرر کیے، دلائل کے مراتب اور ان کی حیثیتوں کا تعین کیا، پھر دلائل اور قواعد کی روشنی میں فروع واحکام کی تخریج فرمائی، دیگر ائمہ عادلین رحمہم اللہ نے بھی اس عادلانہ روش کی پیروی کی۔ مگر آج جب کسی کے سر میں آزادانہ اجتہاد یا ہوائے نفس کے مطابق انتخاب احکام کا سودا سماتا ہے تو یہ اصول وضوابط اس کی آزادی طبع اور غلط روی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے دل کا بخار اسی پر اترتا ہے، جس نے اس طریقے کی بنا ڈالی۔

امام اعظم کے خلاف علم حدیث میں کم مائگی کا پروپیگنڈا بھی کوئی نیا نہیں مگر امام ابو یوسف جو امام اعظم کے شاگرد اور ان کی مجلس فقہ کے رکن تھے، علم حدیث میں ان کے تبحر اور مہارت کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ نے کیا ہے، جس کے باعث اعدائے زمانہ کے لیے بھی مجال انکار نہیں، یہ امام ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات امام ابو حنیفہ سے میرا اختلاف ہوتا اور کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا پھر میں محدثین کوفہ کے یہاں جاتا کہ میرے یا میرے شیخ کے قول کی تائید میں کوئی حدیث مل جائے، جس کے ذریعہ اختلاف کا تصفیہ ہو۔

مجھے امام کے قول کی تائید میں ایک دو حدیثیں مل جاتیں، میں آ کر امام کو سناتا، وہ قبول نہ کرتے، میں عرض کرتا یہ تو آپ کے قول کے موافق ہے، اسے آپ کیوں نہیں لیتے؟ وہ فرماتے اس میں فلاں فلاں علت قادحہ ہے۔ اہل کوفہ کا علم حدیث مجھ سے مخفی نہیں، غور کیجیے جس شیخ کی نظر اتنے جلیل القدر ائمہ حدیث سے فزوں تر ہو، خود اس کی حدیث دانی کا پایہ کتنا بلند ہو گا؟ مگر تعصب وعناد کی بیماری کا کوئی علاج نہیں۔

محدث کا کام سونا جمع کرنا ہے اور ناقد کا کام پرکھ کر بتانا کہ کون سونا کتنا کھرا ہے کتنا کھوٹا؟ اسی طرح محدث کا کام شفا بخش دواؤں کا ذخیرہ کرنا ہے اور فقیہ کا کام امراض اور مریضوں کی تشخیص کے ساتھ ان دواؤں کا استعمال کرانا ہے، امام اعظم کے استاذ امام اعمش سے کچھ مسائل دریافت کیے گئے وہ نہ بتا سکے۔ امام ابو حنیفہ سے پوچھا انھوں نے بتا دیا۔ استاذ نے پوچھا تم نے یہ جوابات کہاں سے اخذ کیے؟ عرض کیا فلاں فلاں حدیثوں سے، جو آپ نے اس اس سند سے مجھ سے بیان فرمائیں۔ فرمایا اے فقہا! تم لوگ طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں، اور ابو حنیفہ تم تو دونوں ہو۔ میں نے سو دن میں جو حدیثیں تم سے بیان کیں وہ ایک ساعت میں تم مجھے سنائے دے رہے ہو۔

دونوں واقعے الخیرات الحسان لابن حجر الہیتمی الشافعی میں ہیں۔ پھر فقہ واجتہاد کا کمال، علم حدیث میں رسوخ کے بغیر متصور بھی نہیں، حدیث کے تمام مراحل اور شعبوں کو عبور کیے بغیر پایۂ اجتہاد تک رسائی ناممکن ہے۔

سوال (۷):

تقلید شخصی کا مفہوم کیا ہے اور امت کو اس کی ضرورت کیوں ہے؟

جواب:

جو شخص اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا مگر مجتہدین کے اقوال تک اس کی رسائی ہے اور بے شمار متفقہ مسائل کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسے مسائل بھی ہیں جن میں مجتہدین کے نتائج فکر مختلف ہیں، ایسی حالت میں وہ کسی ایک ہی مجتہد کی پیروی کر سکتا ہے، اس کا نام تقلید شخصی ہے، اس کے لیے بھی اس مجتہد کے اصول وفروع کو جاننا، سیکھنا، پوچھنا، سمجھنا ضروری ہے اگر وہ بیک وقت دو مجتہد کے قول مثلاً جواز عدم جواز دونوں پر عمل کرنا چاہے تو یہ جمع نقیضین کی آرزو ہوگی جس کا وقوع محال ہے اور اگر یہ چاہے کہ جس وقت جو آسان معلوم ہو اسے اپنا لیا کرے تو یہ شریعت کی نہیں ہوائے نفس کی پیروی ہوگی اور اگر اسے یہ تکلیف دی جائے کہ تمام مذاہب کی تحقیق کرو، ہر قول کو کتاب وسنت اور قیاس واجتہاد کی روشنی میں پرکھو، جو زیادہ درست اور مطابق دلائل نظر آئے اسے لے لو، دوسرے کو چھوڑ دو۔ تو یہ ایک عامی کی قوت وصلاحیت سے باہر ہے، جس کا وہ مکلف نہیں، وہ ساری عمر کھپا کر بھی اتنی اہلیت پیدا کرنے سے عاجز ہے پھر عمل کب کرے گا؟ قبر میں جانے کے بعد یا میدان قیامت میں؟ اور اگر کوئی عالم بے قید تیار ہو جائے کہ تمھیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے تمام ائمہ کے اقوال ودلائل کی تحقیق تام فرمانے کے بعد ایک بے نظیر معجون مذاہب تیار کیا ہے، تم اسے لے لو اور حسب ضرورت استعمال کرتے رہو، اس میں ساری مشکلات سے نجات ہے اور ساری آسائشوں کا انتخاب لاجواب ہے۔ اب وہ شخص وہ نسخۂ کیمیا ہاتھ میں لے اور آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرتا ہے تو یہ بارہ سو سال پہلے کے کسی امام کو چھوڑ کر پندرہویں صدی کے ایک عالم بے قید کی تقلید شخصی ہوگی اور آج اسی پر پوری دنیا کے غیر مقلدین سختی سے کاربند ہیں۔

مگر بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ابتدائی دو صدیوں کے بعد سے ہی پوری دنیائے اسلام ایک امام مجتہد کی پابندی پر کاربند ہے، پھر فرق کیا رہا؟ صرف یہ کہ قدیم امام جو علم وتقویٰ، فقاہت واجتہاد، عہد رسالت سے قرب وغیرہ ہر لحاظ سے اعلیٰ واعظم تھا اسے چھوڑ کر آج کے ہر لحاظ سے ادنی وپست شخص کی پیروی ہو۔

ایک امام معین کی پیروی بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام سے ہمیں باخبر کرتا ہے اور جہاں جہاں اس نے خود اجتہاد کیا ہے تو اپنی طرف سے اس نے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ٹھہرائی ہے بلکہ نصوص

کتاب وسنت میں نظر غائر کے نتیجے میں جس چیز کو اس نے خدا اور رسول کے یہاں حلال جانا ہے، اسے حلال بتایا ہے، جسے حرام جانا ہے، اسے حرام بتایا ہے اور ہم نے اس کی دیانت وتقویٰ کا مشاہدہ اور اس کے رسوخ علم کا تجربہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کر لینے کے بعد اس پر اعتماد کیا ہے اور اس کے اقوال کو قبول کیا ہے۔

سوال (۸):

تقلید کی مخالفت کے پیچھے کیا واقعی "دعوۃ الی الکتاب والسنۃ" کا جذبہ کارفرما ہے؟

جواب:

غیر مقلدین نے پہلے تو بہت شد ومد کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ کتاب وسنت کی پیروی کرو، ائمہ کی پیروی شرک جلی ہے اور تمام مقلدین مشرک مباح الدم ہیں، وہ "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کے مصداق ہیں، وہ ائمہ کی تحلیل وتحریم کو مان کر ان کے پجاری ٹھہرے اس لیے چھ سو سال کی پوری امت شرک خالص پر گزری۔

اس دعوے کا تقاضا یہ تھا کہ غیر مقلدین ایسا مجموعۂ احکام منظر عام پر لاتے جو صرف کتاب وسنت کی تصریحات پر مشتمل ہو اور کسی امام کے قیاس واجتہاد اور تحلیل وتحریم سے یکسر خالی ہو، مگر یہ کام غیر مقلدین سے آج تک نہ ہو سکا۔ جیسے چکڑالوی فرقہ نے صرف کتاب اللہ کے اتباع کا نعرہ بلند کیا مگر کوئی ایسا نظام عمل پیش کرنے سے عاجز ہے جو صرف قرآن مجید کی تصریحات پر مشتمل اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہو۔

غیر مقلدین کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہ پیش کر سکے جو کتاب وسنت میں ان کے اجتہاد کا ثمرہ ہو۔ ان کا کارنامہ بس یہ رہا کہ بزعم خویش "تقلید جامد" سے ہٹ کر "تقلید سیال" پر آ گئے۔ یعنی کسی ایک امام کا پورا مذہب اختیار کرنے کے بجائے اپنی راحت بدن اور ہوائے نفس کے مطابق مختلف ائمہ کے مذاہب سے کچھ کچھ مسائل چھانٹ کر ایک معجون مرکب تیار کر لیا۔ اب وہ خود ہی بتائیں کہ ایک امام کی تحلیل وتحریم کو ماننے والا "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کا مصداق ہوا تو چند اماموں کی تحلیل وتحریم کو ماننے والا اس کا مصداق کیوں نہیں ہوا؟ وہ تو کسی ایک حبر وراہب نہیں بلکہ بقول آپ کے واقعۃً چند احبار ورہبان کو اربابا من دون اللہ بنانے والا ہے، وہی تو اس کا سچا اور پورا پورا مصداق ہے۔

اگر یہ کہیں کہ ہم نے چند احبار کو اپنی تحقیق اور اتباع کتاب وسنت کے تحت مانا ہے تو ایک امام کا مقلد بھی یہی کہتا ہے کہ ہم نے اپنے امام کو خدا یا رسول نہیں مانا ہے، بلکہ خدا کا بندہ، رسول کا امتی، ان کے ارشادات کا غواص اور ان کے احکام کا مبلغ اور مظہر ہی مانا ہے اور ہمیں بھی تحقیق سے معلوم ہے کہ انھوں نے نہایت اخلاص وامانت،

کمال علم و ادراک اور وفور آلات اجتہاد کے ساتھ کتاب و سنت کے سمندر میں غواصی کر کے احکام شریعت کے تابناک گوہر نکالے ہیں اور ہم نے ہاتھوں ہاتھ لیے ہیں تاکہ خدا اور سول کی اطاعت اور زندگی کے ہر شعبے میں شریعت حقہ کی پیروی ہو سکے۔

الحاصل تقلید کی مخالفت کے پیچھے اتباع کتاب و سنت کا جذبہ کار فرما نہیں، بلکہ اتباع نفس کا جذبہ کار فرما ہے۔ یا ان ہی کے الفاظ میں "تقلید جامد" سے ہٹ کر "تقلید سیال" کا راحت بخش داعیہ کار فرما ہے۔

سوال (۹):

غیر مقلدیت کا وجود کب سے اور کیوں ہوا؟

جواب:

ہندوستان میں شاہ اسماعیل دہلوی نے اس کی تخم ریزی کی اور میاں جی نذیر حسین دہلوی نے اس کی کاشت تیار کی، یعنی یہ پودا تیرہویں صدی کے ربع دوم میں لگا اور ربع سوم و چہارم میں پیداوار مارکیٹ میں فروخت ہونے لگی۔

سوال (۱۰):

غیر مقلدیت نے امت کو ائمہ اربعہ کی تقلید سے آزاد کرایا ہے یا کسی دوسری تقلید میں الجھا دیا ہے؟

جواب:

ایک نئی تقلید میں الجھا دیا ہے، آزادی تو جب ہوتی کہ ہر غیر مقلد مجتہد ہوتا اور الگ الگ اجتہاد سامنے آتا۔ یا کم از کم یہی ہوتا کہ مثلاً رفع یدین یا آمین بالجہر، قراءت خلف الامام اور دوسرے صدہا مسائل میں کسی کو امام ابو حنیفہ کی دلیل وزنی معلوم ہوتی، کسی کو امام مالک کی، کسی کو امام شافعی یا امام احمد بن حنبل کی، اور ہر ایک اپنی تحقیق کے مطابق آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عمل کرتا۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں غیر مقلد جنگلی اور گنوار ہیں جن کے لیے صحیح طور سے سورۂ فاتحہ پڑھنا یا اردو لکھا ہوا ترجمۂ قرآن سمجھنا بھی دشوار ہے، وہ اجتہاد یا تحقیق کیا کریں گے۔ کچھ غیر مقلد اگر عالم ہیں تو سب کا مذہب وہی ہے جو میاں جی اور ان کے معاصر و موافق رفقا نے ثبت قرطاس فرما دیا۔ کوئی شخص اس سے سرمو انحراف کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ سامنے ہے کہ نہ آزادانہ اجتہاد رہا، نہ آزاد تحقیق اور فکر و جستجو، ایک طے شدہ، مقررہ اور احبار و رہبان کے ہاتھوں نئی کتابوں میں درج شدہ مذہب کی "تقلید جامد" رہ گئی۔ اجتہاد تو ان کے یہاں کچھ تھا نہیں "تقلید سیال" بھی رخصت ہو گئی۔

سوال (۱۱):

جماعت سلفیہ اور جماعت اہل حدیث میں کچھ فرق بھی ہے یا اختلاف صرف ناموں کا ہے؟

جواب:

اصل میں غیر مقلدین کا جب وجود ہوا اور ابن عبد الوہاب کا اعتقادی مذہب انھوں نے اپنایا اور عمل میں مذاہب ائمہ سے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو مقلدین نے انھیں وہابی یا لامذہب یا غیر مقلد کا نام دیا۔ کوئی نام انھیں پسند نہ آیا۔ انھوں نے ماضی کی صدیوں کا مطالعہ کیا، ماضی میں سلفی اور محدث یا اہل حدیث نام کے گروہ انھیں نظر آئے، یہ نام انھیں اچھے لگے اور انھی سے اپنی تشہیر گوارا کر لی، کبھی اپنے کو محمدی یا اثری بھی کہتے ہیں، شاید اور زیادہ اچھے نام کی تلاش ابھی جاری ہے۔

سوال (۱۲):

جماعت اہل حدیث کا اختلاف صرف فقہی ہے یا نظری و اعتقادی بھی ہے؟

جواب:

غیر مقلدین اعتقاداً کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے پابند ہیں اور عملاً ایک نئی تشکیل اور جدید تدوین کے، دونوں کی کچھ تفصیل جامع الشواہد میں محدث سورتی مولانا وصی احمد علیہ الرحمہ نے دی ہے۔

سوال (۱۳):

غیر مقلدیت نے "دعوة الی الكتاب والسنة" کے نام پر امت کو متحد کیا یا اس کے انتشار کے مزید سامان بہم پہنچا دیے؟

جواب:

امت ائمہ اربعہ کو برحق مانتے ہوئے اپنے اپنے امام کی تقلید پر مطمئن تھی غیر مقلدیت کے وجود میں آتے ہی انتشار اور جنگ و جدال کا ماحول برپا ہو گیا۔ فوجداری، مقدمہ کورٹ، کچہری سب کی نوبت آئی اور سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

سوال (۱۴):

عالمی تناظر میں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کے منفی کردار میں اس کی غیر مقلدیت کا کیا کردار ہے؟

جواب:

سعودی عرب میں رہنے والے شیوخ نجد کو غیر مقلدیت سے زیادہ عقیدۂ وہابیت سے دلچسپی ہے اور اس کو وہ طاقت، دولت، افراد وغیرہ کے ذریعہ پھیلانے میں منہمک ہیں، وہ حنبلیت کے مدعی ہیں مگر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مصلے مسجد حرام سے ختم کر دیے۔ تعظیم و احترام کو عبادت اور شرک کہتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آثار و مقابر کو اصنام کا درجہ دیتے اور ان کی شکست و ریخت کو بت شکنی سمجھتے ہیں۔

سوال (۱۵):

کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟ اگر ہاں! تو کیوں؟ اور اگر نہیں تو عصر حاضر میں تحقیق و اجتہاد کی کون سی صورت ممکن یا واجب ہے؟

جواب:

اجتہاد کی اجازت اہلیت سے مشروط ہے اور وہ صدیوں سے مفقود ہے مگر ائمہ نے جامع اصولوں کی روشنی میں فروع کا جو ذخیرہ ہمیں دیا ہے، اس میں پیدا ہونے والے اکثر مسائل کا حل بعینہ مل جاتا ہے اور کچھ کے لیے نظر و فکر اور الحاق کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ کام انفرادی و اجتماعی طور پر ہر دور میں ہوتا آیا ہے اور آج بھی جاری ہے۔ اسی لیے مقلدین کے یہاں ہر نئے مسئلے کا حل مل جاتا ہے اور غیر مقلدین کے یہاں بے شمار پرانے مسائل بھی تشنہ ہیں۔

۞۞۞۞۞۞

باب ششم

مقدمے اور تقاریظ

تعارف مصنف[۱]

امام احمد رضا، بریلی کا وہ فرزند نجیب، جس کا پورا خاندان شمیم علم و فن سے معطر ہے۔ جس کے والد امام المتکلمین۔[۲] جدِ امجد ولیِ باکرامت اور صاحب علم و فتویٰ۔[۳] خلفِ اکبر حجۃ الاسلام۔[۴] خلف اصغر مفتیِ اعظم۔[۵] نبیرۂ گرامی مفسرِ اعظم۔[۶]

ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

جس نے ۱۰ر شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء بروز شنبہ فرشِ گیتی کو رونق بخشی، جس کا عہدِ طفلی عہدِ شباب کا آئینہ دار۔ اور

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

کا مصداق۔ جس کا زمانۂ طالبِ علمی اور طرزِ تعلم ممتاز و منفرد کہ آٹھ برس کی عمر میں ہدایۃ النحو پڑھی اور عربی میں اس کا حاشیہ لکھ ڈالا، اور حاشیہ بھی ایسا کہ بڑوں کو حیرت ہو۔ دس برس کی عمر میں مُسَلَّمُ الثبوت پر اپنے والد و استاذِ گرامی کے تحریر کردہ اعتراض و جواب پر مقامِ اعتراض کی ایسی تشریح لکھ دی کہ اعتراض واقع ہی نہیں ہو سکتا تھا، اور اپنے وقت کا عظیم و جلیل استاذ اسے دیکھ کر پکار اٹھا "احمد رضا تم مجھ سے پڑھتے نہیں ہو، پڑھاتے ہو۔"

جو ۱۳ر برس ۱۰ر ماہ کی عمر میں دستارِ فضیلت سے سرفراز ہو کر افتا کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے تو اکابر کی عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ جو مفتی ارشاد حسین صاحب رام پوری[۷] علیہ الرحمہ جیسے عظیم و کہنہ مشق مفتی کا فتویٰ خلافِ

(۱) معارفِ رضا، امام احمد رضا قادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور ۱۹۷۹ء
(۲) حضرت مولانا نقی علی خاں علیہ الرحمہ ۱۲۴۶ھ - ۱۲۹۷ھ۔
(۳) حضرت مولانا رضا علی خاں علیہ الرحمہ ۱۲۲۴ھ - ۱۲۸۲ھ۔
(۴) حضرت مولانا حامد رضا خاں علیہ الرحمہ ۱۲۹۲ھ - ۱۳۶۲ھ
(۵) مفتیِ اعظم حضرت مولانا مصطفیٰ رضا خاں ۱۳۱۰ھ - ۱۴۰۲ھ۔
(۶) حضرت مولانا محمد ابراہیم رضا عرف جیلانی میاں ابن حجۃ الاسلام علیہما الرحمہ ۱۳۲۵ھ - ۱۳۸۵ھ۔
(۷) ولادت ۱۲۴۸ھ وفات ۱۳۱۱ھ۔

حقیقت ہونے پر "لَیْسَ بِصَوَاب"[1] کا فیصلہ صادر کرتا ہے اور ایسا تحقیقی جواب سپردِ قلم فرماتا ہے کہ موصوف اور والیِ ریاست رام پور کے ساتھ وہاں کے تمام علما اس کے قلم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اسی ابتدائی زمانہ میں جس کا اشہبِ قلم بدمذہبوں کی شر انگیزیوں کے خلاف یوں رجز خوانی کرتے ہوئے یلغار کرتا ہے۔ ع

کلکِ رضا ہے خنجرِ خوں خوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

جسے ۱۲۹۴ھ میں سید شاہ آلِ رسول مارہروی علیہ الرحمہ[2] کی طرف سے بیعت و خلافت کے ساتھ یہ تمغۂ امتیاز بھی عطا ہوتا ہے کہ "اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ آلِ رسول تو میرے لیے کیا لایا؟ تو میں احمد رضا کو پیش کروں گا"۔ ۱۲۹۵ھ میں بمقام مکہ مکرمہ بعد نماز مغرب، جس کی تقدس آثار پیشانی پر امام شافعیہ حضرت حسین بن صالح کی آنکھیں جم جاتی ہیں اور پکار اٹھتے ہیں "اِنِّی لَأَجِدُ نورَا اللهِ فی هٰذا الجَبِین" میں اس پیشانی سے اللہ کا نور جھلکتا پا رہا ہوں۔ علامہ موصوف ہی نہیں بلکہ حرمین کے اعاظم و اکابر اس ۲۳ ر سالہ فاضل کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ جس کی زندگی یکم محرم الحرام ۱۳۰۱ھ جمعرات کو چودھویں صدی کا ہلال طلوع ہوتے ہی شانِ مجددیت اختیار کرتی ہے، اور اس کا حقیقت نگار قلم جملہ علومِ اصلیہ وفرعیہ پر رواں ہوتا ہے۔ جس سے تحقیق و تدقیق کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اہلِ باطل کی بھرپور سرکوبی ہوتی ہے۔ اور وہ ملتِ بیضا کی حفاظت و صیانت کا ایسا عظیم کارنامہ انجام دیتا ہے کہ دنیاے حقیقت شناس پکار اٹھتی ہے "اِنه وَحِیدُ العصرِ بلا منازِعٍ ومجدِّدُ هذا القرنِ بلا ارتیاب."[3]

جو ۱۳۲۳ھ میں حجازِ مقدس کی حاضری سے شرف یاب ہوکر "الدّولة المكّية بالمادّةِ الغيبية" اور "كِفلُ الفقيهِ الفاهِم فی أحكامِ قِرطاسِ الدراهم" جیسی کتابیں تصنیف کرکے ایوانِ شاہی اور اکابرِ علم وفن سے خراجِ تحسین وصول کرتا ہے۔

جس کی زندگی عشقِ رسول سے سرشار۔ جس کے اشعار حبِّ رسول کے آئینہ دار۔ جس کی تصانیف سلاطینِ علوم وفنون کا مرجع۔ جس کی تحقیق مخالف کے لیے مُسکِت اور موافق کے لیے سکون بخش۔ جس کا فیضانِ علم پوری صدی کو محیط۔ اور ان شاء اللہ اگلی صدیوں تک جاری۔ جو بلاشبہہ امامِ اہلِ حق اور مجددِ برحق ہے۔ وہ

---

(۱) یہ فتویٰ صحیح نہیں۔

(۲) ولادت ۱۲۰۹ھ وفات ۱۲۹۶ھ۔

(۳) یقیناً یہ بلا اختلاف یکتاے روزگار اور بلاشبہہ اس صدی کے مجدد ہیں۔

۲۵ ر صفر ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء جمعہ کو اپنے معبودِ حقیقی سے جاملا مگر آج بھی اُس سچے نائبِ رسول کے لمحاتِ زندگی اور رشحاتِ قلم زمانے کے لیے مشعلِ راہ اور سامانِ ہدایت وبصیرت ہیں۔

فنا کے بعد بھی زندہ ہے شانِ رہبری تیری
خدا کی رحمتیں ہوں اے امیرِ کارواں تجھ پر

تلخیصِ عیدِ ثانی

رسالہ "وِشَاحُ الْجِيْدِ فِيْ تحليلِ مُعَانَقَةِ العِيْدِ" ۱۳۱۲ھ

اعلیٰ حضرت نے پہلے معانقۂ عید کے جواز کا وہ فتویٰ دیا جو حصہ اول (عیدِ اول) میں مرقوم ہے۔ اس میں اعلیٰ حضرت نے کتبِ فقہ کے حوالوں اور سولہ احادیثِ کریمہ سے معانقۂ عید کا جواز ثابت کیا، اور مولوی اسماعیل دہلوی کی بھی ایک عبارت معانقۂ عید کے جائز و مستحسن ہونے کے متعلق پیش کی۔ اس کے بعد بریلی کے ایک مولانا صاحب نے اُس فتواے اعلیٰ حضرت کے مقابلہ میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا ایک فتویٰ پیش کیا اور اپنی طرف سے کچھ عبارتیں حاشیۂ مجموعۃ الفتاویٰ عبدالحی پر لکھ بھیجیں۔ مولانا فرنگی محلی کے فتویٰ میں یہ ہے کہ "مصافحہ و معانقۂ عید میں اختلافِ علما ہے، ترک بہتر ہے۔" حاشیہ پر بریلی کے مولوی صاحب کی درج کردہ عبارتوں میں یہ تین دلیلیں مذکور ہیں، جن سے موصوف نے معانقۂ عید کا عدم جواز ثابت کرنا چاہا ہے:

(۱) "مصافحہ" کا موقع ابتداے ملاقات ہے، نمازوں کے بعد نہیں۔

(۲) یہ خاص "مصافحہ" روافض کا طریقہ ہے۔

(۳) صحابۂ کرام نے یہ خاص "مصافحہ" نہ کیا۔

ظاہر ہے ان دلیلوں میں صرف مصافحہ کا ذکر ہے، ان سے معانقہ کا ناجائز ہونا ہرگز ثابت نہ ہوتا تھا۔ مگر اعلیٰ حضرت نے اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کی خاطر ان باتوں کا دس التماسوں میں جواب لکھ بھیجا، جو تفصیلاً کتاب میں مذکور ہیں۔ یہاں آسانی کے لیے ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

اول: مولانا فرنگی محلی کا مجموعۂ فتاویٰ میں نے مستند کب مانا کہ آپ اسے میرے مدلل فتوے کے جواب میں پیش کررہے ہیں اور اگر خود آپ اسے سب کے لیے مستند سمجھتے ہیں تو اس کا مستند ہونا دلیل سے ثابت کرنا تھا۔

دوم: جو مانعینِ معانقہ فتواے لکھنؤ سے استدلال کرتے ہیں وہ اسی مجموعۂ فتاویٰ کی اُن بہت ساری عبارتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو اُن کے مذہب کے خلاف ہیں بلکہ اُن کے مذہب کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے

والی ہیں۔ جیسے: اس مجموعۂ فتاویٰ میں بہت سی بدعتوں اور نوایجاد چیزوں کو جائز و مستحسن لکھا ہے۔ شغل برزخ کو جائز بتایا ہے جب کہ یہ مذہب مانعین میں شرک ہے۔

سوم: فتوائے فرنگی محل میں معانقۂ عید سے متعلق صرف اتنا ہے کہ "اس کا نہ کرنا بہتر ہے۔" اس حکم سے معانقۂ عید کا ناجائز ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ فقہا کی عبارتوں سے ثابت ہے کہ ترک بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کرنا جائز ہے، ممنوع نہیں۔

چہارم: حاشیہ پر ردالمحتار اور مرقات کی نقل کردہ عبارتوں میں معانقۂ عید کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں۔ پھر انھیں معانقۂ عید کی ممانعت کے ثبوت میں پیش کرنا ہی درست نہیں۔ اُن عبارتوں میں محض مصافحہ کا ذکر ہے۔ اور آپ مجتہد نہیں کہ ایک مسئلہ کو دوسرے پر قیاس کریں۔

اگر یہ کہیں کہ جو دلیلیں ممانعتِ مصافحہ میں ہیں وہی ممانعتِ معانقہ میں بھی جاری ہوں گی۔ تو ایسا بھی نہیں۔

(۱) پہلی دلیل: "مصافحہ کا موقع ابتدائے ملاقات ہے۔" اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ "معانقہ کا موقع بھی ابتدائے ملاقات ہے۔" معانقہ مثلِ مصافحہ نہیں۔ مثلِ تقبیل ہے۔ بصورتِ جائزہ بوسہ دینے کا وقت جس طرح خاص نہیں یوں ہی معانقہ کا بھی وقت خاص نہیں۔ ہماری پیش کردہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابتدائے ملاقات کے علاوہ حالات میں بھی معانقہ کیا۔

(۲) دوسری دلیل (مصافحہ بعدِ فجر و عصر سنتِ روافض ہے) کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ "مصافحہ" کسی وقت کے رافضیوں نے ایجاد کیا اور ان کا شعارِ خاص رہا۔ اس وجہ سے اس وقت کے علما نے سنیوں کے لیے اسے ناپسند رکھا تو اس سے معانقہ کا ناجائز ہونا بھلا کیسے ثابت ہوا۔

پہلے تو مصافحہ بعدِ فجر و عصر ہی کے بارے میں ثابت کیجیے کہ یہ رافضیوں کی ایجاد اور ان کا شعارِ خاص ہے ورنہ کوئی جائز کام کسی بدمذہب کے کرنے سے ناجائز یا مکروہ نہیں ہو سکتا۔ لاکھوں باتیں ہیں جن کے کرنے میں سنی، رافضی، بلکہ مسلم و کافر سب شریک ہیں، کیا وہ صرف بدمذہبوں اور کافروں کی شرکت کی بنا پر ناجائز ہو جائیں گی۔ کتبِ معتبرہ سے ثابت ہے کہ بدمذہبوں سے مشابہت صرف تین صورتوں میں ممنوع ہے: (۱) وہ امر خود شرعاً برا ہو۔ (۲) اُس قوم کا شعارِ خاص ہو۔ (۳) کرنے والے کو اُن سے مشابہت پیدا کرنی مقصود ہو۔ اگر یہ تینوں صورتیں نہیں ہیں تو ممانعت بھی نہیں ہے۔

(۳) تیسری دلیل یہ کہ "یہ خاص مصافحہ صحابۂ کرام نے نہیں کیا" یہ بات معانقۂ عید میں بھی جاری ہو سکتی ہے مگر صحابۂ کرام کا محض نہ کرنا کسی امر کے ناجائز ہونے کی دلیل ہرگز نہیں، آپ ہی کی مستند کتب مجموعۂ فتاویٰ

لکھنوی، ردالمحتار، مرقات اور سیکڑوں معتبر کتابوں سے آپ کی اس دلیل کا باطل ہونا ثابت ہے۔ فقہائے کرام بہت سے امور کے متعلق صراحت کرتے ہیں کہ یہ بدعت ہیں زمانۂ صحابہ و تابعین میں نہ تھیں، مگر انھیں جائز و مستحب بلکہ بعض کو واجب بھی بتاتے ہیں اور بدعت صرف حرام ہی نہیں ہوتی بلکہ بہ تصریحِ فقہائے کرام حرام، مکروہ، واجب، مندوب، مباح، پانچ طرح کی ہوتی ہے۔

پنجم: اگر جناب نے ممانعتِ مصافحہ سے متعلق ردالمحتار اور مرقات کی یہ عبارتیں دیکھیں تو سیکڑوں وہ عبارتیں بھی دیکھنی چاہیے تھیں جن میں اسی مصافحہ بعدِ فجر و عصر بلکہ مصافحہ بعد نماز پنج گانہ کو جائز و مباح لکھا ہے۔ اور اختلافِ عبارات کی صورت میں ترجیح تلاش کرنی تھی، اگر ترجیح آپ کی نظر سے نہ گزری تو ہم بحوالۂ کتب بتاتے ہیں کہ اس مصافحہ کا جائز ہونا ہی راجح ہے۔ افسوس کہ آپ نے محض دو عبارتیں دیکھ لیں اور سیکڑوں عبارتیں نظرِ عالی سے رہ گئیں۔

ششم: التماسِ پنجم کی تفصیلی بحث میں مصافحہ بعدِ نماز کا مسئلہ بھی صاف ہو گیا۔ اور آپ کی تینوں دلیلوں کا کمزور و علیل ہونا بھی منکشف ہو گیا۔ تیسری دلیل (عدمِ فعلِ صحابہ) پر صراحۃً کلام گزرا۔ پہلی دلیل (مصافحہ ابتدائے لقا سے خاص ہے) اس کا جواب تکملہ شرح اربعین و نسیم الریاض سے واضح ہوا کہ بعدِ ختم نماز ملنا بھی ابتدائے لقا ہے کہ مصلی نماز کی حالت میں اپنے رب کے حضور حاضر اور مخلوق سے غائب تھا بعدِ سلام مخلوق کی طرف متوجہ ہوا، اب ملاقات ابتدائے ملاقات ہے۔ لہٰذا یہ مصافحہ ابتدائے ملاقات کا مصافحہ ہے۔

دوسری دلیل (مصافحہ سنتِ روافض ہے) اس کے متعلق گزرا کہ بدمذہبوں کی مشابہت صرف تین صورتوں میں بری ہے ورنہ نہیں۔ اتنا اور سن لیجیے کہ کسی باطل فرقہ کی سنت اسی وقت تک پرہیز کے قابل رہتی ہے جب تک ان کی سنت رہے۔ اگر ان سے رواج اٹھ گیا تو اب وہ قابلِ پرہیز نہ رہی۔ مصافحہ بعدِ نماز کبھی سنتِ روافض رہا ہو، اب نہیں۔ لہٰذا ممانعتِ مصافحہ کی اس علت کا اب سرے سے وجود ہی نہ رہا۔

ہفتم: آپ نے عبارت مرقات بہت کم نقل کی ورنہ اسی عبارت کے بعد یہ حکم تھا کہ اگر قبلِ نماز ملاقات نہ ہوئی تو بعدِ نماز مصافحہ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ مصافحہ سے پہلے سلام بھی کرے۔ اس عبارت کے پیشِ نظر معانقۂ عید میں بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر قبلِ نماز ملاقات نہ ہوئی تو بعدِ نماز معانقہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسی مرقات کے طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ مصافحہ و معانقہ اُن لوگوں کے لیے بالکل ممنوع نہیں۔ جنھوں نے قبلِ نماز باہم ملاقات نہ کی ہو۔

ہشتم: اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اسی عبارت کے متصل، اسی مرقات میں مانعین کے مخالف ایک اور تحقیق جلیل و مفید تھی، جناب نے وہ بھی نقل نہ فرمائی۔ کہ "اگر قبلِ نماز باہم ملاقات ہو چکی ہے تو بعدِ نماز مصافحہ

مکروہ ہونے کے باوجود اگر کوئی مسلمان مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تو یہ اس سے ہاتھ نہ کھینچے بلکہ مصافحہ کرلے، کیوں کہ ترکِ مصافحہ میں صرف ایک ادب واولیٰ کی رعایت ہے اور ہاتھ کھینچ لینے میں دلِ مسلم کی ایذا، جس سے اجتناب رعایتِ ادب سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا اس صورت میں کراہت نہیں۔" جو اذیت ترکِ مصافحہ سے ہوگی، ترکِ معانقہ سے بھی ہوگی، تو معانقہ میں بھی مرقات کا وہی حکم جاری ہوگا۔ اب اگر آپ کو مرقات پر عمل ہے تو صاف صاف کہہ دیجیے کہ بعدِ عید جو شخص معانقہ کے لیے ہاتھ بڑھائے، اس سے انکار ہرگز نہ کیا جائے، بلکہ فوراً معانقہ کرلیں۔

نہم: ہماری ان تحقیقات سے روشن وواضح ہوگیا کہ معانقۂ عید کو بدعتِ مذمومہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ معانقۂ عید اپنی اصلیت کے لحاظ سے سنت، اور خصوص بعدِ عید کے لحاظ سے مباح ہے اور مباح کام نیک ارادے سے ہو تو مستحسن ہے۔

ردالمحتار کی عبارت آپ نے پیش کی تھی کہ جب کوئی حکم سنت وبدعت کے درمیان دائر ہو تو ترکِ سنت کو ارتکابِ بدعت پر ترجیح ہوگی۔ اس کا جواب ہماری تحقیق سے ظاہر ہوگیا کہ اس عبارت کو معانقۂ عید سے کوئی تعلق نہیں کہ وہاں بدعت سے مراد بدعتِ مذمومہ ہے۔ جب تو اس سے بچنے کے لیے سنت کا چھوڑنا تک گوارا کیا۔ ورنہ بدعتِ مباحہ سے بچنا خود ہی مطلوب نہیں، اس کے باعث بھلا کسی سنت کو چھوڑنے کا حکم کیوں ہوگا۔

الغرض جب معانقۂ عید کو بدعتِ سیئہ سے کوئی تعلق نہیں تو اس سے ممانعت کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

دہم: میرے فتویٰ میں میاں اسماعیل دہلوی کی بھی عبارت تھی جس میں معانقۂ عید کو صراحۃً مستحسن بتایا ہے آپ نے اس عبارت کو ہاتھ نہ لگایا، اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) ایک تو یہ کہ حسبِ طرزِ مانعین صرف اس کی باطل وبے کار باتیں قابلِ قبول ہیں۔ یعنی جو باتیں اسی کے بنیادی اصول کے خلاف ہیں وہ بالکل ناقابلِ التفات ہیں۔ (۲) دوسری وہ جس کی جناب سے امید ہے کہ اس کی عبارت سے آپ کو کچھ کام نہیں، اس کی جو بات مرقات، ردالمحتار وغیرہما بلکہ فتوائے مولوی لکھنوی کے خلاف ہو قابلِ قبول نہیں۔ اگر یہ مؤخر الذکر صورت ہے تو اس کی صراحت فرمادیجیے۔ اس طرح بہت سے اختلافی مسائل کا نہایت خوبصورت طریقہ پر فیصلہ ہوجائے گا، اور شخصِ مذکور کی ضلالت وگمراہی کے فیصلے میں ہم اور آپ متفق ہو کر حقِ صریح کے اعلان میں ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہوجائیں گے۔ وباللہ التوفیق والوصول الیٰ سواء الطریق.

محمد احمد اعظمی مصباحی
بھیرہ، ولید پور، اعظم گڑھ
۱۴ر شعبان ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۰ر جولائی ۱۹۷۹ء

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

تقریب (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
حامداً و مُصلیاً و مُسلماً

زیرِ نظر کتاب "امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات" کا خاکہ پانچ برس پہلے تیار ہوا۔ مؤلف محترم نے حصہ دوم "ردِ بدعات ومنکرات" کا مسودہ بھی ان ہی دنوں تیار کرلیا۔ پھر خیال ہوا کہ امام احمد رضا کی خدمات اور علوم ومعارف کا بھی اجمالی تذکرہ شامل ہو۔ یہ کام وقتاً فوقتاً ہوتا رہا اور جہاں تک مجھے یاد آتا ہے تین سال پہلے اس کی تکمیل بھی ہوگئی۔ احباب اور شائقین کے لیے صبر آزما مرحلہ پوری کتاب کی تبییض کا تھا۔ وہ بھی کسی طرح اختتام کو پہنچا۔ اس طویل عرصے میں اصل مسودہ پر برادر محترم مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب جابجا اضافہ اور تحشیہ کا کام بھی کرتے رہے۔ اور اب ہم بے سروسامانوں کے لیے مقام مسرت ہے کہ کتابت وطباعت کے سخت ودشوار مراحل سے گزرتے ہوئے یہ گراں قدر اور محبوب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

امام احمد رضا نے علمی تحقیقات اور فنی تدقیقات کے جو انمول موتی اپنی تصانیف میں جلوہ آرا فرمائے ہیں ان کا اعتراف غیروں کو بھی ہے۔ اسی طرح دین حنیف اور فقہ حنفی کی جو لازوال خدمات امام موصوف قدس سرہ نے انجام دیں ان کے اعتراف پر بھی سبھی مجبور ہیں۔ ع

جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیے ہیں

لیکن ان کے تمام مناقب وفضائل کے خزانے میں ایک "عیب" بھی ہے۔ زبردست عیب، وہی عیب جسے شیخ شعدی نے فرمایا: ع

ہنر بچشم عداوت بزرگ ترعیبے ست

ان کا عیب یہی ہے کہ وہ ع

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

والے مذہب صلح کل کے قائل نہ تھے۔ ان کے یہاں دوستی اور دشمنی دونوں کا ایک پختہ نظریہ موجود تھا۔

(۱) امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات، مولانا یٰسین اختر مصباحی، المجمع الاسلامی، مبارک پور، ۱۹۸۰ء۔

وہ قرآن و حدیث اور اتباع ائمہ پر سختی سے قائم تھے۔ انھوں نے قرآن کریم سے محبتِ ایمان و مومن کے ساتھ ساتھ عداوت کفر و کافر کا بھی درس لیا۔ حدیث پاک سے الحبُ فی الله والبغض فی الله دونوں کی تعلیم حاصل کی۔ ائمہ سے انھوں نے یہ سبق بھی سیکھا کہ:

محبت خدا و رسول بے عداوتِ دشمنانِ آں صورت نہ بندد "تولا بے تبرا نیست ممکن" در یں جا صادق است۔[1]

اس لیے ان کا نتیجۂ فکر و قلم جہاں بارگاہ خدا و رسول اور نگاہ اہل ایمان میں ایک "نغمۂ دلنواز" تھا، وہیں دشمنان خدا و رسول اور اعداے دین و سنت کے لیے "سوہان روح" اور پیام موت۔

یہی کہتی ہے بلبل باغ جناں — کہ رضاؔ کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصف شاہ ہدیٰ — مجھے شوخی طبعِ رضا کی قسم

کلکِ رضاؔ ہے خنجر خونخوار، برق بار — اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

مگر جن کی سرشت شقاوت و شر سے مرکب ہو وہ کب شرارت و شر سے باز آسکتے ہیں۔ انھوں نے سوچا، گستاخیاں کرو، گالیاں لکھو، بہتان تراشو، طرح طرح کے خاکے اڑاؤ، کسی طرح تو اس کا قلم رکے، مگر جو اپنی عزت و آبرو، اپنے آبا و اجداد کی آبرو راہ مولیٰ میں قربان کر چکا ہو وہ کب اپنے آقا کے دین حنیف کی پاسبانی سے رک سکتا ہے۔ اس نے سب کچھ نثار کر دیا، اپنی ساری عزت و شان فدا کر دی۔ اپنے آبا و اجداد کے ناموس کی کوئی پروانہ کی صرف اس خیال جاں نواز سے کہ آقا کی عزت و ناموس کے لیے یہی سب سپر ہو جائے تو زہے نصیب! وہ جتنی دیر مجھے گالیاں دیتے ہیں اتنی دیر میرے آقا ﷺ کی گستاخی سے تو باز رہتے ہیں۔

فإن أبي ووالـــده و عرضـــي — لعرض محمد منكم و قاء ﷺ

بے شک میرے باپ اور ان کے والد (یعنی میرے دادا) اور میری آبرو یہ سب محمد ﷺ کی آبرو کے لیے تمھارے مقابل سپر ہیں۔

ان سب کے باوجود پروپیگنڈوں کا طوفان اب بھی جاری ہے۔ وہ تعظیم خدا و رسول کا پیام دیتا ہے ہمیں یہ گوارا نہیں۔ وہ ایک جہان کے دل خدا و رسول کی محبت سے لبریز کرنا چاہتا ہے ہم سے یہ برداشت نہ ہوگا۔ وہ دشمنانِ خدا و رسول کے خلاف برق خاطف گراتا ہے یہ ہمارے خرمنِ فکر و نظر کی موت ہے۔ ہمارے لیے پیام اجل ہے۔ ہم اس کی طرف سے دنیا والوں کے دل پھیریں گے۔ ہم اسے بدنام کریں گے۔ ہم علم و تحقیق اور دین و سنت کا لبادہ اوڑھ کر اہل علم و تحقیق اور فدایان دین و سنت کو اس سے برگشتہ کریں گے کہ:

---

(۱) مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی۔ م ۱۰۳۴ھ

"اس سے بچتے رہو۔ وہ تو مسلمان کو کافر کہتا تھا۔ وہ بدعات کو فروغ دیتا تھا۔ ہر اصلاحی تحریک کا دشمن تھا۔ وہ تو علم میں بھی کمزور تھا۔" "علم حدیث و تفسیر میں تو بے مایہ نہ سہی، کم مایہ ضرور تھا۔"

اس بر صغیر میں پروپیگنڈوں پر کان دھرنے والوں کی کمی نہیں۔ نہیں بلکہ بہتان و افترا اگر تاریخ و تحقیق کے دبیز پردوں کی اوٹ سے پھیلایا جائے تو پوری دنیا میں ان سے متاثر ہونے والے بہت ہیں اور تحقیق، تفتیش کرنے والے کم۔ خصوصاً وہ طبقہ تو عناد و عقیدت کا مجموعہ ہے۔ وہ بس یہ دیکھتا ہے کہ سمت مخالف سے آواز آرہی ہے یا موافق سے! رد و قبول کا فیصلہ تو پہلے ہی دھرا ہوتا ہے۔

غور کرنا چاہیے کہ انھیں مسلمانوں کی تکفیر کا درد کیسے ہو گیا؟ ان کے یہاں تو شاید ہی کوئی مسلمان مسلمان ہو۔ جس نے علی بخش، حسین بخش نام رکھ دیا وہ کافر۔ کافر ہی نہیں سب سے بڑا کافر یعنی مشرک۔ سہرا باندھ دیا کافر و مشرک۔ کسی کو دور سے پکارا اور یہ سمجھا کہ اس کو خبر ہو گئی کافر و مشرک۔ نبی اور ولی کے لیے علم غیب مانا کافر و مشرک۔ خواہ یوں کہ اسے خود یہ علم ہے یا خدا کے دینے سے ہے ہر طرح کافر و مشرک (ملاحظہ ہو تقویۃ الایمان، بہشتی زیور حصہ اول) ان کے یہاں ایسے ایسے کفر و شرک ہیں کہ یہ اولاد اگر بچ گئی تو ان کے آبا و اجداد تو ضرور کافر و مشرک۔ بلکہ دنیا کا کوئی متنفس، بلکہ خود انبیا و اولیا بلکہ خود خداوند جل وعلا تک اس فتویٔ تکفیر و اشراک کا نفاذ ہے۔ (دیکھیے الأمن والعلا لناعتي المصطفى بدافع البلاء اور أطيب البيان رد تقوية الايمان)

سیدنا امام احمد رضا نے کسی مسلم کو کافر نہ کہا بلکہ اسے کہا جس نے اسلام کو کفر، ایمان کو شرک، مسلمان کو کافر، مومن کو مشرک، خدا کو عیبی، رسول کو ناقص و بے کمال ٹھہرایا یعنی اس کو جس نے اسلام و مسلمین کی حرمت و عزت اور خدا و رسول کے ناموس سے کھیل کیا۔ اور اس طرح امام موصوف نے کروڑوں مسلمانوں کو کفر و شرک کے فتوے سے بچا لیا۔ ناموس خدا و رسول کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ اور اعداے دین کو ان کے کیفر کردار تک پہنچایا۔ یہی وہ کمال و ہنر ہے جو دشمن کی نظر میں زبردست عیب اور ناقابلِ معافی جرم ہے جس کا انتقام اب تک جاری ہے۔

بھلا وہ کسی مسلمان کو کافر کہہ سکتا ہے جو ہر کلام پر اسلامی و کلامی نقطۂ نظر سے غور کرنے کا عادی ہو کہ شاید اس میں ایمان کا کوئی پہلو ہو اور وہی اس کلام والے کی مراد ہو۔ یا للعجب:

خرد کا نام جُنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بھلا وہ بدعات کو فروغ دینے والا ہو سکتا ہے جس نے ایک ایک برائی کے خلاف جہاد مسلسل کیا ہو؟ تعزیہ داری، مزارات پر عورتوں کی حاضری، مزامیر کے ساتھ قوالی، اعراس کی بے اعتدالی، کردار و اطوار

میں حکم شرع کی خلاف ورزی، وہ کون سی بدعت قبیحہ اور وہ کون سا منکر و ممنوعہ ہے جس کی اس نے ہمنوائی کی ہو؟ ذرا اس کے آفتاب قلم کی ضیا میں اس کا رخ روشن پہچانو۔ دیکھو یہ کس کی تابشیں ہیں؟

(۱)

ایک شخص ہمیشہ قیلولہ اس طرح کرتا ہے کہ اس کی ظہر کی جماعت اولیٰ ترک ہو جاتی ہے اور عذر اس کا خوفِ فوتِ تہجد ہے۔ جائز ہے یا نہ؟

فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں جواب حق و حق جواب یہ ہے کہ عذر مذکور فی السوال سرے سے بے ہودہ و سراپا اہمال ہے۔ وہ زعم کرتا ہے کہ سنتِ تہجد کا حفظ و پاس اسے تفویت جماعت پر باعث ہوتا ہے۔ اگر تہجد بروجہ سنت ادا کرتا تو وہ خود فوت واجب سے اس کی محافظت کرتا۔ نہ کہ الٹا فوت کا سبب ہوتا۔ قال اللہ عزوجل۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الفَحشَاءِ وَالمُنۡکَرِ۔ بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

علیکم بقیام اللیل فإنه دابُ الصالحین قبلکم و قربة إلی الله تعالیٰ ومنهاة عن الإثم وتكفير للسیئات ومطردة للداء عن الجسد (رواه الترمذی فی جامعه. وابن أبی الدنیا فی التهجد. وابن خزیمه فی صحیحه. والحاکم فی المستدرك وصححه. والبیهقی فی سننه عن أبی امامة الباهلی. (۲) وأحمد. والترمذی وحسنه. والحاکم. والبیهقی عن بلال (۳) والطبرانی فی الکبیر. عن سلمان الفارسی. (٤) وابن السنی عن جابر بن عبد الله. (٥) وابن عساکر عن أبی الدرداء رضی الله تعالیٰ عنهم أجمعین. (ص:۲۳۰. فتاویٰ رضویه، ج:۳)

تہجد کی ملازمت کرو کہ وہ اگلوں کی عادت ہے اور اللہ عزوجل سے نزدیک کرنے والا اور گناہوں سے روکنے والا اور برائیوں کا کفارہ اور بدن سے بیماری دور کرنے والا۔

تو فوتِ جماعت کا الزام تہجد کے سر رکھنا قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ اگر میزان شرع مطہر لے کر، اپنے احوال و افعال تولے، تو کھل جائے کہ یہ الزام خود اسی کے سر تھا۔

یا ھٰذا: سنت ادا کیا چاہتا ہے تو بروجہ سنت ادا کر۔ یہ کیا کہ سنت لیجیے اور واجب فوت کیجیے۔ ذرا گوش ہوش سن! اگرچہ حق تلخ گزرے۔ وسوسہ ڈالنے والے نے تجھے یہ جھوٹا بہانہ سکھایا کہ اسے مفتیان زمانہ پر پیش کرے۔ جس کا خیال ترغیبات تہجد کی طرف جائے، تجھے تفویتِ جماعت کی اجازت دے۔ جس کی نظر تاکیداتِ جماعت پر جائے، تجھے ترک تہجد کی مشورت دے کہ مَنِ ابتُلِیَ بِبَلِیّتَینِ اختار أهونهما بہرحال مفتیوں

کے ایک نہ ایک کے ترک کی دستاویز نقد ہے۔

مگر حاشا! خدام فقہ و حدیث، نہ تجھے تفویتِ واجب کا فتویٰ دیں گے نہ عادی تہجد کو ترک تہجد کی ہدایت کریں گے۔ ارشاد حضور سید الاسیاد ﷺ:

"یا عبد الله! لا تکُن مِثلَ فُلَانٍ کَانَ یَقُومُ اللیلَ فَتَرَكَ قِیَامَ اللیل." (رواه الشیخان عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله تعالیٰ عنهما) کا خلاف کریں گے۔

تہجد و جماعت میں تعارض نہیں۔ ان میں کوئی دوسرے کی تفویت کا داعی نہیں۔ بلکہ یہ ہوائے نفسِ شریر و سوئے طرز تدبیر سے ناشی (پیدا) ہوا۔

(ا) **یا ھٰذا:** اگر تو وقت جماعت جاگتا ہوتا، اور بطلب آرام پڑا رہتا ہے۔ جب تو صراحۃً آثم و تارکِ واجب۔ اور اس عذر باطل میں مبطل و کاذب ہے۔ سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

الجَفَاءُ کُلَّ الجَفَاء. والکُفر والنِّفاقُ مَنْ سَمِعَ مُنَادِیَ اللهِ ینادِی إلی الصلوٰة فلا یُجِیبُه.

ظلم پورا ظلم، اور کفر اور نفاق ہے کہ آدمی اللہ کے منادی کو نماز کی طرف بلاتا سنے اور حاضر نہ ہو۔

(۲) اور اگر ایسا نہیں تو اپنی حالت جانچ۔ کہ یہ فتنۂ خواب کیوں کر جاگا؟ (اس جملے پر قربان جائیے۔ ۱۲/ محمد احمد اعظمی مصباحی) اور یہ فساد عجاب کہاں سے پیدا ہوا؟ اس کی تدبیر کر۔

(الف) کیا تو قیلولہ ایسے تنگ وقت کرتا ہے کہ وقت جماعت نزدیک ہوتا ہے۔ ناچار ہوشیار نہیں ہونے پاتا؟ یوں ہے تو اول وقت خواب کر۔ اولیائے کرام قَدَّسَنَا اللہُ تعالیٰ بِاَسرارِھم نے قیلولہ کے لیے خالی وقت رکھا ہے، جس میں نماز و تلاوت نہیں۔ یعنی ضحوۂ کبریٰ سے نصف النہار تک۔ وہ فرماتے ہیں کہ چاشت وغیرہ سے فارغ ہو کر خواب خوب ہے کہ اس سے تہجد میں مدد ملتی ہے۔ اور ٹھیک دوپہر ہونے سے کچھ پہلے جاگنا چاہیے کہ پیش از زوال وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر وقت زوال کہ ابتدائے ظہر ہے، ذکر و تلاوت میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ جو پیش از زوال بیدار ہو گیا اس سے فوتِ جماعت کے کوئی معنی ہی نہیں۔

(ب) کیا اس وقت سونے میں تجھے کچھ عذر ہے؟ اچھا! ٹھیک دوپہر کو سو مگر نہ اتنا کہ وقت جماعت آ جائے۔ ایک ساعت قلیلہ قیلولہ بس ہے۔

اگر طول خواب سے خوف کرتا ہے:

(ا) تکیہ نہ رکھ۔ بچھونا نہ بچھا۔ کہ بے تکیہ و بے بستر سونا بھی مسنون ہے۔

(۲) سوتے وقت دل کو خیال جماعت سے خوب متعلق رکھ کہ فکر کی نیند غافل نہیں ہوتی۔

(۳) کھانا حتی الامکان علی الصباح کھا، کہ وقتِ نوم تک بخاراتِ طعام فرو ہولیں اور طول منام کے باعث نہ ہوں۔

(۴) سب سے بہتر علاج تقلیل غذا ہے۔ سید المرسلین ﷺ فرماتے ہیں:

مَاملأ ابن آدم وِعاءً شَراً مِنْ بطنه بِحَسْبِ ابْنِ اٰدم أكلاَتٌ يُقِمْنَ صُلْبَه فاِن كان لا محالة فثُلُثٌ لطَعَامِهِ وَثُلُثٌ لشربِهِ وَثُلُثٌ لِنفسِهِ. رواه الترمذی وحسنه وابن ماجه وابن حبان عن المقدام بن معديكرب رضی الله تعالىٰ عنه.

آدمی نے کوئی برتن پیٹ سے بدتر نہ بھرا۔ آدمی کو بہت ہیں چند لقمے جو اس کی پیٹھ سیدھی رکھیں۔ اور اگر یوں نہ گزرے تو تہائی پیٹ کھانے کے لیے، تہائی پانی، تہائی سانس کے لیے۔

پیٹ بھر کر قیام لیل کا شوق رکھنا بانجھ سے بچہ مانگنا ہے۔ جو بہت کھائے گا، بہت پیے گا۔ جو بہت پیے گا بہت سوئے گا۔ جو بہت سوئے گا، آپ ہی خیرات و برکات کھوئے گا۔

(۵) یوں بھی نہ گزرے تو قیام لیل میں تخفیف کر۔ دو رکعتیں خفیف و تام۔ بعد عشا ذرا سونے کے بعد۔ شب میں کسی وقت پڑھنی۔ اگرچہ آدھی رات سے پہلے۔ ادائے تہجد کو بس ہیں۔ مثلاً نو بجے عشا پڑھ کر سو رہا۔ دس بجے اٹھ کر دو رکعتیں پڑھ لیں۔ تہجد ہو گیا۔

(۶) سوتے وقت اللہ عزوجل سے توفیق جماعت کی دعا اور اس پر سچا توکل۔ مولیٰ تبارک و تعالیٰ جب تیرا حسن نیت وصدق عزیمت دیکھے گا ضرور تیری مدد فرمائے گا۔ مَن يَتَوكّل عَلى اللهِ فَهُوَ حَسبُه.

(۷) اپنے اہل خانہ وغیرہم سے کسی معتمد کو متعین کر کہ وقت جماعت سے پہلے جگا دے کمَا وَكّلَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله تعالىٰ عليه وسلم بلالاً رضی الله تعالىٰ عنه ليلة التَّعريس.

ان ساتوں تدبیروں کے بعد کسی وقت سوئے، ان شاء اللہ تعالیٰ فوت جماعت سے محفوظی ہوگی۔ اور اگر شاید اتفاق سے کسی دن آنکھ نہ بھی کھلی اور جگانے والا بھی بھول گیا۔ یا سو رہا۔ کما وقع لسيدنا بلال رضی الله تعالىٰ عنه تو یہ اتفاقی عذر مسموع ہوگا۔ اور امید ہے کہ صدق نیت و حسن تدبیر پر ثواب جماعت پائے گا۔ و بالله التوفيق۔

(ج) کیا تیری مسجد میں بہت اول وقت جماعت کرتے ہیں کہ دوپہر سے اس تک سونے کا وقفہ نہیں؟ جب تو ساری دقتوں سے چھوٹ گیا۔ سو کر پڑھی۔ یا پڑھ کو سوئے۔ بات تو ایک ہی ہے جماعت پڑھ ہی کر نہ سوئے کہ خوف فوت اصلاً نہ رہے جیسے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم روز جمعہ کیا کرتے تھے۔

غرض یہ تین صورتیں ہیں۔ (۱) پیش از زوال سو اٹھنا (۲) بعد جماعت سونا۔ ان میں کوئی خدشہ ہی نہیں۔ (۳) اور تیسری صورت میں وہ سات تدبیریں ہیں۔ رب عزوجل سے ڈرے۔ اور بصدق عزیمت ان پر عمل کرے۔ پھر دیکھیں کیوں کر تہجد تفویت جماعت کا موجب ہوتا ہے۔

بالجملہ نہ ماہ نیم ماہ۔ کہ مہر نیمروز کی طرح روشن ہوا کہ عذر مذکور یکسر مدفوع و محض نامسموع۔ جماعت و تہجد میں اصلاً تعارض نہیں کہ ایک کا حفظ دوسرے کے ترک کی دستاویز کیجیے۔ اور بوجہ تعذرِ جمع، راہِ ترجیح لیجیے۔ هذا هو حق الجواب. والله الهادی الیٰ سبيل الصواب۔

با ایں ہمہ اگر بالکل خلاف واقعہ و بیکار طور پر یہی مان لینا ضروری کہ جماعت و تہجد میں تعارض ہے لہٰذا ایک ہی کی ادائگی ہوگی دوسرے کو ترک کرنا ہوگا۔ اب ترجیح جماعت کو ہو یا تہجد کو؟ تو تہجد کی ترجیح محض باطل و مہجور۔

(۱) اگر حسب تصریح عامۂ کتب، تہجد مستحب و حسب اختیار جمہور مشائخ جماعت واجب مانیے، جب تو ظاہر کہ واجب و مستحب کی کیا برابری؟ نہ کہ اس کو اس پر تفضیل و برتری!

(۲) اور اگر تہجد میں اعلیٰ الاقوال کی طرف ترقی اور جماعت میں ادنی الاحوال کی جانب تنزل کر کے دونوں کو سنت ہی مانیے۔ تاہم تہجد کو جماعت سے کچھ نسبت نہیں۔

جماعت بر تقدیر سنیت بھی تمام سنن حتی کہ سنت فجر سے بھی اہم و آکد و اعظم ہے۔ لہٰذا اگر امام کو نماز فجر میں پائے اور سمجھے کہ سنتیں پڑھے گا تو تشہد نہ ملے گا۔ تو بالاجماع سنتیں ترک کر کے جماعت میں مل جائے۔

اور سنت فجر بالاتفاق بقیہ تمام سنن سے افضل۔ پھر مذہب اصح پر سنت قبلیۂ ظہر بقیہ سنن سے آکد ہیں اور امام شمس الائمہ حلوائی کے نزدیک سنت فجر کے بعد افضل و آکد رکعتین مغرب ہیں۔ پھر رکعتین ظہر۔ پھر رکعتین عشا۔ پھر قبلیۂ ظہر۔ پھر شک نہیں کہ ہمارے ائمہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک سب سنن رواتب، تہجد سے اہم و آکد ہیں۔ ولہٰذا ہمارے علما سنن رواتب کی نسبت فرماتے ہیں: إنها لِتَأكُّدِهَا اَشْبَهَت الْفَرِيْضَة. (یہ مؤکد ہونے کے باعث فرض کے مشابہ ہیں) اور یہی مذہب جمہور و مشرب منصور ہے۔

تو تہجد جماعت کے کمتر از کمتر سے کمتر۔ پانچویں درجہ میں واقع ہے۔ سب سے آکد جماعت۔ پھر سنت فجر۔ پھر قبلیۂ ظہر۔ پھر باقی رواتب۔ پھر تہجد وغیرہ سنن و نوافل۔

اور دوسرے قول پر تو کہیں ساتویں درجے میں جا کر پڑے گا۔ سب سے اقویٰ جماعت۔ پھر سنت فجر۔ پھر سنت مغرب۔ پھر بعدیۂ ظہر۔ پھر بعدیۂ عشا۔ پھر قبلیۂ ظہر۔ پھر تہجد وغیرہا۔

پس تہجد کو سنت ٹھہرا کر بھی جماعت سے افضل کیا، برابر کہنے کی بھی اصلاً کوئی راہ نہیں۔ نہ کہ مستحب مان کر۔

اگر کہیے یہاں کلام جماعتِ اولیٰ میں ہے کہ سوال میں اس کی تصریح موجود۔ اور واجب یا اس اعلیٰ درجہ کی موکد "مطلق جماعت" ہے۔ نہ خاص جماعت اولیٰ۔ بلکہ وہ صرف افضل و اولیٰ اور فضل تہجد اس سے اعظم و اعلیٰ۔ تو حفظ تہجد کے لیے ترکِ اولیٰ جائز و روا۔ اگرچہ افضل، اتیان و اَدا۔

اقول: یہ تاصیل و تفریع، سراسر بے اصل و احداثِ شنیع۔ زنہار زنہار! ہرگز جائز نہیں کہ بے عذر مقبول شرعی۔ جماعت ثانیہ کے بھروسے پر جماعت اولیٰ قصداً چھوڑ دیجیے۔ اور داعیِ الٰہی کی اجابت نہ کیجیے۔ جماعت ثانیہ کی تشریع، اس غرض سے ہے کہ احیاناً بعض مسلمین کسی عذر صحیح مثل مدافعتِ اخبثین۔ یا حاجت طعام وغیرہا کے باعث جماعت اولیٰ سے رہ جائیں، وہ برکتِ جماعت سے مطلقاً محرومی نہ پائیں۔ بے اعلان و تداعی (یعنی بے اذان) محراب سے جدا ایک گوشے میں جماعت کر لیں۔ نہ کہ اذان ہوتی رہے۔ داعیِ الٰہی پکارا کرے۔ جماعت اولیٰ ہوا کرے۔ مزے سے گھر میں بیٹھے باتیں بنائیں یا پاؤں پھیلا کر آرام فرمائیں کہ عجلت کیا ہے؟ ہم اور کر لیں گے۔ یہ قطعاً یقیناً بدعت سیئہ شنیعہ ہے۔[1]

اس فتوے میں ایک خاص قابل توجہ امر ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی حیثیت صرف ایک مفتی کی نہ تھی بلکہ ایک مصلح و مجدد کی شان ان کے فتاویٰ سے بھی عیاں ہے۔ بحیثیت مفتی سوال مذکور کا اتنا جواب کافی تھا کہ تہجد و جماعت میں تعارض نہیں۔ دونوں کی ادائگی کی تدبیر کیا چاہئے۔ اور اگر بالفرض یہ ممکن نہ ہو تو جماعت ترک کر کے ادائے تہجد کی راہ نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تہجد چھوڑے مگر جماعت سے مفر نہیں۔ اور یہ حکم خاص جماعت اولیٰ کا ہے۔ ثانیہ تو محض ضرورت اور صحیح عذر کے لیے مشروع ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن اس طرح کے جواب سے سائل کو صرف حکم مسئلہ معلوم ہو سکتا ہے۔ بدعت و منکر کا قلع قمع نہ ہو سکے گا۔ کہ تمام وساوس شیطانی اور شہوات نفسانی کا رد ہو، آدمی میں نیکی کی ادائگی اور برائی کے چھوڑنے کا جذبہ بکراں فروغ پائے۔ اور سبیل مستقیم پر گامزن ہو جائے اس لیے جواب میں سیدنا الشیخ عبد القادر الجیلانی کے خطبات کا اندازِ واعظانہ و زاجرانہ اختیار فرمایا۔ اور ساتھ ہی طرز عالمانہ و اسلوب محققانہ و مفتیانہ بھی اپنائے رکھا۔ جس کے بعد سائل اگر دل میں ذرا بھی زندگی رکھتا ہو تو یہ فتویٰ اس کے لیے بہترین مرشد و شیخ کا کام دے سکتا ہے۔ بیماریِ دل کا خوب تر علاج ہو سکتا ہے۔ اور چوں کہ یہ بیماری صرف ایک شخص کی نہیں بلکہ بلائے عام ہے اس لیے یہ فتویٰ نافعِ خاص و عام ہے۔ وھو الھادی والموفق۔

---

(۱) ملخصاً فتاویٰ رضویہ، سوم، ص:۳۳۰ تا ۳۳۵۔ طبع اول، سنی دارالاشاعت مبارک پور۔۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء

علامہ بریلوی کے فتاویٰ کے لیے یہ ایک خاص موضوع ہے جس پر تحقیق کی جا سکتی ہے۔ عنوان اس طرح کا ہو گا: "رضوی فتاویٰ میں اصلاح و موعظت کا عنصر"

(۲)

ایک سوال ہے کہ حافظ کو ادائے تراویح کے لیے دورۂ قرآن کرنا پڑتا ہے۔ اس سخت محنت کے پیش نظر روزۂ فرض اس سے معاف ہے یا نہیں؟

سوال فارسی میں ہے اس لیے جواب بھی فارسی ہے۔ اس کا خلاصہ اردو میں یہاں لکھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

جھوٹا بہانہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قراءت قرآن روزہ سے مانع ہے۔ اطراف عالم اور اکناف زمین میں بوڑھے، بچے کم طاقت ہزار با ہزار حفاظ قرآن دن میں روزہ بھی رکھتے ہیں اور رات کو قرآن بھی پڑھتے ہیں۔ اس سے ان کو کوئی ضرر نہیں لاحق ہوتا اور ہو بھی کیسے؟ جب کہ روزہ صحت ہے اور قرآن شفا۔ ہاں اعتقاد صحیح چاہئے تاکہ ان عطیات کا فائدہ رونما ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا. اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور اس سے ظالموں کو نقصان ہی بڑھتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

أغزُوا تَغْنَمُوا وَصُوْمُوا تَصِحُّوا وَسَافِرُوا تَسْتَغْنُوا.

غزوہ کرو غنیمت یاب ہو گے۔ روزہ رکھو صحت پاؤ گے۔ سفر کرو مالدار ہو گے۔

ذرا بھی باور نہیں ہوتا کہ اس شخص کو قراءت قرآن روزہ سے روکتی ہے۔ لہٰذا در حقیقت یہ صرف عذر باطل ہے اور پست ہمتی و نفس پروری ہے۔ والعیاذ باللہ.

اگر بالفرض ایسا ہی ہے کہ قرآن پڑھنے سے اس کو اس قدر کمزوری لاحق ہو جاتی ہے کہ روزہ کی طاقت نہیں رہ جاتی تو اس صورت میں یہ قرآن پڑھنا اس کے حق میں نہ سنت ہو گا نہ باعث ثواب۔ بلکہ حرام و موجب عذاب۔

علما نے مطلقاً فرمایا ہے کہ ہر وہ عمل جو باعثِ ضعف اور مانعِ روزہ ہو۔ جائز نہیں۔ اور اگر کسی شخص کی ایسی حالت ہو کہ روزہ رکھے تو نماز میں قیام نہ کر سکے، اس کے لیے روزۂ رمضان چھوڑنا جائز نہیں۔ بلکہ روزہ رکھے اور نماز بیٹھ کر ادا کرے۔

سبحان اللہ! علما کے نزدیک قیام نماز جو خود فرض ہے روزہ کی رعایت سے ساقط ہو جاتا ہے۔ یہاں روزہ صرف ایک سنت کی خاطر، بلکہ حصول امامت سے ملنے والے "تفاخر" کی خاطر، بلکہ ایک ایسے فعل ناجائز و گناہ و

حرام (یعنی تفاخر) کی خاطر معاف ہو جائے۔ یہ تو نہیں مگر صریح جہالت۔ یا قبیح مخالفت۔

اس عزیز سے کہیں کہ "حق سبحانہ وتعالیٰ نے روزۂ رمضان تجھ پر اور تجھ جیسے سب پر فرض عین فرمایا ہے۔ اور قرآن تراویح میں ختم کرنا نہ فرض ہے نہ سنت عین۔ اگر وقتِ دَور، کثرت تلاوت کے باعث جو اکثر حافظوں کے لیے ناگزیر ہے۔ تجھے اتنی کمزوری آجاتی ہے تو یہ تیرے ذمہ لازم نہیں فرمایا گیا۔ کسی دوسرے حافظ کی اقتدا کر تراویح ادا کر۔ روزہ رکھ۔ فرض بھی حاصل کر۔ سنت بھی تھام۔ اور اگر اتنا نہیں ہو سکتا تو تراویح میں پورا قرآن نہ پڑھ نہ سن۔ یہی بیس رکعات تجھ سے جس طرح ادا ہو سکیں ادا کر۔ اور روزہ چھوڑ کر نارِ جحیم و عذاب الیم کا مستحق نہ بن۔

اے بھائی! روزہ فرض عین ہے۔ اور فرض عین فرض کفایہ پر مقدم۔ تراویح میں ختم قرآن تو سنت کفایہ ہے اور یہ سنت کفایہ سنت عین سے مؤخر۔ یہ کیا بے وقوفی ہے کہ سنت کفایہ کو فرض عین پر مقدم کریں۔

اس کلام کے بعد سیدنا غوث الثقلین، پیر دستگیر محی الدین ابو محمد، عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتاب مبارک "فتوح الغیب" شریف سے کچھ عبارت تحریر فرمائی ہے جو ایسے تمام لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو نوافل و مستحبات میں تو کوشاں ہیں اور فرائض و واجبات سے غافل۔ فرماتے ہیں:

یَنبَغِیْ لِلْمُؤمِنِ اَنْ یَشتغل اَوَّلًا بالفَرائِضِ. فِاذا فَرَغَ مِنْها اشْتغَل بِالسنَنِ. ثُمَّ یَشْتَغِل بِالنَّوافِلِ وَالفَضَائِلِ. فَمَالَمْ یَفْرُغ مِنَ الفَرائِضِ فَاشتِغَالٌ بالسُّنَنِ حُمُقٌ وَّرُعُوْنَۃٌ. فَاِنِ اشْتغَل بِالسّنَنِ وَالنَّوافِلِ قَبْلَ الفَرائِضِ لَم تُقْبَلْ مِنْہُ وَاُھِیْنَ. فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ رَجُلٍ یَدْعُوہُ الْمَلِكُ اِلٰی خِدْمَتِہٖ فَلَا یأتِیْ اِلَیْہِ و یَقِفُ بِخِدْمَۃِ الاَمِیْرِ الَّذِیْ ھُوَ غُلامُ المَلِكِ وخَادِمُہٗ وتَحْتَ ولاَیَتِہٖ.

عَنْ عَلِیِّ اَبِی طَالِبٍ کرَّمَ اللہُ تعالیٰ وَجْھَہٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلی اللہُ علیہ وسلم: اِنَّ مَثَلَ مُصَلِّی النَّوافِلِ وَعَلَیْہِ فَرِیْضَۃٌ کمَثَلِ حُبْلٰی حَمَلَتْ فَلَمَّادنٰی نِفَاسُھَا اَسْقَطَتْ، فَلاھِیَ ذاتُ حَمْلٍ وَّلَاھِیَ ذَاتُ وِلَادٍ. وَکذالِكَ المُصَلِّیْ لَا یَقْبَلُ اللہُ لَہٗ نَافِلَتَہٗ حتّٰی یُؤدِیْ الفَرِیْضَۃَ وَمَثَل المُصَلِّیْ کمثل التاجر، لایحصل له ربحه حتی یأخذرأس ماله فکذٰلك المصلی بالنَّوافِلِ لَایُقْبَلُ لَہٗ نَافِلَتُہٗ حتی یُؤدِّیِ الفَرِیْضَۃَ.

اس کا فارسی تشریحی ترجمہ بھی شیخ محقق مولانا عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شرح فتوح الغیب سے مختصراً نقل فرمایا ہے۔ یہاں اس کا اردو خلاصہ تحریر کیا جاتا ہے۔

مسلمان کو یہ چاہیے کہ پہلے ان چیزوں پر کاربند ہو جو فرض و واجب ہیں۔ جب ان سے عہدہ برآ ہو جائے تو

سنتوں میں مشغول ہو۔ پھر نوافل و فضائل میں مشغول ہو۔ فرائض چھوڑتے ہوئے سنتوں میں مشغولی جہالت مؤکد بے وقوفی کی نشانی ہے۔ اگر فرائض ترک کرتے ہوئے سنن و نوافل میں مشغول ہو تو یہ نوافل و سنن قبول نہ ہوں گے بلکہ وہ ذلیل و خوار کر دیا جائے گا۔ اس کا حال اس کی طرح ہے جسے بادشاہ اپنے خدمت میں یاد فرمائے تو وہ اس کے پاس حاضر نہ ہو۔ اور کسی امیر کی خدمت میں کھڑا ہو جو بادشاہ کا خادم و غلام اور اس کے زیر قدرت و تصرف ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی مثال جس کے ذمہ فرض ہے اور وہ نوافل پڑھ رہا ہے اس حاملہ عورت کی ہے جس کا زمانہ حمل پورا گیا ہو، جب وقتِ ولادت قریب آیا تو ناتمام بچہ جنا۔ (جیسے اس نے مشقتیں جھیلیں اور ثمرہ کچھ نہ ملا۔ یوں ہی فرض چھوڑ کر نوافل پڑھنے والا سختیاں اٹھاتا ہے اور نتیجہ کچھ حاصل ہونے والا نہیں) تو وہ عورت نہ تو حمل والی ہوئی کیوں کہ مقصودِ حمل بچہ ہی نہیں۔ نہ ہی بچہ والی ہے کہ حمل ہی ساقط ہو گیا۔ اسی طرح نمازی کا نفل اللہ تعالیٰ قبول نہ کرے گا جب تک کہ فرض ادا نہ کرے۔ ایسے نمازی کی مثال تاجر کی ہے۔ جسے نفع حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اپنی پونجی نہ رکھے اسی طرح (فرض نمازی کی پونجی ہے) اس کا نفل قبول نہ ہو گا جب تک فرض ادا نہ کرے۔ (1)

پھر چند احادیث و عبارات مزید لکھ کر حق اصلاح وارشاد ادا کر دیا ہے۔ واللہ الھادی.

یہ فتویٰ نہ صرف ایک شخص کے لیے بلکہ بے شمار ایسے افراد کے لیے باعثِ ہدایت ہے جو طاعات و عبادات میں تو منہمک ہیں مگر ترتیبِ طاعات سے بے پروا اور رعایتِ واجبات و فرائض سے غافل ہیں۔

(۳)

بعض حاضرین نے عرض کیا۔ حضور! دنیوی مکروہات نے ایسے گھیرا ہے کہ روز ارادہ کرتا ہوں کہ آج قضا نمازیں ادا کرنا شروع کروں گا مگر نہیں ہوتا۔ کیا یوں ادا کروں کہ پہلے تمام نمازیں فجر کی ادا کروں پھر ظہر کی۔ پھر اور اوقات کی۔ تو کوئی حرج ہے؟ مجھے یہ بھی یاد نہیں کتنی نمازیں قضا ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے؟

ارشاد: قضا نمازیں جلد سے جلد ادا کرنا لازم ہیں۔ نہ معلوم کس وقت موت آجائے۔ کیا مشکل ہے کہ ایک دن کی بیس رکعت ہوتی ہے (یعنی فجر کے فرض کی دو رکعت، ظہر کی چار، عصر کی چار، مغرب کی تین، عشا کی سات (چار فرض تین وتر) ان نمازوں کو سوائے طلوع و غروب و زوال کے ہر وقت ادا کر سکتا ہے۔ اور اختیار ہے کہ پہلے فجر کی سب نمازیں ادا کرے پھر ظہر پھر عصر پھر مغرب پھر عشا (و وتر) کی۔ یا سب نمازیں ساتھ ساتھ ادا کرتا جائے اور ان کا ایسا حساب لگائے کہ تخمینہ میں باقی نہ رہ جائیں۔ زیادہ ہو جائیں تو حرج نہیں۔ اور وہ سب بقدر طاقت رفتہ رفتہ جلد ادا کرے۔ کاہلی نہ کرے۔ جب تک فرض ذمہ میں باقی رہتا ہے کوئی نفل قبول نہیں کیا جاتا۔ نیت ان نمازوں کی

(1) فتاویٰ رضویہ، ج:۴، ص:۵۱۱ تا ۵۱۴ ملخصاً۔ مطبوعہ سُنّی دار الاشاعت مبارک پور۔ ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷

اس طرح ہو مثلاً سو بار کی فجر قضا ہے تو ہر بار یوں کہے کہ سب سے پہلی جو فجر مجھ سے قضا ہوئی۔ ہر دفعہ یہی کہے۔ یعنی جب ایک ادا ہوئی تو باقیوں میں جو سب سے پہلے ہے۔ اسی طرح ظہر وغیرہ ہر نماز میں نیت کرے۔

اسی سلسلے میں ارشاد فرمایا: اگر کسی شخص کے ذمے تیس یا چالیس سال کی نمازیں واجب الادا ہیں۔ اس نے اپنے ان ضروری کاموں کے علاوہ جن کے بغیر گزر نہیں۔ کاروبار ترک کر کے پڑھنا شروع کیا اور پکا ارادہ کر لیا کہ کل نمازیں ادا کر کے آرام لوں گا اور فرض کیجیے اسی حالت میں ایک مہینہ یا ایک دن ہی کے بعد اس کا انتقال ہو جائے تو اللہ اپنی رحمت کاملہ سے اس کی سب نمازیں ادا کرے گا۔

قال اللہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِراً اِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللهِ. جو اپنے گھر سے اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرتا ہوا نکلے پھر اسے راستے میں موت آ جائے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمۂ کرم پر ثابت ہو چکا۔

یہاں مطلق فرمایا۔ اگر ایک ہی قدم نکالا اور موت نے آلیا تو پورا کام اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور کامل ثواب پائے گا۔ وہاں نیت دیکھتے ہیں۔ سارا دار و مدار حسنِ نیت پر ہے۔ (۱)

④

اندرون نماز (یا دوران خطبہ) رسول پاک ﷺ کا نام سننے پر زبان سے درود بھیجنے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

اللہ عزوجل کا نام پاک سن کر حکم ہے کہ عزوجل یا جل جلالہٗ یا اس کے مثل کلمات تعظیمی کہے۔ حضور اقدس ﷺ کا نام پاک سن کر واجب ہے کہ ﷺ یا علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام۔ یا اس کے مثل کلماتِ درود کہے۔

مگر یہ دونوں وجوب بیرونِ نماز ہیں۔ نماز میں سوا اُن کلمات کے جو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقرر فرما دیے ہیں اور کی اجازت نہیں۔ خصوصاً جہریہ نماز میں وقت قراءت امام، مقتدی کا سننا، اور خاموش رہنا واجب ہے۔ امام کے خطبہ پڑھنے میں جب اللہ عزوجل اور سید عالم ﷺ کے اسمائے طیبہ آئیں۔ سامعین دل میں کلماتِ تقدیس و درود کہیں۔ زبان سے کہنے کی وہاں بھی اجازت نہیں۔ نماز میں نامِ اعلیٰ سن کر "جل وعلا یا نامِ مبارک سن کر ﷺ کہا۔ اگر بقصد جواب ہے نماز جاتی رہے گی۔ سہواً ہو یا قصداً۔ اور اگر بلا قصد جواب ہے تو قصداً ممنوع اور سہواً پر مواخذہ نہیں۔ (۲)

---

(۱) ملفوظات۔ حصہ اول، شائع کردہ کتب خانہ سمنانی میرٹھ۔ ۱۳۸۳ھ

(۲) ص: ۴۴۹، ج: ۳۔ فتاویٰ رضویہ طبع اول سنی دارالاشاعت مبارک پور۔ ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۰ء

⑤

اسی طرح بہت سے منکرات و بدعات کے بارے میں بے شمار تنبیہات ہیں ان سب کا استقصا نہ میرا مطلوب ہے، نہ برادر مولف زید فیضہ کا مقصود ہے۔ البتہ اصل کتاب میں اس کے نمونوں کا کافی و وافی حصہ موجود ہے۔ ذرا ورق الٹ کر دیکھیے پھر فیصلہ کیجیے کہ یہ کس کا قلم ہے جس نے بدعات و مفاسد کی بیخ کنی میں پوری جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا ہے۔ نہ تو اسے لومۂ لائم کا خوف ہے نہ دنیا والوں کی ناراضی کا اندیشہ۔ اسے اپنے مولیٰ کی رضا کافی ہے، اس کی آنکھوں میں شریعتِ مصطفیٰ ﷺ کا نور اور فقہ اسلامی کا کیف و سرور ہے۔ اس لیے وہ فیصلے کرتا ہے تو حق اور اٹل فیصلے کرتا ہے۔ نہ تو اس میں افراط ہے کہ بدعت کو شرک۔ گناہ کو کفر۔ مکروہ تنزیہی کو حرام۔ یا کم از کم صغیرہ بلا اصرار کو کبیرہ۔ خفی کو جلی کہہ دے۔ نہ اس میں تفریط ہے کہ مکروہ یا خلاف اولیٰ کو غیر مکروہ و مستحب، بدعت کو سنت، منکر کو معروف یا ناجائز کو جائز کہہ دے۔ اعتدال ہے اور صرف اعتدال یہی وہ اصلاح ہے جو فساد و افساد سے پاک ہوتی ہے۔

واللہ اس نے بدعات شکنی کی ہے اور اپنے آبدار قلم کی وہ صولت و ہمت دکھائی ہے جس کی نظیر اس کے حریفوں میں صبح قیامت تک نہیں مل سکتی۔ ثبوت کے لیے ایک بار پھر اس کتاب کا حصۂ دوم کھولیے اور غور سے پڑھیے۔ شوقِ دل مزید وارفتہ کرے تو خود اس کی تصانیف نکالیے اور دامنِ فکر و تدبر تھام کر بنظرِ عمیق مطالعہ فرمائیے۔ دیکھیے کہ میرے بیان سے زیادہ اس میں ہے یا نہیں؟ واللہ الموفق والهادی الیٰ سواء السبیل۔

اللہ اکبر! بھلا کسی صاحب ہوش و خرد کے دماغ میں یہ آنے والی بات ہے کہ جس نے بدعات و منکرات کی اتنی زبردست حوصلہ شکنی کی ہے وہی بدعات کا فروغ دینے والا ہو؟

دیکھو تو سہی! کہیں بدعت شکنی کو بدعت افزائی تو نہیں کہہ دیا؟ فروغِ سنت کا نام فروغ بدعت تو نہ رکھ دیا؟ تعظیم خدا و رسول، تکریم صحابہ و اولیا اور حفاظتِ دین و سنت کا نام تمھاری اصطلاح میں بدعت تو نہیں؟ ذرا اچھی طرح غور کر لو۔ اور صحت ہوش و خرد کے عالم میں بولو! خدا تم سے سچ کہلوائے: آمین۔

⑥

پھر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ مجدد اعظم اور مصلح اکبر کردار و عمل میں اس سے کہیں زیادہ پختہ ہے جتنا کہ گفتار و قلم میں ہے۔ وہ اگر گفتار کا غازی ہے تو کردار کا فاتح۔ قلم کا دھنی ہے تو عمل کا تاجدار۔ ملاحظہ فرمائیے چند شواہد۔

(۱) جس فقیہ کے پاس فتوے اتنی کثرت سے آتے ہوں کہ اس کے اوقات جوابِ مسائل میں مصروف ہوں اس سے جماعت جو واجب ہے اور سنن مؤکدہ جو قریب بواجب ہیں معاف ہو جاتی ہیں۔ دیکھیے کتب فقہ۔ مگر امام احمد رضا کی شان تقویٰ قابل دید ہے۔ سوالات اتنی کثرت سے آتے تھے کہ ایک موقع پر (کسی نے کچھ اس

طرح لکھ دیا تھا کہ جواب کی جو کچھ فیس ہوگی ادا کی جائے گی) اصل مسئلہ کے جواب کے بعد رقم طراز ہیں:

"یہاں بحمد اللہ تعالیٰ فتویٰ پر کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ بفضلہ تعالیٰ تمام ہندوستان و دیگر ممالک مثل: چین، افریقہ، امریکہ و خود عرب شریف و عراق سے استفتے آتے ہیں۔ اور ایک وقت میں چار چار سو فتوے جمع ہو جاتے ہیں۔ بحمد اللہ تعالیٰ حضرت جد امجد قدس سرہ العزیز کے وقت سے اس ۱۳۳۷ھ تک اس دروازے سے فتوے جاری ہوئے اکانوے برس اور خود اس فقیر غفرلہ کے قلم سے فتوے نکلتے ہوئے بعونہ تعالیٰ اکاون برس ہونے آئے۔ یعنی اس صفر کی ۱۴ر تاریخ کو پچاس برس چھ مہینے گزرے، اس نو کم سو برس میں کتنے ہزار فتوے لکھے گئے، بارہ مجلد تو صرف اس فقیر کے فتاویٰ کے ہیں، بحمد اللہ تعالیٰ یہاں کبھی ایک پیسہ نہ لیا گیا، نہ لیا جائے گا۔ بعونہ تعالیٰ ولہ الحمد.

معلوم نہیں کون لوگ ایسے پست فطرت ادنی ہمت ہیں جنھوں نے یہ صیغہ کسب کا اختیار کر رکھا ہے، جس کے باعث دور دور کے ناواقف مسلمان کئی بار پوچھ چکے ہیں کہ فیس کیا ہوگی؟

بھائیو! مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. "میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو سارے جہاں کے پروردگار پر ہے، اگر وہ چاہے۔"(۱)

لیکن اس کثرتِ فتویٰ کے باوجود ہمیشہ جماعت کی پابندی فرمائی اور سنن موکدہ بھی نہ چھوڑیں، فتویٰ وہ ہے، تقویٰ یہ ہے۔

(۲) جو شخص بیماری میں اتنا لاغر ہے کہ مسجد نہیں پہنچ سکتا یا جاسکتا ہے لیکن مرض بڑھ جائے گا، اس کے لیے جماعت چھوڑنا جائز ہے۔ مگر امام احمد رضا کی آخری بیماری جس میں وصال فرمایا، حال یہ تھا کہ مسجد تک از خود جا نہیں سکتے پھر بھی فوتِ جماعت گوارا نہیں۔

"جمل النور فی نهی النساء عن زیارة القبور" میں مولانا حکیم عبدالرحیم صاحب مدرس اول مدرسہ قادریہ محلہ جمال پور شہر احمد آباد (گجرات) کے مکرر سوال کے جواب میں مفصل فتویٰ دیتے ہوئے شروع میں فرماتے ہیں:

"آپ کی رجسٹری ۱۵ر ربیع الآخر کو آئی، میں ۱۲ر ربیع الاول شریف کی مجلس پڑھ کر ایسا علیل ہوا کہ کبھی نہ ہوا تھا، میں نے وصیت نامہ بھی لکھوا دیا تھا، آج تک یہ حالت ہے کہ دروازہ سے متصل مسجد ہے چار آدمی کرسی پر بیٹھا کر مسجد لے جاتے ہیں۔"

(۱) ص: ۲۳، ج: ۳، فتاویٰ رضویہ مطبوعہ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء

اس کے حاشیہ میں راقم نے لکھا: "اس عبارت سے جہاں یہ ظاہر ہوا کہ حضرت سخت بیمار تھے وہیں یہ بھی پتا چلا کہ ایسی سخت علالت میں بھی جماعت چھوڑ کر گھر میں تنہا نماز پڑھ لینا گوارا نہ تھا، جب کہ اتنی شدید علالت بلاشبہ ترکِ نماز کے لیے عذر ہے۔"

ایک دفعہ استاذ محترم حضور حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب مراد آبادی علیہ الرحمہ (۱۳۱۲ھ- ۱۳۹۶ھ) بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور نے اعلیٰ حضرت کی اس بیماری کا حال بیان کیا کہ "ایک بار مسجد لے جانے والا کوئی نہ تھا، جماعت کا وقت ہوگیا، طبیعت پریشان، ناچار خود ہی کسی طرح گھسٹتے ہوئے حاضر مسجد ہوئے اور با جماعت نماز ادا کی۔"

آج صحت و طاقت اور تمام تر سہولت کے باوجود ترک نماز و جماعت کے ماحول میں یہ واقعہ ایک عظیم درس عبرت ہے۔(۱)

(۳) شیخ فانی جو روزہ سے عاجز ہو اس کے لیے جائز ہے کہ روزہ نہ رکھے اور فدیہ ادا کر دے، یا جو سخت بیمار ہے کہ طاقت روزہ نہیں اس کے لیے قضا جائز ہے، زندگی کے آخری سال اعلیٰ حضرت کا یہی حال تھا کہ بریلی میں روزہ نہیں رکھ سکتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے لیے فتویٰ صادر فرمایا کہ مجھ پر روزہ فرض ہے، کیوں کہ نینی تال میں ٹھنڈک کے باعث روزہ رکھا جاسکتا ہے اور وہاں جا کر قیام کرنے پر میں قادر ہوں، لہٰذا مجھ پر روزہ فرض ہے۔

(۴) باقاعدہ ٹوپی کرتا، پاجامہ یا تہبند پہن کر نماز بلاشبہ جائز ہے تنزیہی کراہت بھی نہیں، ہاں عمامہ بھی ہو تو یقیناً مستحب ہے، امام احمد رضا باوجودیکہ حار مزاج تھے مگر کیسی ہی گرمی کیوں نہ ہو ہمیشہ دستار اور انگرکھے کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے، خصوصاً فرض تو کبھی صرف ٹوپی اور کرتے کے ساتھ ادا نہ کیا۔(۲)

(۵) عوام تو عوام ہیں بعض خواص کا یہ حال ہے کہ خود اگر کسی غیر شرعی امر میں مبتلا ہیں، تو اس کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کریں گے اور اگر دوسرا کوئی مسلمان جائز و غیر مکروہ امر کا پابند ہے، مستحب و اولیٰ کی رعایت نہیں کرپاتا اور یہ بعض خواص اس معاملہ میں مستحب کی بھی رعایت فرماتے ہیں تو اس بھائی کو طرح طرح برا کہیں گے، اور اس ترک اولیٰ سے شدید و عظیم امر غیبت مسلم میں گرفتار ہوں گے اور خود اپنے احوال پر تنقید کی توفیق نہ ہوگی۔

حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کی شان یہ ہے کہ "رُوسَرل" کی چینی کے بارے میں استفتا آیا۔ اس کے جواب میں رسالہ تصنیف کیا "احلی السکر فی سکر روسر" جس سے اس کے استعمال کا جواز نکلتا ہے،

(۱) مزارات پر عورتوں کی حاضری (جمل النور) ص: ۱۲-۱۳، شائع کردہ مجلس اشاعت طلبۂ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ، اعظم گڑھ ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء

(۲) کرامات اعلیٰ حضرت ص: ۱۳۱، بروایت حضرت مولانا محمد حسین نظامی میرٹھی۔

کوئی ناواقف سوچ سکتا تھا کہ شاید خود استعمال فرماتے ہیں اس لیے اتنی کوشش فرمائی ہے، مگر حاشا و کلا! وہ مقبول بندۂ خدا کبھی اپنی خواہش کے لیے فتوے نہ دیتا، وہ وہی حکم سناتا جو شریعت مطہرہ کا تقاضا ہو، خود فرماتے ہیں:

"فقیر غفر اللہ تعالیٰ لہ" نے آج تک اس شکر کی صورت نہ دیکھی، نہ کبھی اپنے یہاں منگائی، نہ آگے منگانے کا قصد، مگر بایں ہمہ ہرگز ممانعت نہیں مانتا، نہ جو مسلمان استعمال کریں انھیں آثم (گنہ گار) خواہ بے باک جانتا، نہ تورّع و احتیاط کا نام بدنام کر کے عوام مومنین پر طعن کرے، نہ اپنے نفس ذلیل مہین رذیل کے لیے ان پر ترفع و تعلی روا رکھے۔ و باللہ التوفیق والعیاذ بہ من المداهنة والتضييق.[1]

اور جو احتیاط کرے اسے یوں ہدایت فرماتے ہیں (چوں کہ یہ موضوع ہمارے موضوع رد منکرات سے متعلق ہے اس لیے پوری عبارت لکھی جاتی ہے)

"جو بچنا چاہے اور ان امور کا کہ ہم مقدمۂ دہم میں ذکر کر آئے لحاظ رکھے بہتر و افضل، اور نہایت محمود عمل، مگر اس کے ورع کا حکم صرف اسی کے نفس پر ہے نہ کہ اس کے سبب اصلی شے کو ممنوع کہنے لگے، یا جو مسلمان اسے استعمال کرتے ہوں ان پر طعن و اعتراض کرے، اپنی نظر میں حقیر سمجھے، اس سے تو اس ورع کا ترک ہزار درجہ بہتر تھا کہ شرع پر افترا اور مسلمانوں کی تشنیع و تحقیر سے تو محفوظ رہتا، (تائید میں آیات و احادیث پیش فرمانے کے بعد) عجب اس سے کہ ورع (پرہیز و تقویٰ) کا قصد کرے اور محرمات قطعیہ میں پڑے، یہ صرف تشدد و تعمق کا نتیجہ ہے اور واقعی دین و سنت صراط مستقیم ہیں، ان میں جس طرح تفریط سے آدمی مداہن ہو جاتا ہے، یوں ہیں افراط سے اس قسم کے آفات میں ابتلا پاتا ہے۔ لم يجعل له عوجاً. دونوں مذموم۔

بھلا عوام بے چاروں کی کیا شکایت؟ آج کل بہت جہّال منتسب بنام علم و کمال یہی روش چلتے ہیں، مکروہات بلکہ مباحات، بلکہ مستحبات جنھیں بزعم خود ممنوع سمجھ لیں ان سے تحذیر و تنفیر کو کیا کچھ نہیں لکھ دیتے، حتیٰ کہ نوبت تا بہ اطلاق شرک و کفر پہنچانے میں باک نہیں کرتے۔

پھر یہ نہیں کہ شاید ایک آدھ جگہ قلم سے نکل جائے تو دس جگہ اس کا تدارک عمل میں آئے، نہیں نہیں بلکہ اسے طرح طرح سے جمائیں، الٹی سیدھی دلیلیں لائیں، پھر جب مواخذہ کیجیے تو ہوا خواہ، بفحوائے "عذر گناہ بدتر از گناہ" تاویل کریں کہ بنظر تخویف و ترہیب تشدد مقصود ہے، سبحان اللہ! اچھا تشدد ہے کہ ان سے زیادہ بدتر گناہوں کا خود ارتکاب کر بیٹھے (دو سطر بعد پھر تائید میں احادیث)[2]

---

(۱) فتاویٰ رضویہ جلد دوم ص:۱-۹، طبع دوم ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء، سمنانی کتب خانہ میرٹھ، محبوب المطابع، دہلی

(۲) فتاویٰ رضویہ جلد دوم ص:۱-۹، طبع دوم ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء، سمنانی کتب خانہ میرٹھ محبوب المطابع دہلی

(٦) مسجد میں مٹی کا تیل یا کوئی بدبودار تیل جلانا جائز نہیں ہاں ایسا تیل جلایا جائے جس میں بدبو نہ ہو مثلاً کڑوا تیل۔ اعلیٰ حضرت کی قریبی مسجد میں ان کے عزیز مرید حاجی کفایت اللہ صاحب نے لالٹین کے اندر کڑوا تیل جلایا، اب اپنے لیے اعلیٰ حضرت کا کمال احتیاط دیکھیے، حاجی صاحب سے فرمایا: یہ لالٹین آپ نے یہاں کیسے جلا دی؟ عرض کیا، حضور! اس میں مٹی کا تیل نہیں، کڑوا تیل ہے، فرمایا تو پھر بیٹھے رہیے اور ہر شخص کو بتاتے رہیے کہ اس میں وہ تیل نہیں جس کی ممانعت ہے ورنہ لالٹین دیکھ کر لوگ کہیں گے: "مولوی صاحب بھی اپنی یہاں مسجد میں مٹی کا تیل جلاتے ہیں۔" پھر حضرت نے لالٹین باہر کرا دی۔ اسی لیے فتاوی رضویہ میں ایک موقع پر عوام کو احترام علما اور ان کے عمل کی حیثیت سمجھنے پر تنبیہ کرنے کے بعد علما کے لیے تحریر فرماتے ہیں:

"علما کو چاہیے کہ اگر خود نیتِ صحیحہ رکھتے ہوں، عوام کے سامنے ایسے افعال جن سے ان کا خیال پریشان ہو، نہ کریں، کہ اس میں دو فتنے ہیں، جو معتقد نہیں ان کا معترض ہونا، غیبت کی بلا میں پڑنا، عالم کے فیض سے محروم رہنا۔ عالم فرقۂ ملامتیہ سے نہیں کہ عوام کو نفرت دلانے میں اس کا فائدہ ہو، مسند ہدایت پر ہے، عوام کو اپنی طرف رغبت دلانے میں "ان کا" نفع ہے، احیاناً ایسے افعال کی حاجت ہو تو اعلان کے ساتھ اپنی نیت اور مسئلۂ شریعت عوام کو بتا دے۔[1]

ایسی مثالیں اگر تفصیلاً جمع کی جائیں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے - مقصود کلام بس یہ ہے کہ امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ نے رد بدعات و منکرات کا بے مثال کارنامہ انجام دیا - اور منکرات و بدعات سے خود پرہیز کرنے میں بھی اپنی مثال آپ ہیں-

ایسے عالم حاذق - عامل کامل۔ متقی متواضع - مجددِ ملت - مصلح امت کے خلاف جو لوگ اپنی ہوائے نفس کی خاطر زہر افشانی کر رہے ہیں وہ خود اپنا حشر دیکھیں گے - اہل علم و تحقیق اور اصحاب دین و عقل کو چاہیے کہ حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں، عالم برحق کی اتباع کریں اور مخالفانہ پروپیگنڈے پر کان نہ دھریں۔

ایک وضاحت ضروری ہے کہ بدعت کے معنی کیا ہیں؟ اور بدعات و منکرات سے یہاں کیا مراد ہے؟

علامہ نووی فرماتے ہیں:

البدعة كل شيء على غير مثال سبق ـــ و فی الشرع إحداث ما لم يكن في عهد رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم-

لغت میں بدعت ہر اس چیز کا نام ہے جو بغیر کسی سابقہ نمونے کے عمل میں آئے اور شرع میں بدعت کے

---

(۱) فتاویٰ رضویہ جلد سوم ص:۵۹۶، طبع اول سنی دار الاشاعت مبارک پور

معنی ہیں ایسی چیز کی ایجاد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ رہی ہو۔

یہ ہیں بدعت کے معنی۔ظاہر ہے کہ اس معنی میں ہر بدعت بُری نہیں۔صدہا چیزیں ہیں جو عہد رسالت کے بعد ایجاد ہوئیں اور علما امت نے اسے پسند کیا جیسے قرآن پر اعراب، حدیث کی تدوین، اصول حدیث، اصول تفسیر، اور فقہ و کلام وغیرہ علوم و فنون کی ایجاد۔

اسی لیے علما صاف فرماتے ہیں کہ بدعت کی پانچ قسمیں ہیں، چنانچہ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے "مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح" میں عزالدین بن عبد السلام علیہ الرحمہ کی "کتاب القواعد" سے بدعت کی پانچ قسمیں نقل کی ہیں۔

(۱) واجب (۲) حرام (۳) مستحب و مندوب (۴) مکروہ (۵) مباح

علامہ ابن عابدین شامی ردالمحتار میں صاحب در مختار کے قول "صاحب بدعة" (بدعت والا) کے تحت فرماتے ہیں:

أي محرمة وإلا فقد تكون واجبة كنصب الأدلة للرد على أهل الفرق الضالة وتعلم النحو المفهم للكتاب والسنة. ومندوبة كإحداث نحو رباط ومدرسة و كل إحسان لم يكن في الصدر الاول. ومكروه كزخرفة المساجد ومباحة كالتوسع بلذيذ الماكل والمشارب. والثياب۔

یہاں بدعت سے مراد حرام بدعت ہے -ورنہ بدعت تو واجب بھی ہوتی ہے جیسے گمراہ فرقوں کا رد کرنے کے لیے دلیل قائم کرنا - علم نحو سیکھنا جس سے قرآن و حدیث کو سمجھ سکیں۔ مستحب بھی جیسے سرائے اور مدرسہ جیسی چیزیں قائم کرنا۔ اور ہر وہ نیک کام جو زمانۂ اول میں نہ رہا ہو۔ مکروہ بھی جیسے مسجدوں کو آراستہ و منقش کرنا۔ مباح بھی جیسے کھانے پینے کی لذیذ چیزیں اور کپڑوں میں وسعت و فراخی کی راہ اختیار کرنا۔

خود سرکار رسالت مآب ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: من سن فی الإسلام سنة حسنة فله أجرها و أجر من عمل بها من بعده من غير أن ينقص من أجورهم شيء . من سن في الإسلام سنة سيئة فله وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير أن ينقص من أوزارهم شيء.[1]

جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا تو اس کے لیے اس ایجاد کا ثواب اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے ثواب سے کچھ کم کیا جائے اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا تو اس کے لیے اس نئی تراش کا گناہ اور اس پر عمل کرنے والوں کا گناہ بغیر اس کے کہ عمل کرنے والوں کے گناہ سے کچھ کم ہو۔

(۱) صحیح مسلم، ص:۳۴۱، ج:۲، اصح المطابع، دہلی

اس لیے سرکار کی حدیث کل بدعة ضلالة (ہر بدعت گمراہی ہے) کی شرح میں امام ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالی علیہ صاحب ازہار سے نقل فرماتے ہیں: أی کل بدعة سيئة ضلالة یعنی ہر بری بدعت گم راہی ہے۔ دلیل میں وہی سابقہ حدیث پیش کرتے ہیں، یعنی خود سرکار نے جب ایجاد ہونے والی اچھی چیز کی تعریف کی ہے اور ایجاد کرنے والے کے لیے اجر کی بشارت دی ہے تو ہر نئی چیز گم راہی نہیں ہو سکتی، بلکہ خود حدیث پاک سے بدعت کی تقسیم اچھی اور بُری میں ہو چکی ہے۔

اب یہ سمجھ لیں کہ بدعت جب مطلق بولی جائے تو وضاحت یا قرینے کی ضرورت ہوگی، جیسے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یکجائی تراویح کے بارے میں فرمایا: نِعْمَتِ البِدْعَةُ هٰذِهٖ. کیا ہی خوب ہے یہ بدعت۔یہاں بدعت حسنہ کی صراحت ہوگئی۔

اسی طرح منکرات کے ساتھ لفظ بدعات کا ذکر پتا دے رہا ہے کہ بدعت سے مراد بُری بدعت ہے، کیوں کہ منکر کے معنی ہیں شرع میں نامعروف اور بری چیز، البتہ بدعتی یا مبتدع کا لفظ استعمالاً بدمذہب کے لیے خاص ہو گیا ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ نے بری بدعات کا ہی قلع قمع کیا ہے، ان نئی چیزوں کا نہیں جن کی ایجاد کرنے والے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اجر و ثواب کی خوش خبری دی ہے۔

ذکر میلاد، اور قیام تعظیمی وغیرہ کی اصل تو خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے صحابہ کرام نے یہ عمل کیے ہیں، البتہ موجودہ وسیع طریقہ پر محفلوں کا انعقاد یہ ذرا نیا ہے، مگر منکرات سے خالی ہے تو برا نہیں اچھا ہے، جیسے دن، تاریخ کی تعیین اور اشتہارات، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کے ذریعہ اعلان کے ساتھ عظیم پیمانے پر دینی جلسوں کا انعقاد یقیناً کھلی ہوئی بدعت ہے مگر بری نہیں اچھی ہے۔

اسی لیے امام احمد رضا قدس سرہ نے ان امور کی تائید فرمائی ہے، تردید نہیں کی ہے اور کوئی عالم ربانی بھلا ایسی چیزوں کی تردید بھی کیسے کر سکتا ہے جس کی اجازت، جس پر بشارت خود رسول اللہ ﷺ نے دی ہو، البتہ علمائے سوا اس کی پروا نہیں کرتے اور ہوائے نفس کے پیچھے چلتے ہیں۔ واللہ الهادی الی سواء السبیل.

☆☆☆

زیر نظر کتاب برادر گرامی مولانا لیٰسین اختر مصباحی کی گراں قدر کاوشوں کا نمونہ ہے، زبان و بیان کی شگفتگی، دلائل کی پختگی، رد و اثبات میں متانت و سنجیدگی آپ کو ہر جگہ عیاں نظر آئے گی، موصوف نے رضویات کے ایک نئے موضوع پر تحقیق کی ہے جو قارئین کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

حصہ اول ذکر خدمات میں بھی انھوں نے وہ باتیں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو امام احمد رضا قدس سرہ کی حیات و خدمات پر لکھی ہوئی کتابوں میں کم ملتی ہیں، یا نہیں ملتی ہیں، مقصد یہ ہے کہ نئے گوشے سامنے لائے جائیں اور جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کے لیے قارئین کی توجہ پہلی کتابوں کی طرف مبذول کرادی جائے۔

ہندو پاک کے اہل تحقیق کوشش کریں تو رضوی خدمات کے بہت سے اہم گوشے جواب تک تشنۂ توجہ ہیں وہ بھی عمدہ طریقے پر منظر عام پر آسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب مجددی، حکیم محمد موسیٰ صاحب صدر مرکزی مجلس رضا لاہور، مولانا عبد الحکیم صاحب شرف قادری وغیرہم کی خدمات قابل تحسین ولائق تقلید ہیں۔ کثر اللہ تعالیٰ أمثالھم.

محمد احمد الاعظمی المصباحی

❁❁❁❁❁❁

تعارف مصنف[1]

پروفیسر مسعود احمد نقش بندی مجددی، حضرت مولانا مفتی محمد مظہر اللہ صاحب خطیب جامع مسجد فتح پوری دہلی کے فرزند اور ایک علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ پروفیسر کا لقب دیکھ کر کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ یہ بھی ہمارے عام پروفیسروں کی طرح کوئی مغربیت زدہ شخص ہوں گے، جنھیں دین و سنیت سے لگاؤ بس برائے نام ہو۔ موصوف نے دین و مذہب کی آغوش میں پرورش پائی اور علم و ادب کے ماحول میں پروان چڑھے۔ انگریزی تعلیم اور کالج کے ماحول سے شب و روز ان کا سابقہ ہے مگر اپنے بزرگوں کے جادۂ مستقیم پر اتنی پختگی سے قائم ہیں کہ جدید و قدیم کا حسنِ امتزاج کوئی ان سے سیکھے۔ انھیں بارگاہِ قدرت اور آستانۂ رحمت سے ایک حالات آشنا مومن کا دلِ سوز مند، ایک دور رس مفکر کا ذہن، ایک پر خلوص داعی کی فکر، ایک جفاکش محقق کا ذوقِ جستجو، ایک حقیقت نگار مورخ کا قلم، ایک جادو بیان ادیب کا اسلوبِ تحریر، ایک مرد طریقت کا حسنِ کردار اور ایک عاقبت اندیش عالم کی جہد لیل و نہار نصیب ہوئی ہے۔

۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء سے انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، کئی علمی اداروں کے فعال رکن اور کئی کالجوں کے پروفیسر اور پرنسپل رہ چکے ہیں۔ اس وقت بھی کئی اداروں کے رکن ہونے کے ساتھ گورنمنٹ کالج ٹھٹھہ میں پرنسپل ہیں۔ یہ کالج ایک عظیم شہر خموشاں[2] کے قریب ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ اس مردِ عمل کو اکثر ایسی ہی جگہیں ملیں جہاں وسائل کی کمی اور محنت و مشقت کی زیادتی اجرِ اخروی میں اضافے کا سبب ہو۔ افضَلُ العِبَادَاتِ اَحْمَزُھَا. (افضل عبادت وہ ہے جس میں مشقت زیادہ ہو۔ مشکوٰۃ شریف)

ہماری نظر میں ان کی زریں خدمات وہ ہیں جو اصلاحِ معاشرہ اور تعارفِ امام احمد رضا کے محور پر گردش کر رہی ہیں، اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا تعارف اور ان کی سوانح نگاری کوئی نئی چیز نہیں، لیکن جس اندازِ نگارش اور طرزِ تحقیق کے ساتھ پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے لکھا ہے، اس میں وہ منفرد ہیں۔

---

(۱) فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں، پروفیسر مسعود احمد، المجمع الاسلامی، مبارک پور، فروری ۱۹۸۱ء

(۲) کہا جاتا ہے کہ اس قبرستان میں بعض صحابہ کی بھی قبریں ہیں۔ ۱۲ مکتوب مؤلف۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ امام احمد رضا پر کام کرنے والوں میں نمایاں اگر کوئی ادارہ ہے تو وہ مرکزی مجلسِ رضا (لاہور) ہے۔ جس کے روحِ رواں حکیم محمد موسیٰ امرت سری ہیں۔[1] اور اگر کوئی فرد ہے تو وہ پروفیسر محمد مسعود احمد ہیں۔

(۱) پروفیسر صاحب پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے انگریزی میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا محققانہ اور جان دار تعارف کرایا، جس نے صرف یہی نہیں کہ انگریزی داں طبقہ کو امام احمد رضا سے روشناس کرایا بلکہ یوروپین ممالک کے کئی محققین کو اعلیٰ حضرت پر تحقیق کے لیے متحرک بنادیا۔ مقالہ تو بہت مختصر ہے مگر اس میں ایک عجیب تاثیر پنہاں ہے جو غیر متعصب قاری کو امام ممدوح سے قریب کیے بغیر نہیں چھوڑتی۔ نام یہ ہے: NEGLECTED GENIOS OF THE EAST[2]

(۲) اس سے پہلے بہ عنوان "رضا بریلوی" ایک مقالہ سپرد قلم کیا جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد نمبر ۱۰، جز نمبر ۵ میں پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوچکا ہے۔

(۳) ایک انگریزی مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اشاعت کے لیے فرانس بھیجا۔

(۴) اسی طرح ایک اور انگریزی مقالہ لکھا جو لاہور یا انگلستان میں شائع ہونے والا تھا۔[3]

(۵) امام احمد رضا پر انگریز دوستی کے الزام کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے ۱۹۷۰ء میں ایک شان دار تحقیقی مقالہ بعنوان "فاضل بریلوی اور ترکِ موالات" تحریر فرمایا، جس سے صرف ایک ہی الزام کا دفاع نہ ہوا بلکہ امامِ اہلِ سنت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف پھیلائے ہوئے بہت سے پروپیگنڈوں کا صفایا ہوگیا۔

(۶) ۱۹۷۱ء میں اپنے موضوع پر واحد تحقیقی مقالہ لکھا "فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں" یہ مقالہ اور اس پر اہل علم کے تاثرات آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ لہٰذا اس کے بارے میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اس مقالے کی نمایاں خصوصیات:

☆ حتی الامکان اصل مآخذ سے استفادہ۔ ☆ افکار و واقعات کے درمیان ربط و تسلسل۔ ☆ اقتباسات کے حوالوں کی دیانت دارانہ پابندی۔ ☆ تعصب و تنگ نظری چھوڑ کر ہر مسئلہ کا محققانہ جائزہ۔ ☆ امام احمد رضا پر شاتمانہ تحریروں تک کا سنجیدہ و متین رد۔ ☆ مسائل و واقعات کی چھان بین میں بھرپور محنت و کوشش۔ ☆ سنین عیسوی کی بنیاد پر مرتبہ تاریخوں سے مطابقت کی آسانی کے پیشِ نظر سالِ ہجری کے ساتھ سالِ عیسوی لکھنے کا

(۱) ۸ر شعبان ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۷ر نومبر ۱۹۹۹ء کو ان کی رحلت ہوگئی۔ عامله المولی بالمغفرة والرحمة

(۲) یہ مقالہ مرکزی مجلس رضا، لاہور سے شائع ہوکر مفت تقسیم ہوا۔

(۳) مکتوب مؤلف بنام مولانا یٰسین اختر مصباحی اعظمی، رکن المجمع الاسلامی، محررہ ۲۸ر اگست ۱۹۷۶ء۔ ۱۲

التزام۔ ☆ اندازِ تحریر کی چاشنی و دل نشینی۔

(۷) فی الحال کئی سال کی محنت و کاوش کے بعد "حیاتِ امام احمد رضا" مبسوط لکھ کر اس کی تلخیص تقریبًا ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل شائع کرا رہے ہیں۔

(۸) اس سے پہلے، خلیفۂ امام احمد رضا حضرت مولانا برہان الحق صاحب جبل پوری أدام الله ظله علینا[1] کے تاثرات پر مشتمل ایک کتاب "اکرام امام احمد رضا" جلد ہی منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ پروفیسر صاحب نے امام احمد رضا پر اپنی بیش بہا خدمات کا ایک تسلسل قائم کردیا ہے۔

(۹) یہاں ان کی حالیہ تصنیف "تحریکِ آزادی ہند اور ماہ نامہ السواد الاعظم" کا تذکرہ بے اختیار قلم پر آرہا ہے۔ اس کتاب سے انھوں نے حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی اور مولانا محمد عمر صاحب نعیمی علیہما الرحمہ کی زریں خدمات اور فکر انگریز علمی و ادبی تحریروں کو زندہ کرکے بلاشبہہ قلمی مسیحائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ع

اللہ کرے جوشِ عمل اور ہی زیادہ

یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ فاضل مصنف خود پابندِ شرع ہونے کے ساتھ دوسروں کو بھی پابندِ شرع بنانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس خصوص میں ان کی دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) "محبت کی نشانی" یہ داڑھی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ (۲) "موجِ خیال" یہ ان کے مختلف انشائیوں کا مجموعہ ہے جو ایک طرف زبان و ادب کا شان دار مرقع ہے تو دوسری طرف اُدعُ اِلیٰ سَبِیلِ رَبِّكَ بِالحِکمَةِ وَالمَوعِظَةِ الحَسَنَةِ کی سچی تصویر۔"

بڑے بڑے ماہر ادیبوں کی رنگین تحریریں دیکھیں، لیکن اُن کا موضوع "اصلاحِ معاشرہ" نہیں۔ اور کتنے مخلصین کے رشحاتِ قلم دیکھے، مگر زبان و ادب کی چاشنی ان کا حصہ نہیں اور "موجِ خیال" کو پڑھیے تو سہی! اس میں پروفیسر صاحب کا سوزِ دروں، ان کی فکرِ بالیدہ، ان کا جذبۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ان کے مسلک علم و اعتقاد و عملی کی دل کشی، ان کے خیالات کی پختگی، ان کے اسلوبِ تحریر کا اوجِ کمال، ان کے الفاظ و ادب کی رعنائیاں، سبھی یکجا نظر آئیں گی۔ کاش یہاں بھی کوئی اسے شائع کرکے دین و علم اور زبان و ادب کی خدمت میں کوئی مقام حاصل کرے۔ والله المستعان وبيده أزِمَّةُ الامور۔

موصوف نے مذکورہ تحریروں کے علاوہ اور بھی بیسیوں کتابیں لکھی ہیں، جن کی فہرست اگلے صفحے

(۱) ۲۴ر ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۴ء شبِ جمعہ کو وصال ہوگیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

پر درج ہے۔[1]

پروفیسر صاحب کو ہم نے ان کی خدمات کے آئینے میں دیکھا، جانا اور پہچانا ہے۔ یہی آئینہ ہم نے آپ کے سامنے بھی رکھ دیا ہے جس میں ان کی دلکش تصویر اور جاذبِ قلب و نظر ظاہر و باطن عیاں ہے۔

محمد احمد الاعظمی المصباحی
بھیرہ، ولید پور، اعظم گڑھ
رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور
وصدر المدرسین فیض العلوم، محمد آباد، اعظم گڑھ
۲۳ر ربیع النور ۱۴۰۱ھ / ۳۰ر جنوری ۱۹۸۱ء، جمعہ

(۱) یہ فہرست سابقہ اشاعت میں دی گئی تھی جو تقریباً چالیس کی تعداد پر مشتمل ہے، درمیانی تیس سال کے عرصے میں وہ دو گنا سے زیادہ ہو چکی ہوں گی۔ ان کی حیات و خدمات پر پی، ایچ، ڈی بھی ہو چکی ہے۔ ایک تحقیق عزیز گرامی مولانا اعجاز انجم لطیفی استاذ جامعہ منظر اسلام بریلی شریف کی بھی ہے جو پروفیسر صاحب کے زمانۂ حیات ہی میں شائع ہو چکی ہے۔ افسوس کہ موصوف اب ہم میں نہ رہے۔ ۲۲ر ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۸ر اپریل ۲۰۰۸ء دو شنبہ کو بعد مغرب سفرِ آخرت پیش آیا۔ اکرمہ اللہ تعالیٰ بالرحمۃ والغفران۔
[محمد احمد مصباحی، صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور۔ سہ شنبہ ۱۵ر ربیع الآخر ۱۴۳۲ھ/ ۲۶ر فروری ۲۰۱۳ء]

تصانیف رضا کی تقسیم[1]

چودہویں صدی کے مجدد امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ (۱۲۷۲ھ - ۱۳۴۰ھ) کی تصنیفات تین اہم حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں جس کی روشنی میں ان کی تجدیدی، اصلاحی اور علمی خدمات کا اجمالی نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

(۱)..................اصلاح عقائد اور تصحیح نظریات
(۲)..................اصلاح اعمال اور تصحیح عادات
(۳)..................علمی افادات اور فنی تحقیقات

قسم اول:

ظاہر ہے کہ ان میں اول الذکر زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اسی لیے جب اہل باطل کی طرف سے خلاف اسلام نظریات (مثلاً آریوں، عیسائیوں کے اعتراضات اور قادیانی خیالات) اور گستاخانہ تصورات (مثلاً علماے دیوبند کی طرف سے خداوند قدوس، سید الانبیا و انبیا علیہ و علیہم التحیۃ والثنا اور اولیاے کرام کی بارگاہوں میں تنقیص و توہین پر مشتمل مواد) سامنے آئے تو مجدد دین و ملت علیہ الرحمہ نے انھیں دعوتِ حق پیش کی۔ باطل کو باطل اور حق کو حق ثابت کیا۔ مدعیان اسلام کو توبہ و رجوع کی ترغیب دی اور جب صورت رجوع نہ دیکھی تو ان پر اسلامی فتویٰ جاری کیا۔ جس نے کفر کیا اور توبہ نہ کی اس پر کفر کا فتویٰ لگایا، جو بدمذہبی و گمراہی تک رہا اسے بدمذہب و گمراہ کہا۔ ان مخالفِ اسلام خیالات و نظریات کے رد اور اسلامی عقائد و افکار کے اثبات میں مفصل و مدلل کتابیں تصنیف کیں۔

اس طرح کی بیشتر کتابیں مجدد اعظم قدس سرہ نے اپنے اہتمام سے اپنی زندگی ہی میں شائع کرائیں تاکہ عام مسلمانوں کا دین و ایمان محفوظ رہے۔ اور بلا شبہہ امام احمد رضا کی بروقت تنبیہ و ہدایت اور کوشش و محنت بار آور ہوئی۔ اور اہل اسلام متنبہ ہوئے اور اپنے عقائد و ایمان کی حفاظت کر سکے ورنہ بے دینی و بدمذہبی کا تیز و تند سیلاب نہیں معلوم کہاں تک پہنچ جاتا اور کون کون اس کی رَو میں بہ نکلتا۔

(۱) تقدیم رسوم شادی، اشاعت المجمع النورانی، دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، بستی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء

اس موضوع کی کتابیں بعد میں بھی طبع ہوئی ہیں اور بہت سی اب بھی دستیاب ہیں۔ جنھوں نے نہ دیکھا ہو انھیں چاہیے کہ حاصل کر کے مطالعہ کریں اور اہل باطل کے شر و فساد سے ہوشیار رہیں۔ چند کتابوں کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں۔

(۱) اعتقاد الاحباب فی الجمیل والمصطفیٰ والآل والاصحاب ۱۲۹۸ھ (۲) کیفر کردار آریہ ۱۳۱۶ھ (۳) جبل مژدہ آرا و کیفر کفرِ نصاریٰ ۱۳۲۰ھ (۴) الصمصام علیٰ مشکک فی آیۃ علوم الارحام (۵) السوء والعقاب علی المسیح الکذاب ۱۳۲۰ھ (۶) قہر الدیان علی مرتد بقادیان ۱۳۲۳ھ (۷) قوارع القہار علی المجسمۃ الفجار ۱۳۱۸ھ (۸) جزاء اللہ عدوہ بابائہٖ ختم النبوۃ (۹) سل السیوف الہندیہ علیٰ کفریات بابا النجدیہ (۱۰) تمہید ایمان بآیات قرآن (۱۱) فتاوی الحرمین برجف ندوۃ المین (۱۲) رد الرفضہ۔ (۱۳) مقامع الحدید علیٰ خد المنطق الجدید۔

قسم دوم:

اس سے متعلق وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات، ناجائز رسوم، احکام شریعت کی خلاف ورزی اور دین و ملت کی طرف سے بے توجہی پر گرفت اور مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت پر مشتمل ہیں۔ اس طرح کی تحریروں کے چند نمونے یہ ہیں:

(۱) أعالی الإفادة فی تعزیة الهند و بیان الشهادة .... تعزیہ داری کی خرافات و جہالات کا رد بلیغ۔

(۲) الزبدة الزکیة فی تحریم سجود التحیة .... سجدۂ تعظیمی کی حرمت پر مدلل رسالہ۔

(۳) عطایا القدیر فی حکم التصویر .... فوٹو کھنچانے کی حرمت، یوں ہی بزرگوں کی تصویریں بنانے اور گھروں میں لٹکانے کی ممانعت اور اس کی خرابیوں کا مدلل و مفصل بیان۔

(۴) هادی الناس فی رسوم الأعراس ...... شادیوں کی رسومِ بد کا رد اور اہل اسلام کی اصلاح۔

(۵) مروج النجا لخروج النساء .... عورتوں کی بے پردگی اور مردوں کی بے توجہی پر تنبیہ۔ عورتوں کے لیے باہر نکلنے کے جائز مواقع کی تفصیل اور خلاف شرع نکلنے پر ہدایت و موعظت۔

(۶) جمل النور فی نهی النساء عن زیارة القبور ...... مزارات پر عورتوں کی حاضری سے ممانعت اور دیگر افادات۔

(۷) لمعة الضحیٰ فی اعفاء اللُحی ...... داڑھی رکھنے کے وجوب اور منڈانے یا حد شرع سے کم کرانے کی حرمت پر عبرت انگیز رسالہ۔

(۸) جلی الصوت لنهی الدعوة أمام موت ...... سوم، چہلم وغیرہ میں فاتحہ کر کے فقرا کو کھانا کھلانا صحیح ہے مگر عام دعوت اور اغنیا کی شرکت ممنوع۔

(۹) مشعلة الإرشاد إلیٰ حقوق الأولاد ...... اولاد کے حقوق جن سے لوگ عموماً غافل ہیں۔

(۱۰) شرح الحقوق لطرح العقوق .... والدین اور استاذ کے حقوق جن کی خلاف ورزی بلائے عام ہے۔

(۱۱) المحجة المؤتمنه فی آیة الممتحنه ... مسلمانوں کی سیاسی کج روی پر تنبیہ اور اسلامی احکام کی توضیح۔

(۱۲) تدبیر فلاح و نجات و اصلاح ...... مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی خوش حالی کی تدابیر۔

(۱۳) اعزّ الاکتناه فی رد صدقة مانع الزکوٰة ...... زکوٰۃ روک کر نفل صدقات و خیرات کرنے والوں کو سخت تنبیہ۔

(۱۴) یوں ہی فتاویٰ رضویہ جلد چہارم کتاب الصوم کا وہ فتویٰ جو تراویح کے لیے حفظ قرآن کی تیاری میں مشغول رہ کر روزۂ رمضان چھوڑنے سے متعلق سوال پر لکھا گیا۔

اس میں مجدد اعظم قدس سرہٗ نے فرمایا: ”قرآن شفا ہے اور روزہ بحکم حدیث باعثِ صحت۔ نہ تلاوت قرآن روزہ سے مانع ہو سکتی ہے نہ روزہ تلاوت قرآن سے ...... پھر بھی اگر کوئی نہ مانے تو تراویح سنت مؤکدہ ہے اور خاص اس شخص“ کے لیے ختم قرآن صرف مستحب۔ ایک مستحب کے لیے فرض قطعی چھوڑنا کیوں کر روا ہوگا؟“

یہ فتویٰ مفصل ہے اور فرائض و واجبات چھوڑ کر، نفل خیرات یا نفل روزوں اور وظائف و اوراد میں مشغول رہنے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت اور خزینۂ ہدایت و نصیحت۔

(۱۵) فتاویٰ رضویہ جلد سوم ”القلادة المرصعة فی نحر الأجوبة الأربعة“ کا مسئلۂ دوم و سوم۔ کسی نے نماز ظہر کی جماعت چھوڑنے کی ترکیب یہ نکالی تھی کہ مجھے رات کو تہجد کے لیے بیدار ہونا پڑتا ہے اس لیے دوپہر میں قیلولہ ضروری ہے اور قیلولہ چھوڑ کر جماعت ظہر میں شرکت سے فوت تہجد کا خطرہ...... مجدد ملت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دونوں میں کوئی تناقض نہیں۔ جماعت و تہجد دونوں کی بجا آوری ہو سکتی ہے جس کی سات تدبیریں بتائیں۔ پھر فرمایا: اگر کوئی نہ مانے تو تہجد کے لیے جو صرف مستحب یا صرف سنت غیر مؤکدہ ہے جماعت چھوڑنے کی اجازت کیوں کر ہوگی؟ جو بقول اصح واجب اور بقول دیگر سنت مؤکدہ اہم السنن۔ حتیٰ کہ سنت فجر سے بھی اہم اور قریب تر واجب ہے۔

اس رسالے میں ہدایت و موعظت کا عجیب انداز ہے جسے دیکھ کر سیدنا غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کی فتوح الغیب اور ان کی خطابت کا زوردار، پُر شکوہ اور دلنشیں اسلوب یاد آتا ہے۔ تارکین جماعت کے لیے یہ رسالہ سامان ہدایت وبصیرت اور درس عبرت ونصیحت ہے۔

(۱۶) موسیقی کی حرمت اور قوالی مع مزامیر کی آفت پر کئی فتوے۔ (جو بنام مسائل سماع مطبوع ہیں)

یہ چند تحریریں میں نے بطور نمونہ اور اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بطور اشارہ ذکر کر دی ہیں۔ سب کا تفصیلی ذکر ہو تو ایک کتاب ہو جائے اور تذکرہ نامکمل ہی رہے۔ چوں کہ اصلاح عقائد کے بعد اہم کام اصلاح اعمال ہی ہے اس لیے مجدد اسلام امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان نے اس موضوع کی بھی بہت سی کتابیں اپنی زندگی ہی میں طبع کرائیں جو مسلمانوں کی اصلاح میں بڑی حد تک کارگر ثابت ہوئیں۔ بہت سے اپنے لوگ اس سلسلے کے بعض مواخذوں پر ناراض بھی ہوئے ہوں گے مگر جو صرف خدا اور رسول کی خوشنودی کے لیے لکھتا اور بولتا ہو اسے اپنوں اور غیروں کی ناراضی کی کیا فکر؟ وہ تو بلا خوف لومۃ لائم کلمۂ حق باواز بلند اور بانداز حسن کہہ سناتا ہے۔ کوئی ہدایت پذیر نہ ہو تو یہ اس کی سمجھ کا قصور، اس کے نفس کا فتور اور اس کی عاقبت کا نقصان ہے۔ رہنمائے برحق کا دامن اس کے داغ گناہ سے بری ہے۔ وَاللهُ الهَادِیْ الٰی سَوَاءِ السَّبِیْلِ.

قسم سوم:

امام احمد رضا قدس سرہٗ کی فنی تحقیقات ابداع وایجاد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ آج کے تحقیقی مقالات پر ان کی تمام تحقیقات کو قیاس نہ کر لینا چاہیے۔ انھوں نے پچاس سے زیادہ علوم وفنون میں نادر علمی تحقیقات کے موتی لٹائے ہیں۔ علاوہ ازیں تمام کتب متداولہ مثلاً بخاری شریف، مسلم شریف اور دیگر کتب حدیث وتفسیر، کتب فقہ، کتب تاریخ وسیر پر حواشی لکھے ہیں، ان کے حواشی بھی ذاتی تحقیقات اور بے مثال شرح کا درجہ رکھتے ہیں جیسا کہ ان کے مطالعہ کرنے والوں کا تجرباتی بیان ہے۔

ضمنی تحقیقات سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو میرے خیال میں اس نوع کی صرف ایک کتاب "فتاویٰ رضویہ جلد اول" اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی زندگی میں طبع ہوئی ہے۔ اسے صرف فتاویٰ کا مجموعہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں جو علمی افادات، مسائل کا حل، حسن ترتیب پھر ذیلی مسائل کی جو شاندار فہرست ہے ان سب کو دیکھ کر نگاہ ودل عش عش کرنے پر مجبور ہیں۔ آج کے محققین ومصنفین کتاب کے آخر میں ایک فہرست ان شخصیات، بلاد، کتب ورسائل وغیرہ کے ناموں کی دیتے ہیں جو کتاب میں کہیں آئے ہیں۔ ان کی خوبی سے مجھے انکار نہیں لیکن یہ کوئی زبردست علمی وفنی کام نہیں۔ معمولی صلاحیت کا شخص بھی کتاب کے آخر میں ایسی فہرست شامل کر سکتا ہے۔ لیکن علمی مسائل

کی تعیین ایک ایک جملے میں جو جو مسائل ضمناً آجاتے ہیں ان کا انتخاب پھر ابواب وفصول پر ان کی تقسیم، ہر ایک کا فہرست میں الگ الگ بیان بلاشبہہ ایک نادر علمی خدمت ہے۔ میں نے مختلف فنون کی سیکڑوں کتابیں دیکھیں، اعلیٰ مصنفین واصحاب کمال کے کمالات نظر سے گزرے مگر یہ دقیق وعمیق وجلیل کمال پوری وسعت وہمہ گیری کے ساتھ صرف "فتاویٰ رضویہ جلد اول" میں نظر آتا ہے۔ یہ صرف فہرست کا کمال ہے جو بے مثال ہے۔ پوری کتاب کے کمالات کا اگر بہت مختصر تذکرہ ہو تو بھی ایک ضخیم کتاب میں بیان ہو سکے گا جس کا یہاں موقع نہیں۔

اہل سنت کا فریضہ ہے کہ تینوں قسم کی تصنیفات کو تحقیق وتزیین کے ساتھ منظر عام پر لائیں اور عقائد و اعمال کی اصلاحی خدمت کے ساتھ اہل تحقیق کے دیدہ ودل کی ضیافت کا بھی سامان فراہم کریں۔

اس سلسلے میں پیش رفت ہو چکی ہے مگر کام ابھی بہت باقی ہے۔ اخلاص ومحنت اور ایثار وقربانی کے بغیر کسی مقصد کی تکمیل آسان نہیں۔ اہل علم اور اہل ثروت دونوں کی مشترکہ توجہ اور جدوجہد سے یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ بہت سے طلبۂ علوم دینیہ خصوصاً طلبۂ اشرفیہ مبارک پور اور دوسرے حوصلہ مندوں نے اپنی بساط کے مطابق خدمات سر انجام دی ہیں۔ انھیں اگر اہل ثروت کا حوصلہ افزا تعاون حاصل رہے تو انفرادی طور پر بھی بہت سا کام ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک وسیع ومضبوط علمی ادارہ قائم ہو جو اپنے کثیر افراد کے ذریعہ اس مقصد کی بخوبی تکمیل کر سکے۔ جذبات بیدار ہوں اور انسان عمل کے لیے تیار ہو تو راہیں خود بخود پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ وہ حضرات جو قوم میں اعتماد حاصل کر چکے ہیں اور معمولی تحریک سے بھی بڑے سے بڑا کام کر سکتے ہیں وہ اگر اس کارِ اہم کی طرف توجہ دیں تو بہت جلد یہ خلا پورا ہو سکتا ہے۔ البتہ اخلاص وایثار اور نفعِ عاجل پر نفعِ آجل کی ترجیح کا جذبہ ضروری ہے۔ اور وَاِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللہِ پر یقین کامل شرط ہے۔ ساری باتیں تحریر میں سمیٹنا مشکل ہے۔ وَاللهُ الْمُوَفِّقُ لِلْخَیْرِ وَھُوَ الْمُسْتَعَان وَ عَلَیْهِ التُّکْلَان.

محمد احمد مصباحی، رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ
صدر المدرسین مدرسہ عربیہ فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ، مئو
۱۳/۸/۱۴۰۲ھ/۶/۶/۱۹۸۲ء، یک شنبہ

تقریب و تفہیم[1]

باسمه وحمده والصلاة علیٰ حبیبه وجنوده

امام احمد رضا قدس سرہ کے رسائل و فتاویٰ کا کمال یہ ہے کہ موضوع کی اصل روح پورے رسالہ میں کار فرما رکھتے ہوئے اس کے متعلقات پر بھی مختصر اور جامع لفظوں میں گفتگو کرتے چلے جاتے ہیں اور بہت سے دقیق علمی مسائل کو بھی دوران تحریر عربی میں بیان کردیتے ہیں۔ جن کے نہ رہنے میں مصنف کو تشنگی کا احساس ہوتا تھا، اور اردو میں لانے سے عوام کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی، بلکہ دقت و پریشانی کا خیال کرتے۔ اس لیے علما کے افادہ و تفہیم اور متعلقات کی تکمیل کے پیش نظر سلاست و معنویت سے بھرپور عربی میں فوائد کا ایک ذخیرہ جمع کردیے ہیں۔ اس طرح بالعموم ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ جب وہ کسی ایک مسئلہ کی تنقیح و تحقیق فرماتے ہیں تو اس کے تحت دوسرے بہت سے اہم مسائل کا بھی تصفیہ و تذکرہ ہوجاتا ہے۔

اگر دور حاضر کے ترقی یافتہ اور دلفریب قسم کے طول طویل انداز نگارش میں امام موصوف کے کسی رسالہ کے تمام مشتملات کو سامنے رکھ کر شرح وبسط کے ساتھ لکھا جائے تو ان کا بیس صفحہ کا رسالہ دو سو صفحات تک جا سکتا ہے اور بعض رسائل میں اس سے زیادہ صفحات صرف ہوں گے۔ اس لحاظ سے بلاشبہ ان کا ہر رسالہ ایک ضخیم کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

زیر نظر رسالہ:

اسی رسالہ "تنزیه المکانة الحیدریة" میں اصل موضوع صرف یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ، حضور سید عالم ﷺ کی بعثت اور اعلان نبوت سے پہلے بھی شرک و کفر سے محفوظ تھے۔ لیکن اس مسئلہ کی تحقیق و تنقیح میں درج ذیل مسائل بھی حل ہوگئے۔

(۱) زمانۂ فَترت والوں کے کفر و ایمان اور عذاب و نجات کا مسئلہ (ص:۱۵ تا ۲۷)

(۲) اس سلسلہ میں اہل سنت کے علما، اشاعرہ و ماتریدیہ کا موقف۔ (ص:۱۶ تا ۲۷)

(۳) اصول فقہ اور علم کلام کا معرکۃ الآرا مسئلہ کہ اشیا کا حسن و قبح شرعی ہے یا عقلی؟ (ص:۲۸ تا ۳۰)

(۱) براءت علی از شرک جاہلی، امام احمد رضا قادری، المجمع الاسلامی، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء

(۴) بچہ پر اس کے والدین کی تبعیت میں کفر کا حکم کب اور کس طرح عائد ہوسکتا ہے؟ (ص:۱۳ تا ۳۰)

(۵) روافض کے اس خیال کا رد کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابتداءً حالت کفر میں تھے۔ لہٰذا ان کی خلافت صحیح نہ ہوئی۔ (ص:۲۴ تا ۳۷)

(۶) تفضیلیہ کے اس وہم کا ازالہ کہ ابتدائے حیات سے آخر عمر تک ثبوتِ اسلام صرف جناب مرتضیٰ کا خاصہ ہے۔ لہٰذا وہ خلفائے ثلثہ سے افضل ہیں۔ (ص:۳۷،۳۸)

(۷) علی مرتضیٰ آٹھ دس برس کی عمر میں اسلام لائے اس پر کچھ لوگوں نے شبہہ ظاہر کیا کہ گویا پہلے مسلمان نہ تھے جب تو مسلمان ہوئے اس شبہہ کا نفیس ازالہ۔ (ص:۳۶ تا ۳۹)

ان مسائل کے ساتھ عربی میں بھی بعض نکات و افادات تحریر فرمائے ہیں جن سے علما کو خاص طور سے دلچسپی ہونی چاہیے۔ موجودہ ایڈیشن میں ان عبارتوں اور دوسری حوالہ کی عبارتوں کا بھی ترجمہ کردیا گیا ہے (کیوں کہ اب ہمارے بعض اردو داں قارئین بھی علمی مسائل شوق سے پڑھنے اور سمجھنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ ان کے ذوقِ طلب کا لحاظ ضروری ہے۔) یوں ہی کتبِ حوالہ کے صفحات و جلد وغیرہ کی نشان دہی بھی کردی گئی ہے۔

حاصل رسالہ:

میں چاہتا ہوں کہ چند صفحات میں یہ بیان کردوں کہ ان سارے مسائل کو اصل موضوع سے کس طرح تعلق ہوا اور وہ کیسے زیر بحث آگئے۔ ساتھ ہی پورے رسالہ کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کرنے کی کوشش ہوگی۔

سوال اول کے تحت یہ ذکر تھا کہ علی مرتضیٰ کے والدین حالت کفر پر تھے۔ اور بچے والدین کے تابع ہوتے ہیں لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ علی مرتضیٰ پہلے کافر تھے پھر مسلمان ہوئے۔

اس کے جواب میں مصنف قدس سرہ حضرت علی مرتضیٰ کی حیات ظاہری کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اختلافی حصے پر بھرپور گفتگو فرماتے ہیں۔

(۱) ان کی زندگی کا ایک حصہ تو سرکار دوعالم ﷺ کے اعلانِ نبوت سے روز شہادت تک کا ہے۔ بعد بعثت حضرت علی مرتضیٰ فوراً تصدیق و ایمان سے مشرف ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر آٹھ دس سال تھی۔ اور یہ امر یقینی ہے کہ جو سمجھ دار بچہ اسلام لائے وہ مسلمان ہوکر اپنی مستقل حیثیت حاصل کرلیتا ہے اور والدین کے تابع شمار نہیں ہوتا۔ لہٰذا بعد بعثت تو یہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ والدین کے تابع شمار ہوکر حکم کفر کے تحت آسکیں۔

(۲) اس سے قبل ان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جب ابوطالب کی پرورش سے نکل کر پناہِ دوعالم ﷺ کی کفالت و تربیت میں آئے۔ یہ بعثت سے چند برس پہلے کی بات ہے جب قریش قحط عام میں مبتلا ہوئے۔ ابوطالب

کی پریشانی وزیرباری دیکھ کر حضور اقدس ﷺ جناب علی کو اپنے یہاں لائے اور جعفر کو حضرت عباس کی کفالت میں دیا۔ (زندگی کا یہ حصہ تین چار برس کی عمر سے آٹھ دس برس کی عمر تک کا ہوگا۔) سرکار کی پرورش میں آنے کا اثر یہ ہوا کہ یہ خوش نصیب بچہ ہوش سنبھالتے ہی توحید آشنا اور حق پسند و حق پرست بن گیا۔ اور ایک لمحے کے لیے بھی بتوں کی نجاست سے اس کا دامن آلودہ نہ ہوا۔

(۳) زندگی کا تیسرا حصہ روز پیدائش سے چند برس تک کا ہے۔ جب بچہ کو نہ نفع وضرر کی تمیز ہوتی ہے نہ کفر وایمان کی شناخت، نہ دوست ودشمن کی پہچان۔

کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی بچہ حقیقۃً اس حصۂ زندگی میں ارتکاب کفر سے آلودہ ہوا؟ کفر تکذیب اور جھٹلانے کا نام ہے۔ تکذیب کے لیے سمجھ ہونی ضروری ہے، جب بچہ بالکل ناسمجھ ہے تو تکذیب وکفر سے اس کے آلودہ اور متصف ہونے کا سوال ہی نہیں اور جو کفر سے موصوف نہیں اُسے حقیقۃً کافر قرار دینے کی کوئی صورت نہیں۔ ہاں ایسے بچہ کو بعض صورتوں میں حکماً اور تبعاً کافر کہا جاسکتا ہے۔ مگر کب اور کیسے؟ یہی اصل مبحث ہے کہ بچپن کے اس حصۂ زندگی میں علی مرتضیٰ کو حقیقۃً نہ سہی حکماً اور تبعاً کافر کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس بحث کی تحقیق کے لیے حضرت مصنف قدس سرہ نے فرمایا:

”جس کے ماں باپ دونوں کافر ہوں اسے ان دونوں کے تابع شمار کر کے حکماً کافر کہا جاسکتا ہے جب کہ تابع ہونا متصور بھی ہو ورنہ نہیں۔ جیسے وہ بچہ جسے دارالحرب [1] سے گرفتار کر کے دارالاسلام [2] میں لائیں اور اس کے ماں باپ دارالحرب میں رہ جائیں۔ یہاں بچہ کے ماں باپ دونوں زندہ وموجود اور حالتِ کفر پر ہیں مگر وہ دارالحرب میں ہیں۔ یہ دارالاسلام میں آگیا۔ جب دار بدل گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ دارالاسلام کے بچہ کو دارالحرب کے کسی کافر کے تابع قرار دیا جائے۔ اس صورت میں بچہ کے ماں باپ تو ضرور کافر ہیں مگر بچہ کے لیے ان کی تبعیت متصور نہیں۔ اس لیے وہ حکماً بھی کافر نہ قرار دیا جاسکے گا بلکہ قید کر کے لانے والے مسلمان یا دارالاسلام کے تابع ہو کر مسلمان شمار ہوگا۔ (در مختار، ج:۱، ص:۷۶)

(۱) کفار کی وہ مملکت جہاں اسلامی شعائر یکلخت بند کر دیے گئے ہوں۔

(۲) دارالاسلام مملکت اسلامی کو کہتے ہیں یا ایسی مملکت کو جہاں پہلے اسلامی حکومت رہی ہو پھر کفار کا تسلط ہو گیا ہو مگر جملہ اسلامی شعائر بند نہ کیے گئے ہوں۔ ہندوستان پر حکومت اسلامی کے بعد جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو جملہ اسلامی شعائر بند نہ ہوئے جب آزادی کے بعد جمہوری حکومت قائم ہوئی تو خود مسلمان بھی شریک حکومت قرار پائے اس لیے ہندوستان انگریزوں کے دور میں بھی دارالاسلام رہا اور اس کے بُعد تو اس سے اولیٰ طریقہ پر دارالاسلام ہے۔ ۱۲م

اس تمہید سے معلوم ہوا کہ چند سالہ ابتدائی زندگی میں علی مرتضیٰ پر تبعاً اور حکماً کفر ثابت ہونے کے لیے دو باتوں کا تسلی بخش ثبوت فراہم ہونا ضروری ہے۔

امر اول: یہ کہ علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی والدہ فاطمہ بنت اسد اور ان کے والد ابوطالب دونوں اس وقت کافر تھے۔

امر دوم: اُس زمانہ میں بھی بچہ کو کافر ماں باپ کے تابع قرار دے کر کافر شمار کرنے کا حکم صادق وثابت تھا۔

اگر امر اول مفقود ہے اور علی مرتضیٰ کے ماں باپ میں سے کسی ایک کا بھی اس وقت مسلمان ہونا ثابت ہو گیا تو علی مرتضیٰ پر حکم کفر کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ بلکہ مسلمان ماں یا باپ کے تابع قرار دے کر خود انھیں بھی مسلمان شمار کیا جائے گا۔ اس پر علمائے اسلام کی واضح تصریحات موجود ہیں کہ دین کے لحاظ سے ماں باپ میں جو افضل ہو، بچہ اسی کے تابع ہوتا ہے لہٰذا کسی بچہ کو حکماً کافر ثابت کرنے کے لیے اس کے ماں باپ دونوں ہی کو کافر ثابت کرنا ضروری ہے۔

اگر امر اول صادق ہو گیا: یعنی بالفرض کسی طرح علی مرتضیٰ کے ماں باپ دونوں ہی کا اس وقت کافر ہونا ثابت ہو گیا۔ لیکن امر دوم مفقود ہے۔ یعنی اس وقت علی مرتضیٰ پر حکم تبعیت لگانے کا جواز وثبوت نہیں۔ تو بھی حکم کفر سے ان کی براءت ثابت ہو جائے گی۔ ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ماں باپ دونوں کے کافر ہونے کے باوجود بچہ کو ان کا تابع اور کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی ایک مثال در مختار کے حوالے سے اوپر بیان ہوئی۔

اولاً اور **ثانیاً** کے تحت امر اول پر گفتگو کرتے ہوئے امام احمد رضا قدس سرہ نے یہ بیان کیا ہے کہ اس زمانہ میں حضرت علی کے باپ اور ماں دونوں ہی کا کافر ہونا کسی قول پر کسی دلیل سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا تو علی مرتضیٰ پر ان کی تبعیت میں حکم کفر کی گنجائش ہی نہیں۔

پھر **ثالثاً** کے تحت امر دوم پر کلام فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت ماں باپ دونوں ہی کافر تھے تو بھی علی مرتضیٰ کو بحکم تبعیت کافر گرداننے کی صورت نہیں پائی جاتی۔

امر اول کی تنقیح:

اولاً یہ دیکھا جائے کہ علی مرتضیٰ کی زندگی وطفلی کا ابتدائی چند سالہ زمانہ کون سا زمانہ تھا اور اس کا حکم کیا ہے؟ سید عالم ﷺ کی بعثت سے قبل کئی سو برس کا زمانہ وہ ہے جسے ”عہد فترت“ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس طویل زمانہ میں انبیا ورسل علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ منقطع تھا اور گذشتہ انبیائے کرام کی دعوت وتبلیغ کے آثار تقریباً محو ہو چکے تھے۔ حضرت علی کی پیدائش سے لے کر چند برس بعد والا زمانہ بھی حضور کی بعثت سے پہلے کا ہے۔ اور عہد

فترت ہی میں شامل ہے۔ لہٰذا اس وقت علی مرتضیٰ کے والدین زمانۂ فترت والوں کے حکم میں آئیں گے۔ ان کا جو حکم ہوگا ان کا بھی ہوگا۔ اب یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ زمانۂ فترت والے کیسے کیسے تھے اور ان کے کفر و ایمان، نجات و عقاب سے متعلق علماے اسلام نے کیا فرمایا ہے یہ خود ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ لیکن اس کا تفصیلی تذکرہ کیے بغیر زیر بحث مسئلہ طے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے حضرت مصنف قدس سرہ نے فرمایا:

اہل فترت جنھیں انبیاے کرام کی دعوت نہ پہنچی۔ تین قسم کے ہیں۔

(۱) موحّد: جنھیں اس عالم گیر اندھیرے میں بھی نور ہدایت نے روشنی دکھائی اور وہ کم از کم توحید کے قائل رہے۔

(۲) مشرک: جو اپنی جہالت و گمراہی سے غیر خدا کو پوجنے لگے۔

(۳) غافل: جنھوں نے اعتقادیات میں غور و فکر ہی نہ کیا، یا اس کی مہلت ہی نہ پائی اور غفلت میں رہ کر جانوروں کی طرح صرف کھانے کمانے سے کام رکھا۔

آخرت میں یہ تینوں قسم کے اہل فترت نجات پائیں گے یا عذاب میں رہیں گے؟ اس سلسلہ میں ایک قول جمہور ائمۂ اشاعرہ و ماتریدیہ میں سے ائمۂ بخارا کا ہے۔ دوسرا قول امام نووی و امام رازی کا ہے۔ تیسرا قول جمہور ائمہ ماتریدیہ کا ہے[1] ہر قول کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ علی مرتضیٰ کے والدین پر جو اہل فترت ہی میں ہیں، کفر کا حکم لگتا ہے یا نہیں؟ اگر ان پر حکم کفر ثابت نہیں تو علی مرتضیٰ پر بھی نہیں۔

(۱) حضرات اشاعرہ اور ائمہ ماتریدیہ میں سے اہل بخارا اُس زمانہ کے موحّد، مشرک، غافل تینوں قسم کے لوگوں کو نجات والا مانتے ہیں۔ اس قول کی بنیاد پر فترت والوں کو تا زمانۂ فترت کافر نہ کہا جائے گا کیوں کہ: اہل فترت ناجی ہیں۔ اور کوئی کافر ناجی نہیں (جس کا عکس مستوی یہ ہے:) کوئی ناجی کافر نہیں۔ تو اہل فترت کافر نہیں۔ اسی لیے ائمہ اشاعرہ میں سے کوئی انھیں مسلم کہتا ہے اور کوئی معنیٔ مسلم میں کہتا ہے۔

اب والدین علی مرتضیٰ کو دیکھیے وہ بھی اس وقت اہل فترت میں شامل تھے اور اہل فترت کافر نہیں تو وہ بھی اس وقت کافر نہیں۔ ہاں ابو طالب حضور اقدس پر ایمان نہ لائے تو ان پر حکم کفر ضرور ہوگا مگر اس وقت ہوگا جب بعد بعثتِ سرور کائنات علیہ الصلوات والتحیات انھوں نے تسلیم و اسلام سے انکار کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا

(۱) اہل سنت میں ایک گروہ امام ابوالحسن اشعری کے متبعین کا ہے جو اشاعرہ کہلاتا ہے۔ دوسرا امام ابو منصور ماتریدی کے موافق ہے جو ماتریدیہ سے موسوم ہے۔ دونوں کے اندر فروع عقائد میں کچھ اختلافات ہیں۔ جیسے فروع احکام میں حنفیہ و شافعیہ وغیرہم کے درمیان اختلافات ہیں۔ مگر دونوں گروہ حق پر ہیں اور کوئی کسی کو گمراہ بھی نہیں کہتا، زیادہ سے زیادہ ہر ایک اپنی دلیل کے پیش نظر اپنے کو درستی پر اور دوسرے کو غلطی پر کہہ سکتا ہے۔ یہ دلائل بھی صریح اور قطعی و اجماعی نہیں ورنہ اختلاف ہی نہ ہوتا۔ ۱۲۔ محمد احمد مصباحی

جب علی مرتضیٰ خود اسلام لا کر اپنی مستقل حیثیت اختیار کر چکے اور ماں باپ میں سے کسی کے تابع بنانے کا سوال ہی نہ رہ گیا تھا۔ جیسا کہ ابتداءً ذکر ہوا کہ جو عاقل بچہ اسلام قبول کر لے وہ مسلمان ہوگا اور ماں باپ کی تبعیت سے نکل کر مستقل بالذات ہو جائے گا۔

(۲) دوسرا مذہب اشاعرہ میں سے امام نووی و امام رازی کا ہے، یہ تینوں قسم کے لوگوں کو نجات والا نہیں مانتے بلکہ ان میں سے مشرکوں کو عذاب والا کہتے ہیں۔ البتہ موحدوں اور تمام غافلوں کو دیگر ائمہ اشاعرہ کی طرح یہ حضرات بھی نجات والا ہی مانتے ہیں۔

(۳) تیسرا مذہب جمہور ائمہ ماتریدیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا ہے۔ ان کے نزدیک مشرکوں کا حکم عقاب ہے اور موحدوں کا حکم نجات ہے۔ جیسا کہ امام نووی و رازی نے فرمایا۔ لیکن ائمہ ماتریدیہ غافلوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان میں جسے فکر و تامل کا موقع نہ ملا وہ تو نجات والا ہے اور جسے فکر و تامل کا موقع ملا پھر بھی غفلت ہی میں پڑا رہا وہ عقاب والا ہے۔

بہر حال موحدین اور وہ غافلین جنھیں مہلتِ فکر و تامل نہ ملی، متفقہ طور پر ناجی ہیں۔ عذاب والے ہوں گے تو صرف مشرکین یا وہ غافلین بھی جنھیں فکر و تامل کا موقع ملا اور توحید ترک کی۔

اب ان دونوں مذہبوں کا خلاصہ سامنے رکھتے ہوئے اسلام علی مرتضیٰ کو دیکھیے والدین میں سے جو باعتبار دین افضل ہو بچہ اسی کے تابع قرار پائے گا۔ لہٰذا اگر صرف والدہ کا بھی موحدہ یا غافلہ ہونا مانا جائے تو یقیناً وہ ناجی اور غیر کافر ہیں اور جناب مرتضیٰ ان کے تابع ہو کر قطعاً غیر کافر ہوں گے۔ مخالف اگر حکم کفر لگانا چاہتا ہے تو اسے ثابت کرنا ہوگا کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس زمانہ میں موحدہ یا غافلہ نہ تھیں بلکہ اُن لوگوں میں تھیں جنھوں نے شرک اختیار کیا یا فکر و تامل کا موقع پا کر بھی توحید سے اجتناب کیا۔ حالاں کہ عورتیں عموماً غافلہ ہوتی ہیں اور اُس زمانہ کی عورتوں کا کیا کہنا؟ جیسا کہ علامہ زرقانی و سیوطی کے حوالہ سے گذرا کہ وہ ایسا سخت تاریک دور تھا کہ عورتیں در کنار، مردوں کو بھی راہ نہ دکھائی دیتی تھی بالعموم غفلت والے ہوتے تھے۔

مخالف جو دلیل رکھتا ہو پیش کرے اور نہ پیش کر سکے تو اسے محض اپنے تراشیدہ اوہام کی بنا پر یہ کہنے کا حق ہرگز نہیں کہ علی مرتضیٰ کے والد اور والدہ دونوں ہی کافر تھے جن کی تبعیت میں جناب مرتضیٰ بھی پر حکم کفر عائد ہوتا ہے۔

مسلم و نصرانیہ کے زنا سے پیدا شدہ بچے کے اسلام و کفر سے متعلق علامہ شامی کی ایک عبارت یہاں پیش فرمائی ہے جس کے آخر میں ہے کہ ”دین کے معاملہ میں احتیاط ہی مناسب ہے۔ اور کفر سب سے بدتر برائی ہے تو جب تک صریح ثبوت فراہم نہ ہو جائے کسی پر حکم کفر لگانا شایاں نہیں۔“

مسلم و نصرانیہ کے زنا سے پیدا شدہ بچے کے متعلق علما کی ہدایت یہ ہے۔ اور اسد اللہ الغالب جناب علی مرتضیٰ کے بارے میں مخالف کی بلا دلیل جسارت وہ ہے۔ اس جراءت کی بھی کوئی حد ہے؟

ثانیًا:

اب تک اہل فترت کے اشخاص کی بنیاد پر کلام تھا۔ یہاں ثبوت احکام کی بنیاد پر گفتگو کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس وقت علی مرتضیٰ کو بحکم تبعیت کافر شمار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ اصول فقہ اور علم کلام کا ایک اہم مسئلہ ہے کہ اشیا کا حسن و قبح عقلی ہے یا شرعی؟ یہ تو مسلّم ہے کہ خداوند حکیم نے جس چیز کا حکم دیا وہ ضرور اچھی ہے اور جس سے روکا وہ قطعاً بُری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ شریعت وارد ہونے سے پہلے بجائے خود ان چیزوں میں کوئی اچھائی یا برائی تھی یا نہیں؟ ائمہ اشاعرہ کا اس پر اجماع ہے کہ قبل شریعت اچھائی، برائی، ایمان، کفر کچھ بھی نہیں۔ اشیا کا حسن و قبح محض شرعی ہے اور حکم بھی صرف شرعی۔ (۱)

دوسرا مذہب بعض ائمہ ماتریدیہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اشیا کا حسن و قبح عقلی ہے۔ یعنی شرع پر موقوف نہیں۔ اور بجائے خود اشیا میں اچھائی برائی موجود ہوتی ہے۔ لیکن اتنے سے بندہ کے ذمہ نہ کچھ واجب ہوتا ہے نہ کچھ حرام ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھی قبل شرع کسی حکم کا ثبوت نہیں مانتے۔

تیسرا مذہب جمہور ائمہ ماتریدیہ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ افعال کا حسن و قبح عقلی ہے یعنی اشیا میں خود اچھائی برائی ہوتی ہے جس کی بنیاد پر خدا کی طرف سے اچھی چیزوں کے کرنے کا، اور بری چیزوں سے بچنے کا حکم ہوتا ہے۔ لیکن عقل ساری چیزوں کی اچھائی برائی کے ادراک سے قاصر ہے۔ البتہ بعض واضح چیزیں وہ ہیں جن کی اچھائی، برائی کا عقل ادراک کر لیتی ہے تو ان چیزوں میں خدا کی طرف سے بندہ کے ذمہ حکم متعلق ہو جائے گا۔ ہاں خلاف ورزی پر آخرت میں عقاب کو یہ حضرات واجب نہیں کہتے کیوں کہ عفو ممکن ہے۔

اس بنیاد کی روشنی میں وہ فرماتے ہیں کہ ایمان و توحید اور شکر منعم کی اچھائی، کفر و انکار اور ناشکری کی برائی عقل خود جان لیتی ہے تو شریعت آنے سے پہلے بھی توحید و شکر کی بجا آوری اور کفر و ناشکری سے اجتناب ضروری

---

(۱) (ا) فعل کے اچھے برے ہونے کا ایک معنی اس کا صفت کمال یا صفت عیب ہونا جیسے علم کا اچھا اور جہل کا برا ہونا۔ (۲) دوسرا معنی، فعل کا دنیوی غرض کے موافق ہونا۔ (۳) تیسرا معنی، اس کے کرنے والے کا آخرت میں مستحق ثواب ہونا، یا اس کے فاعل کا آخرت میں قابلِ عذاب ہونا۔ پہلے دو معنی پر تو افعال کا حسن و قبح بالاتفاق عقلی ہے یعنی شریعت پر موقوف نہیں۔ اگر شریعت نہ ہوتی تو بھی بعض افعال صفاتِ کمال ہوتے اور بعض صفاتِ عیب۔ یوں ہی بعض غرض دنیوی کے موافق ہوتے بعض ناموافق۔ لیکن تیسرا معنی اختلافی ہے جس کی تفصیل اوپر ذکر ہے۔ ۱۲
محمد احمد مصباحی

ہے۔ ہاں دنیا و آخرت کے تمام تفصیلی احکام کا عقل ادراک نہیں کر پاتی اس لیے قبل شریعت ان کا لزوم نہیں۔

اب زیر بحث مسئلہ کو دیکھیے، پہلے دونوں قول پر قبل شرع جب کوئی حکم نہیں تو کفر بھی نہیں کیوں کہ کفر سب سے بدتر معصیت ہے۔ معصیت حکم کی مخالفت کا نام ہے۔ حکم ہی نہیں تو مخالفتِ حکم کیسے ہوگی۔ اور جب اس وقت سرے سے کوئی معصیت نہیں تو سب سے بڑی معصیت کفر بدرجۂ اولیٰ نہیں۔ جب کفر نہیں تو اس وقت کوئی کافر بھی نہیں۔ لہٰذا قبل بعثت کے اس زمانہ میں ابوطالب پر بھی حکم کفر نہیں۔ جب ان پر نہیں تو جناب مرتضیٰ پر ان کی تبعیت میں کیوں کر ہوگا؟ اور بعد بعثت جب ابوطالب پر حکم کفر ہوا تو اس وقت علی مرتضیٰ خود اسلام لاکر مستقل بالذات اور حکم تبعیت سے بری ہو چکے تھے۔

جمہور ائمہ ماتریدیہ کے مذہب، یعنی تیسرے قول کی بنا پر قبل شریعت بھی بندہ کو اختیارِ توحید اور اجتنابِ شرک لازم ہے۔ تو اس کی کیا دلیل ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کی والدہ فاطمہ بنت اسد نے اس زمانہ میں توحید ترک کی اور شرک سے اجتناب نہ کیا؟ پہلے مخالف اسے ثابت کرے پھر علی مرتضیٰ پر کوئی حکم لگانے کی جسارت کرے۔

ثالثًا:

اگر بطور تنزل مان لیا جائے کہ اُس زمانۂ فترت میں زن و شو فاطمہ و ابوطالب دونوں ہی کے لیے کفر ثابت تھا تو بھی علی مرتضیٰ پر ان کی تبعیت میں حکمِ کفر لگانے سے پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس وقت حکمِ تبعیت صادق و ثابت تھا۔

نگاہِ انصاف کی ضرورت ہے۔ بچہ کو والدین یا دارالحرب کی تبعیت میں کافر کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اگر یہ کہیں کہ وہ حقیقۃً کافر ہے تو بداہتہً غلط اور باطل ہے۔ کیوں کہ گذر چکا کہ کفر تکذیب ہے۔ تکذیب کے لیے تمیز و ادراک ضروری ہے۔ تمیز و ادراک ہی نہیں تو حقیقتِ تکذیب و انکار بھی ہرگز نہیں۔

لہٰذا یہی معلوم ہوا کہ بچہ کو کافر کہنا حقیقۃً نہیں حکماً ہے۔ حکماً کا یہ مطلب ہے کہ بچہ کے لیے از روے شرع وہ احکام ہوں گے جو اس کے ماں باپ یا اہل ملک کے لیے ہوں گے۔ اور یہ احکام بھی احوالِ آخرت سے متعلق نہیں بلکہ صرف احوال دنیا سے متعلق ہیں۔ مثلاً وہ مر جائے تو اس کے جنازے کی نماز نہ پڑھیں گے، مسلمانوں کی طرح غسل و کفن نہ دیں گے، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کریں گے۔

جب یہ تبعیت صرف احکام دنیا میں ہے تو تبعیت ثابت ہونے سے پہلے احکام دنیوی کا وجود ضروری ہے اگر دنیا میں کوئی حکم ہی نہ ہو تو تبعیت کس چیز میں ہوگی؟ یہ ثابت ہو چکا کہ حضرات اشاعرہ و ماتریدیہ کے مذکورہ تینوں اقوال کی روشنی میں اس طرح کے احکام دنیوی شریعت سے پہلے ہرگز نہ تھے تو اس وقت کسی ناسمجھ بچے کا اپنے

والدین کی تبعیت میں کافر قرار پانے کا حکم بھی ہر گز نہ تھا کہ اس وقت نہ حکم نازل تھا نہ حکم میں تبعیت حاصل۔

اس تحقیق سے روشن ہو گیا کہ تبعاً حکماً اسماً وہماً کسی طرح یہ لفظ (کافر) حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ پر کسی وقت صادق نہ ہوا۔ روزِ الست سے ابد الآباد تک ان کا دامن اس آلودگی سے پاک وصاف رہا۔

والحمد لله رب الغلمين.

براءت حیدری کے بعد براءت صدیقی کو تکمیل میں بیان فرمایا ہے۔ اور سوال دوم کے جواب میں مزید تفصیل و وضاحت کرتے ہوئے روافض و تفضیلیہ کے خیالات و اوہام کا رد کیا۔ اور دوسرے تیسرے دونوں سوالوں کے جواب میں کئی طرح یہ دکھایا ہے کہ اسلام لانا، سابقہ اسلامِ فطری کے منافی نہیں۔ تفصیلات اور حوالے مع ترجمہ اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

[پنج شنبہ ۲۳؍ ذو الحجہ ۱۴۰۴ھ، ۲۰؍ ستمبر ۱۹۸۴ء]

تقریب(۱)

باسمه وحمده والصلاة على رسوله وجنوده

آج مسلم معاشرہ میں اصلاح کی کس قدر ضرورت ہے محتاج بیان نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ معاشرہ خود درستی کے لیے تیار نہیں ہوتا، بے شمار تقریریں کہی سنی جاتی ہیں اور سیکڑوں کتابیں لکھی پڑھی جاتی ہیں، لیکن زندگیوں میں انقلاب بپا نہیں ہوتا، ہر شخص بجائے خود اپنے کو مقدس سمجھ بیٹھا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ کتاب و خطاب کسی اور سے توجہ کا طالب ہے، ہر انسان خود اپنا محاسبہ کرے، اپنے بیوی، بچوں اور ماتحتوں کے کردار و عمل کا جائزہ لے، دوسروں پر تنقید کے بجائے خود اپنے اوپر تنقید کرے، تلاش کرکے اپنی خامیاں نکالے اور ان کی اصلاح پر کمربستہ ہو تو معاشرہ کی اصلاح آسان ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جو خود علم کے ساتھ بے پناہ حسن عمل، زہد و تقویٰ اور اخلاص و للٰہیت سے آراستہ ہو اس کے کلام میں جو تاثیر ہوگی وہ کسی ناقص العمل کے کلام میں نہ ہوگی، احیاء العلوم، غنیۃ الطالبین، التعرف وغیرہ سے بہت سے زندگیوں میں انقلاب آئے، حیات کا رخ پھرا اور دل کی دنیا بدل گئی۔ اس کا ایک بڑا سبب ان کتابوں کے مصنفین کا اخلاص و تقویٰ ہے۔

اسی خیال کے تحت ہم نے کسی معاصر صاحب علم و قلم کی خدمات حاصل کرنے کے بجائے صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی قدس سرہٗ (۱۲۹۶ھ-۱۳۶۷ھ) کے رشحات قلم کو ذریعۂ اصلاح بنایا، ان کی باخدا زندگی، ان کا زہد و تقویٰ، ان کی عظیم علمی سطوت اور حیرت انگیز عملی قوت بلکہ ولایت و کرامت کا اعتراف صرف ان کے حلقۂ تلامذہ ہی کو نہیں بلکہ ان کے واقف کار اور باانصاف مخالفین کو بھی ہے۔

ان کی مشہور زمانہ کتاب "بہار شریعت" جہاں بے شمار علوم و معارف کا خزانہ ہے وہی عظیم درس عمل اور انسانی زندگی کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی مشقت خیز کوشش بھی ہے۔

یہ کتاب ۱۷ حصوں پر مشتمل ہے اور اس لائق ہے کہ صرف مفتیان کرام ہی نہیں بلکہ تمام علما، طلبا، خطبا تجار، کاشتکار، صنعت کار اور سارے مسلمانوں کے مطالعہ میں رہے، انھیں اس کی زیادہ ضرورت ہے، خصوصاً جب کہ عربی کتابیں ان کی دسترس سے باہر ہیں یا ان سے خاطر خواہ استفادہ پر قدرت نہیں، اردو زبان کا

(۱) اسلامی اخلاق و آداب، صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی اعظمی، المجمع الاسلامی، مبارک پور

فقہی سرمایہ بہار شریعت کے متبادل سے خالی ہے، جس سے کسی صاحب نظر اور منصف مزاج شخص کو اختلاف کی گنجائش نہیں اور ایسی دل نشیں تفہیم، ہر باب میں پیدا شدہ مسائل کی توضیح، قدیم مسائل کی تحریر، ترجیح راجح و معتمد کے ساتھ نفس مسائل کی جامع و پر مغز تقریر سے عربی مآخذ بھی خالی ہیں، ان کا مطمح نظر اور انداز بیان اس سے مختلف ہے۔ چوں کہ زیادہ تر وہ خاص اہل علم کے پیش نظر زیادہ تفصیل یا بہت اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ قادری بک ڈپو، نو محلہ مسجد، بریلی شریف یوپی نے بہار شریعت کا ایک اچھا صحیح (مگر اس کا حصہ ۱۶ جو ہمارے زیر مطالعہ آیا غالباً اشاعت مکتبہ کلیمی کانپور کا عکس ہے، یہ کافی تصحیح اور مستقل صحت نامہ کا طالب ہے) اڈیشن شائع کیا ہے، لیکن اس کی اشاعت بہت کم نظر آ رہی ہے، ہندوستان میں کئی کروڑ مسلمان رہتے ہیں اور ایسی اہم، سب کے لیے کار آمد کتاب صرف چند ہزار کی تعداد میں طبع ہو کر بھی شائقین کی منتظر پڑی رہتی ہے، یہ صورت حال ناشرین اور قارئین سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

ہمارے موضوع مقصود "اصلاح معاشرہ اور تہذیب اخلاق" پر اردو میں بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں، بہار شریعت حصہ شانزدہم میں اس عنوان پر ہمیں بڑی جامعیت نظر آئی، دوسرے حصوں کی طرح اس میں بھی احادیث کریمہ کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، احادیث رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اسلامی احکام کا مستند ماخذ ہیں۔ اصلاح معاشرہ اور تطہیر اخلاق کے باب میں حصہ شانزدہم کی قدر و منزلت اس بات کی متقاضی تھی کہ اسے ایک امتیازی شان کے ساتھ پیش کیا جائے، تاکہ حضرت مصنف قدس سرہٗ کا اس حصہ کی تالیف سے جو عظیم مقصد تھا اس کی طرف عمومی توجہ ہو اور وہ جلد تر حاصل ہو سکے۔ اسی نظریہ کے تحت وہ "اسلامی اخلاق و آداب" کے نام سے آپ کے سامنے ہے، اسے مفید تر اور مقبول قلب و نظر بنانے میں ادارۂ اشاعت کا جو کردار ہے اس کے متعلق قارئین ہی کچھ فرمائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں المجمع الاسلامی کا یہ اقدام ہر حلقے میں بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا اور کتاب اپنا خاطر خواہ حق پذیرائی ضرور حاصل کرے گی۔

محمد احمد مصباحی

نگراں المجمع الاسلامی

صدر المدرسین فیض العلوم محمد آباد گوہنہ اعظم گڑھ

صبح دو شنبہ ۲۱ر محرم ۱۴۰۶ھ / ۷ر اکتوبر ۱۹۸۵ء

كَلِمَةُ الْمَجْمَع (۱)

باسْمِهٖ وَحَمْدِه تعَالٰی و تقدس

امام احمد رضا قدس سرہٗ تمام علوم عقلیہ و نقلیہ پر ناقدانہ و ماہرانہ نگاہ رکھتے تھے۔ اور اپنی اِس بے پناہ بصیرت کو افتا اور تجدید دین و احیاے سنت میں استعمال کرتے۔ وقت کا کیسا ہی اہم اور مشکل مسئلہ در پیش ہو اس کا محققانہ اور تشفی بخش جواب اعلیٰ حضرت کی بار گاہ سے مل جاتا۔

سائنس اور فلسفہ سے متعلق سوالات بھی مجددِ اسلام قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ان دونوں کے تمام افکار و نظریات، اسلام سے متصادم نہیں لیکن قدیم فلسفہ کے بیشتر نظریات اور موجودہ سائنس کے بعض مزعومات اسلامی افکار و مسائل سے ضرور متصادم ہیں۔ اور مادّہ پرستی تو دونوں کا جزو لاینفک ہے، جسے اسلام بلکہ عیسائیت و یہودیت سے بھی تعلق نہیں۔

اسی لیے امام احمد رضا قدس سرہٗ نے جہاں دوسرے غیر اسلامی افکار و عقائد کی خرابیاں واضح کیں اور دنیا کو راہ راست دکھائی وہیں جدید و قدیم فلسفہ کے غلط افکار و نظریات کو بھی عقل و استدلال کی روشنی میں باطل ثابت کیا، یہ سوچنے کی گنجائش نہیں کہ اعلیٰ حضرت نے صرف قرآن و حدیث اور علماے دین کے اقوال پیش کر کے فلاسفہ اور سائنس دانوں کا رد کر دیا ہوگا، جو اِن مادہ پرستوں کے لیے قابل التفات اور ان پر حجت نہیں۔ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ امام احمد رضا نے خود فلسفہ اور سائنس کے اصول و مبادی اور مسلمات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان ہی کی روشنی میں اور مضبوط عقلی دلائل و براہین سے ان غلط افکار و نظریات کا تعاقب کیا ہے جو ہر فلسفی اور سائنس داں کے لیے اسلام کی جانب سے ایک زبردست چیلنج ہے۔ ہاں اہل اسلام کی مزید تسکین خاطر کے لیے دلائلِ نقلیہ بھی علیحدہ صورت میں پیش کیے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ یہاں مجدد اسلام امام احمد رضا قدس سرہٗ کے اُن رُشحاتِ قلم کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے جو سائنس اور فلسفہ کے افکار باطلہ کی تردید میں ظہور پذیر ہوئے۔

(۱) معین مبین بہرِ دور شمس و سکونِ زمین (۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) امریکہ کے ایک مہندس پروفیسر البرٹ ایف پورٹا نے دعویٰ کیا تھا کہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو اجتماع سیارات کے سبب عجب انقلاب برپا ہوگا، زلزلے اور

(۱) فلسفہ اور اسلام، امام احمد رضا قادری، رضا اکیڈمی ممبئی، رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ

طوفان آئیں گے، کئی ممالک صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ اس کی یہ پیش گوئی ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو بانکی پور پٹنہ کے انگریزی اخبار "اکسپریس" میں شائع ہوئی۔ جس کا تراشہ ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ نے ۱۸؍ صفر ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲؍ نومبر ۱۹۱۹ء کو بریلی شریف اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں بھیجا۔ مطالعہ کے بعد اعلیٰ حضرت نے مولانا بہاری رحمۃ اللہ علیہ کو ۲۴؍ صفر ۳۸ھ کو خط لکھا کہ "کسی عجب بے ادراک کی تحریر ہے، جسے ہیئت کا ایک حرف نہیں آتا۔ سراپا اغلاط سے مملو ہے۔" پھر ہیأت و ہندسہ کی رو سے ۱۷؍ نکات پر مشتمل اس کی تردید الرضا بریلی کے شمارہ صفر و ربیع الاول ۱۳۳۸ھ مطابق نومبر ۱۹۱۹ء میں شائع کی۔ چناں چہ ۱۷؍ دسمبر ۱۹۱۹ء کو کوئی انقلاب برپا نہ ہوا۔ یہ تنقید بعد میں الگ کتابی شکل میں بھی کئی بار شائع ہوئی۔

(۲) **فوز مبین در رَدّ حرکت زمین:** (۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء) مذکورہ تردید میں زمین کی گردش وکشش وغیرہ نظریات پر بھی کلام کیا گیا تھا لیکن ان نظریات کو سائنسی اور عقلی اصولوں کی روشنی میں مکمل اور مستقل طور پر باطل ثابت کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے ان مزعومات کے تعاقب میں ایک سو پانچ دلائل پر مشتمل کتاب فوز مبین تصنیف ہوئی، جو ماہنامہ الرضا بریلی ۱۳۳۸ھ و ۱۳۳۹ھ کے مختلف شماروں میں ۹۶؍ صفحات پر شائع ہوئی۔ کچھ حصہ رہ گیا جو اب تک کہیں شائع نہ ہوا، ہمارے دیرینہ کرم فرما، رضویات کے ماہر اور مشہور صاحب قلم پروفیسر مسعود احمد صاحب (پی. ایچ. ڈی.) کی عنایت سے فوز مبین کے بقیہ حصہ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی المجمع الاسلامی کو موصول ہوگئی ہے۔

(۳) **الکلِمَۃُ الملهَمة فی الحِکمۃِ المُحْکمَۃِ لِوَھاءِ فلسفۃِ المشئمۃ:** (۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) گردش زمین کے رد میں فلسفہ قدیم نے بھی دس دلیلیں پیش کی تھیں جو خود ہی غلط تھیں۔ فوز مبین کی فصل سوم میں ان دلیلوں کو پیش کر کے ان کی تردید کی گئی۔ لیکن اس تردید کے لیے ضروری تھا کہ فلاسفہ کی وہ دلیلیں، فلسفہ کے جن اصول و مسلمات پر مبنی ہیں انھیں بھی باطل ثابت کیا جائے۔

اب فصل سوم کی تذییل میں ان نظریات کا تعاقب شروع ہوا تو تیس مقامات تک جا پہنچا اور فلسفہ قدیمہ کے رد میں الکلمۃ الملہمہ کے نام سے مستقل کتاب کی صورت اختیار کر گیا۔ صفر ۱۳۹۴ھ مطابق مارچ ۱۹۷۴ء میں صدر العلماء مولانا سید غلام جیلانی اشرفی علیہ الرحمہ نے اسے اپنے سمنانی کتب خانہ میرٹھ سے شائع کیا۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) نے "تہافت الفلاسفہ" لکھ کر ایوان فلسفہ منہدم کر دیا تھا جو تقریباً سو برس بعد ابن رشد کی "تہافت التہافت" سے پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ شمارہ فروری ۱۹۸۱ء میں مشہور محقق اور ماہر فنون علامہ شبیر احمد خاں غوری سابق انسپکٹر مدارس عربیہ اتر پردیش نے "الکلمة الملهمه" کا اجمالی تعارف کراتے ہوئے اسے عصر حاضر کا "تہافت الفلاسفہ" قرار دیا۔

"میرے نزدیک الکلمۃ الملہمہ کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں فلاسفہ کے ان دلائل کا بھی ناقابلِ تردید براہین سے بھرپور ابطال کیا گیا ہے جن کے جواب سے ہمارے متکلمین ہمیشہ خاموش رہے اور کسی نے پورے طور پر ان کا بطلان واضح کرنے کی ہمت ہی نہ کی یا بلفظ دیگر اس طرف توجہ نہ فرمائی۔"

(۴) **نزول آیات فرقان بسکونِ زمین وآسمان:** (۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) اس میں قرآنی آیات سے زمین و آسمان کا ساکن ہونا ثابت کیا گیا ہے تاکہ اہل اسلام کی مزید تسکین وتقویت کا سبب ہو۔

یہ رسالہ پروفیسر مولوی حاکم علی اسلامیہ کالج لاہور کے سوال اور مراسلہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس کے آخر میں پروفیسر صاحب کے خیالات کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"محب فقیر! سائنس یوں مسلمان نہ ہوگی کہ اسلامی مسائل کو آیات و نصوص میں تاویلاتِ دور از کار کر کے سائنس کے مطابق کرلیا جائے۔ یوں تو معاذ اللہ اسلام نے سائنس قبول کی، نہ کہ سائنس نے اسلام۔ وہ مسلمان ہوگی تو یوں کہ: جتنے اسلامی مسائل سے اسے خلاف ہے سب میں مسئلہ اسلامی کو روشن کیا جائے۔ دلائل سائنس کو مردود و پامال کر دیا جائے۔ جابجا سائنس کے اقوال سے اسلامی مسئلے کا اثبات ہو۔ سائنس کا ابطال و اسکات ہو۔ الخ"

(۵) **مقامع الحدید علی خدّ المنطق الجدید:** مذکورہ بالا رسائل سے بہت قبل (تقریباً ۳۴؍ سال پہلے) یکم رجب ۱۳۰۴ھ کو نواب مولانا سلطان احمد خاں بریلوی نے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ سے ایک استفتا کیا تھا۔ جس کا سبب یہ ہوا کہ ایک معقولی عالم مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی نے "المنطق الجدید لناطق النائۂ الحدید" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں غیر اسلامی اور خالص فلسفی نظریات بڑے زوردار طریقہ پر پیش کیے، حتیٰ کہ پرانے فلسفیوں سے بھی کچھ زیادہ ہی بولنے کی کوشش کی۔ اور دیباچہ میں اپنی اس منطق جدید کی بڑی مدح وستائش بھی فرمائی۔

نواب صاحب نے اس میں سے چند اقوال و افکار نوٹ کر کے امام احمد رضا علیہ الرحمہ سے ان کے شرعی احکام دریافت کیے۔ اس استفتا کا جواب ۷؍ رجب ۱۳۰۴ھ کو مقامع الحدید علی خدّ المنطق الجدید کی صورت میں مکمل ہوا جس میں ان اقوال مسئولہ کا باطل اور کفری ہونا ثابت کیا گیا۔

(۶) **البارقة اللَّمعا، فی سُوْءِ مَنْ نطقَ بکفرٍ طَوعا:** (۱۳۰۴ھ) قول اگر کفری ہے تو قائل کی

تکفیر بھی ہوگی۔ یہ فقہاے کرام کا مسلک ہے، متکلمین تکفیر کے لیے اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ وہ قول اجماعِ مسلمین اور ضروریاتِ دین کے بر خلاف ہو اور صراحۃً اس کا قول ہو یعنی قائل نے التزاماً اسے کہا ہو نہ کہ اس کے قول سے لزوماً ثابت ہوا ہو۔ ایک حد تک صراحت کی قید تو فقہا کے نزدیک بھی ہے اس لیے خاص فرق یہ ذہن نشین رکھنے کا ہے کہ کوئی صریح کفری قول اگر ضروریاتِ دین کے خلاف ہو جبھی متکلمین تکفیر کریں گے ورنہ نہیں جب کہ فقہا کے نزدیک اس کا قطعیات کے مخالف ہونا ہی تکفیر کے لیے کافی ہے۔ لزوم و التزام اور صراحت و بیان وغیرہ میں متکلمین و فقہا کے مسلکوں کے درمیان حدِ فاصل اور نقطۂ امتیاز سمجھنے کے لیے، "الموت الأحمر" وغیرہ دیکھنا چاہیے۔

المختصر مقامع الحدید میں المنطق الجدید کے اقوال کا کفری ہونا، ثابت کرنے کے بعد آخری مرحلہ قائل کے متعلق حکم شرعی واضح کرنے کا تھا۔ اس ذیل میں یہ بحث سامنے آئی کہ جو شخص بحالت عدمِ اکراہ، بلا اظہار نفرت و انکار ایسا صریح کلمۂ کفر استعمال کرے جو اجماعِ مسلمین اور ضروریاتِ دین کے بر خلاف ہو۔ اس قائل کی تکفیر ہوگی یا نہیں؟ جواب اثبات میں تھا اور اس کے دلائل کثیر و بسیط، جس کے لیے امام احمد رضا قدس سرہٗ نے ایک مستقل رسالہ "البارقة اللمعا" مقامع الحدید کی تصنیف کے دوران ہی تحریر فرمایا۔ اور اس کا حاصل مختصر اشارات اور ایک آیت کریمہ حجت قاطعہ کے ساتھ مقامع الحدید میں درج کیا۔

یہ ان خدمات کا بہت اجمالی تعارف ہے جو اسلام کے اس بطل جلیل نے ردِّ فلسفہ کے سلسلے میں انجام دیں۔ تفصیل کے لیے کتب سوانح اور خود ان رسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

رسالہ "مقامع الحدید" نواب مولانا سلطان احمد خاں بریلوی کے پاس تھا، انھوں نے اس کی تبییض کی، شروع میں تمہید لکھی اور چند مقامات پر حواشی تحریر فرمائے پھر کسی خوش نویس جناب محمد حسین صاحب سے اپنے مبیضہ کی نقل کرا کے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے کتب خانہ میں داخل کی۔ یہی نقل مولانا اختر رضا خاں ازہری مدظلہٗ کے برادر خرد جناب منان رضا خاں زید علمہ کے ذریعہ سیٹھ مقبول احمد انصاری لاری ساکن کلکتہ کو ملی اور ان کے پاس نومبر ۱۹۸۴ء میں یا اس سے ذرا قبل مولانا عبد المبین نعمانی رکن المجمع الاسلامی کی نظر سے گزری۔ برادر موصوف نے اسے حاصل کر کے دو فوٹو اسٹیٹ کاپی کرائی۔ ایک کاپی اصل کے ساتھ انصاری صاحب کو واپس کی، دوسری المجمع الاسلامی کی لائبریری میں رکھی۔ اور راقم سطور سے اس کی اشاعت کی فرمائش کی، میں دوسری کتابوں کے انتظام اور خانگی و تدریسی مصروفیات کے سبب اِس طرف متوجہ نہ ہو سکا۔

توجہ اور اشاعت کی تقریب یہ ہوئی کہ ۱۹۸۲ء میں پروفیسر محمد جلال الدین قادری نے حکیم محمد موسیٰ

امر تسری بانی مرکزی مجلس رضا، لاہور کی فرمائش پر بہ عنوان "امام احمد رضا کا نظریۂ تعلیم" ایک بسیط مقالہ لکھا تھا۔ جو اس سال بعد ترمیم و اضافہ مجلس رضا سے شائع ہوا اور ہمارے دیرینہ محسن محترم مولانا عبد الحکیم شرف قادری استاذ جامعہ نظامیہ لاہور کی عنایت سے نومبر ۱۹۸۵ء میں راقم سطور کو دستیاب ہوا۔ پروفیسر صاحب نے اس مقالہ میں ایک جگہ تعلیم فلسفہ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے رسالۂ اعلیٰ حضرت "مقامع الحدید" کا بھی نام لیا تھا۔ چوں کہ رسالہ کبھی طبع نہ ہوا اور نہ ہی اس کی نقلیں ہو سکیں اس لیے اس کا کوئی اقتباس دینا، موصوف کے لیے ممکن بھی نہ تھا۔ میں اس مقام پر پہنچا تو دوسرے سارے کام چھوڑ کر مقامع الحدید کا مطالعہ شروع کر دیا، بعد مطالعہ خود ہی اس کی تبییض کی اور یہ ملحوظ رکھا کہ تبییض پھر اس کے مطابق کتابت کچھ اس ڈھنگ سے ہو کہ بہت حد تک توضیح و تسہیل کا کام اسی سے نپٹ جائے اور عوام و خواص سب کے لیے باعث کشش، قابل مطالعہ اور مفید و کارآمد بن جائے۔ کیوں کہ وقت کی قلت، کام کی کثرت اور اشاعت کی عجلت میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہ تھی۔ حوالوں کی تخریج، اہم اور مشکل مقامات کی تشریح، ضروری عبارات کا ترجمہ کتاب چھپنے کے بعد کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ اور کوئی بھی صاحبِ ذوق اسے کر سکتے ہیں۔ البتہ عربی عبارتوں پر اعراب لگا دیا گیا ہے تاکہ طلبہ اور بعض قارئین کے لیے ذرا آسانی ہو ورنہ علما اور عوام کے لیے اِس کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔

بہر حال اس بے بضاعت سے عجلت میں جو کچھ ہو سکا آپ کے سامنے ہے۔ نیک دعاؤں میں یاد رکھیں تو کرم۔ اور ربِّ کریم کے یہاں یہ ادنیٰ اور حقیر سی کاوش بارِ قبول پا جائے تو فضلِ عظیم۔

والصلوٰة والسلام على حبيبه خاتم النبيين، سيدالمرسلين رحمة للعلمين وعلى آله وصحبه وابنه وحزبه اجمعين.

محمد احمد مصباحی
رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور
صدر المدرسین فیض العلوم، محمد آباد
۱۲؍ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ/ ۵؍ دسمبر ۱۹۸۵ء، چہار شنبہ

❁❁❁❁❁❁

حرف آغاز[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً و مسلماً

میں ۲۰ر صفر المظفر ۱۴۰۸ھ پنج شنبہ کی شام کو رام پور حضرت حافظ شاہ جمال اللہ قادری علیہ الرحمہ کے آستانے پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا تو آستانے کے سجادہ نشین میرے دیرینہ کرم فرما محترم حافظ لئیق احمد خاں جمالی نے مولانا شاہ سلامت اللہ نقش بندی علیہ الرحمہ کی کتاب "گیارہویں شریف" دکھائی، جو ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء میں مطبع دبدبۂ سکندری رام پور سے شائع ہوئی۔

موصوف نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ نئے انداز میں ضروری تفہیم و تحشیہ کے ساتھ جلد اس کتاب کی اشاعت عمل میں لائی جائے، اس کتاب میں جہاں گیارہویں شریف کے جواز و استحسان کے دلائل، اس کے فوائد و منافع اور فاتحۂ اولیا کے ذبیحہ کی حلت پیش کی گئی ہے وہیں مصنف علیہ الرحمہ نے ان لوگوں کو کافر بھی لکھا ہے جو گیارہویں شریف کرنے والے مسلمانوں کی تکفیر اور فاتحۂ اولیا کے ذبیحہ کی حرمت کے قائل اور اسے مردار و خنزیر کا گوشت بتاتے ہیں، جب کہ رام پور کے خطیب اعظم مولوی وجیہ الدین احمد خاں اور ان کے بعض شاگردوں کا عرصۂ دراز سے یہ پروپیگنڈہ ہے کہ علماے رام پور نے کسی کی تکفیر نہیں کی ہے، اس پروپیگنڈے کا عملی جواب الصوارم الہندیہ کی اشاعت سے دیا گیا، جس میں علماے رام پور نے حسام الحرمین کی تصدیق فرمائی ہے، مزید یہ کتاب "گیارہویں شریف" بھی اس غلط دعوے کا کھلا ہوا رد ہے، ساتھ میں اس پر بہت سے علماے رام پور کی تصدیقات بھی ہیں جن میں کئی حضرات "خطیب اعظم" کے اساتذہ میں سے ہیں۔ اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علماے رام پور کا مسلکِ حق یہی تھا کہ اگر کوئی کلمہ گو ہونے کے بعد کفر بکے، خدا اور رسول کی شان میں اہانت کا مرتکب ہو یا ضروریات دین میں سے کسی ایک کا منکر ہو تو ضرور اس کی تکفیر کی جائے گی اور ہرگز ایسا نہیں کہ کلمہ پڑھنے لینے کے بعد جتنا چاہے کفر بکتا، لکھتا رہے پھر بھی مسلمان کا مسلمان رہ جائے اور اس کی تکفیر سے زبان و قلم روکنا ضروری ہو، کفر اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں، جب کفر جاگزیں ہوا تو ایمان رخصت ہو جائے گا۔

اس کتاب کی اشاعت سے بھی یہ ثابت ہو جائے گا کہ خطیب اعظم جس طرح اکابر اسلام کے خلاف ہیں اسی طرح علماے رام پور حتیٰ کہ خود اپنے بزرگ اساتذہ کے بھی مخالف ہیں اور انھوں نے سب سے الگ اپنا ایک نیا مسلک قائم کیا ہے۔

(۱) گیارہویں شریف، از مولانا سلامت اللہ نقش بندی رام پوری، مکتبۃ الجمال، رام پور، نومبر ۱۹۸۷ء

اس گفتگو کے بعد میں نے کتاب کی ورق گردانی کی تو دیکھا کہ گیارہویں شریف اور اس کے متعلقات پر یہ ایک جامع اور نفیس کتاب ہے جس سے صرف رام پور ہی نہیں بلکہ ہند و بیرونِ ہند کے تمام مسلمانوں کو فائدہ ہو سکتا ہے، اس لیے میں نے محترم لئیق میاں سے کہا کہ آپ اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی مجھے عنایت کریں، میں ان شاء اللہ اسے جدید انداز میں اشاعت کے قابل بنانے کی کوشش کروں گا۔

دوسرے دن مولانا سید شاہد علی رضوی نے اپنی وہ بیاض دکھائی جس پر وہ رسالہ گیارہویں شریف نقل کر کے اسے ترجمہ، حوالہ جات کی تخریج وغیرہ سے آراستہ کر چکے تھے، کچھ کام باقی تھا، ان کا حکم ہوا کہ میں اس پر نظر ثانی کر لوں، اس طرح وہ بیاض اور اصل کتاب میں اپنے ساتھ مبارک پور لایا اور اپنے طور پر اس کا ایک نیا مبیضہ تیار کیا، تبییض کے ساتھ بہت سے مقامات پر ترجمہ بھی خود ہی کر ڈالا، البتہ اصل کتاب کی عبارتیں بعینہ باقی رکھی گئی ہیں، اس کی زبان چوں کہ علمی و فقہی اور وہ بھی قدیم تھی اس لیے جہاں ضرورت محسوس ہوئی حاشیہ میں یا بین السطور کچھ وضاحت کر دی گئی ہے، خاص طور سے ڈیش، کاما وغیرہ نشانات سے میں نے تفہیم کا کام زیادہ لیا ہے تاکہ جہاں تک ہو سکے قاری کو خود مصنف ہی کے الفاظ و عبارات کے ذریعے ان کے مقصود سے روشناس کرایا جائے۔

حوالہ کی عربی عبارتوں کا ترجمہ اصل کتاب میں ہی لکھ دیا گیا ہے، لیکن اسے کچھ علامات و نشانات کے ذریعے ایسا ممتاز کر دیا گیا ہے کہ ہر قاری پر بہ خوبی واضح ہو جائے کہ یہ مصنف کے الفاظ نہیں ہیں، اکثر آیات کا ترجمہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کے ترجمہ قرآن "کنز الایمان" سے نقل کر دیا گیا ہے، بعض عربی عبارتیں سلسلۂ کلام کے درمیان تھیں، متن کتاب کے ساتھ ان کا ترجمہ لکھنے سے عبارت کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور ربط ملانے میں زحمت ہوتی اس لیے ان کا ترجمہ نیچے حاشیہ میں لکھ دیا گیا ہے، اس طرح کتاب میں ایک طویل عبارت مولانا شاہ احمد سعید مجددی علیہ الرحمۃ کی مبارک کتاب "تحقیق الحق المبین" سے منقول تھی، اس کا ترجمہ بھی حاشیہ میں لکھا گیا ہے۔

اب یہ قدیم کتاب جدید زیورات سے آراستہ ہو کر اربابِ ذوق کی ضیافتِ فکر و نظر کے لیے حاضر ہے، کیوں کہ اس کی تجدید میں بنیادی کاوش، حوالہ جات کی تخریج، ترجمہ وغیرہ زیادہ تر کام مولانا سید شاہد علی رضوی کا ہے اس لیے جدید ترتیب اور ترجمہ و تحشیہ کے تحت ان ہی کا اسم گرامی مناسب و موزون ہے۔ رب کریم ان کا فیض عام و تام کرے اور محترم حافظ لئیق احمد خاں جمالی بھی خاص طور سے ناظرین کے شکریہ و تبریک کے مستحق ہیں کہ ان ہی کی تحریک اور سعیِ جمیل سے یہ علمی تحفہ قارئین کی نذر ہو رہا ہے۔

فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء وضاعف حسناتہ وکثر جمل أعمالہ و جلیل أشغالہ.

محمد احمد اعظمی مصباحی

تقدیم[1]

أضواء على حياة العلامة أحمد رضا القادرى البريلوى
وخدماته العلمية والدينية

هو شيخ الإسلام والمسلمين (ت١٣٤٠هـ) مجدد الأمة الإمام أحمد رضاابن الشيخ مولانا نقى على خان القادرى الحنفى البريلوى. كان من أكابر علماء الهند ونوابغ القرن الرابع عشر الهجرى، يندر نظيره فى عصره بل فى عدة قرون ماضية، فإنه رئيس المفسرين وإمام المحدثين، وأفقه العلماء، وأجود المتكلمين فى المعاصرين. له طول الباع فى نحو خمسين علما وصنف فى جميعها فهذا مما تفرد به الشيخ فإن أحدا من المتقدمين لم يصنف فى أكثر من خمسة وثلثين فنا.

ولد فى مدنية بانس بريلى بالهند الشمالية فى العاشر من شهر شوال ١٢٧٢هـ الموافق ١٤ يونيو ١٨٥٦م. وتوفى فى ٢٥ صفر عام ١٣٤٠هـ الموافق ٢٨ اكتوبر ١٩٢١م وكان اليوم يوم الجمعة.

تشرف بزيارة الحرمين مرتين. مرة سنة٩٦ — ١٢٩٥هـ وأخرى سنة٢٤ — ١٣٢٣هـ فقام فى مدة إقامته فى الحجاز بالبحوث العلمية والمناقشات مع أكابرالعلماء، وصنف عدة تصنيفات، واعترف علماء الحرمين الشرفين برئاسته فى العلوم الإسلامية، ونوهوا بشانه وأجلوه إجلالا كبيرا.

وجديرة بالذكر فى هذا المقام واقعتان، تشهدان بفقاهته الراسخة، وذهنه الوقاد، وفكره البالغ. واعتراف علماء الحجاز بعلو كعبه فى العلوم.

(١) سافرالى الحرمين الشريفين فى السادس والعشرين من شوال سنة١٢٩٥هـ مع أبو يه الكريمين وهو اذ ذاك ابن ثلث وعشرين سنة. فوقع له فى هذه الزيارة الكريمة أنه كان يوما يصلى فى مقام إبراهيم فلما انصرف عن صلوته استقبله الشيخ حسين بن صالح كمال

(١) قصيدتان رائعتان، امام احمد رضا قادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور، جون ۱۹۸۹ء

إمام الشافعية (المتوفى ١٣٠٣هـ، ١٨٨٤م) مع أن التعارف بينهما لم يكن قط فأتى وأخذ بيد الشيخ أحمد رضا ومشى به إلى بيته، وقال مرارا واضعايده على جبهته المشرقة والله إنى لأجد نور الله في هذا الجبين ثم رقم بيده إجازة الحديث وإجازة الطريقة القادرية ومنحها للإمام أحمد رضا وقال اسمك "ضياء الدين أحمد". واقترح عليه إمام الشافعية أن يصنف شرحا لكتابه "الجوهرة المضيئة" فشرحها شرحاً وافياً فى يومين فقط سماه" النيرة الوضية فى شرح الجوهرة المضيئة" ثم علق عليها تعليقا سماه" الطرة الوضية على النيرة الوضيئة".

(٢) ومما وقع فى رحلته الثانية إلى الحجاز المقدسة مابينه فى بعض تصانيفه.

استفتانى الشيخ عبد الله مرداد، والشيخ حامد أحمد محمد الجداوي فى ورقة النقد (النوط) وكان الاستفتاء يحتوى على اثنى عشر سوالا فصنفت مجيبا عنها رسالتى "كفل الفقيه الفاهم فى أحكام قرطاس الدراهم" (١٣٢٤هـ) فى نحو يومين بكمال الاستعجال.

كانت الرسالة عند الشيخ السيد مصطفى. الأخ الصغير للشيخ السيد اسمعيل. فى مكتبة الحرم ليبيضه. فإن خطه فى غاية الرشاقة والحسن. وفى سابق الزمان سئل أستاذ أساتذتى فضيلة الشيخ جمال بن عبد الله بن عمر المكى مفتى الحنفية عن ورق النقد فأجاب: العلم أمانة فى أعناق العلماء. المسئلة حديثة ولم أطلع على جزئية فيها. والله أعلم.

ذهبت يوما إلى مكتبة الحرم فإذا أنا بشيخ جليل يطالع رسالتى "كفل الفقيه" فلما بلغ المقام الذى أوردت فيه العبارة التالية من فتح القدير. "لو باع كاغذة بألف يجوز ولا يكره" تهلل بشرا وضرب على فخذه قائلا: "أين كان جمال بن عبد الله من هذا النص الصريح".

ثم استخرج كتبا لتحقيق مسئلة، وأراد أن ينقل شيئا من عبارات الكتب. وكنت مشتغلا بتصحيح نقل الرسالة. فلا عرفنى ولا عرفته الى ذلك الحين. واذا هو قد وضع الدواة على كتاب لم يكن يطالعه ولا ينقل منه. فما أنكرت عليه بل وضعت الدواة عن الكتاب تعظيما له. فوضع ثانيا على الكتاب وقال: فى كتاب الكراهية من البحر الرائق تصريح بجوازه. فلم أقل له: لم يصل البحرالرائق الى كتاب الكراهية بل انقضى قبله.

نعم قلت له: ليس كذلك. بل صرح البحر بالمنع إلا أن يحتاج إليه حين النقل والكتابة مثل أن يطير الورق بالريح. وأريته ذلك التصريح فى البحر الرائق. فقال: إنما اريد النقل والكتابة.

قلت: لكن لست الآن كاتبا وناقلا منه.

فسكت وسأل عنى السيد اسمعيل فقال له "هذا هو مصنف هذه الرسالة" فقابلنى لكن خجلا ثم رجع عجلا. "وذلك فى الرابع من صفرالمظفر ١٣٢٤هـ".

وذلك الشيخ الجليل كان مفتى الحنفية عبد الله بن صديق بن عباس ومنصب مفتى الحنفية كان بالمنزلة الثانية من السلطان.وهذا هو المنصب الذى منعه من لقاء الشيخ أحمد رضا قبل ذلك اليوم. فلم يات إلى مكان اقامته بل دعاه إلى بيته فأراد الشيخ أن يجيب الدعوة و يقابله. لكن قال السيد اسمعيل محافظ مكتبة الحرم: والله لن يكون هذا. أكابر العلماء يأتونك للقاءك فلم لايأتى هو. فامتنع الشيخ أحمد رضا ليمين السيد المحترم. رحمهم الله جميعا.

ومجمل انطباعات علماء المدينة المنورة ما أبداه الشيخ الصالح محمد كريم الله الفنجابى مجاور الحرم المدنى تلميذ الشيخ عبد الحق الاله آبادى المهاجر المكى. (المتوفى ١٣٣٣هـ) وقال للإمام أحمد رضا:

إنى مقيم بالمدينة الأمينة منذ سنين. و ياتيها ألوف من العالمين. فيهم علماء وصلحاء وأتقياء. ورأيتهم يدورون فى سكك البلد. لا يلتفت إليهم من أهله أحد. وأرى العلماء والكبار العظماء إليك مهرعين، وبإجلا لك مسرعين. ذلك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم (٣).

ومن أراد الإطلاع على تفصيل ما أعرب علماء الحرمين المكرمين من انطباعاتهم الجميلة فى الإمام أحمد رضا فليراجع إلى الكتب التالية. فكلها مطبوعة توجد فى المكتبات والنوادى العلمية:

(١) فتاوى الحرمين برجف ندوة المين (٤) (١٣١٧هـ)

(٢) حسام الحرمين على منحر الكفروالمين (٥) (١٣٢٤هـ)

(٣) الاجازات المتينة لعلماء بكة والمدينة. (١٣٢٤هـ)

(٤) كفل الفقيه الفاهم فى أحكام قرطاس الدراهم. (١٣٢٤هـ)

(٥) الفاضل البريلوى كما يراه علماء الحجاز. بالأردية. للبروفيسور محمد مسعود أحمد المجددى.

ومن أحسن الدلائل على مقدرته الهائلة على خمسين فنا مؤلفاته فيها (٦) فان تصانيفه ليست جمعا وتلفيقا واجتناءا من الكتب السابقة فحسب. مثل مؤلفات بعض المصنفين من معاصريه. بل هى تزخروتتدفق بأبحاث وتحقيقات وإفادات وإفاضات لم يسبق إليها ولم يسمح بها قلم ولا كتاب.

منها مجموعة كبرى لفتاواه فى اثنى عشر مجلدا، كل مجلد يحتوى على نحو ألف صفحة. تسمى "بالعطايا النبوية فى الفتاوى الرضوية" تدل على سعة اقتداره فى الفقه والحديث وغيرهما من العلوم الشرعية والعقلية كما لا يخفى على من تشرف بمطالعتها.

كانت له ملكة استنباط الأحكام فى المسائل الحديثة التى لا يوجد فيها نص من القدماء، وإذا وجد النص تورع عن الاستنباط من القرآن والحديث. إلّا لحاجة تدعو إليه. يقول: ليس للمقلد أن يجتهد و يستنبط من الأصلين. بل عليه أن يقتنع بما بينه أئمة المذهب وبما صححه ورجحه الفقهاء. ومن أراد شيئا من تفصيل عبقريته فى الفقه والأصول فليراجع إلى مقدمة الاستاذ افتخار أحمد القادرى على جد الممتاز (٧) للإمام أحمد رضا ومقدمتى عليه.

وقصارى القول أنه لا يوجد فى تاريخ الفتاوى أى مجموعة أجل وأعظم من العطايا النبوية فى الفتاوى الرضوية. ولا يعدها أرباب العلم والفتوى فى درجة الفتاوى بل هى معدودة فى درجة الشروح المعتبرة الجليلة. ورأى العلامة السيد اسمعيل خليل حافظ مكتبة الحرم المكى بعض فتاوى الإمام فكتب إليه: "والله أقول والحق أقول إنه لورآها أبو حنيفة النعمان لأقرت عينه، ولجعل مؤلفها من جملة الأصحاب". (٨)

وأكثرفتاوى الإمام أحمد رضا فى الأردية، وبعضها فى الفارسية والعربية، فكان دأبه الإجابة باللغة التى سئل فيها. أما مصنفاتها الأخرى فهى ايضا فى هذه اللغات الثلث. لكن كثيرا ما يكون تحقيقاتها العلمية الهامة فى العربية لميله الطبيعى إليها. كأنها لغته الوطنية. فإنا نرى ونحس فى تصانيفه الأردية والفارسية أيضا أن الأبحاث العلمية تتجلى فى ذهنه الثاقب بالعربية أولا ثم يحولها الى اللغة الأخرى. كما سيظهر على من تأمل فى مصنفاته من الذين تمكنوا من العربية والأدرية أو الفارسية معا إلا أنه كثيرا مايورد (و أحيانا يخترع و يبتكر) الأمثال و المحاورات الأردية والفارسية خاصة فى تصانيفه الكلامية وغيرها حين

المخاطبات والإفادات. وليس ذلك الا لعظيم اقتداره على الأردية والعربية والفارسية جميعا. ولكن تجلي الأبحاث العلمية فى ذهنه بالعربية يدل على ميله الطبيعى إليها.

والجدير بالذكر أنه على الرغم من تمكنه من العلوم الكثيرة كان شاعرا مجيدا. مع أن الإجادة فى الشعر والنثر معا ندرت منذ قديم الزمان، أما الإجادة فى النثر والنظم مع الإجادة فى البحوث العلمية الدقيقة اليابسة فأقل وأندر.

يمتاز شعره بالطابع الإسلامى والفكر الدينى، وتتجلى فيه الروعة الأدبية والبراعة الفنية، و يتقوى بالآيات القرانية والأحاديث النبو ية ونصوص الأئمة، وإلى جانب ذلك فكره القو يم وذوقه السليم، وكل ذلك يعجب الأسماع، و ينشط الأذهان و ينير الأفكار و يهز المشاعر و يرهف العواطف.

وأكثر شعره فى المديح النبوى وليس ذلك إلا لعميق صلته بالنبى صلى الله عليه وسلم وتمكن حبه الكريم على سوداء قلبه. فكان لا يكاد يمسك ما فى ضميره من عواطف الحب ودواعى التعظيم والإجلال فتتشكل صورة الشعر. ومع ذلك لا يوجد فى أى بيت له غلو ولا تقصير، ولا أى لفظ مما لا يحسن استعماله فى حضرة النبى الكريم عليه أفضل الصلوة وأكرم التسليم.

وشعره ايضا باللغات الثلثة مع غاية الجمال والفصاحة والسلاسة واعترف بها أدباء اللغات الثلث. ولو لا مخافة الإملال لذكرت بعض انطباعاتهم.

وأما أفكاره العالية وتخييلاته الدقيقة ومعانيه النبيلة فمما لا يحول دونه فكر أحد من الشعراء الأجلة المعاصرين.

وقد طبعت مجموعة شعره "حدائق بخشش (١٣٢٥هـ)" وعني بها الشعراء العادلون والأحبار الناقدون فى الهند و باكستان. أكثرها بالأردية وقليل منها بالفارسية لكنها تكفى شهادة لبراعته فى الشعر الفارسى. أما شعره العربى فلم يجمع. نعم يوجد منه قليل متفرق فى بعض تصانيفه كالفتاوى الرضو ية والطارى الدارى وغيرهما.

وأحسن طريق لمن أراد البحث عن نبوغ الامام أحمد رضا فى العلوم والفنون أن يطالع تصانيفه الجليلة مطالعة عميقة أنيقة. انه سيجد أكثر وأبلغ مما وصفناه و يستخرج كنوزا من الحقائق الثمينة والمعارف الغالية والأبحاث المتينة والأفكار الدقيقة مع قلة المبانى

وكثرة المعانى. والله الموفق للخير و بنعمته تتم الصلحت.

المراجع

(١) تذكرة علماء الهند. بالفارسية للمولوى رحمن على. ص: ١٦، ودائرة المعارف الاسلامية ج:١، كراسة: ٥، ص: ٢٨٠.

(٢) ملفوظاته المرتبة. جد الممتاز على رد المحتار. النسخة المخطوطة للمجمع الاسلامى بمباركفور ج: ١، ص: ٢٢، كفل الفقيه الفاهم فى أحكام قرطاس الدراهم ص: ١٥٧ - ١٥٨.

(٣) الإجازات المتينة ص: ٢٥٤، من مجموعة الرسائل الرضو ية ج: ٢.

(٤) فى الرد على العلماء الذين أسسوا جمعية ندوة العلماء و دارالعلوم التابعة لها بلكهنو بالهند الغير المنقسمة فى نهاية القرن الماضى الميلادى، وكان صاحب الترجمة الشيخ أحمد رضا من أشد المنتقدين والمعارضين لحركة ندوة العلماء لأسباب شرحها فى مؤلفاته وكتاباته، منها هذا الكتاب. (رئيس التحرير)

(٥) فى الرد على العلماء المنتمين إلى مدرسة ديو بند الشهيرة. وكان صاحب الترجمة من أشد منتقدى هذه الجماعة ايضا. (رئيس التحرير)

(٦) من أراد الوقوف على مصنفات الإمام فليراجع إلى: (ا) المجمل المعدد لتاليفات المجدد (١٣٢٧هـ) و (ب) مرآة التصانيف. للاستاذ عبد الستار القادرى. يطلب من المكتبة القادر ية بلاهور (ج) وتصانيف رضا للأستاذ عبد المبين النعمانى. يطبع إن شاء الله تعالى. يطلب من المجمع الاسلامى بمباركفور الهند.

(٧) حاشية على رد المحتار للعلامة محمد أمين الشامى و يطبع مجلده الأول تحت اشراف المجمع الاسلامى بمباركفور و يطلب من العنوان التالى: الحاج محمد فاروق المحترم ٣١/ دى ١٨٣. مدنپوره، وارانسى، الهند.

(٨) الإجازات المتينة ص: ٢٥٨، من مجموعة الرسائل الرضو ية ج: ٢.

(المقالة نشرت أول مرة فى مجلة الدراسات الاسلامية. (عدد: ٢، ج: ١٩، مارس، ابريل ١٩٨٤ م) يصدرها مجمع البحوث الإسلامية، الجامعة الإسلامية اسلام آباد، الباكستان ورئيس التحرير محمود أحمد غازى.)

تقدیم[1]

باسمہٖ وحمدہٖ والصَّلوٰۃ علیٰ رسولہٖ وجنودہٖ

اب تک دنیا بے شمار سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظاموں کا تجربہ کر چکی ہے اور آج بھی عالمی آبادی میں جمہوریت، سامراجیت، سرمایہ داری، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ ناموں سے مختلف نظام فکر وعمل رائج ہے۔

لیکن ایک تو زندگی کے ان تمام نظاموں میں انسان کی اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور بعض اخلاق سے اعتنا بھی کیا گیا ہے تو صرف اس لیے کہ مالی اور سیاسی مفاد سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ اگر ان کو چھوڑ دیا جاتا تو بہت سے اقتصادی اور ملکی فوائد بری طرح مجروح ہوتے اور کسی دنیاوی مفاد پر حرف آنا ان نظاموں کی شریعت میں سب سے بڑا گناہ ہے۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ روحانی اقدار اور مابعد الموت کے تصور سے یہ سارے نظام یکسر خالی ہیں اور اس فضائے محدود سے ماورا کسی عالم بسیط کا خیال محض ایک فریب سمجھتے ہیں۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ جس بنیادی نصب العین کے خوش نما اور نشاط انگیز تصور پر ان نظاموں کی اساس قائم ہے اس کی تکمیل سے بھی تجربات کی وسیع دنیا میں وہ ناکام ہی ثابت ہوئے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آج جب کہ سارے نظاموں کی خرابیاں طشت ازبام ہو چکی ہیں، اور جن کے باعث دنیا ایک متعفن آتش کدہ بنتی جا رہی ہے تو کیا اسلام اس صورت حال میں مظلوم انسانیت کی دست گیری کر سکتا ہے اور تباہ حال دنیا کو فیروز مندی و سعادت سے ہم کنار کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اسلامی نظامِ حیات انسان کے اندر خوفِ خدا، آخرت کے تصور، پھر اپنی اور ساری مخلوق کی خیر خواہی اور بھلائی کے افکار و جذبات بروے کار لانے کے اصولوں پر قائم ہے۔ اس لیے وہ عبادات اور معاملات دونوں ہی پر مشتمل ایک جامع اور باہم مربوط و مضبوط دستور پیش کرتا ہے، جو بندہ اور خدا، فرد اور خاندان، فرد اور معاشرہ، فرد اور حکومت کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کی مکمل تشریح و تحدید کرتا ہے۔ وہ جہاں نوع انسان کے دنیاوی مفادات کا پاس و لحاظ رکھتا ہے اور ان کی حد بندی کرتا ہے وہیں انسان کی اخلاقی قدروں اور روحانی

(۱) اسلام اور امن عالم، مولانا بدر القادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور، ۱۹۸۹ء۔

توانائیوں کے اصول و ضوابط بھی پیش کرتا ہے اور ان سب کو بروے کار لانے پر پورا زور صرف کرتا ہے۔ اور اس کی حکیمانہ جامعیت کا عالم یہ ہے کہ دوسرے نظاموں میں جہاں سے مفاسد کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور جہاں سے ظلم و تعدی کے دروازے خود بخود کھلتے ہیں اور اپنی حدوں سے تجاوز و سرکشی کا بازار علانیہ اور خفیہ طور پر خوب خوب گرم ہو جاتا ہے، ان سب کی پیش مندی یا علاج و مداوا اسلام میں پہلے ہی سے موجود ہے۔

اس لیے اسلام آج بھی انسانیت کی دست گیری اور عالمی امن و سلامتی کی وہی صلاحیت رکھتا ہے جس کا صدیوں تک دنیا برابر مشاہدہ کرتی رہی ہے۔ اور آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جس شعبے تک اسلام کو عمل دخل حاصل ہے اس کی کار فرمائی کا حسن نمایاں ہے۔ تفصیلات میں مجھے جانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ایک مبسوط کتاب دعوے کی دلیل کے طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور نظامِ اسلام کے ہر پہلو پر تفصیلی گفتگو اور دوسرے نظاموں سے تقابل پر اور بھی قابلِ قدر تحریریں موجود ہیں۔

لیکن یہ انسانیت کی درد انگیز مظلومیت ہے کہ اسے اس کے امراض کی شفا بخش دوا نہیں دی جاتی۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف ہر نظام چلانے والوں کے اندر جہاں اور نظاموں سے نفرت و بیزاری پائی جاتی ہے وہیں اسلام سے بھی حسد و عداوت اور تعصب و تنگ دلی کا عنصر پوری طرح کار فرما نظر آتا ہے، جب کہ یہی ان کا مسیحا اور ان کی لاینحل مشکلات کا حل ہے۔

دوسری طرف بیشتر مسلم ممالک کا با اقتدار طبقہ اسلام کی روحانی و ایمانی توانائیوں اور اس کی ہمہ گیر صلاحیتوں سے نابلد ہے۔ مزید برآں اس کا ذہن اس تعلیم و تحریر سے مسموم ہو چکا ہے، جسے اسلام دشمن قوتیں پیاسی دنیا کو اس سرچشمۂ حیات سے محروم رکھنے یا دور کرنے کی خاطر وسیع تر پیمانے پر بڑی تیزی سے عام کر رہی ہیں۔ اس لیے یہ طبقہ جو اسلام کو اس کی ساری خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ عملی زندگی میں پیش کرنے کا اصل ذمہ دار ہے وہ خود دوسروں کا دست و بازو اور اسلامی نظامِ حیات کا حریف بن چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام کی قوت و صلاحیت، اس کا جلال و جمال اور اس کا حسن و کمال اسی وقت پورے طور پر جلوہ آرا ہو سکتا ہے جب اسے مکمل نفاذ حاصل ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے خود اسلامیانِ عالم اسے زندگی میں اس کا وہ مقام عطا کریں جس کے بغیر اس کی جلوہ سامانیوں کا ظہور ممکن نہیں۔

دوسرے نظامِ زندگی دیکھنے اور پڑھنے سے پہلے خود اسلام کا گہرا اور وسیع مطالعہ اسلامی مفکرین کے رشحاتِ قلم کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ پھر دوسرے نظاموں کا جائزہ، ان کے اعتراضات کی جانچ اور اسلام کے ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر اسلام کی طرف سے بد دلی نہ صرف یہ کہ بہت بڑی ناانصافی

ہے بلکہ اپنی خودکشی اور پوری انسانیت کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بھی ہے۔

مبلغ اسلام برادرِ گرامی مولانا بدر القادری مد ظلہ کو رب کریم جزاے خیر سے نوازے کہ انھوں نے اسلام سے ناآشنائی اور اس کی طرف سے بدگمانی کا مرض دیکھ کر اس کا علاج پیش کیا۔ اور زیرِ نظر کتاب میں اسلامی نظامِ حیات کے مختلف شعبوں پر سیر حاصل بحث کرتے ہوے یہ بھی ثابت کیا کہ امنِ عالم آج بھی اسلام کی تنفیذ ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے دامن میں اب بھی وہ بجلیاں پوشیدہ ہیں، جو دنیا کی بدحالی و ابتری کا قلع قمع کر سکتی ہیں۔

تعصب و تنگ نظری کی عینک اتار کر دانشورانِ عالم اگر صاف دلی اور نیک نیتی سے تباہ حال انسانیت کی نجات پر غور کریں تو اس کی فلاح و بہبود کی مکمل اور جامع تدبیریں اسلام ہی کے دامن میں ملیں گی۔

کتاب کی تفصیلات سے کیف آشنا اور لطف اندوز ہونے کے لیے ورق الٹیے اور اس خزانۂ معارف کی حقائق نمائی سے اپنے دیدہ و دل کی دنیا آباد کیجیے۔ ؏

توفیق دے جس دل کو خداوند تعالیٰ
دامن میں وہ لے رحمت و انوار کی سوغات

محمد احمد مصباحی
المجمع الاسلامی، مبارک پور، ہند
دار العلوم اشرفیہ، مبارک پور
۷؍ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ، ۱۲؍ جون ۱۹۸۹ء، دوشنبہ

حرفِ آغاز(۱)

باسمہٖ و حمدہٖ تعالیٰ و بالصّلوٰۃ علی نبیہٖ و جنودہ

زیرِ نظر کتاب اُس جلیل القدر شخصیت سے متعلق ہے جو تیرھویں صدی کی آخری دہائیوں اور چودھویں صدی کی پہلی دہائی میں رام پور کی دینی و علمی فضا پر پورے طور سے چھائی رہی۔ بزمِ شریعت و معرفت ہو یا مجلس وعظ و خطابت، حلقۂ درس و تدریس ہو یا میدانِ تبلیغ و اشاعت ہر جگہ مولانا ارشاد حسین رام پوری علیہ الرحمہ کی ذاتِ گرامی فیض بار نظر آتی ہے۔

دورِ ماضی کی یہ تابناک شخصیتیں امتدادِ زمانہ کی تہوں میں دبتی جا رہی ہیں اور ابناے عصر کی تغافل کیشیاں اس پر مستزاد ہیں۔ جب کہ عہدِ حاضر کی بڑھتی ہوئی ظلمتیں دور کرنے کے لیے اُن ہی قندیلوں کی ضرورت ہے جن سے کل ان فضاؤں میں ہمہ گیر اُجالا تھا۔ وہ نہیں مگر اُن کی زندگیوں کے تابندہ نقوش، اُن کے علم و فضل، اُن کے اخلاق و محاسن اور اُن کی تعلیمات و ہدایات آج بھی مینارۂ رُشد و ہدایت کا کام سرانجام دے سکتی ہیں لیکن انہیں بوسیدہ اوراق، منتشر صفحات، اور عصرِ پارینہ کی آغوش سے نکال کر نئی جلوہ گاہوں میں ضیا باری کا موقع فراہم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے محنت و کاوش، تلاش و جستجو، بحث و تحقیق، تحریر و ترتیب اور نشر و اشاعت کے صبر آزما مراحل کا سامنا کرنا ہوگا جس کے جذبات ایک زندہ قوم میں بیدار رہنا حیاتِ ملّی کی بقا کے لیے از حد ضروری ہے:

اپنی تاریخ کو جو قوم بُھلا دیتی ہے
صفحۂ دہر سے وہ خود کو مٹا دیتی ہے

میں اس اظہار میں بے پناہ مسرت محسوس کرتا ہوں کہ حضرت مولانا سید شاہد علی رضوی مہتمم و شیخ الحدیث الجامعۃ الاسلامیہ رام پور کو قدرت کی فیاضیوں نے ایسے پاکیزہ جذبات کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ وہ ایک عظیم ادارہ کے اہتمام و انتظام، تدریس و تعلیم اور تقریر و تبلیغ کی مشقت خیز مصروفیات کے باوجود اسلاف کے احوال و سوانح سے گہرا شغف اور تصنیف و اشاعت کا کافی شوق رکھتے ہیں خصوصاً علماے رام پور کے حالات و آثار کی جستجو ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان ہی جذبات کا ایک نمونہ پیشِ نظر کتاب بھی ہے۔ جس کی قدر شناسی،

(۱) مولانا ارشاد حسین رام پوری، از مفتی سید شاہد علی رضوی، قادری اکیڈمی، رام پور، ستمبر ۱۹۸۹ء

عزت افزائی، اور مصنف کے لیے مزید خدمات کے مواقع کی فراہمی قوم کی ملّی و اخلاقی ذمہ داری ہے۔ مجھے توی امید ہے کہ یہ کتاب دینی و علمی حلقوں میں اپنا متوقع مقام اور خاطر خواہ پذیرائی بہت جلد حاصل کرلے گی اور مصنف کے اگلے کاڑ میں قوت و توانائی اور حوصلہ افزائی کا سامان فراہم کرے گی۔ واللہ المستعان و بنعمتہ تتم الصالحات.

۲۰ر محرم ۱۴۱۰ھ چہار شنبہ ۲۳ر اگست ۱۹۸۹

تقدیم (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　حامداً و مصلیاً و مسلماً

سفرناموں کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے سفرنامے آج بھی شہرۂ آفاق حیثیت کے حامل ہیں جن میں انھوں نے مختلف ملکوں اور شہروں میں اپنی قیام اور وہاں کی قومی، مذہبی، تمدنی اور جغرافیائی حالات کو بیان کیا اور انھیں اس کا موقع بھی ملا کیوں کہ ان کے سفر یک روزہ، دو روزہ نہ تھے بلکہ مختلف مقامات پر ایک عرصے تک قیام کرکے وہاں کے ہر قسم کے حالات کا گہرا جائزہ لیا، وہاں کی عادات و رسوم اور آثار و اشخاص سے براہ راست آشنائی حاصل کی، پھر اپنے عہد کے دور افتادہ باشندوں اور آنے والی نسلوں کے لیے ان سب کی واقفیت بہم پہنچائی۔ یوں تو تجارت و صنعت کے تعلق سے آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں بے شمار سیاح ملیں گے جنھوں نے بہت سے ممالک کا دورہ کیا ہوگا اور یہ ہمارے ترقی یافتہ دور میں کوئی حیرت انگیز امر نہیں -اس لیے کہ برق رفتار سواریوں کی ایجاد نے آج پوری دنیا کو ایک شہر بنادیا ہے اور تھوڑی دیر میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جانا کوئی ناممکن یا مشکل بات نہیں۔ بس دست رس چاہیے پھر سب کچھ آسان ہے۔

لیکن ایک عام تاجر اور ایک صاحبِ فکر عالم کی سیاحت میں بڑا فرق ہے، تاجر اپنی تجارت کے گوشوں، اس کے فروغ کے طریقوں اور اس سے تعلق رکھنے والے افراد اور اداروں پر ہی نظر رکھتا ہے۔ لیکن کوئی اسلامی مفکر جب کسی نئی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اس سرزمین کی پوری تاریخ اس کی نظر میں گھوم جاتی ہے، اس کے انقلابات، ماضی و حال کے تغیرات، اس پر قوموں کے عروج و زوال کے سارے نقوش اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کبھی حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں، کبھی عبرت سے جھک جاتی ہیں اور کبھی رنج و حسرت سے اشک بار ہوجاتی ہیں۔ اس کا دل لرز اٹھتا ہے، ذہن کے تار جھنجھنا جاتے ہیں، فکر و خیال کی رگیں تیز سے تیز تر ہوجاتی ہیں اور ماضی میں وہ ایسا گم ہوجاتا جیسے حال سے اس کا رشتہ ٹوٹ چکا ہو۔

کہیں اس کے جذبات اسے مہمیز دیتے ہیں اور وہ مستقبل کے امکانات پر غور کرتا ہے، اسلام کے فروغ و ارتقا اور تبلیغ اسلام کے ذرائع پر نظر ڈالتا ہے اور اس کی راہیں تلاش کرتا ہے۔

(۱) جادۂ منزل، علامہ بدر القادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور، ۱۹۹۱ء

وہ اس سرزمین کی تجارتی، صنعتی، ثقافتی، صحافتی، تمدنی ہر طرح کی سرگرمیوں کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ مختلف علاقوں کی عادات و تہذیب، افکار و رسوم اور حالات و خیالات کا جائزہ لیتا ہے۔ ان کے بارے میں ایک رائے قائم کرتا ہے، راہِ اعتدال اور جادۂ حق سے ان کے قرب و بُعد کی نشان دہی کرتا ہے، فکر مستقیم کی روشنی میں ان کے انحطاط و ارتقا کی تعیین کرتا ہے اور حسن ظاہر کے ساتھ نور باطن سے بھی انھیں مستنیر کرنے کی قریب ترین راہوں پر غور کرتا ہے۔ یہ وہ فرق ہے جو ایک عام تاجر اور ایک اسلامی مفکر کی سیاحت میں خط امتیاز کھینچتا ہے۔

برادر محترم مولانا بدر القادری نے بھی ایک اسلامی مفکر اور حوصلہ مند مبلغ کی حیثیت سے بہت سے شہروں اور ملکوں کا دورہ کیا (یہ سلسلہ تاحال جاری ہے اور ان شاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی جاری رہے گا) اور انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے اب اپنی قوم کے سامنے رکھ دیا تاکہ وہ بھی ان کے مشاہدات و احساسات میں شریک ہو۔

اس سفرنامے میں آپ کو سفر کے حالات بھی ملیں گے، ہم سفروں کے اخلاق و عادات بھی، قوموں اور ملکوں کے جغرافیائی نشانات اور تاریخی انقلابات بھی، ایک مفکر کے جذبات و خیالات بھی، ایک مبلغ کے مشاہدات و معاملات بھی، ایک بالغ نظر دانشور کے مشورے اور ہدایات بھی۔

کبھی محسوس ہوگا کہ آپ بھی ان مقامات کی سیر و سیاحت سے گزر رہے ہیں اور ان کے مشاہدہ و زیارت کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ کبھی خیال ہوگا کہ ہم کہاں ہیں اور برق رفتار دنیا کہاں پہنچی؟ کبھی تصور ہوگا کہ دنیا کو افکار و اخلاق کی کس بلندی پر جانا تھا اور وہ کس انحطاط و پستی میں جا گری۔ کبھی عیاں ہوگا کہ ہماری ذمہ داریاں کیا تھیں اور ہم غفلت و تغافل کے کس سمندر میں غرق ہیں۔ کبھی ماضی کی یاد ابھرے گی، کبھی حال کا درد اٹھے گا، کبھی مستقبل کا غم تڑپائے گا۔ کبھی حسرت و حرماں کا احساس ہوگا۔ کبھی امید کی کرن چمکے گی اور حوصلوں کا آفتاب گرمائے گا، ہمتوں کو مہمیز ہوگی، عزیمتوں کے چراغ روشن ہوں گے اور آفاق میں حرکت و عمل کا اجالا نظر آئے گا۔

مولانا کا کرم ہے کہ انھوں نے اپنے مشاہدات سے سب کو نفع اندوزی کا موقع فراہم کیا اور ان کا کمال ہے کہ اس سفرنامے کو مفید سے مفید تر بنا کر پیش کیا۔ رب کریم ہم سب کی طرف سے انھیں جزائے خیر سے نوازے اور دنیا کو ان کے رشحات قلم سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہونے کی توفیق جمیل بخشے۔ وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و صحبہ أجمعین۔

محمد احمد مصباحی بھیروی
رکن المجمع الاسلامی مبارک پور
استاد جامعہ اشرفیہ مبارک پور

۲۷/ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ
۱۱/جون ۱۹۹۱ء سہ شنبہ

تقدیم(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلّیاً و مسلماً

دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور کے طلبہ ۲۵ر صفر کو تقریباً پندرہ سال سے "یومِ رضا" کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اس کا طریقہ وہ نہیں جو ہمارے ملک میں عام طور سے رائج ہے کہ خرچ اور نمائش زیادہ سے زیادہ ہو۔ اور افادیت کم سے کم۔ سنا ہے کہ دسویں محرم کو بمبئی کے صرف ایک ایک محلہ بلکہ ایک ایک گلی میں کئی کئی لاکھ روپے محض سبیل اور شربت پر صرف ہو جاتے ہیں، گیارہویں شریف کا موقع آیا تو لاکھوں روپے زردے پر خرچ ہو رہے ہیں۔ کسی بزرگ کی فاتحہ یا عرس کا اہتمام ہوا تو معمولی تقریبات میں کھانے پینے پر دس بیس ہزار یا لاکھ دو لاکھ خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح جو ایصالِ ثواب ہوتا ہے وہ بزرگ کی روح کو ڈائرکٹ پہنچ جاتا ہے، ان کی خاص عنایت و توجہ ہوتی ہے اور اس سے مسلک کا بھی چرچا ہوتا ہے۔ مذکورہ طریقۂ ایصال ثواب کے جواز و استحباب میں کلام نہیں لیکن:

اگر ان حضرات سے کہا جائے یہی رقم ایصالِ ثواب کی نیت سے کسی ادارے کی تعمیر میں دے دیں، یا کسی ایسے ادارے کو دے دیں جو اسے نادار طلبہ کی تعلیم پر صرف کرے، یا تبلیغ دین کے لیے کتابوں کی تصنیف و اشاعت میں لگائے یا اس سے کوئی ایسا ادارہ قائم ہو جو باطل کی ریشہ دوانیوں کا تحریری و تقریری طور پر ہمیشہ مقابلہ کرتا رہے، یا اس سے دوسرے دینی و ملی امور انجام پذیر ہوں، تو یہ بات جلدی کسی کے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں سے رقم والوں کی کوئی زیادہ شہرت و نمائش نہیں ہوتی اور تحسین و ستائش کی مقدار بھی بہت کم ہاتھ آتی ہے، جب کہ اول الذکر کاموں سے خاصی شہرت اور واہ واہی ملتی ہے، ایک دھوم دھام اور چہل پہل مچ جاتی ہے جس سے تفریحی شوق و ذوق کو بھی تسکین ملتی ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ کوئی جائز اور نفل کام نام و نمود کے جذبات سے ہم آہنگ ہے تو اس کے لیے سرمایے پر سرمایہ بے دریغ لٹانا ایک معمولی بات ہے۔ اور دین و ملت اور جماعت و قوم کا کوئی اہم سے اہم اور فرض سے بڑا فرض ہے، مگر اس میں اخلاص و بے نفسی، ریا و نمود سے دوری، اور ایک عظیم مقصد کے لیے پامردی و ثابت قدمی کی ضرورت ہے تو ستائش و نمائش پسند

(۱) انوار مفتی اعظم، مرتبہ علامہ محمد احمد مصباحی، رضا اکیڈمی، ممبئی، ربیع الآخر ۱۴۱۳ھ/اکتوبر ۱۹۹۲ء

طبیعتیں اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتیں، جب کہ حسنِ نیت اور اخلاص واستقامت کے بغیر نفل ہو یا فرض، خدا کے نزدیک کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتا، بلکہ وہاں توریا کو شرکِ خفی قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے ایسا عمل ربِ قدوس کے غضب وعتاب کا سبب بھی ہو سکتا ہے، صاحبِ ایمان کو ثوابِ آخرت اور رضاے مولیٰ کی طلب ہونی چاہیے۔ اور سطحی جذبات وخواہشات سے بالاتر ہو کر حکمت ایمانی کی روشنی میں غور کرنا چاہیے کہ اس وقت دین وملت کے تقاضے کیا ہیں؟ ہمارے سرمایے کا عمدہ سے عمدہ اور افضل سے افضل مصرف کیا ہے؟ ربِّ قدیر اور اس کے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی خوشنودی کس عمل سے وابستہ ہے؟ دنیا کی پذیرائی اور قدر افزائی نہیں بلکہ آخرت کی سرخروئی اور سرفرازی کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ ایمان کی روشنی اور روحانی ترقی وبلندی کیسے مل سکتی ہے؟ مومن کی نظر بھی اگر دنیا ہی تک محدود رہ گئی تو اس کی نظر اور غیر مومن کی نظر میں فرق کیا رہ جائے گا؟ یہ تمام ایام جو ہمارے معاشرے میں منائے جاتے ہیں اور ان پر جو سرمایہ صرف کیا جاتا ہے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ان کو بہت مفید اور کار آمد بنایا جا سکتا ہے اگر ایصالِ ثواب کو کھانے پینے تک محدود رکھنے کی بجائے دینی وعلمی مصارف کی طرف پھیر دیا جائے تو ایصالِ ثواب بھی ہو جائے اور دین وملت کے بڑے بڑے کام جو سرمایے کے بغیر ناتمام پڑے ہیں آسانی کے ساتھ ہوتے جائیں اور ملت کے مقدر کا ستارہ بلند اور روشن سے روشن تر نظر آئے۔

دارالعلوم اشرفیہ کے طلبہ نے یوم رضا کی تقریب کو زیادہ کار آمد اور مفید بنانے کے لیے یہ طریقہ اپنایا کہ اس موقع پر تقریری وتحریری مقابلے بھی رکھ دیے جس کے لیے امام احمد رضا قدس سرہٗ کی شخصیت سے متعلق مختلف عنوانات کا اعلان ہو جاتا ہے اور ہر عنوان پر طلبہ کو کافی مطالعہ کرنا پڑتا ہے جس سے ان کے علم میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے فضل وکمال سے آشنائی بھی، محنت ومطالعہ کے بعد مقالے تیار کرتے ہیں۔ ان مقالوں پر نمبر دیے جاتے ہیں، اور انعامات بھی تقسیم ہوتے ہیں، جس سے دوسرے تمام طلبہ میں بھی علمی وتحریری شوق بیدار ہوتا ہے اور وہ بھی کچھ کرنے کے لیے سوچتے ہیں۔ یہی حال تقریروں کا بھی ہے۔

پانچ سال سے ان طلبہ نے ۱۴ر محرم کی شب میں "یوم مفتی اعظم" کا اہتمام بھی شروع کیا اور مفتی اعظم کی شخصیت کے مطالعے، اور ان کی حیات وخدمات پر مقالہ وتقریر کی تیاری کا سلسلہ بھی چل پڑا۔

ان مقالات سے طلبہ کی مشق اور ان کی استعداد میں اضافہ مقصود ہوتا ہے مگر ان میں بہت سے مضامین ایسے بھی ہوتے ہیں جو متوسط قسم کے اہل قلم کے عمدہ مضامین کی صف میں رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور ان سے دوسرے طلبہ اور عوام کو فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ان مضامین کی اشاعت طلبہ کے بس کی بات نہیں، اس لیے قیمتی ہونے کے باوجود وہ فائلوں کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں، اور منتظم طلبہ کی بے توجہی سے ضائع بھی ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہوا کہ اچھے مضامین کو کسی طرح منظر عام پر لایا جائے۔ اس کے لیے میں نے برادر گرامی مولانا یٰسین اختر مصباحی سے کہا کہ اب تک جو حجاز کے نمبر شائع کیے گئے ان میں زیادہ تر مطبوعہ مضامین تھے۔ ان طلبہ کے مضامین پر مشتمل ایک امام احمد رضا نمبر آپ نکالیں تو بھی مضامین غیر مطبوعہ ہوں گے، ان طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی، اور قارئین کے لیے نئی افادیت بھی۔ انھوں نے بخوشی اسے منظور کر لیا۔ اس سلسلے میں انھیں جامعہ نظامیہ لاہور سے بھی ایسے ہی بہت سے مضامین مولانا عبد الحکیم شرف قادری مد ظلہٗ کے ذریعہ دستیاب ہو گئے اور انھوں نے نمبر کا اعلان بھی کر دیا۔ مگر حجاز کے معمول کے شمارے بھی پابندی سے نکل نہیں پاتے۔ ایسے حالات میں ضخیم نمبر کی اشاعت کی توقع بہت کم نظر آتی ہے۔

یوم مفتی اعظم میں پیش آمدہ اچھے مضامین پر مشتمل ایک مجموعے کی اشاعت کے لیے میں نے "رضا اکیڈمی بمبئی" کے متحرک وفعال سکریٹری جناب محمد سعید نوری سے مراسلت کی، انھوں نے یہ تجویز فوراً منظور کر لی۔ مگر ان دنوں وہ جشن صد سالہ یوم ولادت مفتی اعظم کی تیاریوں میں کافی مصروف تھے۔ اس لیے عملی پیش قدمی میں دیر ہوئی، مگر جشن صد سالہ سے پندرہ دن پہلے انھوں نے مدیر "ماہنامہ اشرفیہ" مولانا مبارک حسین مصباحی کے ذریعہ چار ہزار روپے بھیج دیے کہ مضامین کی کتابت شروع کرادی جائے۔

اس کے بعد جشن صد سالہ کے موقع پر بمبئی میں خود حاضر ہوا، اس جشن کا ایک جز مفتی اعظم کی شخصیت پر سیمینار بھی تھا جو ۱۲ر رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۸ر جنوری ۱۹۹۲ء کو ظہر سے عصر تک منعقد ہوا۔ اس کے لیے مولانا قمر الحسن مصباحی استاذ دارالعلوم محبوب سبحانی کرلا بمبئی نے اہل قلم سے مراسلت بہت پہلے شروع کر رکھی تھی۔ اور تجویز یہ تھی کہ مضامین دو ماہ پہلے دفتر رضا اکیڈمی پہنچ جائیں تاکہ جشن سے پہلے ان کی کتابت وطباعت کا کام مکمل ہو جائے۔ اس کے مطابق زیادہ تر مضامین پہلے پہنچ گئے اور کتابت کے بعد وہ طباعت کے لیے پریس کے حوالے بھی ہو گئے۔ چند مضامین ٹھیک سیمینار کے وقت موصول ہوئے اس لیے وہ تشنۂ اشاعت رہ گئے مگر مولانا یٰسین اختر مصباحی نے وہ سب حجاز میں اشاعت کے لیے سیمینار ہال ہی سے اپنے قبضے میں کر لیے اور دفتر تک ان کے پہنچنے کی نوبت بھی نہ آئی۔ بعض مضامین حجاز میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ، مولانا عبد الحق رضوی استاذ جامعہ اشرفیہ، اور راقم الحروف کے مضامین بھی تھے۔ ان کے لیے جناب محمد سعید نوری کی خواہش ہوئی کہ طلبہ اشرفیہ کے مضامین پر مشتمل جو مجموعہ شائع کرنا ہے اسی میں یہ بھی شامل ہو جائیں تو اچھا ہوگا۔

بمبئی سے واپسی کے بعد میں دارالعلوم اشرفیہ کے امتحان سالانہ کی تیاریوں میں منہمک ہو گیا۔ اور کوئی

مضمون دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مقالات یوم مفتی اعظم کی فائل دیکھی اور جو مضامین زیادہ مفید اور اچھے نظر آئے انھیں منتخب کر لیا۔ پھر تعطیل میں اپنے گھر بھیرہ، ولید پور پہنچ کر سب پر نظر ثانی کی، اس کے بعد جد الممتار جلد ثانی کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران کسی کاتب سے رابطہ نہ ہو سکا۔ ۹؍شوال ۱۲ھ کو مولانا ظفر الاسلام ادروی سے ملاقات ہو گئی۔ فوراً میں نے کتابت کے لیے سارے مضامین ان کے حوالے کر دیے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے کتابت شروع کر دی اور مکمل کر کے پروف ریڈنگ کے لیے میرے پاس بھیج دیا۔

جشن صد سالہ میں ڈاکٹر شیخ جمال مناع کی ایک مختصر پُر مغز اور جامع تقریر عربی میں ہوئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے ترجمے کے ساتھ الگ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ اس کے لیے رضا اکیڈمی سے حاصل کردہ کیسٹ میں نے مولانا عارف اللہ مصباحی استاذ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ کے حوالے کیا کہ آپ اس تقریر کو قلم بند کر کے اس کا اردو ترجمہ کر دیں تو اسے شائع کر دیا جائے، انھوں نے بہت جلد یہ کام کر دیا۔ مگر میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہ نظر ثانی کر سکا نہ الگ اشاعت عمل میں آئی۔ یہ مجموعہ کتابت کے آخری مرحلہ میں تھا تو خیال ہوا کہ فی الحال وہ تقریر و ترجمہ بھی شریکِ اشاعت کر دیا جائے الگ اشاعت آئندہ کبھی ہو جائے گی۔

اس طرح اس مجموعے میں آٹھ مضامین طلبۂ اشرفیہ کے ہیں جو ۱۴۱۲ھ کے یوم مفتی اعظم کے موقع پر لکھے گئے ایک بہت ہی اہم، وقیع اور قدرے مبسوط مضمون مخدوم گرامی حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی مد ظلہ کا ہے۔ دو مضمون راقم الحروف کے ہیں۔ ایک مضمون مولانا عبد الحق رضوی استاذ جامعہ اشرفیہ کا ہے۔ یہ چاروں مضامین جشن صد سالہ کے موقع پر ہونے والے سمینار میں پیش ہوئے۔ آخر میں شیخ جمال مناع کی عربی تقریر اور پھر مولانا عارف اللہ کے قلم سے اس کا ترجمہ ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔

مفتی اعظم قدس سرہ کا جامعہ اشرفیہ اور حافظ ملت شاہ عبد العزیز مراد آبادی قدس سرہ سابق شیخ الحدیث و سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ سے کیا تعلق تھا؟ اور اشرفیہ پر حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کی نگاہ کرم کس طرح متوجہ تھی؟ اسے بتانے کے لیے جشن سے ایک سال قبل عزیز گرامی مولانا مبارک حسین رام پوری نے ایک مضمون لکھا تھا جو اشرفیہ کے ایک شمارے میں اداریے کی جگہ شائع ہوا۔ اس مضمون کو اس مجموعے کے شروع میں خاص مناسبت کی وجہ سے شامل کر دیا ہے۔

اب یہ تین سو صفحات پر پھیلا ہوا تیرہ چودہ مضامین پر مشتمل ایک دلکش، وقیع، نظر افروز، اور دل نواز گلدستہ ہے، جو ہمارے نوجوان بھائی جناب محمد سعید نوری کی سعی مشکور سے منظر عام پر آ رہا ہے۔

میں مضامین کی تعریف کروں یا ان کا تعارف کراؤں اس سے بہتر یہ ہوگا کہ قارئین پڑھ کر خود ہی فیصلہ کریں کہ یہ کیسی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ تاہم اتنا اشارہ کر دیتا ہوں کہ مضامین طلبہ میں "مفتی اعظم اور رد بدعات و منکرات" اپنے طرز کا پہلا مضمون ہے جس کے اقتباس و شواہد خود تصانیفِ مفتی اعظم سے لیے گئے ہیں، اور عنوان کا حق ادا کرنے کی جان دار کوشش کی گئی ہے۔ اس عنوان کے تحت مفتی اعظم کی شخصیت پر اب تک میرے علم میں کوئی بھی مضمون منظر عام پر نہ آیا۔ اسی طرح کلامِ نوری میں کلامِ رضا کا انعکاس، اس عنوان پر دو مضمون ہیں دونوں ہی میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ لکھنے والوں نے براہ راست حدائق بخشش اور سامان بخشش کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے عنوان کو مختلف جہتوں سے ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، خاص اس عنوان پر بھی کوئی مضمون اب تک شائع نہیں ہوا۔ اور شاید کسی نے لکھا بھی نہ ہو، اسی طرح دیگر مضامین بھی وقیع اور مفید ہیں۔

جشن صد سالہ کے مضامین میں حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ کا مضمون ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت ممدوح کو حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کی صحبت میں ایک طویل عرصہ گزارنے کا شرف حاصل ہے۔ اور خود ان کی جو علمی جلالت ہے وہ ان کی تصانیف اور فتاوی سے عیاں ہے۔ نزہۃ القاری شرح بخاری، اشرف السیر، سنی، دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ، اسلام اور چاند کا سفر، مقالاتِ امجدی، اثباتِ ایصالِ ثواب، تحقیقات، اشک رواں، وغیرہ تصانیف کا مطالعہ کرنے والا شاید ہی کوئی ایسا حق پوش اور حاسد و متعصب شخص ہو جو حضرت ممدوح کی علمی عظمت اور تحقیقی کمال کے اعتراف میں بخل و عناد سے کام لے، ایسی قد آور، بلند و بالا ہستی کے رشحاتِ قلم کو اگر میں نے دستاویز کہا تو اس میں کوئی مبالغہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہاں اسے اس کی واقعی حیثیت کے اظہار میں کچھ کوتاہی کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ اس دستاویز کو آپ خود پڑھیں، اس کے ایک ایک لفظ پر غور کریں اور مفتی اعظم کی جلالت و عظمت کا اندازہ کریں، بغور پڑھنے کی بات اس لیے ہے کہ یہ کسی لفّاظ مقرر کی رنگین داستان نہیں بلکہ ایک عظیم فقیہ اور صاحب افتا کے ارشادات ہیں جن کے الفاظ معانی سے لبریز ہیں۔ ان پر غور کرنے ہی سے ان کی صحیح چاشنی اور پوری حلاوت حاصل ہو سکتی ہے۔

مولانا عبد الحق صاحب نے بھی ایک اہم موضوع لیا "رسالہ الموت الاحمر" کا جائزہ۔ جب تحذیر الناس، براہین قاطعہ اور حفظ الایمان کی عبارتوں پر گرفت کی گئی اور علماے دیوبند کی باتوں سے بھی ان عبارتوں کا اور قائلین کا کفر واضح و متعین ہو گیا تو ان کی تکفیر کی گئی۔ اس کے بعد حلقۂ دیوبند کی سر جوڑ کوشش یہ ہوئی کہ ان عبارتوں کی کوئی تاویل تو نہیں ہو سکتی، مگر عوام کی تلبیس ضرور ہو سکتی ہے، اور اس راہ سے ہمارے کفر پر پردہ پڑ سکتا ہے۔ دراصل انھیں نجاتِ آخرت کی نہ کوئی امید تھی نہ کوئی فکر، ورنہ آسان کام یہ تھا کہ ان عبارتوں سے توبہ

کر کے ایمان لاتے اور دارین کی سرخروئی حاصل کر لیتے۔ انھیں فکر تھی تو صرف یہ کہ دنیا کے اندر نگاہِ عوام میں جیسے بھی ہو اپنا بھرم باقی رکھا جائے اور اپنی شہرت علمی برقرار رکھی جائے اس کے لیے انھوں نے تاویل کے روپ میں تلبیس کا سہارا لیا۔ ان تلبیسات کی پردہ دری کے لیے "الموت الاحمر" لکھی گئی، جس کا کوئی جواب آج تک حلقۂ دیوبند سے نہ ہو سکا، البتہ نئے نئے مغالطوں اور عوام کو نئے نئے ہتھکنڈوں کے ذریعہ شکار کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ والعیاذ باللہ۔

یہ تو بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی مسلم آبادی میں شیعہ اور سنی دو ہی فرقے تھے، اور ہر سنی انبیا و اولیا کا معتقد، ان کے لیے خدا کی عطا سے علم غیب اور تصرفات و اختیارات کا قائل تھا، ان سے استعانت و توسل عہد رسالت ہی سے تمام مسلمانوں کا معمول تھا۔ بارگاہِ رسالت اور انبیا و اولیا کی شان میں ناروا جسارت کا کوئی تصور نہ تھا، ان کی اہانت و گستاخی سے ہر مسلمان دور و نفور تھا مگر جب سے "تقویۃ الایمان" نامی کتاب وجود میں آئی اس نے اس ناروا جسارت کا دروازہ کھول دیا۔ اور توحید کے نام پر توہین کا سلسلہ چل پڑا، جب یہ مہم دہلی سے دیوبند پہنچی تو اس میں مزید ترقی ہوئی اور ایسی گستاخیاں کی گئیں جن کو کوئی مسلمان برداشت نہ کر سکتا تھا مگر آج وہی تقویۃ الایمان ہندوستان کے غیر مقلد اور دیوبندی حلقوں کا عین دین و ایمان ہے۔ اور اسی کو نت نئے حربوں سے نئی نسل میں منتقل کرنے کی تیز مہم جاری ہے اور عام مسلمانوں کی سادہ لوحی یہ ہے کہ اس نئے فرقے کو پہچاننے میں دیر سے کام لیتے ہیں۔ نتیجۃً ان کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا سب کچھ لٹ جاتا ہے مگر بزعم خویش مست رہتے ہیں کہ اب ہمیں راہ مل گئی ہے۔ یہ محاذ آج بھی اہل سنت کے لیے اسی طرح محنت و توجہ کا محتاج ہے جس طرح مفتی اعظم اور امام احمد رضا قدست اسرارہما کے زمانے میں تھا، بلکہ آج صورتِ حال زیادہ سنگین ہو چکی ہے۔ ان ہی حالات کے پیش نظر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی نے پندرہ سال پہلے تحقیقات لکھی تھی اور اب تین سال پہلے "سنی دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ" تحریر کیا ہے۔ ان کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اور وسیع پیمانے پر مفت تقسیم کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوں اور بد مذہبوں کے دام تزویر میں پھنسنے والے سادہ لوح افراد راہِ راست پر آسکیں اور جو لوگ محفوظ ہیں وہ آئندہ بھی محفوظ رہ سکیں۔ افسوس! کہ ایصال ثواب کے لیے کھانے پینے پر لاکھوں لاکھ سرمایہ صرف کرنا تو ہم نے سیکھا، مگر دس بیس ہزار کتابوں کی تقسیم کے ذریعہ ایصالِ ثواب پر کبھی غور نہ کیا جب کہ اس کی افادیت اور ضرورت اُس سے زیادہ اور بہت زیادہ ہے۔ ربِّ کریم توفیقِ عمل سے نوازے۔

شیخ جمال مناع نے اپنی تقریر میں متعدد اہم نکات بیان کیے ہیں۔ اور حیرت انگیز انکشاف یہ کیا ہے کہ

میں تقریباً پانچ سال ہندوستان میں رہا لیکن امام احمد رضا سے مجھے کوئی واقفیت بہم نہ ہو سکی۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ غلط فہمیاں دور کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ امام احمد رضا کے رشحاتِ قلم کو عام کیا جائے اور عالمی زبانوں خصوصاً عربی زبان میں انھیں پیش کیا جائے۔ اس طرح سے وہ دبیز پردہ جو ان کی قد آور علمی شخصیت اور ان کی عظیم خدمات پر ڈال دیا گیا ہے، دور ہو سکتا ہے اور عالم عرب ان سے آشنا ہو کر آج بھی ان کی وہی پذیرائی کر سکتا ہے جو کل ان کے دورِ حیات میں حجاز مقدس کے اکابر علما و مشائخ کے ذریعہ عمل میں آئی۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کا کام چلتے پھرتے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ایک ایسا ادارہ چاہیے جو لائق علما اور باصلاحیت دانشوروں کی ایک ٹیم جمع کرے اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کر کے منظم اور باضابطہ طور پر ان سے مسلسل کام کرائے۔

المجمع الاسلامی کا قیام سولہ سال پہلے اسی مقصد کے تحت عمل میں آیا۔ مگر جو وسائل درکار ہیں وہ آج تک میسر نہیں، سرمایہ دار طبقہ ان ضروریات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں، اور ذی علم طبقہ جو ان حالات و ضروریات سے آشنا ہے، اس کے پاس سرمایہ نہیں، دونوں میں اگر ربط و ہم آہنگی اور احساس ضرورت پر اتفاق ہو جائے اور باہم مل کر کام کریں تو یقیناً یہ خلا بہت جلد پُر ہو سکتا ہے۔ ربِّ کریم ہم سب کو دین متین کی راہ میں حرکت و عمل سے نوازے۔

المجمع الاسلامی نے تصنیفی و اشاعتی میدان میں اب تک جو کام کیا ہے وہ اگرچہ اس کے منصوبوں کے دیباچے کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس سے ادارے کی سلامت روی اور قوت و صلاحیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہ کے تعارف سے متعلق اس نے اب تک درج ذیل کتابیں شائع کی ہیں:

کتاب	مصنف و صفحات
(۱) امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر میں	از: مولانا یٰسین اختر مصباحی۔ صفحات: ۱۷۶
(۲) امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات	از: مولانا یٰسین اختر مصباحی۔ صفحات: ۵۸۴
(۳) فاضلِ بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں	از: پروفیسر محمد مسعود احمد۔ صفحات: ۲۲۴
(۴) امام اہل سنت	از: پروفیسر محمد مسعود احمد۔ صفحات: ۶۸
(۵) گناہِ بے گناہی	از: پروفیسر محمد مسعود احمد۔ صفحات: ۸۴
(۶) کلامِ رضا	از: اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی۔ صفحات: ۹۶
(۷) عرفانِ رضا	از: ڈاکٹر الٰہی بخش اعوان۔ صفحات: ۷۶
(۸) اجالا	از: پروفیسر محمد مسعود احمد۔ صفحات: ۴۸

(۹) تعارف امام احمد رضا — از: صوفی محمد اکرم۔ صفحات: ۳۲

(۱۰) امام احمد رضا اور تصوف — از: محمد احمد مصباحی۔ صفحات: ۱۲۸

(۱۱) فیصلہ مقدسہ (بابت حدائق بخشش سوم) — از: مولانا عبد الحکیم شرف قادری۔ صفحات: ۱۲

امام احمد رضا قدس سرہ کے رسائل بھی توضیح و تسہیل کے ساتھ نئے انداز میں شائع کیے۔ چند یہ ہیں:

(۱) حقوق اولاد (۲) حقوق والدین (۳) دعوت میت (۴) مزارات پر عورتوں کی حاضری (۵) احادیثِ شفاعت (۶) براءت علی از شرک جاہلی (۷) فلسفہ اور اسلام (۸) تقدیر و تدبیر (۹) رسومِ شادی (۱۰) اہمیتِ زکوٰۃ (۱۱) فوائد صدقات (۱۲) اذانِ قبر (۱۳) وصایا شریف (۱۴) ندائے یا رسول اللہ (۱۵) ارشادات اعلیٰ حضرت۔

عربی زبان میں بھی کچھ کام کیا مثلاً:

(۱) "الفضل الموهبی فی معنی إذا صح الحدیث فهو مذهبی" کا مولانا افتخار احمد قادری نے عربی ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ ایک مختصر تعارف بھی رقم کیا۔ یہ رسالہ مرکزی مجلس رضا لاہور سے متعدد بار شائع ہوا۔ اور ترکی کے مکتبہ ایشیق سے بھی اس کی اشاعت عمل میں آئی۔

(۲) قصیدتان رائعتان اس کے ساتھ ایک مختصر تعارف شامل کر کے اسے شائع کیا گیا۔

(۳) جدّ الممتار جلد اول: یہ علامہ شامی کی مشہور کتاب "ردّ المحتار" کا عظیم حاشیہ ہے جس کے ساتھ امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت اور حاشیہ کی اہمیت پر مشتمل، دو مقدمے بھی شامل ہیں۔ پہلی بار ۱۹۸۲ء میں یہ المجمع الاسلامی سے شائع ہوا۔ پھر ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے اس کا عکس شائع کر کے اسے مفت تقسیم کیا۔ تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴) حال ہی میں ہمارے رفیق مولانا عارف اللہ مصباحی نے پروفیسر مسعود احمد صاحب کے لکھے ہوئے ایک نئے تعارف امام احمد رضا کا عربی ترجمہ کیا، جو کراچی سے شائع ہو کر مفت تقسیم ہوا۔

(۵) اس وقت جدّ الممتار جلد ثانی کا کام جاری ہے۔ اس کا اردو تعارف بھی لکھا جا چکا ہے، جن میں ان مساعی کی کچھ تفصیل بھی ہے جو اس کتاب کے سلسلے میں زیر عمل آئیں، ۱۶۰ر صفحات پر کتابت ہو چکی ہے۔

دوسری اہم علمی و دعوتی کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) تدوینِ قرآن، ص: ۲۰۴ (۲) فضائلِ قرآن، ص: ۲۷۶ (۳) اسلام اور امنِ عالم، ص: ۳۰۴ (۴) اسلام اور تربیتِ اولاد، ص: ۴۸ (۵) المبین (عربی زبان کے محاسن و کمالات) ص: ۳۲۴ (۶) نویں صدی ہجری کے مصری مؤرخین (۷) مستشرقین کا انصاف و تعصب (۸) امتیاز حق (علامہ فضل حق خیر آبادی اور اسمٰعیل

دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ) ص: ۲۰۸ (۹) نور و نار (تقویۃ الایمان کا جائزہ) (۱۰) تحقیق الفتویٰ (رد تقویۃ الایمان) (۱۱) حقائق تحریکِ بالاکوٹ (۱۲) نور الایمان بزیارۃ آثار حبیب الرحمٰن، ص: ۱۷۶ (۱۳) صحابہ کا عشقِ رسول، ص: ۱۷۶ (۱۴) جشن میلاد النبی (۱۵) تذکرۂ میلاد رسول (۱۶) باغی ہندوستان (علامہ فضل حق خیر آبادی کی کتاب الثورۃ الہندیہ، اور سوانح علامہ) ص: ۴۴۸ (۱۷) اسلامی اخلاق و آداب، ص: ۳۵۲ (۱۸) فیض الحکمۃ ترجمہ ہدایۃ الحکمۃ (مع مقدمہ فلسفہ کی تاریخ اور اس کی شرعی حیثیت) ص: ۶۰۔

اس طرح کی اور بھی کتابیں ہیں، تفصیل المجمع الاسلامی کی نشریات اور فہرست کتب سے معلوم ہو سکتی ہے۔ یہاں کافی اختصار سے کام لینا پڑا ہے جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، "رضا اکیڈمی" بمبئی کی خصوصیت ہے کہ اس نے زیادہ تر کتابیں مفت شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بھی طویل ہے۔ چند یہ ہیں:

(۱) الامن والعلیٰ (۲) تمہید ایمان (۳) سرور القلوب بذکر المحبوب (۴) کنز الایمان (۵) نزولِ آیاتِ فرقان بسکون زمین و آسمان (۶) شریعت و طریقت (۷) اسلامی پردہ (۸) حقوق العباد (۹) گداگری (۱۰) احادیثِ شفاعت۔

(۱۱) حال ہی میں تجلیاتِ مفتی اعظم شائع کی ہے جو جشنِ صد سالہ کے نصف یا زائد مقالات کا مجموعہ ہے۔ (۱۲) اس سے قبل بخاری شریف کی دو جلدیں مکمل شائع کر کے تقسیم کی ہیں۔ (۱۳) اور اب مسلم شریف کی دو جلدیں طبع ہو کر تقسیم ہو رہی ہیں۔

اس طرح کے دوسرے کام بھی اکیڈمی سے ہو رہے ہیں۔ سب کی تفصیل ایک رسالے کی طالب ہے اور سب مجھے مستحضر بھی نہیں، اس لیے فی الحال معاف رکھیں۔

ان تذکروں کا مقصد دوسرے حضرات کی رہنمائی و آگاہی کے ساتھ اس بات کی دعوت و تحریک ہے کہ ان اداروں کو فروغ دے کر ان کی خدمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا جائے اور عصر حاضر کے دینی و ملی تقاضوں کی تکمیل کی جائے۔ اہل سنت کے تمام اداروں، تنظیموں، انجمنوں، دانشوروں، سرمایہ داروں اور سبھی افراد کو آج کے مذہبی، قومی، سیاسی تمام حالات و مطالبات پر بڑی سنجیدگی و ہمدردی سے غور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ عمل کا درجہ احساسِ عمل اور آگاہی حالات کے بعد ہی آتا ہے۔ ربِ جلیل ذہنوں کے دروازے کھول دے، قلوب میں دردمندی اور شعور و احساس پیدا کرے، اور افراد کو جادۂ عمل پر گامزن فرمائے۔ وماذلك علیه بعزیز

محمد احمد مصباحی

فیض العلوم محمد آباد، رکن المجمع الاسلامی، استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

۲۱ر ربیع النور ۱۴۱۳ھ، ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۲ء بروز یکشنبہ

تقدیم وتعارف(١)

[ترجمہ: "روض الریاحین" موسوم بہ "بزم اولیا" از: مولانا بدر القادری]

اللهم لك الحمد حمدا يوافي نعمك، و يكافي مزيد كرمك، والصلاة والسلام على حبيبك الأنور وعلى آله وصحبه السرج الغرر.

المجمع الاسلامی کے لیے یہ امر باعث فخر و سعادت ہے کہ مولانا بدر القادری رکن المجمع الاسلامی کے قلم سے علامہ جلیل عفیف الدین عبد اللہ بن اسعد یافعی (٦٧٨ھ-٧٦٨ھ) کی معتبر و مستند اور مشہور آفاق کتاب "روض الریاحین فی حکایۃ الصالحین" کا دل کش ترجمہ اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

یقیناً صالحین کے واقعات و حالات میں اہل نظر کے لیے بڑی ہی عبرت و بصیرت کا سامان ہوتا ہے، ان سے دلوں کو روشنی، روحوں کو تازگی اور فکر و نظر کو بالیدگی ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں اور اسرار و حکم اور شرائع و قوانین کی عقدہ کشائی کی ہے، وہیں انبیائے سابقین اور اقوام ماضیہ کے حالات و واقعات بھی بڑی اثر انگیزی اور فیاضی سے بیان کیے ہیں اور ہمارے لیے انھیں سامان عبرت و بصیرت قرار دیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

(١) لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ. (سورۂ یوسف:١١١)

بے شک ان کے واقعات میں اہل عقل کے لیے عبرت ہے۔

آیات ربانیہ کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

(٢) ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ. (سورۂ اعراف:١٧٦)

وہ ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو واقعات سنا دو، تاکہ یہ غور کریں۔

فرعون کی سرکشی اور دعوائے الوہیت بتانے کے بعد فرمان ہے:

(٣) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى. اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى. (النازعات:٢٥-٢٦)

تو خدا نے اسے دنیا و آخرت کی عبرت ناک سزا میں گرفتار کیا، یقیناً اس سے خوف والوں کی آنکھیں کھلتی ہیں۔

(٤) انبیائے کرام کے واقعات کو ثبات قلب کا ذریعہ بتایا گیا اور ان کی خبروں پر مشتمل آیات قرآنیہ کو نصیحت اور

(١) بزم اولیا، مولانا بدر القادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور، ١٤١٣ھ

موعظت بتایا گیا:

كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (الھود:١٢٠)

اور سب کچھ ہم تمھیں رسولوں کی خبریں سناتے ہیں جس سے تمھارے دل کو ثبات بخشیں اور اس صورت میں تمھارے پاس حق آیا اور اہل ایمان کے لیے پند و نصیحت۔

(٥) رب کریم نے اپنے خاص بندوں پر انعامات فرمائے ہیں، انھیں ابتلا اور آزمائش سے بھی گزارا ہے اور پھر اس کے ثمرات و فوائد بھی دنیا و آخرت میں رکھے ہیں، اسی طرح سرکش اور نافرمان قوموں کو تباہی و بربادی سے بھی دوچار کیا ہے اور ان کی حالت زار کو بھی سامان عبرت و نصیحت قرار دیا ہے، ایسی قوموں کی ہلاکت کے تذکرے کے بعد فرمان ہے:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۔ (ق:٣٦-٣٧)

یقیناً اس میں اس کے لیے نصیحت ہے جو دل رکھتا ہو یا متوجہ ہو کر کان لگائے۔

(٦) درج ذیل آیات کریمہ ملاحظہ ہوں، جن میں دعوت عبرت کے ساتھ اس مسلک اولیا کی پوری ہدایت بھی موجود ہے، جس کے دل کش مناظر اس کتاب کے ورق ورق پر جلوہ گر نظر آئیں گے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ. (آل عمران:١٣-١٧)

ان دو گروہوں میں جو برسرپیکار ہوئے تمھارے لیے نشانی تھی، ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے اور دوسرا کافر کہ انھیں بچشم سر اپنے سے دونا دیکھ رہا ہے، اور اللہ اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے قوت دیتا ہے، یقیناً اس میں اہل بصیرت کے لیے عبرت ہے، لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت آراستہ کی گئی، عورتیں اور بیٹے اور نیچے اوپر لگے ہوئے سونے چاندی کے ڈھیر، اور نشان زدہ گھوڑے اور چوپایے اور کھیتی، یہ دنیاوی زندگی کا سرمایہ ہے اور اللہ ہے جس کے پاس عمدہ ٹھکانا ہے، تم فرماؤ، کیا میں تمھیں اس سے بہتر چیز بتا دوں؟ پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس جنتیں

ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، ہمیشہ ان میں رہیں گے اور پاک بیویاں، اور اللہ کی خوش نودی۔ اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہ معاف کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے، صبر والے اور سچے اور ادب والے اور راہ خدا میں خرچ کرنے والے اور پچھلے پہر میں معافی مانگنے والے۔

آیات بالا سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں ذکر شدہ گزشتہ امتوں کے واقعات ہمارے لیے درس عبرت اور باعث نصیحت ہیں اور یہ قرآن کا عظیم مقصد ہے ان واقعات کو ذکر فرمانے کا — بلا شبہہ امتِ محمدیہ (علی صاحبہا افضل الصلاۃ و التحیۃ) وہ بہترین امت ہے جو لوگوں کی ہدایت و رہ نمائی کے لیے ظاہر ہوئی، ممکن نہیں کہ اس کا دامن عبرت و موعظت کے ان آبدار موتیوں سے خالی ہو، اس میں جہاں ظاہری علوم و فنون کے تاج دار، صنعت و حرفت کے ماہرین اور سیاست و جہاں بانی کے شناور پیدا ہوئے وہیں علم باطن کے رمز شناس، قلب و روح کے معالج، حکمت و معرفت کے امام، ربانی اسرار و حقائق کے امین اور خلق کا رشتہ خالق سے مربوط و مضبوط کرنے والے عارفین و واصلین بھی پیدا ہوئے۔

ان کی حیات کا لمحہ لمحہ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے، ان کی حکم رانی بحر و بر پر نظر آتی ہے، وہ بے سرو سامان ہوتے ہوئے بھی منٹوں میں کسی کو تاج شاہی سے سرفراز کرتے ہیں، کسی کو تختۂ دار پر پہنچاتے ہیں، اقلیم دل کی فرماں روائی ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، بڑے بڑے جبار و مغرور بھی ان کے آستانے پر لرزتے کانپتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں اور ناچار یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اصل حکومت آپ کی ہے۔

ان کی زندگی کا عجیب پہلو یہ ہے کہ آخرت کی رعنائیاں، جنت کی بہاریں، عقبیٰ کی مسرتیں اور حسن حقیقی کے دیدار کی لذتیں ان کے قلب و نگاہ میں نہ صرف تصور و تخیل بلکہ مشاہدہ اور چشم دید مناظر و واقعات کے ناقابل شکست یقین محکم کی حد تک بسی ہوئی ہیں، ظاہری نگاہوں کو ظلمت شب کا پردہ چاک ہونے کے بعد خورشید عالم تاب کے ضیابار ہونے کا جو یقین ہو سکتا ہے اسی قدر یا اس سے زیادہ ان محرمان راز اور عارفان ذات کو اس دل فریب دنیا کے زوال اور اس عالم جاوداں کے قرار و ثبات کا یقین ہوتا ہے اور اُس جہانِ باقی کی آباد کاری کے لیے وہ اسی طرح منہمک نظر آتے ہیں، جیسے ظاہر شناس انسان اس دنیاے فانی کی آباد کاری کے لیے ہر لمحہ بے قرار نظر آتا ہے اور اس یقین سے ہر آن بے تاب نظر آتا ہے کہ اگر میں نے ذرا بھی غفلت کی تو اپنے ہم سروں سے بہت پیچھے ہو جاؤں گا، تھوڑی سی چوک ہوئی تو میرا متوقع نفع خسارے میں تبدیل ہو جائے گا، ذرا لاپروائی ہوئی تو آسائشِ حیات مکدر ہو جائے گی، فکر و نظر نے خطا کی تو حکومت و قیادت کی باگ ڈور ہاتھ سے چھن جائے گی، سعی پیہم اور جہد شب و روز میں معمولی کوتاہی نے راہ پائی تو ہمیشہ کی پستی اور اپنے ہم چشموں کے سامنے ذلت و خواری کا مزہ چکھنا پڑے گا، علم و فن کے اشہب برق رفتار کی لگام ذرا ڈھیلی ہوئی تو برق توانائیوں کی چکا چوند مدھم پڑ جائے گی اور بزم زمین کی آرائشوں میں بڑا فتور آ جائے گا۔

یہ دنیاے ظاہر کے وہ یقینیات ہیں جن کے بل پر اس کی ساری چہل پہل کا وجود ہے اور ان ہی سے اس کی ساری بہاریں قائم ہیں — ان یقینیات سے سارے عقلاے روزگار کا وجود سرشار ہے اور وہ ان سے انحراف کو جنون و بے عقلی، کوتاہ بینی و ناعاقبت اندیشی کے سوا دوسرا کوئی نام دینے کو تیار ہی نہ ہوں گے۔

یہ وہ طرز فکر ہے جس سے آخرت کو ماننے والے اکثر افراد عالم بھی بچ نہیں سکتے، فرق یہ ہے کہ ان میں جن کو نور آخرت اور دانش یزدانی کا حصہ حاصل ہے، وہ اپنی دنیاوی تگ و دَو میں فکر آخرت کو بھی ساتھ رکھتے ہیں اور ان میں جنھیں کچھ اور زیادہ حصہ ملا ہے وہ ان ساری کوششوں کو اس دین کی سربلندی کے ارادے سے وقف کرتے ہیں جسے پوری زمین میں عام کرنے اور اس کا کلمہ بلند رکھنے کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے — مسبب الاسباب کو کارساز جانتے اور اس کی رضا کو اصل مقصود بناتے ہوئے اسباب کا سہارا لینا اور وسائل و ذرائع کو عمل میں لانا یہی وہ درمیانی راہ ہے جس پر اکثر اہل دین کاربند ہوئے — اور عام حالات میں اکثر انبیاے کرام نے بھی محض عامۂ امت کی آسانی اور اس کے لیے اتباع و اقتدا کی سہولت کی خاطر اسی راہ کو اپنایا — اگرچہ وہ سبھی حضرات کلیۃً ترکِ دنیا اور تجرد کی راہ اپنانے پر بلاشبہہ قادر تھے اور سیدنا عیسیٰ علی نبینا و علیہ السلام نے اسے عملاً اپنا کر بھی دکھایا۔

مگر انبیاے کرام اور سید الانبیا علیہ و علیہم السلام سے ہر لمحہ اکتساب قوت و فیض کرنے والے متبعین میں ہی ایسے بلند حوصلہ اور عالی نظر افراد بھی پیدا ہوئے جنھوں نے صرف مسبب الاسباب سے کام رکھا اور صرف اس کی ذات کو اپنا مقصود بنایا، ان کے سامنے صرف آخرت ہی آخرت ہے، انھیں یقین ہے کہ دنیاوی علائق و روابط اور لذت و آسائش میں منہمک ہوئے تو ہماری ابدی زندگی ویران ہو جائے گی، وہ زندگی جس کا ایک دن یہاں کے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، سو سالہ زندگی کی رعنائیوں، لذتوں اور آسائشوں میں پھنس کر اس حیات دائمی کو بے رونق و بے کیف بنانا یقیناً بے عقلی اور جنون ہے، فکر آخرت نے انھیں ایسا بے تاب و سیماب صفت بنا رکھا ہے کہ انھیں نہ یہاں کے فانی ایوان و قصور بھاتے ہیں، نہ سیم و زر کی کھنک انھیں فریفتہ کرتی ہے اور نہ عیش و تنعم کے یہ ہزارہا ہزار میل میں پھیلے ہوئے مظاہر انھیں اپنی جانب مائل کرتے ہیں۔ دراصل وہ ان ایوانوں سے زیادہ پر شکوہ اور پر کیف ایوان و قصور دیکھ چکے ہیں، جن پر کبھی گردش ایام اثر انداز نہیں ہو سکتی، جن کے مکینوں میں کسی سراے کے مکینوں کی طرح آئے دن تبدیلی نہیں ہوتی، جن کی آسائشوں میں کسی رنج و غم اور خوف و خطر کی آمیزش نہیں ہوتی، بلکہ ان میں عارفان حق اور عاشقان ذات کی ہمتیں تو شوق بہشت اور خوف نار سے بھی بالاتر ہیں، ان کے لیے جمال حقیقی اور حسن ازلی کے دیدار کے سوا کوئی لامحدود اور لافانی کیف و سرور بھی سکون بخش نہیں، وہ اسے چھوڑ کر جنت لینے کو بھی تیار نہیں، اس فانی دنیاے دوں میں الجھنا کیا جانیں۔

بلاشبہہ ان کے واقعات و حالات میں ہمارے لیے درس عبرت ہے، ان کے اسرار و افکار میں ہمارے لیے

سامان بصیرت ہے، ان کے حقائق و معارف میں ہمارے لیے گنجینۂ حکمت ہے، اگر ہم ان کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتے تو اپنی نیتوں اور اپنے معاملات کی دنیا تو سنوار سکتے ہیں، مولائے حقیقی کی ناراضی مول لے کر اپنے نفس کی خوش نودی کے سودوں سے تو باز رہ سکتے ہیں، آخرت کا خسارہ سہ کر دنیا کا نفع کمانا تو چھوڑ سکتے ہیں، حلال و حرام کی تمیز، آخرت کے سود و زیاں اور رب قدیر کے غضب و رضا سے بے نیاز ہو کر محض دنیائے دنی کی خوش نما لذت و آسائش، سرمایۂ فانی کے نفع و ضرر اور خواہش نفس کی رضامندی و ناراضی میں سرگردانی کا وطیرہ تو ترک کر سکتے ہیں اور کم از کم اس درمیانی راہ پر تو چل سکتے ہیں جس میں فکر دنیا کے ساتھ آخرت سے بے فکری نہ ہو، آبادی دنیا کی دھن میں عقبیٰ کی ویرانی نہ ہو، لذت نفس کی فراہمی میں احکام مولا سے روگردانی نہ ہو۔ مومن اگر صرف آخرت کا نہیں بنتا تو صرف دنیا کا بھی بن کر نہیں رہ سکتا۔ ہاں! کافر کے لیے یہ راہ بہت کشادہ ہے، اس کی جنت یہی ہے، اس کا سب کچھ یہیں ہے، مومن اگر ان عُرفا کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتا تو ان سُفہا کے قدم بہ قدم چلنے کی بھی فکر نہ کرے اور کم از کم وہ راہ اپنائے جو دونوں کے درمیان ہو، یہ راہ اگرچہ ان خاصان خدا کے جادۂ بلند سے کم تر ہو مگر ان نادانوں کی ڈگر سے برتر و بہتر ضرور ہوگی۔

کتاب:

روض الریاحین فی حکایات الصالحین (واقعات صالحین میں گلوں کے چمنستان) کا لقب "نزهة العیون النواظر و تحفة القلوب الحواضر فی حکایات الصالحین والاولیاء والاکابر" ہے یعنی صالحین، اولیا اور اکابر کے واقعات میں بینا آنکھوں کا سامانِ فرحت، اور حضوری والے دلوں کا تحفہ۔

اس کتاب کے شروع میں قرآن و حدیث اور آثار سلف سے فقر و فقرا اور اولیا کے فضائل اور کرامات اولیا کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے جس سے مصنف کے رسوخ علم کا اندازہ ہوتا ہے، پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو عام صالحین، درمیانی درجے کے اولیا اور بلند مرتبہ اکابر عرفا سبھی کے منتخب واقعات پر مشتمل ہے، مصنف نے اس میدان کی معتبر کتابوں اور مستند رجال کو اپنا ماخذ بنایا ہے، تعبیرات اور بیان حالات میں ان کے قلم پر شروع سے آخر تک علم و عرفان کی گرفت مضبوط نظر آتی ہے، ان کا شعری ذوق بھی بڑا بلند ہے، کثرت سے اشعار بھی درج کتاب فرمائے ہیں اور خود ان کے اشعار کی بھی وافر مقدار شامل کتاب ہے۔

ان واقعات میں جو کیف و لذت مستور ہے ان کا لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب حضورِ قلب اور اکتساب فیض کے ارادے سے ان کا مطالعہ کیا جائے، یقیناً ان میں روح کی بالیدگی، یقین کی پختگی اور ایمان کی ترقی و مضبوطی کا کافی سامان موجود ہے، مصنف نے نمبر وار پانچ سو حکایات تحریر فرمائی ہیں اور بعض نمبروں کے تحت کسی خاص مناسبت کی وجہ سے ضمناً متعدد واقعات ثبت فرمائے ہیں۔

آخر میں حضرت مصنف نے بعض واقعات پر بعض علمائے ظاہر کے اعتراضات کا شافی جواب رقم فرمایا ہے، پھر ذات و صفات سے متعلق عقائد اولیا، امام ابوالقاسم قشیری کے رسالے سے مختصراً نقل کیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ اولیائے کرام اس باب میں بھی جادۂ تحقیق پر گامزن ہیں، اور ہر بدعت و ضلالت سے دور و نفور ہیں۔

اس کے بعد چار قصیدے درج فرمائے ہیں:

پہلا قصیدہ: مدح اولیا میں، دوسرا قصیدہ: باعمل اور متبع سنت علما کی مدح میں۔ تیسرا قصیدہ: اقسام اولیا کے ذکر میں۔ چوتھا قصیدہ: عام مومنین کے لحاظ سے جنت کی تشویق اور دوزخ سے تخویف میں اس کی تذییل میں آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ بھی ذکر فرمائی ہیں، تاکہ مزید شوق و طلب اور کمال یقین کا ذریعہ ہو سکیں۔

آخر میں پانچواں قصیدہ: سید الابرار، رسول مختار، حبیب کردگار، علیہ و علی آلہ و صحبہ الصلاۃ والتسلیم کی مدح میں۔

کتاب میں جو واقعات تحریر کیے گئے ہیں، ان میں سوانح نگاری کا طرز نہیں کہ کسی ایک بزرگ کا نام لکھ کر ان کے حالات و واقعات، پھر دوسرے کے حالات و واقعات یکجا کر دیے گئے ہوں، نہ ہی یہ طریقہ ہے کہ ایک دور کے اولیا اور ہم عصر بزرگوں کے حالات الگ الگ بیان کرنے کا التزام ہو۔ نہ ہی یہ کہ ایک شہر یا ملک کے صالحین کے احوال جمع کیے گئے ہوں۔ بلکہ انداز نگارش میں عام موعظت اور عبرت انگیزی کا عنصر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے مختلف ادوار و بلاد کے اولیا کے چیدہ چیدہ واقعات کچھ تسلسل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں تاہم ان میں کچھ ترتیب بھی کارفرما ہے۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) بہت سی صالح خواتین اور مجاہدہ کیش عارفات کے احوال ایک جگہ زیادہ مقدار میں جمع ہیں۔
(۲) بہت سے غلام عرفا کے واقعات ایک جگہ۔
(۳) باندیوں کے حالات ایک جگہ۔
(۴) ایسے ہی کمسن اور خردسال عارفوں کی حکایات۔
(۵) مجاہدہ کیش اور شوق و عرفان سے لبریز جوانوں کے مناظر۔
(۶) مشتاقان حور و قصور اور طالبان جنت کی حکایات۔
(۷) عالم برزخ، اور منزل قبر کی حکایات۔
(۸) بے ثباتی دنیا، عشرت ناپائدار اور عیش کیش دولت مندوں، بادشاہوں کے لق و دق محلوں کی ویرانی کے مناظر۔
(۹) مجذوبوں کے حالات۔
(۱۰) طالبان ذات، عاشقان جمال لایزال اور اکابر اہل عرفان کے اخبار و افکار۔

مصنف کا مقصد یہ نہیں کہ کسی ایک دور یا چند ادوار، کسی شہر یا بلاد، کسی طبقہ یا طبقات کی زمانی تاریخ مرتب کی جائے۔ اور فن تاریخ کا کوئی علمی شاہکار تصنیف کیا جائے، بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو وہ خلوتیں اور جلوتیں دکھائی جائیں جو فکر آخرت اور ذکر حبیب کی لذتوں سے سرشار ہیں، ان فرزانوں کی داستان سنائی جائے جن کے سامنے دنیا ایک بے ثبات اور ناپائدار سایے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ جن کی نگاہوں میں منزل جاوداں کے پر کیف مناظر اسی طرح بسے ہوئے ہیں جیسے اہل دنیا کی نگاہوں میں یہ فنا پذیر مناظر، بے ثبات رعنائیاں اور دل فریب عشرتیں چھائی ہوئی ہیں کہ نکالے نہیں نکلتیں۔ ساتھ ہی ان مغرور اور فریب خوردہ نادانوں اور مجنونوں کا انجام بھی دکھایا گیا ہے جنھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ دنیا ہی دار البقا ہے۔ اور چند روزہ زندگی کے لیے سج دھج ایسی اپنائی کہ گویا ہزار ہا ہزار سال رہنے کا سودا سر میں سمایا ہوا ہے، محلوں پر محل تیار ہو رہے ہیں۔ سیم و زر کا ڈھیر لگ رہا ہے۔ خدم و حشم کا جم غفیر ہے۔ عیش و تنعّم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے سرور انگیز نغموں کی موجیں رواں ہیں، خُم پر خُم اور پیمانوں پر پیمانے چھلک رہے ہیں۔ مگر چند دنوں میں ایسا سناٹا کہ "ہو" کا عالم ہے۔ ویرانی ہی ویرانی، تاریکی ہی تاریکی۔

حضرت مصنف قدس سرہ العزیز نے ان سچے واقعات سے غفلت شعار دلوں کی بیداری، مشتاق طبیعتوں کی شوق افزائی اور "عاقبت اندیش" قلوب کے حوصلے بلند سے بلند تر کرنے کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے جس میں ان کا جذب دروں، اخلاص فزوں، اور جوہر علم و قلم بھی پوری طرح کار فرما ہے، یہی وجہ ہے کی اہل دل اس کتاب کو صدیوں سے چراغِ راہ اور حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ ہم بھی اس کتاب کے ذریعے اولیا کی صحبت میں کچھ دیر بیٹھ سکتے ہیں، اور ان مجلسوں اور ان خلوتوں کا کچھ نظارہ کر سکتے ہیں، جن کو دیکھنے کو اب نگاہیں ترستی ہیں، روحیں تڑپتیں ہیں اور دل بے قرار ہیں۔

ترجمہ کتاب:

ایسی عبرت انگیز کتاب کے ترجمے کے لیے ایک ایسے صاحب قلم کی ضرورت تھی جو خود دلِ دردمند رکھتا ہو، زبان و بیان کی باریکیوں اور پیچیدگیوں سے آشنا ہو، اور قرطاس و قلم کا طویل تجربہ بھی رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے برادر گرامی مولانا بدر القادری کی ذات اس کام کے لیے بہت موزوں ثابت ہوئی۔ میں نے ان کا ترجمہ اصل کتاب کے ساتھ مکمل پڑھا۔ میں نے دیکھا کہ مترجم پر بھی وہی کیفیت طاری ہے جو ان واقعات کی روح میں جاری وساری نظر آتی ہے، طرز ادا کی شگفتگی بھی ہے، زبان کی سلاست و روانی بھی اور بیان کی دلکشی و اثر انگیزی بھی، ان سب پر مستزاد یہ کہ شاعرانہ طبیعت بھی پائی ہے، اور جا بجا اپنے اشعار سے بھی اس کیف کو تقسیم کیا ہے جو واقعات

کی زمین میں کار فرما ہے۔ کتاب میں حضرت مصنف قدس سرہٗ کا بھی یہ طرز ہے کہ بہت سے واقعات یا ان میں ذکر شدہ اشعار کی مناسبت سے اپنے اشعار بھی درج فرمائے ہیں، جس سے نثر و نظم دونوں میں مصنف کا کمال عیاں ہے۔ اردو زبان کے تعلق سے برادر مترجم زید فضلہ کے بارے میں قارئین کو علم ہوگا کہ نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، اور غالباً نظم میں پہلے اور نثر میں اس کے بعد، کیوں کہ اوائل عمر ہی سے ان کے اشعار مشاعروں اور محفلوں کی زینت بننا شروع ہو گئے، جب کہ نثر کو یہ مقام بہت بعد میں ملا، اس خصوص پر نظر کی جائے تو ہمیں ترجمہ "روض الریاحین" کے لیے مولانا موصوف سے موزوں شخصیت ملنا بہت دشوار تھا۔

ترجمہ کا انداز کیا ہے اس سلسلے میں قدرے تفصیلی تعارف کرا دینا چاہتا ہوں، تاکہ قارئین پر حقیقت واضح رہے اور وقت ضرورت طالبان تحقیق اصل کتاب کی طرف رجوع کر سکیں۔

ترجمہ کا مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ قارئین تک وہ کیفیت منتقل کی جائے، جو ان واقعات میں جلوہ فگن ہے، اس لیے بعض واقعات میں چند تمہیدی جملے بھی لکھ دیے گئے ہیں، کہیں کہیں ترتیب بھی بدل دی گئی ہے، اور بعض واقعات حذف بھی کر دیے گئے ہیں۔ حذف ہونے والے واقعات ایسے ہیں جن میں نتائج بہت مبہم نظر آتے ہیں، یا اس موضوع کے سابقہ شاندار واقعات جو گزر چکے ہیں "ان کے مقابلے میں" یہ زیادہ عبرت آموز نہیں رہ جاتے یا شعری مکالموں کی ایسی کثرت ہے جس کے لیے ان اشعار کو ہی سننا اور سمجھنا وہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے جو ان واقعات سے مصنف کو مقصود ہے، اور اردو داں قارئین کو ان سے کما حقہ لطف اندوز ہونا بہت مشکل ہے، ان سب کے باوجود ایسی ترجمانی نہیں کی گئی ہے جس سے واقعات کی صورت مسخ ہو جائے، اور مصنف یا عبارت کا مقصود و مفہوم ہی بدل جائے، مزید توضیح کے لیے چند مختصر واقعات کی اصل عبارتیں، پھر ان کے لفظی ترجمے، پھر شامل کتاب ترجمے پیش خدمت ہیں۔

(ا) عبارت کتاب:

الحكاية التاسعة عشرة عن عبدالله بن مهران رحمه الله تعالىٰ ــ قال: حج هارون الرشيد فوافى الكوفة، فاقام بها اياما، ثم ضرب بالرحيل، فخرج الناس، وخرج بهلول المجنون رضى الله تعالىٰ عنه فيمن خرج، فجلس بالكناسة، والصبيان يوذونه، ويولعون به، إذأقبلت هوادج هارون، فكف الصبيان عن الولوع به فلما جاء هارون نادى البهلول باعلىٰ صوته، يا أمير المؤمنين! يا امير المؤمنين! فكشف هارون

السجاف بيده، وقال لبيك يا بهلول، لبيك يا بهلول، فقال: يا امير المؤمنين! حدثنا ايمن بن نائل عن قدامة بن عبدالله العامرى، قال رأيت النبى صلى الله تعالى عليه وسلم بمنىٰ على جمل وتحته رحل رث فلم يكن ضرب ولا طرد، ولا اليك اليك، وتواضعك فى سفرك هذا يا امير المؤمنين! خير لك من تكبرك وتجبرك، فبكىٰ هارون حتى سقطت الدموع على الأرض، ثم قال يا بهلول زدنا يرحمك الله تعالىٰ، فقال:

هب انك قد ملكت الأرض طراً ودان لك العباد فكان ماذا

اليس غداً مصيرك جوف قبرٍ ويحثو التراب هٰذا ثم هٰذا

فبكى هارون، ثم قال أحسنت، يا بهلول، هل غيره قال: نعم يا امير المؤمنين رجل أتاه الله مالاً و جمالاً فأنفق من مالهٖ وعفّ فى جمالهٖ، كتب فى خالص ديوان الله تعالىٰ من الأبرار فقال أحسنت يا بهلول مع الجائزة فقال ارددالجائزة علىٰ من اخذتها منه، فلا حاجة لى فيها، قال يا بهلول إن يكن عليك دين قضيناه فقال يا امير المؤمنين لا يقضىٰ دين بدين، ارددالحق الىٰ اهله، واقض دين نفسك من نفسك، فقال يا بهلول فنجرى عليك مايكفيك، فرفع بهلول راسه الى السّماء، ثم قال يا امير المؤمنين انا وانت من عباد الله، فمحال أن يذكرك و ينسانى، فأسبل هارون السجاف ومضىٰ.

لفظی ترجمہ:

انیسویں حکایت، حضرت عبداللہ بن مہران رحمہ اللہ تعالی سے مروی ہے، فرماتے ہیں: ہارون رشید حج کو نکلے تو کوفہ پہنچ کر وہاں چند دن قیام کیا، پھر کوس رحلت بجا تو (جلوس شاہی کے نظارے لیے) لوگ باہر نکل پڑے، نکلنے والوں میں بہلول مجنون رضی اللہ تعالی عنہ بھی تھے، یہ کوڑا کرکٹ کی جگہ آبیٹھے، بچے ان کو ستاتے اور ان سے لپٹے رہتے، اتنے میں ہارون رشید کے محمل اور اس کی سواریاں آپہنچیں، تو بچوں نے بہلول سے لگنا چھوڑ دیا۔

جب ہارون رشید آگئے تو بہلول نے زور سے چلا کر پکارا "امیرالمومنین !امیرالمومنین !" ہارون نے محمل کا پردہ ہٹایا اور کہا لبیک بہلول !لبیک بہلول ! بہلول نے کہا اے امیرالمومنین ! ہم سے ایمن بن نائل نے قدامہ بن عبداللہ عامری سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو منیٰ میں ایک اونٹ پر اس حالت میں دیکھا کہ ان کے نیچے ایک بوسیدہ سا کجاوہ تھا، تو نہ مار پیٹ تھی نہ ہٹو بچو۔

امیرالمومنین اس سفر میں آپ کی خاکساری کبر ونخوت اور شان وشکوہ سے بہتر ہے، یہ سن کر ہارون رشید ایسا روئے کہ ان کے آنسو زمین پر گرنے لگے، پھر کہا بہلول مزید فرمائیے، خدا آپ پر رحمت فرمائے، بہلول نے کہا:

فرض کر لیجیے کہ آپ ساری روے زمین کے مالک ہوگئے اور تمام بندے آپ کے تابع فرمان ہوگئے تو کیا ہوا؟ کیا کل آپ کا ٹھکانا قبر کا شکم نہ ہوگا، جب کہ آپ کے اوپر یہ، پھر یہ، مٹی ڈالتا ہوگا؟

اس پر ہارون رشید روئے پھر کہا بہت خوب کہا بہلول! کچھ اور بھی ہے؟ فرمایا ہاں اے امیرالمومنین! ایک شخص کو اللہ نے دولت اور حسن سے نوازا، تو اس نے دولت راہ مولیٰ میں خرچ کی اور حسن کے معاملے میں پارسائی اختیار کی تو اللہ تعالی کے خاص دفتر میں ایسا شخص ابرار کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے، ہارون نے کہا بہت خوب، اس کے ساتھ انعام بھی لو، بہلول نے کہا انعام تو اسی کو واپس کر دیجیے جس سے لیا ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں، کہا: بہلول اگر آپ پر قرض ہو تو ہم ادا کر دیں، جواب دیا امیرالمومنین دَین سے دَین ادا نہیں کیا جاتا، حق، حق دار کو واپس کیجیے، اور خود اپنی ذات کا دَین اپنے سے ادا کرائیے۔ کہا اے بہلول، آپ کے لیے ہم اتنا وظیفہ جاری کر دیتے ہیں جو آپ کے لیے کافی ہو، اس پر بہلول نے آسمان کی طرف سر اٹھایا، پھر یوں کہا: امیرالمومنین! میں اور آپ دونوں ہی خدا کے بندے ہیں، اور یہ محال ہے کہ آپ کو وہ یاد رکھے اور مجھے بھول جائے، اس پر ہارون نے محمل کا پردہ گرایا اور آگے بڑھ گئے۔

شامل کتاب ترجمہ: "بہلول دانا اور ہارون رشید"

خلیفہ ہارون رشید ایک بار حج کرنے گئے، ان کے ہمراہ بغداد کے حاجیوں کا ایک بڑا قافلہ تھا، واپسی کے وقت کوفہ میں ہارون رشید کا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں حضرت بہلول دانا (مجذوب) کو بچے پریشان کر رہے تھے خلیفہ کی سواری نزدیک پہنچی تو لڑکے دیکھ کر بھاگ گئے، اور گلیوں میں چھپ گئے، ہارون رشید ایک شاندار اونٹنی پر ہودج میں سوار تھے، شاہی کر وفر اردگرد تھا اور ہودج پر پردہ پڑا ہوا تھا، حضرت بہلول نے دیکھا تو آواز بلند پکارا: یاامیرالمومنین! یاامیرالمومنین! ہارون رشید نے ہودج کا پردہ ہٹایا، اور کہا لبیک یا بہلول!

حضرت بہلول: اے امیرالمؤمنین! ہم سے ایمن بن نائل نے قدامہ بن عبداللہ عامری سے روایت کیا قدامہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو مقام منیٰ میں ایک ایسے اونٹ پر سوار دیکھا جس پر بوسیدہ کجاوہ تھا، اور حضور کی سواری کے باعث نہ لوگوں میں ہٹو بچو، نہ مار دھاڑ، لہذا اے امیرالمؤمنین! آپ کے لیے تواضع اور انکساری، تکبر اور برتری جتانے سے بہتر ہے۔

خلیفہ ہارون رشید یہ سن کر رونے لگا، اس کے اشکوں کے قطرات زمین پر گرے، اور عرض کیا، اے بہلول! مجھ کو نصیحت فرمائیے، انھوں نے دو شعر سنائے جن کا مفہوم یہ ہے:

نعمت دہر پہ اے دوست نہ ہرگز اترا
عمر بھی ایک دِیا ہے کہ جو بجھ جائے گا
لے کے میت جو چلا گورغریباں تو آج
بس اسی طرح تجھے کل کوئی پہنچائے گا

یہ سن کر خلیفہ اور رونے لگا اور مزید کہنے کی درخواست کی۔

حضرت بہلول: امیرالمؤمنین! جسے اللہ تعالی مال و دولت اور حسن و جمال سے نوازے، اور وہ اپنی دولت راہِ مولا میں خرچ کرے، اور حسن و جمال کو حرام سے بچائے، دفتر مولا میں اس کا نام ابرار کی فہرست میں لکھا جائے گا۔

خلیفہ: آپ نے نہایت قیمتی بات فرمائی اور انعام کے لائق کلام کیا۔

حضرت بہلول: انعامی مال اسی کو واپس کر دیں جس سے لیا ہے، مجھے ضرورت نہیں۔

خلیفہ: اگر آپ کے ذمے کوئی قرض ہو تو میں ادا کر دوں۔

حضرت بہلول: دَین سے دَین کی ادائیگی کیا ہوگی؟ آپ حق داروں کا حق انھیں دیں اور اپنے نفس کا حق ادا کریں۔

خلیفہ: اگر قبول کیجیے تو کچھ وظیفہ مقرر کر دوں۔

حضرت بہلول: (آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے) امیرالمومنین! ہم اور آپ دونوں اللہ ہی کے بندے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالی آپ کو یاد رکھے اور مجھے فراموش کر جائے۔

ہارون رشید نے یہ سن کر محمل کا پردہ گرا دیا، اور سواری آگے روانہ ہوئی۔

(اس واقعے کو حضرت عبداللہ بن مہران رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے روایت کیا)

(۳) عبارت کتاب:

الحكاية الثالثة عنه ايضاً رضى الله تعالىٰ عنه قال بينما أسير فى بعض جبال بيت المقدس إذ سمعت صوتاً وهو يقول: ذهبت الألام عن أبدان الخدام، ولهت بالطاعة عن الشراب و الطعام، وألفت أبدانهم طول القيام، بين ايدى الملك العلام، قال رضى الله تعالىٰ عنه فتبعت الصوت، فإذا بشاب أمرد قد علا وجهه اصفرار يميل مثل

الغصن إذا أمالته الريح، عليه شملة قد اتزر بها،واخرىٰ قد اتشح بها، فلما رآنى توارى عنى بالشجر، فقلت له ايها الغلام ليس الجفاء من اخلاق المؤمنين، فكلمنى و اوصنى، فخر ساجدًا لله تعالىٰ، وجعل يقول: هذا مقام من لاذ بك واستجار بمعرفتك، والف محبتك، فيا اله القلوب، وما تحو يه من جلال عظمتك، احجبنى عن القاطعين لى عنك، ثم غاب عنى فلم أره، رضى الله تعالىٰ عنه.

لفظی ترجمہ:

تیسری حکایت، ان ہی حضرت ذوالنون رضی اللہ تعالی عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں: میں بیت المقدس کے ایک پہاڑ پر چل رہا تھا، اچانک ایک آواز سنائی دی، کوئی یوں کہہ رہا تھا:

"خدمت گزاروں کے جسم کی تکلیف دور ہوئی، وہ طاعت کی شیفتگی میں خور د و نوش سے بے پروا ہو گئے اور ان کے جسم کو بادشاہِ عَلّام کے حضور طول قیام کا انس مل گیا ہے۔"

حضرت ذوالنون فرماتے ہیں: میں آواز کی سمت چلا، دیکھا کہ ایک بے ریش جوان ہے، جس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی ہے، یوں لرزتا ہلتا ہے جیسے تیز ہوا میں شاخ ہلے، جسم پر ایک کمبل ہے، جسے تہبند بنالیا ہے اور دوسرے کو اوڑھ رکھا ہے، وہ مجھے دیکھ کر درخت کی آڑ میں چھپ گیا۔ میں نے کہا لڑکے! جفا و بے رخی مومن کی سیرت نہیں، مجھ سے ہم کلام ہو اور مجھے کچھ نصیحت کر، اس پر وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ اور یہ عرض کرنے لگا:

یہ اس کی جگہ ہے جس نے تیری پناہ لی، تیری معرفت کی امان میں آیا، اور تیری محبت سے انس رکھا، تو اے دلوں کے معبود! اور دلوں میں موجود جلال و عظمت والے معبود! جو میرے اور تیرے درمیان قطع تعلق کریں ان سے تو مجھے روپوش رکھ۔"

یہ کہ کر وہ میری نگاہوں سے ایسا غائب ہوا کہ پھر میں اسے دیکھ ہی نہ سکا۔ رضی اللہ تعالی عنہ

شامل کتاب ترجمہ:

وہ جنھیں دامن محبوب چھپالیتا ہے

بیت المقدس اور اس کی نواحی پہاڑیاں ہزاروں انبیاے کرام اور صاحبان باطن کے خروش روحانی سے معمور ہیں، آج بھی اس سنگلاخ خطہ ارض کی خاک میں خوف خدا سے پگھلنے والے قلوب کی نزہت جاں فزا کا احساس ہوتا ہے، ایک بار حضرت ذوالنون مصری انھیں سنگ زاروں میں عشق و عرفاں کے گل بوٹے چن رہے تھے کہ انھوں نے ایک آواز سنی جس کا مفہوم یہ تھا:

" بندوں کے اجسام سے مصائب کی کلفتیں ڈھل گئیں، وہ طاعت ربانی میں کھو کر خورد و نوش سے بے نیاز ہو گئے، اور ان کے پیکر جسمانی مالک حقیقی کے حضور قیام کی عادت سے آشنا ہو چکے۔"

حضرت ذوالنون نے اس آواز کا تعاقب کیا تو ایک نوجوان کو پایا جس کے رخسار پر ابھی جوانی کا غازہ بھی نمودار نہ ہوا تھا۔ نحیف بدن، زردی مائل، شاخ نازک کی طرح لچکتا قد، جسم پر دو چادروں کا لباس، آہٹ پا کر چھپنے لگا، حضرت ذوالنون نے آواز دی، اس درجہ اظہار تنفر اور بد خلقی شان مومن کے خلاف ہے، مجھ سے ہم کلام ہو اور مجھ کو کچھ نصیحت کر، یہ سن کر وہ سجدے میں گر کر مناجات کرنے لگا، جس کا مفہوم یہ ہے:

"اے اللہ! یہ مقام اس شخص کا ہے جس نے تیرے ساتھ قرار پکڑا، تیری پناہِ معرفت میں آیا، تیری محبت کا شیدا ہوا، تو اے مالک قلوب، اور دلوں میں بسنے والے جلال و عظمت کے مالک! جو مجھے تجھ سے الگ کرنے والے ہیں تو مجھے ان سے پوشیدہ رکھ۔"

شیخ ذوالنون فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا—رضی اللہ عنہ

(۳) عبارت کتاب:

الحكاية الثلاثون عن ذى النون المصرى رضى الله تعالى عنه قال وصف لي رجل من أهل المعرفة في جبل لكام، فقصدته، فسمعته يقول بصوت حزين فى بكاء وأنين،

يا ذا الذى أنس الفؤاد بذكره
أنت الذى ما ان سواك أريد
تفنى الليالى والزمان بأسره
وهواك غض فى الفواد جديد

قال ذوالنون فتبعت الصوت، فإذا بفتى حسن الوجه حسن الصوت، وقد ذهبت تلك المحاسن، وبقيت رسومها، نحيف قد اصفر واحترق وهو يشبه الولِهَ الحيران، فسلمت عليه، فرد على السلام وبقى شاخصاً يقول:

أعميتَ عينى عن الدنيا وزينتها
فأنت والروح منى غير مفترقِ
إذا ذكرتك وافىٰ مقلتى أرَقٌ
من أول الليل حتى مطلع الفلقِ
وما تطابقت الأحداق عن سنة
إلّا رأيتك بين الجفن والحدقِ

ثم قال يا ذاالنون مالك و طلب المجانين، قلت او مجنون انت؟ قال قد سمعت به، قلت مسئلة، قال سل، قلت ماالذى حبب إليك الانفراد و قطعك عن المؤانسين، وهيمك فى الأودية والجبال؟ فقال حبى له هيمنى، وشوقى اليه هيجنى، ووجدى به افردنى، ثم قال يا ذاالنون!أعجبك كلام المجانين؟ قلت إى والله، وأشجانى، ثم غاب عنى، فلا ادرى اين ذهب. رضى الله تعالىٰ عنه.

لفظی ترجمہ:

تیسویں حکایت، حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مجھ سے جبل لکام میں رہنے والے ایک صاحب معرفت کا حال بیان کیا گیا۔ جس کے بعد میں نے اس سے ملنے کا قصد کیا۔ گیا تو وہ آہ و بکا اور درد بھری آواز میں یہ کہہ رہا تھا:

" اے وہ جس کی یاد سے دل کو الفت ہو چکی ہے، تو ہی وہ ہے جس کے سوا میرا کوئی مقصود نہیں، راتیں ختم ہو جائیں گی، سارا زمانہ فنا ہو جائے گا، مگر تیری محبت دل میں ترو تازہ رہے گی۔"

حضرت ذوالنون فرماتے ہیں: آواز کی سمت جا کر میں نے دیکھا تو ایک خوبرو، خوش آواز نوجوان ہے جس کا حسن و جمال رخصت ہو چکا ہے اور نشانات باقی ہیں۔ دبلا قد، زرد رُو، سوختہ صورت، جیسے کوئی سرگرداں عاشق شیدا، میں نے سلام کیا، سلام کا جواب دیا، اور آنکھیں پھاڑے کہتا رہا:

"تو نے دنیا اور اس کی آرائش و زیبائش سے میری آنکھیں اندھی کر دیں، تو تیری ذات اور میری جان میں کبھی جدائی نہ ہوگی، جب تجھے یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں میں بے خوابی آجاتی ہے جو اول شب سے طلوعِ صبح تک قائم رہتی ہے۔ اور نیند سے جب بھی آنکھیں بند ہوئیں تجھے میں نے پتلیوں اور پلکوں میں دیکھ لیا ہے۔"
(اور آنکھیں بند ہوتے ہی تیرا دیدار نصیب ہوا)

پھر اس نے کہا اے ذوالنون! تمھیں مجنونوں کو ڈھونڈنے سے کیا غرض؟ میں نے کہا آپ کیا مجنون ہیں؟ کہا یہ تو سن ہی چکے ہو۔ عرض کیا ایک سوال ہے فرمایا پوچھو۔ بتائیے وہ کون سی چیز ہے جس نے تنہائیوں کو آپ کے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اہل انس سے الگ تھلگ کر کے وادیوں اور پہاڑوں میں سرگرداں کر رکھا ہے۔ فرمایا، اس سے مجھے جو عشق ہے اسی نے سرگرداں بنا دیا ہے، اسی کے شوق نے مجھے بھڑکا دیا ہے، اور اسی کی وارفتگی نے لوگوں سے الگ تھلگ کر دیا ہے، پھر فرمایا: ذوالنون! تمھیں مجنونوں کی بات پسند آئی؟ میں نے عرض کیا: ہاں! خدا کی قسم، پسند بھی آئی اور سوز و غم بھی پیدا کر دیا، اس کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ رضی اللہ تعالی عنہ۔

شامل کتاب ترجمہ:

کوہ لکام کا عارف

کوہ لکام کے نشیب و فراز میں حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ عنہ اس عارف کامل کو تلاش کر رہے تھے، جس کے سوز نفس کا چرچا دور و نزدیک تھا۔ یک بیک ان کے کانوں سے نالہ و شیون اور آہ و گریہ کے انداز میں ایک آواز ٹکرائی، کوئی دل جلا یہ اشعار پڑھ رہا تھا:

یا ذا الذي انس الفُؤادُ بذِكْرِه
اَنتَ الذی ما اِنْ سِواكَ اُرِيْدُ
تَفْنَی اللیالِیْ و الزمانُ بِاَسْرِه
و هَواكَ غَضٌّ فی الفُؤادِ جدیدُ

ہے ترا ذکر ہی تسکین مری
رضا ہی تری، مرا مستقر ہے
فنا ہوتا ہے دن، مٹتی ہیں راتیں
چمن ہے عشق کا، جو تازہ تر ہے (بدرؔ)

حضرت ذوالنون رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آواز سن کر قدم آگے بڑھائے، قریب جاکر دیکھا تو ایک شکیل نوجوان بیٹھا ہے۔ لاغری اور کمزوری سے اس کا جسم دبلا ہو رہا ہے۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی، آنکھیں حلقۂ چشم میں دھنس گئی ہیں، ذوالنون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سلام سن کر جواب دیا، اور اشعار پڑھے جن کا مفہوم کچھ اس طرح تھا:

ساری دنیا سے پھیر کر آنکھیں
دل میں تجھ کو بسا لیا میں نے
نیند کیا، رات کیا، اندھیرا کیا،
ذکر کا نور پالیا میں نے
نیند آئی تو اپنی آنکھوں میں
تیرا جلوہ جمالیا میں نے (بدرؔ)

اس کے بعد کہا: اے ذوالنون! آپ کو مجھ جیسے مجنون کی کیا حاجت، کیوں یہاں آنے کی زحمت کی؟

ذوالنون: مجھے تم سے ایک بات دریافت کرنی ہے۔

نوجوان: پوچھیے۔

ذوالنون: آخر وہ کون سی بات ہے جس نے تمھیں دنیا سے کنارہ کشی، اور گوشہ نشینی پر آمادہ کی؟

نوجوان: محبت نے مجھے ویرانوں، جنگلوں، اور پہاڑیوں میں سرگرداں کیا، شوق نے مجھے آمادہ کیا، اور عشق نے مجھے سب سے علیحدہ کر دیا۔

نوجوان: کیا آپ کو دیوانوں کی باتیں بھلی لگتی ہیں؟

ذوالنون: بخدا! مجھے تم جیسے لوگوں کی باتیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہیں، اور ان باتوں سے مجھے رقتِ قلبی میسر آتی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس کے بعد وہ نوجوان نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، اور پھر اسے کہیں نہ پا سکا۔

○

یہ تین نمونے میں نے پیش کر دیے جن میں روض الریاحین کی اصل عربی عبارت ہے پھر اس کا مناسب "لفظی ترجمہ" جو میں نے کیا ہے، پھر اس کا وہ ترجمہ جو مولانا بدر القادری کے قلم سے شامل کتاب ہے۔ ان نمونوں سے مولانا کی ترجمانی کا دل پذیر انداز بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) واقعات میں جو مکالمے آئے ہیں، انھیں مکالمات کے جدید طرز پر دائیں صاحب کلام پھر کلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ جس سے بار بار "اس نے کہا" میں نے کہا کی تکرار نہیں ہوتی، اور ضمیروں کی ہر بار صحیح تعیین کے لیے ذہن پر کوئی بار نہیں پڑتا، عبارت میں روانی، بیان میں شگفتگی، اور فہم مقصود میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) بہت سی جگہوں میں اشعار کی ترجمانی شعروں ہی میں کی گئی ہے، یہ مترجم کے شاعرانہ کمال کی روشن دلیل ہے۔ عربی عبارتوں کو دلکش اردو میں ڈھالنا ہی بڑا مشکل کام ہے اور انھیں شعری پیکر میں اتارنا اس سے بھی مشکل تر، مگر جو زود گو، کہنہ مشق اور باکمال شاعر ہوتے ہیں وہ بڑی مہارت سے یہ مشکل سر کر لیا کرتے ہیں۔

(۳) واقعات کے آغاز و اختتام میں کہیں کہیں روایتی لطافت و دل چسپی پیدا کرنے کے لیے مناسب تمہیدی جملے لکھ دیے ہیں، کہیں مزید وضاحت اور واقعے کی جانب شوق انگیزی کے لیے عربی کے ایک دو جملوں کے عوض زیادہ جملے لکھے گئے ہیں۔

(۴) چوں کہ یہ ترجمانی و تلخیص ہے اس لیے حکایتوں پر کتاب کے مطابق نمبر نہیں ڈالے گئے ہیں، مگر ہر حکایت کے لیے ایک مناسب اور شوق انگیز سرخی قائم کی گئی ہے جو پوری حکایت کا ماحصل کہی جا سکتی

ہے، ان عنوانات کے انتخاب میں مترجم کی مہارت اور شگفتہ طبعی کا جوہر عیاں ہے۔

(۵) اِن سب کے باوجود واقعات کی اصل زمین بعینہ باقی رکھی گئی ہے، اور مکالمات خصوصاً اولیا و عرفا کے عبرت انگیز اور نصیحت آموز الفاظ کو تقریباً اصلی حالت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بلکہ بہت سی حکایات ایسی ہیں جو مکمل طور پر بامحاورہ اور سلیس ترجمہ ہی پر مشتمل ہیں۔ اور اپنی طرف سے کسی تفہیمی اور توضیحی اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے، اور یہ بات شروع سے آخر تک ملحوظ ہے کہ واقعات کی صورت ہرگز مسخ نہ ہو، اور ان کی جو اصلیت ہے وہ کامل طور پر محفوظ رہے، اور اعتماد کے ساتھ کہا جا سکے کہ حکایت وہی ہے جو مصنف نے بیان کی۔

(۶) نقل و بیان میں امانت و دیانت، زبان میں روانی و شگفتگی، طرز ادا میں لطافت و دل کشی، حذف و اضافہ، تقدیم و تاخیر، تفہیم و توضیح میں روایت بالمعنیٰ کی ساری پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نصیحت و موعظت کی روح، عبرت انگیزی، شوق آفرینی اور اہل شوق کی ہمت افزائی ان ساری خصوصیات کے ساتھ ترجمانی کو نبھانا مولانا بدر القادری کا وہ کمال ہے جس پر وہ بجا طور پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

جب کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں صحیح لفظی ترجمہ کرنا بھی دونوں زبان سے پوری واقفیت، محاورات کی معرفت اور عبارتوں میں جاری و ساری روح سے مکمل آشنائی کا مقتضی ہے جو بجائے خود ایک مشکل کام ہے، پھر اتنی ضخیم کتاب کے ترجمہ یا ترجمانی میں جو محنت شاقہ ہے وہ ہر صاحب نظر پر عیاں ہے، اس لحاظ سے بھی برادر محترم دام ظلہ ہمارے اور تمام اردو داں قارئین کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ محنتِ شاقہ جھیل کر ایک عظیم سرمایے کو اردو میں منتقل کیا، اور ہمارے اردو ذخیرے میں اضافہ بھی فرمایا۔

رب کریم انھیں ان کی محنتوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے، انھیں دین و علم اور قرطاس و قلم کی خدمات کے میدان میں نمایاں مقام بخشے، دارین کی سعادتوں سے ہم کنار فرمائے، اور ان کے ادارہ المجمع الاسلامی کو بھی فروغ و استحکام مرحمت فرمائے، آمین۔ یا اکرم الاکرمین بجا ہ حبیبك سید المرسلین، خاتم النبیین علیه وعلیٰ آله وصحبه اکرم الصلوة وافضل التسلیم الیٰ یوم الدین.

(شب دوشنبہ، ۱۷؍رجب ۱۴۱۳ھ)

❁❁❁❁❁❁

تقریظ[1]

استاذ گرامی حضرت مولانا محمد شفیع اعظمی علیہ الرحمۃ کے مختصر حالات پر یہ دل کش مرقع عزیزی شکیل احمد بھیروی (سلمه الله تعالیٰ وزاده علما نافعا و عملا متقبلا) کی کوششوں سے منظر عام پر آرہا ہے۔

وہ چلتے پھرتے، ملتے ملاتے اچانک ہم سے جدا ہو گئے، اس ناگہاں جدائی پر معمول سے زیادہ کرب و الم اور صدمہ ہونا فطری امر ہے۔ متعدد اہل تعلق نے قلم سے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا، ان کے کچھ حالات بھی لکھے، وہ رسالوں میں شائع بھی ہوئے، مگر رسائل کا حال یہ ہے کہ ایک بات کوئی چیز ان میں چھپی، ماہ دو ماہ نظر کے سامنے رہی، پھر غائب ہوئی تو ایسی کہ تلاش کرنا مشکل۔ عزیز موصوف نے ان منتشر موتیوں کو یکجا کر کے انھیں نئی زندگی دے دی، اور کچھ نئے مضامین بھی حاصل کیے خصوصاً حضرت بحر العلوم کے رشحات قلم بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ محب گرامی مولانا بدر القادری نے بھی تازہ مضمون ارسال کیا اور عجلت کے باوجود ذرا بسط سے لکھا۔ یقیناً آپ ان سبھی مضامین سے مستفید و محظوظ ہوں گے۔

میری بیماری یہ ہے کہ یکسوئی اور سکون کے بغیر کچھ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے جس کا نقصان یہ ہے کہ یکسوئی کی تلاش میں کبھی عرصہ گزر جاتا ہے اور کام وقت نکل چکا ہوتا ہے تاہم یہاں عجلت میں چند سطور قلم بند کر رہا ہوں جو ان مضامین کی تائید اور تلخیص کہی جا سکتی ہیں۔

حضرت مولانا محمد شفیع اعظمی علیہ الرحمۃ ایک بلند پایہ عالم تھے، اتنے بلند کہ بہت سے قد آور علما ان کی درس گاہ فیض سے اٹھے۔ معقولات و منقولات سبھی پر وہ عبور رکھتے تھے۔ اور ادب میں خاص امتیاز کے حامل تھے۔ میں نے ان سے فقہ میں ہدایہ اولین، حدیث میں مشکاۃ شریف منطق میں میر قطبی اور ادب میں دیوان متنبی کا درس لیا اور عربی انشا کی مشق خاص طور سے انھیں کے یہاں تقریباً ایک سال کرتا رہا، ہر فن کو وہ مہارت اور دلچسپی سے پڑھاتے، طلبہ پر بہت شفیق اور مہربان تھے، انھیں صاحب کمال بنانے کا خاص جذبہ رکھتے تھے۔

دینداری، پرہیز گاری اور اخلاص و ایثار میں اپنے بیشتر اقران پر فائز تھے۔ قومی و ملی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے اور حتی المقدور ان میں حصہ لینے بلکہ پیش قدمی کرنے کی کوشش فرماتے۔ تحریر میں خاص ملکہ حاصل

---

(۱) تذکرۂ قاضی شریعت، قاری شکیل احمد اعظمی، انجمن عزیزیہ، بھیرہ ولید پور، مئو، ۱۹۹۴ء

تھا۔ ان کے بہت سے مضامین اشاعت پذیر بھی ہوئے، شعر وسخن کا ذوق تھا۔

دارالعلوم اشرفیہ کے تدریسی کارواں کے رکن رکین تو وہ عرصۂ دراز سے تھے ۱۹۷۱ء میں حافظ ملت علامہ عبدالعزیز مرادآبادی قدس سرہ العزیز کی سربراہی میں جب مجلس منتظمہ کی تشکیل ہوئی تو ادارہ کے انتظامی و تعمیری قافلہ کے بھی یہ خاص رکن اور عہدے دار ہوئے اور حافظ ملت کی معیت میں اپنی منصبی ذمہ داریاں بڑی محنت و دل سوزی سے انجام دیتے رہے بلکہ قافلہ سالار کی رحلت کے بعد بھی تقریباً دس سال تک بڑی ذمہ داری سے نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے، ادارے کو ان کا بدل اب تک نہ مل سکا۔

ان کے طویل عرصۂ تدریس میں اشرفیہ میں ہزاروں طلبہ آئے ان میں سے اکثر ان کے تلمذ سے شرف یاب ہیں۔ اور سبھی ان کے مداح و قدر داں ہیں۔

نرم مزاج، سادگی وخاکساری کا پیکر، خاموش طبع، کم گو، شگفتہ مزاج، کبھی کبھی بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور خوش طبعی سے پیش آتے تھے۔ افکار سے گراں بار بھی رہتے ان کا اثر بھی نظر آتا۔ مختصر یہ کہ علم وعمل، افکار و خیالات، اخلاق و کردار اور دینی و علمی، قومی و ملی خدمات ہر لحاظ سے وہ ایک بلند پایہ اور ممتاز انسان تھے۔

اس اجمال کی تفصیل اگلے اوراق میں ملاحظہ فرمائیں اور مزید تفصیل مزید مبسوط مضامین کی طالب ہے۔ رب کریم وابستگان دامن کو توفیق خیر سے نوازے۔

محمد احمد مصباحی غفرلہ
بھیرہ ولید پور ضلع مئو۔
شیخ الادب الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ
۱۳؍رجب ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۶؍دسمبر ۱۹۹۴ء شب شنبہ

تقدیم (۱)

قرآن کریم خدا کا آخری پیغام اور لافانی سرچشمۂ ہدایت ہے۔ وہ رہتی دنیا تک عالم انسانیت کی ہدایت و فلاح کا ضامن ہے۔ رب کریم نے اپنے رسول انور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر اسے ہر چیز کے واضح بیان کی صورت میں اتارا اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین کامل کر دیا۔ ارشاد ربانی ہے: وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (النحل، آیت: ۸۹)

"اور ہم نے تم پہ قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے اور ہدایت اور رحمت اور بشارت مسلمانوں کے لیے۔"

اور فرماتا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ: آیت: ۳)

"آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔"

لیکن کیا ہر شخص قرآن کریم سے ہر طرح کے تمام معانی و مطالب نکال سکتا ہے؟ یا کم از کم دین و شریعت کے تمام احکام صرف قرآن کریم کے مطالعہ سے واضح اور قطعی طور پر جان سکتا ہے؟ یہ ایک ضروری اور اہم سوال ہے جس کا جواب ان کے ذمہ ہے جو حدیث رسول سے بے نیازی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص تو در کنار یہ کام ہر عالم کے بس کا بھی نہیں، بلکہ امت کا بڑے سے بڑا عالم بھی سنت رسول سے بے نیاز ہو کر اسے انجام نہیں دے سکتا۔ اجلۂ صحابۂ کرام بھی رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تفہیم کے محتاج رہے، جس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اسی لیے رب کائنات ارشاد فرماتا ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (نحل: آیت: ۴۴)

"اور اے محبوب! ہم نے تمھاری طرف یہ ذکر اتارا تاکہ تم لوگوں کے سامنے اسے بیان کرو جو ان کی طرف اترا اور کہیں وہ دھیان کریں۔"

رسول اللہ ﷺ کے اوپر تعلیم و توضیح کی ذمہ داری اسی لیے رکھی گئی کہ امت کے لیے معانی قرآن تک

(۱) سنت کی آئینی حیثیت، مولانا بدر القادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور

پورے طور سے رسائی ممکن نہیں، مثلاً قرآن میں نماز قائم کرنے کا حکم موجود ہے مگر نماز کے مقررہ اوقات کی تفصیل، رکعتوں کی تعداد، ارکان کی ترتیب، اذکار نماز کی تعیین، اور ادائیگی کا مکمل طریقہ کوئی بڑے سے بڑا مجتہد بھی محض قرآن سے واضح اور حتمی طور پر نہیں نکال سکتا، اس کے لیے بیان رسول اور عملِ رسول کی ضرورت ہے۔ بلکہ قرآن کی صفت تو یہ ہے کہ:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا. (بقرہ:۲۶) بہت کو خدا اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت کو ہدایت دیتا ہے۔

اسی لیے قرآن نے رسول کی جانب رجوع کی ہدایت فرمائی۔ رب العلمین کا فرمان ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (حشر:۷)

"اور جو کچھ تمھیں رسول عطا فرمائیں وہ لو، اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

اور بارگاہ رسول سے سرتابی کرنے والوں کی یوں مذمت فرمائی:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا. (نساء:۶۱)

"اور جب ان سے کہا جائے اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو تم دیکھو گے کہ منافق تم سے منہ موڑ کر پھر جاتے ہیں۔"

مگر احادیث رسول میں بھی قیامت تک پیدا ہونے والے ہر معاملہ سے متعلق احکام کا صریح بیان موجود نہیں خلفاے راشدین ہی کے زمانے میں ایسے مسائل در پیش ہوئے جن کا جواب صراحۃً انھیں حدیث سے نہ مل سکا اور اجماع یا قیاس کے ذریعہ ان کا حل تلاش کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کے بعد بھی اجماع یا قیاس سے اخذ احکام کی حاجت باقی رہتی ہے۔

لیکن یہ بھی واضح رہے کہ کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں قیاس واجتہاد کے ذریعہ استخراجِ احکام پر بھی سب کو قدرت نہیں ہوتی بلکہ جن کو علوم وفنون میں کافی مہارت اور خدا کی جانب سے فقاہت کا ملکہ عطا ہوا ہو وہی اس سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے عام لوگوں کو اہل علم کی جانب رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

فَسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكرِ ان كُنتُم لاتَعْلَمون. بِالْبيّنٰتِ وَالزُّبُر وَاَنزَلْنَا اِلَيك الذِّكرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفكَّرُون (نحل:۴۳، ۴۴)

"تو اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں۔ روشن دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ بھیجا۔ اور اے محبوب ہم نے تمہاری طرف یہ ذکر اتارا تاکہ تم لوگوں سے اسے بیان کرو جو ان کی طرف اترا اور کہیں وہ دھیان کریں۔"

امام احمد رضا قدس سرہٗ تفسیر معالم التنزیل کے حاشیے میں اس مقام پر فرماتے ہیں:

"أقول هٰذا من محاسن نظم القرآن العظيم، أمر الناس أن يسألوا أهل الذكر العلماء بالقرآن العظيم، وَأرشد العلماء ان لا يعتمدوا على أذهانهم فى فهم القرآن بل يرجعوا الى مايبيّن لهم النبى ﷺ، فردّ الناس إلى العلماء، والعلماء إلى الحديث، والحديث إلى القرآن، وان إلى ربكم المنتهىٰ فكما أن المجتهدين لو تركوا الحديث ورجعوا إلى القرآن لضلّوا، كذلك العامة لو تركوا المجتهدين ورجعوا إلى الحديث لضلّوا، ولهٰذا قال الإمام سفيان بن عيينة احدائمة الحديث قريب زمن الامام الأعظم و الامام مالك رضى الله تعالىٰ عنهم: الحديث مضلة إلا للفقهاء نقله عنه الامام ابن الحاج المكى فى المدخل.

میں کہتا ہوں یہ عبارت قرآنی کا حسن ہے کہ عام انسانوں کو یہ حکم دیا کہ اہل ذکر یعنی علماے قرآن سے دریافت کریں، اور علما کو یہ ہدایت فرمائی کہ فہم قرآن کے معاملے میں اپنے ذہن پر بھروسا نہ کرلیں بلکہ بیان رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب رجوع کریں۔ اس طرح عوام کا مرجع علما، علما کا مرجع حدیث، حدیث کا مرجع قرآن کو ٹھہرایا، اور بلا شبہ انتہا رب ہی کی جانب ہے۔

جیسے یہ ہے کہ مجتہدین اگر حدیث ترک کردیں اور صرف قرآن کی طرف رجوع لائیں تو گمراہ ہو جائیں اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگر عوام حضرات مجتہدین کو چھوڑ دیں اور خود حدیث کی جانب رجوع کرنے لگیں تو گمراہ ہو جائیں۔ اسی لیے امام اعظم و امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قریب زمانہ کے ایک جلیل القدر امام حدیث حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

"غیر فقہا کے لیے حدیث گمراہی کی جگہ ہے۔" (یعنی آدمی، اگر فقاہت سے خالی ہے تو حدیث سے گمراہی میں پڑ سکتا ہے جیسے حدیث وفقاہت کے بغیر خود قرآن سے گمراہی میں پڑ سکتا ہے۔) اسے امام ابن الحاج مکی نے امام موصوف سے "مدخل" میں نقل فرمایا۔"

عارف باللہ امام عبد الوہاب شعرانی میزان الشریعۃ الکبری میں فرماتے ہیں:

تأمل يا اخى لولا انّ رسول الله ﷺ فصل بشريعته ما أجمل فى القرآن لبقى القرآن على إجماله كما أن المجتهدين لولم يفصّلوا ما أُجمل في السنة لبقيتِ السنّةُ على إجمالها، وهكذا إلى عصرنا هذا.

"برادرم! غور کر، اگر رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی شریعت سے قرآن عظیم کے مجمل امور کی تفصیل نہ فرماتے تو قرآن کریم یوں ہی مجمل رہ جاتا۔ اسی طرح ائمۂ مجتہدین اگر حدیث کی مجمل باتوں کی تفصیل نہ فرماتے تو حدیث

یوں ہی مجمل رہ جاتی۔ اسی طرح ہمارے زمانے تک۔"

یہی وجہ ہے کہ دین حق کی بنیاد اور احکام شرعیہ کی اساس چار چیزوں پر رکھی گئی:

(۱) قرآن (۲) سنت (۳) اجماع (۴) قیاس

اس کی نشان دہی خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن و سنت کے مرجع ہونے سے متعلق تو بہت آیات ہیں، کچھ بعض اوپر نقل بھی ہوئیں۔ اب سنت و اجماع دونوں کے حجت ہونے سے متعلق یہ آیت کریمہ ملاحظہ ہو:

وَمَنْ یُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بعدِ مَاتَبَیَّنَ لَهُ الهُدٰی ویَتَّبِعْ غَیرَ سَبِیْلِ المؤمِنِین نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیْرًا (نساء:۱۱۵)

"اور جو رسول کا خلاف کرے اس کے بعد کہ حق راستہ اس پر کھل چکا اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ چلے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اُسے دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ کیا ہی بُری پلٹنے کی جگہ ہے۔"

معلوم ہوا کہ رسول کریم کی مخالفت اور مسلمانوں کے اجتماعی طریق سے سرتابی جہنم رسی کا باعث اور عذاب الٰہی کا سبب ہے۔ اس سے جہاں اتباع رسول کا وجوب ثابت ہوتا ہے وہیں "سبیل مومنین" (مسلمانوں کے اجتماعی راستے) کی پیروی کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔

قیاس مجتہدین کی حجیت، فقہاے دین کی جانب رجوع، ان کی تعلیم پر اعتماد اور ان کے ارشادات کے اتباع سے متعلق درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) اہل ذکر سے پوچھو اگر تمھیں علم نہیں۔ (نحل، آیت: ۴۳) تفصیل گزر چکی ہے۔

(۲) وَاِذَا جاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الاَمْنِ اَوِالخوفِ اَذَاعُوابِهٖ وَلَورَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُولِ وَاِلٰی اُولِی الاَمْرِ مِنْهُم لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَستنبِطونَهُ مِنْهُمْ. (۸۳، نساء)

"اور جب ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا ڈر کی آتی ہے اس کا چرچا کر بیٹھتے ہیں، اور اگر اس میں رسول اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف رجوع لاتے تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے یہ جو بعد میں استنباط اور کاوش کرتے۔"

معلوم ہوا کہ رب کریم نے امت کے کچھ افراد کو استنباط کی قوت بخشی ہے، وقتِ حاجت عام مسلمانوں کو ان کی جانب رجوع کرنے ہی میں نجات ہے۔

(۳) وَمَا کَانَ المُومِنُونَ لِیَنْفِرُوا کَافَّةً فَلولَا نَفَرَ مَنْ کُلِّ فرقَةٍ مِّنْهُمْ طَائفَةٌ لِیَتَفَقَّهُوا فِی الدِّین وَلِیُنْذِرُوْا قَومَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَیهِمْ لعَلَّهُمْ یَحْذَرُونَ. (توبہ: ۱۲۲)

"اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں، تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے تاکہ دین میں فقاہت حاصل کریں، اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں۔"

اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) درجۂ فقاہت تک رسائی سب کے لیے میسر نہیں۔

(۲) ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جو دینی فقاہت کے کمال سے آراستہ ہوں۔

(۳) ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ فقہ کی تحصیل کے بعد اپنی قوم کے سامنے تبلیغ کریں۔

(۴) قوم کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان پر اعتماد کرے، ان کا اتباع کرے، خدا سے ڈرے اور معاصی سے بچے۔

(۵) ان کا اتباع اسی لحاظ سے ہوگا کہ انھوں نے خدا کے دین اور اس کی شریعت کا وہ علم حاصل کر لیا جو ہمارے پاس نہیں۔ اور فقہ و اجتہاد کی صلاحیت سے کام لے کر احکام کے استخراج اور جزئیات کی معرفت تک پہنچ چکے ہیں، ان کے علم کا سرچشمہ کتاب و سنت اور اجماع مجتہدین ہے۔ ان کے دینی اخلاص و تقویٰ کا سونا نکھرا ہوا ہے اس لیے ان کا بتایا ہوا حکم در اصل کتاب و سنت کا ارشاد اور خدا اور رسول کا فرمان ہے اور ان کی اطاعت خدا اور رسول ہی کی اطاعت ہے۔

امت مسلمہ کا سوادِ اعظم ان چاروں اصول: کتاب، سنت، اجماع، قیاس کو حجت مانتا ہے، اور عہد صحابہ سے لے کر دور حاضر تک مسلمانوں کا عمل درآمد اسی پر جاری ہے۔ لیکن جب کسی سر میں آزادی کا سودا سماتا ہے اور نفس کی غلامی کا جذبہ اُبھرتا ہے تو وہ ان چار اصول میں سے کسی ایک سے انکار کے چکر میں پڑتا ہے تاکہ پابندی میں کچھ کمی ہو اور نفس کو ذرا آزادی و عیاشی نصیب ہو۔ اس لیے کوئی کہتا ہے کہ فقہا کی پیروی اور ائمہ کی تقلید ایک لغو اور بے معنی چیز ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے مشرکوں نے ایک خدا کو چھوڑ کر بہت سے "ارباب" ٹھہرا لیے، خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کافی ہے۔ ائمہ کی تقلید شرک ہے۔ دوسرا اٹھتا ہے اور کہتا ہے: رسول کی اطاعت بھی غیر خدا کی اطاعت ہے۔ سنتِ رسول بھی کوئی چیز نہیں بس اللہ کی کتاب کافی ہے۔ یہ منکرین کبھی تقلید کی مخالفت میں فقہا و ائمہ پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے ہیں، کبھی سنت کی مخالفت میں محدثین اور کتبِ حدیث کو ہدف بناتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اجماع امت کا انکار کرتے ہیں۔ جس قدر انکار بڑھتا جاتا ہے آزادی کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، عیاشی، نفس پروری اور ہوس پرستی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

کتاب و سنت میں جو مسائل تفصیلاً مذکور ہیں وہ بہت کم ہیں، اصول و کلیات ضرور موجود ہیں۔ جن سے روز مرہ جزئیات کے استخراج، استخراج کے لیے قانون سازی اور تفریع و تاصیل کا بہت سا کام فقہا و ائمہ نے انجام دیا جو امت کے لیے مینارۂ نور اور مشعل راہ ہے۔ اب اس کی روشنی میں یہ سہولت بہم ہو چکی ہے کہ ہر دور کے علما

اپنے زمانہ کے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ مشکل کی توضیح، مجمل کی تفصیل، مُرسل کی تقیید وغیرہ امور کی صلاحیت رکھنے والے علما ہر زمانے میں ہوتے رہیں گے اور دین کی خدمت سرانجام دیں گے۔ جیسا کہ بخاری و مسلم شریف کی حدیث "لاتزال طائفة من أمتی ظاهرين على الحق حتی یاتی أمر الله" سے یہ مضمون علما نے واضح کیا ہے۔

مگر جو لوگ فقہا و علما سے بے نیازی کے مدعی ہیں وہ ذرا ان سے خوشہ چینی کے بغیر صرف کتاب و سنت سے عبادات، معاملات، معیشت، تمدن، حکومت، سیاست وغیرہ متنوع شعب زندگی کے جزئیات کی تفصیل پیش کریں۔ یقیناً وہ اس سے عاجز ہیں، بلکہ تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ ایسے لوگ دو راہ اختیار کرتے ہیں۔ پہلی یہ کہ گزشتہ فقہا و ائمہ کے اقوال تلاش کر کے دیکھتے ہیں کہ کون زیادہ آسان یا زیادہ منفعت بخش ہے۔ یا کون ہماری خواہش اور مزاج سے زیادہ قریب ہے، اسی کو لے لیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے کتاب و سنت سے اخذ کیا۔ حالاں کہ انھوں نے فقہا و علما سے سرقہ کیا۔ مزید یہ کہ فقہا نے جو حکم بیان کیا تھا وہ ان کے اخلاص و اجتہاد پر مبنی تھا مگر انھوں نے وہی حکم لیا تو اخلاص و اجتہاد کے تحت نہیں بلکہ محض ہوائے نفس، راحت طلبی اور منفعت جوئی کے زیر اثر لیا۔

دوسری راہ یہ کہ اپنی بے نور عقل کا گھوڑا دوڑاتے ہیں، اور جو سمجھ میں آیا بتا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث میں تفصیل موجود نہیں، اور ان کے پاس علوم کی مہارت اور اجتہاد کی قوت بھی نہیں مگر ایک قوم کی پیشوائی کا سہرا باندھ کر نکل پڑے۔ اب یہ ہر شعبۂ زندگی کے ہر باب کے ایک ایک مسئلہ کے بارے میں بتائیں تو کہاں سے بتائیں۔ اپنی عقل میں جو آیا کہہ دیا۔ اور اسی کی پیروی اپنی قوم پر لازم کر دی۔ در اصل یہ ائمہ کرام اور رسول اسلام علیہ و علیہم السلام سے برگشتہ کر کے خود اپنے آگے جھکانے اور اپنی اطاعت کرانے کی تدبیر ہے۔

کہتے یہ ہیں کہ کتاب کی اطاعت کرو۔ یا کتاب و سنت کی پیروی کرو۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو قوم عربی زبان سے نابلد ہے وہ کتاب و سنت کی اطاعت کیسے کرے؟ ترجمہ دیکھے تو یہ در اصل مترجم کی پیروی ہے۔ نہ معلوم اس نے کہاں سے اور کیسے ترجمہ کیا۔ اس کی تقلید اور اس پر کامل اعتماد کے بغیر اس کے ترجمہ پر کاربند ہونا ممکن نہیں۔ پھر جس طرح اصل کتاب و سنت سے ان کے لیے تمام احکام کا استخراج ممکن نہیں صرف ترجمہ سے بھی ممکن نہ ہوگا۔ اسی طرح ان میں جو عربی زبان کے ماہر ہوں وہ بھی کتاب و سنت کی اصل زبان پڑھ کر اس سے جملہ احکام کے استخراج پر قدرت نہیں رکھتے۔ صحابۂ کرام تو بیانِ رسول اور بیان مجتہدین کے محتاج تھے۔ آج کا کوئی ماہر ان سے بے نیاز کیسے ہو سکتا ہے؟ لامحالہ وہی ہوگا کہ جس کے بہکانے سے اس نے ائمہ کا دامن چھوڑا اسی کو امام بنا لے گا اور وہ جو کچھ بتا دے گا اسی کی تقلید کرے گا۔ اسی طرح جس نے رسول کی اطاعت سے ہٹایا اسی کو رسول کی

جگہ مرجع بنائے گا اور وہ جو بتاتا جائے گا اسے مانتا جائے گا۔

یہ کہاں کی دانشمندی ہوئی کہ رسول کی اطاعت تو شرک سمجھی اور ایک عامی کی اطاعت کو ایمان بنا لیا؟ یا ائمہ کی اطاعت کو تو شرک قرار دیا اور صدیوں بعد جنم لینے والے کسی نفس پرست کی غلامی کا قلادہ گردن میں ڈال لیا اور بزعم خویش مست رہے کہ ہم تو صرف اللہ کے فرماں بردار ہیں، ہم محض خدا اور رسول کے مطیع ہیں، صرف کتاب و سنت ہمارا مرجع و ماخذ ہے۔

جو شخص بھی ان چار اصول میں سے کسی ایک کا منکر ہو آپ اس کا جائزہ لے لیں وہ اپنے نفس کا متبع ہوگا یا اپنے سے بھی گھٹیا کسی دوسرے نفس پرست کا اطاعت شعار ہوگا۔ عام صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین رسول اقدس ﷺ کی طرف رجوع کرتے اور اگر یہ میسر نہ ہوتا تو ان صحابۂ کرام کی تقلید کرتے جو علم و فضل، دیانت و تقویٰ اور قوتِ اجتہاد و استنباط میں ان سے اعلیٰ و افضل ہوتے۔ اسی کی قرآن نے انھیں ہدایت دی۔ اسی طرح ہر زمانے میں غیر مجتہد افراد زیادہ رہے اور شریعت کے معاملے میں کسی مجتہد کی تقلید کرتے رہے۔ مگر جب آزادی کی ہوا چلی تو طرح طرح کے فرقے پیدا ہوئے۔ فقہ و قیاس اور تقلید ائمہ کے منکرین، اجماعِ امت کے منکرین، حدیثِ رسول اور سنتِ نبوی کے منکرین یہاں تک کہ قرآن کریم کے منکرین جو قرآن کو "بیاض عثمانی" اور ناقابل اعتبار بتاتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتے۔

اور المیہ یہ ہے کہ یہ سب کلمہ گو ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے مستشرقین کا انکار اس سے مختلف ہے وہ تو سرے سے اسلام ہی کے منکر ہیں اس لیے وہ قرآن کو خدا کا کلام نہ مانیں، حدیثوں میں تشکیک کریں، ائمہ و فقہا کو بے اعتبار ٹھہرائیں۔ علما و صلحا سے امت کو بیزار اور متنفر کریں، سیرت رسول پر اعتراضات جڑیں، اسلامی قوانین کو ناپائدار اور کمزور بتائیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت میں کچھ بھی کریں حیرت انگیز نہیں۔ مگر کلمہ گویوں کا قرآن کی تعلیمات اور رسول کے ارشادات سے انحراف حیرت انگیز بھی ہے اور الم انگیز بھی۔ رب کریم مسلمانوں کی حفاظت و صیانت فرمائے۔

زیر نظر کتاب "سنت کی آئینی حیثیت" منکرین حدیث کے لیے دعوتِ حق اور سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت کے لیے سامانِ بصیرت اور ذریعۂ استقامت ہے۔ برادر محترم مولانا بدر القادری دام فضلہ نے بہت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس موضوع سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو منکرین کے بے ہودہ خیالات، بے جا اعتراضات، غلط تاویلات، اور من مانی تفہیمات کی کمی نہیں۔ سب سے تعرض ہو تو ضخیم دفتر بھی ناکافی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو طبقہ عہد صحابہ سے لے کر آج تک کی تمام موقر اسلامی شخصیات کو بے اعتبار سمجھتا ہو وہ خود کس

قدر اعتنا کے قابل ہے؟ وہ علماے اسلام کی ساری جد و جہد اور تمام دینی و علمی خدمات کو صفر کے درجہ میں شمار کرے اور ہم اس کی ہر بات کو درخورِ اعتنا سمجھیں جب کہ وہ محض کج فہمی، گمراہی اور قصداً گمراہ گری کی پیداوار ہیں۔

ہاں اجمالاً اتنا جان لینا ضروری ہے کہ انھوں نے تمام اصول و مآخذ کو چھوڑ کر محض اپنی دماغی اُپج اور ذہنی اختراع کو امام بنایا ہے۔ جس سے دور رہنے میں ہی مسلمانوں کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔ وَاللّٰہُ الھَادِیْ اِلٰی سَواءِ السَّبِیْلِ۔

محمد احمد مصباحی
۲ر صفر ۱۴۱۶ھ/۲ر جولائی ۱۹۹۵ء یک شنبہ

❁❁❁❁❁❁

تقدیم(۱)

۷ر ربیع الآخر ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۷ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو "جماعت رضاے مصطفی" کا قیام عمل میں آیا، اور اس کا دینی، علمی اور عملی فیضان ایک عرصۂ دراز تک سرزمین ہند پر ابر کرم بن کر برستا رہا، اس کی تاریخ کا بڑا رقت انگیز اور عظیم الشان باب شدھی تحریک کا انسداد ہے، اگر اس کی خدمات کے خانے میں صرف یہی ایک کارنامہ ہوتا تو وہی اسے بقاے دوام بخشنے کے لیے کافی تھا۔

بعض سرگرم مشرکین ہند نے یہ منصوبہ بنایا کہ مسلمانوں کو ہندو بنایا جائے، اس کے لیے انھوں نے سب سے پہلے ان علاقوں کا انتخاب کیا جہاں مسلمان دینی احکام سے بالعموم نابلد اور ہندوانہ مراسم کے پابند تھے، ماضی قریب میں ان کے آبا و اجداد نے اسلام قبول کیا مگر تعلیم کی کمی اور ماحول کی ناسازگاری کی وجہ سے وہ نہ تو پورے طور پر شریعت اسلامیہ کے احکام و اعمال سے آشنا ہو سکے نہ ہی ہندوانہ عادت و اطوار کو مکمل طور پر ترک کر سکے، ان کی نسل کو یہ دعوت دی گئی کہ تمھارے باپ دادا کا پرانا دھرم ہندو تھا، تم اسلام میں داخل ہو کر ملیچھ اور ناپاک ہو گئے اب پھر اپنے پرانے دھرم میں لوٹ کر شدھ اور پاک و صاف ہو جاؤ۔ بہت سی آبادیوں پر یہ جادو چل گیا اور لوگ ارتداد کا شکار ہو گئے، شدھی تحریک کو اپنی ابتدائی کامیابی دیکھ کر بڑا حوصلہ ملا اور اس کے جوان ایک آبادی کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری کا رخ کرنے لگے اور بڑھتے گئے۔

اس بلاخیز طوفان کے مقابلے میں اترنے والے کوئی مسلم تنظیم نظر نہ آتی تھی، قومی لیڈر، دینی رہنما، علما، خطبا، اور اہل قلم سب کے پاؤں میں زنجیریں اور لبوں پر مہر سکوت پڑی ہوئی تھی، عوام میں بیشتر کا حال یہ تھا کہ وہ یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے کہ کوئی مسلمان بھی ہندو ہو سکتا ہے، جماعت رضاے مصطفی کے معظم سرپرست مفتی اعظم علامہ شاہ مصطفی رضا قدس سرہ اس صورت حال پر تڑپ اٹھے، دل و دماغ کا سکون اٹھ گیا، راحت و آرام غارت ہو گیا، مردانہ وار آگے بڑھے اور چند مؤقر علما و عمائد کو لے کر میدان کارزار میں کود پڑے، سب سے پہلے ان بستیوں کا رخ کیا جو ارتداد کے ہلاکت خیز پنجوں کی گرفت میں آ چکی تھیں، لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دی توبہ کرائی اور پھر اسلام میں داخل کیا۔ اس کے بعد ان آبادیوں کا رخ کیا جو شدھی تحریک کا نشانہ بنے

(۱) تاریخ جماعت رضاے مصطفی، از مولانا شہاب الدین رضوی، طبع ممبئی ۱۹۹۵ء

والی تھیں جہاں بندو رائفلوں، بندوقوں، سپاہیوں اور ہر طرح کے سازوسامان سے لیس ہو کر جاتے اور لوگوں کو دین سے برگشتہ کرتے، ایسے علاقوں میں جنگ کا بھی خطرہ ہوتا اور وہاں قدم رکھنا بڑا مشکل تھا، جماعت رضائے مصطفی کے پاس حربی آلات اور جنگی سازوسامان نہ تھے، مگر ایمان کی طاقت و قوت تھی اس لیے ایسے خطرناک مواقع پر بھی اس نے بڑھ کر مقابلہ کیا اور حق کا غلبہ ہوتا رہا۔

یہ جماعت مبارکہ کا ایک میدان عمل تھا، دوسری طرف آریوں کی جانب سے گمراہ کن اخبارات اور پمفلٹ شائع ہوتے جن میں اسلام پر اعتراضات ہوتے ان کا جواب بھی جماعت نے اپنے ذمہ لیا اور قلمی محاذ پر بھی اہل باطل کو شکست دی۔

اس طرح کے بہت سے دینی و ملی امور جماعت سے وابستہ تھے جنھیں سرانجام دینے کے لیے جماعت نے ذیلی کمیٹیاں بھی تشکیل دے رکھی تھیں، وسائل اور سرمایہ کی ہمیشہ قلت رہی مگر کچھ جواں حوصلہ اور مخیر مسلمانوں کے ذریعہ کام ہوتا رہا۔

جماعت کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں اور موجودہ نسل میں حرکت و عمل کی گرمی اور ایمان و ایقان کی تازگی و توانائی بخشنے کے لیے ان کی اشاعت بہت ہی حوصلہ بخش، نتیجہ خیز اور مفید ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری ۵۰ سالہ نسل کی اکثریت جماعت کے کارناموں کی تفصیل سے نابلد ہے، عزیز گرامی مولانا شہاب الدین رضوی نے اس سلسلہ میں امام احمد رضا کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۴۱۳ھ کے سیمینار کے لیے ایک مختصر مقالہ لکھا جو میں نے بغور پڑھا، پھر عزیز موصوف کو خط لکھا کہ اس موضوع پر آپ تفصیل سے لکھیں، انھوں نے پرانے ذخیرے تلاش کیے، خاص طور سے جماعت کی رودادیں حاصل کیں اور ان کی روشنی میں یہ تاریخ مرتب کی، جس پر وہ ہم سب کی طرف سے خراج تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ایک عربی شاعر علی بن جہم کے قول (وذكر الفتى بالخير عمر مجدد، جواں مرد کا ذکر خیر اس کے لیے ایک حیات نو کی حیثیت رکھتا ہے) کے تحت میں کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اس تذکرہ سے جماعت کو ایک نئی زندگی اور حیات تازہ بخش دی ہے اور موجودہ نسل کے لیے عبرت و بصیرت اور حرکت و عمل کا نیا درس فراہم کر دیا ہے، ایک عبرت انگیز تاریخ جو داستان پارینہ بن چکی تھی آج پھر اپنی نئی تاب و تواں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہے۔

میں بار بار یہ کہتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے ادوار حیات میں بڑی زریں خدمات انجام دی ہیں مگر ہماری غفلت شعاری اور حرماں نصیبی یہ رہی ہے کہ ہم نے بروقت ان کی تاریخ لکھنے کا اہتمام نہ کیا اور اگر کچھ تاریخ لکھی گئی تو اس کی باضابطہ تدوین اور بار بار اشاعت و تجدید کی طرف توجہ نہ ہوئی، جس کے باعث بے شمار

کارنامے یا تو فضائے بسیط کی امانت بن کر رہ گئے یا ہنگامی اخبارات و رسائل کی زینت بنے، پھر بوسیدہ اوراق اور مقفل الماریوں میں ان کا دم گھٹ کر رہ گیا، ابھی ہماری پرانی روش میں کوئی خاص تبدیلی نہیں اور موجودہ اکابر کے ساتھ بھی تقریباً وہی سلوک جاری ہے جو ماضی کے بزرگوں کے ساتھ رہ چکا ہے۔

ہم میں سے ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے اپنی بساط بھر کوشش کرے اور جو کچھ مل سکتا ہے اسے منظر عام پر لائے، غفلتوں کا ماتم، کوتاہیوں پر حسرت، ایک دوسرے کی شکایت اور اپنے لیے اظہار براءت ہمارے درد کا مداوا نہیں بن سکتا، ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر آدمی میں بہت کچھ صلاحیت موجود ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم میں بہت سے افراد "شہاب الدین" بنیں، اپنے وقت، محنت اور صلاحیت کا صحیح استعمال کریں، ایثار و اخلاص سے کام لیں اور اپنے ساتھ اپنے اسلاف، اپنی قوم اور اپنی نسل کے لیے بہت کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا کریں، اس طرح ہر میدان کا خلا پر ہو سکتا ہے اور کام بہت آگے بڑھ سکتا ہے، رب کریم ہمیں توفیق خیر سے نوازے۔ وهو المستعان وعليه التكلان، والصلاة والسلام على حبيبه سيد الأكوان وعلى آله وصحبه ما تعاقب الملوان.

محمد احمد مصباحی

رکن المجمع الاسلامی واستاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

۴ر صفر المظفر ۱۴۱۶ھ / مطابق ۴ر جولائی ۱۹۹۵ء

❁❁❁❁❁❁

العلامة أحمد رضا خان القادري البريلوي(1)

أسرته: أسرته كانت من الأفغان، انتقل بعض أجداده إلى الهند في عصر المغول، ونال منصبا من الحكومة، وملك ضيعات وقرى، تبقى في أولاده إلى الآن. وبعض أجداده رغب عن وظيفة الحكومة إلى الرياضة والمجاهدة، والذكر وكثرة العبادة، وأصبح صنيعه سنة في أبناءه، وتحولت الأسرة من منحى الأمراء والأثرياء إلى منهج الزهّاد والفقراء. وجدّه الشيخ رضا علي خان (ت ١٢٨٦ﻫ) كان من كبار العلماء والصلحاء، يقوم بالإفتاء، والإرشاد، والتصنيف، والتدريس. تلمذ عليه كثير من أهل بريلي، وأثنوا عليه كثيرا. وأبوه الشيخ نقي علي (١٢٤٦ﻫ-١٢٩٧ﻫ) أيضا كان عالما شهيرا، صاحب فتاوى وتصانيف جليلة. منها "الكلام الأوضح في تفسير سورة ألم نشرح" في نحو خمس مأة صفحة.

ولادته ونشأته: تولّد الشيخ أحمد رضا ببلدة بريلي في العاشر من شوال سنة ١٢٧٢ﻫ المصادف ١٤/ يونيو سنة ١٨٥٦م، ونشأ في أسرة دينية، وبيئة صالحة، ربّاه جده وأبوه، ودرس بعض الكتب الإبتدائية من المرزا غلام قادر بك ثم أتم دراسته من أبيه وتخرج عليه في ١٤/ من شعبان المعظم سنة ١٢٨٦ﻫ، وبعد ماتخرج فوض إليه أبوه الإفتاء، فكان يكتب ويعرض فتاواه على أبيه للتصويب والإصلاح حتى قال له الشيخ بعد سنوات لاتحتاج الآن إلى العرض، لكنه استمر في صنيعه حتى توفي أبوه. وخلال قيامه بالإفتاء والتصنيف درس كتابا من الهيئة- وهو شرح ملخص الجغميني- على الشيخ عبد العلي الهيأتي الرامفوري.

تبحره في العلوم: أخذ من أبيه العلوم المتداولة، وحصل كثيرا من الفنون

(١) الکشف شافیا حکم فونوجرافیا، امام احمد رضا قادری، رضا اکیڈمی، ممبئی، مئی ۱۹۹۷ء

بدراسته ومطالعته بدون أستاذ، فحذق في الحساب، والهندسة، والجفر، والتكسير، والمناظر والمرايا، وعلم المثلث الكروي، والزيج، ونحوها مع نبوغه في العلوم الدينية، والأدبية. ومصنفاته في كل فن أقوى شاهد على تبحره بل إيجاده كثيرا من القواعد والمبادئ في مختلف الفنون. ابتكر عَشَر قواعد لمعرفة جهة القبلة من أي جزء من الأرض، وقال: قواعدنا في غاية الصحة حتى لو أزيلت الحجب لتجلّت الكعبة بمرأى من العيون بعد الاستخراج السديد من هذه الأصول. وقد نقل تلك القواعد تلميذه العلامة ظفر الدين أحمد البهاري في كتابه "توضيح التوقيت" وكتب قصة ظريفة لعلماء عصره الذين كانوا يُعَدّون من الفحول الأجلّة، لكن لما وجّه إليهم بعض تلامذة الشيخ ظفر الدين سؤالا عن جهة القبلة أتوا بمضحكات عجيبة، ولو اعتذروا واعترفوا بعدم معرفتهم ذلك الفن لسلموا من تلك الأعاجيب، ولكن العُجب ياتي بالعجائب. والعلامة ظفر الدين أحمد أخذ هذا الفن من العلامة أحمد رضا كما أخذ منه علومًا كثيرة جعلته مبرزا على أقرانه.

ولا يخلو كتاب للشيخ أحمد رضا من إفادات بديعة، وابتكارات مدهشة، وإيرادات مشكلة، وحلول مستقيمة لم يسبق إليها. أما الفقه والكلام والعلوم الدينية فقد اشتهر نبوغه فيها، وبلغ صيته الآفاق، واعترف به الأعداء والأصدقاء.

مذهبه وطريقه: كان من أهل السنة والجماعة، حنفي المذهب، قادري الطريقة، بايع على يد الشيخ آل رسول المارهروي سنة١٢٩٤ﻫ ونال منه الإجازة والخلافة في السلاسل كلها وإجازة الحديث وغيره أيضا وكان شيخه من تلامذة الشيخ عبد العزيز المحدث الدهلوي صاحب تحفة الإثني عشرية، وغيرها من التصانيف العلية، كان شديد الاعتصام بالكتاب والسنّة وسلف الأمة، راسخ الإتباع للرسول الكريم عليه أفضل الصلاة والتسليم وللصحابة، والأئمة، قوي الحبّ بالغ الإجلال لهم، يثيره غضبا كل إساءة وإهانة تتعرض لحضراتهم، فما كان يبيح المداهنة في الدين، والمسالمة مع المبطلين، إلا أن يرتدعوا عن الأباطيل ويرجعوا إلى الحق المبين.

جهاده بالقلم: ردّ على النصارى، والهنادك، والرافضة، والقاديانية،

والوهابية، والديو بندية، والندو ية، والنياشرة وغيرها.وكلما ظهرت بدعة ردّ عليها حتى قال العلماء: إن كثيرا من المبطلين كان يمتنع من إعلان بدعته زمنا طو يلا مخافة من قلم الإمام أحمد رضا. وكذا كان شديد الإنكار على كل حرام ومنكر وسوء يظهر في المجتمع الإسلامي. وتصانيفه تزخر وتتدفق بالردّ على البدع والمنكرات التي راجت في عصره، أو ظهرت قبل زمانه.

والمبتدعة لما لم يتمكنوا من الرد عليه بحجة و دليل لجأوا إلى البهت والإفتراء فقالوا: إنه يسوّي الرسول بالرب الجليل، و يبيح السجود للصالحين أو لقبورهم، و يتصدّى للرد على كل حركة إصلاحية، وأسموا أهل السنة "بالبريلو ية" لينخدع من لا يعرف حقيقة الأحوال والظروف، و يظنّ أن هذه فرقة جديدة. والحق أن الإمام أحمد رضا لم يعدُ عمامضى عليه الصحابة والتابعون، ومن بعدهم من أئمة الدين قدر شبر، ولم يخرج عن الدين الحنيف، والمذهب الحنفي قدر شعير. لكن المبطلين يلوذون بالإفك والإختلاق. ومصنفات الإمام أحمد رضا اكبر شاهد على كذب دعاياتهم. ومن راجعها وقف على نزاهته من جميع الافتراءات، وحظي بكثير من إفادات وإفاضات، وبحوث رائعات، وعلوم رائقات.

قد أثنى عليه علماء عصره من الحرمين الشريفين، وأخذوا منه أسانيد الأحاديث، وقد جمع البروفيسور مسعود أحمد كثيرا من كلماتهم في كتابه "الفاضل البريلوي كما يراه علماء الحجاز".

ذكر بعض مصنفاته: قد كتب في نيف وخمسين فنا، وقال بعض الخبراء: "لم يكتب أحد ممن سبقه إلا في خمسة وثلاثين فنا" بلغت مؤلفاته ألفا، مابين صغير وكبير. وله يدطولى في الإيجاز، وجمع المعاني الكثيرة في مباني قليلة، وقد بسطت ذلك في مقدمتي على كتابه جد الممتار على رد المحتار (المجلد الثاني) مع إيراد الشواهد من نفس الكتاب. فرسائله القصيرة أيضا ذات مكانة عالية في البحث والكشف. كما سيرى القراء في مابين أيديهم من رسالته.وهنا أعدّ بعض تصانيفه ليعرف الناظرون مناحي خدماته ومآثر حياته.

(١) العطايا النبوية في الفتاوى الرضوية. في اثني عشر مجلدا، كل مجلد يتجاوز خمس مأة صفحة كبيرة، و يقارب ألف صفحة. (٢) جد الممتار على رد المحتار لابن عابدين الشامي. في خمسة أجزاء. وقد انتشر منها جزءان تحت إشراف المجمع الإسلامي بمبارك فور، أعظم جره، الهند. (٣) الصمصام على مشكك في آية علوم الأرحام- في الرد على النصارى. (٤) كيفر كردار آريه- في الرد على الهنادك (٥) السوء والعقاب على المسيح الكذاب- في الرد على القادياني (٦) وأصدر مجلة في الرد عليه باسم "قهر الديان على مرتدّ بقاديان" (٧) الجراز الدياني على المرتد القادياني (٨) ردّ الرفضة (٩) الأدلة الطاعنة في أذان الملاعنة- في الرد على الشيعة (١٠) فتاوى الحرمين برجف ندوة المين (١١) الدولة المكّية بالمادة الغيبة، في إثبات العلم بالغيب للأنبياء عليهم السلام (١٢) الفيوض الملكية لمحب الدولة المكية (١٣) إكمال الطامّة على شرك سُوّيَ بالأمور العامّة (١٤) الزبدة الزكية في تحريم سجود التحية- قدم فيها أربعين حديثًا ومأة وخمسين نصّا من كتب الفقه على حرمة سجود التعظيم لأحد من الخلق (١٥) جمل النور في نهي النساء عن القبور (١٦) مروج النجا لخروج النسا (١٧) جليّ الصوت لنهي الدعوة أمام موت (١٨) إعتقاد الأحباب في الجميل والمصطفى والآل والأصحاب (١٩) منير العين في تقبيل الإبهامين- إضافة إلى نفس المسألة يشتمل على بحوث نادرة، وتحقيقات رائعة في علم الحديث (٢٠) حياة الموات في بيان سماع الأموات.

وله حواش جليلة، وتعليقات أنيقة على كتب التفسير والحديث والفقه والسيرة وغيرها من العلوم والفنون، تمتاز حواشيه بأنها فيض خاطره، وما كان يفرغ لكتابتها كغيره من المحشين الذين إذا أرادوا كتابة حاشية على كتاب، جمعوا حولهم ذخائر من كتب وشروح وحواش، وأخذوا منها ونقلوا عنها ما أحبّوا حتى تتكون حاشية ضخمة، وهذا أيضا عمل نافع، له قدره بل كان العلامة أحمد رضا إذا طالع كتابا ورأى بحثا عو يصا، أوزللا من صاحب الكتاب، أومسئلة تحتاج إلى زيادة الكشف والإيضاح، أو موضعا اختلفت فيه الأفكار والأقلام كتب هناك جملا يسيرة تنحلّ بها

العقد، و يندفع الزلل، وتنكشف العلل، و يتجلى الحق الأبلج، وهذا فضل لا يحظى به كل من كتب الحواشي واشتهر بها.

وكان الشيخ يقرض الشعر أيضاً بالعربية والفارسية والأردية، وله ديوان شعري في مجلدين يسمى "حدائق بخشش" عني به أدباء الهند و باكستان وشعراءهما، وكتبوا حوله كثيرا من بحوث ومقالات،نقله بعض أفاضل الأزهر الشريف إلى العربية وسماه " بساتين الغفران" يحتوى على حمد الله تعالىٰ و مدح رسوله عليه الصلاة والسلام، ومناقب أولياءه ومثالب أعداءه، يزدان شعره بعواطف الحب والإجلال لله ولرسوله، و يملأ قلوب المنشدين والمستمعين حبّا وغراما، وإكراما وإعظاما.

وفاته: قد خدم الدين والعلوم والأمة طيلة حياته. عجز الباحثون عن الإحاطة بجوانب خدماته، ونوادر تحقيقاته وجلائل إفاداته. ولا يزال طبقة من المثقفين في الجامعات والكليات والمعاهد الكبيرة تكتب بحوثا ودراسات حول حياته ومآثره وصنائعه وخدماته. وانتقل الشيخ بعد قيامه بتلك الأعمال الباهرة إلى جوار ربه الأعلى في ٢٥/ من صفر المظفر سنة ١٣٤٠هـ المصادف ٢٨/ أكتوبر سنة ١٩٢١م يوم الجمعة المبارك.

خلفه نجله الأكبر الشيخ حامد رضا خان القادري (ت ١٣٦٢هـ) ثم نجله الأصغر الشيخ مصطفى رضا القادري المعروف بالمفتي الأعظم (ت ١٤٠٢هـ) احتذيا حذو أبيهما في خدمة الدين والعلم والقيام بالإفتاء، والإرشاد، والذبّ عن الأمة المسلمة. رحمهما الله تعالىٰ.

الكشف شافيا: كتب الشيخ سلامة الله الرامفوري رسالة باسم "اللؤلؤ المكنون في حكم كراموفون" وأرسلها إلى العلامة أحمد رضا البريلوي للتصديق. فكتب العلامة البريلوي رسالة مستقلة باسم "الكشف شافيا، حكمَ فونو جرافيا" (١٣٢٨هـ) بالأردية، وطبعت مع رسالة الأستاذ الرامفوري أول مرة. ثم أتاه ببريلى من مكة المكرمة **الشيخ السيد إسماعيل خليل** حافظ كتب الحرم المكى في السابع والعشرين من شهر المحرم سنة ألف وثلاث مأة وثلاثين، فترجم له الرسالة بالعربية،

وكان مبحث الكلام الإلٰهي في المقدمة الثانية بالأردية إلى عبارة ميزان الشريعة الكبرىٰ لكن المصنف أضاف إليها حين التعريب أبحاثا جليلة فاستحسن السيد **إسماعيل خليل** أن تجعل هذه رسالة مستقلة، فزاد المصنف في صدرها خطبة موجزة، ليجعلها من شاء رسالة مفرزة، وسماها بلحاظ التاريخ:

أنوار المنان في توحيد القرآن (١٣٣٠هـ)

كانت الرسالة في خزانة كتب المصنف رحمه الله تعالىٰ ثم انتقلت إلى أحد أحفاده الأستاذ **توصيف رضا القادري**، فأخذ منه **الحاج محمد سعيد النوري**، سكريتر رضا اكاديمي، ممبائي، وحصّلت منه صورة عكسية لها ثم راجعت إلى الأصل بعد النقل والتبييض، وهي الآن بين أيديكم كاملة. وقد أفرزنا "**أنوار المنان في توحيد القرآن**" وألحقناها **بالمعتمد المستند** بناء نجاة الأبد (١٣٢٠هـ) للإمام أحمد رضا القادري، شرح **المعتقد المنتقد** (١٢٧٠هـ) للعلامة **فضل الرسول البدايوني** (ت١٢٨٩هـ) رحمهما الله تعالىٰ. تعميما للنفع، وتتميما لمبحث الكلام المندرج في المتن والشرح المذكورين. والله الموفق لكل خير، والمانع عن كل ضير.

محمد أحمد المصباحي
عضو المجمع الإسلامي بمباركفور
والأستاذ بالجامعة الأشرفية- مباركفور
مديرية: أعظم جره. الولاية الشمالية. الهند
٢٨ محرم سنة ١٤١٨هـ / ٥ يونيو سنة ١٩٩٧م يوم الخميس

❁❁❁❁❁

تقدیم [1]

عام حالات یہ ہیں کہ "قدر نعمت بعد زوال" جب کسی شخصیت کی رحلت ہو جاتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ ان کا مقام بہت اہم اور خدمات بڑی وسیع تھیں، ان کے حالات و سوانح مرتب کرنا چاہیے۔ مگر زندگی میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ان کی خدمات، ان کے خطبات، حل اشکالات، اصلاح عبارات، علمی افادات، روابط و تعلقات، قیمتی نصائح و ملفوظات وغیرہ کا ریکارڈ رکھا جائے۔ اس کا شکوہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے بھی اپنے سفر حج کے تذکرے میں کیا ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ سبھی اکابر کے ساتھ ان کی زندگی میں ہمارا ایسا سلوک رہا۔ اور اب بھی ہم اسی روش کے پابند ہیں۔

بعد وصال سوانح و حالات لکھنے میں یہاں تک دشواری ہوتی ہے کہ تاریخ پیدائش، والدین اور خاندان، احباب و متعلقین، ابتدائی اساتذہ وغیر ہم کا بھی پوری طرح علم نہیں ہو پاتا۔ اور بھی بہت سے گوشے تاریک نظر آتے ہیں جن پر زندگی میں روشنی ڈالنا آسان تھا۔

میں نے اپنی اس خلش کا تذکرہ اپنے احباب و متعلقین سے بارہا کیا۔ پہلی بات کی طرف تو اب بھی باضابطہ کوئی توجہ نہیں مگر دوسری بات سے متعلق یہ پیش رفت سامنے آئی کہ چند سال قبل عرس حافظ ملت کے موقع پر "شارح بخاری" کی حیات و خدمات پر جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے طلبہ نے لائق تحسین مقالات لکھے اور علمائے کرام نے اپنے تاثرات بیان فرمائے۔

اب مولانا عبدالحق رضوی، الحاج محمد سعید نوری اور دیگر احباب کو خیال آیا کہ نزہۃ القاری شرح بخاری کی تکمیل پر باضابطہ جشن کا انعقاد ہو اور شرح بخاری و شارح بخاری سے متعلق علما و دانشوران اور دیگر اہل تعلق کو دعوت تحریر و سخن دی جائے تاکہ جو حالات آج محفوظ ہو سکتے ہیں کم از کم وہ ضائع نہ ہونے پائیں۔ بحمدہ تعالیٰ اس منصوبے کے تحت کام کا آغاز ہو گیا ہے۔

مبارک پور میں اس موضوع کی پہلی نشست میں راقم سطور نے یہ رائے پیش کی کہ ایک مختصر تعارف جشن سے پہلے مکمل ہو جانا چاہیے تاکہ جشن میں مدعو ہونے والے ناواقف حضرات بھی متعارف ہو کر شریک ہوں اور

(۱) شارح بخاری، از مولانا یٰسین اختر مصباحی، دائرۃ البرکات، کریم الدین پور، گھوسی، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء

کچھ تاثرات بھی پیش کر سکیں۔ اس تعارف کو عربی، انگریزی، ہندی، گجراتی میں بھی منتقل کر دیا جائے تو اس کی افادیت اور زیادہ ہو سکتی ہے۔ شرکائے نشست نے یہ رائے قبول کی۔ اور اس کے لیے برادر گرامی مولانا یٰسین اختر مصباحی کی خدمات حاصل کرنے میں کامیابی مل گئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلك.

دیگر زبانوں میں اسے منتقل کرنے کے لیے کوئی پیش رفت ابھی تک نہ ہو سکی جس کا ایک سبب یہ ہے کہ مسودہ تیار ہوتے ہی کمپیوٹر کے حوالہ ہو گیا۔ پھر پروف ریڈنگ اور نظر ثانی وغیرہ کے مرحلہ سے اس کو رخصت ہی نہیں مل رہی ہے کہ کسی اور ہاتھ میں جا سکے۔ مگر جانا چاہیے اور بہت جلد تاکہ یہ تعارف عام سے عام تر ہو سکے۔

اس تعارف کا تعارف میں کیا کراؤں۔ شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ کی عظمت و اہمیت اپنوں ہی نہیں غیروں کو بھی تسلیم ہے اور میں تو ان کے خوان علم کا ایک خوشہ چیں ٹھہرا۔ لیکن چند باتیں عرض کروں گا جو میں نے ان کی ذات میں خاص طور سے محسوس کیں۔

(۱) دینی و ملی غیرت و احساس ان میں معاصرین سے زیادہ دیکھتا ہوں۔ جب بھی اسلام و سنت یا اکابر دین و ملت پر کوئی حملہ آور ہوتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتے ہیں اور اس کے دفاع کے لیے اپنی ممکنہ تدبیر سے باز نہیں آتے۔

(۲) علم میں وہ رسوخ حاصل ہے کہ جب کسی خاص موضوع پر لکھنے یا بولنے پر آتے ہیں تو بہت جلد اس کے تمام گوشوں کا احاطہ و استحضار کر کے بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

(۳) فقہی جزئیات کا استحضار، حالات زمانہ پر نظر، سائلین کے فکر و مزاج سے آگاہی، بعض سائلوں کی چالاکی و عیاری سے باخبری اور دیگر لوازم سے آراستگی ایسی ہے کہ زمانہ دراز سے فتاویٰ کا برجستہ املا کراتے ہیں۔ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بہت ہی مناسب اور برمحل جواب دیا گیا ہے۔ جو کسی ماہر مفتی کا نتیجۂ قلم ہے یا کافی غور و خوض اور محنت و تیاری کا ثمرہ ہے۔

(۴) جماعت اور اداروں کے احوال پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اپنے طویل تجربات کی روشنی میں بڑی قیمتی رہنمائی اور لاجواب عقدہ کشائی سے نوازتے ہیں۔

(۵) اصلاح و تربیت کا بھی خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ اور اہل تعلق کو مناسب ہدایات و تنبیہ سے برابر بناتے سنوارتے رہتے ہیں۔

(۶) عرصۂ دراز تک تدریس، افتا، تبلیغ و تقریر کا جو وسیع تجربہ ہے اس میں انفرادیت کے ساتھ تحریر و تصنیف خصوصاً سرعت تحریر اور حسن تفہیم میں یکتائے زمانہ ہیں۔ مولا تعالیٰ ان کا سایہ دراز فرمائے۔

زیر نظر کتاب میں شارح بخاری کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجمالی طور پر سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ عنوانات کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس اختصار، جامعیت اور اثر آفرینی کے ساتھ ان موضوعات سے عہدہ برآ ہونا سب کے بس کی بات نہیں۔ پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے محض تقاضا نہیں اتارا ہے بلکہ عقیدت سے سرشار ہو کر بڑی امنگ کے ساتھ لکھا ہے۔ اکابر کے ساتھ اسی جذبۂ عقیدت کی ضرورت ہے جو اس زمانے میں کم یاب ہوتا جارہا ہے۔

نمونۂ فتاوی اور نمونۂ مضامین کا اضافہ بھی بہت خوب ہے۔ اس کا نقد فائدہ یہ ہے کہ قاری ان تحریروں کے ذریعہ شارح بخاری کی شخصیت سے براہ راست متعارف ہو سکتا ہے۔ ان کے علمی و فکری مقام، دینی جذبات اور قلمی اسلوب سے آشنا ہو کر علی وجہ البصیرۃ خود بھی ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتا ہے۔ تصانیف پر تبصرہ بھی بہت جامع اور دل چسپ ہے۔

اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے زیادہ دیر تک حائل رہنا مناسب نہیں، ورق الٹیے اور خود دیکھیے:

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

محمد احمد مصباحی
المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارک پور
۱۰ ربیع الآخر ۱۴۲۰ھ/ ۲۴ جولائی ۱۹۹۹ء

❁❁❁❁❁

ہدایات برائے طلبہ(۱)

(۱) دیے گیے الفاظ پر ہی اکتفا کریں بلکہ اس سے صرف انداز بیان سیکھیں اور شخصیت و موقع کی مناسبت سے اچھے القاب و کلمات خود بنالیں۔

(۲) اگر یاد کرنا ضروری ہو تو اپنی طبیعت کے مطابق اشعار اور جملوں کو منتخب فرمالیں مگر مناسب موقع پر ہی استعمال کریں۔

(۳) وقت کم ہو، افراد زیادہ ہوں تو جامع اور مختصر تعارف سے کام لیں خصوصاً بارہ، ایک بجے شب میں زیادہ سے زیادہ اختصار ملحوظ رکھیں۔

(۴) تعریفات والقاب میں اس بات کا خصوصی خیال رکھیں کہ جیسی شخصیت ہو ویسی ہی تعریف و توصیف ہو۔

(۵) کتاب میں بعض القاب و تعارف بہت اہم اور بزرگ شخصیات ہی کو مد نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ ان لوگوں کے لیے آپ استعمال کر ڈالیں جن پر منطبق نہ ہوں اور تضحیک کا سبب بن جائیں۔

(۶) حتی الامکان ایسی کوئی بات نہ بولیں جو شخصیت یا تقریر سے میل نہ کھائے اور مدح کے بجائے ذم کے درجے میں قرار پائے۔ کہا گیا ہے: مَنْ مَدَحَكَ بِمَا لَيسَ فِيْكَ فَقَدْ ذَمَّكَ.

ترجمہ: جس نے تیری تعریف ایسی چیز سے کی جو تجھ میں نہیں ہے تو بلا شبہہ اس نے تیری مذمت کی۔

(۷) جلسہ کی کاروائی دیے گئے وقت کے مطابق جلد سے جلد شروع کریں اور "آئیے تشریف لائیے" جیسے جملوں کی تکرار میں وقت برباد نہ کریں۔

سامعین اس کے منتظر رہتے ہیں کہ جلسہ شروع ہو جائے یا خصوصی نعت خواں یا مقرر کی باری آجائے تو چلیں۔ اس لیے آپ سامعین کا انتظار کرنے کے بجائے تلاوت قرآن پاک اور حمد و نعت سے فوراً آغاز کرادیں اور خصوصی مقرر و نعت خواں حضرات کو سامعین تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش کریں۔ اسی میں وقت کا تحفظ ہے اور جلسے کی کامیابی بھی۔

(۸) اس بات کی بھرپور کوشش ہو کہ مناسب وقت پر جلسہ کا آغاز و اختتام ہو اور نماز با جماعت کی ادائگی

(۱) رہنمائے نظامت، مولانا محمد شبیر عالم مصباحی

میں کوئی خلل ہرگز نہ ہو۔

زیر نظر کتاب کے بعض صفحات میں نے دیکھے۔ اس میں مولانا محمد شبیر عالم مصباحی نے نظامت اجلاس کے انداز اور طریق کار سے روشناس کرانے کی پوری کوشش کی ہے۔ خدا کرے ان کی یہ کاوش بار آور ہو اور طلبہ اس سے بخوبی استفادہ کر کے اس فن میں بھی کامیابی حاصل کریں۔ وهو المستعان و عليه التكلان.

محمد احمد مصباحی
۱۸ر صفر ۱۴۲۱ھ / ۲۳ر مئی ۲۰۰۰ء

❁❁❁❁❁❁

تاثر گرامی[1]

باسمہ تعالیٰ و تقدس..... حامداً و مصلیاً

حضرت مولانا سید سعادت علی قادری مدظلہ سے میرا غائبانہ تعارف ہے۔ قدرت نے انھیں ایک دردمند دل عطا فرمایا ہے جو امت مسلمہ کی خیر و فلاح کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ اپنے دعوتی و اصلاحی مزاج کے پیش نظر موصوف نے متعدد کتابیں لکھی ہیں اور برابر لکھ رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی ان کے دعوتی مزاج کی آئینہ دار ہے، جن آیات کریمہ میں **"یاایھاالذین امنوا"** فرما کر خطاب آیا ہے یہ ان کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ یقیناً رب تعالیٰ نے اپنے ایمان دار بندوں کو جن ہدایات و تعلیمات سے نوازا ہے وہ بہت اہم ہیں اور صدقِ ایمان کا تقاضا ہے کہ ان پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ عمل سے پہلے علم ضروری ہے، اس لیے ان ہدایات کی توضیح و تشریح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مولانا نے قلم اٹھایا اور معارف کا ایک موج زن سمندر یا احکام و اسرار کا ایک گنج گراں مایہ صفحات قرطاس پر رکھ دیا۔ میں نے جستہ جستہ کچھ اوراق دیکھے اور موصوف کے ناصحانہ، واعظانہ اور دل نشیں اسلوب اور تفہیمی جد و جہد سے متاثر ہوا۔ ایسی جلیل الشان قلمی و فکری کاوش مجھ سے جیسے بے مایہ و گمنام انسان کی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ صرف تعمیل حکم کے تحت چند سطور لکھ دیں۔ خدا کرے یہ لوگوں کے لیے ذریعۂ ہدایت و نجات ثابت ہو اور مقبول خدا و رسول و مقبول خواص و عوام ہو۔

محمد احمد مصباحی
[استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور]
۹ر ربیع النور ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۳ر جون ۲۰۰۰ء، سہ شنبہ

(۱) یاایھاالذین آمنوا، حضرت مولانا سید سعادت علی قادری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، دسمبر ۲۰۰۳ء

تقریظ جلیل (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی حبیبہ الکریم

حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی استاذ ادب جامعہ اشرفیہ مبارک پور کی کتاب "اصولِ حدیث" نظر سے گزری، اس کتاب میں انھوں نے اصول حدیث بہت عمدہ پیرایے میں بیان کیے ہیں، اس کی اصل زمین انھوں نے مقدمۂ شیخ محقق مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کو بنایا، بلکہ ابتداءً اسی کے ترجمے پر اکتفا کا ارادہ کیا، مگر بعد میں دیگر کتب اصول سے استفادہ کرتے ہوئے کافی معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا۔

یہ کتاب درجۂ مولوی و عالم کے علاوہ فاضل کے طلبہ کے لیے بھی کارآمد ہے اور حدیث کا مطالعہ کرنے والے عام طلبہ و قارئین کے لیے بھی بہت نفع بخش ہے۔

اسے زیادہ جامع، نہایت مفید اور عام فہم بنانے کے لیے مولانا نے کافی تلاش وجستجو اور محنت ومشقت سے کام لیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس دینی وعلمی خدمت کو قبول فرمائے اور اسے نافع خاص وعام اور مقبول انام بنائے۔

محمد احمد مصباحی
صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارک پور
۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ/۲۱ر جولائی ۲۰۰۲ء
شب دوشنبہ

(۱) اصول حدیث، مولانا نفیس احمد مصباحی، المجمع القادری مبارک پور، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء

تقریظ جلیل (۱)

مبسملاً وحامدًا ومصلیاً

یہ پروپیگنڈے کا دور ہے۔ جس کے بل پر سچ کو چھپانے اور جھوٹ کو باور کرانے کا کاروبار بڑے منظم پیمانے پر ہو رہا ہے۔ امریکہ سے لے کر انڈیا تک اس میدان میں باطل پرستوں کی ٹولیاں اپنے اپنے حلقۂ ابلاغ کے لحاظ سے پیش پیش نظر آئیں گی۔ اور زیادہ تر جھوٹے اور باطل حربوں کی استادی کا سہرا کسی ستم پیشہ یہودی یا فرنگی کے سر ہوتا ہے جس سے روحانی ولادینی تعلق رکھنے والے سیکھ سیکھ کر اسی ڈگر پر چلنے کی پیہم کوشش میں مبتلا رہتے ہیں۔

ان ہی پروپیگنڈوں میں سے اہل باطل کا ایک پروپیگنڈہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کا کام بریلی کی سرزمین سے مولانا احمد رضا بریلوی کے ہاتھوں شروع ہوا۔ اس جھوٹ کی اشاعت اس قدر کی گئی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بہت سے سادہ لوح لوگوں نے اسے سچ مان لیا ہے۔ ان کے پاس نہ اپنی ذاتی تحقیق ہے نہ اس کی فرصت۔ مگر اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو اور ہر انصاف پسند کو یہ معلوم ہوگا کہ حقیقت کیا ہے؟

اس میں ناقابل تردید دلائل وشواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں شیعہ وسنی کا اختلاف تو پرانا ہے اور سنیوں میں جو تفریق ہوئی ہے وہ بریلی سے نہیں بلکہ دہلی سے ہوئی ہے۔ یہاں کے اور دیگر ممالک کے اہل سنت ایک تھے۔ نجد میں کتاب التوحید اور ہند میں تقویۃ الایمان کے ذریعہ وہابی پھر اس کی شاخ دیوبندی کے نام سے ایک فرقہ جنم دیا گیا جو اپنے یوم پیدائش سے لے کر آج تک قدیم مسلک اہل سنت کے حامیوں سے برسرپیکار ہے۔ جھوٹ اور فریب کا ایسا دلدادہ اور عادی ہے کہ خدا کو بھی بالامکان جھوٹا اور عیب دار مانتا ہے۔

عزیز گرامی مولانا مبارک حسین مصباحی کو رب تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے کہ انھوں نے اس طرح کے مکروفریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے مبسوط مقالات لکھے جن میں بعض جستہ جستہ میں نے بھی دیکھے۔ آج جہاد بالسیف تو ناپید ہی ہے جہاد بالقلم بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ إذا ظهرت الفتن. أو البدع. ولم يظهر العالم علمه فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين. أو كما قال ﷺ. جب فتنے اور گمراہیاں ظاہر ہوں اور عالم اپنا علم چھپائے رکھے تو اس پر اللہ اور فرشتوں اور انسانوں

(۱) برصغیر میں افتراق بین المسلمین کے اسباب، مولانا مبارک حسین مصباحی، المجمع المصباحی، مبارک پور، دسمبر ۲۰۰۱ء

سب کی لعنت ہے۔ اور فرمایا: لأن يهدى الله بك رجلا خير مما طلعت عليه الشمس. تمھارے ذریعہ کسی ایک شخص کو ہدایت نصیب ہوجائے تو یہ تمھارے لیے روے زمین کی حکومت سے بہتر ہے۔

مولا تعالیٰ اس کتاب کو دافع فتن اور ہادی راہ سنن بنائے۔ مصنف کے علم وقلم اور ارشاد وعمل میں برکتیں نصیب فرمائے اور صحت وقوت اور عافیت کے ساتھ خدمت دین متین سے ہمیشہ وابستہ وسرفراز رکھے۔

اس کتاب پر برادر گرامی مولانا لیسین اختر مصباحی نے ایک عالمانہ اور وقیع مقدمہ تحریر فرمایا ہے جس کے بعد میری خامہ فرسائی کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر مولانا مبارک حسین کے مسلسل اصرار پر یہ چند سطور لکھنی پڑیں۔ مولیٰ تعالیٰ ہم سب کو توفیق خیر سے نوازے۔ اپنی اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی رضا وخوشنودی کے کاموں میں لگائے اور ہر طرح کے شرور وفتن سے محفوظ ومامون رکھے۔

محمد احمد مصباحی

۱۳؍رجب ۱۴۲۳ھ/۲۱؍ستمبر ۲۰۰۲ء

❁❁❁❁❁❁

پیغام(۱)

مبسملاً وحامداً ومصلیاً

حضرت احسن العلما سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں قدس سرہ کے وصال کے چند ماہ بعد ہی ان کے خلیفہ شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ نے یہ پروگرام بنایا کہ ماہ نامہ اشرفیہ کا "سیدین نمبر" شائع کیا جائے جس میں سید العلما حضرت مولانا سید شاہ آل مصطفیٰ قدس سرہ اور ان کے برادر خرد حضرت احسن العلما قدس سرہ کے حالات وسوانح پیش کیے جائیں۔

اس منصوبے کے مطابق کام کا آغاز ہوگیا۔ حضرت مفتی صاحب نے خود بھی مبسوط مضمون لکھا اور دیگر بزرگوں اور اہل قلم سے رابطے کے لیے مدیر اشرفیہ مولانا مبارک حسین مصباحی کو مامور کردیا۔ بہت سے مضامین یکجا ہوگئے۔ مگر حضرت مفتی صاحب کی رحلت کے بعد اس کام میں تعطل آگیا اور پہلے بھی کچھ خاص مضامین کے انتظار میں دیر ہوئی۔ شخصیات کی حیات میں ان کے سوانحی نقوش جمع کرنے میں بے توجہی ایک عام روش ہے جس کا خمیازہ بعد میں بھگتنا پڑتا ہے کہ جو معلومات وحالات زندگی میں بآسانی فراہم ہوسکتے تھے بعد میں برسوں تلاش وجستجو کے بعد بھی کما حقہ دستیاب نہیں ہوتے۔ اس صورت حال سے ہمارے "سیدین" علیہما الرحمہ کی شخصیتیں بھی مستثنیٰ نہیں۔ اس لیے جو کچھ جمع ہوسکا ہے اس میں بھی مدیر موصوف کو کیا کچھ زحمتیں اٹھانی پڑی ہوں گی ان کی تفصیل وہی بتاسکتے ہیں۔

رب کریم حضرت شارح بخاری کے درجات بلند فرمائے، مولانا مبارک حسین مصباحی کو جزاے خیر سے نوازے، خانوادۂ برکات کے بزرگوں اور احباب ومتوسلین کا سایۂ کرم دراز فرمائے کہ بھی حضرات کی توجہات اور مساعی جمیلہ سے یہ وقیع اور شاندار نمبر منظر عام پر آرہا ہے۔ امید ہے کہ مدتوں اس سے استفادہ ہوتا رہے گا۔

میں پشیمان اور شرمندہ ہوں کہ اس نمبر کے لیے کئی جہت سے مجھے حصہ لینا چاہیے تھا مگر افکار ومشاغل کے ہجوم نے یہ حالت بنادی ہے کہ مدیر گرامی کے اصرار پر بہت شرمندگی اور افسوس کے ساتھ چند بے ترتیب سطروں پر قناعت کی نوبت آگئی۔ جو لوگ قریب سے دیکھنے والے ہیں وہ میری مجبوریوں کو اچھی طرح جانتے

(۱) ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور، سیدین نمبر، اکتوبر ۲۰۰۲ء

ہیں۔ رب تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور توفیق خیر سے نوازے۔

اخیر میں مدیر اشرفیہ، جملہ اہل قلم اور تمام معاونین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ان کی کاوشوں کے صدقے ہمیں اور بہت سے متوسلین ومحبین کو اپنی دو عظیم شخصیتوں سے بڑی حد تک روشناس ہونے کا موقع فراہم ہو رہا ہے۔ یہ بھی عرض ہے کہ یہ نمبر کوئی حرفِ آخر نہیں ہے۔ اہل عقیدت اور اہل ہمت کے لیے عمل کی دنیا کشادہ ہے۔ مزید کاوشیں بہت سے تشنہ گوشوں کو سیراب کر سکتی ہیں۔ واللہ الموفق لکل خیر.

محمد احمد مصباحی

خادم الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

۱۳؍ رجب ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۱؍ ستمبر ۲۰۰۲ء

❁❁❁❁❁❁

تقریب(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
حامداً و مصلیاً

قرآن مقدس نے جہاں شرک سے دوری اور توحید پر استقامت کی دعوت دی وہیں رسالت کے اقرار اور انبیا ورسل کی تعظیم وتوقیر کا بھی حکم دیا اور سید الانبیاء علیہ وعلیہم التحیۃ والثنا سے متعلق تو قرآن کریم میں نہایت روشن ارشادات موجود ہیں جن میں ان کی تعظیم کی تاکید کی گئی ہے اور توہین پر صاف کافر قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو درج ذیل آیت کریمہ کی تفسیر:

قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ. لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ. (۲)

تم فرماؤ، کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنستے ہو، بہانے نہ بناؤ، تم کافر ہو چکے مسلمان ہو کر۔ (۳)

جملہ صحابہ کرام اور بعد کے ائمہ اسلام ہمیشہ خدا کی توحید کے ساتھ رسول کی تعظیم پر بھی کار بند رہے مگر بارہویں صدی ہجری کے اخیر میں نجد سے اور تیرہویں صدی کی چوتھی دہائی میں دہلی سے ایک نیا مذہب اٹھا جس میں توحید کی آڑ لیتے ہوئے تعظیم رسول کو شرک قرار دیا گیا اور یہ ذہن بنایا گیا کہ ”صرف خدا کو مانو اور کسی کو نہ مانو“ اس کے نتیجے میں ہر ایسا کام نگاہوں میں کھٹکنے لگا جس میں رسولِ اکرم ﷺ یا انبیا و اولیا کی تعظیم نظر آتی اسے روکنے اور اسے توحید کے منافی ٹھہرانے کی سرگرم کوشش شروع ہو گئی، اسی لیے محفلِ میلاد اور قیام تعظیمی کو بھی ناروا قرار دیا گیا اور اسے کنہیا کا جنم منانے سے تشبیہ دی گئی، علم رسول کو جانوروں، پاگلوں جیسا کہا گیا، علم شیطان کو زیادہ، علم رسول کو کم بتایا گیا، ختم نبوت میں سرکار کی انفرادیت ختم کرنے کے لیے خاتم النبیین کے نئے معنی گڑھے گئے اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی نئے نبی کا آنا ممکن کہا گیا۔ اس ماحول میں مرزائے قادیان نے آگے بڑھ کر اپنی نبوت کا دعوی بھی کر ڈالا اور اپنے متبعین کا ایک گروہ بھی بنالیا۔ علمائے حق نے ان فتنوں کا ان کے اٹھنے کے ساتھ ہی مقابلہ کیا۔ اور مسلمانوں کا دین وایمان بچانے کی خاطر ہر طرح جدوجہد کی۔ اعلیٰ

(۱) الصوارم الہندیہ، مولانا حشمت علی لکھنوی، طلبہ درجہ سابعہ، جامعہ اشرفیہ، ۲۰۰۴ء

(۲) پ: ۱۰، ع: ۱٤

(۳) کنز الایمان

حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے بھی ان فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے شرعی احکام واضح کیے جو ۱۳۲۰ھ میں المستند المعتمد کے اندر شائع ہوئے۔ وہ ۱۳۲۴ھ میں علماے حرمین کے سامنے پیش ہوئے، انھوں نے بھی اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے فتاویٰ کی تصدیق و تائید کی۔ ان کی تصدیقات کا مجموعہ حسام الحرمین علیٰ منحر الکفر و المین کے نام سے اسی دور میں منظر عام پر آیا۔ پھر شیر بیشہ اہل سنت مولانا حشمت علی قادری لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے حسام الحرمین پر برصغیر کے ڈھائی سو سے زیادہ علما کی تصدیقات جمع کر کے الصوارم الہندیہ کے نام سے آج سے اسی (۸۰) سال قبل ۱۳۴۵ھ میں شائع کیں۔ پھر اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ لیکن اِدھر تقریباً بیس سال کے اندر ہندوستان میں اس کا کوئی نیا ایڈیشن نہ آسکا۔

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے درجہ سادسہ ۱۴۲۵ھ کے طلبہ کی کوششوں سے اب اس کی نئی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ مولا تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے اور مزید دینی، علمی، قلمی، لسانی خدمات کی توفیق جلیل مرحمت فرمائے اور دارین کی سعادتوں سے سرفراز رکھے۔ وھو المستعان وعلیہ التکلان. وصلی اللہ تعالیٰ و بارك وسلم علیٰ حبیبه الأفضل الأکرم وعلیٰ آله وصحبه أولی الفضل والفیض والجود والعطاء والکرم.

محمد احمد مصباحی
صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ، ۱۸ر جولائی ۲۰۰۴ء

❁❁❁❁❁❁

تقدیم[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے حافظ ملت پر پہلا مضمون حضرت بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مدظلہ کے قلم سے غالباً ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا جس کی تقریب یہ تھی کہ ماہ نامہ پاسبان الہ آباد کے لیے معارف حدیث کے عنوان سے حافظ ملت ایک مستقل مضمون پابندی سے لکھا کرتے تھے۔ مدیر پاسبان مولانا مشتاق احمد نظامی کا ارادہ ہوا کہ ان مضامین کو یکجا کتابی شکل میں مکتبہ پاسبان سے شائع کر دیا جائے۔ اس خیال کی تکمیل کرتے ہوئے انھوں نے معارف حدیث کو یکجا کیا، خود اس پر پیش لفظ لکھا اور مقدمہ و تعارف مصنف، حضرت بحر العلوم نے تحریر فرمایا۔ وہ اس کے لیے زیادہ موزوں بھی تھے۔ حضرت نظامی صاحب نے مجاہد ملت علیہ الرحمہ پر بھی ایک مضمون ان کی حیات میں خود لکھ کر پاسبان میں شائع کیا تھا۔ ان کا یہ اقدام ان حضرات کے تصور سے آگے تھا جو مسلم بزرگوں اور پیشواؤں سے متعلق بھی ان کی حیات میں قلم اٹھانے کا قصد نہیں کرتے، جب کہ زندگی ہی میں ان کا تعارف عام ہو تو بہت سے ناواقفوں کے لیے ان کی دید و شنید اور استفادہ و استفاضہ کی راہ کھل سکتی ہے۔ اور معمولی واقفیت رکھنے والوں کو بھی ان کی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

حافظ ملت علیہ الرحمہ کی حیات میں ان کی ایک منقبت ۱۹۷۱ء میں سنی جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی نے فارسی میں لکھی اور ایک طالب علم امان اللہ بلیاوی نے انجمن اہل سنت اشرفی دار المطالعہ مبارک پور کے جلسۂ عید میلاد النبی ﷺ میں حافظ ملت کی موجودگی میں پڑھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا جس میں مختلف دیار و امصار سے طالبان علم کو یکجا کرنے پھر انھیں علم و فن سے آراستہ کر کے مختلف اکناف و اطراف میں خدمت دین کے لیے بھیجنے کی طرف شاید اشارہ بھی ہے۔

اول اول جمع کردی بوئے بے ترتیب را
آخر آخر آں شمیمے را پریشاں کردہ ای

[1] حیات حافظ ملت، مولانا بدر القادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور، مئی ۲۰۰۸ء

حضرت کی زندگی میں اس نظم کی اشاعت نہ ہو سکی، بعد وصال ''اوراق گل'' مرتبہ مولانا اسلم بستوی میں کچھ حذف واضافہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

پھر مولانا بدر القادری نے ایک لمبی نظم لکھی اور مئی ۱۹۷۲ء میں تعلیمی کانفرنس کے موقع پر شائع کی اور کانفرنس میں خود پڑھ کر سنائی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

یہ کون اٹھا ہند شمالی کی زمیں سے
علم اور حقائق کی سنبھالے ہوئے قندیل
سدرہ کے مکینوں سے سنا بدر نے اک راز
ہونے کو ہے اب آرزوے شوق کی تکمیل
ایثار کی پاپوش ہے اخلاص کا جامہ
بے نفسیِ کردار کا ہاتھوں میں عصا ہے
تابندہ جبیں پر یہ تقدس کی لکیریں
کہتی ہے صداقت کہ کوئی مرد خدا ہے
جلوت ہے تو ہے گرم کوئی مسند ارشاد
خلوت ہے تو انوار حقیقت میں نہاں ہے
پنہاں ہے خموشی میں تکلم کی حلاوت
گفتار کے ہر بول میں حکمت کا جہاں ہے
قانون حکومت ہو کہ دستور زمانہ
مذہب کا مخالف ہو تو مومن نہیں پابند
اس دور میں کس مرد مجاہد نے کیا فاش
اوہام سے آزاد ہے مذہب کا گلوبند

فروری ۱۹۷۶ء سے مولانا بدر القادری کی ادارت میں ماہنامہ اشرفیہ کا آغاز ہوا۔ اسی دوران یا چند ماہ پہلے مولانا بدر القادری اور وکیل عبد الاول مبارک پوری نے مل کر کچھ سوالات مرتب کیے اور حافظ ملت سے تحریری طور پر انٹرویو لیا جس سے خاص اور اہم حالات وخیالات قید تحریر میں آگئے مگر حضرت کی حیات میں اس انٹرویو کی اشاعت نہ ہو سکی۔ ۱۳۱ر مئی ۱۹۷۶ء کو شب میں بارہ بجنے سے کچھ پہلے حافظ ملت کا وصال ہوا۔ ۲ر جون بدھ کو صبح ساڑھے

آٹھ بجے جنازہ ہوا۔ ماہ جون ۱۹۷۶ء کے شمارۂ اشرفیہ میں حافظ ملت کی رحلت اور تجہیز وتکفین کی خبروں کے ساتھ علما و مشائخ کے تاثرات شائع ہوئے پھر یہ سلسلہ مراثی اور تعزیتوں کی شکل میں ایک سال سے زیادہ جاری رہا۔

۱۲ر ۱۳ر رجب ۱۳۹۶ھ کی تاریخیں عرس چہلم کے لیے طے ہوئیں اس موقع سے مولانا محمد احمد مصباحی مرحوم ابن بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی مد ظلہ نے حافظ ملت کی شخصیت، حالات، سفر آخرت، تعزیتی کلمات، وغیرہ پر مشتمل تقریباً سوا سو صفحات میں ایک مختصر کتاب بنام ''حافظ ملت'' شائع کی۔ مختصر مدت میں انھوں نے ایک عمدہ کوشش کی اور بر وقت اشاعت فرمائی۔

دوسری طرف مدیر اشرفیہ مولانا بدر القادری نے حافظ ملت نمبر کا منصوبہ بنایا اور اس کے مضامین کے لیے اہل تعلق اور اہل قلم سے مراسلت شروع کر دی۔ ان کی بر وقت بیداری سے حافظ ملت کے بزرگوں میں سے حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کے تاثرات بالواسطہ اور حضرت برہان ملت مولانا برہان الحق جبل پوری خلیفہ امام احمد رضا علیہما الرحمہ اور حافظ ملت کے ایک استاذ مولانا عبد العزیز خان فتح پوری علیہ الرحمہ کے تاثرات بلا واسطہ موصول ہو گئے۔ حافظ ملت کے رفقائے درس اور متعدد تلامذۂ صدر الشریعہ کے گراں قدر مضامین یا تاثرات بھی دست یاب ہو گئے۔ حافظ ملت کے ابتدائی دور کے معمر تلامذہ نے بھی اپنی اپنی تحریریں بھیجیں اور جوانوں اور ادھیڑ عمر والوں نے زیادہ ذوق وشوق سے حیات حافظ ملت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور قبل اس کے کہ بہت سے مراجع دنیا سے رخصت ہوتے یا بہت سی یادیں دست نسیاں کے تصرف سے محو ہوتیں، ایک معتمد اور ضخیم سرمایہ ۱۹۷۸ء تک محفوظ ہو گیا اور عمدہ ترتیب اور تزئین کے ساتھ تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ماہنامہ اشرفیہ کے حافظ ملت نمبر کی شکل میں منظر عام پر آگیا۔ زیادہ ضخامت کی وجہ سے غالباً ڈیڑھ سو صفحات کے مضامین محروم اشاعت رہ گئے۔ انھیں میں تقریباً پچاس تلامذۂ حافظ ملت کے حالات بھی تھے جو عزیز گرامی مولانا علاء المصطفیٰ قادری نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں علما سے زبانی وقلمی طور پر رابطہ کر کے بڑی محنت سے جمع کیے تھے بعد میں کہیں ان کی اشاعت نہ ہو سکی۔ حافظ ملت کے پڑوسی اور اشرفیہ کے خازن حاجی محمد حسین عزیزی مبارک پوری نے اپنی کچھ یادیں اپنی زبان میں لکھ رکھی تھیں جو کسی صاحب علم کی نظر ثانی اور ترتیب کے بعد ایک کتابچہ کی شکل میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ مرحوم مولانا غلام مصطفیٰ امجدی بلیاوی نے غالباً ۱۹۷۷ء میں اپنی کتاب فیضان حافظ ملت کلکتہ سے شائع کی۔

مولانا مبارک حسین رام پوری کو اپنی فراغت کے بعد ۱۹۹۰ء میں حافظ ملت کی شخصیت پر کام کرنے کا شوق ہوا اور ادارۂ تحقیقات حافظ ملت کی بنا ڈالی۔ اس کے تحت بہت سے اہل علم سے رابطہ کر کے کچھ مضامین حاصل

کیے، ایک مختصر سیمینار بھی کیا، اس طرح دو مجموعے معرض وجود میں آئے۔ (۱) حافظ ملت افکار و کارنامے۔ (۲) انوار حافظ ملت نمبر۔ پھر یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

حافظ ملت نمبر اور دیگر مجموعوں میں حافظ ملت کے حکیمانہ اقوال دیکھنے اور بزرگوں سے سننے کے بعد مولانا اختر حسین اعظمی فیضی مصباحی کو "ملفوظات حافظ ملت" ترتیب دینے کا خیال آیا۔ اس کے لیے انھوں نے کافی محنت و جستجو کی۔ مولانا عبد المبین نعمانی کی کچھ قلمی یادداشتیں بھی انھیں حاصل ہوگئیں۔ پھر ان ملفوظات کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا۔ ایک عنوان حیات اور خانگی حالات کا بھی رکھا جس کے تحت ولادت، نشو و نما وغیرہ کا ذکر حضرت کے انٹرویو وغیرہ سے لے کر جمع کیا ہے مگر سال ولادت ۱۸۹۴ء کے مطابق ہجری سال ۱۳۱۴ نہیں بلکہ ۱۳۱۲ ہے اس کی تصحیح ہوجانی چاہیے، پہلی بار ملفوظات حافظ ملت کی اشاعت ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔

اس کے بعد مولانا عبد المبین نعمانی کی تحریک پر مولانا محمد اسلم عزیزی گورکھپوری نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعہ بنام معارف حافظ ملت مرتب کرکے ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔ یہ کام انھوں نے بہت دیر میں کیا اس لیے دو تین جگہ مجھے سہو کا گمان ہوتا ہے۔

ان دونوں کتابوں کی اشاعت بلکہ منصوبے سے بھی پہلے میں وہ مسودہ پڑھ چکا تھا جو مولانا بدر القادری نے مفصل حیات حافظ ملت کے سلسلے میں مرتب کیا تھا اور بطور یاد داشت یہ بھی لکھ رکھا تھا کہ فلاں فلاں ابواب یا عنوانات کا اور فلاں عنوانات کے تحت واقعات کا اضافہ کرنا ہے، میرے اندازے کے مطابق وہ مسودہ ۳۰×۲۰ کے کم از کم تین سو صفحات پر مشتمل تھا۔ نظر ثانی کے بعد میں نے بھی مزید عنوانات اور حالات و واقعات کے اضافے کا مشورہ دیا اس کے لیے برادر موصوف نے بہت سے وابستگان بارگاہ سے ذاتی طور پر رابطہ قائم کیا۔ ماہناموں میں اعلانات بھی شائع کیے مگر اس زمانے میں اہل خیر سے مالی تعاون ملنا تو آسان ہے لیکن اہل علم سے قلمی تعاون ملنا بہت مشکل ہے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جتنے ذمے دار اور باصلاحیت قسم کے لوگ ہیں ان کے اوپر ان کے وقت، ان کی صحت، قوت اور گنجائش سے زیادہ بوجھ لدا ہوا ہے یا کوئی دوسرا بار اٹھانے والا نہ دیکھ کر خود اپنے اوپر لاد رکھا ہے۔ ان حالات میں اگر ان سے تھوڑا بار اور اٹھانے کی فرمائش کی جاتی ہے تو یہ تقریباً تکلیف مالا یطاق کے درجے میں پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے اکثر محرومی ہی ہاتھ آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے اس کا سبب تحریر کی ممارست اور سرعت کی کمی یا یک سوئی اور دل جمعی کا فقدان ہو۔ بہر حال قلمی تعاون کا حصول بڑا مشکل مسئلہ ہے۔

حالات و سوانح کے باب میں ایک کمی برابر دیکھنے میں آ رہی ہے وہ یہ کہ ہمارے بزرگوں کے بہت سے احوال معتبر عوام سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں، جن مقامات میں ایک بار یا چند بار بزرگوں کی آمد و رفت رہی ہو

وہاں پہنچ کر لوگوں سے ملاقات کی جائے۔ حالات دریافت کیے جائیں اور جو کچھ ملے ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جائے، کچھ قلمی اشارات بھی بنا لیے جائیں۔ اس طرح ایک بڑا سرمایہ جمع ہو کر مرتب ہو سکتا ہے مگر یہ کام نہ مفتی اعظم قدس سرہ کے لیے ہو سکا نہ حافظ ملت علیہ الرحمۃ کے لیے اور مجاہد ملت علیہ الرحمۃ سے متعلق تو شاید خواص کا خزانہ بھی اب تک زیادہ تر محفوظ ہی ہے مگر نسیان ایک ایسا پرندہ ہے جو اچھے اچھے محفوظ خزانے بھی بہت جلد اچک لیتا ہے۔ اس لیے بس خدا ہی حافظ ہے۔

معتبر عوام سے ملاقات کرکے حالات جمع کرنے کا خیال جتنی آسانی سے میں نے لکھ دیا ہے اور بار بار ذمہ دار لوگوں سے زبانی بھی کہا اس پر عمل اتنا آسان نہیں۔ ضروری ہے کہ دو تین دیدہ ور افراد کو اس کے لیے خالی کیا جائے اور ان کے جملہ مصارف کا بار اٹھایا جائے۔ اہل تعلق کی نشان دہی کی جائے انھیں خطوط بھی لکھ دیے جائیں کہ ہمارے فلاں حضرات کسی وقت اس کام کے لیے پہنچیں گے، ان سے رابطہ رکھیں اور انھیں معلومات بہم پہنچائیں یا اس راہ میں ان کا تعاون کریں، مختلف اسفار اور ملاقاتیں اگر تسلسل کے ساتھ جاری رہیں تو بھی سال دو سال کا عرصہ لگ سکتا ہے اسی دوران اگر یادداشتیں ٹیپ ریکارڈ سے قلم بند بھی ہوتی رہیں تو بہت خوب ورنہ بعد میں ایک عرصہ اس میں بھی صرف کرکے تکمیل کریں، پھر ترتیب و تدوین اور نظر ثانی ہو تب جا کر وہ خیال عملی شکل میں سامنے آسکتا ہے۔ واللہ الموفق لکل خیر۔

سال رواں ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء کے ماہ محرم / فروری میں برادر گرامی مولانا بدر القادری دامت مکارمہ کا ایک فون مجھے ملا کہ "حیات حافظ ملت" آخری مرحلے میں ہے، بہت جلد اسے پریس کے حوالے کرنا ہے اس سے قبل اسے دیکھ کر آپ اس پر مناسب مقدمہ لکھ دیں۔ کتاب آپ کو مولانا محمد اسلم عزیزی سے مل جائے گی۔ کتاب آئی اور ہفتہ عشرہ کے بعد واپس بھی چلی گئی۔ میرے دیکھنے یا چھونے کی نوبت نہ آئی۔ میں نے سمجھا تقدیم سے چھٹی مل گئی۔ مگر جب ۱۹/ تا ۲۱/ صفر مجلس شرعی مبارک پور کا فقہی سیمینار الجامعۃ الاشرفیہ میں جاری تھا مولانا بدر القادری ہالینڈ سے دہلی، اجمیر شریف وغیرہ ہوتے ہوئے مبارک پور پہنچ گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کیوں کہ سیمینار میں پہلی بار ان کی شرکت ہو رہی تھی۔ اس وقت اس طرف ذہن بھی نہیں گیا کہ پھر مقدمہ کا تقاضا میرے سر آسکتا ہے۔ شام یا صبح کو جب سیمینار سے الگ ملاقات ہوئی تو حیات حافظ ملت اور تقدیم کا ذکر آگیا، دو تین دن بعد گھوسی سے خود ہی کتاب بھی لے کر آگئے اسی وقت ہم لوگوں کو ایک ساتھ بریلی شریف عرس رضوی میں شرکت کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں نے کہا ابھی کتاب رکھ دیتا ہوں واپسی کے بعد دیکھنے اور کچھ لکھنے کی کوشش ہوگی۔ واپسی کے ایک ہفتہ بعد دو تین اہم کتابوں پر نظر ثانی موخر کرکے اس کتاب کو ہاتھ میں لینے کا موقع ملا۔

سرسری طور پر اس کے ابواب اور اوراق پر میں نے نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ دس سال پہلے جو مسودہ میں نے دیکھا تھا یہ اس کا ڈھائی گنا نہیں تو دو گنا ضرور ہے۔ ذرا تفصیلاً پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں معارف حافظ ملت، ملفوظات حافظ ملت، افکار اور کارنامے، انوار حافظ ملت کی ساری اہم باتیں حوالوں کے ساتھ اخذ کر لی گئی ہیں۔ مکتوبات کے باب میں حضرت کے مکتوبات بنام بیکل اتساہی کا مستقل اضافہ ہے۔ چند اور بھی مکتوبات آگئے ہیں۔ زیادہ تر مکتوبات دست یاب نہ ہوئے۔ شاید مکتوب الیہم نے غیر اہم سمجھ کر محفوظ نہ رکھے یا اس قدر محفوظ کر دیے کہ خود پالینا بھی ایک دشوار مسئلہ بن گیا یا ڈھونڈھ کر نکالنے، خود فوٹو کاپی کرانے اور بھیجنے کی زحمتوں سے مامون رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔

حافظ ملت ایک جہانِ کمالات و محاسن کا نام ہے۔ ان کی زندگی کا گلستاں متنوع اور رنگارنگ پھولوں سے مزین ہے۔ ان کی حیات کا ہر میدان سوانح نگار سے طویل جستجو اور لمبی جادہ پیمائی چاہتا ہے۔ وہ صرف ایک متبحر عالم یا ایک بلند پایہ مدرس یا ایک باکمال خطیب ہی نہ تھے کہ صرف ایک جہتِ کمال کی تفصیلات رقم کر کے سوانح نگار اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جائے بلکہ۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

(۱) ان کا خاندان بھی قابل ذکر ہے جو نہ کوئی سرکاری منصب رکھتا تھا، نہ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ، نہ عالمانہ جاہ و جلال مگر اس میں دین کی حکم رانی تھی اور دین داری کا سچا حسن و جمال۔

(۲) ان کی طالب علمی بھی قابل ذکر ہے کہ بظاہر فوت ہو کر اور ناامیدی کے بعد اس نے پھر زندگی پائی ہے اور اس شان سے کہ جو کچھ پڑھا ایک بار اسی سال اپنے رفقاے درس میں بطور تکرار اسے پڑھایا دوسرے سال نیچے والی جماعت کو پڑھایا۔

(۳) ان کی مدرسی بھی لائق توجہ ہے کہ اس کا آغاز ملازمت سے ہٹ کر محض خدمت دین کی شرط پر ہوا ہے اور آخر تک اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

(۴) ان کی خطابت بھی امتیازی شان رکھتی ہے کہ وہ دلوں کی دنیا بدل دیتی، اذہان کی گرہیں کھول دیتی، اس میں افکار و معانی کا دریا موج زن ہوتا اور سننے والوں کو سیراب کر جاتا۔

(۵) ان کا مناظرانہ کمال بھی قابل بیان ہے کہ چار ماہ تک جملہ یومیہ مشاغل اور ذمہ داریوں کو جاری رکھتے ہوئے ایسا شاندار مناظرہ فرمایا کہ اپنے طلبہ اور عوام کو بھی مناظر بنا دیا۔

(۶) ان کا تحریری اور تصنیفی حسن بھی کسی دیدہ ور کی نگاہ بصیرت اور زبان بلاغت چاہتا ہے جو یہ بتا سکے کہ زبان و بیان کی سلاست و روانی کے ساتھ کمال ایجاز ایسا ہے کہ دریاؤں کو کوزوں میں سمو رکھا ہے۔

(۷) ان کا تبحر علمی بھی اکابر کی مدح و ثنا سے بہرہ ور رہا ہے کہ ہمارے فلاں رفیق درس کو فلاں فن میں زیادہ مہارت ہے، فلاں کو فلاں فن سے زیادہ شغف ہے اور مولانا عبد العزیز کو ہر فن پر عبور حاصل ہے۔

(۸) ان کی مردم سازی بھی بڑے بڑوں کے لیے قابل رشک ہے کہ ابو الفیض کی بارگاہ فیض سے کیسے کیسے مسند نشینان درس و تدریس، رئیسان تحریر و قلم، ماہران تنظیم و ادارہ سازی، مناظران صف در وصف شکن، خطیبان اثر آفریں، مصلحان قوم و ملت، مفتیان نکتہ رس، صوفیان پُر سوز اٹھے اور ہر میدان میں اپنی بیش بہا خدمات کا سکہ بٹھا دیا۔

(۹) ان کی جوہر شناسی بھی ان کی فراست ایمانی کی شہادت بن کر جلوہ نما ہے، جن کو سنگ ریزے سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے وہ انھیں جوہر قابل جان کر اٹھا لیتے ہیں اور ایک مدت کے بعد دنیا دیکھ لیتی ہے کہ در حقیقت یہ سنگ ریزے نہیں جواہر گراں مایہ ہیں۔

(۱۰) ان کی شفقت و عنایت بھی ایک مستقل موضوع ہے جسے بھائیوں نے زندگی میں بار بار بیان کیا اور بعد وصال باچشم تر یاد کیا جسے بیٹے بیٹیاں کبھی نہ بھول سکیں، جسے غریب الوطن تلامذہ ہمیشہ یاد کریں، اعزا و اقربا جس کا گن گاتے رہیں، ہم سایوں اور آنے جانے والوں کو جس کی یادیں تڑپاتی رہیں، دور افتادہ محبین جس سے سرشار نظر آئیں اور سخت مخالفین بھی جس سے بے بہرہ نہ رہیں۔

(۱۱) ان کی ادب شناسی اور تعظیم اکابر بھی قابل تقلید ہے جن سے انھوں نے کسب علم کیا تھا ان کے لیے تو وہ "مَنْ عَلَّمَنِي حَرْفاً فَقَدْ صَيَّرَنِي عَبْداً" کی تصویر تھے ہی، جو حضرات ان اساتذہ کے ہم سبق، ہم منصب یا اور کسی عظمت کے حامل تھے ان کے حضور بھی حافظ ملت کی نیاز مندی قابل دید تھی۔

(۱۲) ان کی عبادت و ریاضت، معمولات کی پابندی، سفر و حضر ہر حال میں تہجد کی مداومت، ان کا حفظ قرآن اور کثرت تلاوت، ان کا عشق رسول اور خوف خدا، ان کا توکل اور جرأتِ مردانہ، ان کی قناعت اور وقار عالمانہ بھی مستقل موضوعات ہیں اور سوانح نگار سے سب اپنا اپنا حق چاہتے ہیں۔

(۱۳) فوٹو کی پابندی کے زمانے میں بلا فوٹو پاسپورٹ سے ان کا سفر حج و زیارت بھی ان کی عزیمت کا ایک درخشاں باب ہے جو مستقل تفصیل کا طالب ہے۔

(۱۴) ان کے مرکز جہد و عمل مدرسہ لطیفیہ مصباح العلوم، دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم اور الجامعۃ

الاشرفیہ کے تاریخی ادوار، ان ادوار کی مشکلات اور تعمیر و ترقی کے لیے ایک سیماب صفت درویشِ کہن سال کا عزم جواں، سعی رواں اور سوز دروں بھی ایسا باب ہے جس کے بغیر نہ حافظ ملت کی سیرت مکمل ہو سکتی ہے نہ اسے چھوڑ کر ان کی شخصیت کا صحیح تصور قائم ہو سکتا ہے، نہ ان کی علمی و عملی مساعی جمیلہ کا مرکز و محور دریافت ہو سکا ہے اس لیے ایک صبر آزما صاحب قلم سے یہ باب بھی اپنے حقوق کا تقاضا کرتا ہے۔

(۱۵) ان کی خدمت خلق، لوگوں کی غم گساری و ہم دردی، رہ نمائی و ہمت افزائی، تواضع و انکسار، خودداری و پامردی، ان کے پر تاثیر مواعظ و نصائح، ان کے دیگر اخلاق عالیہ، ان موضوعات سے متعلق بھی واقعات کا ایک تسلسل ہے جو اشرفیہ کے ذرّے ذرّے، مبارک پور کے چپے چپے اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے کوئی سمیٹے تو کس طرح؟ اور محفوظ کرے تو کیسے؟ کتنی زبانوں کی گویائی لائے، کتنے دلوں کی ترجمانی کرے، کتنے اہل محبت کی داستانِ دل نشیں سنے اور لکھے؟ لیکن کچھ نہ کچھ عہدہ برآ ہونا ضروری ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ ہمارے برادر باکمال مولانا بدر القادری نے ان سارے ہفت خوانوں کو بڑی ہنر مندی اور ذمہ داری سے سر کیا ہے۔ ان کے قلم کی چاشنی کیا کہنا، وہ پرانے خطیب بھی ہیں اور کہنہ مشق شاعر بھی۔ مگر سوانح حافظ ملت میں خطابت اور شاعری سے ہٹ کر خالص تحقیق کا اسلوب اپنایا ہے۔

حافظ ملت نمبر اور بعد کے مجموعوں اور کتابوں کو انھوں نے بار بار ناقدانہ و غائرانہ نگاہ سے پڑھا ہے اور ہر جگہ سے اپنے مقررہ موضوعات کے مناسب باتیں اخذ کرتے ہوئے کتاب میں انھیں بڑے سلیقے سے سجایا ہے اور پورا حوالہ بھی رقم کیا ہے۔ بزرگوں کا بھی، دوستوں کا بھی، خُردوں کا بھی۔ یہی دیانت و امانت ہے، یہی فراخ دلی و اعلیٰ ظرفی ہے اور یہی میدان تحقیق کا تقاضا ہے۔

یہ ہماری ان کی اور سبھی اہل محبت کی خوش قسمتی ہے کہ حافظ ملت قدس سرہ کے حالات مستند اور معتمد حضرات کی زبان و قلم سے بیان ہو کر جمع ہوئے۔ جو روایت و درایت ہر لحاظ سے قابل تسلیم اور لائق قبول ہیں۔ حافظ ملت نمبر کی تدوین رہی ہو یا افکار اور کارنامے وغیرہ مجموعوں کے لیے دعوت تحریر، ہر موقع پر ایسے ہی اہل قلم کو دعوت دی گئی ہے جو راست باز، دیانت دار اور محتاط ہوں اور ایسی ہی روایات لی گئی ہیں جو معتبر حضرات نے بیان کی ہوں اور مبالغہ آرائی سے پاک ہوں۔

ہمارے بزرگوں کی جو قرار واقعی عظمت و جلالت تھی وہی اگر ہم سچائی کے ساتھ بیان کر لے جائیں تو ہمارا بہت بڑا کمال ہے اور ان بزرگوں کے تعارف کے لیے کافی۔ مبالغہ آرائی اور اختراعی کہانیوں کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں حقیقی فضل و کمال کا دائرہ تنگ سے تنگ ہوتا ہے اور بے جا عقیدت کا اصرار اسے وسیع سے

وسیع تر بنانا چاہتا ہے، بفضلہ تعالیٰ ہمیں ایسی غیر واقعی وسعت سے نہ کوئی دلچسپی ہے، نہ ہمارے بزرگوں کے سوانحی مجموعوں کو اس کی ضرورت۔ واللہ یحب الحق وھو یھدي السبیل.

اس کے بعد مناسب تھا کہ کتاب کے ابواب کا ذکر کرتے ہوئے ہر باب کے مندرجات کا اجمالی تذکرہ اور مختصر تبصرہ تحریر ہو۔ لیکن قلت وقت کے باعث میں اسے ناظرین کی بصیرت کے حوالے کرتا ہوں۔ ان سے ابواب کی فہرست اور ذیلی سرخیوں پر نظر ڈالیں اور مندرجات کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے مصنف کی کاوش فکر و قلم کی داد دیں۔ یقیناً انھوں نے تحقیق و احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر موضوع کو بڑی کامیابی سے سر کیا ہے اور تمام وابستگان عزیزی کی طرف سے ایک عظیم فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ فجزاہ اللہ عنا و عن سائر المحبین خیر ما یجزی بہ المحسنین. وصلی اللہ تعالیٰ و سلم علیٰ خیر خلقہ خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین.

محمد احمد مصباحی
رکن المجمع الاسلامی
وصدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور
۱۲؍ ربیع النور ۱۴۲۸ھ؍ یکم اپریل ۲۰۰۷ء یک شنبہ

❁❁❁❁❁❁

کلمات تکریم[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً

حضرت مولانا سید محمد مجتبیٰ اشرف اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ کی زیارت پہلی بار میں نے اس وقت کی جب میں مدرسہ اشرفیہ ضیاء العلوم خیر آباد ضلع اعظم گڑھ (حالیہ ضلع مئو) میں زیر تعلیم تھا۔ وہ اپنے بعض مریدین کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ بمشکل ۲۴ر گھنٹے خیر آباد میں ان کا قیام رہا ہوگا جس میں زیادہ وقت لوگوں کے گھروں پر جانے آنے میں صرف ہوگیا۔ وہیں ایک بار ان کے والد ماجد مولانا سید مصطفےٰ اشرف علیہ الرحمہ کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت خیر آباد میں ان کے بھی چند مریدین تھے۔ بعد میں جب میں مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گہنہ میں صدر المدرسین تھا اس وقت حضرت مجتبیٰ میاں ایک دو دن کے لیے محمد آباد تشریف لائے تھے اور مدرسہ ہی میں قیام تھا لیکن ہم مدرسین مدرسہ سے زیادہ محلہ کے لوگ اپنی اپنی حاجات کے لیے ان کا وقت استعمال کرتے رہے۔ اس وقت میری کتاب "تدوین قرآن" چھپ چکی تھی، وہ میں نے حضرت کو نذر کی۔ مدرسہ میں چند منٹ سکون سے اگر بیٹھنے کا موقع انھیں مل جاتا تو اسے جستہ جستہ دیکھ لیا کرتے۔

اس ملاقات کے قبل و بعد بھی کئی بار دید و شنید کا موقع ملا مگر بہت سرسری۔ اس لیے کوئی خاص گفتگو یا کوئی اہم واقعہ ذہن میں نہیں جو بیان کر سکوں۔ اجمالی طور ان سے متعلق یہ جانتا ہوں کہ وہ ایک عظیم خانوادے کی قدآور شخصیت تھے۔

عربی کی ابتدائی تعلیم کچھوچھہ مقدسہ میں حاصل کرنے کے بعد دار العلوم اشرفیہ مبارکپور میں شوال ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء میں تحصیل علم کے لیے آئے اور شعبان ۱۳۶۶ھ مطابق جون ۱۹۴۷ء میں سند فضیلت حاصل کی۔

نتائج امتحان دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اپنے درجہ میں نمایاں صلاحیت رکھتے تھے اور ہر کتاب میں امتیازی نمبر لاتے تھے۔ اس زمانے میں عموماً منتہی کتابوں کے ممتحن صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رضوی (مصنف بہار شریعت)، محدث پاکستان ابو الفضل مولانا سردار احمد گورداس پوری، شمس العلما مولانا قاضی شمس

(۱) اشرف الاولیاء- حیات و خدمات، مفتی محمد کمال الدین اشرفی مصباحی، پنڈوہ شریف، ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء

الدین احمد جعفری جونپوری علیہ الرحمہ ہوتے تھے۔

اور منتہی کتابوں کے اساتذہ درج ذیل حضرات تھے:

حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمہ۔ شیخ الحدیث و صدر المدرسین دار العلوم اشرفیہ۔

مولانا عبد المصطفیٰ ازہری ابن صدر الشریعہ علیہما الرحمہ۔

مولانا محمد سلیمان اشرفی بھاگلپوری تلمیذ صدر الشریعہ علیہما الرحمہ

مولانا عبد المصطفیٰ اعظمی تلمیذ صدر الشریعہ علیہما الرحمہ

اشرفیہ کی روداد و مظہر تعلیم وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجتبیٰ میاں علیہ الرحمہ نے اکثر اسباق انھیں حضرات سے پڑھے۔ مزید تفصیل حضرت کے رفقائے درس اور اس زمانے میں تحصیل علم کرنے والے حضرات سے دریافت ہو سکتی ہے۔ وہ چند ہی حضرات رہ گئے ہیں جن میں ایک حضرت بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی دام ظلہ ہیں۔ مولانا مجیب اللہ بھاگلپوری، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا اعجاز احمد خان ادروی، مولانا قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی بھی اس دور کے طلبہ میں تھے۔

حضرت مولانا سید محمد مجتبیٰ اشرف علیہ الرحمہ نے دار العلوم اشرفیہ سے فراغت کے بعد جہاں تک مجھے معلوم ہے تبلیغ و خطابت اور طریقت و ارشاد کا میدان اپنایا۔ اس میں بھی انھوں نے شاداب اور زرخیز علاقوں کو چھوڑ کر بنجر اور سنگلاخ زمینوں کی آبیاری پر کمر ہمت باندھی۔ یوپی و بہار، بنگال وغیرہ کے ان خطوں کی جانب رخ کیا جہاں ذی علم خطبا اور مرشدوں کا گزر کم ہی ہوتا تھا۔ عموماً ان جگہوں میں جو لوگ ملتے وہ ایک تو ناخواندہ یا کم خواندہ ہوتے اور دوسرے غریب و نادار ہوتے، انھیں علم و عمل سے آراستہ کرنے کے لیے دل و دماغ کی کافی توانائی بھی چاہیے، ان کی اعرابیت برداشت کرنے کی قوت بھی، مسلسل صبر اور پیہم جد و جہد بھی اور ان سب کے ساتھ ساتھ بے پناہ خلوص و للّٰہیت بھی۔

مگر حضرت ممدوح کی ہمت مردانہ قابل صد آفریں ہے کہ انھیں علاقوں میں پوری زندگی صرف کر دی، لوگوں کی مشکلات میں دست گیری کی، انھیں ایمان و عقائد حقہ پر صلابت بخشی، علم و عمل سے آراستہ کیا۔ اور اس شان سے کہ نہ کلفتوں اور مشقتوں کا گلہ ہے نہ تہی دستی کا شکوہ بلکہ مسرت و سرخوشی کا یہ نقشہ:

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

انھوں نے اپنے استاذ گرامی حضرت حافظ ملت اور اپنے مادر علمی دار العلوم اشرفیہ سے رابطہ بھی ہمیشہ استوار رکھا۔ اور ناساز گار ماحول میں بھی انھوں نے اور ان کے برادر عزیز حضرت مولانا سید حامد اشرف اشرفی

جیلانی علیہما الرحمہ نے استاذ گرامی اور دار العلوم کی حمایت جاری رکھی، ان حضرات نے عرصۂ دراز تک حافظ ملت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے رسوخ علم کے ساتھ ان کے کردار و عمل کی پختگی، اخلاق کی بلندی، سادات کے ساتھ محبت و عقیدت، خانوادۂ اشرفیہ کے لیے بے پناہ جذبۂ احترام و نیاز مندی، ان کے بلند پایہ جذبۂ اخلاص اور روحانی رتبہ و کمال سے بھی آشنا تھے دوسری طرف یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ بے دینی اور بدمذہبی کا جو طوفان اسلامی آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا جارہا ہے اس سے مقابلے کی جو اسپرٹ اور دینی و علمی خدمت کی جو لگن اس بوریانشین کی بارگاہ فیض میں پیدا کی جاتی ہے وہ ملک بھر میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس لیے اس ادارے کی توسیع اور اس کا فیضان عام سے عام تر کرنا وقت کا سنگین تقاضا اور ملت کی اہم ضرورت ہے۔

ان ہی مشاہدات و احساسات کا یہ اثر تھا کہ ان حضرات کے جذبۂ محبت و حمایت پر کبھی گرد نہ لگ سکی اور ان کے خلوص کا سونا ہمیشہ تاب ناک رہا۔ حضرت ممدوح دار العلوم اشرفیہ کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے اور رکنیت کا یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔

میرا اندازہ ہے کہ ان کی طویل خدمات کو صفحات قرطاس پر سمیٹنا آسان نہیں۔ مگر حضرت کے جواں ہمت فرزند سید جلال الدین اشرف قادری کے نیک عزائم کو خدا سلامت رکھے۔ انھوں نے ابتدائی اور مختصر حالات مرتب کرنے کے لیے حضرت کے مرید باوفا عزیزی مولانا کمال الدین مصباحی کو کام سے لگا دیا ہے۔ یہ جامعہ اشرفیہ سے فضیلت اور اختصاص فی الفقہ کی تکمیل کر کے کئی سال سے تدریسی خدمات سے وابستہ ہیں۔ تلاش و جستجو اور محنت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ ایک ملاقات میں ان سے مختصراً میں نے ذکر کیا ہے کہ حالات جمع کرنے کے لیے کس طرح جستجو، تگ و دو، احتیاط، نقد و نظر اور محنت و جاں فشانی ہونی چاہیے۔ ان خطوط پر اگر کام ہو تو امید ہے کہ بہت معتبر اور صاف و شفاف حالات و سوانح کا ایک ذخیرہ جمع ہو سکتا ہے۔ واللہ الموفق لکلّ خیر، نعم المولیٰ ونعم النصیر وصلی اللہ تعالیٰ علی سید المرسلین وعلی اٰلہٖ صحبہ اجمعین.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور، رکن المجمع الاسلامی مبارکپور

۲۰ ربیع الآخر ۱۴۲۸ھ، ۸ مئی ۲۰۰۷ء سہ شنبہ

❁❁❁❁❁❁

تقریب[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً

بڑی مسرت کی بات ہے کہ درجۂ فضیلت ۱۴۲۸ھ کے طلبہ نے اپنی دستار بندی کے موقع پر کسی اہم دینی کتاب کی اشاعت کا ارادہ کیا، پھر مولانا نفیس احمد مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ کے مشورے سے "انوار ساطعہ" کا انتخاب ہوا۔

یہ کتاب عرصۂ دراز سے نایاب تھی، جب کہ علمی اہمیت کے ساتھ اس کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ اس کتاب سے عیاں ہوتا ہے کہ مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ کے مریدین میں سے چند افراد کس طرح اپنے مرشد کے مسلکِ حق سے منحرف اور مرتد ہوئے اور مرشد کی مسلسل مساعی کے باوجود حق کی جانب واپس نہ آئے۔

آج مسلسل پروپیگنڈے کے زور سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ سنی دیوبندی اختلاف کی ابتدا بریلی سے ہوئی جب کہ انوار ساطعہ یہ بتاتی ہے کہ اس اختلاف کی نشو و نما سہارن پور میں ہوئی۔ وہ بھی ایسے لوگوں سے جن کے مرشد تمام اسلافِ ہند اور اسلافِ امت کے مطابق تعظیمِ رسول، میلاد و قیام، فاتحہ و عرس وغیرہ معمولاتِ اہلِ سنت پر کاربند تھے۔ مگر ان کے چند مریدین کو مولوی اسماعیل دہلوی کے تقویۃ الایمانی مسلک کی ایسی ہوا لگی کہ پیر و مرشد کے ساتھ پوری امت خطاکار اور ضلالت شعار نظر آئی۔ آج دیوبند کی پوری مشنری اسی نئے مسلک کی ترویج و اشاعت میں ہر طرح کے حربوں کے ساتھ منہمک ہے، وہی نیا مسلک جس میں تعظیم رسول شرک ہے، رسول کے لیے خدا کی عطا سے بھی غیب کا علم ماننا شرک ہے، محفل میلاد و قیام کبھی شرک اور کبھی بدعت ہے، فاتحہ و عرس اگرچہ شرعی طریقے پر ہو، ناجائز و حرام اور بدعتِ ضلالت ہے۔

انوار ساطعہ کے مباحث سے اس نئے مسلک کے بیش تر خیالات کا تحقیقی و علمی رد ہو جاتا ہے۔ آج کے لحاظ سے اس کی زبان پرانی ہو چکی ہے، مگر ناشر طلبہ اور ان کے مددگار اساتذہ نے پیراگراف کی تبدیلی اور علامات و رموز کے ذریعہ اسے سہل اور آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس سے پوری طرح مستفید ہوں گے۔

---

(۱) انوار ساطعہ، از مولانا عبد السمیع رام پوری، اشاعت طلبہ درجۂ فضیلت جامعہ اشرفیہ، جون ۲۰۰۷ء

یہ طلبہ اپنے استاذ مولانا نفیس احمد مصباحی سے کتاب پر ایک وقیع مقدمہ لکھانے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں۔ مولانا نے مصنف کے مختصر احوال بیان کرنے کے ساتھ کتاب کا تاریخی پس منظر بھی بیان کر دیا ہے۔ تفصیل تو بہت ہو سکتی تھی مگر موصوف نے اجمال میں ہی کافی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ آخر میں ان بزرگوں کے حالات بھی رقم کیے ہیں جنھوں نے اپنی زبردست تقریظات سے انوار ساطعہ کی بھرپور تائید فرمائی ہے۔ یہ مقدمہ بھی قارئین کے لیے بہترین رہ نما ثابت ہوگا۔

مولیٰ تعالیٰ ان طلبہ و اساتذہ کی مساعی جمیلہ کو شرف قبول بخشے اور کتاب کے اس نئے ایڈیشن کو مقبول خاص و عام اور مفید انام بنائے۔ ساتھ ہی مصنفِ جلیل اور ان کے مؤید علما و مشائخ اہلِ سنت کا فیضان علم و عمل عام سے عام تر فرمائے اور جامعہ اشرفیہ کے طلبہ، اساتذہ اور ارکان و معاونین کو ہمیشہ دین متین کی گراں قدر خدمات جلیلہ مقبولہ سے شاد کام، تمام آفاتِ ارضی و سماوی سے مامون و محفوظ اور دارین کی سعادتوں سے فیروز مند و محظوظ رکھے۔ وھو المستعان، وعلیہ التکلان، وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسولہ خاتم النبیین و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارک پور

۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ/ ۲۲/ مئی ۲۰۰۷ء سہ شنبہ

تأثرات[1]

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم حامداً و مُصلياً و مُسلماً

مجھر شریف ایک قدیم آبادی ہے جہاں سیدنا محمد قادری بغدادی علیہ الرحمہ بغداد سے ۸۴۶ھ میں تشریف لائے اور یہ قریہ بہت سے اہل دل اور اہل عقیدت کا مرجع و ماویٰ بن گیا۔ ان کی ولادت ۸۱۰ھ میں اور وفات ۹۴۰ھ میں ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اولاد غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی اور کی ہند میں آمد ان سے پہلے نہیں بتاتی۔ ان کی تشریف آوری سے سرزمین ہند میں فیضان قادریت خوب خوب پھیلا۔

ان کی اولاد کرام سے حضرت مولانا سید اصغر امام قادری مصباحی مدظلہ بہت زبردست عالم و شیخ ہونے کے ساتھ دینی و ملی ضروریات کے سلسلے میں حساس اور فعال بھی واقع ہوئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے شہر اورنگ آباد میں ایک شاندار ادارہ "دارالعلوم فیضان سیدنا" قائم کیا اور خود مجھر شریف میں بھی ایک مدرسہ و مسجد کی تعمیر کی، مجھر شریف کا مدرسہ "دارالعلوم سیدنا" سے موسوم ہے اور قادری سادات کرام کے احاطۂ مزارات سے متصل خدمت علم میں مصروف ہے۔

مولیٰ تعالیٰ اسے فروغ و ترقی بخشے، بانی ادارہ کے عزائم کو مزید استحکام کے ساتھ تکمیل سے نوازے، ان کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور ان دینی اداروں کے لیے مخلص و بلند ہمت معاونین فراہم کرے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و علی آلہ وصحبہ اجمعین.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۴/ نومبر ۲۰۰۸ء

۞۞۞۞۞۞

(۱) روداد دارالعلوم فیضان سیدنا، اورنگ آباد، بہار، ۲۰۰۸ء

کلمۃ المجلس (1)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   حامدًا و مصلّیاً

تمدنی وسائل کی ترقی سے پہلے انسانی زندگی مشکلات کی خوگر تھی، کھانے پینے، رہنے سہنے، دُور آنے جانے میں لوگ وہ ساری سختیاں بخندہ پیشانی گوارا کرتے جن کے تصور سے ہی آج پسینہ آتا ہے۔ تعلیم و تعلم کی دنیا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پہلے جو دشواریاں تھیں آج ان کا عُشرِ عَشیر بھی نہ رہا۔ تعلیمی میدان میں بھی اربابِ ہمت کی تیز گام مساعی کا کارواں برابر جادہ پیما رہا۔

طلبہ کے مزاج و حالات اور زمانے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر علوم و فنون کو بہت سے شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ہر شعبے کے لیے ایک مخصوص نصاب بنا۔ پھر اس نصاب پر بار بار نظر ثانی اور ترمیم و تسہیل کا عمل ہوتا رہا جو دنیا کے ہر ملک میں آج بھی جاری ہے، مگر ہندوستان کے مدارس عربیہ میں یہ عمل ماہرین کی بے توجہی، یا مطلوبہ وسائل کی حد درجہ کمی کے باعث بڑی سست رفتاری کا شکار رہا، اور آج بھی ہے۔

دو سال قبل تنظیم المدارس کا قیام عمل میں آیا تو اس طرف کچھ پیش رفت ہوئی۔ اسی کا ایک حصہ یہ تجویز بھی ہے کہ ابتدا میں طلبہ کو نحو و صرف وغیرہ کے قواعد خود ان کی زبان میں سکھائے جائیں، تاکہ قواعد کے ساتھ دوسری زبان کا بار اُن کے اوپر نہ رہے۔ پھر جب وہ بنیادی قواعد سے آشنا ہو کر عربی زبان پر کسی قدر قابو پالیں تو عربی میں قواعد، یا دیگر فنون کی تعلیم زیادہ مشکل نہ رہے گی۔

اس تجویز کے تحت صَرف کی پہلی کتاب "دِرَاسَۃُ الصَّرف" مولانا ساجد علی مصباحی استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور کی توجہ و محنت سے تیار ہو چکی ہے جو میزان و منشعب کے تمام قواعد پر مشتمل ہونے کے ساتھ کثیر تمرینات کی بھی حامل ہے جن سے بعونہ تعالیٰ قواعد کی معرفت میں پختگی بھی آئے گی اور زبان سے آشنائی میں بھی اضافہ ہوگا۔

نحو کی پہلی کتاب کے طور پر "دِراسَۃُ النَّحو" کو شاملِ نصاب کیا گیا جو حضرت مفتی سید افضل حسین مونگیری علیہ الرحمہ سابق صدر المدرسین جامعہ منظر اسلام، بریلی شریف نے بہت اختصار اور جامعیت کے

(1) قواعد النحو، مولانا ساجد علی مصباحی، مجلس برکات جامعہ اشرفیہ، ۲۰۰۹ء

ساتھ تحریر کی تھی۔ دوسری کتاب "قواعد النحو" مولانا ساجد علی مصباحی نے تیار کی ہے جو نحو میر اور ہدایۃ النحو کے تقریباً تمام قواعد کا احاطہ کرتی ہے۔ زبان و بیان بھی سہل و شستہ ہے جس کے باعث طلبہ کے لیے استفادہ بہت آسان ہے۔ حجم بھی زیادہ نہیں کہ ختم کرانا دوبھر ہو۔ ساتھ ہی مشقی سوالات اور تمرینات کا بھی اضافہ ہے جن کے باعث ان شاء اللہ الرحمٰن قواعد کی یادداشت اور اجرا میں پختگی اور آسانی ضرور ہوگی۔

صرف و نحو اور بعض دیگر فنون کی کچھ اور کتابیں بھی زیر ترتیب، یا قریب التکمیل، یا زیر طبع ہیں۔ امید ہے کہ اہل علم انہیں نگاہ استحسان سے دیکھیں گے اور دعاؤں سے نوازیں گے۔ خصوصی گزارش یہ ہے کہ کوئی چیز قابلِ اصلاح نظر آئے تو ضرور مطلع فرمائیں، تاکہ اگلی اشاعت میں تصحیح ہو سکے۔ واللہ لایضیع أجر المحسنین.

محمد احمد مصباحی
صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور
۲۰ر رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ / ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۹ء، جمعہ

كَلِمَةُ الْمَجْلِس (۱)

فن صرف میں مجلس برکات کی پہلی پیش کش دراسۃ الصرف ہے جو مولانا ساجد علی مصباحی کی کاوش قلم ہے۔ اس میں یہ کوشش کی گئی کہ میزان و منشعب کے قواعد اور گردانوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ان کی مشقیں بھی خاطر خواہ ہوں، ناظرین نے محسوس کیا ہوگا کہ اس معیار پر وہ بہت کامل اور عمدہ ہے۔ محنت و توجہ سے پڑھی پڑھائی جائے تو اس سے عربی کے سالم صیغوں کے لکھنے بولنے پر بخوبی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔

اب یہ دوسری پیش کش قواعد الصرف حصہ اول ہے جو مولانا نظام الدین قادری مصباحی استاذ دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی، بستی کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔

اس کی ترتیب کا ہدف یہ تھا کہ مہموز، معتل، مضاعف وغیرہ کے قواعد اور گردانوں کا احاطہ ہو اور علم الصیغہ کی جگہ کار آمد ہو۔ پہلے علم الصیغہ کے بعد خاصیاتِ ابواب کا درس فصول اکبری سے ہوتا تھا، اس لیے یہ بھی کوشش ہوئی کہ خاصیاتِ ابواب بھی اسی حصے میں آجائیں۔

مزید برآں دراسۃ الصرف کی بیش تر بحثوں اور گردانوں کا اعادہ بھی کیا گیا ہے، تاکہ پچھلی باتیں از سر نو تازہ ہوجائیں۔

میں نے اس حصے کا مسوّدہ کم از کم تین بار پڑھا اور ہر بار بہت کچھ حذف و اضافہ کیا، آخر میں مولانا ساجد علی مصباحی کو دیا کہ وہ بھی بغور دیکھ لیں، انھوں نے بھی کچھ مشورے اور اصلاحیں لکھیں جن میں سے اکثر کی تعمیل کر دی گئی۔ کمپوزنگ خود مولانا نظام الدین صاحب نے کی تھی، پھر مولانا ناصر حسین مصباحی مدرس جامعہ اشرفیہ نے از سر نو سیٹنگ کرتے ہوئے کتاب اور حروف کو مزید واضح اور عمدہ بنانے کی کوشش کی، بہت سی آیات کے حوالے وغیرہ بھی درج کیے اور کچھ اشارات دیے گئے تھے جن کی انھوں نے تکمیل کی۔ جزی اللّٰہ کلّھم خیرا۔

اب دیگر اہل علم خصوصًا مدرسینِ کتاب سے درخواست ہے کہ آپ کی نظر میں جو بھی مشورے یا اصلاحات ہوں بلا تکلف لکھ کر ارسال فرمائیں، تاکہ کتاب کو بہتر سے بہتر بنانے میں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔

إنَّ اللّٰہ لایضیع أجرَ المحسنین.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور- اعظم گڑھ

۲۰ رجب ۱۴۳۲ھ / ۲۳ جون ۲۰۱۱ء - پنج شنبہ

(۱) قواعد الصرف، حصہ اول، مولانا نظام الدین قادری، مجلس برکات جامعہ اشرفیہ، جون ۲۰۱۱ء

تقدیم (۱)

باسمہٖ و حمدہ تعالیٰ و تقدس

خیال ہوتا ہے کہ قواعد املا کی ضرورت کیا ہے؟ جو اردو لکھنا پڑھنا جان گیا اس کا املا درست ہی ہوگا، الفاظ اور جملے کتابوں میں جس طرح لکھے ہوتے ہیں اُسی طرح لکھنا ہے۔ عمومی حد تک یہ خیال درست ہے مگر قواعد کی ضرورت اُن الفاظ میں پیش آتی ہے جن کا املا قلمی تحریروں اور مطبوعہ کتابوں میں مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے، ایسے وقت عام قاری الجھن کا شکار ہوتا ہے کہ صحیح کیا ہے؟ اسے چند مثالوں کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک طرف غلط املا خط کشیدہ الفاظ کے ذریعہ نمایاں کیا گیا ہے، دوسری طرف صحیح املا دکھایا گیا ہے، کچھ تفصیلی گفتگو کتاب کے اندر دیکھ سکتے ہیں۔

غلط املا	صحیح املا
(۱) دوکاندار اپنے قرض کا تقاضہ کرنے کیلئے نکلا اور خریدار کے گھر پہونچا۔	(۱) دُکان دار....... تقاضا....... کے لیے.... پہنچا۔
(۲) ہمنے دیر تک یہ تماشہ دیکھا۔	(۲) ہم نے..... تماشا.....
(۳) تمہارا دوست صبح یھاں آیا۔ مگر ہمسے ملنا گوارہ نہ کیا۔	(۳) تمھارا...... صبح یہاں............ ہم سے..... گوارا.........
(۴) ابتداء، انتہاء، استدعاء، علماء، فضلاء، حکماء، نداء، دعاء، جزاء۔	(۴) ابتدا، انتہا، استدعا، علما....... (اردو میں سب بلا ہمزۂ آخر ہوں گے)
(۵) اسنے اس نکتہ پر توجہ دی۔	(۵) اس نے اس نکتے پر.....
(۶) حکماء دہر اور علماء زمانہ اس فلسفہ کے حل سے قاصر ہیں۔	(۶) حکمائے دہر اور علمائے زمانہ اس فلسفے کے.............
(۷) اعلا، ادنا، سبکا مدعیٰ یہ تھا کہ اس جھگڑا کو	(۷) اعلیٰ، ادنیٰ، سب کا مدعا...... اس

(۱) قواعد انشا و املا، مولانا اختر حسین فیضی مصباحی، مجلس برکات جامعہ اشرفیہ، اگست ۲۰۱۱ء

کسیطرح ختم کرنا چاہئے۔	جھگڑے کو کسی طرح..... چاہیے۔
(۸) تقاضۂ زمانہ اور مقتضیٰ حال پر نظر رکھنا ضروری ہے۔	(۸) تقاضاے زمانہ اور مقتضاے حال...... ....

یہ چند نمونے پیش کر دیے گئے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اس طرح کی غلطیاں قلمی اور مطبوعہ تحریروں میں نظر آتی رہتی ہیں جن کے باعث کچھ ایسے اصول و ضوابط کی ضرورت پیش آتی ہے جن کی روشنی میں ہم اپنی تحریریں غلطیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔

اردو زبان قدیم ہندی اور عربی وفارسی الفاظ سے مرکب ہے۔ اب اس میں انگریزی الفاظ بھی کثرت سے داخل ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر اردو املا محض ہندی بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا، خصوصاً فارسی عربی الفاظ جو اردو کی شان و شوکت کا ذریعہ اور اس کا تہذیبی ورثہ ہیں، ان کی صورت کو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض حضرات نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ص ض ط ظ ذ ث وغیرہ کی شکلیں ختم کر دی جائیں اور ان کی جگہ س ت ز سے کام لیا جائے مگر اردو دنیا اسے قبول نہ کر سکی اور اسے مقبول ہونا بھی نہیں چاہیے، اسی طرح یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ اعلیٰ، ادنیٰ، مرتضیٰ، موسیٰ، عیسیٰ وغیرہ کو پورے الف سے اعلا، ادنا، مرتضا، موسا، عیسا لکھا جائے۔ بعض حلقوں میں اس پر عمل بھی شروع ہو گیا، مگر اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ املا کی اس تبدیلی سے ایک تو ان الفاظ کی اصلیت دفن ہو جاتی ہے۔ دوسرے، صدیوں سے جو املا عوام و خواص سب میں رائج و مقبول رہا ہے اسے ترک کرا کے ایک نئی راہ کا پابند بنانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جب کہ روایت اور رواج عام کا، املا اور تلفظ دونوں میں اہم کردار ہوتا ہے اس سے صَرفِ نظر روا نہیں۔ (۱)

اردو املا سے متعلق مولانا احسن مارہروی (م ۱۹۴۰ء) نے رسالہ فصیح الملک مئی ۱۹۰۵ء میں کچھ تجاویز پیش کی تھیں، پھر ڈاکٹر عبد الستار صدیقی اس موضوع پر برابر لکھتے رہے۔ آزادی سے قبل مولوی عبد الحق بابائے اردو کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے املا کمیٹی بنائی اس کے متعدد جلسے ہوئے اور تجاویز شائع ہوئیں۔ آزادی کے بعد ترقی اردو بورڈ اس سلسلے میں سرگرم عمل ہوا، دوسری اجتماعی و انفرادی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ رشید حسن خاں نے اس

(۱) تلفظ سے متعلق چند مثالیں یہ ہیں: (۱) جمہور، دستور، صندوق یہ عربی میں بضمِ اول ہیں مگر فارسی اردو میں بفتحِ اول مستعمل ہیں، اسی طرح سوال عربی میں بضم اول ہے اور دوسرا حرف ہمزہ ہے مگر فارسی اردو میں بفتح اول اور واو سے مستعمل ہے۔ خزانہ عربی میں بکسر اول ہے اور فارسی اردو میں بفتح اول۔ (۲) حیوان، سیلان، دوران، جولان، حرکت، عظمت، برکت وغیرہ عربی میں بفتح اول و دوم ہیں مگر فارسی اردو میں بسکون دوم مستعمل ہیں۔ (۳) نفی، رمی، وحی، عربی میں بفتح اول و سکونِ دوم ہیں مگر اردو نثر میں بفتح اول و کسر دوم بلا نکیر مستعمل ہیں۔ ہاں جب یہ کسی فارسی ترکیب میں مضاف یا معطوف علیہ ہو کر آتے ہیں تو اصلی حالت (فتح اول و سکون دوم) پر رہتے ہیں، جیسے وحیِ خدا، نفیِ ماسوا، رَمیِ جَمرہ — وحی والہام، نفی واثبات۔

موضوع کو خاص طور سے اپنا ہدف بنایا اور اردو املا کے نام سے ایک مبسوط اور مفصل کتاب لکھی اور کئی مختصر کتابیں بھی لکھیں۔ پاکستان میں بھی اس طرف توجہ دی گئی۔

نئی دہلی کے ترقی اردو بورڈ کی سفارشات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کیں جو پہلی بار ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئیں۔ اس کی بعض تجاویز سے اختلاف کرتے ہوئے بہت سی رائیں سامنے آئیں، جن کے باعث پہلی سفارشات پر نظر ثانی کے لیے ترقی اردو بورڈ کے تحت متعدد اجلاس ہوئے اور ترمیم شدہ سفارشات املا نامہ طبع دوم ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئیں۔ یہ زیادہ معتدل اور جامع اصولوں پر مبنی ہیں۔

مجلس برکات کے تحت قواعد املا کی ترتیب میں ان کاوشوں کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اصول ہم نے بھی اپنایا ہے کہ جہاں تک ہو سکے عربی فارسی الفاظ کو ان کی اصلی حالت پر رکھا جائے مگر جہاں فارسی یا اردو کا تصرف پوری طرح اثر انداز ہو چکا ہے وہاں بعد تصرف جو رواج عام ہے اس کی پیروی کی جائے۔ اسی طرح یہ قاعدہ بھی اپنایا گیا ہے کہ جن الفاظ کا کوئی خاص املا عوام و خواص سب میں رواج پا چکا ہے اُسے ترک کرانے پر زور نہ دیا جائے۔ ہاں کوئی چیز بالکل بے اصل یا خلاف اصول کچھ لوگوں کے املا میں در آئی ہے تو اس سے باز رکھنے کی کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ بعض مقامات پر اپنی پسندیدہ اور ترجیحی صورت بتادی گئی ہے اور دوسری صورت کا بھی جواز رکھا گیا ہے۔ املا نامہ وغیرہ کی دو چار تجویزوں سے اختلاف بھی کیا گیا ہے، اس کی وجہ کتاب میں بیان کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب مدارس کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے مگر امید ہے کہ دوسرے اردو داں حلقے بھی اس سے پوری طرح مستفید ہوں گے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ انشا سے متعلق ہے۔ انشا در اصل مشق اور ذوق کی چیز ہے مگر استاد کی رہنمائی اس میں اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ ابتدائی بچوں سے ان کے گرد و پیش کی چیزوں پر چند جملے کہلوائے جائیں، پھر لکھوائے جائیں، جب وہ کسی ایک عنوان پر دس بارہ مربوط جملے لکھنے کے عادی ہو جائیں تو انھیں مضمون کو مزید بڑھانے پھیلانے کی راہ دِکھائی جائے۔ ثانوی اور عالیہ درجات کے طلبہ نے اگر اب تک مضمون نویسی کی مشق بالکل نہیں کی ہے تو انھیں بھی اسی انداز پر چلانا ہوگا۔ مگر ان کا کام نسبۃً آسان ہوگا۔ البتہ درجے کے معیار پر لانے کے لیے ذرا زیادہ محنت کی ضرورت ہوگی، ذوق سلیم کی مساعدت، مشق کی کثرت اور استاد کی رہنمائی کے ساتھ وہ بھی بہت جلد معیار پر پورے اتر سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ نہ احساسِ کمتری کا شکار ہوں، نہ محنت سے جی چرائیں۔ اچھے اہل قلم کی نگارشات بھی کثرت سے پڑھیں اور پڑھنے کے ساتھ ان سے کچھ اخذ بھی کریں۔ مضمون نگار نے کہاں کہاں سے مواد جمع کیا؟ کس معیار کے مراجع سے اخذ کیا؟ کس طرح ترتیب دی؟ اپنے مقاصد و مطالب کو ذہن نشیں کرنے اور

دل چسپ بنانے کے لیے زبان و بیان میں کیا کیا خوبیاں پیدا کیں ؟ یہ ساری چیزیں بہت غور سے دیکھنے، سمجھنے اور اخذ کرنے کی ہوتی ہیں۔ محض عامیانہ نظر اور سرسری مطالعے سے معیاری انشا اور حسنِ نقد و تحقیق کا حصول نہیں ہوتا۔ واللہ خیر موفق و معین.

محمد احمد مصباحی
یکم رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ
۲؍ اگست ۲۰۱۱ء

تقریب[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

فقیہ اجل، شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمۃ علوم و فنون کی جامعیت اور گونا گوں علمی و اخلاقی محاسن و کمالات کے ساتھ حسن استحضار، سرعت اخذ اور سرعت تحریر میں یکتائے روزگار تھے۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی قدس سرہ کے آخری دور حیات میں ان سے فقہی استفادہ اور مشق افتا کی سعادت پائی اور باضابطہ فتویٰ نویسی کا کام دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف کے زمانۂ تدریس میں سرکار مفتی اعظم مرشد امام علامہ شاہ مصطفیٰ رضا خاں قادری نوری قدس سرہ کی سرپرستی و نگرانی میں شروع کیا اور وہاں تقریباً ۲۵ ہزار فتاویٰ آپ کے قلم سے صادر ہوئے پھر جب ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء کے اواخر میں جامعہ اشرفیہ مبارک پور تشریف لائے تو یہاں تدریس آپ سے متعلق نہ تھی، صرف کار افتا سپرد تھا جسے آپ نے پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا، تادم آخر یہ سلسلہ جاری رہا اور تقریباً ساٹھ ہزار فتاویٰ قید تحریر میں آئے۔

جوابات کو ٹالنا قطعاً پسند نہ تھا، وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ جائز و ناجائز، حلال و حرام کا حکم اپنے عمل کے لیے پوچھتے ہیں، اگر بر وقت انھیں حکم نہ بتایا جائے تو وہ عمل کیسے کریں گے ؟ ہماری ذمہ داری ہوتی ہے کہ جتنی جلد ہو سکے مستفتی کو حکم مسئلہ سے باخبر کر دیں۔ سوالات اتنی کثرت سے آتے تھے کہ سب کو تنہا نپٹانا ممکن نہ تھا اس لیے متعدد حضرات نائب و معاون کی حیثیت سے مقرر ہوئے پھر بھی زیادہ فتاویٰ آپ ہی کے حصے میں آتے۔ سرعت عمل اور استحضار کا عالم یہ تھا کہ استفتا پڑھا گیا اور برجستہ جواب لکھنا شروع کر دیا، مختصر، جامع اور شافی جواب چوں کہ سوالات بہت زیادہ جمع ہو جاتے تھے اس لیے زیادہ جزئیات اور دلائل لکھانے سے گریز کرتے اور فرماتے کہ سائل کو جلد سے جلد حکم معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ وہ عمل کر سکے، دلائل اس کے اطمینان و تشفی کے لیے ہوتے ہیں، اگر وہ مفتی پر اعتماد رکھتا ہے تو زیادہ دلائل کی جستجو میں بھی نہ پڑے گا اور حکم معلوم کرکے عمل شروع کر دے گا۔ تاہم غایت اختصار کے باوجود ایک دو جزئیہ یا مفہوم عبارت بتا کر کتاب کا حوالہ، یا حسب حال کوئی آیت یا حدیث پیش کر دینا معمول میں داخل تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ بس نفس حکم بیان ہو، کوئی

(۱) فتاویٰ شارح بخاری، جلد اول – مفتی محمد شریف الحق امجدی، دائرۃ البرکات، کریم الدین پور گھوسی، دسمبر ۲۰۱۱ء

حوالہ یا دلیل کی جانب اشارہ بالکل نہ ہو۔

حضرت کے بعض فتاویٰ کی اشاعت تو ان کے دور حیات ہی میں ہوتی رہتی تھی مگر باضابطہ سب کی ترتیب، کتابت، اصل سے مقابلہ، تصحیح وغیرہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ حضرت کے لائق فرزندوں کو برابر اس کی فکر دامن گیر رہی اور آج بھی ہے کہ والد ماجد کے رشحات قلم کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور سب کو ان سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا جائے، یہ فکر تو ہم تمام وابستگان دامن کو ہونی چاہیے اور ہے مگر پیش قدمی اور عملی حصہ لینا، کثیر مصروفیات اور موانع کے باعث اکثر کے بس سے باہر ہے۔ میں نے ایک زمانے میں تحقیقِ فقہ کے کچھ طلبہ کو اس پر مامور کیا کہ حضرت کے فتاویٰ کی فوٹو کاپی لے کر ان کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کریں اور حوالے کی عبارتیں اصل کتابوں سے ملائیں، بہت سارا کام انھوں نے کیا بھی مگر وہ نہ مکمل ہوا نہ زیادہ اطمینان بخش، اس سے دلچسپی مولانا مفتی محمد نسیم مصباحی استاذ جامعہ اشرفیہ کو زیادہ تھی، یہ برسوں حضرت کی تربیت میں رہے اور ان کے انداز و طریق کار سے بخوبی واقف بھی تھے، اس لیے وہ اس کام سے لگے رہے۔ دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف کے فتاویٰ کی اصل یا نقل تو نہ مل سکی مگر جامعہ اشرفیہ کے فتاویٰ محفوظ تھے، وہی اتنے زیادہ معلوم ہو رہے ہیں کہ قابو میں لانا مشکل ہو گیا ہے۔

مفتی محمد نسیم صاحب نے یہاں حضرت کے فتاویٰ رجسٹروں سے صرف عقائد سے متعلق فتاویٰ کو الگ کیا تو تین جلدیں بن گئیں، ہر جلد تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اندازہ ہے کہ بقیہ ابواب سے متعلق کم از کم دس جلدیں مزید ہوں گی۔ ان میں بھی بہت کچھ تخفیف کی گئی ہے۔

مولانا موصوف نے ایک بار مجھ سے ذکر کیا تھا کہ مکرر فتاویٰ بھی بہت ہیں مثلاً طلاق سے متعلق فتاویٰ۔ واقعات الگ الگ ہیں مگر بنیادی سوال ایک ہی ہے۔ اور جواب کا بنیادی مضمون بھی ایک ہی ہے بعض دیگر عنوانات بھی ایسے ہیں جن سے متعلق سوالات مختلف اوقات میں مختلف مقامات سے آئے اور سب کے جوابات دیے گئے، کبھی مفصل، کبھی مختصر، کبھی متوسط۔ میں نے یہ رائے دی کہ جو جوابات تقریباً ایک ہی مضمون پر مشتمل ہیں، ان میں سے کوئی ایک لے لیں، اور اگر چند جوابات لیے جائیں تو ایسے کہ ہر ایک میں کوئی نئی بات، کوئی نیا گوشہ یا نیا انداز ہو اور بعض عنوانات ایسے ہوں گے کہ ان کے تحت کوئی ایک تفصیلی جواب لے لیا جائے تو کافی ہوگا۔

یہ میری رائے تھی، اب معلوم نہیں کہ انھوں نے اس پر کہاں تک عمل کیا، مگر اندازہ ہے کہ کچھ نہ کچھ تخفیف ضرور کی ہوگی۔

بہر حال حضرت کے فرزندان گرامی مولانا ڈاکٹر محب الحق رضوی، مولانا حافظ حمید الحق برکاتی، محترم وحید

الحق برکاتی، جناب ظہیر الحق برکاتی اور دیگر اقارب و متعلقین کا یہ جذبہ قابل ستائش ہے کہ وہ حضرت کا علمی ورثہ ساری امت میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے حسب مقدور کوشش بھی کر رہے ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر صاحب اور مولانا حمید الحق صاحب اس سلسلے میں برابر فکر مند اور متحرک رہتے ہیں مگر اصل کاوش مرتب یعنی مفتی محمد نسیم صاحب کی ہے اگر ایسے چند افراد اس مہم میں شریک ہوتے تو نتیجہ جلد سامنے آتا۔ مگر کام خالص علمی، فقہی اور بہت محنت طلب ہے اس لیے زیادہ افراد کا ملنا بھی مشکل ہے۔ خدا کرے کہ مزید تیزی اور عمدگی کی کوئی مناسب اور بہتر صورت نکل آئے۔

جن حضرات نے بھی اس علمی سرمایے کو منظر عام پر لانے میں کسی طرح کا کوئی حصہ لیا ہے وہ ہمارے اور بھی قارئین کے شکریے کے مستحق ہیں، میں سب سے واقف نہیں مگر رب کریم کے یہاں اچھی نیت اور نیک عمل کا صلہ بفضلہ و کرمہ تعالیٰ ضرور ملتا ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے سب کو اپنے بے کراں فضل و انعام سے نوازے۔ اور اس بڑے کام کی جلد از جلد تکمیل کے لیے پردۂ غیب سے بہتر اسباب مہیا فرمائے۔ وما ذلك عليه بعزيز.

محمد احمد مصباحی
رکن المجمع الاسلامی
وصدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

۱۹ر محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
۱۵ر دسمبر ۲۰۱۱ء پنج شنبہ

❁❁❁❁❁❁

تقدیم (۱)

کتاب و سنت، اجماع امت اور قیاس دینی احکام و مسائل کا ماخذ ہیں۔ کسی بھی معاملے میں حکم شرعی معلوم کرنے کے لیے انھیں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ عہد صحابہ سے ہی جاری ہے۔ مگر ہر شخص میں احکام کے استنباط و استخراج کی صلاحیت نہیں ہوتی بلکہ کچھ خاص افراد ایسے ہوتے ہیں جنھیں رب علیم و قدیر اجتہادی قوت و صلاحیت سے سرفراز فرماتا ہے۔ وہ اپنی خداداد قوت سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور امت کے لیے راہ عمل متعین فرماتے ہیں، پھر امت کے جو افراد خود اجتہادی صلاحیت نہیں رکھتے وہ ان حضرات کے بتائے ہوئے احکام پر کاربند ہوتے ہیں۔

یقیناً کتاب و سنت کا علم اور استخراج احکام کی قوت رب تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے اور جو حضرات اس نعمت سے سرفراز ہوں وہ بلا شبہہ امت کی امامت اور اور پیشوائی کے مستحق ہیں۔ اسی لیے امت نے ہر دور میں ان کی امامت اور پیشوائی تسلیم کی ہے۔ سلاطین ہوں یا امرا، محدثین ہوں یا قرا، ادبا و شعرا ہوں یا دیگر اصناف کے علما جو بھی منصب اجتہاد سے بہرہ ور نہیں انھوں نے کسی صاحب اجتہاد کی پیروی کی ہے۔

مجتہدین کرام کا یہ عظیم احسان ہے کہ انھوں نے استنباط کے اصول و قواعد بھی وضع کیے اور احکام کی تفصیلات بیان کر کے امت کے لیے شاہراہِ عمل بھی واضح کی۔ اس خصوص میں امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی (۸۰ھ-۱۵۰ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمات سب سے نمایاں ہیں، انھوں نے اصول استنباط متعین کرنے کے ساتھ اپنے تلامذہ پر مشتمل ایک مجلسِ فقہا بھی تشکیل فرمائی۔ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ پیش آمدہ مسائل حل کیے بلکہ اپنی فقاہت و بصیرت کی توانائی سے آئندہ پیش آنے والے سوالات اور ان کے جوابات بھی مرتب کیے جن سے اس دور کے فقہا و مجتہدین نے بھی روشنی حاصل کی اور بعد کے فقہا بھی ان سے مستفید ہوتے رہے، اسی لیے امام قرشی محمد بن ادریس شافعی (۱۵۰ھ-۲۰۴ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”الناس كلهم فى الفقه عيال أبى حنيفة“ فقہ میں سب لوگ امام ابو حنیفہ کی عیال ہیں۔ یعنی سب ان کے خوانِ علم سے خوشہ چینی کرنے والی اولاد کا حکم رکھتے ہیں۔

دوسری تیسری صدی میں مجتہدین بہت تھے اور ان کی تقلید بھی ہوتی تھی لیکن عامۂ امت کو ضرورت اس

(۱) نصر المقلدین، مولانا سید شاہ احمد علی بٹالوی (م ۱۳۴۵ھ)، طلبہ جماعت سابعہ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اپریل ۲۰۱۲ء

بات کی تھی کہ عبادات و معاملات کے ہر باب میں طریقۂ عمل کیا ہو؟ کیا صورت ہو تو جواز ہے کیا صورت ہو تو عدم جواز ہے؟ یہ سب تفصیل سے کتابوں میں درج کر دیا جائے تاکہ ان کتابوں کی مراجعت کر کے غیر مجتہد علما اور ان علما سے رجوع کرنے والے عوام کے لیے راہ عمل آسان ہو۔

اس ضرورت پر امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور ان کے اصحاب و تلامذہ نے توجہ دی اور اپنے اپنے قواعد اور استخراج و استنباط کے مطابق فقہی احکام کتابوں میں جمع کر دیے اس سے افراد امت کو یہ آسانی ہوئی کہ جس امام کی تقلید اپنائی اس امام کے مسائل کتابوں میں یکجا پا لیے اور اس کی روشنی میں اپنی عبادات اور معاملات کو درست کر لیا۔ بقیہ مجتہدین کے احکام و مسائل اس انداز سے مدون نہ ہو سکے اس لیے ان پر عمل کرنے والے بھی نہ رہے اور پوری امت ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے ایک مذہب پر کاربند رہی۔ اور آج بھی امت کا سواد اعظم اسی روش کا پابند ہے۔

مگر تیرہویں صدی ہجری میں کچھ افراد ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے تقلید ائمہ کو شرک اور مقلدین ائمہ کو مشرک کہنا شروع کیا، جیسے انھوں نے پوری امت کے اجماعی اعتقاد و عمل کے برخلاف انبیا و اولیا کی تعظیم اور ان سے استعانت و توسل کو شرک کہنا شروع کیا اور ایک ایسا نیا دین ایجاد کیا جس میں بارہ سو سال کی پوری امت شرک کی مرتکب ٹھہری اور سچا اسلام تیرہویں صدی میں رونما ہوا، اسی طرح مذاہب ائمہ سے سرقہ کر کے ایسے مسائل جمع کیے جو ان کی خواہش نفس سے پوری طرح ہم آہنگ تھے کچھ ایسے مسائل بھی جنم دیے جو مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب میں نہ تھے۔ اس طرح ایک پانچواں مذہب وجود میں آیا جس کی تقلید جاری ہوگئی، اس پانچویں مذہب کی پابندی کو عمل بالحدیث کا نام دیا، اور ہزار سال پیش تر کے کسی امام مجتہد کی تقلید کو شرک کا نام دیا۔

ظاہر ہے کہ عام امت جو اپنی معیشت کے کاموں میں منہمک ہے وہ براہِ راست قرآن و حدیث کی مہارت حاصل کرنے اور ان سے مسائل نکالنے سے عاجز ہے، عوام اور جہلا تو در کنار آج کے بڑے بڑے علما بھی اجتہاد کے شرائط سے خالی اور اجتہادی قوت سے عاری ہیں، بلکہ اجتہاد مطلق کی صلاحیت صدیوں سے معدوم چلی آ رہی ہے۔ عوام سے بس یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب علم انھیں راہ بتائے اور یہ اس پر اعتماد کر کے اس راہ پر گامزن ہوں۔ خواہ تیرہویں، چودہویں، پندرہویں صدی کے کسی راہ نما کی تقلید کریں یا دوسری تیسری صدی کے کسی امام کی تقلید کریں، تقلید سے کسی حال میں گلوخلاصی نہیں۔ اور تقلید اگر شرک ہے تو شرک سے بھی کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ والعیاذ باللہ رب العالمین.

تیرہویں صدی کے نصف اخیر میں یا اس سے کچھ قبل سرزمین ہند ترک تقلید کے فتنے سے دوچار ہوئی اور تقلید ائمہ پر طعن و تشنیع کا ہنگامہ خیز دور شروع ہوا۔ پھر تقلید کی مخالفت، ائمہ کی تحقیر، خصوصاً امام اعظم ابو حنیفہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے متبعین کے سب و شتم پر مشتمل بھاری لٹریچر سامنے آیا جس کے رد میں تقلید کی حمایت، ائمہ کی ضرورت اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل مقلدین کی بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔

انھیں میں سے ایک کتاب **"نصر المقلدین"** بھی ہے۔

مصنف اور کتاب کا تعارف مولانا امتیاز احمد مصباحی، لائبریرین المجمع الاسلامی مبارک پور نے لکھ دیا ہے۔ جن تقریظ نگاروں کے حالات دستیاب ہوئے ان کے حالات بھی لکھ دیے۔ حضرت محدث سورتی علیہ الرحمہ کا رسالہ جامع الشواہد بھی نصر المقلدین کے آخر میں شامل تھا اس لیے حضرت محدث سورتی علیہ الرحمہ کے حالات بھی مختصراً لکھ دیے ہیں، ان کے حالات میں خواجہ رضی حیدر کی تفصیلی کتاب "تذکرۂ محدث سورتی" قابل مطالعہ ہے۔ نصر المقلدین کی اشاعت کا خیال کیسے آیا اور کتاب کی جدید اشاعت کو نئے تقاضوں کے قریب لانے کے لیے کیا کوششیں ہوئیں اور ان میں کن حضرات نے حصہ لیا ان سب کی تفصیل خود ناشرین طلبہ درجۂ فضیلت سال اول (درجۂ سابعہ) نے بیان کر دی ہے جس کا مسودہ **محمد شعیب احمد** متعلم درجۂ سابعہ نے مجھے سنایا تھا۔ کتاب کی زبان سو سال سے زیادہ پرانی تھی جسے آج کے مطابق سلیس اور رواں بنانے کی ضرورت تھی مگر کمپوزنگ ہو جانے کے بعد اس طرف توجہ ہوئی اس لیے اس پر خاطر خواہ عمل نہ ہو سکا، قدرے سہل اور رواں بنانے کی کوشش ہوئی ہے۔

بہر حال ان طلبہ کی جد و جہد کے باعث ابتدائے غیر مقلدیت کے مناظر و مباحث سوا سو سال بعد پھر سامنے آ رہے ہیں، اس طرح کی بحثیں غیر مقلدین آج بھی نئے نئے انداز اور الگ الگ عنوان سے چھیڑتے رہتے ہیں، اور اس وقت لوگوں کو لامذہب بنانے کے لیے وہ طرح طرح کے حربے استعمال کر رہے ہیں، امت مسلمہ کو ان کے خطرناک فتنے سے بچانے کے لیے اہل حق کو آج پہلے سے زیادہ محنت و کاوش کی ضرورت ہے۔ مولیٰ تعالیٰ توفیق خیر سے نوازے۔ وما ذلك عليه بعزيز.

والصلوٰة والسلام على خاتم النبيين أفضل المرسلين، أعلم الأولين والآخرين وعلىٰ اٰله وصحبه المرشدين وفقهاء شرعه الهادين لاسيما الأئمة الأربعة المجتهدين وعلىٰ من تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

۲۲؍ ربیع الآخر ۱۴۳۳ھ / ۱۶؍ مارچ ۲۰۱۲ء - جمعہ مبارکہ

پیغام (۱)

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۸۰ھ - ۱۵۰ھ) کا احسان نہ صرف اُمت مسلمہ پر ہے بلکہ دنیا کی دوسری قوموں پر بھی ہے۔

عین اس وقت جب مملکت اسلامیہ کا رقبہ اور دائرہ کار روز افزوں تھا۔ پوری انسانیت اس بات کی محتاج تھی کہ اس کے جائز حقوق اسے حاصل ہوں اور ظلم و تعدی سے اس کا تحفظ ہو، اس دور میں صرف امام اعظم کی وہ بلند ہمت ذات اور دور بیں نگاہ تھی جس نے قرآن و حدیث کے عادلانہ اصولوں کی رہ نمائی میں انفرادی اور اجتماعی، شہری و ملکی بلکہ بین الاقوامی زندگی کے لیے وہ فقہیانہ دستور مرتب کیا جو ہر فرد کی راحت و عافیت کا ضامن ہوا اور آج بھی عالمی سطح پر اس سے استفادہ جاری ہے۔

فرقِ باطلہ کے مقابلے میں ان کے جوابات اور مناظرے تمام اہل حق کا فرض کفایہ ادا کرتے ہیں اور سبھی کو ان کے احسانات کا اسیر بناتے ہیں۔

بڑے بڑے محدثین ان کے دامن فیض اور سلسلۂ تلمذ سے وابستہ ہیں جو ان سب حضرات کے لیے سرمایۂ افتخار ہے، ان کے بلند پایہ اخلاق و عادات بڑے بڑے صوفیہ اور اولیا کے لیے مشعل راہ ہیں اور وہ ان کی پیروی پر نازاں و فرحاں ہیں۔

اس طرح تصور کریں تو ان کے ممنون امرا و سلاطین بھی ہیں، فقہا و محدثین بھی، اولیا و عرفا بھی، اغنیا و تاجرین بھی بلکہ جملہ اہل اسلام اور غیر مسلمین بھی۔

ایسی ہمہ جہت عالم گیر اور بلند پایہ شخصیت سے اپنوں اور غیروں کو روشناس کرانا یقیناً ایک اہم اخلاقی اور علمی فریضہ ہے جس کی بجا آوری میں حصہ لینے والے تمام مخلصین جملہ اہل محبت کی جانب سے مبارک باد اور تکریم و تعاون کے مستحق ہیں۔

دعا ہے کہ رب کریم ہر فرد کو اس کی نیت، کوشش و محنت اور اخلاص و محبت کے مطابق بلکہ اپنی شان جود و عطا اور فضل بے انتہا کے اعتبار سے جزائے بے کراں اور اجر بے پایاں سے نوازے۔ آمین بجاه حبيبك رحمة للعالمين صل وسلم وبارك عليه وعلىٰ آله وصحبه وهداة دينه ومجتهدي شرعه و متبعي ملته اجمعين.

محمد احمد مصباحی

۱۵؍ ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ / ۲۵؍ فروری ۲۰۱۳ء شب سہ شنبہ

(۱) انوار امام اعظم ابو حنیفہ، یادگار ایوبی، کشی نگر، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ / مارچ ۲۰۱۳ء

کلماتِ خیر (۱)

مبسملاً و حامداً و مصلیاً

عزیزی مولانا جاوید احمد عنبرؔ مصباحی نے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں شوال ۱۴۲۶ھ تا شعبان ۱۴۲۸ھ دو سال رہ کر فضیلت کی تکمیل کی۔ پھر شوال ۱۴۲۸ھ تا شعبان ۱۴۳۰ھ مزید دو سال یہاں رہ کر تقابل ادیان اور مطالعۂ مذاہب کا کورس مکمل کیا۔

یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ جامعہ سے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے اپنی علمی و قلمی دل چسپی نہ صرف یہ کہ برقرار رکھی بلکہ اس میں گراں قدر اضافہ بھی کیا۔ ابھی ان کی فراغت کو چار سال پورے نہیں ہوئے مگر ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین و کتب کی اچھی خاصی فہرست ہوگئی ہے جو دیگر فارغین کو بھی دعوتِ عمل دے رہی ہے۔

آدمی میں محنت، جستجو اور اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروے کار لانے کی لگن ہو تو بہت ساری سر بفلک چوٹیاں سر ہو سکتی ہیں۔

عزیز موصوف کی زیر نظر کتاب "بائبل میں نقوش محمدی، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" کی داد تو بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے قارئین دے سکتے ہیں، میں تو باقاعدہ ورق گردانی بھی مکمل نہیں کر سکا۔ فہرست دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب خاتم النبیین ﷺ سے متعلق تورات و انجیل کی بشارتوں کا تعارف کراتی ہے۔

بہت پہلے مولانا قاضی عنایت رسول چریاکوٹی (ولادت ۱۲۴۴ھ ـ وفات ۱۳۲۰ھ) نے اس موضوع پر ۱۸۷۴ء تا ۱۸۹۴ء بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد "بُشریٰ" لکھی تھی جو تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ توریت کی اصل زبان جاننے کے بعد پہلے انھوں نے کلکتہ جاکر عبرانی سیکھی جس کے لیے ایک یہودی بڑی ترکیبوں کے بعد بمشکل تیار ہوا۔ عبرانی سے پہلے انگریزی سیکھی، وہی ذریعۂ تعلیم بنی، پھر یونانی بھی سیکھی اس لیے کہ اصل کے نام پر اب جو انجیل دستیاب ہے اس کی زبان یونانی ہے۔ موصوف نے غازی پور سے کلکتہ کا سفر کشتی سے کیا تھا، خیر واپسی کے وقت ریل جاری ہو چکی تھی اس لیے واپسی ٹرین سے ہوئی۔

"بُشریٰ" میں پہلے توریت کی عبارت عبرانی رسم الخط میں درج ہے پھر اس کا تلفظ فارسی (اردو) رسم الخط

(۱) بائبل میں نقوش محمدی، مولانا جاوید عنبر مصباحی، برکاتی بک ڈپو، گلبرگہ، کرناٹک، مارچ ۲۰۱۳ء

میں ہے پھر اس کا اردو ترجمہ اور اس پر تبصرہ اور مصنف کی ذاتی آرا ہیں۔ مولانا کے تفردات بہت ہیں جن سے اختلاف ضروری ہے مگر ان کی جگر کاوی، کوہ کنی، محنت ہاے شاقہ اور دبیز تہوں کے نیچے چھپے مطالب عالیہ اور بشارات صادقہ کو منظر عام و خاص پر لانے کی سعی بلیغ کسی طرح نظر انداز ہونے کے قابل نہیں۔ مولانا کے سوانح نگار کے مطابق انھوں نے زیادہ تعلیم اپنے خاندان کے علما سے چریاکوٹ ہی میں حاصل کی اور بعض کتابوں کا درس علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ (ولادت ۱۲۱۳ھ ـ وفات ۱۲۸۹ھ) سے بدایوں میں لیا۔

عنبر مصباحی کی جستجو اور محنت دیکھ کر تحسین و تبریک میرا فرض ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اپنے کسی استاذ کو پوری کتاب دکھا کر ان کی تائید و تقریظ حاصل کریں تو زیادہ مناسب ہے۔ میں نے مولانا ناظم علی رضوی، مولانا صدر الوریٰ قادری، مولانا نفیس احمد مصباحی استاذان اشرفیہ کے نام بھی لیے مگر عزیز موصوف نے بتایا کہ ان حضرات سے رابطہ کیا تھا، چند ماہ تک وہ بہت مصروف رہنے والے ہیں، بعد میں دیکھ سکتے ہیں مگر کتاب کی طباعت و اشاعت کی تیاری مکمل ہو چکی ہے یکم جمادی الآخرہ ۱۴۳۴ھ عرس حافظ ملت میں رسم اجرا کا ارادہ ہے، اس لیے اب تاخیر کی گنجائش نہیں۔

بہر حال ان کے اصرار پر اور ان کی محنت و کاوش سے متاثر ہو کر یہ چند سطریں لکھ دیں، اگرچہ اس وقیع و ضخیم کتاب کا تقاضا کچھ اور تھا، مگر میں بھی اپنی مصروفیات اور یومیہ ذمہ داریوں کے آگے سپر انداز ہوں۔

مولا تعالیٰ عزیز موصوف کو مزید علمی پختگی، گہرائی، تلاش و تحقیق کی صفات عالیہ اور مقبول و ممتاز دینی علمی ملی خدمات سے نوازے، فرزندان اشرفیہ اور فارغین مدارس اہل سنت کو ہمہ جہت مساعی اور ہر میدان میں مخلصانہ و کامیاب کوششوں کی توفیق مرحمت فرمائے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما کر تمام چھوٹی بڑی خدمات کو شرف قبول سے نوازے۔ وھو المستعان وعلیہ التکلان.

ہمارے دوسرے عزیز جاوید احمد مصباحی گلبرگہ شریف بھی ہمارے شکریے، تحسین و تبریک اور نیک دعاؤں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے کتب خانے سے یہ کتاب شائع کر کے مؤلف کی ہمت افزائی اور معاونت کی۔ اس کار خیر میں جتنے بھی رفقا و معاونین ہیں سب کو رب کریم و عظیم اپنی بے پایاں رحمتوں اور نیک جزاؤں سے نوازے۔ وھو ذو الفضل العظیم.

(۱۸؍ ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ، یکم مارچ ۲۰۱۳ء، جمعہ)

تقدیم[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم* حامداً و مصلیاً و مسلماً

دین حق عقائد و اعمال کا مجموعہ ہے۔ عقائد کا ثبوت دلیل عقلی، قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ہوتا ہے۔ اور اعمال کا ثبوت قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے ہوتا ہے۔

جو شخص خدا اور رسول سے نا آشنا اور آسمانی کتاب کا منکر ہو اسے عقلی دلائل کے ذریعہ خدا کے وجود، توحید، علم، ارادہ، سمع و بصر اور کلام و حکمت کی معرفت کرائی جاتی ہے پھر اسے کتاب و رسول کی ضرورت اور حقانیت سے باخبر کرتے ہوئے دین حق کی دعوت دی جاتی ہے۔ اسی لیے ربّ جلیل نے قرآن حکیم میں بکثرت عقلی دلائل پیش کیے ہیں اور انسانوں کو بار بار عقل و نظر کو استعمال کرنے اور فکر و تدبیر کو کام میں لا کر حق کو پہچاننے اور ماننے کی دعوت دی ہے۔

دلیل عقلی سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی ہے جو تمام مادّوں کو وجود دینے والی اور جملہ ممکنات کی خالق ہے۔ سارا نظام عالم اسی کے تصرف و تدبیر کے تحت چل رہا ہے، اس کا وجود خود سے ہے اور وہ واجب الوجود ہے۔ واجب الوجود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ مخلوقات سے بالاتر ہے، وہ مادّہ و جسم سے پاک اور برتر ہے۔ اس کے مثل کوئی چیز نہیں۔ قرآن کریم بھی اس دلیل کی تائید کرتا ہے اور اسے بہت مضبوط و محکم انداز میں بیان فرماتا ہے۔

مگر غیر مقلدین عقل و نقل کے صریح دلائل سے منحرف ہو کر خدا کے بارے میں جسمانیت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور عرش پر اس کا اِستوا جسم کی طرح بتاتے ہیں، جیسا کہ ان کی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ صرف دلیل عقلی کو رہنما بنانے والے فلاسفہ بھی ہمیشہ واجب الوجود کو جسم اور مادّہ سے پاک مانتے آرہے ہیں اور قرآن کریم بھی اسے جسم و جسمانیت سے پاک اور برتر بتاتا ہے۔ ارشاد ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ. ''اس کی طرح کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھنے سننے والا ہے۔''

اس موضوع پر فتاویٰ رضویہ میں ایک مبسوط رسالہ ہے جس میں غیر مقلدین کے اس عقیدے پر بوجوہ کثیرہ رد کیا گیا ہے۔ رسالے کا نام ہے: قوارع القهار على المجسمة الفجار. ہو سکتا ہے جلد ہی اس کی

(۱) مخالفین تقلید کا ایک جائزہ، امام احمد رضا قادری، طلبہ درجۂ سابعہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۳ء

علیحدہ اشاعت ہو۔

قرآن کریم پر بھی غیر مقلدین کی نظر بڑی کوتاہ ہے۔ پورے قرآن پر غور کرنا اور جملہ آیات پر نظر کرتے ہوئے نتائج اخذ کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔ بتوں کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا مطالعہ کیا، ان میں مشرکین کا رد فرمایا گیا ہے کہ اللہ اور معبود تو وہی ہو سکتا ہے جو تمام ممکنات پر قادر ہو مگر یہ ان اصنام کو معبود مانتے ہیں جن میں کسی نفع و ضرر کی قوت نہیں۔ غیر مقلدین ان آیات کو انبیا و اولیا پر فٹ کرتے ہیں کہ ان میں کسی نفع و ضرر کی قوت نہیں۔

سورۂ فاتحہ میں پڑھ لیا اِيَّاكَ نَسْتَعِيْن. ''ہم صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں،'' اور حکم لگا دیا کہ خدا کے سوا کسی سے بھی مدد مانگنا شرک ہے۔ اور انبیا و اولیا سے مدد مانگنے والے مشرک ہیں۔

قرآن کی ان تمام آیات سے ان کی آنکھیں بند ہیں جن میں بندوں کے اندر نفع و ضرر کی قوت ہونے اور اسے استعمال کرنے کا ذکر ہے۔ مثلاً تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوٰنِ ''نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''

اگر بندوں میں یہاں تک کہ انبیا و اولیا میں بھی نفع و ضرر کی کوئی قوت نہیں تو تعاون اور عدم تعاون کے یہ دونوں حکم کیوں اور کیسے؟

قرآن میں ہے: اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ''صبر اور نماز سے مدد چاہو۔'' صبر اور نماز بھی خدا نہیں، جس طرح بندے مخلوق ہیں اسی طرح ان سے صادر ہونے والے افعال بھی مخلوق ہیں۔ بندوں کا صبر، نماز، روزہ، خورد و نوش، خرید و فروخت سبھی افعال مخلوق اور غیر خدا ہیں۔ مگر اللہ نے غیر خدا سے استعانت کا حکم دیا۔ اب اگر غیر اللہ سے استعانت شرک ہے تو کیا رب العالمین نے قرآن میں شرک کا حکم دیا ہے؟

شرک کے نشے میں یہ اپنے کو بھول جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ان کا بیٹا باپ سے، باپ بیٹے سے مدد مانگتا ہے۔ آدمی اپنے اہل خاندان، دوستوں اور شناساؤں سے مدد مانگتا ہے۔ پورا طبقہ حکومت سے مدد مانگتا ہے۔ ریال اور ڈالر کے زور سے اپنی بدمذہبی کو پھیلاتا ہے۔ یہ بھی تو غیر اللہ سے استعانت ہے۔ یہ کیوں شرک نہیں؟

اگر فطری و مافوق الفطرۃ کا فرق کریں تو سوال یہ ہے کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ علاوہ ازیں یہ انبیا و اولیا کے خلاف جن آیات سے استدلال کرتے ہیں ان میں ایسی کوئی تفریق نہیں، پھر یہ کیا انصاف ہے کہ خود جب شرک میں ماخوذ ہوں تو اپنے دل سے گڑھ کر راہ فرار نکالیں، اور ساری دنیا کو مشرک ٹھہرانا ہو تو کوئی راہ نظر نہ آئے۔ صدیاں گزر گئیں کوئی قرآن کی مراد نہ سمجھ سکا، یہ پیدا ہوئے تو انھیں قرآن کی وہ مراد سمجھ میں آئی جس کی رُو سے عہد

رسالت سے آج تک کی ساری امت مسلمہ مشرک ہے۔ بلکہ اس شرک کی زد سے قرآن و حدیث اور خدا اور سول بھی محفوظ نہیں۔ ان کی ناروا جسارت اور کھلی ضلالت پر تفصیلی کلام علماے حق کی کتابوں میں ہے۔ مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن میں بھی یہ کس قدر کوتاہ بینی کے شکار ہیں۔

حدیث کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ چند حدیثیں اپنی پسند کے مطابق لی لیں اور باقی سے آنکھیں بند کر لیں پھر زور و شور سے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ہم عمل بالحدیث کے پیکر ہیں اور دوسروں کو حدیث سے سروکار نہیں۔ اس دعوے کی قلعی کھولنے کے لیے زیر نظر مجموعے میں بہت سی نظیریں ملیں گی خصوصاً حاجز البحرین اور صفائح اللجین سے علم حدیث میں ان کی کوتاہ نظری اور کم سوادی کا عقدہ خوب کھلے گا۔

تقلید ائمہ کو یہ شرک کہتے ہیں مگر خود پوری طرح تقلید میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جسے نہ پورے قرآن کا علم ہو، نہ جملہ احادیث پر نظر، نہ رجال حدیث کی معرفت، نہ جرح و تعدیل کی صلاحیت، نہ اصول حدیث جیسی "بدعت" کی ایجاد میں کوئی دخل، وہ اس کے سوا کیا کر سکتا ہے کہ اپنی پسند اور ہواے نفس کو امام بنا کر مقلدین ائمہ کی تقلید کرتا جائے، انھوں نے جو کچھ لکھ دیا حسب پسند اس پر ایمان لاتا جائے، ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ ہم کسی کی تقلید نہیں کرتے اور یہ ائمہ کی تقلید کرنے والے علماے رجال، علماے حدیث، علماے اصول حدیث، علماے جرح و تعدیل وغیرہم سب کے سب مشرک ہیں۔ یہیں تک بس نہیں فقہی احکام و مسائل میں بھی یہ کسی نہ کسی امام کے مذہب سے سرقہ کے مرتکب ہیں، خود ان کے پاس اجتہاد و استنباط کی کوئی صلاحیت نہیں اور جہاں ائمہ سے ہٹ کر کوئی مسئلہ اپنایا ہے وہاں ان کی جہالت و ضلالت بالکل عیاں ہے، جیسے بیک وقت تین طلاقوں سے ایک طلاق ہونے کا مسئلہ، آٹھ رکعت تراویح کا مسئلہ، بالغ کو دودھ پلانے سے رشتۂ رضاعت قائم ہونے کا مسئلہ۔

ائمۂ مجتہدین کی انتھک کوششوں سے شرعی احکام و مسائل کی تفصیلی تدوین ہوئی اور امت مسلمہ ان کے زیر ارشاد و احسان ان احکام پر کاربند ہوئی، پوری امت کا چار تدوین شدہ مذاہب میں سے کسی ایک کی پیروی پر اجماع ہو گیا جو صدیوں سے جاری ہے۔ تیرہویں صدی میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو ایک طرف تقلید کو شرک کہتا ہے، دوسری طرف خود سر سے پاؤں تک کسی کی تقلید میں ڈوبا ہوا ہے یا اپنی راحت و آسانی اور ہواے نفس کا غلام ہے۔

ناظرین علماے حق کے رسائل و کتب کا مطالعہ کریں اور اس فرقہ جدیدہ کے فتنوں سے اپنی حفاظت کا سامان کریں۔

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے درجۂ فضیلت سال اول ۳۴-۱۴۳۳ھ کے طلبہ کی خوش بختی ہے کہ وہ فرقۂ لامذہباں کے رد میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے رسائل کا مجموعہ مفید اور دل کش انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ رسائل بحث و تحقیق کا بیش بہا نمونہ اور علوم و معارف کا گراں قیمت خزانہ ہیں جن سے

حسب لیاقت و صلاحیت ان شاء اللہ عوام و خواص سبھی مستفید و مستنیر ہوں گے۔

اس سلسلہ میں ان طلبہ اور ان کے جملہ رفقا و معاونین کی مساعی جمیلہ کو ربّ کریم شرف قبول سے نوازے، انھیں مزید دینی و علمی خدمات کی توفیق مرحمت فرمائے اور ہر محاذ پر ان کی یاوری و دست گیری فرمائے۔

وهو المستعان و عليه التكلان.

و صلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيد المرسلين خاتم النبين و علىٰ آله وصحبه الراشدين المهدين و أئمة المذاهب الحقة الراسخين المجتهدين، وعلىٰ من تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

۲۵؍ ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ/۸؍ مارچ ۲۰۱۳ء بروز جمعہ

❁❁❁❁❁❁

کلمات تکریم[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ☆حامداً و مصلیاً ومسلماً

مولانا محمد انور نظامی کی یادداشت کے مطابق تقریبًا پچیس سال پہلے میں نے تہذیب سیرت ابنِ ہشام (از عبد السلام ہارون مصری) انھیں اردو ترجمے کے لیے سپرد کی تھی، اس وقت میرا خیال تھا کہ ترجمہ مکمل ہو جانے کے بعد میں اصل عربی اور ترجمہ دونوں سامنے رکھ کر نظر ثانی کر لوں گا، مگر جب ترجمہ مکمل ہو کر میرے پاس آیا تو نظر ثانی کی صعوبت کا احساس کرتے ہوئے یہ کام ٹلتا رہا۔ کسی ترجمے پر نظر ثانی کے ذیل میں تجربہ ہو گیا تھا کہ اصل اور ترجمے کو بار بار دیکھنا پڑتا ہے، پھر بہت غور و خوض کے بعد اصلاح ہو پاتی ہے۔ مولانا محمد انور کا ترجمہ مع اصل دیکھنے کی نہ ہمت کر پاتا تھا، نہ وقت میں اتنی گنجائش نظر آتی جو اس کام سے خاطر خواہ عہدہ برآ ہونے کی مہلت دے۔

بالآخر میں نے عزیز موصوف سے کہا کہ اب دس بارہ سال تدریس، تقریر، تحریر اور تحقیق کے تجربات سے گزر جانے کے بعد آپ اپنی پرانی تحریر دیکھیں گے تو خود بڑی حد تک درست اور بہتر بنا لیں گے۔ انھوں نے بھی محسوس کیا کہ کتاب کو بالکل موقوف رکھنا اچھا نہیں، کام آگے بڑھنا چاہیے۔ اس طرح وہ مسودہ لے گئے اور کام آگے بڑھایا۔

نظر ثانی، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ وغیرہ کے بعد انھوں نے ایک بار پھر ترجمہ میرے پاس بھیج دیا مگر کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی میں دیکھ نہ سکا۔ رجب ۱۴۳۴ھ میں مولانا کے فرزند محمد احمد جامی متعلّم جامعہ اشرفیہ کتاب واپس لینے آئے تو ہفتہ عشرہ کے بعد کچھ وقت نکال کر میں نے پچاس ساٹھ صفحات دیکھے۔

مولانا نے ترجمے میں سلاست، روانی اور اصل سے قریب تر رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ رائج علاماتِ وقف پر بھی توجہ دی ہے اور کئی باتوں کا لحاظ رکھا ہے، جس کی نشان دہی انھوں نے "آغازِ سخن" کے تحت کر دی ہے۔

امید ہے کہ یہ ترجمہ عوام و خواص میں بہ نظر قبول و استحسان دیکھا جائے گا۔

غالبًا ۱۹۸۷ء میں مولانا افتخار احمد قادری اور مولانا اسرار الحق بھاگل پوری نے عاتق بن غیث بلادی کی کتاب

(۱) مختصر سیرت ابن ہشام، ترجمہ مولانا انور نظامی، دائرۃ القلم، ہزاری باغ جھارکھنڈ، جنوری ۲۰۱۹ء

"معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية" کا ترجمہ کر کے اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ مگر عام ہندوستانی قارئین کے لیے خالص مقامات کا جغرافیائی تعارف میرے گمان میں بے کشش معلوم ہوا، اس لیے اشاعت موقوف رہی۔

مولانا محمد انور نظامی مصباحی جب "تہذیب سیرت ابن ہشام" کا ترجمہ کرنے لگے تو مجھے یاد آیا کہ ترجمۂ سیرت میں جہاں ان مقامات کا ذکر آئے وہیں حاشیے میں تعارف رکھ دیا جائے تو اسے بغیر کسی اکتاہٹ کے دل چسپی کے ساتھ پڑھ لیا جائے گا اور برمحل ہونے کی وجہ سے افادیت بھی زیادہ ہوگی۔

اس کے مطابق مولانا موصوف نے جغرافیۂ مقامات کو مناسب جگہوں پر حاشیے میں شامل کر دیا ہے۔ اور آخر کتاب میں ان کی ایک فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے دے دی ہے، جس کے باعث تلاش میں آسانی بھی ہوگی اور اصل کتاب کی جو ترتیب (بلحاظ حروفِ تہجی) ہے وہ بھی معلوم ہو جائے گی۔

بہر حال مولانا موصوف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے محنتِ شاقہ کے ساتھ بڑی مدت تک صبر اور انتظار کی مصیبت بھی جھیلی ہے۔ ساتھ ہی عفو و درگزر کا خواستگار ہوں کہ اپنی کم ہمتی یا کم فرصتی کی وجہ سے اولین ارادہ و خیال کی تکمیل سے قاصر رہا اور باضابطہ نظر ثانی نہ کر سکا۔

دعا ہے کہ ربِ کریم اپنے حبیبِ لبیب علیہ الصلاۃ والتسلیم کی سیرت مبارکہ کے سلسلے میں ہونے والی ان تمام مساعی جمیلہ کو شرفِ قبول سے سرفراز فرمائے اور قارئین کو ان سے مستفیض و مستنیر فرمائے اور ہم سب کو مزید دینی و علمی خدمات کی توفیق خاص سے نوازے۔ آمین یا أرحم الراحمین. بجاه حبيبك خاتم الأنبياء والمرسلين عليه و عليهم وعلیٰ آله وصحبه أفضل الصلاة والتسليم.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ

المجمع الاسلامی ملت نگر مبارک پور

۲۶ رجب ۱۴۳۴ھ/ ۶ جون ۲۰۱۳ء، پنج شنبہ

❁❁❁❁❁❁

حرف آغاز (۱)

باسمه وحمده تعالى وتقدس

زیر نظر کتاب " بخاری شریف کے ایمان افروز واقعات " کا نقش ثانی ہے۔ اس میں واقعات کے علاوہ احکام و آداب کو بھی جگہ دی گئی ہے اور حصۂ واقعات میں بھی کافی اضافہ ہے۔ بخاری شریف میں انبیاے کرام علیہم الصلاۃ والسلام سے متعلق مختصر احادیث کریمہ آئی ہیں، اسی طرح سرکار کے غزوات اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مناقب کا بھی ذکر ہے۔ زیر نظر کتاب میں انبیاے کرام علیہم السلام کے مزید حالات کتب تفسیر سے اخذ کر کے دیے گئے ہیں، اسی طرح صحابہ کرام علیہم الرضوان کے مزید حالات سیر و تاریخ کی کتابوں سے لے کر شامل کیے گئے ہیں۔ احکام کی احادیث کے تحت شروح حدیث اور کتب فقہ کی روشنی میں مختصر فوائد کا بھی اضافہ ہے۔

مندرجات کی اجمالی اور تفصیلی فہرست بھی دی گئی ہے۔ درس حدیث کو آسان، عام فہم اور دل چسپ بنانے میں عزیز محترم مولانا شبیر عالم مصباحی نے محنت شاقہ سے کام لیا ہے، ان کا علمی تعاون کرنے والے مولانا شاہد رضا مصباحی و مولانا عابد رضا مصباحی استاذان مرکزی دار القراءت، ذاکر نگر جمشید پور کا بھی کتاب کو آراستہ، پیراستہ اور مفید تر بنانے میں عمدہ کردار ہے۔

امید ہے کہ ان کاوشوں کے بعد کتاب عوام و خواص سبھی کے لیے باعث کشش، قابل مطالعہ اور نفع بخش ہوگی۔ مولا تعالیٰ ساری کوششوں کو قبول فرمائے، مصنف اور ان کے سارے معاونین کو اجر جزیل مرحمت فرمائے اور قبول خاص و عام سے نوازے اور مزید دینی و علمی خدمات مقبولہ سے سرفرازی بخشے۔ وهو الموفق لكل خير، وهو المستعان، وعليه التكلان، نعم المولى ونعم النصير. والصلاة والسلام على حبيبه سيد المرسلين، خاتم النبيين، وعلى آله وصحبه أجمعين. وعلى من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

محمد احمد مصباحی
نگران المجمع الاسلامی مبارک پور
وناظم تعلیمات، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

۲۶/ ربیع النور ۱۴۳۹ھ
۱۶/ دسمبر ۲۰۱۷ء شنبہ

(۱) بخاری شریف کے ایمان افروز واقعات، دوم، مولانا شبیر عالم مصباحی،

تقدیم (۱)

بسم الله الرحمٰن الرحيم حامداً ومصلياً ومسلماً

رب کائنات نے زمین میں اپنی نیابت و خلافت کے لیے حضرت آدم کی تخلیق فرمائی، فرشتوں کو حکم دیا: آدم کا سجدہ کرو، سب نے اطاعت کی، مگر ابلیس نے انکار کیا اور خلیفۂ رب کے سجدہ و تعظیم کے لیے تیار نہ ہوا، راندۂ درگاہ کر دیا گیا، اس نے قیامت تک جینے کی مہلت مانگی، رب کی طرف سے اسے یہ مہلت مل گئی، اب اس نے قسم کھا کر کہا میں سارے بنی آدم کی راہ ماروں گا، سب کو بہکاؤں گا، صرف تیرے منتخب اور مخلص بندے ہی میرے فریب سے بچ پائیں گے۔ اس عہد اور قسم کے مطابق ابلیس اس وقت سے آج تک اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ رب سے برگشتہ کرنا، دین حق سے دور کرنا، خدا کے مقرب بندوں کی تعظیم و توقیر سے روکنا، احکام الٰہی کی اطاعت سے نفرت و کاہلی اور خدا کی معصیت سے محبت و دل چسپی پیدا کرنا اس کا روز و شب کا مشغلہ ہے۔ بنی آدم کو راہ خدا سے جدا کرنے کے لیے وہ اپنی ساری توانائیوں اور جملہ اعوان و انصار کے ساتھ سرگرم سفر ہے۔ اور اس کا یہ سفر قیامت سے پہلے کسی منزل پر رکنے والا نہیں۔

رب رؤف و رحیم نے بھی اپنے ناتواں بندوں کو بے سہارا نہ چھوڑا، ان کی فطرت میں اپنی معرفت ودیعت فرمائی، انھیں فہم و ادراک کی قوتیں بخشیں اور اپنی ذات و صفات کی پوری معرفت کے لیے انفس و آفاق میں بے شمار دلائل و آثار جلوہ گر فرمائے۔ مزید برآں انبیا و رسل کو بھیجا، جو اس کے بندوں کو راہ حق سے وابستہ اور راہ شیطان سے برگشتہ کرتے رہیں۔ آخر میں اس نے اپنے نائب مطلق، حبیب برحق، محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کو ساری خلقت کا رسول اور کائنات کا آخری نبی بنا کر بھیجا، ان پر اپنا ابدی پیغام قرآن کی صورت میں نازل فرمایا جو ان کی نبوت و رسالت کا زندۂ جاوید معجزہ ہے۔

خاتم پیغمبراں، رحمت عالم، و عالمیاں ﷺ نے خلق خدا کی ہدایت، کفر و شرک سے صیانت اور ضلال و معصیت سے حفاظت میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، یہاں تک کہ حجۃ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار

(۱) انتصار الحق فی اکساد اباطیل معیار الحق، از مفتی ارشاد حسین رام پوری، اشاعت طلبۂ جماعت سابعہ جامعہ اشرفیہ، جمادی الآخرہ ۱۴۳۵ھ ۱۴۳۵ھ

صحابۂ کرام کو اس بات کا گواہ بنالیا کہ میں نے اپنے رب کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچادیا۔ دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ بلکہ اس سے قبل بھی کار دعوت وار شاد کی ذمہ داری اپنی امت کو سپرد کر گئے اور اس وقت سے آج تک امت کی ایک جماعت ہر دور اور ہر خطہ میں خلق خدا کی رہنمائی اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے حسب ہمت و توفیق سرگرم ہے۔

رب جلیل نے اپنے آخری نبی اور ہمہ گیر رسول کو بے پناہ طاقت و قوت اور خیر و برکت سے نوازا۔ ان کی دعوت و ہدایت کے طفیل لوگوں نے رب کو بھی پہچانا اور رسول کی عظمت کو بھی جانا۔ صحابۂ کرام یہ مانتے تھے کہ رسول کی ذات رب اور بندوں کے درمیان واسطہ و وسیلہ ہے۔ رب کا پیغام رسول ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اور اس امتِ دعوت سے خسف و مسخ اور استیصال جیسا عذاب رسول ہی کے وجود باسعود کی برکت سے اٹھالیا گیا ہے۔

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ "[۱]

اور اللہ کا کام نہیں کہ انھیں عذاب کرے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہو۔

رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ ہمارے دکھ درد کا درماں اور ہمارے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ہے۔

"وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا."[۲]

اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمھارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائیں تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔

کسی صحابی کی آنکھ کا ڈیلا خانے سے باہر آگیا تو رسول کی بارگاہ میں حاضری دی، فوراً علاج ہوگیا، کسی کی ہڈی ٹوٹ گئی تو آقا کی خدمت میں حاضری دی، ہڈی درست ہوگئی۔ قحط کی مصیبت سے دوچار ہوئے تو آقا سے درخواست کی، رسول نے دست دعا بلند کیا، باران کرم برسا اور برستا ہی رہا، سیلاب اور پریشانی کی شکایت کی، پھر دعا ہوئی، راحت مل گئی۔ کتب احادیث و سِیَر میں اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں کہ صحابہ نے اپنی مشکلات میں آقا سے استعانت و استمداد کی اور آقا کی عنایت و توجہ سے ان کی مشکلات کی زنجیریں کٹ گئیں۔

صحابۂ کرام کا ایمان تھا کہ رسول کی تعظیم فرض عین ہے اور رسول کی بے ادبی و گستاخی، کفر کی سند اور بربادی اعمال کی دستاویز ہے۔

---

(۱) سورۃ: الانفال، پ:۹، آیت:۳۳

(۲) سورۃ: النساء، پ:۵، آیت:۶۴

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شٰهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا. لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا.[۱]

بے شک ہم نے تمھیں بھیجا حاضر و ناظر اور خوشی اور ڈر سناتا، تاکہ اے لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی پاکی بولو۔

لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ.[۲]

اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلّا کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلّاتے ہو کہ کہیں تمھارے عمل اکارت نہ ہوجائیں اور تمھیں خبر نہ ہو۔

بارگاہ رسول کا ادب کرنے والوں کی قرآن کریم نے مدح فرمائی اور انھیں مغفرت و اجر عظیم کا مژدہ سنایا۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ."[۳]

بے شک وہ جو اپنی آوازیں پست کرتے ہیں رسول اللہ کے پاس وہ ہیں جن کا دل اللہ نے پرہیزگاری کے لیے پرکھ لیا ہے ان کے لیے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔

کچھ منافقین نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات کہے اور روایت کے مطابق حضور اقدس ﷺ کے علم غیب میں طعن کرتے ہوئے کہا: "وَمَا يُدْرِيْهِ بِالْغَيْبِ" انھیں غیب کی کیا خبر؟ بازپرس ہوئی تو بہانہ کر گئے اور کہا: ہم یوں ہی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اس پر خدائے قدوس نے برملا ان کی تکفیر نازل فرمائی جو رہتی دنیا تک کے لیے درس عبرت ہے۔

"قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ. لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ."[۴]

تم فرماؤ کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنستے ہو بہانے نہ بناؤ تم کافر ہو چکے مسلمان ہو کر۔

منافقین کی گستاخی، رسول کی شان میں تھی مگر رب جبّار نے اسے اپنی ذات اور اپنی آیات کے ساتھ بھی استہزا قرار دیا، ان کی بے جا تاویل قبول نہ فرمائی اور ان پر مومن ہونے کے بعد کافر ہونے کا حکم نافذ کر دیا۔

---

(۱) سورۃ: الفتح، پ:۲۶، آیت:۹-۸

(۲) سورۃ: الحجرات، پ:۲۶، آیت:۲

(۳) سورۃ: الحجرات، پ:۲۶، آیت:۳

(۴) سورۃ: التوبہ، پ:۱۰، آیت:۶۶-۶۵

فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارْ.

مختصر یہ کہ صحابہ کرام نے خدا کی توحید و تقدیس اور رسول کی تعظیم و تکریم دونوں کو اپنایا۔ خالق کائنات کا مطلوب بھی یہی ہے جس پر اس نے تخلیق آدم کے وقت ہی تنبیہ فرمادی کہ ملائکہ کو سجدۂ آدم کا حکم دیا۔ اگر کسی برگزیدہ بندے کی تعظیم رب کی توحید کے منافی ہوتی تو ملائکہ کو آدم صفی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سجدے کا حکم ہرگز نہ ہوتا اور تکریم آدم سے انکار کے باعث عزازیل راندۂ درگاہ نہ ہوتا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رب کائنات کو کارساز حقیقی جان کر اپنی حاجات کے وقت کبھی اس کی بارگاہ میں رجوع کرتے اور کبھی خدا کے رسول کو اس کی عطا سے قادر و توانا، مشکل کشا اور حاجات روا جان کر ان کی بارگاہ میں رجوع کرتے اور کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ ہوتا کہ رسول سے استغاثہ واستمداد کے سبب ان کا عقیدۂ توحید برباد ہوگیا۔ نہ ان کے خلاف قرآن نازل ہوا، نہ کبھی رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے استعانت و استمداد کے سبب تم مشرک ہوگئے۔ اب از سر نو اسلام لاؤ، بلکہ قرآن نے تو سارے اہل ایمان کو ہدایت فرمائی ہے کہ جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو تو رسول کی بارگاہ میں حاضری دیں وہاں اگر اپنے رب سے استغفار کریں اور رسول بھی ان کی شفاعت کر دیں تو خدا کی رحمت و مغفرت کا یقین رکھیں۔

اور رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو یہ ارشاد فرمایا کہ:

اِنَّ لِلّٰہِ عِبَادا اخْتَصَّھُمْ بِحَوَائِجِ النَّاسِ یَفْزَعُ النَّاسُ اِلَیْھِم فِی حَوَائِجِھِمْ اُولٰئِكَ الاٰمِنُوْنَ مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ.(1)

”بے شک اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جنھیں اس نے لوگوں کی حاجت روائی کے لیے خاص کر دیا ہے کہ لوگ اپنی ضروریات میں ان کی طرف رجوع کریں اور ان کی پناہ لیں۔ (یہ کون بندے ہیں جن کو یہ منصب حاصل ہے؟ سرکار نے فرمایا:) یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے عذاب سے بے خوف ہیں۔“

خدا کے عذاب سے بے خوف کون ہیں؟ اس کی نشان دہی قرآن فرماتا ہے۔ بڑی تاکید کے ساتھ ارشاد ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ. الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ. لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ.(2)

سن لو بے شک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ کچھ غم وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگاری کرتے ہیں

(1) رواہ الطبرانی فی المعجم الکبیر عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بسند حسن

(2) سورۃ: یونس، پ:۱۱، آیت: ۶۲-۶۴

انھیں خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔

حاجات میں مدد طلبی اور حاجت روائی کا یہ انتظام جب رب ہی کی طرف سے ہے تو یہ استعانت و اعانت توحید کے منافی کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور جب اس نے اپنے اولیا کو لوگوں کی حاجت روائی کی قوت بخشی ہے تو وہ بے اختیار اور عاجز و مجبور کیسے ہوئے؟ اور جب رب کی عطا سے اولیا مختار و حاجت روا ثابت ہوئے تو انبیا اور سید الانبیا علیہم التحیۃ والثنا کا مقام کیا ہوگا؟

صحابہ کرام کا جو عقیدہ تھا وہی پوری امت کا عقیدہ تھا۔ تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، صالحین اور جملہ مومنین کے نزدیک خدا کی توحید اور اس کے مقبول بندوں کی تعظیم میں کوئی منافات نہ تھی، خدا سے دعا و استغفار میں کسی مقرب بندے سے استعانت و توسل ایمان کے خلاف نہ تھا بلکہ خود قرآن کی ہدایت کا تقاضا تھا اور اس پر جملہ مومنین کا عمل تھا۔ تمام ائمہ نے قبر انور کی زیارت کے آداب میں اس کی صراحت کی ہے۔

گیارہ سو سال گزر جانے کے بعد سرزمین نجد پر ایک شخص محمد بن عبد الوہاب نامی پیدا ہوا جس نے بارہویں صدی ہجری میں قرآن و سنت اور اسلاف امت کے برخلاف ایک نیا دین تیار کیا، جس میں انبیا و اولیا کی تعظیم توحید کے منافی اور شرک قرار پائی۔ ابلیس نے تو صفی اللہ کے سجدے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ آدم مٹی سے پیدا ہوئے میں آگ سے۔ میں ان سے افضل ہوں تو ان کا سجدہ کیوں کروں؟ مگر صفی اللہ کے سجدۂ تعظیمی کو شرک اور حضرات ملائکہ علیہم السلام کو مشرک نہ کہا۔ اس نئے مذہب کی جسارت ابلیس کی جسارت سے بھی فزوں تر ہے۔

بارہویں صدی ہجری کے آخر میں شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کے گھرانے میں ایک شخص محمد اسمٰعیل نامی پیدا ہوا، وہ نجدی فکر سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی ترجمانی میں ”تقویۃ الایمان“ نامی ایک کتاب لکھی جو تیرہویں صدی کی چوتھی دہائی کے اواخر میں منظر عام پر آئی۔ اس میں بھی ایمانی عقائد کو طرح طرح کی بے جا دلیلوں سے شرک بتانے اور امت مسلمہ کو مشرک ٹھہرانے کی ظالمانہ کاروائی کی گئی ہے۔ اسی مصنف کتاب کے ذریعہ نجدی مذہب ہندوستان میں منتقل ہوا۔

شیخ محمد ابن عبد الوہاب نے ایک طرف تو امام احمد بن حنبل کی تقلید کا دعوی کیا اور خود کو حنبلی ظاہر کیا، دوسری طرف ائمہ مذاہب کی تقلید کو شرک کہا اور براہ راست کتاب و سنت کی پیروی کی دعوت دی۔

اسی طرح مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے ایک طرف اپنے کو حنفی اور امام ابو حنیفہ کا مقلد ظاہر کیا، دوسری طرف اماموں کی تقلید کو بدعت و گمراہی قرار دیا۔ اس کے نتیجے میں اس نئے مذہب کو ماننے والے دو گروہ میں بٹ گئے ایک مقلد حنفی جو بعد میں دیوبندی کے نام سے معروف و مشہور ہوا۔ دوسرا غیر مقلد جس نے اپنے کو کبھی

محمدی کہا، کبھی اہل حدیث، کبھی سلفی یا اثری۔ حسب زمانہ وماحول کئی نام تجویز کیے۔ اہل سنت میں یہ دونوں گروہ وہابی کے نام سے معروف ہیں اور امتیاز کے لیے اول کو دیوبندی ثانی کو غیر مقلد کہا جاتا ہے۔

دونوں گروہوں کے اندر اعمال اور فروع میں تو اختلاف رہا مگر بنیادی عقائد میں دونوں متفق اور متحد رہے۔ اگرچہ غیر مقلدین اب دیوبندیوں کو بھی بڑی شدت کے ساتھ مشرک قرار دیتے ہیں۔ جس کے دو سبب بتاتے ہیں ایک: تقلید امام ابو حنیفہ۔ دوم: اتباع تصوف وطریقت اور یہ کہ دیوبندی بھی اپنے علما واکابر اور وفات یافتہ بزرگوں سے توسل واستعانت کے قائل وعامل ہیں اور اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں علم غیب، اختیار وتصرف وغیرہ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کتابوں سے عیاں ہے جو طبقۂ دیوبند نے خاص اپنے بزرگوں کے حالات وسوانح میں لکھی ہیں۔ جیسا کہ اہل سنت کے معروف عالم دین علامہ ارشد القادری نے اپنی کتاب "زلزلہ" اور "زیروزبر" میں اسے مکمل ثبوت اور تفصیلی شواہد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور غیر مقلدوں نے اپنی کتاب "الدیوبندیۃ" میں ان تفصیلات کو درج کرکے ان پر برملا مشرک ہونے کا حکم لگایا ہے۔

وہابیہ کے عقائد جو کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان وغیرہ میں درج ہیں۔ سیف الجبار (از علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ ۱۲۱۳ھ-۱۲۸۹ھ) میں علمائے مکہ کے جواب کے ساتھ مذکور ہیں۔

چند عقائد یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ یقین جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔
(تقویۃ الایمان، ص:۱۳، راشد کمپنی دیوبند)

(۲) اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی اور کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔ (ص:۷)

(۳) اس طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو کہ جب چاہے کر لیجیے یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے۔ (ص:۱۸)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم الٰہی ازلی دائمی نہیں۔ تمام اشیا کا علم اسے پہلے سے اور ہمہ وقت حاصل نہیں۔ ہاں اس کے اختیار میں ہے جب چاہے حاصل کر لے۔ انبیا سے نفی علم غیب کے جوش میں خدا کے جہل کا اثبات کر ڈالا۔ معاذ اللہ

(۴) کسی انبیا واولیا یا امام یا شہیدوں کی جناب میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب کی بات جانتے ہیں بلکہ حضرت پیغمبر کی جناب میں بھی یہ عقیدہ نہ رکھے اور نہ ان کی تعریف میں ایسی بات کہے۔ (ص:۲۳)

(۵) سو چھوٹی چیز (جیسے نمک وغیرہ) بھی اسی سے مانگنا چاہیے کیوں کہ اور کوئی نہ چھوٹی چیز دے سکتا ہے نہ بڑی۔ (ص:۳۱)

(۶) کسی کی محض تعظیم کے واسطے اس کے روبرو ادب سے کھڑے رہنا انھیں کاموں میں سے ہے کہ اللہ نے اپنی تعظیم کے واسطے ٹھہرائے ہیں۔ سو اور کسی کے لیے نہ کیا جائے۔ (ص:۳۷، تقویۃ الایمان)

اِنَّ القِیَامَ بَیْنَ یَدَیْ اَحَدٍ شِرْكٌ۔ (کتاب التوحید صغیر) کسی کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا شرک ہے۔

(۷) جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔ (تقویۃ الایمان، ص:۳۶)

(۸) سب انبیا اور اولیا اس کے روبرو ایک ذرۂ ناچیز سے بھی کم تر ہیں۔ (ص:۴۸)

(۹) جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی۔ (ص:۵۲)

(۱۰) جیسا کہ ہر قوم کا چودھری اور گاؤں کا زمین دار، سو ان معنوں کر ہر پیغمبر اپنی امت کا سردار ہے۔ (ص:۵۵)

(۱۱) إن السفر إلى قبر محمد ومشاهده ومساجد آثاره وقبر أي نبي و ولي وسائر الأوثان، وكذا طوافه وتعظيم حرمه وترك الصيد والتحرز عن قطع الشجر وغيرها شرك أكبر.[1]

سفر کرنا محمد (ﷺ) کی قبر کی طرف، ان کے مشاہد اور مساجد آثار کی طرف اور کسی نبی وولی کی قبر اور دیگر بتوں کی طرف، ایسے ہی اس کا طواف، حرم کی تعظیم، اور شکار نہ کرنا درخت نہ کاٹنا اور اس طرح کے کام سب شرک اکبر ہیں۔

(۱۲) یہ جسم وجسمانیات کی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے بھی جہت مکان اور جسم مانتے ہیں۔ عبد العزیز بن سعود نجدی کی تصنیف "الهدية السنية" میں ہے: (اس کے اردو ترجمے کا نام تحفۃ الوہابیہ ہے) ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہت علو میں ہے۔

نواب صدیق حسن خان بھوپالی غیر مقلد کی تصنیف "الاحتواء علی مسئلة الاستواء" میں ہے:
"اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہے اور عرش اس کا مکان ہے۔ اس نے اپنے دونوں قدم کرسی پر رکھے ہیں اور کرسی اس کے قدم رکھنے کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جہت علو وبلندی میں ہے۔ اس کے لیے جہت کی بلندی ہے، رتبے کی بلندی نہیں۔ وہ عرش پر رہتا ہے اور ہر رات آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے۔ اس کے لیے دایاں ہاتھ، بایاں ہاتھ، قدم، ہتھیلی، انگلیاں، آنکھیں، چہرہ اور پنڈلی وغیرہ تمام اعضا ثابت ہیں"

(۱) کتاب التوحید صغیر، سیف الجبار، ص:۱۳۰

شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تصنیف ایضاح الحق میں ہے: ”تنزیہ او تعالیٰ از زمان و مکان و جہت و اثبات رویت بلا جہت و محاذات (الیٰ قولہ) ہمہ از قبیل بدعات حقیقیہ است“

”اللہ تعالیٰ کو زمان و مکان اور جہت سے پاک ماننا اور اس کا دیدار جہت اور مقابلہ کے بغیر ثابت کرنا، یہ ساری باتیں بدعات حقیقیہ سے ہیں۔“

(۱۳) اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔ (۱)

(۱۴) نماز میں پیر یا کسی بڑے بزرگ کا تصور کرنا خواہ رسول اللہ ﷺ ہی کا تصور کیوں نہ ہو اپنے گدھے اور بیل کے خیال میں ڈوب جانے سے بدر جہا بدتر ہے۔ (۲)

تقویۃ الایمان نے انبیا و اولیا کی شان میں گستاخی اور ان کی تنقیص و تحقیر کی ایک فضا تیار کی جس کے نتیجے میں اس فرقے کو ماننے والے انبیا و اولیا کی بارگاہوں میں بے باک اور جری ہو گئے۔ توحید کے نام پر کمالات انبیا کا انکار انھوں نے اپنا شعار بنالیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ رسول سے نسبت رکھنے والی ہر چیز سے انھیں جلن ہونے لگی۔ ان کی کتابیں خصوصاً فتاوی رشیدیہ دیکھیے۔ میلاد رسول کی محفل کو کس کس حیلے سے ناجائز و حرام کہا ہے۔ خدا کی عطا سے بھی رسول کے لیے علم غیب کا انکار یہاں تک لے گیا کہ حفظ الایمان میں مولوی اشرف علی تھانوی نے علم رسول کو جانوروں، پاگلوں، کے علم سے تشبیہ دی، براہین قاطعہ میں مولوی خلیل احمد انبیٹھی اور مولوی رشید احمد گنگوہی نے شیطان کے لیے تو علم کی وسعت مان لی مگر علم رسول کی وسعت ماننے کو شرک ٹھہرایا۔ تحذیر الناس میں مولوی محمد قاسم نانوتوی نے خاتم النبیین ﷺ کے بعد بھی نیا نبی آنا ممکن مانا، میاں جی نذیر حسین دہلوی وغیرہ نے چھ زمینوں میں چھ مثلِ سرور کائنات علیہ الصلوات والتحیات تجویز کیے۔

آج بھی تنقیص انبیا و اولیا کی جو فضا پائی جا رہی ہے وہ اُسی ماحول کی دین ہے جو تقویۃ الایمان نے اپنے بعد پیدا کیا اور جس کے سرگرم مبلغ برابر پیدا ہوتے رہے۔

دوسری طرف شیخ ابن عبد الوہاب نجدی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی نے ائمۂ مجتہدین سے بے نیازی اور عوام کے لیے عملی آزادی کی راہ ہموار کی اور اپنی کتابوں میں درس دیا کہ قرآن و حدیث سمجھنے کے لیے زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کتاب و سنت کو براہ راست سمجھ کر اس پر عمل کر سکتا ہے۔

اس فکر کی بنیاد اس لیے رکھی گئی کہ جس طرح فکری مذہب ساری امت سے الگ نئے عقائد پر تیار کیا گیا

---

(۲) رسالہ یک روزہ از شاہ اسمٰعیل دہلوی

(۳) صراط مستقیم از شاہ اسمٰعیل دہلوی

اور دور صحابہ سے لے کر اب تک کی ساری امت کو مشرک ٹھہرایا گیا اسی طرح عملی مذہب ایسا تشکیل پائے جو مذاہب ائمہ سے مختلف ہو اور جس میں راحتِ نفس زیادہ سے زیادہ ہو۔ لیکن اس میں انھیں پوری کامیابی نہ ملی، اس لیے کہ اجتہاد کی صلاحیت سے محروم تھے، کتاب و سنت میں نظر کر کے خود ہر باب میں نئے مسائل نکال نہیں سکتے تھے۔ اس لیے یہ راہ اپنائی کہ چاروں مذاہب سے چھان بین کر کچھ باتیں لے لی جائیں، اس میں یہ بھی خیال رکھا کہ جو مسائل اپنائے جائیں وہ ہندوستان میں زیادہ رائج مذہب، مذہب حنفیہ کے خلاف ہوں تاکہ یہ ظاہر ہو کہ یہ نئے مجتہدین اپنی سعی بلیغ سے ایک نیا مذہب تیار کر کے لائے۔ حالاں کہ ان کا ذاتی سرمایہ کچھ بھی نہیں اور جو کچھ مذاہب اربعہ سے الگ تھلگ سرمایہ ہے وہ انتہائی شرم ناک اور عبرت ناک ہے۔

مثلاً انھوں نے یہ حکم اختیار کیا کہ سفر میں دو نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں پڑھنا جائز ہے۔ خواہ اس طرح کہ عصر کو مقدم کر کے ظہر کے وقت میں پڑھ لیں یا اس طرح کہ ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے وقت میں پڑھیں۔ اسی طرح مغرب و عشا کی تقدیم و تاخیر۔ اسے جمع حقیقی کہتے ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک قرآن و حدیث کے مطابق ہر نماز کا وقت الگ الگ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

«اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا»

”بے شک نماز اہل ایمان پر وقت باندھا ہوا فریضہ ہے۔“ اور احادیث اس مضمون کی بہت ہیں۔

البتہ حنفیہ کے نزدیک جمع صوری جائز ہے، خصوصاً سفر میں۔ وہ اس طرح کہ ظہر آخر وقت میں پڑھی اور عصر اول وقت میں پڑھی۔ اسی طرح مغرب و عشا۔ صورۃً معلوم ہو گا کہ دونوں نمازیں یک جا پڑھی گئیں اور حقیقۃً ہر نماز اپنے وقت میں ادا ہوئی۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اہلیہ صفیہ بنت عبید کے وقت آخر کی خبر پائی اور دور تھے تو بڑی عجلت اور تیز روی کا سفر کیا اس میں دو نمازیں جمع کرتے گئے مگر اکثر روایت میں یہ صراحت ہے کہ مغرب آخر وقت میں پڑھی پھر کچھ انتظار کر کے عشا کی نماز پڑھی۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انھوں نے صرف صورۃً دونوں نمازیں جمع کیں، حقیقۃً جمع نہ کیں۔ بلکہ جتنی روایات میں پہلی نماز کی تاخیر اور بعد والی کی تقدیم مذکور ہے ان کا مفاد یہی ہے۔ اس لیے کہ جب بعد والی نماز کے وقت میں پہلی نماز کو حقیقۃً جمع کرنا مطلوب ہے تو مغرب کا وقت گزار کر فوراً مغرب و عشا پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، نصف شب کے بعد بلکہ طلوع فجر سے پہلے تک یہ کام ہو سکتا ہے۔ غروب شفق سے طلوع فجر تک عشا کا وقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس طویل وقت کے کسی حصے میں عشا کے ساتھ مغرب کو جمع کر سکتے ہیں، اول کی تاخیر اور ثانی کی تعجیل کی ضرورت تو جمع صوری میں ہے۔

مگر غیر مقلدین نے جمع حقیقی کو اختیار کیا اس لیے کہ راحت اور حنفیہ کی مخالفت دونوں اس میں جمع ہیں۔ لب حنفیہ کی جانب سے ان پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کا جواب دینے کے لیے شافعیہ کی پناہ لیتے ہیں، اور کمزور، ضعیف جو بھی انھوں نے لکھ رکھا تھا یہ بڑی دلیری سے ہمارے جواب میں نقل کر ڈالتے ہیں اور شرم نہیں کھاتے کہ امام شافعی کی تقلید تو شرک تھی، یہ ان کے مقلدین کی تقلید کیسے روا ہو گئی؟

چاروں مذاہب سے الگ انھوں نے تراویح آٹھ رکعات تراشی، اس لیے کہ آرام نفس اسی میں ہے۔ امام مالک سے ایک روایت ۳۶ر کی تھی وہ نہ لی، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت اور امام اسحٰق بن راہویہ و اہل مدینہ کا مذہب چالیس کا تھا اسے اختیار نہ کیا، کہ بیس سے بھی دوگنا بار تھا۔

چاروں مذاہب کے خلاف ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک مانا، اس لیے کہ یہ ایسا کار آمد نسخہ ہے کہ تین طلاق دینے کے بعد بھی بیوی گھر میں رکھی جا سکتی ہے، جب کہ دیگر مذاہب میں جدائی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

سارے مذاہب سے الگ ایک اور دل چسپ مسئلہ انھوں نے نکالا وہ یہ کہ عورت اگر کسی بالغ آدمی کو دودھ پلا دے تو وہ اس کا رضاعی بیٹا ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ خلوت اور سفر جائز ہو جاتا ہے۔ سعودی افسران اور ملازمین کو اپنی بیوی کے سفر میں خود ساتھ جانا یا کسی محرم کو ساتھ کرنا دشوار ہوا تو نجدی مفتیوں کو یہ نسخہ یاد آیا کہ عورت ڈرائیور کو دودھ پلا دے، وہ رضاعی بیٹا ہو جائے گا، پھر جہاں چاہے لے جائے اور خلوت میں رہے کوئی حرج نہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ مقلدین ائمہ کسی ایک امام کے مذہب کو اختیار کرتے اور اس کی تمام تفصیلات کی پابندی کرتے، غیر مقلدین کو یہ پابندی پسند نہ آئی تو انھوں نے یہ نعرہ لگایا کہ صرف کتاب و سنت کی پیروی کی جائے، ہر شخص قرآن و حدیث سے مسائل نکالے اور ان پر عمل کرے۔ ائمہ کی تقلید شرک ہے۔ اس پر وہ آیت اور تفسیر فٹ کی جو ان یہود کی مذمت میں آئی تھی جنھوں نے کتاب اللہ کے بر خلاف اپنے احبار و رہبان کے احکام کی پیروی کی جیسے انبیا و اولیا سے قدرت و اختیار کی نفی میں وہ آیات پیش کرتے ہیں جو بتوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ صحیح بخاری کے مطابق خوارج کا بھی یہی طریقہ تھا کہ وہ مشرکین سے متعلق آیات کو مومنین پر فٹ کرتے۔

مقلدین تو ائمہ کی بات اس لیے قبول کرتے ہیں کہ انھوں نے جو بیان کیا وہ کتاب و سنت سے ماخوذ ہے۔ خواہ عبارت و اشارت سے یا دلالت و اقتضا سے۔ ائمہ کا بیان کتاب و سنت کے بر خلاف نہیں بلکہ ان کا شارح و ترجمان ہے۔

مگر اب خود غیر مقلدین یہ بتائیں کہ ان کے ائمہ مثلاً نذیر حسین دہلوی، صدیق حسن بھوپالی، نواب وحید الزماں وغیرہ نے دیگر مذاہب سے اخذ کر کے یا اپنی پسند اور طبیعت سے جو مذہب تیار کر دیا کیوں ہر شخص کو اسی کے اتباع کی دعوت دی جاتی ہے اور ہر غیر مقلد کیوں اسی کی پابندی کرتا ہے؟ ہر شخص اگر کتاب و سنت سے مسائل اخذ کرتا تو سب کا حاصل ایک ہرگز نہ ہوتا، کسی کو اگر یہ سمجھ میں آتا کہ امام کے پیچھے قراءت فاتحہ فرض ہے تو کوئی اس کا بھی قائل ہوتا کہ فرمان رسول کے مطابق امام کی قراءت مقتدی کی بھی قراءت ہے۔ اور فرمان خدا کے مطابق یہ بھی سمجھ میں آتا کہ جب قرآن کی قراءت ہو تو سننا اور چپ رہنا ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ ان کا مقصد اور مدعا صرف یہ ہے کہ ساری امت سے الگ تھلگ فکری مذہب کی طرح سارے جہان سے جدا ان کا ایک عملی مذہب بھی ہو۔ کتاب و سنت کا نام اور اتباع قرآن و حدیث کی دعوت محض ایک فریب اور دل کش نعرہ ہے جس کے بغیر کسی دانا و بینا کو اپنے دام تزویر کا شکار بنانا نہایت مشکل ہے۔ چار مذاہب کے بعد ایک پانچویں مقررہ مذہب کا نام غیر مقلدیت ہے، جس کے ائمہ دوسری تیسری صدی کے بجائے تیرہویں چودہویں صدی کی پیداوار ہیں۔ دوسری تیسری صدی کے ائمہ کی تقلید تو شرک ہے مگر ان تیرہویں چودہویں صدی کے ائمہ کی تقلید معین فرض ہے۔ فیا للعجب

تنویر الحق، معیار الحق، انتصار الحق وغیرہ فروغ وہابیت و غیر مقلدیت کے پہلے دور کی نشانیاں ہیں۔ تنویر الحق نواب قطب الدین خان دہلوی (وفات: ۱۲۸۹ھ - عمر ۶۵ر سال) نے لکھی تھی اس کے جواب میں غیر مقلدوں کے مجتہد مطلق اور امام و پیشوا میاں جی نذیر حسین دہلوی (۱۲۲۰ھ - ۱۳۲۰ھ) نے معیار الحق لکھی اس کے جواب میں حضرت مفتی ارشاد حسین رام پوری (۱۲۴۸ھ - ۱۳۱۱ھ) علیہ الرحمہ نے **انتصار الحق** لکھی۔

یہ کتاب بڑی متانت اور سنجیدگی سے لکھی گئی ہے اور اپنے جوابات کی تائید میں ان کتابوں کی عبارتیں بھی پیش کی گئی ہیں جو مولف معیار کے نزدیک مستند و معتبر ہیں۔ ابتذال اور سوقیت سے مکمل پرہیز کیا گیا ہے۔

۱۳۱۳ھ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ - ۱۳۴۰ھ) نے "حاجز البحرین الواقی عن جمع الصلاتین" تصنیف فرمائی۔ اس وقت میاں جی نذیر حسین زندہ تھے۔ جمع صلاتین کے موضوع پر یہ کتاب اپنے حسن ترتیب، طرز استدلال، انداز نقد و جواب اور افادات بدیعہ کے لحاظ سے منفرد اور لاجواب ہے۔

درجہ سابعہ کے طلبہ نے ۱۴۳۴ھ میں ایک مجموعہ شائع کیا تھا (مخالفین تقلید کا ایک جائزہ - ۱۴۳۳ھ) اس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کے چھ رسائل تھے جن میں حاجز البحرین بھی شامل ہے۔

اس سال کے طلبۂ سابعہ نے نصر المقلدین، نصرۃ المجتہدین، حمایۃ المقلدین کی طرح **انتصار الحق** کا انتخاب کیا تاکہ قدیم علمی سرمایہ بھی محفوظ رہے۔

تنویر الحق اور معیار الحق کی طرح انتصار الحق کی اردو زبان بھی قدیم درس گاہی زبان تھی جسے سمجھنے میں عوام

تو عوام بہت سے علما و طلبا کو بھی خاصی دشواری پیش آتی۔ اس لیے زبان کی قدرے تسہیل خصوصاً تراکیب کی پیچیدگی کا ازالہ ضروری تھا۔ اس سلسلے میں مولانا محمود علی مشاہدی مصباحی اور مولانا محمد صادق مصباحی نے محنت شاقہ اٹھائی، اور مولانا نور محمد مصباحی نے ان کی معاونت کی۔ بعض طلبۂ سابعہ نے بھی حوالوں کی تخریج وغیرہ میں کاوش کی۔ جزاهم الله خير الجزاء.

مولانا محمود علی مشاہدی مصباحی جامعہ اشرفیہ میں مدرس ہیں اور باقی دو صاحبان مولانا محمد صادق مصباحی اور مولانا نور محمد مصباحی مدرسہ عربیہ سعید العلوم یکچھی پور ضلع مہراج گنج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مجھے بڑی مسرت اس بات پر ہے کہ ان حضرات نے اپنے خالص دینی و علمی ذوق کے تحت بغیر کسی عوض کے یہ کام کیا اور اس سے پہلے بھی کئی کام اس طرح کر چکے ہیں۔ جب کہ عموماً میں دیکھتا ہوں کہ ابنائے زمانہ میں بڑی تبدیلی آگئی ہے اور خالصاً لوجہ اللہ کچھ کرنے کا جذبہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس ماحول میں جب ایسے عزیزوں پر نظر جاتی ہے جنھوں نے دشواریوں کے باوجود بزرگوں کی روش کو باقی رکھا ہے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ویسے میں نے تو حالات سے مصالحت کر لی ہے اور اس بات کا قائل ہوں کہ سابقہ دور روحانی توانائی، مصائب پر صبر اور بے عوض کار خیر پر بے انتہا مسرت و خوشی کا تھا؟ اب وہ بات نہ رہی، لوگوں کا معیارِ زندگی بڑھ گیا، ضروریات و سہولیات میں اضافہ ہوا، آسانی سے آدمی مشقت اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا، بہت سارے کام مردان کار کے انتظار میں رکے رہتے ہیں مگر دین کا کام رکنا نہیں چاہیے، جس قیمت پر بھی ہو سکے آگے بڑھانا چاہیے۔ ورنہ بڑے خسارے کا خطرہ ہے۔

خیال ہو رہا ہے کہ "انتصار الحق" کی اصل عبارت اور تسہیل شدہ زبان کا ایک نمونہ پیش کر دوں تاکہ قارئین کو ان حضرات کی کاوشوں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ (انتصار الحق مطبوعہ ۱۳۱۹ھ بار دوم)

زیر نظر نسخۂ انتصار الحق:

لہٰذا مولف معیار جو اس کے پہلے جواب میں کہتا ہے:

"شیخ سلام اللہ حنفی نے "محلّی" میں کہا ہے: معنی اس حدیث کے یہ ہیں کہ سایہ تیرا برابر تیرے ہو جائے، مع سایۂ اصلی کے تقریباً۔ اور جب سایہ اصلی کو اس میں سے علاحدہ کریں گے تو ایک مثل شئ سے، جو سوا سایۂ اصل کے ہو، بمقدار سایۂ اصلی کم ہوگا، اور وقت ظہر اس وقت تمام ہوگا، کہ سایۂ اصلی کے سوا ایک مثل کو سایہ شئ پہنچ جائے تو اس مقدار کمی میں کہ وہ بقدر سایۂ اصلی ہے، نماز امام و مسبوق بخوبی ادا ہو جائے گی۔" اھ خلاصة كلامه مع بعض الايضاح.

عجب توجیہ ہے! اس لیے کہ سایۂ اصلی کسی چیز کے اس سایہ کو کہتے ہیں جو سورج کے دائرۂ نصف النہار کے پہنچنے کا وقت ہوتا ہے اور سایۂ اصلی بلاد، اقالیم اور مختلف مہینوں میں مختلف ہوتا ہے، چنانچہ مولف اس مضمون کو کلام خطابی سے نقل کر چکا ہے۔ لہٰذا حدیث ابو ہریرہ (جو حدیث موقوف ہے بحکم مرفوع) کو اگر اسے مکہ اور مدینہ کے سایہ پر محمول کیا جائے، تو بعض ایام میں وہاں پر سایۂ اصلی ایک مثل شئ سے زیادہ ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ بلاد، اقلیم دوم میں سے ہیں اور ان میں بعض دنوں میں سایۂ اصلی آٹھ قدم سے زیادہ ہوتا ہے اور کسی شئ کا سایۂ مثل بقدر سات قدم ہوتا ہے یا بقدر ساڑھے چھ قدم، کما قال فی "شرح چغمینی" وغیرہ:

"وقد يقسم المقياس الثانى مرة باثنى عشر قسماً، و يسمى اقسامه: اصابع، ومرة اخرى بسبعة اقسام او ستة ونصف و يسمى اقسامه: اقداماً" اھ. مختصراً

تو جس وقت بقدر مثل سایہ کو جو حدیثِ مذکور میں مذکور تھا، مثل عرفی پر محمول کیا، یعنی سایۂ اصلی کے ساتھ ایک مثل ہو، تو جب بعض ایام میں سایۂ اصلی ایک مثل سے زیادہ ہوا، کما مر۔ تو ایک مثل مع سایۂ اصلی اور زیادتی کے مراد لینا ان ایام میں کس طرح ممکن ہوگا؟ خود سایۂ اصلی ہی ایک مثل شئ سے زیادہ ہے۔ اور اگر صرف سایۂ اصلی میں سے (جو ایک مثل شئ سے زیادہ تھا) بقدر ایک مثل لے لیا جائے، تو لازم آئے گا کہ نماز ظہر قبل از وقت ادا ہو، اس لیے کہ زوال کے وقت کسی شی کا سایہ آٹھ قدم سے زیادہ ہوگا۔ اور ایک مثل سے سات قدم سایہ ہے، تو لازم آئے گا کہ نمازِ ظہر ایک قدم اور چند دقیقہ پیش تر ادا کی جائے۔ اور اس امر کا کوئی عقل مند قائل نہ ہوگا۔ لہٰذا حدیثِ مذکور کا یہ محمل نکالنا سراسر غلط ہوگا۔

اسی لیے علامہ عبد الباقی زرقانی نے "شرح موطا" میں حدیثِ مذکور کے تحت لکھا ہے کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ سایۂ اصلی کے علاوہ کسی چیز کا سایہ ایک مثل کو پہنچ جائے، اس وقت نماز ظہر ادا کرو، و كلامه هذا:

"صل الظهر إذا كان ظلك مثلك، أي: مثل ظلك، يعنى قريباً منه بغير ظل الزوال" اھ.

یہ ایک نمونہ میں نے پیش کر دیا۔ بعض مقامات پر سابقہ نسخے کی عبارت ادق اور مشکل ترکیب پر مشتمل تھی (وہ حصہ بروقت میرے پیش نظر نہیں) ان حضرات نے بہت واضح اور آسان کر دیا۔

مولا تعالیٰ اس کتاب کی ترتیب و تسہیل اور طباعت و اشاعت میں بھی حصہ لینے والوں کو جزائے خیر سے نوازے۔ مولانا محمود علی مشاہدی مصباحی نے طلبۂ اشرفیہ کی علمی سرگرمیوں کا حال اپنے مضمون میں قدرے اجمال و تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے اس لیے میری سبک دوشی ہے۔ رب کریم ہمارے مدارس کے تمام ارکان، اساتذہ، طلبہ، معاونین اور سرپرستوں میں جذبات خیر و حق کو عام کرے۔ دین و علم سے

والہانہ شغف عطا فرمائے، دینِ حق کی دعوت اور علوم دینیہ کو جہان کے ہر گوشے میں پہنچانے کی توفیق جلیل مرحمت فرمائے۔ مصیبت و معصیت ہر ایک سے دور سے دور تر رکھے اور دارین کی سعادتیں نصیب کرے۔

وما ذلك عليه بعزيز:

والصلاة والسلام على أكرم الأولين والآخرين وعلى آله وصحبه ومجتهدي شرعه واولياء دينه وصلحاء أمته أجمعين.

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

۲؍رجب ۱۴۳۵ھ/ ۲؍مئی ۲۰۱۴ء جمعہ مبارکہ

❁❁❁❁❁❁

كلمة المجلس [1]

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا وَّ مُسَلِّمًا

كان المنهج الدراسي في مادة النظم العربي يشتمل على المعلقات السبع و ديوان الحماسة ونحوهما من الكتب التي لا تتقيد بنزاهة المشمول و معاني الأخلاق الجميلة، و تحمل قسطًا كبيرا من مدح الملوك و الأمراء الجائرين، و الهجو البشع، و الفخر القبيح، و الغزل الرديء، و الخمر الحرام، و نزراً يسيراً من الحِكَم و الأدب الحسن.

و أهمل الأدباء مادة المديح النبوي في مجموعاتهم إلا ما شذّ و ندر. و لم يعتنِ به خُبراء الدراسات الأدبية، و مسئولو المناهج العربية كأن المديح النبوي ليس من الأدب في شيء.

و نعرف أنّ كثيرًا من المدائح صدر من أجلّاء الصحابة والتابعين الذين يُستند بكلامهم، و لهم مكانة مرموقة في حسن التعبير مع تمام الصدق، و اقتدارٌ فارع على أصناف البلاغة مع نزاهة المعاني، و سُموّ البيان، و ادّخار البدائع.

حق لكلامهم المنثور و المنظوم أن يُجمع و يُقرأ و يُدرس، و يستضاءَ به أدبًا و دينا و صلاحًا. و لقد منّ الله تعالى على أساتذة الجامعة الأشرفية إذ وجّه أنظارهم إلى هذا الكنز الغالي، والأدب العالي، و في مقدمهم أخونا الأستاذ يٰسٓ أختر المصباحي الأعظمي. فقد عزم على استخراج هذا الكنز من بطون الأوراق، و عكف مدة غير قصيرة على جمع منشوده من مظانه، وفاز بمرامه إذ قدم إلى أوساط المدارس الإسلامية العربية كتابًا يجمع أصناف المدائح النبوية من العصر الأول إلى العصور الأخيرة. ابتهج به العلماء والأدباء، و أهل المحبة الصادقة بالنبي الخاتم الذي أرشدنا إلى الدين الحق، و مهّد لنا سبيل كل خير، و كشف للخلق كل ضرّ و ضير.

تقرّر درس المديح النبوي في منهج الجامعة الأشرفية مذ سنة ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹م، واقتفاها كثير من أهل المدارس العربية، و كتب عليه بعض المدرسين حواشي حين تدريسهم الكتاب، منهم أنا و الأستاذ شمس الهدى المصباحي، والأستاذ نفيس أحمد المصباحي، ولا ريب أن الشعر يكون غامضًا صعبًا بالإضافة إلى النثر، لأن الشاعر يعبّر عمّا في ضميره بكلمات

---

[1] المدیح النبوی۔ مع تشریح و ترجمۂ اشعار، مولانا یٰسین اختر مصباحی، مجلس برکات جامعہ اشرفیہ، جون ۲۰۱۴ء۔

موجزة مجملة مبهمة متقيدًا بالوزن والقافية، و قد يبلغ به ضيق المجال حدَّ التعقيد و الإلغاز، والسامعون يتحيرون في فهم المراد، لكن الشاعر البارع يخرج من كل ضيق سالما محتفظًا بقدره لسعة اقتداره، و حسن تصرفه ، و بذلك تتجلى مكانته عاليةً شامخةً. أمّا القارئ الذي ليس له كثير إلمام و اعتياد بالنظر في الشعر فهو يضطرب و ينزعج بأدنى تغير في التركيب المالوف نثرًا و محادثةً، كتقديم الخبر على المبتدأ أو تقديم المفعول على الفعل أو الفاعل أو بُعد مرجع الضمير و نحو ذلك و لا يخلو الشعر عامةً عن مثل هذا التغيير اليسير.

و لذا نرى أن أهل العلم وضعوا الشروح للمنظوم العربي للقراء العرب و أهل الفارسية والأردية شرحوا المنظوم الفارسي و الأردي للناطقين بالفارسية و الأردية.

و "المديح النبوي" لاحتواءه على كلام المادحين القدامى والجدَد كان في أمس حاجة إلى الشرح ، و خاصة لغير الناطقين بالعربية، فطلبتُ من الأستاذ محمد صادق المصباحي أن يشرح الكلمات والتراكيب الصعبة، و يتركَ بعد كل بيت فراغًا أملؤه بإيضاح مغزى البيت في سطرين أو سطور بالعربية ثم بدا لي أن الإيضاح بالعربية لا يكفي بعض الطلاب إفهامًا و تسهيلًا ، و لا بد لسَدِّ حاجتهم من ترجمة الأبيات بالأردية الواضحة.

لكن العزيز المذكور انتقل من الجامعة الأشرفية إلى مدرسة قريبة من وطنه، و توقف هذا العمل ، ثم طلبتُ من الأستاذ ساجد علي المصباحي أن يجمع ما كتبتُ أنا والأستاذ شمس الهدى المصباحي و الأستاذ نفيس أحمد المصباحي، و يضيف إليه كثيرا مما تركنا إيضاحه و يحتاج إليه الطلاب، و طلبت من الأستاذ نفيس أحمد المصباحي أن يترجم الأبيات إلى الأردية ليسهل الفهم لكل طالب و مدرس له إلمام بالعربية، و اهتمام و اعتياد بفهم اللغة و تفهيمها.

فشكرًا لهما أن شرعا في أعمالهما، و أتمّا ، و أعدتّ النظر على الحواشي و الترجمة، و أرجو نفعهما للدارسين و المدرسين، و أسأل الله ربي عز و جل القبول، و الجزاء الموفور، و تعميم النفع . و هو المستعان و عليه التكلان. والصلاة و السلام على رسوله أشرف الخلق و على آله و صحبه أجمعين.

محمد أحمد المصباحي
رئيس المدرسين بالجامعة الأشرفية (مصباح العلوم)
مبارك فور ، مديرية أعظم جره. يوبي. الهند
و مدير مجلس البركات
قسم نشر المقررات الدراسية و إعدادها
بالجامعة الأشرفية

المجمع الإسلامي
۱۲/ ۷/ ۱٤۳٥ھ يوم الاثنين
۱۲/ ٥/ ۲۰۱٤م

على تقريب التهذيب[1]

بسم الله الرحمٰن الرحيم
حَامِدًا و مصليا و مسلّما

و بعد فقد سررت بأن الشيخ محمد حسان رضا العطارى قام بتحقيق تعليقات الإمام أحمد رضا القادري البريلوي رحمه الله تعالى على تقريب التهذيب للعلامة ابن حجر العسقلاني رحمه الله تعالى ، و ذكر في تقديمه على تعليقات التقريب ما لها من مزايا،وجمعها في التنبيهات و الإفادات ،و فصلهما بذكر أنواع التنبيه و الإفادة والإشارة إلى الشواهد.

لا تخفى مكانة العلامة العسقلاني في فنّ أسماء الرجال و علم الحديث. و قد ترك تراثا غاليا في العلمين ، و اشتهر بلقب " خاتمة الحفاظ " ، و علماء عصره الميمون و مَن بعدهم يرجعون إلى كتبه و يثقون به. و إنه لجدير بذلك لعلو كعبه و ارتفاع مقامه في العلوم . و ما استغنى عن نفثات يراعه مَن جاء بعده من جهابذة العلماء.

فالزيادة على ما كتبه الحافظ العلامة أمر صعب يتطلب سَعة الاطلاع و خُبرة الفن ، و أصعب منه الوقوف على أخطائه النادرة . و أصعب منه التنبيه على زلّات العظماء بالتزام الإجلال و حسن الأدب ، بدون الكبر و العُجب ، و بدون الغضّ من أقدارهم و مراتبهم السامية .

لكن الإمام أحمد رضا القادري في تعليقاته على "التقريب" زاد فوائد كثيرة ، و نبّه على أخطاءٍ و زلّات ، و بيّن ما هو الحق والصواب . و هذا دليل على طول باعه في العلوم ، و قدرته المدهشة على الفنون ، و حسن تصرفه في التحرير و التنقيح ، مع الاعتراف بعظمة المتقدمين ، و التزام الأدب و التواضع لحضراتهم .

كانت إفادات الإمام أحمد رضا قدس سره كنزًا مخفيّا لا تصل إليه أيدي

[1] حاشیہ امام اہل السنہ، محمد حسان رضا العطاری، دار النعمان، کراچی، ۱۴۳٦ھ/۲۰۱۵ء

الطالبین و عیون المشتاقین، لکن الشیخ محمد حسان رضا العطاری بذل جهوده في إخراجها من معدنها ، و سعى في تحقيقها و إصدارها ، و وضعها على طرف الثمام لينتفع بها الخاصة و العامة . و قد ذكر مراجع كثيرة لما كتب الإمام أحمد رضا رحمه الله، و في عدة مواضع أضاف إليه من رسائله و فتاواه ما ينفع، و يوضح المرام، و بمواضع أضاف من عند نفسه فوائد نفيسة، و كلّ من يرى تحقيقه بعين الإنصاف و الاعتبار يعترف أن الشيخ راجع كثيرا من المصادر بدون سآمة و ملل ، و أخذ منها ما يجب أو يحسن إيراده لإيضاح تعليقات الإمام و تائيدها ، و تكثير جدواها ، و توفير منافعها . و لم يألُ جهدًا في إصدارها بثوب قشيب أنيق ، و منظر رائع جميل ، و صورة مفيدة ممتعة رائجة في عصرنا هذا ، محتوية على العلامات و الأوقاف و تقطيع العبارات. فجزاه الله تعالى خير ما يجزي به العلماء العاملين المجتهدين في سبيل نشر العلم و الخير . و وَفّقه و إيّانا للعمل بمرضاته ، و رزَقه القَبول بفضله و إنعامه . إنه لجواد كريم.

و صلى الله تعالى و بارك و سلم على سيد المرسلين خاتم النبيين و على آله و صحبه أجمعين.

محمد أحمد المصباحي

عضو المجمع الإسلامي بمبارك فور

و مدير التعليم بالجامعة الأشرفية ، مبارك فور

۱۵/ ۱۱/ ۱٤۳۵ھ

۱۱/ ۹/ ۲۰۱٤م

كلمةُ المجلس (۱)

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّ مُصَلِّيًا و مُسَلِّمًا

جرح و تعدیل سے راوی کے متعلق یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی روایت قابل قبول ہے یا نہیں پھر راوی اور روایت کا درجہ کیا ہے۔ اس کے لیے راوی کے جملہ حالات سے آگاہی لازم ہوتی ہے اور کبھی یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شیخ سے کسی نے کوئی حدیث روایت کی ہے تو اس شیخ کے دیگر تلامذہ سے وہ حدیث مروی ہے یا نہیں؟ اگر مروی ہے تو دونوں میں موافقت ہے یا مخالفت؟ اس کے لیے مزید علم اور وسعتِ اطلاع کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرح و تعدیل سے متعلق کلام کرنے والے ائمہ کی تعداد بہت کم ہے جب کہ راویانِ حدیث اور محدثین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

جرح و تعدیل سے متعلق کچھ بحثیں کتب اصول حدیث اور کتب اسماء الرجال میں ملتی ہیں۔ ان کو یکجا کرنے کے بعد کچھ اصول و ضوابط مستنبط ہوتے ہیں جن کو سامنے رکھ کر راوی اور روایت کے درجۂ قبول و استناد کی تعیین ہو سکتی ہے۔

یہ اصول یکجانہ تھے ابو الحسنات مولانا عبد الحی فرنگی محلی علیہ الرحمہ (۱۲۶۴ھ — ۱۳۰۴ھ) نے "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" کے نام سے اس فن کے اہم اصول کو جمع کیا۔ یہ کتاب پہلی بار مطبع انوار احمدی لکھنؤ سے ۱۳۰۱ھ میں اور دوسری بار مطبع علوی لکھنؤ سے ۱۳۰۹ھ میں ۳۰ صفحات پر شائع ہوئی اور اس فن کی منفرد کتاب شمار کی گئی۔

پھر مشہور محقق علامہ زاہد الکوثری (۱۲۹۶ھ — ۱۳۷۱ھ) کے شاگرد شیخ عبد الفتاح ابو غُدہ (۱۳۳۶ھ — ۱۴۱۷ھ) نے الرفع والتکمیل پر تعلیقات لکھ کر اشاعت فرمائی۔ ۱۳۸۳ھ سے ۱۴۰۷ھ تک اس کے کئی ایڈیشن تعلیقات میں اضافوں کے ساتھ اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ ہمارے پیش نظر اس کا آٹھواں ایڈیشن ہے جو ۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اسے شیخ ابو غدہ کے فرزند شیخ سَلمان کے اہتمام میں شرکۃ دار البشائر الاسلامیہ بیروت نے ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء میں شائع کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ (۱۲۷۲ھ — ۱۳۴۰ھ) کی تصانیف خصوصاً حاجز البحرین الواقی عن جمع الصلاتین (۱۳۱۳ھ) اور منیر العین فی تقبیل الابہامین (۱۳۱۳ھ) میں بھی اصول حدیث اور جرح و تعدیل سے متعلق قیمتی افادات متفرق طور پر موجود ہیں۔

(۱) اصول جرح و تعدیل، مولانا محمد صدر الوریٰ قادری، مجلس برکات جامعہ اشرفیہ، جنوری ۲۰۱۵ء

۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء میں تنظیم المدارس کے قیام کے بعد جب ۱۸/۱۹ر ربیع النور ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶/۲۷ر مارچ ۲۰۰۸ء کو نصاب تعلیم پر نظر ثانی کے لیے جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں تنظیم المدارس کی نشست منعقد ہوئی تو خیال ہوا کہ حدیث اور اصول حدیث کے ساتھ فنّ جرح و تعدیل سے متعلق بھی طلبہ کو مختصر اور بنیادی آشنائی ہونی چاہیے۔ اسی کے تحت ایک مختصر کتاب تیار کرنے کی تجویز طے ہوئی۔ کتاب کی ترتیب کا کام حضرت مولانا مجاہد حسین مصباحی استاذ دار العلوم غریب نواز الٰہ آباد کے ذمہ سپرد ہوا۔ موصوف لائق و فائق مدرس ہونے کے ساتھ شہرت یافتہ خطیب بھی ہیں، اس لیے چند سال بعد انھوں نے اپنی عدیم الفرصتی کا عذر پیش کر کے اس کام سے دائمی رخصت حاصل کر لی۔ خدا کرے ان کی سنجیدہ، مدلل، فکر انگیز اور مقبول خاص و عام تقریروں کا سلسلہ طالبان خیر کے لیے سدا منفعت بخش رہے۔ معیاری مقررین اور تقریروں کی بھی بڑی کمی ہے۔

موصوف کے بعد "اصول جرح و تعدیل" کی تحریر و ترتیب عزیز گرامی مولانا محمد صدر الوری قادری مصباحی کے سپرد ہوئی، انھوں نے مذکور الصدر مراجع اور دیگر مصادر سے استفادہ کرتے ہوئے زیر نظر کتاب جلد تیار کر دی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مضامینِ "الرفع والتکمیل" کے احاطے کے ساتھ امام احمد رضا قدس سرہ کے افادات کا بھی خاصا حصہ شاملِ کتاب ہو گیا۔ ربّ کریم مولانا موصوف کی دینی و علمی، قلمی و لسانی خدمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر فرمائے۔

کتاب اردو میں مرتّب کی گئی تاکہ طلبہ کے ساتھ دیگر شائقینِ فن بھی بآسانی استفادہ کر سکیں۔ ہو سکتا ہے موصوف جلد ہی اسے عربی کا جامہ بھی پہنا دیں، اس لیے کہ یہ ان کے لیے کوئی مشکل نہیں بلکہ اردو ترتیب کی بہ نسبت آسان ہے۔ تعریب کے بعد عرب اہلِ ذوق بھی اس مختصر سے مستفید ہو سکیں گے۔

مجلس برکات اور تنظیم المدارس کے لیے یہ مسرت کا موقع ہے کہ ایک اہم فن کی نئی پیش کش بغیر طولِ مُمِل واختصارِ مُخِل کے، اربابِ ذوق اور تشنگانِ علم کی ضیافت کا ذریعہ بن رہی ہے۔

واللهَ أسألُ أن يتقبّله بقبول حسن، و ينفعَ به كلّ مَن يطلبُ العلم والمعرفة و يوفّقنا لخدمة الدين و العلم ليلا و نهارا مع تمام العافية و حسن العاقبة بفضله و منّه و كرمه، و هو المولى، نعم المولى و نعم النصير ، و صلى الله و سلّم على رسوله هادي الإنس و الجانّ و على آله و صحبه ما تعاقب الملوان.

محمد احمد مصباحی
نگرانِ مجلس برکات
و ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور

۱۰ر صفر ۱۴۳۶ھ
۴ر دسمبر ۲۰۱۴ء پنج شنبہ

کلمۃ المجلس (۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا

ایک کام ہے لکھی ہوئی عربی عبارت کو صحیح طور سے پڑھنا، دوسرا کام ہے خود صحیح اور بامحاورہ عربی بولنا اور لکھنا، اسی طرح عربی عبارت کا دوسری زبان کے مزاج و محاورہ کے مطابق ترجمہ کرنا اور دوسری زبان کو عربی کے مزاج و محاورہ کے مطابق عربی میں منتقل کرنا۔

اول الذکر کے لیے عربی صرف و نحو سے آگاہی اور قواعد کے استحضار کے ساتھ ان کا اِجرا ضروری ہوتا ہے۔ غیر عرب (بلکہ اب عامیہ کے عادی عرب) کے لیے یہ بھی بڑا صبر آزما اور کٹھن کام ہوتا ہے جس میں ماہر و فائق عموماً کم ہی نظر آتے ہیں جب کہ عربی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے اور فراغت پانے والوں کی ایک لمبی تعداد نظر آتی ہے۔

ثانی الذکر کے لیے عربی کے ساتھ دوسری زبان کے قواعد و محاورات سے بھی آگاہی اور عملی مشق ضروری ہوتی ہے جس کے لیے اخّاذ ذہن، انتقادی فکر، وسیع مطالعہ اور طویل مشق و ممارست درکار ہوتی ہے۔ یہ اول الذکر سے زیادہ مشقت خیز، صبر آزما اور دشوار گزار عمل ہے اس لیے اس کے ماہرین کی تعداد بھی اقلِ قلیل ہے۔

نصاب تعلیم کا مقصد طلبہ کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا اور مزید مہارت و عبور کے لیے انھیں تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ابتدا ہی سے انھیں چھوٹی چھوٹی عربی عبارتیں صحیح پڑھنے کا عادی بنایا جائے پھر ایسی چھوٹی چھوٹی عبارتیں خود لکھنے بولنے اور دوسری زبان میں منتقل کرنے، اسی طرح دوسری زبان کو عربی میں منتقل کرنے کا بھی عادی بنایا جائے۔ جب مختصر عبارتوں پر قابو پالیں گے تو مشق و محنت اور تجرباتِ عمل سے گزرنے کے بعد لمبی عبارتوں، چھوٹے بڑے مضامین اور کتابوں کے مراحل بھی طے کر لیں گے۔

انھی مقاصد و فوائد کے پیش نظر نصاب میں صرف و نحو اور ادب و انشا کی کتابوں کو جگہ دی جاتی ہے اور اساتذہ کے ذریعہ طلبہ کو مطلوبہ مقاصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اساتذہ و طلبہ کی مشترکہ محنت، لگن اور انہماک و توجہ کے اعتبار سے کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے۔

(۱) مصباح الانشا، حصہ اول، مولانا نفیس احمد مصباحی، مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ، جولائی ۲۰۱۵ء

مصباح الانشا ثانی الذکر عمل کی تیاری کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے مندرجات اور متعلقات کے بارے میں خود مؤلف کتاب نے اپنی تقدیم میں تفصیلی گفتگو کی ہے، اس لیے مزید کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کا پہلا حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

رب کریم اسے بامراد و کامیاب اور مقبول خاص وعام بنائے اور بقیہ حصص بھی بطریق احسن جلد مکمل کرائے اور نافع انام بنائے۔ و هو المستعان و عليه التكلان، والصلاة و السلام على حبيبه سيد الإنس و الجانّ، و على آله و صحبه ما تعاقب الملوان.

محمد احمد مصباحی
ناظم مجلس برکات
و ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

۱۸ر رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ
۶ر جولائی ۲۰۱۵ء - دوشنبہ

❁❁❁❁❁❁

تقریب(۱)

دیوبندی مذہب تضادات کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف یہ لوگ تقویۃ الایمان کی پیروی میں کچھ ایسی باتوں کو شرک قرار دیتے ہیں جو عہد رسالت سے آج تک اہل اسلام میں متوارث طور پر رائج ہیں۔ مثلاً اللہ کی عطا سے انبیا و اولیا کے لیے اعانت و امداد، تصرف واختیار اور غیبی علم وادراک کی قوت ماننا، امت کا رسول کو خدا کی بارگاہ میں وسیلہ بنانا، اپنی مشکلات میں رسول کی مدد کا خواستگار ہونا، مقبولان بارگاہ خداوندی اور ان کے آثار و تبرکات کی تعظیم کرنا۔ ان باتوں کی وجہ سے وہ اہل سنت کو کافر و مشرک بتاتے ہوئے نہیں تھکتے اور اسے عقیدۂ توحید کی حفاظت اور دین کی عظیم خدمت تصور کرتے ہیں۔

مگر یہی عقائد وآداب جو انبیا و اولیا کے حق میں شرک بتاتے ہیں اور ان کی وجہ سے اہل سنت کو مشرک قرار دیتے ہیں خود اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں ایمان ٹھہراتے ہیں اور ایسے بے شمار واقعات اپنے اکابر کی حیات و ممات سے وابستہ دکھاتے ہیں جن میں ان کا غیبی علم وادراک بھی عیاں ہے، خدائی تصرف واختیار کی قوت بھی، دور دراز مقام میں رہتے ہوئے اپنے عقیدت مندوں کی غیبی وروحانی امداد بھی، مرنے کے بعد عالم برزخ سے عالم اجسام میں آنے اور حیرت انگیز تصرف کرنے کی طاقت بھی۔

یہ کیسا مذہب ہے جس میں وہی امور جو انبیا و اولیا کے حق میں ماننا شرک قرار پاتا ہے، انھی کو دیوبند کے بزرگوں کے حق میں ماننا عین اسلام قرار پاتا ہے۔ ایک سنی اگر انبیا و اولیا کے لیے ان کا اعتقاد رکھے تو وہ مشرک ہو جاتا ہے اور ایک دیوبندی اپنے بزرگوں کے حق میں ان کا اعتقاد رکھے تو وہ سچا پکا موحد اور مسلمان رہتا ہے۔

علامہ ارشد القادری نے اپنی کتاب "**زلزلہ**" میں دیوبندی مذہب کا یہ تضاد بڑی تفصیل سے رقم کیا ہے۔ جس کا جواب دینے کی ناکام کوشش کئی افراد نے کی مگر جواب کیا ہوگا، اپنی گردن میں **مزید الزامات** کا ہار پہن لیا جسے علامہ ممدوح نے اپنے جواب الجواب "**زیروزبر**" میں خوب واضح کیا ہے اور مزید واقعات و حقائق کے انبار لگا دیے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں مولانا **محمد یوسف رضا** قادری نے مولانا محمد زکریا کاندھلوی شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارن

(۱) بات ہماری کتاب تمھاری، از مولانا محمد یوسف رضا قادری، بھیونڈی

پور کی کتاب فضائل اعمال (مشمولہ تبلیغی نصاب) سے ۴۳ واقعات نقل کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم رحمت عالم ﷺ بعد وصال بھی اس جہان فانی کے حالات کا مشاہدہ فرماتے ہیں، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں، اور عہد صحابہ سے لے کر اب تک کی امت مسلمہ اپنی حاجتوں میں آقاے دوعالم ﷺ سے استمداد کرتی اور مدد پاتی رہی ہے۔ امت کے ائمہ، شیوخ و علما اور عوام بھی ہر دور میں رسول انور روحی فداہ ﷺ کے غیبی علم وادارک، روحانی تصرف واختیار اور سرکار سے استعانت و توسل کے قائل و معتقد رہے ہیں۔

ان امور کو خلاف اسلام اور شرک ٹھہرانا شیخ نجدی محمد ابن عبد الوہاب کی کتاب التوحید اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان کا پھیلایا ہوا نیا مذہب ہے جو ماضی کے اعلام امت، اولیاے ملت، ائمہ مذاہب اور حضرات صحابہ و تابعین کے اعتقاد و عمل سے صراحۃً متصادم ہے۔

شیخ نجدی نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ میرے شیوخ اور میرے شیوخ کے شیوخ چھ سو سال اوپر تک سب مشرک تھے۔ مگر جب ہم شیخ نجدی سے چھ سو سال قبل کے اساطین امت کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے شرکی فتوے سے وہ بھی محفوظ نظر نہیں آتے، بلکہ خدا اور رسول بھی اس کی زد میں آتے ہیں۔

علماے دیوبند کبھی وہ عقیدہ بیان کرتے ہیں جو اہل سنت کا ہے اور عہد رسالت سے آج تک تواتر و توارث کے ساتھ چلا آرہا ہے اور کبھی وہ عقیدہ اپناتے ہیں جو شیخ نجدی کی ایجاد ہے۔ اس اعتقادی تضاد کا فائدہ یہ اٹھاتے ہیں کہ جب ممالک عرب کے اہل سنت سے ملتے ہیں اور ان سے کوئی عزت و منفعت اور منصب وجاہ ملنے کی توقع ہوتی ہے تو یہ بتاتے ہیں کہ ہم توسل و استعانت اور تصوف و طریقت کے قائل و عامل ہیں، ہمارا مذہب وہی ہے جو اہل سنت کا ہے۔ اور جب سعودی و نجدی شیوخ و حکام سے ملتے ہیں تو اپنے کو ان کا ہم عقیدہ اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کا متبع ظاہر کرتے ہیں جس سے انھیں دولت و منفعت اور عزت و وجاہت بڑی فراوانی سے حاصل ہوتی ہے۔

غیر مقلدین — جو اپنے کو کبھی سلفی کبھی اثری کبھی اہل حدیث کہتے ہیں — دیوبندیوں کی اس دو رخی پالیسی اور سعودی ریال کے استحصال سے سخت برہم ہوئے اور زلزلہ و زیروزبر کے منظر عام پر آنے کے بعد انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں برملا یہ اعلان کیا کہ دیوبندی بھی بریلویوں کی طرح مشرک ہیں، یہ بھی اہل قبور کے لیے علم و اختیار اور ان سے استعانت و استمداد کے قائل ہیں۔ یہ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان سے بالکل منحرف ہیں۔ غیر مقلدین نے اپنے اس دعوے کو ان حوالوں سے ثابت کیا ہے جو زلزلہ اور زیروزبر میں مرقوم ہیں اور کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ اس لیے اب سعودیہ عربیہ میں اہل دیوبند کی وہ پذیرائی نہ رہی جو پہلے تھی۔

شیخ نجدی نے ساری دنیا خصوصاً اہل حجاز کو مشرک ٹھہرانے کی مہم اس لیے چھیڑی تھی کہ اس بہانے ان کی جان ومال کو مباح ٹھہرائے اور ان سے قتل و قتال کرکے خطہ عرب پر حکم رانی کا موقع ہاتھ آئے۔

پہلے یہ حربہ خوارج نے استعمال کیا تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تجویز پر حَکَم بنانا تسلیم کرلیا تو خوارج نے کہا: علی مشرک ہوگئے۔ قرآن میں ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام/۵۷) حکم تو صرف اللہ کا ہے۔ علی غیر خدا کو حَکَم مان کر مشرک ہوگئے۔ خوارج نے ان ساری آیات کو نظر انداز کردیا جن میں آپسی جھگڑوں کو کسی حکم اور فیصل کے ذریعہ طے کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وہابیہ نے بھی ساری امت مسلمہ کو مشرک ٹھہرانے کے لیے ان آیات کا سہارا لیا جن میں یہ ذکر ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ کے لیے ہے۔ طاقت وقوت صرف اللہ کے لیے ہے اور ان آیات کو یکسر نظر انداز کردیا جن میں خدا کی عطا سے بندوں کے لیے بھی علم اور قوت و اختیار کا حصول مذکور ہے۔ وہ ایاک نعبد و ایاک نستعین پڑھ کر یہ بتاتے ہیں کہ جیسے غیر اللہ کی عبادت شرک ہے ویسے ہی غیر اللہ سے استعانت بھی شرک ہے۔ مگر یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ بیٹا باپ سے مدد لیتا ہے، باپ بیٹے سے مدد لیتا ہے، حکومت پبلک سے مدد لیتی ہے، پبلک حکام اور افسران سے مدد لیتی ہے، خصوصاً سعودی حکومت ہر لحہ وہر آن امریکہ مہاراج سے مدد لیتی ہے۔ یہ سب کے سب غیر اللہ سے استعانت کرکے مشرک ہوگئے، روے زمین پر مسلم کوئی باقی ہی نہ رہا۔

اب اس الزام سے چھٹکارا پانے کے لیے کبھی فطری اور مافوق الفطرۃ کا فرق بتاتے ہیں، کبھی زندہ، مردہ کا فرق کرتے ہیں، کبھی اسباب ظاہری اور اسباب غیبی و روحانی کا فرق کرتے ہیں۔ لیکن قرآن میں تو یہ تفریق نہیں، ایاک نعبد کی طرح ایاک نستعین بھی کسی قید سے مقید نہیں، بیٹا باپ کی عبادت کرے، امتی، نبی کی عبادت کرے، رعایا بادشاہ کی عبادت کرے، کوئی بھی کسی غیر اللہ کی عبادت کرے قطعاً یقیناً مشرک ہے۔ جب یہاں کوئی تفریق نہیں تو استعانت میں تفریق کیوں؟ تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید میں تو ایسی کوئی تفریق مذکور نہیں۔

در اصل کسی ایک یا چند آیات و احادیث کو پکڑ لینا اور دوسری ساری آیات و احادیث کو نظر انداز کردینا، اس کا نتیجہ وہی ہوگا کہ آدمی حضرت علی جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو بھی مشرک ٹھہرانے کی جسارت کر بیٹھے گا۔ میری کتاب ”فتنوں کا ظہور اور اہل حق کا جہاد“ اسی طرح ”شرک کیا ہے؟“ میں اس عنوان پر کسی قدر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور علماے اہل سنت کی کتابوں میں تو اس طرح کے سبھی موضوعات پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ طالبان حق ان کا مطالعہ کریں۔

یہ کافر و مشرک ٹھہرانے کا جذبہ اس قدر عام ہوا کہ خود وہابیوں میں سے ایک ایسی جماعت نکلی جس نے

سعودیہ عربیہ اور ساری، مسلم حکومتوں کو کافر و مشرک اور مباح الدم قرار دیا، اس لیے کہ یہ حکومتیں خدائی قانون کو چھوڑ کر یورپ و امریکہ جیسے خود ساختہ قوانین پر کاربند ہیں۔ اس فکر کو سید قطب وغیرہ، شدت پسند وہابیہ نے فروغ دیا، جس کے نتیجے میں "داعش" جیسی تنظیمیں وجود میں آئیں، اور در پردہ یہود نے ان کے ہم نوائی اور تقویت کا سامان کیا، آج وہ پوری دنیا کے لیے خطرہ ہیں۔

مولانا **محمد یوسف رضا** قادری تحسین و تبریک کے مستحق ہیں کہ مسلمانوں کو مشرک بتانے والوں کا اعتقادی و عملی تضاد انھوں نے برہنہ کر کے منظر عام پر رکھ دیا۔ مولی تعالی اہل علم و عقل کو ہدایت نصیب فرمائے۔

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور
۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۶ھ / ۷/ ستمبر ۲۰۱۵ء دوشنبہ

❁❁❁❁❁❁

کلمة المجلس[1]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَ مُسَلِّمًا

مصباح الانشا کا پہلا حصہ شوال ۱۴۳۶ھ مطابق جولائی ۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اب اس کا دوسرا حصہ تیار ہے۔ امید ہے کہ صفر ۱۴۳۷ھ / نومبر ۲۰۱۵ء میں شائقین و قارئین کے سامنے ہوگا، ان شاء المولیٰ تعالیٰ۔

مصباح الانشا کی تیاری اور اس کی خصوصیات سے متعلق حصۂ اول میں مؤلفِ محترم مولانا نفیس احمد مصباحی تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اور راقم نے بھی کچھ عرض کیا ہے، اسے وہیں دیکھنا چاہیے۔

حصۂ اول درجۂ اولیٰ و ثانیہ کے لیے ہے اور حصۂ دوم درجۂ ثالثہ کے لیے ہے اس لیے اس کا معیار بھی اول سے بلند نظر آئے گا۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ ہمارے مقررہ نصاب میں عربی انشا کی مشق و تمرین درجۂ اعدادیہ ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ جس کے لیے فی الحال درجۂ اعدادیہ میں منہاج العربیہ اول، دوم اور درجۂ اولیٰ میں منہاج العربیہ سوم اور فیض الادب اول، دوم شامل نصاب ہیں اور اب درجۂ اولیٰ و ثانیہ میں مصباح الانشا (اول) بھی شامل ہو چکی ہے۔ جب کہ عربی ادب میں القراءۃ الرشیدہ اول و دوم درجۂ اولیٰ میں، اور مجانی الادب و ازہار العرب درجۂ ثانیہ میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں درجۂ ثانیہ و نصف ثالثہ میں اردو مضمون نگاری کے لیے بھی ایک پریڈ خاص کیا گیا ہے۔

ہر سابقہ درجے کی نصابی کتب اگلے درجے کے لیے وسیلہ اور زینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے سابقہ کتب پر عبور حاصل کیے بغیر اگلی کتابوں پر عبور تو در کنار، پڑھنا اور سمجھنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ اور انشا کی حیثیت تو ایک فن اور آرٹ کی ہے جس کے لیے صرف پڑھنا اور سمجھنا کافی نہیں بلکہ بھرپور مشق و ممارست ضروری ہے۔ اساتذہ کی بے توجہی یا طلبہ کی دانستہ یا نادانستہ کوتاہی کے باعث اگر سابقہ کتب پر عبور حاصل نہ ہوا تو اگلے درجے میں ان کا چلنا سخت مشکل اور بڑا دردِ سر ہوتا ہے۔

اس لیے ہر طالب علم کو ابتدا ہی سے اپنی نصابی کتب میں مہارت حاصل کرنی ضروری ہے تاکہ اگلے درجات کا سفر آسان ہو، اساتذہ کو بھی اس بارے میں کسی طرح کی بے توجہی، راحت طلبی اور تن آسانی کو دخل نہ دینا

---

(۱) مصباح الانشا، حصہ دوم، مولانا نفیس احمد مصباحی، مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ، دسمبر ۲۰۱۵ء

چاہیے۔ ہر طالب علم کو ایک بلند مقام اور عظیم مقصد کے لیے تیار کرنے کی ذمہ داری ان کے سر ہے، اس فرض منصبی سے تغافل یا غفلت کسی طرح روا نہیں۔

یہ نکات اس لیے عرض کیے گئے کہ عموماً غفلت شعار طلبہ اپنی ساری خرابیوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے سارا الزام کتاب ہی کے سر رکھتے ہیں کہ بہت مشکل ہے۔ اگر وہ ضابطے کے مطابق پوری تن دہی سے تحصیلِ علم کریں تو اس طرح کی شکایات ان سے سننے میں نہ آئیں۔ واللہ الهادي إلى سواء السبيل، و هو الموفّق لكل خير و الميسّر لكل صعب. والصلاة والسلام على رسوله خاتم النبيين و علىٰ آله و صحبه أجمعين.

محمد احمد مصباحی
ناظم مجلس برکات
و ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

المجمع الاسلامي
۱۳ر محرم ۱۴۳۷ھ شب سہ شنبہ
۲۶ر اکتوبر ۲۰۱۵ء

❁❁❁❁❁❁

تاثر گرامی[1]

مبسملاً وحامداً ومصليا ومسلّماً

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء ــــ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی ذاتِ گرامی تیرہویں چودہویں صدی کی وہ فقید المثال اور عبقری شخصیت ہے جس نے علوم و فنون کی جامعیت، اخلاص و تقویٰ اور بھرپور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ دنیا کی دینی، علمی، فقہی رہنمائی اور باطل افکار و خیالات سے لوگوں کی آگاہی اور حفاظت و صیانت کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے تابندہ قلمی نقوش آج بھی مشکلات سے دوچار اہل علم کی دست گیری اور ضلالت و بے راہ روی کے شکار افراد کی ہدایت و رہبری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس لیے ان قلمی نقوش کی حفاظت اور زیادہ سے زیادہ اشاعت ایسا کارنامہ ہے جو دنیا کی مشکل کشائی اور ہدایت و حفاظت کی راہ میں سنگ میل یا کلید باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ فجزی الله من قام بذلك ايمانا و احتسابا.

امام احمد رضا قدس سرہٗ کے علمی و فقہی کمالات کچھ ایسے نہیں کہ انھیں چند سطروں یا چند صفحات میں سمیٹا جا سکے۔ میں نے صرف جدّ المُمْتار علی ردّ المُحْتار کی جلد ثانی کے محاسن کو پیش کرنا چاہا تو ۱۵ر عنوانات قائم کرنے پڑے اور اختصار در اختصار کے باوجود تقریباً سو صفحات تیار ہو گئے، جو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں المجمع الاسلامی سے شائع ہو چکے ہیں۔

فتاویٰ رضویہ کی جلدوں کا بھی باضابطہ علمی جائزہ لیا جائے تو درج ذیل عنوانات نمایاں طور پر نظر آئیں گے:

(۱)- فکر انگیز تحقیقات
(۲)- کثیر جزئیات کی فراہمی اور نئے جزئیات کا اضافہ
(۳)- لغزشوں اور خطاؤں پر تنبیہ
(۴)- حلِّ اشکالات اور جواب اعتراضات
(۵)- فقہی تبحر اور وسعت نظر
(۶)- تحقیق طلب مسائل کی تنقیح اور مشکلات و مبہمات کی توضیح
(۷)- مراجع و مصادر کی کثرت
(۸)- غیر منصوص احکام کا استنباط
(۹)- علم حدیث میں کمال اور قوتِ استنباط واستدلال
(۱۰)- دلیل طلب احکام کے لیے دلائل کی فراہمی

[1] فتاویٰ رضویہ، جلد اول، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف۔

(۱۱)- مختلف اقوال میں تطبیق
(۱۲)- مختلف اقوال میں ترجیح
(۱۳)- اصول وضوابط کی ایجاد یا ان پر تنبیہات
(۱۴)- رسم المفتی اور قواعد افتا میں ہدایات
(۱۵)- فقہی فوائد
(۱۶)- اسماء الرجال پر نظر
(۱۷)- فضائل ومناقب کا ذکر
(۱۸)- فن عقائد میں افادات
(۱۹)- مسائل کلامیہ
(۲۰)- ردّ افکار باطلہ
(۲۱)- ہندسہ وریاضی، طبعیات، ہیأت وتوقیت، طب، علم لغت وغیرہا میں مہارت اور فقہ کے لیے ان کا استعمال
(۲۲)- مختصر الفاظ میں بیش قیمت افادات یعنی حسن ایجاز واختصار

فتاویٰ رضویہ کے محاسن وکمالات کی جلوہ نمائی کے لیے بعض احباب کی کوشش ہے کہ تقسیم کار کے اصول پر عمل کرتے ہوئے چند اہل علم کو مذکورۂ بالا عنوانات میں سے ایک ایک عنوان سپرد کیا جائے جس پر وہ تمام جلدوں کا جائزہ لیتے ہوئے کثیر شواہد، تفہیم وتوضیح کے ساتھ پیش کریں، اس طرح کم از کم دس ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں اور علمی دنیا امام احمد رضا قدس سرہٗ کی فقہی وفنّی عظمت سے بڑی حد تک روشناس ہو سکتی ہے۔ والله الموفق لكل خير، ودافع كل ضير. نعم المولى ونعم النصير. والصلاة والسلام على حبيبه البشير النذير وعلىٰ آله وصحبه وأولياء أمته وعلماء ملّته دعاة الدين القويم وحماة الشرع الحكيم.

(کیم محرم الحرام ۱۴۳۸ھ / ۳ر اکتوبر ۲۰۱۶ء)

❁❁❁❁❁❁

صدائے آفریں[1]

بسم الله الرحمٰن الرحيم حامداً ومصلياً ومسلماً

شریف العلما مولانا محمد ایوب شریف القادری علیہ الرحمہ سے میں ان کی زندگی میں متعارف نہ ہو سکا۔ ان کی وفات کے وقت حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے ان کا نام سنا تھا، مگر بعد میں وہ بھی یاد نہ رہا۔ چند سال پہلے جب شریف العلما کے فرزندوں سے ملاقات اور "پیرا کنک" "کشی نگر (سابق ضلع: دیوریا، یوپی) میری آمد ورفت ہوئی تو ان سے متعلق کچھ آشنائی ہوئی۔

ان کے حالات معلوم کرنے اور قید تحریر میں لانے کے لیے صوفی محمد سبطین میاں اور دیگر فرزندوں نے بڑی عمدہ پیش قدمی فرمائی، جس کا مشورہ کئی عظیم شخصیات سے متعلق کئی حضرات کو تقریباً تیس سال پہلے میں دیتا رہا مگر کسی نے اسے عمل میں لانے کی ہمت نہ کی۔ مگر سبطین میاں نے میرے مشورے کے بغیر از خود یہ راہ سوچی اور عملی پیش قدمی بھی شروع کر دی، وہ یہ کہ شریف العلما کے خلفا، مریدین، معتقدین اور متعلقین سے ملاقات کر کے ان سے متعلق بیانات "سی ڈی" میں محفوظ کر لیے جائیں پھر انھیں تحریری شکل دی جائے۔

اس کام کے لیے انھوں نے جواں سال عالم و فاضل مولانا کمال احمد علیمی نظامی استاذ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی، ضلع بستی کا انتخاب کیا، وہ تیار ہوئے اور لوگوں سے ملاقات کر کے حالات و واقعات جمع کیے، پھر بڑی محنت اور عقیدت کے ساتھ انھیں سلیس، شستہ اور رواں زبان میں مرتب کیا، معاونت اور کمپوزنگ کے لیے انھوں نے مولانا غلام سید علی علیمی نظامی کو بھی تیار کر لیا، اور بڑے سلیقے سے "حیات شریف العلما" جلد اول قابل اشاعت بنا کر پیش کر دی (مزید کام جاری ہے)

محبِ گرامی حضرت مولانا فروغ احمد اعظمی مصباحی صدر المدرسین دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی نے بھی انھیں اپنی رہ نمائی اور نظر اصلاح سے نوازا۔ نئے مسافروں کے لیے یہ ضروری بھی ہے اور انتہائی مفید و معاون بھی۔ بالغ نظر قارئین خود حسنِ جمع و ترتیب کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مشک آں ست...

[1] حیات شریف العلما، مولانا کمال احمد علیمی، مرکز مجلس ایوبی، کشی نگر، ۱۴۳۸ھ / ۲۰۱۷ء

بہت سی شخصیات ہیں جن کے معتقدین و متعلقین ان کے مفصل یا مختصر حالات شائع کرنے پر توجہ نہ دے سکے اور وہ پردۂ گم نامی میں چلی گئیں یا ان کے شایان شان ان کا تعارف نہ ہو سکا۔ لیکن شریف العلما کے معتقدین و متعلقین قابل تحسین و تبریک ہیں کہ انھوں نے اپنے محسن کو یاد رکھا اور دوسروں کو بھی ان سے باخبر کرنے کی تدبیر کی اور مزید کوشش جاری ہے کہ ان کا تعارف خوب سے خوب تر ہو سکے۔

مولا تعالیٰ اس کار خیر میں حصہ لینے والے تمام حضرات کو اپنی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے نوازے، سب کو دین حق اور شریعت طاہرہ پر استقامت بخشے اور دارین میں عزت و عافیت اور سرخ روئی و سرفرازی نصیب فرمائے۔ آمین یا أکرم الأکرمین بجاہ حبیبك سید المرسلین علیه وعلیهم أفضل الصلاۃ والتسلیم و علی آله وصحبه اجمعین.

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ
المجمع الاسلامی مبارکپور
۱۶ر ربیع الآخر ۱۴۳۸ھ
۱۵ر جنوری ۲۰۱۷ء یک شنبہ

❁❁❁❁❁❁

تقریظ جلیل (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً

دار العلوم محبوب سبحانی کرلا، ممبئی کے طلبہ کی انجمن "بزمِ فیضانِ رضا" قابلِ تحسین و مبارک باد ہے کہ وہ اپنی تعلیمی جد و جہد جاری رکھنے کے ساتھ اشاعت سے بھی دل چسپی رکھتی ہے اور ۱۹۸۳ء سے اب تک ہر سال کوئی اہم اور مفید کتاب شائع کرتی آ رہی ہے۔ امسال طلبۂ دار العلوم نے حضرت مولانا عبد الحکیم شرف قادری علیہ الرحمہ کی کتاب "عقائد و نظریات" کا انتخاب کیا اور سابقہ اشاعت پر مزید کدّ و کاوش کرکے اسے زیادہ عمدہ اور معیاری بنانے کی کوشش کی، مولا تعالیٰ اس مہم میں حصہ لینے والے تمام طلبہ و اساتذہ کو اپنی جزائے فراواں سے نوازے۔

"البریلویۃ- عقائد و تاریخ" بقلم احسان الٰہی ظہیر کے ذریعہ پورے روے زمین میں بسنے والے اہل سنت کے خلاف ایک مسموم فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی اور وہابی نظریات کی روشنی میں اہل سنت کے عقائد کو نشانہ بنایا گیا۔ اس کے جواب میں علامہ شرف قادری نے پہلے عربی میں "من عقائد اہل السنۃ" لکھی پھر اس کا اردو ترجمہ بنامِ "عقائد و نظریات" شائع کیا۔ اس میں بڑی متانت کے ساتھ قرآن و حدیث سے اور وہابیہ کے مستند حضرات کی تحریروں سے اہل سنت کے عقائد کی حقانیت ثابت کی گئی ہے۔ بطور خاص درج ذیل موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) حیاتِ انبیا علیہم السلام (۲) حضراتِ انبیا اور اولیا کے اختیارات (۳) علم مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا (۴) نورانیت و بشریت (۵) توسّل (۶) روحِ اعظم کی کائنات میں جلوہ گری۔

کتاب عوام و خواص سبھی کے لیے قابل مطالعہ و استفادہ ہے۔ مولا تعالیٰ سبھی کو توفیق خیر سے نوازے۔ آمین

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور
اعظم گڑھ، یوپی

المجمع الاسلامی
۱۸ر جمادی الآخرہ ۱۴۳۸ھ
۱۸ر مارچ ۲۰۱۷ء شنبہ

❁❁❁❁❁❁

(۱) عقائد و نظریات، مولانا عبد الحکیم شرف قادری، بزم فیضان رضا، کرلا، ممبئی، اپریل ۲۰۱۷ء

تقریظ جلیل (۱)

بسم الله الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً

مولانا حافظ قاری محمد رضا مصباحی نے تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل زیر نظر تاریخ بڑی محنت و مشقت اور جاں فشانی سے مرتب کی ہے۔ اس میں انھوں نے اردو کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی مراجع سے بھی استفادہ کیا ہے اور موجودہ علما اور تصانیف سے متعلق زیادہ تر ذاتی تلاش و جستجو کے نتیجے میں معلومات سپرد قلم کی ہیں۔

میں اپنی علالت اور مصروفیات کے باعث پوری کتاب پڑھ نہ سکا مگر فہرست پر نظر اور سرسری ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے دوسرے باب میں نیپال کی جغرافیائی حالت اور ملکی و سیاسی تاریخ بہت اختصار کے ساتھ تقریباً سو صفحات میں مرقوم ہے۔ چوتھے باب میں علمائے نیپال کی علمی و ادبی خدمات کا تعارف تقریباً ۷۴ر صفحات پر مشتمل ہے۔ پانچویں باب کے تحت تقریباً ۱۵ر صفحات میں نیپال کے مدارس اہل سنت کا تذکرہ ہے۔

زیادہ مبسوط اور مفصل تیسرا باب ہے جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کچھ نیپال میں مستقل رہنے والے صوفیہ و مشائخ کا ذکر ہے اور زیادہ ان علما و مشائخ اور ان کے سلاسل کا تفصیلی تذکرہ ہے جن کی آمد و رفت نیپال میں کسی تقریب یا تقریبات میں عارضی طور پر ہوئی۔ اس سے اہل نیپال اور دیگر قارئین کو ان بزرگوں سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا جن کے ارشاد و ہدایت سے نیپال کی دینی و علمی فضا کو فروغ و توسع حاصل ہوا، اور جن سے وابستگی کے طفیل ساکنان نیپال کے عقائد و اعمال کی حفاظت ہوتی رہی۔

ربّ کریم مولانا کی اس دینی و علمی کاوش کو مقبول خواص و عوام بنائے، نسلِ نو کو زیادہ سے زیادہ اس سے مستفید فرمائے اور مولانا کو مزید عمدہ اور اعلیٰ دینی و علمی خدمات انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ و ما ذلك علیه بعزیز.

محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

۲۲ر رجب ۱۴۳۸ھ، ۲۰ر اپریل ۲۰۱۷ء

❁❁❁❁❁❁

(۱) نیپال میں اسلام کی تاریخ، مولانا محمد رضا قادری، مکہ پبلی شر، دہلی، دسمبر ۲۰۱۷ء

تاثر گرامی (۱)

باسمه وحمده تعالى وتقدس

پٹنہ سے ڈاکٹر امجد رضا امجدؔ نے فون کے ذریعہ اطلاع دی کہ حجۃ الاسلام (علامہ حامد رضا خاں خلف اکبر امام احمد رضا قادری بریلوی قدست اسرارھما) کی حیات و خدمات پر "رضا بک ریویو" کا "حجۃ الاسلام نمبر" تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل منظر عام پر آنے والا ہے۔ آپ کے تاثرات مطلوب ہیں۔

میں نے مندرجات کی تفصیل جاننے کی کوشش نہ کی، کیوں کہ میری مسرت کے لیے یہی کافی ہے کہ موصوف نے اپنی محنت و جاں فشانی سے ایک ضخیم مجموعہ تیار کر لیا۔ اندازہ ہے کہ حجۃ الاسلام کے سلسلے میں منتشر طور پر ماضی و حال میں جو وقیع اور مستند رُشحات قلم ملے ہوں گے وہ انھوں نے سلیقے کے ساتھ یکجا کر دیے ہوں گے اور خود حضرت کے بھی کچھ قلمی نقوش شامل ہوں گے۔

محنت، لگن اور جفاکشی کے کرشمے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ حضرت کے وصال کو ایک طویل عرصہ گزر گیا، اب تلامذہ، مریدین، مستفیدین اور زائرین بھی نہیں ملتے، اس لیے ان کی حیات و خدمات پر زیادہ مواد ملنے کی توقع کم ہی ہوتی ہے۔ مگر "جوینده یابنده" کی مثل صادق ہے۔

امید ہے کہ موصوف کی کاوشوں سے یہ نمبر صحتِ کتابت، حسن ترتیب، کمالِ تحقیق اور اپنی معنویت و افادیت کے اعتبار سے ایک قابل قدر مرجع اور دستاویز کی حیثیت حاصل کرے گا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین۔

محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ

۲ر صفر ۱۴۳۹ھ / ۲۳ر اکتوبر ۲۰۱۷ء روز دوشنبہ

❁❁❁❁❁❁

(۱) رضا بک ریویو، پٹنہ، حجۃ الاسلام نمبر، جنوری تا ستمبر ۲۰۱۷ء

کلمۃ المجلس

باسمه وحمده تعالیٰ

عزیزی مولانا محمد سلمان رضا فریدی مصباحی کی "نظم عقائد" دیکھی، ان کی فنّی مہارت اور قادر الکلامی سے بڑی مسرت و خوشی ہوئی۔

شعر میں ایک تو وزن و قافیہ کی پابندی ہوتی ہے، دوسرے کم لفظوں میں زیادہ مَعانی کو پرونا ہوتا ہے، تیسرے ثقالت اور تعقید لفظی و معنوی سے بھی بچنا ہوتا ہے، چوتھے اس کے لیے شاعرانہ فطرت چاہیے، یا طویل مشق و مُمارست۔ اسی لیے کسی مضمون کو شعری قالب میں ڈھالنا ہر ذی علم کو میسر نہیں ہوتا۔

پھر ایک عام نظم و غزل کی دنیا ہوتی ہے، جہاں شاعر اپنے خیالات واِحساسات کا اظہار کچھ آزادی سے کر سکتا ہے، دوسری دنیا علمی مضامین کی ہوتی ہے، جس میں شاعر دلائل اور مسلّمات کا پابند ہوتا ہے، خصوصاً اگر کسی فن کی اصطلاحات کو اہل فن کے مطابق بیان کرنا ہے، تو اس میں بڑی دشواری پیش آتی ہے، ایک طرف اصطلاح کی پابندی، دوسری طرف وزن و قافیہ کی پابندی، تیسری طرف اِفہام و تفہیم کی صُعوبت۔ اس لیے دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعر نے کہیں حذف سے کام لیا، کہیں حَشو سے خانہ پُری کی، کہیں سلاست سے دست بردار ہوا، کہیں تعقید میں گرفتار ہوا۔ کامیابی کے ساتھ اس میدان کو سَر کرنا بہت کم لوگوں کا حصّہ ہوتا ہے۔

اہل کمال نے ہر وادی و کہسار اور ہر خار زار و سنگ لاخ کی سیر کی ہے، اور اپنے فنّی مَحاسن کی یادگار چھوڑی ہے۔ "عقائد" کا فن بلند پایہ بھی ہے اور خطرناک بھی، ذرا سی لغزش آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتی ہے، شاعرانہ کمال بے داغ گزر گیا، مگر ایمان داغدار ہو گیا تو بڑا زبردست نقصان ہوا!۔

اہل علم ان ساری مشکلات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، عزیز موصوف کی "نظم عقائد" پر منصفانہ نگاہ ڈالیں، تو مجھے قوی امید ہے کہ ان کی علمی مہارت، فنّی کمال اور خطرناک وادی میں کامیاب جادہ پیمائی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے!۔

اللهم زِدْ فزِدْ، وبِيَدِكَ الخير، والوقاية عن كل ضَير!.

غالبًا مولانا موصوف پہلے شخص ہیں جنھوں نے متن عقائد نسفی کو اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔

عربی متن کی طرح اردو نظم کو بھی نصاب درس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

متن عقائد نسفی کو عربی اور اردو نظم کا جامہ پہنانے کے سلسلے میں مولانا اسلم رضا قادری میمنی کی پیہم کوششوں کی کارفرمائی رہی ہے، انہی کی فرمائش اور اصرار پر دونوں (عربی، اردو) نظمیں تیار ہو سکی ہیں۔ اس لیے وہ قارئین کی جانب سے بجا طور پر شکریے کے مستحق ہیں۔ مولا تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے اور مزید دینی و علمی خدمات میں سرگرم رکھے۔ آمین[1]

محمد احمد مصباحی

نگران مجلس برکات

۱۹ر جُمادی الأولیٰ ۱۴۳۹ھ

۶ر فروری ۲۰۱۸ء چہار شنبہ

❁❁❁❁❁❁

(۱) یہ مجموعہ نظم اردو و عربی سال گزشتہ دبئی اور کراچی سے دوبار شائع ہو چکا ہے۔ مولانا سلمان رضا فریدی مصباحی کی کوشش سے اب یہ تیسری اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ جب کہ ہند میں پہلی اشاعت ہے۔ طبع اول کے لیے میں نے اپنے تاثرات لکھے تھے وہی چند سطور کے اضافے کے ساتھ یہاں درج ہیں۔

کلمة المجلس[1]

اِنشائی تمرین کے لیے مصباح الانشاء کا تیسرا حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس حصے میں دو باب ہیں، باب اول قواعد کے تحت تمرینات پر مشتمل ہے اور دوسرا باب چند عام تمرینات پر مشتمل ہے۔ مزید تمرینات اگلے حصوں میں آئیں گی۔

حسبِ سابق اس حصے کی بھی خصوصیت ہے کہ بہت سے وہ قواعد جن کی تفصیل ہدایۃ النحو اور کافیہ وغیرہ میں مرقوم نہیں اس کتاب میں دل نشیں انداز اور خوب صورت مثالوں کے ساتھ درج ہیں جن سے طلبہ کے علم میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور تمرینات کے ذریعہ وہ قواعد ان کے ذہن اور عمل میں مستحکم بھی ہوجاتے ہیں۔

دوسرا اہتمام یہ ہے کہ جدید الفاظ و محاورات خاصی مقدار میں جمع کر دیے گئے ہیں اور بہت سی تاریخی، تمدنی اور جغرافیائی معلومات بھی تمرینات کے تحت سمو دی گئی ہیں۔

تیسری اہم چیز یہ ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث کریمہ سے بھی تمرینات کو آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ کتاب وسنت کی زبان سے استفادہ یہاں بھی جاری رہے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ مضامین کے انتخاب میں اسلامی اخلاق و کردار کی نشو و نما اور اچھی تعلیمی و اخلاقی صلاحیت اجاگر کرنے کی سعی مشکور بھی شامل رکھی گئی ہے۔ منتخب آیات و احادیث کا بھی اس باب میں نمایاں کردار ہے۔

ان مساعی جمیلہ پر مؤلف محترم مولانا نفیس احمد مصباحی ہمارے اور جملہ اہلِ استفادہ کی جانب سے ہدیۂ تحسین و تبریک کے مستحق ہیں، جزاه الله خيرًا و زاده فضلًا و إحسانا.

آخر میں ماہرین اور مدرسین سے گزارش ہے کہ یہ جو کچھ ہے حَسَن اور اَحسن کی جانب ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ اگر کوئی خامی نظر آئے یا حسنِ مزید کی ضرورت محسوس ہو تو اپنے قیمتی مشوروں سے دریغ نہ کریں۔

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور
۱۰ر رمضان ۱۴۳۹ھ، شنبہ/ ۲۶ر مئی ۲۰۱۸ء

(۱) مصباح الانشا، حصہ سوم، مولانا نفیس احمد مصباحی، مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ، جولائی ۲۰۱۸ء

تقریظ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لوليه والصلوٰة والسلام علىٰ حبيبه وصحبه وجنوده وبعد! فقد سرحت النظر فى ما كتبه الأخ العزيز محمد شكيل المصباحى البريلوى من بحث جامعى لنيل الدكتوراة من الجامعة الملية الاسلامية بدلهى بعنوان: "الكتاب المشهورون فى روهيلكند وخدماتهم فى الأدب العربى".

كانت منطقة روهيلكندتحتوى علىٰ مدن تالية:

١. بدايون، ٢. سهسوان، ٣. رامفور، ٤. مرادآباد، ٥. امروهه، ٦. شاهجهان پور، ٧. جلال آباد، ٨. بر يلى، ٩. آنوله، ١٠. سنبهل، ١١. پيلى بهيت، ١٢. بجنور

والباحث من مواطنى روهيلكند فكان جديراً بهٰذا العنوان،وقد بذل جهوداً حثيثةفى اشباع مافوض اليه من الموضوع،وتكلم على جوانبه،خاصة فيمن أنجبته هٰذه المنطقة من رجال العلم والأدب،وفيماخلّفوا من ثروات علمية،وروائع فنّية،ونفائس أدبية.قدّم الى القراء العرب والمِلمّين بالعربية تاريخا موجزا لمنطقة روهيل كند وتراجم الكتاب النابهين وفهرس مارقمت أقلامهم فى مختلف العلوم والفنون،فيتمكن الدارس من العثور على أحوال روهيل كند السياسية وآثار أبنائها العلمية.

ولا أطيل الكلام بذكر المحتويات،فان نظرة عابرة على الفهرس تغنى عن ذكرها،وتدعوالى استكشاف مافيها من جلايا وخفايا،وقد أجاد الباحث الفاضل فى التنميق والتزئين،واختار رشاقةالعبارة،وحسن الاشارة،والعزو الى المصادر والمراجع.فجزاه الله عن انجاز هذاالعمل الهامّ الذى يتطلب تقديرا جميلا عن القراء عامة وعن أهل المنطقة خاصّة،وفّقه الله تعالىٰ للمزيد من خدمات علميّة،وكثّر أمثاله،وهو الموفق لكل خير.

محمد احمد مصباحى،رئيس هيئة التدريس سابقا،ومدير التعليم حالاً بالجامعة الاشرفية ،مبارك فور، أعظم جره ،يوبى[٥/ شوال١٤٣٩ه. ٢٠/ يونيو ٢٠١٨م]

کلمۃ المجمع الاسلامی(۱)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ حَامِدًا وَمُصَلِّیًا وَمُسَلِّمًا

جَدُّ الـمُمْتَار علیٰ رَدِّ الـمُحْتَار جلد اول کے لیے میں نے ۲۲ر صفر ۱۳۹۸ھ مطابق یکم فروری ۱۹۷۸ء کو تقریبًا ۱۵ (فل اسکیپ) صفحات پر ایک تعارف عربی میں لکھا تھا جو کتاب کی اشاعت کے ساتھ ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل وہ تعارف میں نے اردو میں منتقل کرکے ماہ نامہ عرفات لاہور میں شائع کرایا، اور بھی کئی ماہ ناموں میں شائع ہوا۔

جب جَدُّ الـمُمتار جلد ثانی کو ایڈٹ کرکے شائع کرنے کا وقت آیا تو میں نے ماہ رمضان ۱۴۱۲ھ میں اس کے لیے ذرا تفصیلی تعارف لکھا جو کتاب کے ساتھ صفر ۱۴۱۵ھ/اگست ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا، وہ ص ۱۳ سے ص ۱۰۸ تک ۹۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اس سے قبل ۱۰ر شوال ۱۴۱۲ھ کو امام احمد رضا قدس سرہ کی تاریخ ولادت (۱۰ر شوال ۱۲۷۲ھ) کی مناسبت سے مولانا عبد المصطفیٰ صدیقی، (دار العلوم مخدومیہ ردولی) اور ان کے رفقا کے اہتمام میں سرزمین لکھنؤ پر ایک کانفرنس اور سیمینار کا انعقاد ہوا، اس کے لیے میں نے جد الممتار ثانی کے عربی تعارف کو ذرا مختصر کرکے اردو میں لکھا پھر دونوں جلدوں کا اردو تعارف کتابی شکل میں پہلی بار ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۳ء میں المجمع الاسلامی سے شائع ہوا، نام یہ تجویز ہوا:

”امام احمد رضا کی فقہی بصیرت ـــ جد الممتار کے آئینے میں“

جلد ثانی کا تعارف میں نے درج ذیل عنوانات پر تقسیم کیا:

۱-فکر انگیز تحقیقات ۲-کثیر جزئیات کی فراہمی
۳-لغزشوں پر تنبیہات ۴-حل اشکالات اور جواب اعتراضات
۵-فقہی تبحر اور وسعت نظر ۶-تحقیق طلب مسائل کی تنقیح

(۱) فتاویٰ رضویہ جہان علوم و معارف، مرتبہ علامہ محمد احمد مصباحی، المجمع الاسلامی، مبارک پور نومبر ۲۰۱۸ء

۷-مراجع کا اضافہ ۸-مشکلات و مبہمات کی توضیح
۹-غیر منصوص احکام کا استنباط ۱۰-علم حدیث میں کمال اور قوت استنباط و استدلال
۱۱-دلیل طلب احکام کے لیے دلائل کی فراہمی ۱۲-مختلف اقوال میں تطبیق
۱۳-مختلف اقوال میں ترجیح ۱۴-اصول و ضوابط کی ایجاد
۱۵-مختلف علوم میں مہارت ۱۶-حسن ایجاز و کمال اختصار

ہر عنوان پر اسی جلد ثانی سے میں نے شواہد فراہم کیے جس پر بعض بزرگوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا خصوصًا حضرت **مفتی عبد القیوم ہزاروی** علیہ الرحمہ (ناظم اعلی جامعہ نظامیہ - لاہور، متوفی ۲۷ر جمادی الآخرہ ۱۴۲۴ھ ۲۶ر اگست ۲۰۰۳ء) نے راقم کو بڑا حوصلہ افزا خط لکھا جو ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور کے صدر الشریعہ نمبر (شمارہ جمادی الآخرہ ۱۴۱۶ھ/اکتوبر، نومبر ۱۹۹۵ء ص ۲۶۲) میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد میرا خیال ہوا کہ فتاوی رضویہ کی ہر جلد کا اسی طرح تفصیلی تعارف ہونا چاہیے تاکہ اس کے محاسن و کمالات کھل کر منظر عام پر آسکیں۔ یہ کام میں خود تو شروع نہ کر سکا لیکن جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے طلبۂ تحقیق فی الفقہ کے ذمہ اسے سپرد کیا۔ جامعہ میں تحقیق کی سند حاصل کرنے کے لیے ہر طالب علم کو کسی فقہی موضوع پر کم از کم سو صفحات پر مشتمل ایک مقالہ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔

طلبہ کی رہ نمائی کے لیے جد الممتار کے مطبوعہ اردو تعارف کو نمونہ قرار دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ عنوانات میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ جو ہو سکے محنت سے لکھیں۔ اس طرح جلد دوم سے دوازدہم تک ہر جلد کے لیے ۱۰۰ یا زیادہ صفحات پر مقالات تیار ہو گئے، جوانِ طلبہ نے کسی استاذ کی نگرانی یا نظر ثانی کے بغیر اپنی وسعت و محنت کے مطابق تحریر کیے۔

تقریبًا پانچ سال قبل سے یہ منصوبہ بن رہا تھا کہ امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت پر کوئی سیمینار منعقد کیا جائے اور مذکورہ پندرہ، سولہ یا کم و بیش عنوانات پر فتاویٰ کی تمام جلدوں کو سامنے رکھ کر ماہر علمائے کرام سے مضامین حاصل کیے جائیں، منتخب حضرات کے نام دعوت نامے اور عنوانات بھی تقسیم ہوئے، تقاضے بھی کیے گئے مگر دو تین سال گزرنے کے باوجود بجز نامرادی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس تجربے کے بعد حضرت مفتی **محمد نظام الدین رضوی**، مولانا **نفیس احمد مصباحی** اور مولانا **اختر حسین فیضی** پھر مولانا **لیٰسین اختر مصباحی** کی مشاورت سے یہ طے ہوا کہ جامعہ کے طلبۂ تحقیق سے جو مقالات لکھائے گئے

ہیں انہی کو شائع کر دیا جائے۔

ان مقالات کی اشاعت سے قبل ان پر نظر ثانی ضروری تھی؛ اس لیے متعدد علماے کرام کو یہ مقالات نظر ثانی کے لیے دیے گئے۔ ان میں جلد سوم، ہفتم، نہم، دہم اور دوازدہم سے متعلق مقالات خود لکھنے والوں کو دیے گئے، اس خیال سے کہ یہ حضرات اب کئی سال سے برسر تدریس ہیں خود اچھی طرح نظر ثانی کر سکتے ہیں۔ مگر سوم، دہم اور دوازدہم سے متعلق مقالات تادم تحریر واپس نہ ملے۔ ہفتم، نہم سے متعلق واپس ملے، جن میں نہم پر نظر ثانی کی محنت کچھ سمجھ میں آئی، ہفتم پر محنت بہت کمتر معلوم ہوئی۔ دیگر جن حضرات کو مقالات دیے گئے ان میں مولانا **محمد عارف اللہ** فیضی مصباحی، استاذ مدرسہ فیض العلوم محمد آباد گوہنہ اور مولانا **محمد قاسم ادروی** مصباحی و مولانا **محمد اشرف قادری** مصباحی، استاذان جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے (بالترتیب جلد دوم، ششم اور پنجم سے متعلق مقالات) بغور دیکھے اور اچھی اصلاحات کیں،، باقی حضرات نے معذرت کے ساتھ واپس کر دیے۔

حضرت مولانا **عبد المبین نعمانی** اور مولانا **عبد الغفار اعظمی** مبارک پوری کو بھی دو مقالے مولانا **اختر حسین فیضی** نے مندرجات دیکھے بغیر دے دیے، ان حضرات نے نظر ثانی بھی کی، بعد میں جب میرے پاس آئے تو میں نے دیکھا کہ یہ مقالے کسی خاص جلد کے تحت نہیں، اول میں کئی جلدوں سے شواہد لیے گئے تھے، ان میں سے بعض مکرر ہو رہے تھے اور دوم میں مختلف جلدوں سے صرف مسائل جدیدہ کو جمع کیا گیا تھا، یہ دونوں اس مجموعے میں شریک اشاعت نہیں، آئندہ کسی موقع سے مزید نظر و اصلاح کے بعد ان کی اشاعت ہو سکتی ہے۔

جلد نہم سے متعلق مقالہ مولانا **نفیس احمد مصباحی** نے بھی دیکھا اور مناسب اصلاحات سے نوازا۔

پھر میں نے خود ہی سبھی مقالات بالاستیعاب دیکھنے کی کوشش کی۔ ہر مقالے میں کئی صفحات تمہیدی کلمات اور صاحب فتاوی کے حالات پر مشتمل تھے، وہ سب حذف کر دیے گئے، اور ان کی جگہ ایک مختصر تعارف بقلم مولانا عبد المبین نعمانی اور دوسرا ذرا تفصیلی بقلم مولانا ساجد علی مصباحی، استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور شامل کر دیا گیا۔

نظر ثانی میں جلد سوم کے مقالے میں بہت کم، باقی سب میں بہت زیادہ محنت صرف کرنی پڑی۔ کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے دوران بھی بہت سی اصلاحیں کی گئیں پھر بھی یہ دعوی نہیں کہ اب کچھ باقی نہ رہا۔

تاہم ان مقالات سے فتاوی کی جلدوں کے بہت سے مخفی محاسن و کمالات عیاں ہوتے ہیں اور وہ ارباب نظر کی جانب سے تحسین و تبریک کے لائق ہیں۔ کم از کم کشادہ دل اور عالی ظرف اہل علم سے خیر کثیر کی امید ہے۔

جلد اول کا تعارف کسی طالب علم کے سپرد نہ ہو سکا، جس کی کئی وجہیں ہیں:

(۱) اس جلد کی فہرست جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے زمانے میں تیار ہو کر شائع ہوئی وہ خود ایسی جامع اور چشم کشا ہے کہ بے شمار نادر کمالات اور اعلیٰ محاسن اس کے مطالعے ہی سے روشن ہو جاتے ہیں۔

(۲) اس پر اگر باضابطہ تبصرہ و تعارف رقم ہو تو سو صفحات میں ہرگز سما نہیں سکتا، کم از کم میرے اندازے سے تقریباً پانچ سو صفحات میں کچھ حق ادا ہو سکے گا۔

(۳) اس میں اکثر دقیق علمی مباحث ہیں جن کو عام فہم زبان میں پیش کرنا بڑی مہارت، دیدہ وری، علمی و تحریری شناوری اور کئی فنون کی جامعیت کا طالب ہے۔

(۴) اس کی بعض تحقیقات امام احمد رضا کے علمی تبحر کی شہادت کے طور پر بعض مطبوعہ مقالات میں کسی قدر آ چکی تھیں، جن سے اس جلد کا ایک حد تک تعارف ہو گیا تھا۔

(۵) امید ہے کہ آئندہ ایک یا چند اہل کمال اس مہم کو بخوبی سر کرنے کی کوشش کریں گے۔

مگر کہا گیا ہے کہ ما لا يُدرَك كلّه، لا يُترَك كلُّه. اس کے تحت مولانا **نفیس احمد مصباحی** اور مولانا اختر حسین **فیضی** کا خیال ہوا کہ جلد اول کا کچھ تعارف ایک دو اہل علم سے اب لکھا لیا جائے۔ اس کے لیے دو صاحبان کو زحمت دی گئی، ایک صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے لکھا تھا، مگر کاغذات مکان کی تبدیلی میں دب گئے اور تلاش بسیار کے باوجود نہ ملے، دوسرے صاحب نے مختصراً عمدہ تعارف لکھ کر کمپوزنگ کرا کے ۱۵/ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو ای میل سے بھیجا، وہ شریک اشاعت ہے۔ "امام احمد رضا اور عربی زبان و ادب" کے عنوان سے ایک مضمون مولانا نفیس احمد مصباحی نے لکھا تھا، اس میں عربی زبان و ادب میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے کمال پر کسی قدر تفصیل سے تحریر ہے۔ اور دیگر مقالات میں اس عنوان پر کوئی گفتگو نہ تھی، اس لیے مولانا موصوف کے اس مضمون کو بطور ضمیمہ شامل کر لیا گیا ہے۔

کمپوزنگ کے بعد پروف ریڈنگ میں مولانا شمشیر علی مصباحی اور مولانا عبد الباری مصباحی رفیقانِ المجمع الاسلامی نے بڑی محنت صرف کی اور بہت سے مقامات پر فتاویٰ رضویہ کی خود مراجعت کی اور کہیں کہیں فتاوی کے مراجع بھی تصحیح کے لیے دیکھے، خصوصاً مولانا شمشیر علی نے پروف ریڈنگ کے علاوہ سیٹنگ درست کرانے میں بھی شروع سے آخر تک محنت صرف کی۔ ان لوگوں کی تصحیح اور کاوش کے بعد مجھے بڑی حد تک اطمینان ہے کہ مقالات صحت کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔

آگے فتاویٰ رضویہ کی پہلی اشاعت / رضا اکیڈمی ممبئی کی اشاعت / رضا فاؤنڈیشن لاہور کی اشاعت / امام احمد رضا اکیڈمی بریلی شریف کی اشاعت کا اجمالی تذکرہ کیا جارہا ہے، **تاکہ اشاعت کی سوسالہ تاریخ بھی محفوظ رہے۔**

فتاویٰ رضویہ کی جلدیں:

مضامین (فقہی ابواب و کتب)

اشاعتِ اول مع ادارۂ اشاعت و سنہ - صفحات

اول : کتاب الطہارۃ (وضو، غسل، میاہ، تیمم) اشاعت اول ۱۳۳۶ھ بحیات مصنف علیہ الرحمہ۔ مطبع اہل سنت و جماعت بریلی شریف۔ صفحات: ۸۸۰

دوم (۲) : کتاب الطہارۃ (بقیہ ابواب) کتاب الصلاۃ (باب الاوقات، باب الاذان والاقامۃ وغیرہ) بار اول تخمیناً ۱۳۴۴ھ میں باہتمام صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ تقریباً ۵۶۰ صفحات میں مطبع اہل سنت و جماعت بریلی شریف سے شائع ہوئی۔

سوم (۳) : کتاب الصلاۃ (از شروط الصلاۃ تا باب الکسوف و الاستسقاء) مجموعی صفحات: ۸۴۰۔ اشاعتِ اول ۱۳۸۱ھ باہتمام سنی دار الاشاعت مبارک پور۔

چہارم (۴): باب الجنائز، کتاب الزکاۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج ۔ مجموعی صفحات: ۷۴۸۔ اشاعت اول ۱۳۸۷ھ ۔ سنی دار الاشاعت مبارک پور

پنجم (۵) : کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الأیمان والنذور، باب الحدود و التعزیر.

اس جلد میں کتاب النکاح کی خصوصیت یہ ہے کہ جلد اول سے بہتر کتابت و طباعت کے ساتھ اس کی اشاعت ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۷ھ کے درمیان تین قسطوں میں ہوئی، نظر ثانی، اضافۂ فوائد، فہرست سازی وغیرہ سرکار مفتی اعظم علامہ شاہ مصطفیٰ رضا قادری علیہ الرحمہ نے فرمائی، کتابت و طباعت کا اہتمام مولانا حسنین رضا خاں ابن مولانا حسن رضا خاں علیہما الرحمہ نے کیا اور اسے اپنے مطبع حسنی سے شائع کیا۔ تینوں قسطوں کے مجموعی صفحات ۵۹۸ ہیں۔

پھر جب سنی دار الاشاعت مبارک پور سے اس کی اشاعت کی باری آئی تو اس وقت یہاں فوٹو آفسیٹ کی سہولت نہ تھی اس لیے از سرِ نو کتابت ہوئی۔ کتاب النکاح ۴۰۰ صفحات میں آئی۔ اسی کے

ساتھ کتاب الطلاق، کتاب الأیمان وغیرہ بھی ہے جو ص ۴۰۱ سے ۷۹۹ تک ہے اور دونوں کی فہرست مع عرض حال ۶۴ صفحات میں ہے کل صفحات ۸۶۳ ہوتے ہیں، اس طرح یہ کتاب النکاح کی اشاعت بار دوم ہے اور کتاب الطلاق وغیرہ کی بار اول۔ سال اشاعت ۱۳۹۷ھ ہے۔

بعد میں رضا اکیڈمی ممبئی سے جب تمام جلدیں یک بارگی شائع ہوئیں تو جلد پنجم میں کتاب النکاح طبع اول کا عکس لیا گیا تاکہ بزرگوں کا نقش جمیل باقی رہے اور کتاب الطلاق وغیرہ کے لیے اشاعت مبارک پور کا عکس لیا گیا۔ فہرست بھی اشاعت مبارک پور کا عکس ہے۔ کل صفحات کی تعداد ۹۹۷ درج ہے۔

ششم (۶): کتاب السیر، کتاب المفقود، کتاب الشرکۃ، کتاب الوقف، باب المسجد.
مجموعی صفحات: ۵۹۶ - اشاعت اول ۱۴۰۱ھ ۔ سنی دار الاشاعت مبارک پور

ہفتم (۷): کتاب البیوع . کتاب الحواله، کتاب الشهادة، کتاب القضا والدعاوی
مجموعی صفحات: ۶۷۴ - اشاعت اول ۱۴۰۷ھ ۔ سنی دار الاشاعت مبارک پور۔

ہشتم (۸) : ١ - کتاب الوکاله ٢ - کتاب الاقرار ٣ - کتاب الصلح ٤ - کتاب المضاربه ٥ - کتاب الامانات ٦ - کتاب العاریه ٧ - کتاب الهبه ٨ - کتاب الاجاره ٩ - کتاب الاکراه ١٠ - کتاب الحجر ١١ - کتاب الغصب ١٢ - کتاب الشفعه ١٣ - کتاب القسمه ١٤ - کتاب الاضحیه - باب العقیقه.
مجموعی صفحات: ۶۷۲ ۔ اشاعت اول ۱۴۱۲ھ ۔ سنی دار الاشاعت مبارک پور

سنی دار الاشاعت، مبارک پور کے بانی و ناظم جامع معقول و منقول، استاذ گرامی مولانا **حافظ عبد الرؤف** علیہ الرحمہ تھے۔ وہ مفتی اعظم علیہ الرحمہ کے پاس سے جلد سوم تا ہشتم کا مسوّدہ مبارک پور لائے تھے، تبییض کرا کے نظر ثانی بھی کرلی تھی، مگر ان کی حیات میں کتابت و طباعت اور اشاعت صرف جلد سوم و چہارم کی ہو سکی، جلد پنجم ۱۳۸۷ھ میں پریس کے حوالے ہوگئی تھی، اس زمانے میں طباعت کے ساتھ کتابت بھی پریس ہی کے ذریعہ ہوتی تھی، اس لیے پورا بس نہ چلتا، کام میں دیر ہوتی، اور جلد پنجم میں مزید دیر ہوئی، کئی طرح کی نئی مشکلات سامنے آئیں یہاں تک کہ ۱۴؍ شوال ۱۳۹۱ھ کو حضرت کا وصال ہو گیا، بعد میں حافظ ملت علیہ الرحمہ [1] اور مولانا محمد شفیع صاحب [2] اور مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب [3] نے یہ کام بحر العلوم مفتی عبد المنان صاحب [4] کے سپرد کیا، خود

بھی معاون رہے اور بعد تاخیر بسیار یہ جلد ۱۳۹۷ھ میں شائع ہو سکی،

---

(۱) وصال : کیم جمادی الآخرہ ۱۳۹۶ھ / ۳۱ر مئی ۱۹۷۶ء۔ (۲) وصال : ۷ر جمادی الآخرہ ۱۴۱۱ھ / ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۰ء۔

(۳) وصال : ۲۶ر ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ / ۱۵ر مئی ۱۹۹۶ء۔ (۴) وصال : شب ۱۵ر محرم ۱۴۳۴ھ / ۲۹ر نومبر ۲۰۱۲ء۔

یعنی ایسے وقت جب کہ حافظ ملت علیہ الرحمہ کا بھی وصال ہو چکا تھا۔ ششم تا ہشتم پوری طرح حضرت بحر العلوم کے اہتمام میں شائع ہوئیں۔ ان تین جلدوں میں بھی ۱۵ر سال کا وقت صَرف ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدیم و ضخیم علمی مخطوطہ کو مطبوعہ کی شکل میں لانا کتنا زہرہ گداز اور صبر آزما عمل ہے۔ خصوصاً اُس دَور میں جب آج کی طرح آسانیاں ناپید تھیں۔

<u>نہم</u> (۹): پہلی بار مکتبۂ رضا، ایوان عرفان بیسل پور ضلع پیلی بھیت سے ۱۴۱۱ھ / ۱۹۹۰ء میں باہتمام ڈاکٹر **فیضان علی** و حاجی **قربان علی** صاحب زادگان مولانا عرفان علی رضوی علیہ الرحمہ شائع ہوئی۔

یہ جلد مع عرض حال ۳۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مندرجات یہ ہیں:

مسائل کلامیہ (ص: ۱ تا ۹۷) کتاب الشتّی (ص: ۹۸ تا ۲۰۲) کتاب الفرائض (ص: ۲۰۳ تا ۳۹۲)

عرض حال کے تحت شہزادۂ صدر الشریعہ **مولانا بہاء المصطفیٰ قادری** مصباحی نے لکھا ہے کہ

"مسائل کلامیہ اور شتّٰی کا مسوّدہ ناتمام ملا۔ کلامیہ کے مسوّدہ پر صفحات کا جو نمبر شمار ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک مستقل جلد تھی جس کے ۹۳۶ صفحات کسی اور کے پاس ہیں، یا امتداد زمانہ سے ضائع ہو گئے۔ غالبًا جو جلد غائب ہو گئی یہ اِسی جلد کے ماقبی صفحات ہیں۔ ۹۳۷ سے ۱۰۳۸ صفحات تک کا مسودہ ملا ——— مسائل شتّٰی کا مسوّدہ ۴۶۱ سے ۵۴۶ تک جو ہمارے پاس تھا اس کو بھی اس جلد میں شامل کر دیا گیا..." (۱)

فرائض کا جو مسودہ ملا وہ کامل و مکمل معلوم ہوتا ہے۔ (اُس وقت – ۱۴۱۱ھ میں – مولانا بہاء المصطفیٰ قادری، دار العلوم منظر اسلام بریلی شریف میں مدرس تھے۔)

---

(۱) مسائل کلامیہ وغیرہ کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۱۳۳۵ھ سے ۱۳۳۹ھ تک یعنی اعلیٰ حضرت قدّس سرہ کے اخیر دورِ حیات سے متعلق ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سرمایہ شروع میں تھا جو ہاتھ سے جاتا رہا۔ محمد احمد مصباحی

<u>جلد دہم</u> (۱۰): یہ کتاب الحظر و الاباحۃ پر مشتمل ہے۔ پہلی بار مکتبۂ رضا بیسل پور، پیلی بھیت سے صاحب زادگان مذکور کے اہتمام میں دو قسطوں میں جلد دہم نصف اول، جلد دہم نصف آخر کے عنوان سے شائع ہوئی۔

قسط اول کے صفحات ۲۷۲، قسط دوم کے ۳۳۶، کل ۶۰۸ صفحات ہوتے ہیں، سالِ اشاعت کہیں درج نہیں۔ نصف اول کی اشاعت تخمیناً صفر ۱۴۰۲ھ دسمبر ۱۹۸۱ء میں اور نصف آخر کی اشاعت جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ / جنوری ۱۹۸۸ء میں ہوئی۔ مکتبۂ رضا کی جلد نہم اس کے کم از کم دو سال بعد شائع ہوئی۔

ان حضرات نے اندازے سے کتاب الحظر والاباحۃ کو جلد دہم قرار دیا تھا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی ایک تحریری یادداشت کی روشنی میں **بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی** علیہ الرحمہ نے متعین فرمایا کہ یہ جلد نہم ہے اور بعد میں جلد نہم ہی کے نام سے اس کی اشاعت ہوئی۔

<u>جلد یازدہم</u> (۱۱): پہلی بار ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۱ء میں ۳۲۵ صفحات (اور مع فہرست وغیرہ ۳۵۶ ص) میں ادارۂ اشاعت تصنیفات رضا بریلی شریف سے باہتمام مولانا منان رضا خاں، **منانی میاں** شائع ہوئی۔

تقدیم و تعارف اور فہرست سازی حضرت مولانا **عبد المبین نعمانی** مصباحی کے قلم سے ہے۔ بعد میں مکتبۂ رضا بیسل پور کی جلد نہم سے کتاب الفرائض کو لے کر اور رسالہ رد الرفضہ کو شامل کر کے جلد دہم کے نام سے ۵۲۷ صفحات (مجموعی ۵۶۷ ص) میں اس کی اشاعت ہوئی۔

<u>جلد یازدہم</u> (۱۱): **جدید** : ۱۹۹۳ء میں رضا اکیڈمی ممبئی کا یہ ارادہ ہوا کہ فتاوی رضویہ کی تمام جلدیں قدیم اشاعتوں کا عکس لے کر ۱۲ جلدوں کے سیٹ کی شکل میں شائع کی جائیں اور آئندہ بھی اسی طرح اشاعت ہوتی رہے تاکہ ضرورت مندوں کو کسی جلد کی نایابی کا صدمہ نہ اٹھانا پڑے۔ اس سلسلے میں الحاج **محمد سعید نوری** بانی و صدر رضا اکیڈمی نے بحر العلوم **مفتی عبد المنان اعظمی** علیہ الرحمہ اور مولانا محمد حنیف خاں رضوی بریلوی سے مشورہ کیا، جس کے تحت جلد اول تا ہشتم تو سابقہ حالت پر رکھی گئیں مگر جلد نہم، دہم، یازدہم کی صورت بدل گئی۔ جلد دہم، جلد نہم قرار دی گئی اور جلد یازدہم کا اشاعت شدہ حصہ باقی رکھتے ہوئے اس میں جلد نہم سے کتاب الفرائض لے کر اور ایک رسالے کا اضافہ کر کے اسے جلد دہم کے نام سے شائع کیا گیا۔

پھر جلد نہم طبع اول سے مسائل کلامیہ اور کچھ نئے مسائل اور قدیم رسائل لے کر ۳۴۳ صفحات میں جلد یازدہم کے نام سے صفر ۱۴۱۵ھ/اگست ۱۹۹۴ء میں دوسری تمام جلدوں کے ساتھ اشاعت ہوئی۔

جلد دوازدہم (۱۲) : اشاعت ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء - اس جلد میں جلد نہم طبع اول اشاعت یسل پورے کتاب الشتیٰ کا عکس لیا گیا ہے اور کچھ نئے مسائل شتیٰ بھی نئی کتابت سے شامل کیے گئے ہیں اور چند رسائل ہیں جو پہلے شائع ہوئے تھے مگر فتاویٰ کی جلدوں میں شامل نہ تھے۔ کل صفحات ۳۰۰ ہیں۔ رسائل یہ ہیں:

۱- نطق الهلال بأرخ ولاد الحبيب و الوصال.
۲- الصمصام على مشكك فى آية علوم الأرحام
۳- اقامة القيامه على طاعن القيام لنبى تهامه
۴- انوار الانتباه فى حل نداء يا رسول الله
۵- تدبیر فلاح ونجات واصلاح
۶- طرد الأفاعى عن حمى هادٍ رفَعَ الرفاعى
۷- نزول آیات فرقان بسکون زمین وآسمان

آخر الذکر دونوں رسالے جلد نہم طبع اول میں کتاب الشتیٰ کے تحت تھے چوں کہ مسائل کلامیہ کے ۹۳۶ صفحات غائب ہو گئے اور مسائل شتیٰ سے بھی بہت کچھ غائب ہیں اس لیے گیارہویں، بارہویں جلد کا حجم بہت کم ہو گیا۔

نہم تا دوازدہم کا سارا کام حضرت بحر العلوم اور مولانا محمد حنیف خاں کی رہ نمائی و نگرانی میں ہوا۔ اس طرح بارہ جلدیں یک جا شائع ہو گئیں۔ اور شائقین کو فتاویٰ کی جلدیں دست یاب نہ ہونے کا شکوہ جاتا رہا، جس پر **رضا اکیڈمی** سب کی طرف سے شکریہ و مبارک باد کی مستحق ہے۔

(۴۰۲) متفرق طور پر مکتبہ نعیمیہ سنبھل، مرادآباد، رضا دار الاشاعت بہیڑی ضلع بریلی، رضوی کتاب گھر بھیونڈی، دہلی نے بھی ایک دو جلدیں متفرق زمانوں میں شائع کیں۔ سمنانی کتب خانہ میرٹھ سے غالباً ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء میں جلد دوم نئی کتابت سے شائع ہوئی۔ اسی طرح پاکستان میں بھی بعض مکتبوں سے بعض جلدیں مختلف مدتوں میں شائع ہوتی رہیں۔

فتاویٰ رضویہ - اشاعت: رضا فاؤنڈیشن، لاہور:

ہندوستان میں یہ کوشش جاری تھی کہ جیسے بھی ہو فتاویٰ رضویہ کی بقیہ جلدیں شائع کر دی جائیں، یہ کام تقریباً ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء پھر ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء میں کسی طرح اختتام کو پہنچا۔

دوسری طرف ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء میں مولانا عبد الحکیم شرف قادری علیہ الرحمہ (متوفی ۱۸ر شعبان ۱۴۲۸ھ/یکم ستمبر ۲۰۰۷ء) اور پاکستان کے کچھ اور علمائے کرام کا خیال ہوا کہ فتاویٰ رضویہ میں جو عربی، فارسی عبارتیں بے ترجمہ ہیں ان کا اردو ترجمہ ہو اور کتابوں کے موجودہ دست یاب ایڈیشنوں سے حوالوں کی تخریج ہو، یعنی متعلقہ عبارتیں درج حوالہ کتاب کی کس جلد، کس باب، کس صفحہ میں ہیں ان کا ذکر اسلوب زمانہ کے مطابق حاشیے میں دیا جائے۔ مشاورت کے مطابق کام کا آغاز بھی ہو گیا پھر ۱۴۰۸ھ/مارچ ۱۹۸۸ء میں حضرت **مفتی عبد القیوم ہزاروی** علیہ الرحمہ ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ لاہور کی سرپرستی میں اس کام کے لیے رضا فاؤنڈیشن کا باضابطہ قیام عمل میں آیا، اور منتخب علمائے کرام کے ذریعے بہت تیزی سے کام ہوتا رہا۔

اس طرح فتاویٰ کی ۱۲ر جلدیں تیس (۳۰) جلدوں میں مکمل ہوئیں۔ ۲۴ جلدیں حضرت مفتی عبد القیوم ہزاروی علیہ الرحمہ کی حیات میں شائع ہو گئیں۔

۲۷ر جمادی الآخرہ ۱۴۲۴ھ/۲۶ر اگست ۲۰۰۳ء کو ان کا وصال ہو گیا۔ ۲۵ر ویں جلد ان کے چہلم کے موقع پر شائع ہوئی۔

پہلی جلد، پہلی بار شعبان ۱۴۱۰ھ/مارچ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی اور تیسویں جلد رجب ۱۴۲۶ھ/اگست ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آئی۔ تقریباً سولہ سال میں یہ طویل و عریض اور دشوار گزار کام مکمل ہو گیا۔ فله الحمد والمنة، و الشكر للعاملين الجاهدين.

مولانا **عبد الستار سعیدی** ناظم تعلیمات جامعہ نظامیہ لاہور نے ہر جلد کی اشاعت کے ہجری و عیسوی ماہ و سال نیز ہر جلد کے شروع میں دے دیے ہیں، باقی جلدوں میں بھی اُس وقت تک کی شائع شدہ جلدوں کے ماہ و سال انھی کے قلم سے مرقوم ہیں۔ اور دیگر احوال و کوائف اور قلمی و علمی معاونین کے تذکرے بھی ہر جلد میں موجود ہیں۔

اسی ایڈیشن کی تجدید یعنی عکسی اشاعت ۲۴ جلدوں تک ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء میں باہتمام **مولانا عبد الستار ہمدانی**، برکات رضا، پور بندر، گجرات سے ہوئی۔ پھر مکمل تیس جلدیں اسی ادارے سے صفر ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء

میں شائع ہوئیں۔ اس طرح یہ نسخہ ہندوستان میں بھی عام ہوگیا اور زیادہ استفادہ اسی سے ہونے لگا۔ مگر اہل علم کو کسی عبارت یا مضمون میں جب اشتباہ ہوتا ہے تو انھیں قدیم اشاعت کی بھی مراجعت کرنی پڑتی ہے۔

بہر حال ترجمہ و تخریج کے ساتھ اچھی کتابت و طباعت کا بھرپور اہتمام کرتے ہوئے تیس متوازن اور یکساں جلدوں میں اشاعت، **رضا فاؤنڈیشن لاہور کا ایک بڑا کارنامہ** ہے۔ اس عظیم کام میں جتنے بھی شرکا اور معاونین ہیں وہ تمام اہل علم کی جانب سے بے پناہ شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ رب کریم سب کو اپنی وافر جزاؤں سے نوازے۔ آمین

فتاوی رضویہ - اشاعت: امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف:

امام احمد رضا قدس سرہ کے دور حیات ۳۶ - ۱۳۳۵ھ/ ۱۸ - ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء تک فتاوی کی جو جلدیں بریلی شریف، مبارک پور، ممبئی، لاہور، پور بندر وغیرہ سے شائع ہوئیں وہ سب دستی کتابت پر مشتمل تھیں، بعض کی کتابت بہت نفیس، بعض کی عمدہ، بعض کی بس قابل خواند تھی، مؤخر الذکر قسم میں اغلاط کتابت کی مقدار بھی زیادہ تھی۔ ۲۰۰۰ء آتے آتے کمپیوٹر زندگی کے شعبوں میں بڑی تیزی سے داخل ہوا، عربی، انگریزی، ہندی، اردو وغیرہ زبانوں کی تحریریں بھی کمپیوٹر پر کمپوز ہوکر سامنے آنے لگیں، رسائل کے علاوہ یومیہ اخبارات نے بھی بہت ساری آسانیوں کے پیش نظر اسی کو اختیار کیا، روز بروز اس کا دائرہ بڑھتا گیا۔ اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔

ان حالات میں **مولانا محمد حنیف خاں** رضوی بانی امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف اور **مولانا اسلم رضا قادری**، ادارۂ اہل سنت کراچی نے یہ پروگرام بنایا کہ فتاویٰ رضویہ کو بھی کمپیوٹرائزڈ کتابت کے ساتھ شائع کیا جائے، اور سابقہ نسخوں میں کتابت وغیرہ کی جو غلطیاں رہ گئی ہیں حتی المقدور انھیں بھی درست کیا جائے۔

اس کے لیے انھوں نے قدیم اشاعت اور رضا فاؤنڈیشن کی اشاعت کو سامنے رکھا، عربی، فارسی عبارتوں کے نئے ترجموں کو حذف کیا، اور حاشیہ میں مندرج حوالوں کو برقرار رکھا، اخیر کی جلدوں میں جو بے ترتیبی تھی وہ بھی دور کرنے کی کوشش کی، کتاب الشتی کے متفرق مسائل کو جہاں تک ہوسکا متعلقہ ابواب میں داخل کیا، اصلی مسائل اور ضمنی مسائل کے لیے اندرون کتاب سرخیاں قائم کیں، کچھ نئے رسائل کا بھی اضافہ کیا۔ اس طرح فتاوی کو ۲۲ جلدوں میں مرتب کرکے ۱۴۳۸ھ/ ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔

مولانا محمد حنیف صاحب نے جلد اول میں ص ۱۹ تا ۲۸، اپنی جملہ سرگرمیوں کا حال قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر ص ۲۹ تا ۱۲۵، ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں عہد رسالت سے چودہویں صدی ہجری تک فقہ و فتاوی خصوصاً فقہ حنفی کی اجمالی تاریخ ہے، اسی درمیان سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ کے احوال و سوانح کا بھی ذکر ہے۔ ص ۱۲۵ سے ص ۱۳۲ تک فتاوی رضویہ کی قدیم و جدید طباعت کے مراحل کا تذکرہ ہے۔ پھر ص ۱۳۳ سے ۲۲۸ تک اپنی شائع کردہ ۲۲ جلدوں اور ان میں مندرج رسائل کا تعارف کرایا ہے۔

پھر ص ۲۲۹ سے ۲۹۱ تک صاحب فتاوی، امام احمد رضا قدس سرہ کا ذکر جمیل ہے، اس درمیان فن وار ان کی تصانیف کی اجمالی تعداد بھی مذکور ہے اور اب تک معلوم شدہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کل تصانیف کی تعداد ۵۹۱ (پانچ سو اِکانوے) لکھی ہے۔ (۱)

اسی ذیل میں امام احمد رضا کے **تبحر علمی** کے تحت درج ذیل عنوانات قائم کرکے ان کے کچھ شواہد فتاویٰ رضویہ سے پیش کیے ہیں۔

۱- امام احمد رضا اور علم حدیث
۲- کسی ایک موضوع پر کثیر احادیث
۳- حوالوں کی کثرت
۴- اصطلاحاتِ حدیث کی تنقیح و تحقیق
۵- مختلف روایات میں تطبیق

الحاصل جلد اول میں یہ اضافی تحریریں بہت محنت و توجہ سے تیار کی گئی ہیں اور کثیر معلومات پر مشتمل ہیں۔

اس اشاعت کی **ایک نمایاں خصوصیت** یہ بھی ہے کہ آرٹ پیپر پر چار کلر میں ہے جو بجائے خود بڑی عالی ہمتی کا کام ہے۔ ربِ کریم جزائے فراواں سے نوازے۔

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

المجمع الاسلامي
۱۲ر صفر ۱۴۴۰ھ دوشنبہ
۲۲ر اکتوبر ۲۰۱۸ء

(۱) مولانا عبد الغفار اعظمی مصباحی، رکن المجمع الاسلامی نے "انصاف الامام" کے ترجمہ "امام عشق و عرفان" میں حروف تہجی کی ترتیب پر ایک فہرست مرتب کی ہے اور کتاب کا سال تصنیف بتانے کے ساتھ نام کے تاریخی یا غیر تاریخی ہونے کی بھی صراحت کی ہے۔ اس میں کل تعداد ۶۷۴ ہے۔ کتب و رسائل ۵۰۸، تعلیقات ۱۶۶۔ "تصانیف رضا" مرتبہ مولانا عبد المبین نعمانی کے مطابق ہر کتاب کے سامنے ایک خانے میں فن اور اس کا نمبر شمار بھی درج کر دیا ہے۔ دیکھیے کتاب مذکور ص ۱۵۹ تا ص ۲۰۷۔ اشاعت: ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۵ء۔ المجمع الاسلامی مبارک پور۔

ابتدائیہ [1]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لولیّہ . و الصلاۃ و السلام علی نبیّہ . و علی اٰلہ و صحبہ و جنودہ.

شریف العلما مولانا محمد ایوب شریف القادری مشرقی یوپی کی ایک متحرک و فعال شخصیت کا نام ہے، ان کی سکونت پپرا کنک (PIPRA KANAK) ضلع کشی نگر (یوپی) میں تھی مگر دیوریا، مہراج گنج، گورکھ پور، پورب میں سیوان، گوپال گنج، موتیہاری، چمپارن وغیرہ علاقوں پر ہمیشہ نظر رکھتے تھے، اور وہاں کے دینی و ملی کاموں کے لیے پیش قدمی کی کوشش کرتے تھے۔ خود اپنے وطن پپرا کنک میں جامعہ رضویہ شمس العلوم کے نام سے ایک دینی تعلیمی ادارہ قائم کیا، جہاں اس دیار کے طلبہ حفظ و قراءت اور درس نظامی کی تعلیم حاصل کرتے، پھر دوسرے بڑے اداروں سے تکمیل کرکے مختلف مقامات پر پہنچ کر دینی و ملی خدمات انجام دیتے، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مولانا کو سلسلۂ تیغیہ، قادریہ میں خلافت بھی حاصل تھی، اس لیے سلسلے کی اشاعت میں بھی کوشاں رہتے، اطرافِ کشی نگر کے علاوہ مہاراشٹر وغیرہ میں بھی ان کے مریدین ہیں، وہ ان کی اصلاح و تربیت پر بھی توجہ دیتے، اس لیے ان کے مریدین میں عموماً دین سے محبت، شریعت کی پابندی، علما کی عزت اور تواضع و خاکساری کی صفات پائی جاتی ہیں، تعداد میرے خیال میں بہت زیادہ نہیں، مگر جو بھی ہیں اپنی دین داری کی وجہ سے قابل قدر اور لائق تحسین ہیں۔

۱۴۱۶ھ/۲۰۰۵ء میں مولانا کا صرف ۵۳ر سال کی عمر میں وصال ہوگیا، ان کے چار لڑکے ہیں: محمد ثقلین رضا، محمد کونین رضا، محمد حسنین رضا، محمد سبطین رضا، سبھی کو انھوں نے دین دار، نیک اطوار بنانے کی کوشش کی، جہاں تک ہوسکا علم و عمل سے آراستہ کیا۔ یہ حضرات ان کے مشن کو قائم رکھنے بلکہ آگے بڑھانے میں باہمی تعاون کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ مولا تعالیٰ انھیں کامیاب و کامران بنائے اور جملہ آفاتِ روزگار سے محفوظ و مامون رکھے۔

سجادگی چھوٹے صاحب زادے حافظ قاری محمد سبطین رضا کے حصے میں آئی، یہ لوگ ہر سال اپنے والد گرامی کا عرس کرتے ہیں اور اسے شریعت کے مطابق رکھنے کے ساتھ زیادہ بامقصد، بافیض اور مفید بنانے کی

---

(۱) انوار امام احمد رضا، یادگار ایوبی، کشی نگر، یوپی ۱۴۴۱ھ ۲۰۱۹ء

کوشش کرتے ہیں۔ ''یادگارِ ایوبی'' کے نام سے ایک سال نامہ بھی شائع کرتے ہیں جو عمدہ دینی و علمی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس خانقاہ سے کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، تفصیل جاننے کے لیے یادگارِ ایوبی کے شماروں کی مراجعت کی جاسکتی ہے۔

خانقاہِ قادریہ ایوبیہ کی علمی دل چسپی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اب تک اس کے زیر اہتمام سات آٹھ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں جن میں امام اعظم ابو حنیفہ سیمینار اور امام احمد رضا سیمینار بڑے پیمانے پر ممبئی میں منعقد ہوئے، باقی پپرا کنک، کشی نگر میں عرس ایوبی کے ساتھ عمل میں آئے۔ سنہ وار تفصیل یہ ہے:

نمبر شمار	سیمینار کا عنوان	تاریخ قمری	تاریخ شمسی
①	امام اعظم ابو حنیفہ سیمینار	۷/۸/۹ر صفر ۱۴۳۴ھ /	۲۱/۲۲/۲۳ر دسمبر ۲۰۱۲ء
②	فیضان برکات سیمینار	۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ /	۱۵ر مارچ ۲۰۱۳ء
③	فیضان خواجہ غریب نواز سیمینار	۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ /	۵ر مارچ ۲۰۱۴ء
④	فیضان غوث اعظم سیمینار	۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ /	۲۲ر فروری ۲۰۱۵ء
⑤	شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی سیمینار	۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ /	۱۲ر فروری ۲۰۱۶ء
⑥	بحر العلوم علامہ عبد العلی فرنگی محلی سیمینار	۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۸ھ /	یکم ر فروری ۲۰۱۷ء
⑦	شیخ عبد الحق محدّث دہلوی سیمینار	۲۹ر جمادی الآخرہ ۱۴۳۹ھ /	۱۸ر مارچ ۲۰۱۸ء
⑧	امام احمد رضا سیمینار (بمناسبت عرس صد سالہ)	۲۸/۲۹ر ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ /	۵/۶ر جنوری ۲۰۱۹ء

امام اعظم سیمینار کے مقالات کا ضخیم مجموعہ ''انوار امام اعظم'' کے نام سے (۸۵۳ صفحات پر مشتمل) ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد چھ سیمیناروں کے مضامین سال نامہ ''یادگارِ ایوبی'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں اکثر مضامین بہت قیمتی اور معلومات افزا ہیں۔ سبھی مجموعے اس قابل ہیں کہ شائقین انھیں حاصل کرکے مستفید ہوں۔

امام احمد رضا سیمینار:

اس کے انعقاد کا منصوبہ تقریباً چھ سال پہلے بنا۔ خیال یہ ہوا کہ فتاویٰ رضویہ کے علمی و فنّی محاسن پر اب

تک کوئی ضخیم مجموعہ باضابطہ تیار نہ ہو سکا جب کہ اس کے بغیر اس کے علمی کمالات کا خاطر خواہ تعارف ممکن نہیں۔ اس کے محاسن سے متعلق پندرہ سولہ عنوانات قائم کیے گئے، ماہرین کا انتخاب ہوا، ہر عنوان کسی مناسب شخصیت کو سپرد کرتے ہوئے درخواست کی گئی کہ فتاویٰ کی جلدیں سامنے رکھ کر اپنے عنوان پر سیر حاصل گفتگو کریں۔ سال دو سال کا وقت اس کے لیے کافی سمجھا گیا، مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا منصوبہ سازوں نے گمان کیا۔

وجہ یہ ہے کہ ہر عنوان کی تکمیل کے لیے فتاوی کی بارہ جلدوں کا بنظر غائر مطالعہ ضروری تھا، اس کے لیے مناسب وقت ملنا بہت مشکل تھا؛ کیوں کہ ہر شخصیت کے پاس اپنے یومیہ فرائض و مشاغل ہوتے ہیں، پھر کچھ ہنگامی مصروفیات بھی سامنے آجاتی ہیں جن سے دامن کشی کی صورت نہیں بن پاتی، ان حالات میں ایک اہم علمی موضوع کی سیرابی کے لیے فتاوی رضویہ کی بارہ ضخیم جلدوں پر نظر عمیق برسوں کی مشقت بلکہ کسی قوتِ قدسیہ کی کرامت چاہتی ہے۔

انجام یہ ہوا کہ دو تین سال گزر گئے اور کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ اس سے قبل ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۷ء تا ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء کے دوران میں نے جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں اختصاص فی الفقہ کے بعض طلبہ کو ایک ایک جلد اُن (پندرہ، سولہ) عنوانات کے ساتھ سپرد کی تھی تاکہ مفوّضہ جلد پر اُن عنوانات کے تحت سو یا زیادہ صفحات پر مشتمل اپنا تحقیقی مقالہ لکھیں، انھوں نے حسب استعداد کوشش کی اور دو سالہ نصاب کی مدت میں اپنے مقالات لکھ کر پیش کیے۔ فجزاهم الله خير الجزاء.

اول الذکر منصوبے میں ناکامی کے بعد مفتی محمد نظام الدین رضوی، صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور، مولانا نفیس احمد مصباحی و مولانا اختر حسین فیضی مصباحی پھر محب گرامی مولانا لیٰسین اختر مصباحی کی مشاورت سے یہ طے ہوا کہ اب ہر جلد سے متعلق طلبۂ تحقیق کے لکھے ہوئے انھی مقالات کو نظر ثانی و اصلاح کے بعد یکجا شائع کر دیا جائے۔ بحمدہ تعالیٰ صد سالہ عرس رضوی سنہ ۱۴۴۰ھ کے موقع سے یہ کام مکمل ہو گیا، اور تقریباً چودہ سو صفحات پر مشتمل یہ مقالات تین وقیع جلدوں میں المجمع الاسلامی، مبارک پور کے مصارف پر شائع ہو گئے۔ مجموعے کا نام یہ ہے:

فتاویٰ رضویہ : جہانِ علوم و معارف

اس کے باوجود خانقاہ قادریہ ایوبیہ نے اپنے اہتمام میں امام احمد رضا سیمینار کے انعقاد کا منصوبہ منسوخ نہ کیا۔ سنہ ۱۴۴۰ھ امام احمد رضا قدس سرہ کے صد سالہ عرس کا سال ہے۔ بہت سی انجمنوں، اداروں، تنظیموں اور افراد نے امام موصوف کی یاد میں اس سال، جشن، کانفرنس، سیمینار اور جلسے منعقد کیے، بہت سی ضخیم

اور غیر ضخیم کتابیں شائع ہوئیں، امام احمد رضا اکیڈمی بریلی سے ۲۰ر جلدوں میں جہان امام احمد رضا اور بہت سے رسائل و کتب کی اشاعت ہوئی۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے بعض طلبہ نے ایک ضخیم مجموعہ شائع کیا بعنوان " فروغ رضویات میں فرزندانِ اشرفیہ کی خدمات"۔ ماہ ناموں کے عمدہ اور ضخیم نمبر بھی نکلے، اس لیے خانقاہ قادریہ ایوبیہ نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس کی اور ممبئی کے علاوہ ۱۷/ ۱۸/ مارچ ۲۰۱۹ء عرس ایوبی کے موقع سے پڑرا کنک، کشی نگر میں ہونے والا سیمینار بھی " امام احمد رضا قدس سرہ" سے ہی منسوب رکھا۔

ممبئی کے امام احمد رضا سیمینار کے لیے " فتاویٰ رضویہ: جہانِ علوم و معارف " کے مقررہ عنوانات سے الگ کچھ آسان موضوعات منتخب کیے گئے جو مقالہ نگاروں کے لیے غیر معمولی بار گراں نہ ثابت ہوں اور آٹھ، دس ماہ کے مقررہ وقت میں خاطر خواہ ان کی تکمیل ہو سکے۔

خدا کا شکر ہے کہ اچھے مقالات موصول ہو گئے اور مزید کچھ نگارشات کو شامل کر کے ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل دو وقیع جلدیں تیار ہو گئیں۔

کئی سال سے " یادگار ایوبی" کی ترتیب اور سیمیناروں کے مضامین کو یکجا کر کے کمپوزنگ، پروف ریڈنگ وغیرہ مراحل سے گزارنے کا کام مولانا نفیس احمد مصباحی اور مولانا اختر حسین فیضی مصباحی، استاذان جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے سر رہتا ہے، جسے یہ حضرات وقت نکال کر بحسن و خوبی مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ مجموعہ " انوارِ امام احمد رضا" بھی ان ہی کی ترتیب سے اشاعت پذیر ہے، پروف ریڈنگ میں معاونین کی تعداد ۱۵ ہے، جن کی فہرست دونوں جلدوں کے دوسرے صفحے پر درج ہے۔ ربّ کریم سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مزید مہارت و ژرف نگاہی نصیب کرے۔

یہ جلدیں آٹھ ابواب پر مشتمل ہیں، جلد اول میں باب اول تا سوم، جلد دوم میں باب چہارم تا ہشتم ہیں۔ ہر باب کے تحت عنوانات اور اہل قلم کے اسما فہرست میں نمایاں طور پر مذکور ہیں، اس لیے میں یہاں ان کی تفصیل ترک کرتا ہوں۔ غالب گمان یہ ہے کہ فہرست بھی قارئین ملاحظہ کریں گے اور میری خامہ فرسائی دیکھنے کی زحمت کم ہی لوگ کریں گے۔

لیکن بعض مضامین کی جانب ان کی کسی خصوصیت یا جامعیت کی وجہ سے اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، مثلاً:

(۱) امام احمد رضا اور فقہی ضوابط کی تدوین — از مفتی محمد نظام الدین رضوی دام ظلہ
باب سوم کے تحت ساٹھ (۶۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

جہاں تک میری یاد داشت کام کر رہی ہے اس عنوان پر اب تک کسی صاحب قلم نے باضابطہ کوئی

مضمون نہیں لکھا ہے۔ ان حالات میں یہ مضمون "نقشِ اول" ہے۔ اگر چہ اس میں اضافے کی کافی گنجائش موجود ہے، مگر توقع نہیں کہ کسی جانب سے پیش قدمی ہو، مفتی صاحب خود اس عنوان کے تحت یادداشتیں جمع کرتے رہیں تو امید ہے کہ مستقبل قریب میں ایک جامع اور وقیع کتاب منظر عام پر آسکتی ہے۔ وفقه الله و إيانا لما يحبّ و يرضىٰ.

(۲) فتاویٰ رضویہ میں اصلاح و موعظت کا عنصر از مولانا ساجد علی مصباحی

باب سوم میں سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔

عموماً فتاویٰ میں سائلین کو شرعی احکام بتا دیے جاتے ہیں، کبھی تہدید و تاکید کے لیے دو چار سطریں بھی لکھ دی جاتی ہیں۔ لیکن شعوری طور پر باضابطہ یہ کوشش کہ جو کسی گناہ میں مبتلا ہے وہ فوراً اُس سے تائب ہو کر جادۂ شریعت پر گام زن ہو جائے، اس میں ایسے جذبات برانگیختہ ہوں کہ اس کے دل میں شر سے پوری نفرت اور خیر سے پوری محبت بیدار ہو جائے، ایسا صوفیۂ کرام اور اولیاے عظام کے یہاں تو بہت ہوتا ہے مگر مفتیانِ کرام کے یہاں یہ عنصر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

سیدنا امام احمد رضا قدّس سرّہ مفتی بھی تھے، مصلح اور مجدّد بھی، صوفی اور ولی بھی، اس لیے ان کے فتاوی میں "اصلاح و موعظت کا عنصر" فراوانی سے نظر آتا ہے۔

میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ شکوہ کیا تھا کہ "آج سے چالیس سال قبل جب برادر گرامی مولانا یٰسین اختر مصباحی کی کتاب "امام احمد رضا اور ردّ بدعات و منکرات" پر میں نے "تقریب" لکھی تھی تو اس عنوان کے تحت چند شواہد پیش کیے تھے اور امید ظاہر کی تھی کہ کوئی صاحب قلم اس موضوع کو مبسوط انداز میں سیراب کریں گے لیکن اتنے طویل عرصے میں اس پر کوئی قابل ذکر قلمی کاوش نظر نہ آئی۔ میرے چند طلبہ نے اس پر جزوی کوشش کی ہے مگر اس میں ابھی کافی اضافے کی ضرورت ہے۔"

خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس شکوے کا جواب اسی سیمینار میں مل گیا اور اپنے ہی عزیز اور جامعہ اشرفیہ کے قابلِ قدر استاذ کے قلم سے سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ دیکھنے کو ملا۔ اس میں اضافے کی گنجائش سے انکار نہیں، مگر کسی عنوان پر سو صفحات تو ہم ان فارغین سے قبول کر لیتے ہیں جو دو سالہ مدت تحقیق میں کسی طرح تیار کر کے لاتے ہیں، یہ تو تعلیمی و خانگی مشاغل کو باقی رکھتے ہوئے غالباً صرف دو تین ماہ کی کاوش قلم ہے۔ ربّ تعالیٰ قبول فرمائے اور مزید دینی و علمی خدمات انجام دلائے۔

(۳) کنز الایمان: تعارف و جائزہ از مولانا محمد عارف اللہ فیضی مصباحی

باب سوم میں ایک سو تیرہ (۱۱۳) صفحات پر مشتمل ہے۔

کنز الایمان کے محاسن پر بہت کچھ لکھا گیا، خصوصاً جب سعودی گورنمنٹ نے اس پر پابندی عائد کی، اور اس کے ہندی وظیفہ خواروں نے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دینے کی کوشش کی تو ہمارے اہل قلم نے ان کی باطل پروری اور کنز الایمان کی حقانیت کو واشگاف کرتے ہوئے بہت لکھا اور خوب لکھا۔ میں اُس زمانے کی بیش تر نگارشات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس کے باوجود زیر تذکرہ مضمون کو کچھ نئے انداز، نئے نکات اور دل چسپ مباحث پر مشتمل پا کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس کی قدر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پرانی تحریروں کے مطالعے سے گزر چکے ہوں۔ مولانا موصوف نے خوش اسلوبی سے سنجیدہ تحقیق کی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

(۴) امام احمد رضا اور ردّ آریہ از مولانا خالد ایوب شیرانی مصباحی

باب سوم میں ۵۰ صفحات پر مشتمل اس عنوان کے تحت بالکل نیا مضمون ہے۔

امام احمد رضا قدّس سرّہ نے فرق باطلہ کے علاوہ مذاہب باطلہ کے رد میں بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن وہ ساری تحریریں شائع نہ ہوئیں، اس لیے ان کا تفصیلی تعارف ممکن نہیں۔ ملک العلما علامہ ظفر الدین احمد بہاری علیہ الرحمہ نے ردّ آریہ کے تحت کیفر کفر آریہ اور پردہ درِ امرتسری، دو رسالوں کا ذکر کیا ہے مگر وہ دست یاب نہیں، اس لیے اس عنوان پر باضابطہ کوئی مضمون لکھنا بہت دشوار تھا۔

مگر مولانا خالد ایوب نے فتاویٰ رضویہ کی جلدوں سے تلاش کر کے کچھ مواد نکالا اور اپنے تبصرے اور تفصیل و توضیح کے ساتھ پچاس صفحات پر مشتمل ایک شاندار مضمون تیار کر دیا، یہ ان کی محنت، دیدہ وری اور اپنے موضوع کا حق ادا کرنے سے دل چسپی کی دلیل ہے۔ مولا تعالیٰ ان کے علمی و تحقیقی ذوق میں مزید برکتیں اور ان کی قلمی خدمات میں مزید وسعتیں نصیب فرمائے۔

(۵) فتاوی رضویہ: ایک تعارف اس عنوان کے تحت باب سوم میں مولانا محمد صادق مصباحی کا مضمون شامل ہے، جس کی خوبی یہ ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ صرف دس صفحات میں فتاویٰ رضویہ کے بہت سے امتیازی محاسن اشارۃً بیان کر دیے ہیں۔ یہ بھی فتاوی رضویہ کا ایک امتیاز ہے کہ صرف اشارات کے لیے دس صفحات صرف ہو گئے۔

(۶) امام احمد رضا اور عقیدۂ ختم نبوت از مولانا نظام الدین علیمی مصباحی

باب چہارم میں اکتالیس صفحات پر مشتمل ایک جامع مقالہ ہے جس میں موضوع سے متعلق سبھی ضروری مندرجات تفصیل و اختصار کے امتزاج کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ درج ذیل مقالات بھی اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے پسند آئے۔

۷-امام احمد رضا اور علوم حدیث (باب پنجم) از مولانا کمال احمد علیمی

۸-حدیث اور رجال حدیث میں مہارت (باب پنجم) از مولانا محمد اختر کمال قادری مصباحی

۹-اصول فتوی نویسی اور اجلی الاعلام (باب پنجم) از مولانا محمد حنیف خاں رضوی

باب ششم (روابط و تعلقات) میں ایک دو کے علاوہ سبھی مضامین اہم اور عمدہ معلومات پر مشتمل نظر آئے۔

باب اول میں ہمارے وفات یافتہ بزرگوں کی نگارشات ہیں جو "قند مکرر" اور تبرک کے طور پر شریک اشاعت ہیں، ان کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہوگا۔

باقی مضامین بھی افادیت سے خالی نہیں لیکن طول کلام سے بچنا بھی ضروری ہے، اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ "عطار" سے کچھ سننے کی بجائے خود "مشک" کو ہاتھ میں لینے اور دیکھنے سونگھنے کی کوشش کی جائے۔

اس مجموعے کی اشاعت میں فکری، قلمی، بدنی، مالی کسی بھی طور سے شرکت کرنے والے تمام اہل خیر کی خدمات کو ربّ کریم شرف قبول سے نوازے اور جزائے فراواں مرحمت فرمائے۔ آمین - والصلاۃ و السلام علی سید المرسلین و علیھم و علی آلہ و صحبہ أجمعین.

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔یوپی

المجمع الاسلامی
۳؍ شعبان ۱۴۴۰ھ
۹؍اپریل ۲۰۱۹ء۔سہ شنبہ

تقریظ(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامدًا و مصلیاً و مسلماً

زیر نظر کتاب عزیز القدر مولانا سرفراز احمد مصباحی استاد جامعۃ المدینہ نیپال گنج کی کاوش فکر و قلم ہے۔یہ چند قسموں پر منحصر ہے:

(۱) کلمات کی استعمالی صورتیں
(۲) مثالوں میں دی گئی عبارات کی نحوی تراکیب
(۳) فروق لغویہ
(۴) ترکیبی شبہات کا ازالہ
(۵) کیا کہیں کیا نہ کہیں؟
(۶) نحوی پہیلیاں
(۷) صرفی پہیلیاں

ہو سکتا ہے کتاب میں اور اضافہ ہو تو کچھ اور بحثیں شامل ہو جائیں، میں نے محسوس کیا کہ اس میں جو مسائل دیے گئے ہیں ان میں اکثر وہ ہیں جن کی صراحت ہماری درسی کتب نحو میر، ہدیۃ النحو، شرح ماۃ عامل، کافیہ شرح جامی وغیرہ میں نہیں ملتی خصوصًا اس کتاب کی ترتیب کے ساتھ ان کا ذکر یقینًا نہیں۔میں نے اس کتاب کی بہت سی بحثوں کو پڑھا ہے۔

عزیز موصوف کا علمی شغف اور ذوق مطالعہ قابل تحسین ہے کہ انھوں نے درسی کتب اور ان کی شروح و حواشی سے آگے بڑھ کر نئے دور میں تصنیف ہونے والی نحوی، صرفی اور ادبی کتب سے استفادہ کیا، کچھ قدیم تصانیف کو بھی ماخذ بنایا اور ان سے گراں بہا موتی چن کر شائقین کی ضیافت قلب و نظر کے لیے انھیں سجا کر پیش کر دیا۔

امید ہے کہ اہل علم اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور طلبہ بھی حسب ذوق و ہمت استفادہ سے باز نہ رہیں گے۔اللہ کریم کتاب کو قبول فرمائے اور عزیز موصوف کو توفیق مزید سے نوازے۔آمین

المجمع الاسلامی
۱۸؍محرم ۱۴۴۲ھ
۷؍ستمبر ۲۰۲۰ء دوشنبہ

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

(۱) جب نحو آپ کو الجھادے، از مولانا سرفراز احمد مصباحی، صراط پبلی کیشنز

"حرف آغاز"

باسمہ وحمدہ

افکار وخیالات کی ترویج میں تقریر وتحریر کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر تقریر کی افادیت اس وقت ہے جب واقعی تقریر ہو یعنی عنوان گفتگو کا مضبوط اور موثر طریقہ پر اثبات ہو۔ یہ اس وقت زیادہ کار آمد ہوتی ہے جب بہت سے افراد کو کسی موضوع پر فوراً متنبہ کرنے کی سخت ضرورت ہو ایسے موقع پر چند منٹ میں ایک بلیغ کی تقریر لوگوں کے شکوک و شبہات دور کر دیتی ہے اور سکون و اطمینان بخشی ہے۔ کسی قومی، ملکی، مذہبی مفاد کی طرف افراد کی کثیر جماعت کو یک بیک متوجہ و متنبہ کرنے کے لیے بھی تقریر ہی کو ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ زیادہ تر فوری اور وقتی ضرورتیں اسی سے پوری کی جاتی ہیں۔ خصوصاً ناخواندہ افراد کی آگاہی کے لیے تحریر بالکل بے کار اور تقریر یا مجلسی و زبانی تفہیم ہی ضروری ہے البتہ سنانے اور بتانے والے ارباب علم کا ماخذ و مرجع عموماً تحریر ہی ہوتی ہے۔ انھیں افکار و دلائل ہی نہ میسر ہوں گے تو وہ زبانی طور پر لوگوں کی تعلیم و تفہیم سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے ؟ لہٰذا معتدبہ مقدار میں کتابوں اور تحریروں کا ہونا از حد ضروری ہے۔

تحریر کا دائرۂ ابلاغ زیادہ وسیع اور دیرپا ہے اگرچہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے تقریر کا دائرہ بھی پوری دنیا تک پھیلا کر عام کر دیا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر فلاحی انجمن اور ہر فرد کو یہ سہولت حاصل ہو اور اگر کسی کو حاصل بھی ہو تو ضروری نہیں کہ جن لوگوں کو وہ باخبر کرنا چاہتا ہے وہ سب ریڈیو یا ٹیلی ویژن لیے اسی کی تقریر سماعت کر رہے ہوں۔ جب کہ تحریر باقی رہ کر کسی وقت بھی لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اور مقررین و مبلغین بھی اس سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں تک اس کا مضمون پہنچا سکتے ہیں۔ پھر آج کے نسیانی دور میں تو تقریریں حافظہ کی گرفت سے بالکل نکل جاتی ہیں اور تحریریں ہی اپنا اثر دکھاتی ہیں اور اصل سہارا اور ماخذ و مرجع یہی ثابت ہوتی ہیں۔ ہاں ٹیپ ریکارڈ نے بڑی حد تک تقریر و گفتگو کے تحفظ میں اپنا رول ادا کیا ہے۔ مگر زحمت و کلفت سے خالی نہیں۔ البتہ آواز کی کاپی محفوظ رکھنا اس کی انفرادی خصوصیت ہے۔ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ تحریر بھی وہی کار آمد ہے جو بامقصد موثر اور جامع ہو۔ لایعنی تقریروں کی طرح بے مغز تحریریں بھی نظر التفات کے قابل نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اہل سنت کے علما و اہل قلم نے جامع، مدلل، سنجیدہ اور پُر مغز کتابوں کا بھی عظیم ذخیرہ ورثہ میں چھوڑا ہے۔ اور بہت سا نیا ذخیرہ نئے اہل قلم کو عصر جدید کے مقتضیات کی روشنی میں تیار کرنا ہے جس کی طرف کچھ لوگوں نے توجہ

شروع کی ہے۔ لیکن تصنیف و اشاعت کے لیے بھی ایک یا کئی معیاری دارالعلوم جیسی عمارت اور اسٹاف کی ضرورت ہے جس سے ہمارے بیشتر عوام و خواص یا تو بے خبر ہیں یا دانستہ اسے نظر انداز کر رہے ہیں یا اس راہ کی سخت مشکلات کی وجہ سے اس میں قدم رکھنے کو تیار نہیں مگر وقت کے تقاضوں سے گریز کب تک ؟

جامعہ اشرفیہ کے باشعور طلبہ و فارغین نے موقع و محل کی مناسبت سے تبلیغ دین کی راہ میں تقریر و تحریر دونوں کو اختیار کیا، اگرچہ تقریر کی طرف پہلے اور اب بھی ضرورت سے زیادہ توجہ دی گئی اور دی جا رہی ہے۔ مگر اشاعتِ کتب کی راہ میں بھی خاصی پیش قدمی ہو چکی ہے لیکن کام ابھی بہت زیادہ باقی ہے۔ حالیہ دس برس کے اندر خاصی اشاعت عمل میں آنے کے باوجود ہماری نظر میں اس کی حیثیت " آغاز باب " سے زیادہ نہیں۔ اہل نظر غور کر لیں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ربّ کریم تائید و توفیق سے نوازے۔

جامعہ کے اندر زیر تعلیم اعظمی طلبہ نے ایک مختصر مقالہ "رحمت عالم" کی اشاعت سے اپنی نثری مہم کا آغاز کیا ہے۔ صاحب مقالہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے کئی اہم گوشوں پر ان کی رحمت عامہ کے ذیل میں قدرے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ خاص طور سے نوع انسان کے مظلوم طبقات (عورتوں، یتیموں، غلاموں) پر ان کی رحمت کو تقابلی طریقہ اور دل نشیں پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ رب کریم موکف کو جزائے خیر سے نوازے اور ناشرین کو توفیق مزید مرحمت فرمائے۔ ھو المستعان و علیہ التکلان۔

محمد احمد اعظمی مصباحی

صدر المدرسین فیض العلوم محمد آباد گوہنہ

۲۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ

۱۶؍ فروری ۱۹۸۵ء شنبہ

كلمة اعتراف وتقدير[1]

حامدا ومصليا ومسلّما

بسم الله الرحمٰن الرحيم

علماء گجرات تركوا تراثا عظيما في فنون عديدة وقدّره معاصرهم ومَن بعدهم تقديرا حسنا فنسخوا كتبهم بأيديهم، أو استنسخوها من أحد الخطاطين بأجره، أو استكتبوها بعض باعة الكتب من أحد الناسخين بأجرة، ثم باعوها، فانتشرت نقول كتبهم في الهند وخارجها، ولم تكن المطابع نشأت في زمانهم.

وبعد نشأة المطابع قلّما عُني بطبع تلك الكتب ونشرها فضاع أكثرُها وبقي بعضها مخزونة في بعض دور الكتب، والنقل لا يعتمد عليه إلا إذا تحقق أن أحدا من الفضلاء قابله بأصل موثوق به، بتيقظ تام و وعي حاضر وصوّب ما وقع فيه من الأخطاء.

وُجدت نسخة خطّية لكتاب: "**الفيض النبوي**" لأحد علماء گجرات في مكتبة من بريطانيا، لكن ليس فيها اسم الناسخ ولا تاريخ النسخ، ولا ذكر الأصل الذي نسخت عنها، ويظهر بعد المطالعة كثرة الأخطاء الواقعة فيها بأيدي الناسخين. ليس بهيّن تصويب مثل هذه المخطوطة ، ثم طبعها ونشرها.

لكن الشغف بالعلم يبعث المرأ على تحمل المشاق، فيخترق سبيلا لمكافحة الشدائد، وتسهيل المتاعب،ونيل المقاصد،لما وصلت صورة النسخة المذكورة إلى العالم الباحث **الشيخ نفيس أحمد المصباحي** قام عن ساق الجد والاجتهاد،وراجع الأصول التي أخذ منها صاحب الفيض،وصوّب أخطاء كثيرة، ولولا هذا البحث والفحص والتصويب لكان كثير من عبارات الكتاب مَجْهَلة ومَضَلّة للناشئين، وأضحوكة وأعجوبة للباحثين، وألغازاً و أحاجي لعامّة القارئين.

(۱) الفیض النبوی، الشیخ نفیس احمد مصباحی، جماعت رضائے مصطفیٰ، یو-کے، ۱۴۴۲ھ/۲۰۲۰ء

وقد أضاف الشيخ إلى الكتاب معارف جمّة في تعليقاته، سوى التخريج والتصويب، وضم إليه مقدمة حافلة راشدة في علوم الحديث وترجمة الإمام البخاري، والتعريف لصحيحه، والتعريف بالفيض النبوي ومؤلفه رحمه الله تعالى.

من نظر إلى هذه الجهود الحثيثة اعترف بمكانة الباحث، وخدماته الجميلة وأعماله المثمرة لإصدار هذا الكتاب. والله وليّ الجزاء لكل خير.

محمد أحمد المصباحي

مدير المجمع الإسلامي

ومدير التعليم بالجامعة الأشرفية

مبارك فور، أعظم جره. الهند

۲۷/ صفر ۱٤٤۲هـ

۱۵/أكتوبر ۲۰۲۰م

کتاب اور صاحبِ کتاب(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم حامدًا ومصلّیًا ومسلّما

غیر مقلدین تقلید سے دامن کشی کے لیے کتاب وسنت کا نام بڑے زور شور سے لیتے ہیں، لیکن ان کے عقائد واعمال کا جائزہ لیجیے تو کتاب وسنت سے انحراف صاف دکھائی دیتا ہے، اسی طرح کسی عمل کی بحث آتی ہے تو وہ حدیث کا مطالبہ کرتے ہیں اور کتبِ حدیث میں بھی خاص بخاری ومسلم کا نام لیتے ہیں یعنی ان دونوں میں جو ہے وہی دین اور شریعت ہے اور ان سے باہر جو کچھ ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں، اگرچہ وہ قوی سے قوی تر دلیل سے ثابت ہو۔

زیر نظر کتاب میں غیر مقلدین کے بلند بانگ دعووں کی نقاب کشائی بڑی خوش اُسلوبی سے کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ قدم قدم پر صحیحین (صحیح بخاری وصحیح مسلم) سے ان کا انحراف اور کتاب وسنت سے دوری ان کے خمیر میں داخل ہے۔

اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے دلائل وشواہد کی مضبوط زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے، چشم بینا ہو تو دیکھے، گوش شنوا ہو تو سنے۔ کھلے دل سے مطالعہ کریں، اس میں ہدایت وبصیرت کا سامان وافر مقدار میں مُہیّا پائیں گے۔

(۱) احادیث صحیحین سے غیر مقلدین کا انحراف، مفتی محمد نظام الدین رضوی برکاتی، مجلس برکات جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، ۱۴۴۲ھ/۲۰۲۱ء

واللہ الهادي والنصير.

صاحب کتاب: جی چاہتا ہے کہ مصنف کا بھی کچھ ذکر خیر کر دیا جائے۔

جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں درجۂ فضیلت کا نصاب مکمل کرنے کے بعد یہیں انھوں نے تحقیق فی الفقہ کا نصاب مکمل کیا اور انھی کی جماعت سے جامعہ میں "تحقیق فی الفقہ" کا آغاز ہوا اور اب بھی جاری ہے۔

درجۂ تحقیق میں اسباق کی تکمیل اور مشقِ افتا کے ساتھ کم از کم سو صفحات پر مشتمل ایک مقالہ بھی لکھنا ہوتا ہے، موصوف کے مقالے کا عنوان تھا: "فقہ حنفی کا تقابلی مطالعہ، کتاب وسنت کی روشنی میں"۔ ان کا یہ مقالہ تقریبًا ۱۵۰ر صفحات پر مشتمل ہے جس میں مذاہب اربعہ کے ۱۷ر اصولی اور فروعی اختلافی مسائل کا تقابلی مطالعہ ومحاکمہ ہے۔

انھوں نے تدریس، افتا، قضا، مذاکرہ، تصنیف، تقریر، وغیرہ مختلف میدانوں میں نمایاں کام کیا ہے، میں یہاں اجمالاً ان کا کچھ ذکر کروں گا۔

① ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں جامعہ سے فراغت کے بعد یہیں سے ان کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جو ۳۱ر مارچ ۲۰۲۱ء (شعبان ۱۴۴۲ھ) تک تقریبًا اکتالیس، بیالیس سال(۱) پر پھیلا ہوا ہے۔ اور ان شاء اللہ الرحمٰن تاحیات جاری رہے گا۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے عمومًا درجۂ سادسہ تا فضیلت یا درجۂ تحقیق کی کتابیں ان کے زیر تدریس رہیں۔ جو کتاب بھی ان کے ذمہ آئی بحسن وخوبی اسے پڑھنے، پڑھانے، سمجھنے، سمجھانے اور طلبہ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی، ان کتابوں میں ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، مسلم شریف، بخاری شریف، الاشباہ والنظائر اور فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مسلم شریف پر انھوں نے مذہب حنفی کی تائید کے لیے عربی میں مختصر حاشیہ بھی لکھا ہے۔

ہدایہ اخیرین کی تدریس میں انھوں نے خاص محنت وشغف سے کام لیا، اسی سے استخراج واستنباط کا اسلوب سیکھا، فقہی ضوابط اخذ کیے اور حوادث پر ان کی تطبیق کا طرز اپنایا، جس سے ان کے فتاوی، مقالات اور بحثوں میں بڑا نکھار آیا۔ فقہ وفتوی، اصول فقہ، اصول افتا اور دیگر علوم کی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ مزید برآں ہے۔

تدریس میں اوقات درس کی پابندی اور مناسب مدت میں نصاب کی تکمیل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا انھوں نے ہمیشہ لحاظ رکھا۔

(۱) انگریزی سنہ کے لحاظ سے تقریبًا ۴۱ر سال اور عربی سنہ کے لحاظ سے تقریبًا ۴۲ر سال۔

④ جامعہ اشرفیہ میں آغاز تدریس کے ساتھ **دار الافتا** سے بھی برابر ان کی وابستگی رہی۔ پہلے شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ ان سے فتاویٰ املا کراتے، پھر یہ خود بھی فتوے لکھتے اور حضرت شارح بخاری کی نظر ثانی اور تصدیق کے بعد انھیں جاری کرتے۔ اس باب میں ان کا قابل ذکر وصف یہ ہے کہ انھوں نے تن آسانی اور سہل پسندی سے گریز کرتے ہوئے مشکل مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جس کے لیے انھیں زیادہ محنت و مشقت اور بڑی مشق و ممارست سے گزرنا پڑا، اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ شارح بخاری علیہ الرحمہ کی زندگی ہی میں وہ ایک ماہر مفتی اور عمدہ محقق کی حیثیت سے متعارف ہوگئے۔

③ ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء میں شارح بخاری علیہ الرحمہ کے وصال کے تھوڑے دنوں بعد شعبۂ افتا کی صدارت بھی ان کے ذمہ آگئی۔ اس کے بعد دیگر مفتیانِ ادارہ کی رہ نمائی، ان کے فتاوی پر نظر ثانی اور ذمہ دارانہ تصدیق بھی ان کا معمول بن گئی۔

④ بعض مسائل وہ ہوتے ہیں جن کا حل محض دار الافتا کی بجائے **دار القضا** سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس کا احساس کرتے ہوئے دار الافتا کے ساتھ یہاں دار القضا کا قیام بھی عمل میں آیا۔ قضا کے مسائل، قاضی کا دائرۂ کار، قضا کے اصول وضوابط ان امور پر مفتی محمد نظام الدین صاحب نے باقاعدہ مضامین لکھے اور ضرورت مند شائقین کو قضا کی تعلیم وتربیت سے بھی سرفراز کیا۔ نئے چاند کے مواقع پر وہ برابر مستعد رہتے ہیں اور پابندی سے رویت یا عدم رویت کا عموماً اعلان بھی کرتے ہیں۔

⑤ جولائی ۲۰۱۴ء سے مارچ ۲۰۲۱ء تک انھوں نے جامعہ اشرفیہ میں بحیثیت "صدر المدرسین" کام کیا۔ اب ریٹائرڈ ہونے والے ہیں۔ یہ عہدہ بڑے اداروں ہی نہیں، چھوٹے مدرسوں میں بھی کلفت وآلام سے بھرا ہوتا ہے۔ طلبہ کا لحاظ، مدرسین کی دل جوئی، انتظامیہ کی خوشنودی، عوام کا اعتماد سب کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے، نظام تعلیم کی بہتری اور طلبہ ومدرسین کی کارکردگی پر ہمیشہ نظر رکھنا پڑتا ہے اور کسی ابتری پر صدر المدرسین جواب دِہ ہوتا ہے، اس لیے اس عہدے کے ساتھ سلامت گزر جانا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ آساں ہے "پرنسپل ہونا"۔ جو لوگ امانت ودیانت سے عاری اور جلبِ منفعت کے عادی ہوتے ہیں، ان کے نزدیک یہ منصب یا کوئی منصب کسی "حلوائے تر" سے کم نہیں۔ مگر جو لوگ امانت ودیانت، عدل وانصاف اور صدق وراستی کے پابند اور مشکلات سے خبردار ہوتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ: اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

مفتی صاحب نے اپنے دور صدارت میں میری بہ نسبت زیادہ مشکلات اور ناخوشگوار حالات کا سامنا کیا مگر ثابت قدمی، صبر وتحمل اور حکمت وتدبر سے اپنا دور پورا کیا، گویا۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

⑥ تصنیف سے بھی انھیں دل چسپی ہے، ان کے طویل فتوے اور سیمیناروں کے تحقیقی مقالات خود عمدہ تصنیف کا درجہ رکھتے ہیں، ۲۵ر سے زیادہ کتابیں ان کے قلم سے منظر عام پر آچکی ہیں۔

⑦ مذاکرات اور سیمیناروں سے انھیں فطری لگاو ہے، ملک کے مختلف سیمیناروں میں شرکت کرچکے ہیں اور مجلس شرعی کے سیمینار تو گویا انھی کے دم قدم سے جاری وساری ہیں۔

⑧ ان کا انوکھا اور مقبول ومشہور سلسلہ وہ ہے جو جلسوں میں اور اجتماعات میں فقہی سوالات وجوابات کی صورت میں رونما ہوتا ہے، اس کے لیے کمال استحضار اور ملکہ تفہیم ضروری ہے، تاکہ عوام وخواص بخوبی مستفید ہوسکیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ اس وصف میں بہت نمایاں، ممتاز، مقبول اور ہر دل عزیز ہیں۔ ان کے بعض جوابات قلم بند ہوکر شائع بھی ہوچکے ہیں۔

⑨ ضرورت مندوں کی خدمت کے لیے وہ کچھ اوقات کے استثنا کے ساتھ ہمیشہ کمربستہ رہتے ہیں اور موبائل پر آنے والے سوالات کا بھی شافی جواب دیتے ہیں اور کبھی کبھی آئندہ کے لیے مؤخر کرتے ہیں، بعض مفتیان کرام کا کہنا ہے کہ موبائل پر جواب نہیں دینا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ مسئلہ پوری طرح مستحضر نہ ہو اور جواب میں غلطی ہوجائے، اس کے باوجود ہمارے مفتی صاحب کی ہمت اور مسلسل خدمت قابل آفریں ہے۔

⑩ انھوں نے فتاوی اشرفیہ کی تدوین کا بھی بیڑا اٹھایا ہے، اس میں کئی معاونین کی اعانت بھی شامل ہوتی ہے مگر آخری نظر ثانی اور تصحیح انھی کی ہوتی ہے۔ اس کے لیے "مجلس فقہی" کے نام سے ایک بورڈ کی بھی تشکیل ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا وجود انھی کی ہمت ومحنت کا صدقہ ہے۔

⑪ مفتی صاحب کی اور بھی خوبیاں ہیں، مثلاً: تقریر، خوش اخلاقی، رابطۂ عامہ، ضیافت، فیاضی، حاضر جوابی، وغیرہ، ان کا ذکر آپ دوسرے رفقا کے قلم سے بھی دیکھیں گے۔ جس قدر میں نے ماسبق میں اجمالاً بیان کیا ہے انھی کو کوئی صاحب قلم تفصیل سے لکھ دے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

میں علالت، کمزوری اور کبرسنی کے دور سے گزر رہا ہوں اس لیے ایک شش جہت عالم ربانی، مفتیِ تبحر

اور سراج الفقہا کے تعارف میں چند سطریں لکھنے کی ہمت کی۔ آئندہ اتنی سطور کی بھی ہمت وقوت ملے، نہ ملے، کوئی ضمانت نہیں۔ والله المستعان على نوائب الزمان وبيده الخير وأصلّی وأسلّم علیٰ حبيبه وآله وصحبه أجمعين.

محمد احمد مصباحی
ناظم تعلیمات، الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ

المجمع الإسلامي
۳ر شعبان ۱۴۴۲ھ / ۱۶ر مارچ ۲۰۲۱ء
شب سہ شنبہ

باب ہفتم

فقہی مقالات کے خلاصے

خلاصۂ مقالات، بعنوان

الکحل آمیز دواؤں اور رنگین چیزوں کا استعمال

پہلا موضوع: انگریزی دواؤں اور ممنوع چیزوں سے مخلوط رنگوں کا حکم

بالعموم انگریزی دواؤں میں ممنوع اشیا کی ملاوٹ کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں جو مقالات موصول ہوئے، ان میں بعض مبسوط ہیں، بعض متوسط اور بعض صرف ایک فتوے اور رائے کے طور پر بہت مختصر لکھے گئے ہیں۔

مبسوط مقالات درج ذیل حضرات کے ہیں:

(۱)- مولانا آلِ مصطفیٰ مصباحی	۲۲؍ صفحات
(۲)- مولانا بدرِ عالم مصباحی	۱۲؍ صفحات
(۳)- مولانا عبد الحق رضوی	۱۶؍ صفحات
(۴)- مولانا محمد معراج القادری	۱۰؍ صفحات
(۵)- مولانا انور علی مصباحی	۱۰؍ صفحات

متوسط:

(۶)- مفتی مجیب الاسلام نسیم اعظمی	۳؍ صفحات
(۷)- مولانا محمد نسیم فیض آبادی	۲؍ صفحات
(۸)- مولانا رحمت حسین کلیمی	۲؍ صفحات

آرا و فتاوی:

(۹)- علامہ عبد الحکیم شرف قادری، لاہور	۱؍ صفحہ
(۱۰)- مفتی محمد ایوب رضوی	۱؍ صفحہ

(۱۱)-مفتی زین العابدین نانڈوی ۱ر صفحہ
(۱۲)-مولانا قاضی فضلِ احمد مصباحی ۲ر صفحات
(۱۳)-مولانا مفتی اختر حسین مصباحی دربھنگوی ۱ر صفحہ

ان مقالات وفتاویٰ کا مجموعی رخ جواز کی جانب ہے، عدم جواز کا رجحان رکھنے والے مقالات یہ ہیں:

مبسوط وغیر مبسوط:

(۱۴)-مولانا شمس الہدیٰ بستوی ۱۵ر صفحات
(۱۵)-مولانا عزیر احسن رضوی ۱۰ر صفحات
(۱۶)-مولانا عبدالرحمٰن بستوی ۵ر صفحات
(۱۷)-مولانا محمد قاسم عبدالواحد شہید القادری ۸ر صفحات
(۱۸)-مولانا قاضی عبدالرحیم بستوی ۱ر صفحہ
(۱۹)-جناب سہیل احمد قادری رضوی، بلرام پور ۱ر صفحہ (اِس میں بعض چیزوں کی توضیح ہے، کوئی فقہی مسئلہ یا شرعی حکم مذکور نہیں۔)

تبصرہ وخلاصہ: اول الذکر مبسوط مقالات میں زیادہ تفصیل اس سلسلہ میں ہے کہ خمر کی اقسام کیا ہیں؟ اور ان کے بارے میں ائمہ کے مذاہب اور احکام کیا ہیں؟ اس تفصیل کے تحت ہدایہ، عالم گیری، درِ مختار، ردالمحتار، فتاویٰ رضویہ وغیرہ کتب کے حوالے دیے گئے ہیں۔

اس بحث کے بعد ان مقالات میں یہ مسئلہ شروع ہوتا ہے کہ انگریزی دواؤں کا حکم کیا ہے؟ اور عصرِ حاضر میں ان کے استعمال میں کچھ تخفیف ہوسکتی ہے یا نہیں؟ جب کہ امام احمد رضا، صدر الشریعہ، مفتیِ اعظم علیہم الرحمہ نے ان کے عدم جواز کا حکم دیا تھا۔

اس نکتہ کے فیصلہ کے لیے یہ بحث آتی ہے کہ کیا اب حالات پہلے سے مختلف ہو چکے ہیں؟ اگر مختلف ہوگئے ہیں تو کیا اس حد تک کہ حکم میں تخفیف کے مقتضی ہوں؟

اختلافِ حال سے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ امام احمد رضا قدس سرہ کے زمانے میں طبِ یونانی کے ماہر مسلمان اطبا موجود تھے، جو اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ دواؤں میں کوئی ممنوع چیز شامل نہ ہو، مگر اب ایسے اطبا تقریباً نایاب ہیں اور اختلافِ زمان سے حکم میں تبدیلی ہوتی ہے، اس سلسلے میں کتبِ فقہ سے کچھ جزئیات اور نظائر بھی پیش کیے گئے ہیں۔

دوسرے امر سے متعلق یہ بتاتے ہیں کہ اختلافِ حال اور یونانی اطبا و پاک ادویہ کی نایابی کے نتیجہ میں اب

انگریزی دواؤں کا استعمال عام ہو چکا ہے اور عوام و خواص سب اس میں مبتلا ہیں، اس لیے حکم میں تخفیف ہونی چاہیے، اس کی دلیل میں بطور خاص سبھی مبسوط مقالات میں فتاویٰ رضویہ کا یہ سوال وجواب پیش کیا گیا ہے:

سوال یہ تھا کہ ”مصری ایک سرخ رنگ کے کاغذ میں جس کی نسبت یہ قوی گمان ہے کہ پُڑیا کے رنگ میں رنگا گیا ہو، بندھی تھی، اس کی سرخی فی الجملہ مصری میں آگئی تو وہ مصری کھائی جائے یا نہیں، اور نہ کھائیں تو پھینک دیں یا کیا کریں؟

جواب یہ ہے کہ:

” ”پُڑیا کی نجاست پر فتویٰ دیے جانے میں فقیر کو کلام کثیر ہے۔ ملخص اس کا یہ ہے کہ...

(الف) پڑیا میں اسپرٹ کا ملنا اگر بطریق شرعی ثابت بھی ہو...

(ب) تو اس میں شک نہیں کہ ہندیوں کو اس کی رنگت میں ابتلائے عام ہے۔ اور ”عموم بلویٰ“ نجاست متفق علیہا میں باعث تخفیف ——— حتیٰ فی موضع النصّ القطعی کما فی ترشّش البول قدر رؤس الإبر کما حققه المحقق علی الإطلاق فی فتح القدیر.“

(ج) نہ کہ محل اختلاف میں، جو زمانۂ صحابہ سے عہد مجتہدین تک برابر اختلافی چلا آیا۔

(د) نہ کہ جہاں صاحب مذہب حضرت امام اعظم و امام ابو یوسف کا اصل مذہب طہارت ہو، اور وہی امام ثالث امام محمد سے بھی ایک روایت اور اسی کو امام طحاوی وغیرہ ائمۂ ترجیح وتصحیح نے مختار و مرجح رکھا ہو۔

(ہ) نہ کہ ایسی حالت میں، جہاں اس مصلحت کو بھی دخل نہ ہو جو متاخرین اہل فتویٰ کو اصل مذہب سے عدول اور روایتِ اُخرائے امام محمد کے قبول پر باعث ہو۔

(و) نہ کہ جب مصلحت الٹی اس کے ترک، اور اصل مذہب پر افتا کی موجب ہو۔ تو ایسی جگہ بلا وجہ بلکہ برخلاف وجہ مذہب مہذب، صاحب مذہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ترک کرکے مسلمانوں کو ضیق و حرج میں ڈالنا اور عامۂ مومنین و مومنات جمیع دیار و اقطار ہندیہ کی نمازیں معاذ اللہ باطل اور انھیں آثم و مُصِر علی الکبیرہ قرار دینا روشِ فقہی سے یکسر دور پڑنا ہے۔“

فتاویٰ رضویہ یازدہم، ص: ۳۲ر۳۳ کی یہ عبارت بھی پیش کی گئی ہے:

اقول: ولسنا نعنی بهذا ان عامة المسلمین اذا ابتلوا بحرام حل بل الامران عموم البلوٰی من موجبات التخفیف شرعا و ماضاق امر الا اتسع فاذا وقع ذلك فی مسئلة مختلف فیها ترجح جانب الیسر صونا للمسلمین عن العسر ولا یخفی علی خادم الفقة ان هذا کما هو جار فی باب الطهارة والنجاسة کذلك فی باب الاباحة والحرمة. الخ

متوسط مقالات اور مختصر فتاویٰ میں اقسام و احکام کی تفصیل سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے موجودہ حالات میں

تخفیف سے متعل خاص طور سے گفتگو کی گئی ہے اور یہ بھی اس امر پر متفق ہیں کہ جواز کا حکم ہونا چاہیے مگر علامہ عبدالحکیم شرف قادری مد ظلہ ایک اہم نقطے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مذہبِ شیخین کو بنائے جواز بنانا فتنہ کا باعث ہوگا، اس کے بجائے تداوی بالحرام سے متعلق مذہب صاحبین کو بنیاد بنانا چاہیے۔

مولانا بدرِ عالم مصباحی استاذ اشرفیہ اور مولانا انور علی مصباحی کے مقالوں میں اس طرف بھی توجہ کی گئی ہے، اور وہ تداوی بالحرام کے مسئلہ کو بھی انگریزی دواؤں کے جواز کی تائید کے طور پر لاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں رد المحتار کی متعدد عبارتیں پیش کرتے ہیں۔ رد المحتار میں خانیہ، نہایہ، تہذیب، ذخیرہ، تجنیس لصاحب الہدایہ وغیرہ کی عبارتیں لکھی گئی ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ تداوی بالحرام بھی ناجائز ہے، اور ظاہر مذہب ممانعت ہی کا ہے، لیکن ایک قول میں رخصت ہے، جس کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ دوسری کوئی جائز دوا ایسی دستیاب نہ ہو جو اس ممنوع دوا کا کام کر سکے، دوسرے یہ کہ مسلمان ماہر طبیب بتائے کہ اس ممنوع دوا سے شفا ہو جائے گی۔ ان عبارتوں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجازت بھی شفا یقینی ہونے ہی کی صورت میں ہے۔

مولانا انور علی نظامی یہاں ایک سوال و جواب بھی رقم کرتے ہیں، جو ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

امام اہلِ سنت کا یہ قول کہ: "نہ مجرد قولِ اطبا کہ ہرگز موجبِ یقین نہیں" خاص اور متعین دوا سے متعلق ہے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں: "بارہا اطبا نسخے تجویز کرتے ہیں اور ان کے موافق آنے پر اعتمادِ کلی کرتے ہیں، پھر ہزار دفعہ کا تجربہ ہے کہ ہرگز ٹھیک نہیں اترتے، الخ" (فتاویٰ رضویہ ۲/۱۳۴) مگر عام دوا یا جنسِ دوا کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ موجبِ یقین نہیں، کیوں کہ مطلقاً انگریزی دوائیں مثلاً عام امراض کے لیے نفع بخش ہیں اور ان کے علاوہ دوسری دوائیں یا تو دستیاب نہیں یا سہل الحصول نہیں، اس لیے مذکورہ دواؤں کا استعمال جائز ہونا چاہیے۔

الحاصل ان مقالات میں اہم اور بنیادی عنصر یہ ہے کہ انگریزی دواؤں میں اب نہ صرف ہندوستان اور نہ صرف عوام بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ تمام ممالک کے مسلم عوام و خواص سبھی اس میں مبتلا ہو چکے ہیں اور دوسری دواؤں کا ملنا بہت دشوار ہے، اسی طرح ماہر مسلم یونانی اطبا کا ملنا بھی نہایت مشکل ہے، اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ دوا و علاج میں ان کا استعمال جائز ہونا چاہیے۔

مخلوط چیزوں سے مخلوط رنگوں کے متعلق بھی ابتلائے عام کی وجہ سے جواز ہی کا فیصلہ ان مقالات میں نظر آتا ہے، بلکہ رنگوں میں دواؤں سے زیادہ شدید ضرورت بیان کی گئی ہے۔

انگریزی دواؤں کے عدم جواز کا رجحان رکھنے والے مقالات میں مولانا شمس الہدیٰ بستوی استاذ اشرفیہ کا مقالہ زیادہ مبسوط ہے، مگر اس کا زیادہ تر حصہ مُسکرات کی حرمت، اس کی مضرت و شناعت، اس سے متعلق احادیثِ کریمہ،

مذہبِ ائمہ اور کچھ حکایات کے بیان پر مشتمل ہے، بہرحال سوال نامہ سے جو رجحان ملتا تھا یہ اس سے مخالف سمت میں ایک کوشش ہے، زیادہ تر فتح الباری للامام ابن حجر الشافعی، المغنی لابن قدامۃ الحنبلی، احکام القرآن للقرطبی المالکی سے مدد لی گئی ہے اور فتاویٰ رضویہ سے وہ عبارتیں نقل کی گئی ہیں جو مذہبِ مفتیٰ بہ سے تعلق رکھتی ہیں، اور اس کی مکمل تائید کرتے ہیں، مگر یہ بھی آخر میں ممنوع اشیا سے مرکب، انگریزی دواؤں سے متعلق دو شرطوں کے ساتھ جواز و اباحت کی بات لکھتے ہیں: (۱) دوسری دواؤں سے کام نہ بنے (۲) طبیبِ حاذق کا مشورہ ہو، ورنہ عدم جواز ہے۔ اس استثنا کا حاصل تداوی کا مشروط جواز ہے جس کی قدرے تفصیل مولانا بدرِ عالم کے مقالہ کی تلخیص میں ذکر ہوئی اور مزید آگے آ رہی ہے۔

ممنوعات سے مخلوط رنگوں سے متعلق ابتلائے عام کی وجہ سے یہ بھی جواز کی تصریح کرتے ہیں۔

عدم جواز کے رجحان پر مشتمل دوسرا مبسوط مقالہ مولانا عزیز احسن رضوی کا ہے، اس میں سوال نامہ کا تجزیہ کرتے ہوئے ممنوع مشروبات کے اقسام و احکام بتانے کے بعد "الکحل" بنانے کے طریقوں پر گفتگو کرتے ہوئے بلحاظِ حکم اس کی بھی دو قسمیں متعین کی گئی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ کیسے یہ حتمی فیصلہ کیا جائے کہ اس دوا میں یہ قسم ہے اور اُس دوا میں وہ قسم ہے، جب تک بیّن ثبوت نہ ملے۔ یہ صرف ایک قیاس ہے تو سستی مہنگی دونوں دواؤں میں ہر قسم کی شراب کا خلط لیکن امور اجتماع حلال و حرام کی صورت میں تغلیبِ حرام کے قاعدے کے تحت اسے قسم اول سے شمار کرنا مناسب، اگر قسم سوم میں شمار ہو تو بھی تو مذہبِ مفتیٰ بہ پر مطلقاً حرام و ناجائز۔

ان دواؤں کی حرمت متعین کرنے کے بعد اس پہلو پر گفتگو ہوتی ہے کہ حرام کے ذریعہ علاج کا کیا حکم ہے، اس سے قبل شروع ہی میں علاج کی شرعی حیثیت متعین کی ہے اور یہ بحث فرمائی ہے کہ علاج کرنا فرض ہے یا واجب، یا اس سے کم اور یہ ضرورت یا حاجت کے مرتبے میں ہے یا اس سے فروتر۔

درج ذیل عبارت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص علاج نہ کرے تو گنہ گار نہیں۔

(۱)-مرض أو رمد فلم يعالج حتىٰ مات لا يأثم كذا فى الملتقط.[1]

(۲)-الرجل إذا استطلق بطنه أو رمدت عيناه فلم يعالج حتى اضعفه ذلك و أضناه ومات منه لا اثم عليه.[2]

(۳)-ولو ان رجلا ظهر به داء فقال له الطبيب عليك الدم ، فاخرجه فلم يفعل حتى مات لا يكون اٰثما ، لانه لم يتيقن ان شفاءه فيه.[3]

---

(۱) عالمگیری، ۵/ ۲۵۵.

(۲) ایضاً، عالم گیری.

(۳) فتاویٰ قاضی خاں بر هامش هنديه، ۳/ ۴۰۳.

(٤)-امتنع عن الاكل حتى مات جوعاً اثم و إن عن التداوي حتىٰ تلف مرضاً، لا لان عدم الهلاك بالاكل مقطوع، والشفاء بالمعالجة مظنون.[1]

(٥)-الاشتغال بالتداوي لا باس به الخ.[2]

موخر الذکر عبارت سے یہ استناد کیا ہے کہ علاج سنتِ غیر مؤکدہ بھی نہیں، کیوں کہ "لا بأس" کا استعمال اکثر خلافِ اولیٰ پر ہوتا ہے اور کبھی مندوب و مستحب پر جیسا کہ فتح القدیر اور رد المحتار میں ہے۔

(٦)-قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم لكل داء دواء فإذا أصيب دواء الداء برء باذن الله تعالىٰ.[3] ان في هذا الحديث اشارة إلىٰ استحباب الدواء وهو مذهب اصحابنا وجمهور السلف و عامة الخلف.[4]

اس عبارت کے تحت اس پر جزم کیا ہے کہ علاج صرف مستحب ہے، ان عبارتوں کو میں نے اس لیے نقل کردیا کہ علاج کو عموماً "ضرورت" سے کم درجہ میں شمار نہیں کیا جاتا، جب کہ فقہاے اسلام نے اس کی شرعی حیثیت بس "منفعت" کے درجہ میں رکھی ہے، یہاں ایک اور بہت مفید عبارت جد الممتار ثانی میں ہے، جو میں اپنی طرف سے نقل کردوں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس کا تعلق رد المحتار ۲/۶۷۰، باب النفقہ کی ایک عبارت سے ہے، جس میں نادار بچے کا نفقہ مع اپنی تمام اقسام کے واجب ہونے کے تحت علامہ شامی نے فرمایا ہے: علاج باپ پر واجب ہے یا نہیں ؟ اس کا تذکرہ کہیں نہ ملا، صرف زوجہ سے متعلق علما نے ذکر کیا ہے کہ وہ شوہر پر واجب نہیں۔

اس کے تحت امام احمد رضا قدس سرہ نے یہ اظہار فرمایا ہے کہ جو علاج قطعی ہو اس کا انتظام باپ پر واجب ہے، اور اس کا صَرفہ بھی اسی کے سر ہے، اگر بچے کے پاس مال نہ ہو اور اس کے علاوہ علاج جو غیر قطعی اور ظنی قسم کا ہو واجب نہیں، کیوں کہ یہ اس پر خود اپنے لیے واجب نہیں، تو اس کے عیال کا اس پر کیسے واجب ہوگا، حدیث میں ہے: "ابتدا اپنی ذات سے کرو، پھر ان سے جو تمھاری کفالت میں ہوں۔" اس کے کچھ آگے یہ عبارت ہے جو ہندیہ میں فصولِ عمادیہ سے منقول ہے۔

ضرر کو دور کرنے والے اسباب تین قسم کے ہیں ① قطعی، یقینی، جیسے پانی، روٹی ② ظنی: جیسے فصد اور پچھنا لگوانا، یوں ہی مسہل اور سارے ابوابِ طب۔ ③ موہوم: جیسے داغنا اور جھاڑ پھونک۔

(١) فتاویٰ بزازیہ، ج:۳، برهامش هنديه ٦/ ٣٦٧.
(٢) عالمگیری.
(٣) مسلم شریف، ٢/ ٢٢٤
(٤) شرح نووي

جو قطعی ہے اسے ترک کرنا توکل میں داخل نہیں، بلکہ موت کا خطرہ ہو تو اس کا ترک حرام ہے۔ اور جو موہوم ہے اسے ترک کر دینا شرط توکل ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے متوکلین کی صفت میں بیان فرمایا۔ اور جو ظنی ہے وہ خلاف توکل بھی نہیں اور اس کا ترک بھی ممنوع نہیں، بلکہ بعض حالات میں بعض اشخاص کے لیے اس کا نہ کرنا، کرنے سے افضل ہوتا ہے۔ اھ

اس کے بعد امام احمد رضا لکھتے ہیں:

"ہاں وہ شخص جو اپنی ذات کے لیے ہلکی سے ہلکی بیماری کی وجہ سے ہر علاج و دوا کی طرف دوڑے، اور اکثر عوام ایسے ہی ہیں، وہ اگر اپنے بچے کا علاج نہ کرے اور بچہ جو تکلیف جھیل رہا ہے اس کی پروانہ کرے تو اس کی دو ہی وجہیں ہوں گی، یا تو شدتِ بخل اور بخل موت ہے، یا بچہ کے ساتھ شفقت و رحمت کا فقدان، اور یہ شفقت کسی بدبخت ہی کے قلب سے سلب ہوتی ہے، تو اسے چاہیے کہ اپنے بچے کا علاج کرے تاکہ خود اس کے نفس کا علاج ہو اور اس کی بری بیاری دور ہو، خدا ہی سے سلامتی کا سوال ہے۔" انتہیٰ

در اصل عربی عبارت کتاب میں ہے جو ابھی زیرِ طبع ہے اور مذکورۂ بالا حاصل میری درج ذیل مطبوعہ کتاب میں شامل ہے:

"امام احمد رضا کی فقہی بصیرت، جد الممتار کے آئینے میں" (ص:۱۱۰ و ۱۱۱)

اس اضافے کی وجہ سے بات طویل ہوگئی مگر بے فائدہ نہ رہی، خیر مذکورہ مقالے میں علاج کو درجۂ استحباب میں بتانے کے بعد علاج بالحرام سے متعلق بحث کی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب ایسی کسی دوا سے شفا کا ایسا یقین ہو جائے جو پیاسے کو پانی پینے اور بھوکے کو کھانا کھانے سے جان بچ جانے کے بارے میں ہوتا ہے اور دوسری دوا دستیاب نہ ہو تو اس کا استعمال جائز ہے، اس سے متعلق درج ذیل حوالے دیے گئے ہیں۔ درِ مختار برہامش رد المحتار ۳/۳۴۸، ایضاہامش ۵/۲۷۵، ہندیہ ۵/۳۵۵، خانیہ برہامش ہندیہ ۳/۴۰۳، رد المحتار ۱/۱۵۴، ۵/۲۷۵، بہارِ شریعت ۱۶/۱۲۷۔

آگے لکھتے ہیں: علم سے یقین مراد لینے پر یہ حکم تحریر ہوا، اگر علم سے مراد ظن وگمان لیا جائے جیسا کہ فقہاے کرام کے کلام میں علم سے ظن وگمان مراد لینا شائع وذائع ہے تو اس صورت میں ناجائز و حرام چیزوں کو ان کے نزدیک بطور دوا استعمال کرنا، جائز و روا ہوگا، اس کے تحت یہ عبارتیں ہیں:

①- والظاهر ان التجربة يحصل بها غلبة الظن دون اليقين، الا ان يريدوا بالعلم غلبة الظن، وهو شائع في كلامهم.[1]

(١) ردالمحتار، ٢/ ٤٣٨

(۲)- لا يخفى ان حقيقة العلم متعذرة، فالمراد اذا غلب على الظن، والا فهو بمعنى المنع.[1]

(۳)- اگر ناجائز کو دوا کے لیے استعمال کرنا جائز بھی ہو تو وہاں کہ اس کے سوا دوا نہ ملے، اور یہ امر طبیبِ حاذق مسلمان غیر فاسق کے اخبار سے معلوم ہو اور یہ دونوں امر یہاں متحقق نہیں۔"[2]

آگے لکھتے ہیں: "حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں بھی شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے ناجائز چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنا جائز و روا نہ ہوگا۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دواؤں میں ابتلاے عام کے باعث تخفیفِ حکم ہوگی یا نہیں؟ اس کے تحت یہ لکھتے ہیں کہ ابتلاے عام کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اسے لوگوں نے عام طور پر کرنا شروع کر دیا، دوسری یہ کہ لوگ اس کے کرنے پر مجبور ہوں اور نہ کرنے پر حرج و دشواری میں پڑ جائیں، دوسری ہی صورت باعثِ تخفیف اور حجت ہے. يتعذر الاحتراز عنه ووقع الحرج فى الحكم.[3] "والبلوىٰ فيما يسبق دون مايتعمد" کے تحت یہ عبارت: "فيه البلوىٰ لحصوله بغير فعله، فجاز ان يجعل معذورا بخلاف العمد.[4]

پہلی صورت کا کچھ اعتبار نہیں ورنہ محرمات کا دروازہ کھل جائے گا، اس کی نظیر میں غیبت میں ابتلاے عام کے باوجود حکم حرمت کا برقرار رہنا پیش کیا ہے۔ اسی طرح بلاضرورت شرعیہ تصویرکشی میں ابتلاے عام کے باوجود حرمت قائم رہنے کی مثال دی ہے۔

پھر دوسری صورت کا تجزیہ دو حصوں میں کرتے ہیں: (۱)- جس کے کرنے پر مجبور ہوں (۲) نہ کریں تو حرج میں پڑیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ لوگ اس پر مجبور نہیں، دوسری یونانی دوائیں اور ایسی انگریزی دوائیں فراہم ہیں جو پاک ہوں، رہی جلد یا دیر میں شفایابی کی بات تو فقہاے کرام فرماتے ہیں کہ اگر مسلم حکیم کہے کہ حرام چیز کے استعمال سے جلد شفا ملے گی تو مذہبِ معتمد یہ ہے کہ جائز نہیں۔ (عالم گیری و رد المحتار)

اب رہا یہ کہ نہ کریں تو حرج میں پڑ جائیں، اس سے متعلق لکھتے ہیں کہ حرج دو قسم کے ہیں:

(۱)- حرجِ شرعی - (۲)- حرجِ جانی۔ حرجِ شرعی موجود نہیں اس لیے کہ علاج واجب نہیں صرف مستحب ہے، نہ کرنے پر کوئی مضایقہ و گناہ نہیں، حرجِ جانی بھی نہیں کیوں کہ ایسی یونانی اور انگریزی دوائیں جو پاک ہوں، قریب قریب ہر جگہ دستیاب ہیں۔

---

(۱) رد المحتار، ۲/ ۴۳۸

(۲) فتاویٰ رضویہ، ج: ۱۰، نصف اول، ص: ۱۴

(۳) حلبی کبیر، ۱/ ۱۶۲

(۴) عنایہ، ۱/ ۳۳۱

رنگوں سے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ اگر ان میں ممنوع اشیا کی ملاوٹ شرعی طور پر ثابت ہو جائے تو بوجہ عمومِ بلویٰ حکم طہارت دیا جائے گا۔

مولانا عبد الرحمٰن بستوی اور مولانا عبد الواحد جبل پوری کے مضامین میں بھی عدم جواز کا رجحان ہے مگر زیادہ مربوط استدلال اور تمام ضروری گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے باضابطہ فقہی و عقلی گفتگو صرف مولانا عزیز احسن کے مضمون میں ہے۔

یہاں تک دونوں قسم کے مضامین کی تلخیص ہوئی، اب دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے جو امور تنقیح طلب نظر آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱)- کیا ایسی دوائیں بکثرت دستیاب ہیں جو ممنوع کی آمیزش سے ہر طرح پاک ہوں اور ان سے علاج میسر ہے؟

(۲)- بالفرض ممنوع آمیز دوا ہی کے استعمال کی نوبت آئی تو کیا لوگ اسے اس خیال سے ترک کر سکتے ہیں کہ علاج صرف مستحب ہے، ترک میں کوئی گناہ نہیں؟

(۳)- عمومِ بلویٰ کا معنیٰ کیا ہے؟ انگریزی دواؤں میں جو ابتلاے عام نظر آتا ہے، وہ باعثِ تخفیف ہے یا نہیں؟ امام احمد رضا قدس سرہ کے فتاویٰ سے کیا طے ہوتا ہے؟

(۴)- اگر اس طور پر تخفیف کی صورت نہیں تو کیا مذہبِ شیخین کو بنیاد بنانا درست ہوگا جب کہ مذہبِ امام محمد پر بعد والوں کا اجماع ہو چکا ہے جو بعدِ اختلاف متقرر ہونے کی وجہ سے اجماعِ ظنّی ہے۔

(۵)- ترکِ علاج یا دیر طلب علاج آدمی کے دینی و دنیاوی کاموں کے تعطل اور بہت سے مالی و غیر مالی نقصانات کا باعث ہوتا ہے، بعض مقامات پر ایسے نقصانات کی وجہ سے رخصت آئی ہے، مثلاً پانی قیمتِ مثل سے زائد پر ملے تو تیمم جائز ہے۔ یوں ہی زیادتیِ مرض کا خطرہ ہو تو تیمم کا جواز ہے، کیا اس طرح کے مسائل سے زیرِ بحث مسئلہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے؟

بحث کا دور آیا تو زیادہ بحث عمومِ بلویٰ کے معنیٰ کی تعیین میں ہوتی رہی، اکثر لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ جب عوام و خواص کسی امر میں مبتلا ہو جائیں تو عمومِ بلویٰ ہو گیا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عمومِ بلویٰ اس صورت میں ہوگا جب لوگ کرنے پر مجبور ہوں اور نہ کریں تو حرج میں پڑ جائیں، اس پر فریقِ اول نے کہا کہ تو پھر سب خواص و عوام کے عصیان اور فسق بالاعلان کا حکم ہونا چاہیے، یہی بحثیں کچھ دیر جاری رہیں مگر تنقیح نہ ہو سکی اور وقت ختم ہو گیا، اس لیے یہ مسئلہ فیصل بورڈ کے سپرد کر دیا گیا۔

❁❁❁❁❁❁

خلاصۂ مقالات بعنوان:

"جان ومال کا بیمہ اور ان کی شرعی حیثیت"

تلخیص نگار: حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ

اس موضوع کے تحت بیمہ اور اس کی قسموں سے متعلق سوال نامہ میں کافی معلومات فراہم کی گئی تھیں جو سبھی مقالہ نگاروں کے لیے کار آمد ثابت ہوئیں۔ مرتب سوالات حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین رضوی ہیں۔ بیمہ کے نظام کار کی تفصیل کے بعد درج ذیل سوالات پیش کیے گئے تھے:

(۱)۔ "بیمۂ اموال" اور "بیمۂ زندگی" کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی وہ قرض ہیں یا امانت یا کچھ اور؟ نیز قرض کی تقدیر پر یہ "ربا" اور بہر حال "قمار" ہیں یا نہیں؟

(۲)۔ اگر یہ بیمے ربا ہیں تو یہاں کی کمپنیوں سے (جو حکومت کی ہوں، یا خالص غیر مسلموں کی) ایسا عقد یا معاہدہ جائز ہے یا نہیں؟ اور قمار ہونے کی صورت میں کسی ایسی شرط کے ساتھ جس کے ہوتے ہوئے نفع کا حصول مظنون بظن غالب ہو، ان بیموں کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جواب اثبات میں ہو تو شرط کی بھی صراحت فرمائیں۔

(۳)۔ کیا ان عقود کو ضمان خطر طریق، ضمان درک، یا حضرت شامی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ سوکرہ کی جائز شکل سے ملحق کیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟ (ضمان وسوکرہ کے مسائل منسلک جزئیات میں مصرح ہیں)

(۴)۔ بیموں کے عدم جواز کی تقدیر پر انکم ٹیکس اور ان کے علاوہ دوسرے ٹیکسوں سے بچنے کے لیے بیمہ کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ جبکہ ٹیکسوں کے لزوم کی صورت میں جتنے مال کا استحصال متیقن یا مظنون بظن غالب ہے، اتنے یا اس سے کم مال کا ضیاع قمار کی تقدیر پر محض موہوم و متردد ہے؟

(۵)۔ بعض صورتوں میں قانونی حیثیت سے بیمہ کرانا لازمی ہوتا ہے تو ان کے بارے میں حکم شرع کیا ہوگا؟

(۶)۔ بہر حال ان عقود کے عدم جواز کی تقدیر پر:

(الف) کیا یہ جائز ہوگا کہ ان کے ذریعہ حاصل ہونے والی اضافی رقم یا بونس کو فرقہ وارانہ فسادات میں ناحق ضائع ہونے والے جان ومال کا عوض قرار دے کر وصول لیں، اور اپنے مصرف میں خرچ کریں؟

(ب) یا بہر حال (خواہ عوض مانیں یا نہ مانیں) اسے لینا اور اپنے دینی ودنیوی امور میں استعمال کرنا جائز ہوگا؟ کیوں کہ وہ مال فی الواقع مال مباح ہے جو بلا غدر وفریب وصول ہو رہا ہے۔

بیمہ سے متعلق مقالات:

درج بالا سوالات سے متعلق موصول ہونے والے مقالات وجوابات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱)۔۔۔۔ مفتی محمد نظام الدین رضوی — ۲۰ر صفحات
(۲)۔۔۔۔ مولانا شمس الہدیٰ بستوی — ۱۸ر صفحات
(۳)۔۔۔۔ مولانا آل مصطفیٰ مصباحی — ۱۶ر صفحات
(۴)۔۔۔۔ مولانا عبد الحق رضوی — ۱۰ر صفحات
(۵)۔۔۔۔ مولانا معراج القادری — ۱۰ر صفحات
(۶)۔۔۔۔ مولانا عزیر احسن رضوی — ۵ر صفحات
(۷)۔۔۔۔ علامہ عبد الحکیم شرف قادری — ۴ر صفحات
(۸)۔۔۔۔ مولانا محمد حسین خاں — ۴ر صفحات
(۹)۔۔۔۔ مولانا انور علی نظامی — ۴ر صفحات
(۱۰)۔۔۔۔ مولانا محمد نسیم فیض آبادی — ۳ر صفحات
(۱۱)۔۔۔۔ مولانا رحمت حسین کلیمی — ۳ر صفحات
(۱۲)۔۔۔۔ مولانا بدر عالم مصباحی — ۱۴ر صفحات

آرا وفتاویٰ:

(۱۳)۔۔۔۔ مولانا قاضی عبد الرحیم بستوی — ۲ر صفحات
(۱۴)۔۔۔۔ مفتی زین العابدین ٹانڈوی — ۱ر صفحہ
(۱۵)۔۔۔۔ مفتی اختر حسین رضوی دربھنگوی — ۱ر صفحہ
(۱۶)۔۔۔۔ مفتی محمد ایوب رضوی — ۱ر صفحہ

تبصرہ وخلاصہ:

بعض مختصر مقالات بھی بہت جامع اور تمام ضروری گوشوں پر حاوی ہیں، مثلاً علامہ عبد الحکیم شرف قادری اور مولانا عزیر احسن رضوی کے مقالات اسی طرح مولانا رحمت حسین کلیمی نے بھی ہر گوشے پر بحث کی کوشش کی ہے، اگرچہ ان کی بعض

باتیں تمام مقالہ نگاروں سے جداگانہ ہیں۔ مولانا شمس الہدیٰ بستوی کا مقالہ ۱۸؍ صفحات کا ہے جن میں ۶؍ صفحات سود کی
حرمت، اس کی مضرت اور اس سے متعلق آیات واحادیث اور بعض حکایات پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۷ سے صفحہ ۹ تک حربی سے سود
قمار کی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ سود وقمار نہیں اور جائز ہے۔ صفحہ ۱۰؍ و ۱۱؍ پر ربا القرض و ربا
النسیئہ کا تعارف ہے۔ صفحہ ۱۲؍ سے لائف انشورنس پر گفتگو شروع ہوتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس میں منافع سے زیادہ
مفاسد، خطرات اور نقصانات ہیں، جو نفع متوقع ہے اس کا حصول انتہائی مشکل ہوتا ہے، اور طرح طرح کے ثبوت وشواہد کی
فراہمی لازم کردی جاتی ہے جو انتہائی دشوار ہے، اس لیے اس کا جواز نہ ہوگا۔

مگر جنرل انشورنس سے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

"انشورنس کی سوسائٹی کا مزاج رضا ورغبت سے مل کر بنا ہوتا ہے، اس میں فریب کاری، دھوکا بازی سے دور کا بھی
واسطہ نہیں ہے، لہٰذا جنرل انشورنس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔"

جن صورتوں میں قانوناً بیمہ ضروری ہے، انھیں بھی "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت جائز کہتے ہیں۔

علامہ عبدالحکیم شرف قادری کے فاضلانہ، جامع اور مختصر مضمون کا حاصل یہ ہے کہ:

"(الف): بیمۂ زندگی کے علاوہ دوسرے بیموں میں کئی طرح غرر اور دھوکا پایا جاتا ہے، اس لیے وہ ناجائز ہیں، اور غرر
کی کچھ صورتیں بیمۂ زندگی میں بھی ہیں، اس لیے اس کا بھی جواز نہیں، غرر کی صورتیں یہ ہیں:

(۱)۔ کیا رقم ملے گی؟ وہ موجود ومتعین نہیں، یہ غرر فی الوجود والتعیین ہے۔

(۲)۔ خطرہ ہوا تو ملے گی ورنہ نہیں، یہ غرر فی الحصول ہے۔

(۳)۔ مقدار کیا ہوگی؟ اس کا تعلق نقصان کے حساب سے ہوگا، یہ غرر فی المقدار ہے، جب کہ بیمہ کی قسط فوری
طور پر ادا کردی جاتی ہے۔

(۴) کب رقم ملے گی؟ اس کا کوئی وقت متعین نہیں، بیمۂ زندگی میں بھی متعین نہیں، کیوں کہ موت اور حادثے کا وقت
متعین طور پر ہمیں معلوم نہیں، یہ غرر فی الاجل ہے۔

(ب) پھر یہ قمار ہے اور اس میں ربا بھی ہے، عقدِ فاسد بلا عذر کی اجازت اس شرط سے مشروط ہے کہ ہر طرح اپنا ہی نفع
ہو اور یہ ایسی کمپنیوں میں کسی طرح متوقع نہیں۔ (فتاویٰ رضویہ)

(ج) ٹیکسوں سے بچنے کے لیے ایسے ناجائز کا ارتکاب جائز نہیں، کیوں کہ ان میں حالتِ اضطرار نہیں۔ اگر قانونی
طور پر بیمہ کرانا جائز ہو تو یہ لکھ دیا جائے کہ مجھے یا میرے وارث کو اتنی ہی رقم لینی ہے جتنی جمع کی ہے، کتابوں کے حوالے آخر
میں درج فرمائے ہیں۔

مولانا عبدالحق رضوی بیمۂ جان ومال کو ربا وقمار پر مشتمل بتاتے ہیں، چوں کہ زندگی بیمہ میں جو رقم جمع ہوتی ہے اس
سے زائد کا حصول شرط وعہد کے ساتھ ہوتا ہے اور بیمۂ اموال حادثہ رونما ہونے پر موقوف رہتا ہے، حادثہ نہ ہوا تو رقم ضائع
ہوجاتی ہے، اس لیے وہ قمار ہے۔

مگر زندگی بیمہ کا معاملہ حربی سے ہو اور نفع مسلم ہی کا ہو تو اسے جائز بتاتے ہیں، اس کے بعد (۱) کفار کی قسمیں (۲) سود
کے تحقق کے لیے عصمتِ بدلین کی شرط۔ (۳) ہندوستان کا دار الاسلام اور یہاں کے کفار کا حربی ہونا (۴) پھر حربی کے ساتھ عقودِ
فاسدہ کا جواز، چار مقدمات قائم کرکے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

آخر میں واضح کرتے ہیں کہ زندگی بیمہ ایک قرض کا معاملہ ہے جس میں ربا پایا جاتا ہے، اور ایسے عقدِ فاسد کے توسط سے
حربی کا مال لیا جاسکتا ہے۔ رہا تین سال تک قسطیں جمع نہ کرنے کی صورت میں ضیاعِ رقم کا خطرہ تو اس کا دفعیہ یہ بتاتے ہیں کہ
تینوں قسطیں ایک ساتھ جمع کردی جائیں، یا اس کا جواز اس کے حق میں خاص کیا جائے جو اپنی آمدنی کے لحاظ سے ظنِ غالب رکھتا
ہو کہ میں قسطیں جمع کرلوں گا۔

بیمۂ اموال سے متعلق نقصانِ حال کا زیادہ رجحان پائے جانے کی وجہ سے عدمِ جواز کی جانب اپنا میلان ظاہر کرتے ہیں۔

مولانا آلِ مصطفیٰ، مولانا معراج القادری اور مولانا عزیز احسن رضوی سوال نامے کے پیشِ نظر بیمۂ زندگی کا امانت وکفالت
نہ ہونا تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اس طرح کہ پہلے ان کی تعریفیں کتبِ فقہ سے نقل کرتے ہیں، پھر بتاتے ہیں کہ بیمہ ان
تعریفات کے تحت نہیں آتا، مگر ایک فرق یہ ہوتا ہے کہ مولانا آلِ مصطفیٰ بیمۂ زندگی کو قرض مع ربا مانتے ہیں اور مولانا عزیز احسن و
مولانا معراج القادری اسے قرض نہیں مانتے۔ قرض نہ ہونے کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ:

①۔ بیمہ کے معاملہ میں قرض کی نیت نہیں ہوتی۔ ②۔ قرض مقررہ میعاد سے پہلے طلب کیا جاسکتا ہے۔ ③۔ قبل
میعاد مطالبہ پر واپسی لازمی ہوتی ہے۔ ④۔ قرض سوخت نہیں ہوتا اور بیمۂ زندگی ان سب کے برخلاف ہے۔

مگر اس میں ربا کی شکل ہونے پر سبھی متفق ہیں، اسی طرح اس کے قمار ہونے پر بھی متفق ہیں۔ ان مقالات میں قمار کی
تعریف وتوضیح کے بعد اس کا انطباق زندگی بیمہ کی صورت پر دکھایا گیا ہے، آخر میں حکم یہ ہے کہ حربی کے ساتھ اس کا جواز ہونا
چاہیے، بشرطے کہ نفع مسلم ہی کا ہو، اس طرح کہ قسطوں کے سوخت ہونے کا خطرہ نہ ہو، مثلاً ایسی آمدنی والا ہو کہ اسے ابتدائی
تین سال کی قسطیں جمع کرلینے کا ظن غالب ہو یا یہ قسطیں پہلے ہی جمع کردے۔

ان مقالات میں بیمۂ اموال سے متعلق گفتگو نہیں، البتہ ہندوستان کا دار الاسلام ہونا اور یہاں کے حربیوں سے بذریعہ
عقدِ فاسد مال لینے میں ربا وقمار کا تحقق نہ ہونا دلائل اور حوالوں کے ساتھ مولانا آلِ مصطفیٰ و مولانا معراج القادری کے مقالوں
میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح مفتی نظام الدین صاحب نے بھی ان باتوں کو بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے مقالہ کا

ایک خلاصہ یہاں ذکر کرتا ہوں، اسی سے مولانا عبد الحق رضوی، مولانا آلِ مصطفیٰ مصباحی، مولانا معراج القادری اور مولانا عزیز احسن رضوی کی بہت سی تفصیلات کا اندازہ ہوجائے گا، کیوں کہ اکثر باتیں مشترک ہیں، ماٰخذ اور حوالے کی کتابوں، عبارتوں اور بسط و تفصیل میں کچھ کمی بیشی اور زبان و بیان کا فرق ضرور ہے، وہ لکھتے ہیں:

①- پریمیم امانت نہیں، کیوں کہ امانت میں صرف راس المال کی واپسی ہوتی ہے، اور ضیاعِ مال پر امین تاوان نہیں دیتا۔ اور بیمہ کمپنی تاوان کی ذمہ دار ہوتی ہے اور اصل مال پر ایک طے شدہ اضافہ دیتی ہے۔

②- مضاربت بھی نہیں، کیوں کہ مضاربت میں خسارے کا تنہا ذمہ دار ربُّ المال ہوتا ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں اور راس المال مضارب کے پاس امانت ہوتا ہے، جب کہ بیمہ دار کسی خسارے کا ذمہ دار نہیں ہوتا اور ضیاعِ مال کی صورت میں تاوان کا حق دار ہوتا ہے۔

③- بیمہ میں جمع شدہ مال کی شرعی حیثیت قرض کی ہے، اس میں مثل مال کی واپسی لازم ہوتی ہے اور اس پر اضافہ کا معاہدہ کمپنی کی دنیا میں رائج ہے۔ ، رہیں وہ شرطیں جن کی بنیاد پر بیمہ قرض سے جداگانہ نظر آتا ہے (جیساکہ مولانا عزیز احسن رضوی و مولانا معراج القادری کے مضامین میں ہے) تو فتح القدیر وغیرہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ قرض شروطِ فاسدہ سے فاسد نہیں ہوتا۔ ہاں یہ صورتِ ربا کی وجہ سے عقدِ فاسد ہے۔

④- بیمہ دار کو قرض پر جو اضافہ ملتا ہے وہ ظاہری شکل میں سود ہے مگر یہاں حقیقۃً سود متحقق نہیں، اس لیے کہ سود صرف مسلم اور ذمی و مستامن ہی کے مال میں متحقق ہوتا ہے، جب کہ ہندوستان کے غیر مسلم باشندے ذمی یا مستامن نہیں اور عملی طور پر حکومت بھی ان ہی کی ہے۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ سے سوال ہوا کہ گورنمنٹ قرض کا جو منافع دیتی ہے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے جواب دیا کہ سود کی نیت سے لینا جائز نہیں۔ اگر یہ تصور کرکے لے کہ ایک جائز مال برضائے مالک بلا غدر و بد عہدی مل رہا ہے تو لینا جائز ہے مگر اہل تقوی اور دینی پیشواؤں کو ناواقفوں کی جانب سے سود خواری کی تہمت کے اندیشہ کے باعث اس سے بچنا چاہیے۔ (فتاویٰ رضویہ: ۷/۱۳۳)

⑤- ہندوستان کی حکومت اور یہاں کے غیر مسلموں سے مسلمان کا کوئی معاملہ جیسے سود نہیں ہوتا اپنی شرعی حقیقت کے لحاظ سے قمار بھی نہیں ہوتا۔ البتہ شرط جواز یہ ہے کہ نفع و غلبہ مسلمان ہی کے حق میں ہو اس طرح کہ اس کا یقین یا ظن غالب ہو۔

⑥- زندگی بیمہ کا جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ بیمہ کرانے والے کو اپنی آمدنی اور موجودہ مال و متاع کے پیش نظر ظنِ غالب ہو کہ وہ ابتدائی تین سال کی قسطیں ادا کرلے گا۔

⑦- بیمہ دار کے دیوالیہ ہونے کا احتمال نوادر سے ہے اس لیے قابل اعتبار نہیں۔ اس خصوص میں مسلم فیہ کے صوبے

یا ملک سے غائب ہونے کا احتمال بطور نظیر پیش کیا ہے جو نوادر میں سے ہونے کے باعث صحتِ سَلم پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

⑧- بیمۂ اموال سے متعلق تحریر ہے کہ اس کی صورت ایسے قمار کی ہے جس میں محرومی کا گمان غالب ہے اور یہ نادر نہیں بلکہ کثیر الوقوع ہے اس لیے اس کا جواز نہیں۔

ایک اشتباہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے اور جان و مال کے لیے تحفظ فراہم کرنے کو بیمہ کے جواز کی بنیاد بنانا درست نہیں۔ کیوں کہ ضرورت شرعیہ کے تحقق کے لیے شرط یہ ہے کہ اس ممنوع کے بغیر کام نہ بن سکتا ہو اور ممنوع کے ذریعہ کام بن جانے کا یقین یا ظنّ غالب ہو۔ فسادات پر قابو پانے کا حل بیمہ کرانا نہیں بلکہ اس کی وجہ سے فسادات بھیانک رُخ بھی اختیار کرسکتے ہیں اس طرح کہ پورا کنبہ ہی صاف کردیا جائے کہ کوئی بیمہ کی رقم وصول کرنے والا بھی نہ رہے۔ یا ایک بار رقم دے دی جائے پھر دوسری بار لوٹ لی جائے وغیر ذلک۔ ہاں زندگی بیمہ کا جواز ایک دوسری دلیل کی بنیاد پر مشروط طور پر ہے جیساکہ بیان ہوا۔

آخر میں ترتیب وار جوابات کا حاصل اس طرح ہے:

①-②- بیمہ قرض مع قمار اور شمول ربا کی وجہ سے ایک عقد فاسد ہے لیکن اس کے باوجود زندگی بیمہ جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حربی کا مال اس کی رضا سے مل رہا ہے جس میں عدم عصمت کے باعث ربا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر سود یا قمار سمجھ کرلے تو ناجائز ہے یہ اس لیے کہ اس کے نیت ارتکاب ممنوع کی ہوئی اگرچہ فی الواقع وہ امر ممنوع نہ تھا جیسے دور سے نظر آنے والی کسی شکل کو نامحرم عورت سمجھ کر دیکھتا رہا حالاں کہ فی الواقع وہ عورت کی شکل نہیں کچھ اور ہے۔

③- بیمہ کو ضمان خطر طریق و ضمان درک سے ملحق نہیں کیا جاسکتا۔

④- انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لیے بیمۂ زندگی کی اجازت بقدر ضرورت ہوگی۔

⑤- جن صورتوں میں قانوناً بیمہ ضروری ہے وہ بحکم اکراہ ہوکر مطلقاً مباح ہیں۔

⑥- جس صورت میں بیمہ کی رقم لینا جائز بتایا گیا ہے اس میں وہ رقم اپنے دینی و دنیوی مصرف میں لاسکتا ہے۔

مولانا محمد نسیم کے مضمون میں بھی بہت اختصار کے ساتھ چند حوالے پیش کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ بیمہ کی حیثیت قرض کی ہے اور نفع مشروط کی وجہ سے رِبا، اور خطرۂ ضیاع کی وجہ سے قمار بھی ہے۔ اور یہاں غیر مسلموں یا حکومت سے عقود فاسدہ کے ذریعہ بلا غدر و بد عہدی جو مال ملے اس کا لینا جائز ہے اس لیے بیمہ میں ملنے والی زائد رقم کا بھی ان سے لینا جائز ہے اور جب اپنے نفع کا ظنّ غالب ہو تو بیمہ کا معاملہ کرنا بھی جائز ہے۔

ظنّ غالب کون سا معتبر ہے اس سلسلے میں فتاوی رضویہ دوم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ظن غالب کا لفظ دو معنوں میں بولا جاتا ہے اور ملحق بہ یقین وہ ہے جس میں جانب راجح پر قلب کو اس درجہ اعتماد و ثوق ہو کہ جانب دیگر کو نظر سے بالکل ساقط

اور محض ناقابل التفات سمجھے مگر وہ جس میں جانب راجح پر اس درجہ وثوق نہ ہو اور جانب مرجوح کو محض مضمحل نہ سمجھے بلکہ ادھر بھی ذہن جائے اگرچہ بضعف وقلت تو یہ صورت ملحق بہ یقین نہیں اگرچہ کلمات علما میں کبھی اسے بھی ظن غالب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر حقیقۃً یہ محض ظن ہے ظن غالب نہیں۔

مولانا انور علی کے مختصر مضمون کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ کسی مستحکم ملازمت یا عمدہ تجارت سے وابستہ ہیں ان کے لیے تین سال والی شرط سے نقصان صرف موہوم ہے اور نفع کا ظن غالب ہے اس لیے ایسے لوگوں کے حق میں زندگی بیمہ جائز ہے۔ جو شخص معاشی اعتبار سے مستحکم نہیں وہ بیمہ پالیسی نہ لے اور اگر لینا ہی ہے تو تین سال کی قسطیں ایک ساتھ جمع کر دے یہ بھی نہ ہو سکے تو ان کمپنیوں سے بیمہ پالیسی لے جن کے یہاں یہ شرط نہیں مثلاً پیر لیس کمپنی۔

اور مولانا رحمت حسین کلیمی نے فرمایا انھوں نے بیمۂ اموال کو کفالت وضمانت بتا کر اس سے ملنے والی رقم کو جائز کہا ہے۔ ہے کہ بیمۂ اموال تھوڑا مال دے کر زیادہ مال کے لیے تحفظ فراہم کرنے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کچھ نقصان کے باوجود اس کا جواز ہونا چاہیے۔

مولانا قاضی عبد الرحیم بستوی زندگی بیمہ کو جائز بتاتے ہیں جب کہ نفع مسلم ہی کا ہو، اور جنرل انشورنس سے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی اکثر صورتیں ناجائز ہیں کیونکہ عموماً رقم ڈوب جاتی ہے اگر ملنے کی صورت بھی بنی تو پوری رقم ملتی نہیں اور رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔ اس کے لیے مکر و فریب بھی کرتے ہیں جو ناجائز ہے۔ حربی کے ساتھ بھی روا نہیں۔ غدر و بد عہدی ناجائز ہے۔

مفتی محمد ایوب رضوی فرماتے ہیں کہ بیمۂ زندگی اور بیمۂ مال بظاہر ربا میں داخل ہیں اور موجودہ وقت میں حرام نہیں ہونا چاہیے علامہ شامی کی بیان کردہ صورت سو کرہ مستامن سے متعلق ہے اور یہاں معاملہ حربی سے ہے اس لیے جواز ہوگا۔

مفتی زین العابدین صاحب بھی ہر طرح اپنا نفع ہونے کی صورت میں یہاں جواز کے قائل ہیں مفتی اختر حسین صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔

مولانا بدر عالم فیض آبادی نے بھی اپنے مقالہ میں تفصیلی گفتگو کی ہے، بہت سی باتیں بیان ہو چکیں مگر اس میں کچھ زائد باتیں بھی نظر آئیں۔ اتفاق سے ابتداءً یہ میرے ہاتھ نہ آیا اس لیے مستقلاً ذکر کر رہا ہوں غایت اختصار پھر بھی ملحوظ ہے۔

① **امانت** (یہ ودیعت سے عام ہے) اس سامان کو کہتے ہیں جو کسی طرح کسی کے قبضے میں آجائے مالک کا اس میں قصد ہو یا نہ ہو۔ ودیعت اس سامان کو کہیں گے جو قصداً کسی کی حفاظت میں دیا جائے۔ کفالت ضم الذمۃ الی الذمۃ فی المطالبۃ۔ یعنی مطالبہ ایک شخص کے ذمہ تھا دوسرے نے بھی مطالبہ اپنے ذمہ لے لیا خواہ وہ مطالبہ نفس کا ہو یا عین کا۔

مضاربت ایسا عقد ہے کہ ایک جانب سے مال ہو، دوسری جانب سے کام اور نفع میں جانبین کی شرکت۔ ان

تعریفات کے بعد بالتفصیل یہ ثابت کیا ہے کہ بیمہ پر ان میں سے کوئی بھی تعریف صادق نہیں۔ پھر لکھا ہے کہ یہ دَین کی صورت ہے کیوں کہ اس میں مثل مال کی واپسی کمپنی کے ذمہ واجب ہوتی ہے البتہ یہاں کچھ زائد دینے کا عہد ہوتا ہے اس لیے سود کی تعریف اس پر صادق آتی ہے۔ مگر حربی کا مال عقد فاسد کے ذریعہ لینا جائز ہے اس لیے جواز ہے۔ یہاں کفار کی اقسام اور ہند کا دار الاسلام ہونا اور ربا کے تحقق کی شرائط وغیرہ تفصیلاً بیان کی ہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مقالوں کے تحت ذکر ہوا مگر سود سمجھ کر لینا ناجائز ہے وجہ وہی ہے جو مفتی نظام الدین صاحب کے مقالے کے تحت نقل ہوئی۔

②- بیمۂ ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خواہ جبری ہو یا اختیاری جائز ہے۔ صورت یہ بتائی ہے کہ گورنمنٹ ایک متعینہ رقم ماہانہ وضع کرتی ہے اور ملازمت کے اختتام یا ملازم کے انتقال پر ایک خطیر رقم دیتی ہے۔ اس کی تائید میں فتاویٰ رضویہ (۱۰۰/۷) سے ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔

③- بیمۂ املاک یہ کہ کمپنی بیمہ ہولڈر کے کسی سامان وجائداد کے مستقبل میں تلف ہونے یا نقصان لاحق ہونے کی صورت میں تلافی کا ذمہ لے اور بیمہ دار قسط وار کچھ رقمیں جمع کرے نقصان ہوا تو بقدر نقصان تلافی کرے گی ورنہ جمع شدہ رقم واپس نہ ملے گی۔

اس کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ (۱) جبری (۲) اختیاری

جبری یہ کہ گورنمنٹ کی جانب سے پابندی ہو کہ اپنی گاڑیوں یا تجارتوں کا بیمہ کرائیں ورنہ گاڑیاں روڈ پر اور سامانِ تجارت بازار میں نہیں آسکتے۔

اختیاری یہ کہ موہوم خطرات ونقصانات کی تلافی کے لیے اپنی مرضی سے بیمہ کرائیں۔ پھر اختیاری کے عدم جواز پر تفصیلی بحث کی ہے کیوں کہ اس میں غرر، خطر اور قمار کی حالت ہے۔ اور نفع مسلم کا ظن غالب نہیں بلکہ نقصان کا غلبہ ظن ہے۔ پھر لازمی جبری بیمہ پر گفتگو کرتے ہوئے بوجہ مجبوری اسے جائز بتایا ہے ایسے ہی ملازمت میں جبری بیمہ کی ایک صورت بتاتے ہوئے اسے جائز اور مسلم کے حق میں ذریعۂ نفع بتایا ہے۔

بیمۂ زندگی میں تنقیح طلب امور

①- بیمۂ زندگی کون سا عقد ہے؟

②- بیمۂ زندگی عقد شرعی ہے یا عقد فاسد؟

③- تین سال متواتر جس نے بیمہ کی قسطیں جمع نہیں کیں اسے تاریخ بیمہ سے پانچ سال کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ باقی ماندہ اقساط مع سود جمع کر کے اپنا بیمہ جاری رکھے اس صورت میں:

الف: شکل قمار ہے جس میں رقم سوخت ہونے کا خطرہ ہے تو کیا جو شخص موجودہ حالات کے پیش نظر تین سال متواتر

جمع کرنے کا گمان رکھے تو اس کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کا یہ غالب ظن ملحق بہ یقین ہے یا نہیں؟

ب: جو شخص ابتدا کے بعد بند کر دے تو مدت موسعہ میں مع سود جمع کرنا رباے ممنوع ہے یا قرض بہ نیت واپسی کا جز ہے؟

ج: بیمہ سے حاصل شدہ زائد رقم ربا ہے یا مالِ مباح؟

د: اس ظنِ غالب کے ساتھ بیمہ شروع کیا کہ تین سال جمع کرے گا لیکن ایک دو سال میں ترک کر دیا تو اب تضییع مال کی وجہ سے آثم ہوگا یا نہیں؟

(۴)- حاصل شدہ زائد مال اگر مال مباح ہے تو زکوۃ کتنے مال کی ادا کرے اور کب سے؟

خلاصۂ مقالات بعنوان

مشترکہ سرمایہ کمپنی کا نظام اور اس کی شرعی حیثیت

از: حضرت علامہ محمد احمد مصباحی، رکن مجلس شرعی واستاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

ایک شخص اپنے تھوڑے سرمایہ سے کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے تو کسی وسیع پیمانے پر پہنچنے میں اسے ایک مدت درکار ہوتی ہے، یوں ہی اگر دو تین شخص مل کر تجارت کریں تو ان کو بھی اگرچہ کم سہی مگر دیر ضرور لگے گی، ساتھ ہی کاروبار بھی ان کی زندگی تک عموماً محدود رہتا ہے، کیوں کہ ایک شریک کی موت ہوئی تو پھر اس کا سرمایہ اس کے ورثہ میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سب کے سب باپ کے شریک کے ساتھ تجارت نہ کرنا چاہیں، یوں ہی ایک باپ کی تجارت تھی جو اس کے انتقال کے بعد ورثہ کی طرف منتقل ہوئی تو منقسم ہو کر کافی کمزور ہو سکتی ہے، غالباً ان دشواریوں سے بچنے اور تجارت کو دوام و استحکام بخشنے کے لیے کمپنی کی ایجاد ہوئی، جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ چند اشخاص کسی وسیع تجارت کا منصوبہ بناتے ہیں، مگر سرمایہ کم رکھتے ہیں تو کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کرتے ہیں جس کی تجارتی رقم کا ایک نشانہ مثلاً دس کروڑ منظور کرا لیا، اور کام کی ابتدا ابھی دس لاکھ سرمایے سے کرنا چاہتے ہیں، تو اپنے پاس سے اتنا سرمایہ لگاتے نہیں بلکہ اس دس لاکھ کو مثلاً سو، سو، یا دس، دس روپے کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور سارے عوام کو دعوت دیتے ہیں کہ یہ حصے خرید لیں اور انھیں ایک مقررہ نفع، یا حسب آمد نفع ملتا رہے گا۔ انھیں شرکا کہتے ہیں۔ یوں ہی کمپنی کو چلانے کے لیے ایک انتظام کار ٹیم منتخب کرتے ہیں۔ وہی سارے کاروبار کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ شرکا بدلتے رہتے ہیں۔ یوں ہی انتظامیہ میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے، مگر کمپنی کا نام باقی رہتا ہے اور سارے معاملات اسی کی جانب منسوب ہوتے ہیں اور اس کی مہر سے انجام پاتے ہیں، یہ طریقۂ تجارت دیرپا اور مستحکم سمجھا گیا، کیوں کہ اس میں تجارت کاروں اور حصہ داروں کی موت یا علیحدگی کے باوجود ان کے متبادل دوسرے افراد کے ذریعہ کام جاری رہتا ہے اور سرمایہ بھی وافر مقدار میں جمع ہو جاتا ہے اور جس کے پاس کم سرمایہ ہے وہ بھی شریک بن کر نفع پانے لگتا ہے، اس کے

لیے سودی قرضے بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہ کمپنی کی ایک سادہ سی شکل اور اس کا تعارف ہے۔

اس میں خاص طور سے یاد رکھنے کی باتیں چند ہیں:

- اس کے حصوں کی دو قسمیں بناتے ہیں: (۱) ترجیحی حصص (۲) مساواتی حصص۔

ترجیحی حصوں کے خریداروں کو ایک مقررہ نفع بہر حال ملتا رہے گا، خواہ کمپنی کا خسارہ ہو یا فائدہ، اور مساواتی حصص والوں کو تجارت میں نفع و نقصان جو بھی ہو اٹھانا ہوگا۔

- سود کا معاملہ اس میں قدم قدم پر پیش آتا ہے۔
- جو حصے قسطوں پر جمع ہوتے ہیں اگر ایک مقررہ مدت تک مکمل جمع نہ ہوئے تو سابق جمع رقم سوخت کر دی جاتی ہے اور اس کا کوئی بدل نہیں دیا جاتا۔

یہ طریقۂ تجارت اب بہت عام ہو گیا ہے، چوں کہ عموماً یہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو دین و شریعت کی قیدوں سے آزاد رہتے ہیں بلکہ کسی دین سے صحیح طور پر وابستہ ہی نہیں ہوتے، اس لیے وہ کمپنی کے لیے جو اصول و ضوابط وضع کرتے ہیں ان میں شرعی حلّت و حرمت کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہوتا۔ مادی منفعت اور اس کی جانب زیادہ سے زیادہ افراد کو مائل کر کے وسیع پیمانے پر نفع اندوزی ہی ان کا اصل مطمح نظر ہوتا ہے۔

اس کا صحیح حل تو صرف یہ ہے کہ اہل اسلام شریعت کے جواز کی حدود میں رہ کر خود کمپنی بنائیں اور چلائیں۔ علمائے کرام سرمایہ داروں کو اس کی ترغیب دیں اور ماہرین تجارت اور عالمان شریعت باہم مل کر اس کے اصول و ضوابط ترتیب دیں، اور یہ کوئی ناممکن یا بہت دشوار نہیں۔ کم از کم جن ممالک میں مسلم حکومتیں ہیں وہاں تو ایسی راہیں آسانی سے نکل سکتی ہیں، لیکن جنھوں نے مغرب کی تقلید ہی کو اپنا فیشن بنا لیا ہے اور آنکھ بند کر کے اس کے پیچھے بھاگنے کے عادی ہیں، وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہم ان بے دینوں سے بہتر کوئی طریقۂ کار اور کوئی دستور العمل وضع کر سکتے ہیں۔ انسان جب کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی فکری و عملی قوتیں یوں ہی سلب ہو جاتی ہیں اور آزاد ہو کر بھی وہ دوسروں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے رہنے کو باعث فخر و شرف سمجھتا ہے۔

مگر علمائے دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ جو بھی طرز تجارت ہے اس کا جائزہ لے کر اس کا حسن و قبح واضح کریں اور اگر کچھ اصلاح ہو سکتی ہے، تو اصلاح کریں اور جہاں تک ہو سکے عوام کو حرام سے بچائیں، اسی نظریہ کے تحت کمپنی کے حصوں کی خریداری کا مسئلہ زیر بحث آیا۔

مولانا مفتی محمد نظام الدین رضوی نے ”جدید طریقۂ تنظیم و تجارت“ نامی ایک کتاب اور کچھ دوسری کتابوں کی روشنی میں اس کے شرائط و ضوابط اور طریقۂ کار وغیرہ کی تفصیلات پر مشتمل کمپنی کا تعارف لکھا اور حتی الامکان اس سے

متعلق سبھی ضروری باتیں سمیٹنے کی کوشش کی، پھر کچھ سوالات رکھے جو سوال نامہ کے اخیر میں درج ہیں۔

جوابات

جواباً موصول ہونے والے فتاوی، آرا، اور مقالات مع قلمی صفحات حسب ذیل ہیں:

۱- حضرت مولانا قاضی عبد الرحیم بستوی — ۲ صفحات
۲- حضرت علامہ عبد الحکیم شرف قادری، لاہور — ۲ صفحات
۳- مفتی محمد ایوب رضوی جامعہ نعیمیہ، مرادآباد — چار سطریں
۴- مولانا مفتی محمد نظام الدین رضوی — ۵۸ صفحات
۵- مولانا مفتی مطیع الرحمٰن مضطرؔ، پورنوی — ۱۳ صفحات
۶- مولانا رحمت حسین کلیمی — ۲ صفحات
۷- مفتی اختر حسین رضوی — ۱ صفحہ
۸- مفتی زین العابدین صاحب — ۱ صفحہ
۹- مولانا شمس الہدیٰ بستوی
۱۰- مولانا محمد نسیم مصباحی
۱۱- مولانا آل مصطفٰی مصباحی — ۶ صفحات

تبصرہ و خلاصہ

مقالات نمبر ۴، ۵، ۱۱، کے علاوہ سبھی تحریروں میں مسئولہ شرکت کے عدم جواز کا فیصلہ یا رجحان نظر آتا ہے۔ مولانا آل مصطفٰی مصباحی اور مفتی مطیع الرحمٰن رضوی کے جوابات میں کہیں کہیں کچھ شرائط و قیود کے ساتھ جواز کی جھلک نظر آتی ہے۔ مفتی محمد نظام الدین رضوی ترجیحی حصص کو یکسر ناجائز کہتے ہیں اور مساواتی حصص کو بعض شرطوں کے ساتھ بالکل جائز بتاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھیں تینوں مقالات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے تو پوری بحث سامنے آجائے گی۔

مفتی مطیع الرحمٰن رضوی پورنوی کمپنی کے طریقۂ تجارت کو از قسم شرکت بتانے کے بعد شرکت اور اس کی اقسام کا تعارف کراتے ہیں، پھر تعیین کرتے ہیں کہ یہ شرکت کی کس قسم میں داخل ہے۔

شرکت کی دو قسمیں ہیں: (۱) شرکت ملک (۲) شرکت عقد۔

شرکتِ ملک کا مطلب یہ ہے کہ چند شخص ایک شَے کے مالک ہوں اور باہم عقد شرکت نہ ہوا ہو۔

شرکتِ عقد کا مطلب یہ ہے کہ باہم چند اشخاص نے شرکت کا معاملہ کیا ہو۔

پھر شرکت ملک کی دو قسمیں ہیں: (۱) جبری (۲) اختیاری۔

چند اشخاص کا مال ان کے قصد و اختیار سے باہم مل جائے تو اختیاری ورنہ جبری۔

شرکت عقد کی تین قسمیں ہیں: (۱) شرکت عمل (۲) شرکت وجوہ۔ (۳) شرکت مال۔

شرکتِ عمل کا مطلب یہ ہے کہ چند اشخاص دوسرے کے یہاں سے کام لائیں اور مل کر کام کریں، پھر جو اجرت ملے تقسیم کر لیں۔

شرکتِ وجوہ کا مطلب یہ ہے کہ چند اشخاص مال کے بغیر باہم یہ طے کریں کہ اپنی وجاہت اور اعتماد کی بنا پر سامان اُدھار لائیں اور مال بیچ کر دام دیں، پھر جو بچے آپس میں تقسیم کر لیں۔

شرکتِ مال کا مطلب یہ ہے کہ چند اشخاص اپنے مال لگانے کے ساتھ یہ طے کریں کہ اس سے مل کر کاروبار کیا جائے اور جو نفع ہو آپس میں تقسیم کر لیں۔

شرکت مال کی دو قسمیں ہیں: (۱) شرکت مفاوضہ (۲) شرکت عنان۔

شرکتِ مفاوضہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اشخاص جو ایک دوسرے کی کفالت کے لائق ہوں، اپنی مخصوص قسم کی پونجی برابر برابر لگا کر کاروبار میں اس طرح شرکت کریں کہ نفع و تصرف میں سبھی شریک ہوں اور ایک دوسرے کے وکیل و کفیل بھی ہوں، یعنی ہر ایک کا مطالبہ دوسرا وصول کر سکتا ہو، اور ہر ایک پر جو مطالبہ ہو دوسرا اس کی طرف سے ضامن بھی ہو۔

شرکتِ عنان کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اشخاص جو ایک دوسرے کی وکالت کے لائق ہوں، پونجی لگا کر کاروبار میں اس طرح شرکت کریں کہ ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہو، مگر ضامن نہ ہو۔

آگے پھر لکھتے ہیں کہ "مشترکہ سرمایہ کمپنی" اگر ہوگی تو شرکت عنان ہوگی، اسی پر ہمیں غور کرنا ہے۔ اس کے بعد ترجیحی حصص کی شرکت اور مساواتی حصص کی شرکت پر الگ الگ کلام کرتے ہیں:

ترجیحی حصص کے اشتراک کو تین وجہوں سے باطل و ناجائز قرار دیتے ہیں۔

(۱) یہ شرکا صرف نفع میں شریک ہوتے ہیں، نقصان میں نہیں، یہ شرکت اسلام کے منافی ہے۔

(۲) ان کے نفع کی مقدار ایک خاص شرح کے ساتھ مقرر ہوتی ہے اور مقدار نفع کی تعیین قاطعِ شرکت ہے۔

(۳) اب ان کی دی ہوئی رقم ہبہ تو ہو نہیں سکتی، عاریت یا قرض ہوگی، عاریت ہو تو اسے بعینہ باقی رکھ کر انتفاع ضروری ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہوتا، اس لیے وہ قرض ہی ہو سکتی ہے، جیسا کہ عالمگیری (ص ۳۶۳، ج ۴) اور فتح القدیر (ص ۴۰۲، ج ۵) کی عبارتوں سے ظاہر ہے۔ اور قرض پر نفع کی شرط قطعاً سود ہے۔ اس لیے کسی کمپنی کا ترجیحی حصص کے ممبران مقرر کرنا اور لوگوں کا ترجیحی حصص میں شامل ہونا قطعاً حرام ہے۔

مساواتی حصص کی شرکت بذات خود صحیح ہو سکتی ہے، اس لیے کہ اس میں نفع و نقصان دونوں میں شریک رہنے کا معاملہ ہوتا ہے۔

(۱) مگر جب کمپنی میں ترجیحی حصص کے شرکا بھی شامل ہوں گے تو جو نفع ہوگا پہلے انھیں ایک معینہ شرح کے مطابق دے دیا جائے گا اور نقصان ہو تو بھی انھیں مشروط نفع دیا جائے گا۔ نفع کی صورت میں اگر کچھ باقی رہا تو مساواتی حصص والوں کو ملے گا، ورنہ یہ محروم رہیں گے۔ اور نقصان کی صورت میں ان کے راس المال سے ترجیحی حصص والوں کو مقررہ نفع دیا جائے گا۔ اس طرح سے نفع و نقصان میں ان کی جو شرکت ٹھہری تھی وہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور سراسر نقصان ہی کی صورت رہ جاتی ہے، کیوں کہ یا تو ان کی اصل پونجی سے بھی جاتا ہے یا ان کا حقیقی نفع مارا جاتا ہے۔ اگر کچھ بچا تو ملتا ہے، ورنہ وہ بھی نہیں ملتا۔

(۲) طے شدہ تمام قسطیں اگر ایک خاص مدت کے اندر جمع نہ کر سکے تو جو سابقاً جمع کی تھیں وہ بھی ضائع ہو جائیں گی۔ اس لیے یہ معاملہ قمار اور جوا بھی ہوا، اگرچہ شرکت ان عقود میں سے ہے جو شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتے، اس لیے نفس شرکت باقی رہتی ہے۔

(۳) ترجیحی حصص کا دیا ہوا قرض بھی محفوظ رہتا ہے اور برابر نفع بھی دیا جاتا رہتا ہے جو سراسر سود ہے اور اس کے دینے والے یہی مساواتی شرکا ہیں۔ اور سود لینے کی طرح دینا بھی حرام ہے۔

(۴) اس میں جہاں مخصوص قسطیں جمع کرنے کی شرط ہوتی ہے، وہیں اپنی طرف سے سودی قرض جمع کرنے کی بھی شرط ہوتی ہے، یہ بھی حرام ہے۔ اگرچہ اس شرط فاسد کی وجہ سے عقد شرکت فاسد نہ ہو اور جائز کاروبار کے ذریعہ جو نفع حاصل ہو، اسے لینا جائز ہو۔

ہاں اگر ترجیحی شرکا نہ ہوں، مساواتی حصہ دار قرض دینے کے ساتھ صراحۃً سود لینے کی نفی کر دے اور دوسروں کو بھی سود نہ دیا جائے تو مساواتی حصص کی شرکت جائز ہو سکتی ہے۔ یہ امور یہاں مفقود ہیں، اس لیے ناجائز ہی ہے۔

اس مقام پر یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ قرض کمپنی کے عام ممبران نہیں لیتے بلکہ اس کے کارندے لیتے ہیں۔ اور شرکت عنان میں کوئی شریک قرض لے تو ایک قول کے مطابق یہ قرض دوسرے شرکا کی طرف راجع نہیں ہوگا، لہٰذا عام شرکا سودی قرض لینے کے وبال سے بری الذمہ ہوں گے۔

اس کے جواب میں یہ بتاتے ہیں کہ مذکورہ ضابطہ کے ساتھ حکم یہ بھی ہے کہ اگر قرض لینے والا سب کی جانب سے قرض لے، اور مجھے قرض دیجیے کے بجائے ہم سب کو قرض دیجیے، بولے تو یہ قرض سب پر عائد ہوگا۔ اور یہاں جو قرض لیا جاتا ہے وہ کمپنی ہی کے لیے لیا جاتا ہے، کارندے صرف پیغام رسانی اور سفارت کا کام انجام دیتے ہیں،

اس لیے وہ سب پر عائد ہوگا اور تمام شرکا اس کے وبال میں شریک ہوں گے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب ابتداءً ہی مساواتی حصص کی شرکت ناجائز ہے تو کمپنی کے مالکِ اسباب تجارت ہوجانے کے بعد بھی اس کے اسباب کو خرید کر اس میں شرکت ناجائز ہے۔

• قرض تمسکات حاصل کرکے حصص میں بدلنے سے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی حقیقت سوال نامے میں منقول "جدید طریقۂ تجارت" کی عبارتوں سے پورے طور پر منکشف نہیں ہوتی، اس لیے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے جب مساواتی حصص ہی میں شریک ہونا، ناجائز ہے تو قابل تبدیل قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کردینے سے بھی شرکت ناجائز ہی رہے گی۔

• کمپنی کے معہود طریقے پر ایجنٹ مقرر کرنا اور اس پر کمیشن دینا، اگر کسی جائز کام کے لیے ہوتا تو بھی متعدد وجوہ کی بنا پر ناجائز ہوتا، جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ جس کام کے لیے اجارہ ہورہا ہے اس کا وقت معلوم نہیں۔ اور ایسا اجارہ ناجائز ہے۔ (خانیہ ص۳۳۶، ج۲) اور یہاں تو وہ کام ہی ناجائز ہے۔

• جب یہ واضح ہوگیا کہ "مشترک سرمایہ کمپنی" کا کاروبار ناجائز ہے تو اس کے قیام کی منصوبہ سازی، اس کا رجسٹریشن یا اس کی ایسی ملازمت جس میں ناجائز کام کرنا پڑے، سبھی ممنوع ہوں گے۔ کیوں کہ گناہ پر اعانت حرام ہے۔

• کمپنی میں حصص کے نام پر جو رقم جمع کی جاتی ہے، وہ قرض ہوتی ہے اور قرض پر نفع لینا سود ہے، اس لیے منافع پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی، ہاں! جمع کی ہوئی اصلِ رقم شرکا جب چاہیں، وصول کر سکتے ہیں، تو یہ قرض "دین قوی" ہے۔ اب اگر یہ دین خود یا دوسرے مال سے مل کر مقدار نصاب ہو تو اس پر زکاۃ سال بہ سال واجب ہوتی رہے گی، مگر ابھی واجب الادا نہیں۔ واجب الادا اس وقت ہوگی جب مقدار نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہو جائے، مگر جو پانچواں حصہ وصول ہوجائے اسی کی زکاۃ واجب الادا ہوگی۔

مولانا آل مصطفیٰ مصباحی نے اسے "بظاہر" شرکت عقد کی قسم شرکت عنان کی طرح بتانے کے بعد یہ لکھا ہے کہ اس کے مساواتی حصص میں شرکت سے متعدد حرام کا ارتکاب کرنا ہوگا۔

(۱) مساواتی حصص میں شرکت کے لیے سودی قرض دینا لازمی شرط ہے۔

(۲) کمپنی کے حصہ داران مقررہ یا موسّعہ مدت تک قسطوں کی مکمل ادائیگی نہیں کرتے تو جمع شدہ قسطیں ضبط ہوجاتی ہیں۔

(۳) کمپنی کے کاروبار میں خالص سودی قرض بھی لگایا جاتا ہے۔ لہٰذا اپنی رقم کے ذریعہ اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا اعانت علی الاثم کی وجہ سے حرام ہوگا۔

ہاں اگر مشترکہ کمپنی خالص حربیوں کی ہو تو اس کے ترجیحی حصص میں وہ لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو ان قسطوں کی مقررہ وقت پر ادائیگی کا یقین یا ظن غالب رکھتے ہوں، کیوں کہ حربیوں کا مال ان کی رضا سے بلا غدر و بد عہدی لینا جائز و درست ہے۔ خواہ عقود فاسدہ ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ البتہ ایسی کمپنیوں کے مساواتی حصص میں شرکت روا نہ ہوگی، کیوں کہ اس میں مسلم کو نفع ملنا محض محتمل ہے۔

مفتی محمد نظام الدین رضوی کا مقالہ بہت بسط و تفصیل کا حامل ہے، اس میں انھوں نے جو موقف اختیار کیا ہے، اس پر دس شبہات وارد کرکے ان کا تفصیلی جواب بھی دیا ہے۔ یقیناً یہ کافی غور و خوض اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے جس کے باعث ان کے موقف سے اختلاف رکھنے والے بھی انھیں تبریک و تحسین پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں یہاں اس کی مناسب تلخیص کی کوشش کروں گا جو اس کے تمام ضروری گوشوں کو محیط ہو۔

ابتداءً انھوں نے کمپنی کی شرعی حیثیت متعین کی ہے جو ان کے بقول حصہ داروں کی وکیل عام ہوتی ہے اور اصل مالک حصہ داران ہوتے ہیں، مگر اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ کوئی غیر عاقل شَے وکیل کیسے ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہاں اس کی وکالت پر اقتصار نہیں بلکہ اس کی نیابت کے لیے "منتخب وُکلا" مقرر ہوتے ہیں۔ مگر جو حصہ داران موت یا جنونِ مطبق کے شکار ہوں ان کے حق میں کمپنی کی وکالت ختم ہوجاتی ہے۔ اور اگر موکل کی موت کے بعد اس کے ورثہ اس کے حصص اپنے نام منتقل کرالیں، یوں ہی جنونِ مطبق کی صورت میں اس کا ولی مال تجارت پر راضی ہو تو یہ توکیل جدید ہوگی، اس طرح کمپنی کی زندگی باقی رہتی ہے، اگرچہ اس کے بعض حصہ داران باقی نہ رہیں۔

اس کے بعد کمپنی کے حصص کی شرعی حیثیت سے بحث ہے۔ بتاتے ہیں کہ حصص حاصل کرنے کے چار طریقے ہیں:

(۱) اجرائے حصص کے وقت براہ راست کمپنی سے حصے خرید کر۔

(۲) جن کے لیے کمپنی سے حصص نامزد ہوچکے، ان سے خرید کر۔

(۳) کمپنی کے کسی حصہ دار کے مجنون ہونے یا مرجانے پر اس کے اولیا یا ورثہ کے نام انتقال حصص کے ذریعہ۔

(۴) قابل تبدیل قرض تمسکات کو اجرا کی شرط کے مطابق حصص میں تبدیل کراکر۔

طریق اول میں حصے خریدنے کا لفظ محض مجازی ہے، ابتدا میں کمپنی یا اس کے متعلقین کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا جسے خریدا جائے، دراصل حصے خریدنے کا مطلب رقم لگاکر شریک تجارت بننا ہے۔ اور یہ معاملہ فقہی اصطلاح کی رو سے عقدِ شرکت ہے۔ رہے حصص سرٹیفکٹ تو ان کی خریداری نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے معنی کے لحاظ سے حقیقۃً صرف سند اور ثبوت ہی کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر سندیں مبیع ہوتیں تو رقم کمپنی کی ملک ہو جاتی اور حصہ دار صرف ان اسناد کے مالک

ہوتے، جب کہ کمپنی آئین کی تصریحات کے مطابق رقوم کے مالک حصہ داران ہی ہوتے ہیں، ہاں! جب کوئی رقم لگاکر شریک بن گیا، پھر اس نے اپنا حصہ بیچا اور کسی نے خریدا تو یہ واقعۃً خرید و فروخت ہے اور یہ معاملہ یہاں جائز بھی ہے۔
یہی وہ دوسرا طریقہ ہے جو اوپر ذکر ہوا۔

تیسرا طریقہ دراصل توریث یا تولیت ہے، اس میں کسی حصہ دار کی موت کے بعد اس کے ورثہ قانونی کارروائی کے بعد اس کی جگہ نامزد ہو جاتے ہیں اور کسی کے مجنون ہونے کے بعد یہی عمل اس کے ولی کے لیے ہوتا ہے۔

کمپنی کو کسی نے سودی یا غیر سودی قرض دیا تو کمپنی کی جانب سے اس کو ایک رسید دے دی جاتی ہے، اسی کا نام قرض تمسک ہے۔ یہ ایک مدت تک قرض تمسک کی صورت میں رہتا ہے، اس کے بعد جزوی یا کلی طور پر حصص میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، یعنی قرض دینے والے کو کمپنی کا شریک اور اس کی رقم کو کمپنی کا اصطلاحی حصہ بنا لیا جاتا ہے، جس کے پاس یہ سند قرض ہو، وہ اسے دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔ اب یہ دوسرا شخص قرض خواہ ہو جائے گا اور سند قرض کو حصہ میں تبدیل کرنے کے بعد وہ شریک ٹھہرے گا۔ یہی وہ چوتھا طریقہ ہے جو اوپر ذکر ہوا اور تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان چاروں طریقوں سے عقد شرکت کا تحقق ہوتا ہے اور سب کا مقصود وہی ہے۔

اس کے بعد شرکت کی تعریف اور اس کے اقسام و احکام ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتے ہیں کہ یہ شرکت، شرکتِ عنان ہے۔ ان باتوں کا تذکرہ اجمالاً مفتی مطیع الرحمن رضوی کے مقالہ کی تلخیص میں آچکا ہے۔

اس کے بعد ترجیحی حصص اور مساواتی حصص کا ذکر کرتے ہیں اور ترجیحی حصص کے ذریعہ شرکت کو سرمایہ کاری کے بجائے غصب کاری اور لوٹ کھسوٹ قرار دیتے ہوئے ناجائز و حرام بتاتے ہیں، مگر مساواتی حصص کے ذریعہ معاہدۂ شرکت کو جائز و درست، اور ان کی تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کو حلال و طیب کہتے ہیں۔ لیکن اس موقف کے گرد دس اشکالات ذکر کرتے ہیں، پھر ان کا حل بھی رقم فرماتے ہیں۔

پہلا اشکال: یہ ہے کہ حصوں کی خریداری کے ساتھ سودی قرض دینا بھی ضروری ہوتا ہے، اس طرح یہ شرکت سود لینے کی آلودگی سے مشروط ہوتی ہے۔

اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ حصہ دار قرض دیتے وقت صاف صاف یہ کہہ دے کہ میں قرض کی رقم پر کوئی سود نہ لوں گا۔ اس کا قطعی ارادہ بھی یہی ہو۔ بعد میں بھی سود نہ لے دے۔ ان شرطوں کی پابندی کے ساتھ اس کی شرکت اُس آلودگی سے بچ جائے گی۔

دوسرا اشکال: بطریق بالا حصہ دار خود اپنی رقوم کا سود لینے کی آلودگی سے بچ سکتا ہے، مگر کمپنی دوسرے تمام شرکا سے بھی سودی قرض لے کر تجارت میں شامل کرتی ہے، اس سود کی ناپاکی سے حصہ دار کیسے بچ سکتا ہے، جب کہ کمپنی یا ہدایت

کاروں کا عمل حصہ داروں ہی کا عمل ہے، اس لیے کہ حصہ دار مؤکل ہوتے ہیں اور وہ وکیل ہوتے ہیں۔ تو جو سودی قرض لیا جائے گا وہ سب پر عائد ہوگا۔

اس کا **دو حل** پیش کرتے ہیں، **ایک** یہ کہ مذکورہ حرمت صرف فعل تک محدود ہے، تجارت اور اس کے نفع میں اس کا کوئی اثر نہیں، یعنی شریک بنا حرام و گناہ ہوگا، مگر کمائی حلال ہوگی۔ اس کی تشریح یہ کرتے ہیں کہ حرام کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) وہ جو اپنی ذات میں قبیح ہو۔

(۲) وہ جو اپنی ذات میں اچھا ہو، مگر کسی وصف لازم غیر منفک کی وجہ سے برا ہو۔

(۳) وہ جو بذات خود اچھا ہو، مگر کسی وصف عارض قابل انفکاک کی وجہ سے برا ہو، جیسے بیع بذات خود جائز ہے، مگر وہ بیع جو جمعہ کی حاضری کے وقت کی جائے ممنوع ہے، جب کہ اس کے سبب حاضری میں رکاوٹ اور خلل ہو۔ کمپنی میں سرمایہ کاری کا تعلق تیسری قسم سے ہے، کیوں کہ حصص اور قرض کے ذریعہ حاصل کیا ہوا مال جائز و حلال ہے۔ اس سے ہونے والی تجارت بھی درست ہے۔ رہی سود کی شرط تو وہ مقارنِ عقد نہیں، قبل عقد ہے اور مفسد عقد صرف وہی شرط ہوتی ہے جو مقارن عقد ہو، البتہ خود سود کا لینا دینا حرام لِعَینِہٖ ہے اور یہ مال، مال خبیث ہے۔ یوں ہی ترجیحی حصص میں طے شدہ نفع لینا دینا بھی حرام ہے اور یہ مال بھی مالِ خبیث ہے۔

دوسرا حل یہ ہے کہ:

(۱) قرض لینے کے لیے کسی کو وکیل بنانا (بر قول صحیح و مختار) باطل ہے۔

(۲) وکیل نے اگر قرض لیا تو اس کا مالک خود وہی ہوگا۔

(۳) اگر یہ مالِ قرض وکیل کے پاس سے ضائع ہو گیا تو اس کا ضامن بھی خود وکیل ہی ہوگا۔

اس قول کے پیش نظر ہدایت کاروں نے جو سودی قرض لیا وہ ان ہی کی جانب عائد ہوا۔ دوسرے شرکا اس سے بری ہیں۔

تیسرا اشکال: یہ ہے کہ کمپنی کے حصوں میں مساواتی حصص کے ساتھ ترجیحی حصص بھی شامل ہوتے ہیں جو ناجائز ہیں تو ان کے انضمام کے ساتھ مساواتی حصص کے ذریعہ بھی سرمایہ کاری ناجائز ہوگی۔

اس کا حل یہ ہے کہ ترجیحی حصص کے ساتھ شرکت، شرکت نہیں، نہ ترجیحی حصص کی رقم سرمایۂ شرکت ہے۔ وہ صرف ایک قرض ہے جس پر سود دینے کی شرط لگی ہوئی ہے، اس لیے سودی قرضے ملانے کی صورت میں جو حل پیش ہوا وہی حل ان ترجیحی حصص کی رقوم ملانے کا بھی ہے۔

چوتھا اشکال: کمپنی کا سودی قرض ادا نہ ہوا تو اس کی ادائیگی کا ذمہ حصہ داروں پر عائد ہوتا ہے، اس لیے کمپنی میں

شرکت سودی قرض اداکرنے کی ذمہ داری اٹھانے کے مترادف ہے، اس لیے یہ شرکت ناجائز ہوگی۔

جواب یہ دیتے ہیں کہ حصہ داروں پر کمپنی ادائے قرض کے لیے صرف یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ابھی جتنے حصے جمع نہیں کیے ہیں، وہ جمع کر دیں تاکہ کمپنی قرض چکا سکے، توحقیقتہً یہ اپنے حصوں کی ادائگی ہوئی، سودی قرض کی ادائگی نہ ہوئی، کمپنی کا آئین اسے جس لفظ سے بھی تعبیر کرے، معاملہ اپنی حقیقت کے تابع ہوتا ہے اور حصہ دار کی نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی بقیہ قسطیں اداکررہاہے، اس کا اس سے مطالبہ بھی ہوتا ہے۔

پانچواں اشکال: یہاں اپنی رقم کوداؤ پر لگاکر ایک طرح کا جوا بھی کھیلنا پڑتا ہے، اس لیے کہ حصہ دار نے اگر مقررہ وقت پر اپنی قسطیں جمع نہ کیں، تواسے ایک مہلت دی جاتی ہے جس کے اندر اسے بقیہ قسطیں مع سود جمع کرنی پڑتی ہیں اور اگر اس مدت مہلت میں بھی جمع نہ کیں توسابقہ جمع شدہ قسطیں بحق کمپنی ضبط کرکے حصہ دار کو خارج کر دیا جاتا ہے، اس طرح یہ شرکت سود اور قمار دونوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ آدمی اپنی پونجی کا خیال کرکے اتنے ہی حصوں کا معاملہ کرے جن کو وہ بآسانی جمع کر لے۔ دوسری صورت یہ کہ اپنی تمام قسطیں یک مشت جمع کر دے، تاکہ آئندہ کا کوئی خطرہ ہی نہ رہے، یک مشت جمع کرنے کی اسے اجازت بھی ہوتی ہے اور مہلت کی مدت میں وہ بنام سود جو زائد رقم دیتا ہے، دراصل وہ سود نہیں بلکہ یہ ابتداءً مثلاً دس روپے کی جگہ بارہ روپے دے کر شریک بنانا یا حصص کا گراں قدر پر اجراہے جو جائز ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ الحاصل یک بارگی جمع کرنے والا سود اور قمار سے بالکل بری ہے، اسی طرح مقررہ وقت کے اندر جمع کرنے والا بھی سلامت ہے، اور مدت مہلت میں جمع کرنے والا بھی حقیقت امر کے لحاظ سے سود دینے والا نہیں۔

چھٹا اشکال: شرکت صحیحہ شرعیہ میں شریک کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جب چاہے اپنا مال واپس لے کر شرکت ختم کر دے لیکن کمپنی کا آئین یہ ہے کہ شریک اپنا مال واپس نہیں لے سکتا، تو یہ شرط لگا کر ایک عاقل، بااختیار انسان کو حجر کے تینوں اسباب میں سے کسی ایک کے بغیر مجبور کرنا ہوا۔

جواب یہ ہے کہ آدمی کو اختیار ہے کہ کمپنی میں شرکت کرے یا نہ کرے، اور کمپنی نے اپنے شرائط و ضوابط سے اسے آگاہ کر دیا ہے، جن کو جان بوجھ کر وہ معاہدۂ شرکت کرتا ہے، جس کا معنی یہ ہوا کہ وہ خود ہی یہ پابندی قبول کرتا ہے، اس لیے کمپنی کی طرف سے حجر نہ ہوا۔

دوسرے یہ کہ یہاں بھی مال واپس لینے کا راستہ مسدود نہیں بلکہ مخصوص ہے، وہ یہ کہ اپنا حصہ کسی کے ہاتھ فروخت کرکے وہ اپنی رقم حاصل کرے اور اس مخصوص راہ کی پابندی بھی اس نے خود ہی اپنے سر لی ہے، اس لیے اس میں کوئی نزاع بھی نہیں ہو سکتا، بالفرض عدم واپسی کی یہ شرط، فاسد بھی ہو تو اس سے عقد شرکت فاسد نہیں ہوگا، کیوں

کہ یہ ان عقود میں ہے جو شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتے۔ (۱)

ساتواں اشکال: کمپنی میں سرمایہ کاری اگر شرکت ہے تو شریک کی موت اور اس کے جنون ممتد سے یہ شرکت باطل ہو جانی چاہیے اور اس میں وراثت جاری نہ ہونا چاہیے، حالاں کہ کمپنی کے آئین کی رُو سے اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مرنے والے شریک کی شرکت تو ختم ہوگئی، البتہ اس کے حصے بذریعہ قانون، ورثہ یا ولی کے نام منتقل کر دیے گئے، کمپنی کے آئین سے حاصل یہی نکلتا ہے۔ اور شرعاً اس کی حقیقت یہ ہے کہ شریک کی موت کے بعد اس کے ترکے کے مالک اس کے ورثہ ہوئے، تو اس کے مال شرکت کے مالک بھی اس کے ورثہ ہوئے، اب یہ ورثہ اپنی رضا سے اپنے مورث کے حصص اپنے نام منتقل کراتے ہیں، تو یہ اپنے مورث کی جگہ نئے شریک اور حصہ دار ہوئے، دراصل یہاں وراثت ترکے میں جاری ہوئی، عقد شرکت میں نہیں اور ورثہ نے کمپنی کی شرکت قبول کرلی تو جدید عقد شرکت وجود میں آگیا۔ ایسا شرعاً بھی جائز و درست ہے۔

آٹھواں اشکال: حصہ داروں کی رقم سے جب تک کوئی سامان خریدا نہ گیا وہ روپے کی شکل میں ہوتی ہے اور جب اس سے کچھ خرید لیا گیا تو مال و متاع کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ حصہ جب تک روپے کی شکل میں ہے اور روپے سے اس کی بیع ہوئی تو مجلس عقد میں تقابض بدلین ضروری ہے، اگر ایک نقد ہو دوسرا اُدھار، تو یہاں ربا النسیہ پایا جائے گا، اس لیے یہ بیع حرام اور فاسد ہوگی یہاں معین پیسوں کے باہمی تبادلہ سے متعلق ہدایہ کی عبارت پیش کی گئی ہے۔ (۲)

جب حصہ سامان میں تبدیل ہوگیا اور روپے کے عوض اس کی بیع ہو رہی ہے، تو بھی یہ بیع ناجائز و فاسد ہے، کیوں کہ کمپنیوں کے سامانوں میں اس حصہ دار کا حصہ کون ہے اور کتنا ہے، یہ مجہول و نامعلوم ہے اور مجہول شے کی بیع ناجائز و فاسد ہوتی ہے۔

پہلی صورت کا جواب یہ ہے کہ جس وقت بیع کی کارروائی مکمل ہوتی ہے اس وقت دونوں جانب سے قبضہ متحقق ہو جاتا ہے کیوں کہ حصص سرٹیفکیٹ کی منتقلی "منتقلی فارم" پر درخواست آنے، منتقلی کی رجسٹری کرنے، بورڈ کے ذریعہ منتقلی کی منظوری دینے اور ممبران کے رجسٹر میں اندراج کرنے پر مکمل ہوتی ہے۔ (۳)

اس کارروائی کے بعد خریدار کمپنی کا نیا حصہ دار ہو جاتا ہے اور کمپنی اس کی وکیل عام ہوتی ہے، جس کا دائرۂ عمل قبضہ بدل کو بھی شامل ہے اور صحت بیع کے لیے مبیع پر خود مشتری کا قبضہ ضروری نہیں بلکہ اس کے وکیل قبض کا قبضہ

(۱) فتح القدير، ص:۸۱، ج:٦/ خانيه، ص:۹۰۵، ج:٤

(۲) هدايه، باب الربا، ص:٦٥، ج:۳، مجلس البركات، مباركفور

(۳) طريقۂ تجارت، ص: ۱۹۱، ج:۱

بھی کافی ہے۔ اور زیر بحث مسئلہ میں وکیل قبض یعنی کمپنی کا قبضہ پہلے ہی سے متحقق ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں تقابض بدلین ضروری نہیں بلکہ صرف ایک طرف سے قبضہ ضروری ہے، کیوں کہ یہاں معاملہ نوٹ کی نوٹ سے بیع کا ہوتا ہے، وہ ثمن خلقی نہیں ثمن اصطلاحی ہے اور اس میں ایک عوض پر مجلس میں قبضہ ہوجانا صحت بیع کے لیے کافی ہے۔(۱)

دوسری صورت سے متعلق اعتراض بالا کا جواب یہ ہے کہ متاع مجہول کی بیع اس وقت ناجائز ہوتی ہے جب اس کی جہالت باعث نزاع ہوکر لین دین کے عمل سے مانع ہو، یہاں کمپنی کے دستور کے مطابق مبیع کو نئے حصہ دار کے حوالے کرنے کی حاجت ہی نہیں پیش آتی، تو نزاع باہمی اور منع تسلیم کی صورت ہی نہ ہوئی کہ عدم جواز اور فساد بیع لازم آئے۔ "إن محض التمليك لا يبطل بجهالة لعدم الحاجة إلى التسليم" (۲) کچھ اور عبارتیں بھی ہیں۔(۳) آگے لکھا ہے کہ اس کا "صریح جزئیہ" مسئلہ تخارج ہے، جس میں مبیع اور اس کی مقدار مجہول ہوتی ہے۔

نواں اشکال: حصہ دار کے حصے روپے کی شکل میں ہوں یا سامان کی شکل میں، ان کی بیع اور تسلیم کے لیے کمپنی میں شرکت شرط ہے۔

(۱) یہ بیع بالشرط ہے جو فاسد و ناجائز ہے۔

(۲) ایسی شرط باہمی نزاع کی باعث ہے، جس کا فائدہ ہوگا وہ اس شرط پر عمل کا مطالبہ کرے گا، جس کا نقصان ہوگا وہ اس سے اعراض کرے گا۔

(۳) یہ شرط تقاضاے عقد کے خلاف ہے، کیوں کہ عقد کا تقاضا یہ ہے کہ بائع و مشتری مبیع و ثمن کے تسلیم و تسلّم کے عمل میں آزاد ہوں اور یہاں اس کام کے لیے کمپنی میں شرکت کی پابندی ہوگئی۔

(۴) جب عقد بیع کے ساتھ عقد شرکت کو بھی لازم کردیا گیا تو یہ در حقیقت ایک عقد کے اندر دو عقد ہوئے، یہ بھی فاسد و ناجائز ہے۔ وقد نهى النبي عليه الصلاة و السلام عن صفقتين في صفقة.(۴)

جواب (الف): (۱) شرط مفسد بیع اس وقت ہوتی ہے جب وہ تقاضاے عقد کے خلاف ہو۔

(۲) اور اس کی وجہ سے عاقدین میں سے کسی کو ایسا نفع مل رہا ہو جس کے مقابل دوسرے کو کچھ نہ ملے یا مبیع ذی

---

(۱) كفل الفقيه مشموله فتاوى رضويه، ص:۱۵۰-۱٥٤، ج:۷

(۲) بنايه، ص:۷۸، ج:۳

(۳) هدايه، ص:٤، ج:۳و ص:۲۳، ج:۳، قبيل باب البيع الفاسد، مجلس البركات، مبارك فور/ فتح القدير، ص:۲۹، ج:٦

(۴) هدايه، ص:٤٤، ج:۳، كتاب البيوع، مجلس البركات، مباركفور

عقل و باشعور ہو اور شرط کا نفع اس کے حق میں ہو۔ مفسد بیع ہونے کے لیے ان سبھی امور کا اجتماع ضروری ہے۔

لیکن جب کوئی شرط معروف و معہود ہوجائے تو وہ تقاضاے عقد کے خلاف اور باعث نزاع نہیں ہوتی اور یہاں یہ شرط معروف و معہود ہے اور عاقدین نے خود اس طریقۂ تسلیم و تسلم کو خاص کیا ہے، اس لیے یہ عمل ان کے اختیار ہی سے ہوا اور ان کی آزادی بھی مسلوب نہ ہوئی۔ امام احمد رضا قدس سرہ نے "المنى والدرر لمن عمد مني آرڈر"(۱) میں ایسی آٹھ بیعوں کا ذکر کیا ہے۔ اور آج کے زمانے میں اس کی نظیر مثلاً چھ ماہ میں گھڑی یا پنکھا خراب ہو جائے تو واپس کرکے دوسرا لے جانے یا ایک مقررہ مدت کے اندر مفت مرمت کرالینے کی گارنٹی کی شرط ہے، جو متعارف ہونے کے باعث تقاضاے عقد کے خلاف اور باعث نزاع نہ رہی۔ اس شرط کا فائدہ عاقدین میں سے کسی ایک کو نہیں ملتا بلکہ غیر یعنی کمپنی کو ملتا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ مشتری شرکت پر مجبور نہیں بلکہ شرکت ہی کے لیے وہ حصص خریدتا ہے، اس لیے اس کی کوئی آزادی سلب نہ ہوئی۔

(ب) (۱) ایک عقد میں دو عقد ممنوع ہونے کی علت یہ ہے کہ کسی عاقد کو ایسا نفع ملتا ہے جو سود کی حیثیت رکھتا ہے اور یہاں شرکت کا فائدہ عاقدین میں سے کسی کو نہیں ملتا بلکہ کمپنی کو ملتا ہے۔

(۲) تعارف و تعامل کے بعد ایک عقد میں دو عقد ناجائز نہیں رہ جاتے بلکہ صحیح ہوجاتے ہیں، جیسے گھڑیوں اور پنکھوں میں مفت مرمت کی شرط عقد بیع کے ساتھ عقد اجارہ کی شرط ہے، مگر تعامل کی وجہ سے جائز ہے۔ یہی حال یہاں عقد شرکت کی شرط کا بھی ہے۔

(۳) علاوہ ازیں شرکت بجائے خود کوئی نفع بھی نہیں کہ سود کی صورت بنے اور کسی عاقد کو بلا عوض کوئی زیادتی ملے۔ ردالمحتار میں ہے:

"والظاهرُ أن الشّركة كالمفاوضة، لو دفع ألفًا، نصفها قرض على أن يعمل بالألف بالشركة بينهما، والربح بقدر المالين مثلًا أنه لاكراهة في ذلك؛ لأنه ليس قرضا جر نفعًا". (۲)

یہاں مقرض نے ایک شخص کو قرض اس شرط پر دیا کہ وہ اس کے ساتھ عقد شرکت کرے۔ اگر شرکت بذات خود کوئی نفع ہوتی، تو یہ "كُلُّ قَرْضٍ جرَّ نَفْعًا" کے عموم میں شامل رہتا اور ناجائز ہوتا۔ مگر جواز کی وجہ یہی ہے کہ ایسا کوئی نفع نہ پایا گیا جو سود کہا جاسکے، بعینہ یہی بات بیع حصص میں بھی پائی جاتی ہے، لہٰذا مساواتی حصص کی بیع بہر حال جائز و درست ہے۔

---

(۱) فتاویٰ رضویہ، ص:۲۰۸، ج:۸، رضا اکیڈمی

(۲) ردالمحتار، ج:٦، ص:۵۱۰، كتاب الشركة، دارالكتب العلمية، بيروت

دسواں اشکال: مسئلہ زیر بحث سے متعلق فتاوی رضویہ ص ۱۱۲-۱۱۱، ج ۷ میں ہے:

''ظاہر ہے کہ حصہ روپوں کا ہے اور وہ اتنے ہی روپوں کو بیچا جائے گا جتنے کا حصہ ہے۔ کم، زائد کو بیچا گیا تو ''صرف'' ہے جس میں تقابض بدلین نہ ہوا، یوں حرام ہے۔ پھر حصہ داروں کو جو منافع کا سود دیا جاتا ہے وہ بھی حرام ہے، غرض یہ معاملہ حرام، در حرام، محض حرام ہے۔ حصص کی قیمت شرعًا کوئی چیز نہیں بلکہ اصل روپے جتنے اس کے، کمپنی میں جمع ہیں یا مال میں جتنا اس کا حصہ ہے یا'' منفعتِ جائزہ غیر ربا'' میں اس کا جتنا حصہ ہے، اس پر زکاۃ لازم آئے گی''۔

جواب: واضح رہے کہ یہ فتوی مساواتی حصص سے متعلق سوال کا جواب ہے اور کسی لفظ سے یہ مترشح نہیں کہ کمپنی میں شرکت حرام یا گناہ ہے بلکہ آخر میں منفعت جائزہ غیر ربا میں شریک کا حصہ مان کر اور اس پر زکاۃ لازم بتا کر یہ افادہ فرمایا کہ نفس شرکت جائز اور اس سے حاصل ہونے والا غیر سودی نفع بھی جائز و پاک ہے، جس پر زکاۃ کی ادائگی بھی لازم ہے، ہاں! روپے کی روپے کے بدلے بیع کو عدم تقابض بدلین کی وجہ سے ناجائز کہا ہے، مگر یہاں روپے سے مراد چاندی کے سکے ہیں، جو ان کے زمانے میں رائج تھے اور ثمن خلقی کی بیع میں مجلس عقد کے اندر تقابض بدلین بہر حال ضروری ہے۔ اب چاندی کے سکے نہیں بلکہ نوٹ ہیں، جو ثمن اصطلاحی ہیں اور ان میں ایک عوض پر قبضہ ہو جانا جواز بیع کے لیے کافی ہے۔ یوں ہی ثمن اصطلاحی کی بیع کمی، بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ نیز یہ متعین کرنے سے متعین ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ثمنیت باطل ہو جاتی ہے اور یہ متاع ہو جاتے ہیں، ان مسائل کی تحقیق و تفصیل ''کفل الفقیہ الفاہم'' وغیرہ میں ہے۔ تو اب نوٹ کے بدلے میں نوٹ کی جو بیع ہوتی ہے، اس میں تفاضل بالاتفاق جائز۔

آج یہ حیلہ بھی جاری ہو سکتا ہے کہ عاقدین ثمن والے نوٹ کو متعین کر کے اور متاع بنا کر اسے مبیع قرار دیں اور کمپنی کے قبضے میں جو نوٹ ہیں، انھیں ثمن ٹھہرالیں تو یہ اُدھار بیع ہوگی، جو بلا شبہہ جائز ہے۔ لیکن چاندی کے سکّوں میں یہ حیلہ نہیں ہو سکتا۔

آج کمپنیوں کے لیے ۱۹۵۶ء کا جو قانون نافذ ہے، اس کی رو سے کمپنی وکیل عام ہوتی ہے، اس لیے کمپنی کے قبضہ کی وجہ سے تقابض بدلین کی توجیہ نہ صرف ممکن بلکہ مناسب ہے۔ اعلی حضرت قدس سرہ کے زمانہ میں ۱۹۵۶ء سے قبل کا جو قانون نافذ تھا، ہو سکتا ہے اس کی رو سے کمپنی صرف وکیل بیع و شرا ہی ہو اور اس وقت تقابض بدلین کی توجیہ نہ کی جا سکتی ہو۔ فتوے کے الفاظ سے اس وقت کمپنی کا وکیل عام ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔

ہاں! اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے قرض پر نفع کو سود و ناجائز قرار دیا ہے۔ ہم نے بھی اس سے انحراف نہ کیا۔ یوں ہی کمپنی کے جاری شدہ حصص کو بے قیمت مانا۔ ہم نے بھی یہی لکھا۔ الحاصل آج کے حالات میں مذکورہ فتوے سے بیع حصص کے عدم جواز پر استناد بجا نہیں۔

مذکورہ دس اشکالات و جوابات کے بعد یہ بحث آتی ہے کہ کمپنی کا ایک حصہ دس یا سو روپے کا ہوتا ہے، کبھی اسے

کمپنی اتنے ہی میں جاری کرتی ہے، کبھی کم و بیش میں۔ یعنی شریک دس کا حصہ دس میں لے یا دس کا حصہ پندرہ میں لے یا دس کا حصہ آٹھ میں لے، یہ تین صورتیں ہوتی ہیں، کیا یہ تینوں جائز ہیں؟

جواب یہ ہے کہ شریک نے برابر یا کم و بیش جتنے روپے دیے، در اصل وہ اتنی ہی رقم لگا کر عقد شرکت عمل میں لانے والا ہوا اور شریک بنا۔ اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔

ہاں! اس پر یہ محظور وارد ہو سکتا ہے کہ شریک کو نفع تو اسی رقم کا ملیگا جو سند میں چھپی ہوئی ہے، اگرچہ اس نے دس کی جگہ بیس دیے ہوں لیکن اس میں بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ کمپنی کے آئین میں جب یہ شرط متعارف ہے کہ گراں قدر والے حصص میں اضافی روپوں پر نفع نہیں ملے گا تو اس کے جانتے ہوئے ان حصوں کو لینے کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ دار صرف دس روپے ہی نفع میں شرکت کے لیے دے رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اضافی دس روپوں کا بھی نفع دینے میں کچھ لحاظ ہوتا ہے، جیسا کہ '' سرمایہ کاری '' کی عبارت سے عیاں ہے۔ لہٰذا مساواتی حصص کا اجرا مساوی قیمت پر جائز ہے اور کم و بیش پر بھی۔ (انتہی المقال ملخصًا)

ان مقالوں کے بعد **بحث کا دور** آیا۔ سب سے پہلے کمپنی کی حیثیت پر بحث شروع ہوئی کہ کمپنی کس چیز کا نام ہے؟ مؤکل کون ہے؟ وکیل کون ہے؟

کہا گیا کہ کمپنی شرکا کے وجود اجتماعی، اعتباری کا نام ہے۔ مؤکل شرکا ہیں اور وکیل ہدایت کاروں کی انجمن ہے۔ مگر یہ بحث دیر تک جاری نہ رہ سکی، چوں کہ اجلاس کا مقررہ وقت ختم ہو رہا تھا۔ یہ چوتھا دن اور آخری اجلاس تھا۔ رات کو جلسۂ عام ہونا تھا، بہت سے علمائے کرام نے فرمایا کہ ابھی بہت سی چیزوں پر کافی غور و خوض کی ضرورت ہے جو عجلت میں اور کتابوں کی مراجعت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے طے یہ ہوا کہ ان مقالات کا خلاصہ یا ان کی مکمل نقلیں علما و مفتیان کرام کی خدمات میں بھیج دی جائیں تا کہ وہ جملہ نکات پر غور و خوض کر لیں، پھر آئندہ سیمینار میں ان پر باضابطہ بحث اور فیصلہ ہو۔ اسی تجویز کے پیش نظر میں نے ان مقالات کے بنیادی اجزا ذرا بسط کے ساتھ یہاں پیش کر دیے ہیں۔ انھیں سامنے رکھ کر بھی غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔

سیمینار کے انعقاد، خوشگوار اور علمی ماحول میں مباحثہ و مذاکرہ اور بعض امور سے متعلق تنقیح و فیصلہ سے بھی مندوبین کو مسرت ہوئی۔ بہت سے نئے فارغین اور شرکا کو بھی حوصلہ ملا کہ آئندہ اچھی محنت و کوشش کے ساتھ مسائل کا جائزہ لیں، مقالے لکھیں اور مباحثوں میں حصہ لیں۔ الغرض یہ سیمینار مجلس شرعی کے ارکان کی توقعات سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ آئندہ سیمینار کے سلسلہ میں جلد ہی مجلس شرعی کی ایک نشست ہونے والی ہے، اس میں حالیہ سیمینار سے متعلق بعض امور کی تنقیح اور فیصلہ کے لیے فیصل بورڈ کا اجلاس منعقد کرنے پر بھی غور ہونا ہے۔ ان شاء المولی تعالیٰ فیصل بورڈ کے

اجلاس میں پہلے دونوں مسئلوں سے متعلق امور طے ہوجائیں گے اور آئندہ سیمینار میں کچھ دوسرے نئے موضوعات بھی بحث کے لیے رکھے جائیں گے۔

ادارہ ان تمام حضرات کا شکرگذار ہے، جنھوں نے ان مسائل پر توجہ دی، مقالات لکھے، سیمینار میں شرکت فرمائی، اپنی آرا سے نوازا، اپنی علمی و عملی بیداری کا ثبوت دیا اور آئندہ کام کرنے کے لیے اپنے اندر مزید حوصلے پیدا کیے اور دوسروں کے حوصلے بھی بڑھائے، رب قدیر سب کو جزائے فراواں سے نوازے۔ اس دینی و علمی کام کو فروغ و استحکام بخشے اور ملت اسلامیہ کے مقدر کا ستارہ ہمیشہ بلند و تابناک رکھے۔

وله الحمد والمنة، وهو المستعان وعليه التكلان والصلاة والسلام على خير خلقه خاتم النبيين و على آله و صحبه و علماء ملته و فقهاء دينه أجمعين.

☆☆☆☆☆

باب ہشتم

مکتوبات

مکتوبات

إلى فضيلة الشيخ الدكتور **عمرعبدالله كامل** حفظه الله تعالى ـــــ تحية و سلاما

سمعنا عن اختلال صحتكم و إصابتكم بالتعب الشديد و البرد الوجيع في سفركم، ساءنا هذا الخبر المفاجئ و أحزننا، و نرجو من فضل الله سبحانه أن يلبسكم ثوب الصحة و العافية، و وقاكم كل مرض و ألم، و نفع بكم الأمة المسلمة و خاصة أهل الدين والعلم.

و مما يبعث القلوب على الأسف و الحزن ارتفاضُ سفركم إلى مبارك فور و لكن صحتكم و راحتكم أحبّ إلينا. و ليس ببعيد أن يرزقنا الله زيارتكم بمناسبة سعيدة، و يشرِّفَ رحابَ الجامعة الأشرفية و أهلَها بأقدامكم المباركة في قريب الزمان مع توفير الراحة و العافية و تكثير المحبة و الوداد، و تيسير الآلات و الأسباب، و دفع كل مانع و حاجز، وهو وليّ كل سعادة و خير، و مشيته تقهر كل رادع و عائق. و تدفع كل ألم و ضير.

و نتجاسر ثانيا – إن لم تكرهوا – أن ندعوكم إلى جامعتنا في آونة ملائمة، و ظروف مناسبة، و فصل رائق حسب اختياركم مثلا في شهر مارس أو أكتوبر أو غيرهما مما يترجّح عندكم سوى شهور شعبان و رمضان و شوال.

و لا غرو إن رجونا ثانيا قبولكم و إخباركم بالقدوم الميمون و لو بعد حين، فإن الكرام لا يرجى منهم إلا الكرم و الإحسان. والله ولي كل توفيق و إنعام.

والسلام عليكم و رحمة الله و بركاته.

محمد أحمد المصباحی

عميد الجامعة الأشرفية مبارك فور

۱۰، صفر ۱۴۳۲ھ

۱۵، يناير ۲۰۱۱م

☆☆☆

إلى مديردارالكتب العلمية..........................بيروت لبنان

بسم الله الرحمن الرحيم

حامدًا و مصلّياً

و بعد! فقد نشر مجلس البركات، الجامعة الأشرفية، مبارك فور، الهند "شرح نزهة النظر" للعلامة **وجيه الدين العلوي الگجراتي** بتحقيق الأستاذ نفيس أحمد المصباحي، و "التعليق المجلي على منية المصلي" للعلامة وصي أحمد المحدث

السورتي الهندي، و حبا للنشر العام يريد المجلس إعادة طبع "شرح نزهة النظر" و يريد إصدار "التعليق المجلي" على نهج جديد كما هو رائج في الأقطار العربية الآن، و منى أذن لدار الكتب العلمية، بيروت، لبنان بنشرهما كما يريد المجلس بالتزام الأمانة العلمية و جودة الترتيب والكتابة و النشر. والله ولي التوفيق.

محمد أحمد المصباحي
مدير مجلس البركات
الجامعة الأشرفية، مبارك فور
مديرية أعظم جراه، الولاية الشمالية، الهند
٢٢/ ٢/ ١٤٣١هـ / ٢٠١٠/٢/٧م

☆☆☆

إلى مديردارالكتب العلمية..........**السلام عليكم و رحمة الله و بركاته**

استلمت رسالتكم بالبريد البرقي، سرّنا صدور الكتابين: التوضيح و حدوث الفتن. فشكرا لكم و لمساعيكم في سبيل إصدارهما. يسهل لنا استلام النسخ بالبريد على العنوان التالي:

محمد أحمد المصباحي
مدير مجلس البركات، الجامعة الأشرفية

☆☆☆

إلى حضرة الأستاذ ، الدكتور/ سعد محمود محمد شمه

المستشار الثقافي و مدير المكتب الثقافي بـ نيو دلهي تحية عاطرة و بعد ..

فقد استلمت اليوم ١٢/١/ ٢٠١٣م خطابكم المرسل في ٢٠١٣/١/٢م بخصوص احتياج قارئ من القاهرة لشهر رمضان المبارك.

أسفًا أن إدارة الجامعة لبعض الموانع لا ترغب إلى طلب قارئ بصفة مذكورة.

و السلام مع الإكرام
(محمد أحمد المصباحي)
مدير الجامعة الأشرفية
مبارك فور- أعظم جَره - يو، پی

سعادة السيد الدكتور/ سفير جمهورية مصر العربية بدلهي الجديدة، الهند

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته و بعد

فقد تشرفت باستلام رسالتكم في ....فجزيل شكر لكم على هذه العناية بالجامعة الأشرفية مع رجاء المزيد من سعادتكم.

و تلبية لندائكم أرسل إلى سيادتكم .... راجيا الإرسال إلى الأزهر الشريف بعد الإجراءات اللازمة، ثم المساعدة بإعطاء جواز السفر إلى جمهورية مصر العربية العزيزة، و غير ذلك مما يتسنى لكم من المعاونة في طريق الالتحاق بالأزهر الشريف. والله لا يضيع أجر المحسنين.

مع خالص التحية والتقدير
والسلام عليكم و رحمة الله و بركاته
مدير الجامعة الأشرفية
مبارك فور، أعظم جراه أتربراديش، الهند

☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

فضيلة الشيخ الكريم حفظه الله.........السلام عليكم ورحمةالله وبركاته

من المعلوم أن الهند بلادغيراسلامية.والمسلمون الصلحاءوان يرغبوا فى العمل بالشرائع الاسلامية لكن العلماء وقضاة المسلمين يواجهون ظروفا متعقدة ومسائل صعبة، من قبل بعض المسلمين الذين لايكترثون كثيراًبأحكام الشرع القويم.وعددهم ايضاليس بقليل.فمن تلك المسائل الصعبة مسئلة ثبوت الهلال وفق المبادئ الشرعية..ومسئلة هلال العيد بصفة خاصة..فان العامّة اذ يسمعون من راديو أن بالبلد الفلانى عيدا،وقاضى ذلك البلد حكم بالعيد وأعلن،فيطالبون من علماءمدائنهم أن يحكموا بالعيد لثبوت الهلال طبق بيان المذياع ثم يصرّون على مطالبتهم.وبعض الناس لاينتظرون حكم العلما والقضاة بل يفطرون فى مثل ذلك اليوم علانية.

أما ثبوت الهلال بالطرق الشرعية فصعب جدا.والعمل باعلان مذياع غير مسلم أذيع حكمه.أصعب منه ومتعقد كثيرا عند علماء الشرع .وكذا استخدام المجهار (آلة مكبرة الصوت) فى خلال الصلوٰة وانتقال المصلين الى الأركان بسماع صوته متعقد منذ

زمن مدید. وعلماء الأحناف أكثرهم أو بعضهم يرون أن صوت المجهار ليس عين صوت المتكلم بل صوت آخر حدث بالقرع الجديد، فالانتقال عليه يكون تلقنا من الخارج،وهذا يفسد الصلاة.لكن العامة ينزعون الى المجهار فيطالبون العلماء أن يفتوا بجواز استخدامها فى الصلوة. وليست سلطة شرعية وقوة اسلامية قاهرة تردعهم عن زيغهم فى أحكام الدين فينفذون أرائهم فى مساجد يجدون فيها مساغا لنفوذهم.

نظراً الى هذه القضايا المشكلة عُقد مجلس استشارى لكبار علماء أهل السنة فى الجامعة الاشرفية بمباركفور (الولاية الشمالية) فى ٣/ من ذى القعدة عام ١٤٠٥ ه المصادف ٢٢/ يوليو ١٩٨٥م، تحت رئاسة العلامة اختر رضا خان الازهرى،القائم مقام المفتى الأعظم فضيلةالشيخ الكبير العلامة مصطفیٰ رضا خان القادرى البريلوى قدس سره.فأنشات فى الاجتماع المذكور لجنة شرعية تشتمل على ٢٩ مفتيا من الهند. وفوضت مسئولية الاستفتاء و الارتباط بالعلماء والمفتيين فى الهند وخارجها الى العلامة ارشد القادرى مؤسس "ادارهٔ شرعيه بولايۂ بهار" وعميد جامعة فيض العلوم بجمشيد فور (بهار) والى كاتب هذه السطور محمد أحمد المصباحى رئيس المعلمين بالمدرسة العربية فيض العلوم بمحمد آباد. وتقرر ايضاً أن تعقد الجلسة الاولیٰ لهذه اللجنة ببلدة وارانسى فى ١٥/ صفر ١٤٠٦ ه الموافق ٣٠/ اكتوبر ١٩٨٥م،ويُوضع حلاّ مجمعا عليه بعد تقديم جميع الفتاویٰ الى المجلس.

وفق قرار المجلس أُرسل الى سماحتكم الاستفتاء لتبحثوا عن مسائله وتعربوا عن أحكامها. ونرجو أن ترسلوا فتواكم المحتوية على الدلائل القوية والايضاح التام فى ظرف شهرين..الى ٣٠/ ستمبر ١٩٨٥م.. ليسهل لنا ارسالها وتقديمها الیٰ جميع أعضاء اللجنة وفى الاجتماع المقرر ٣٠ / اكتوبر ١٩٨٥ م.ولا سمح الله ابداً أن تحرموا من اجابتكم المباركة.والسلام

[محمد أحمد الأعظمى المصباحى،عضو اللجنة الشرعية والقائم بأمور الرابطة، المحرر فى١٢/ ١١/ ١٤٠٥ ه الموافق ٠٣/ ٠٧/ ١٩٨٥ م]

☆☆☆

فضيلة الشيخ الجليل.........................حفظه الله تعالیٰ

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

قدوجهنا الى سماحتكم مسائل عن اعلان ثبوت الهلال بالمذياع فى مثل بلادنا، وعن استخدام المجهار فى خلال الصلوٰة وأداء الأركان بسماع صوته.

نرجو من بركات علومكم الكشف عن وجوه المسائل والايضاح عن المعضلات فى الوقت المحدود..آخر ستمبر ١٩٨٥ م.. ولايبعد عن سماحتكم أن ترسلوا سامى جوابكم قبله.وان لم يمكن الیٰ ٣٠/ ستمبر فبفضلكم أفيدونا عن فيوضكم و واضح فتواكم ولو بعده بعدة ايام.

اللجنة الشرعية ستعقد جلستها فى ٣٠/ اكتوبر ١٩٨٥م ببلدة وارانسى. وقبل ذلك علينا أن نستجمع الفتاویٰ،ونقدمها الى أعضاء اللجنة فى الجلسة، ونلخّصها ان كان التلخيص لازماً. فنظراً الى هذه الظروف تكرموا علينا بجوابكم فى أقرب حين، ليمكن لنا و يسهل علينا ما بعد ذلك من الأمور. وليس الكرم صعباً على الكرام. والسلام عليكم

[محمد احمد الأعظمى المصباحى،عضو اللجنة الشرعية والقائم بأمور الرابطة[٢١ذى الحجه،١٤٠٥ھ/ مطابق٩ ستمبر ١٩٨٥م]

☆☆☆

مکتوب (١) بنام **مولانا عبدالحکیم شرف قادری**، لاہور

حضرت مفتی صاحب مد ظلہ العالی کا والا نامہ موصول ہوئے کئی ماہ گزرے، جواب دینا بہت ضروری تھا۔ اس درمیان آپ اور مولانا محمد منشا صاحب کے خطوط بھی موصول ہوئے مگر میں اپنی بے توفیقی کی کیا توجیہ کروں، خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ چند ماہ عجب پریشاں خاطری میں گزرے، کوئی کام سا کام بھی نظر نہیں آتا جسے دکھا کر کچھ عذر کر سکوں، بس میرے حق میں دعائے خیر کریں۔

۵/ جمادی الآخرہ ١٤١١ھ مطابق ٢٣/ دسمبر ١٩٩٠ء شب دوشنبہ کو والد صاحب کی رحلت کی خبر کہیں نظر سے گزری ہوگی۔ ان کے اٹھ جانے سے میں اور زیادہ بے سہارا ہو گیا ہوں۔ عمر تو زیادہ تھی مگر اپنے کام خود کر لیتے تھے، کمزوری و ضعیفی کی وجہ سے لیٹے تو رہتے تھے مگر وقت ضرورت گھر میں چل پھر لیتے تھے۔ چند ماہ پہلے باہر بھی آتے جاتے تھے۔ وہ ۵/ جمادی الآخرہ ١٣٤٦ھ پنج شنبہ کو حضرت شیخ المشائخ سید شاہ علی حسین اشرفی علیہ الرحمہ کے پیر و مرشد اور برادرِ اکبر سید شاہ اشرف حسین صاحب علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے تھے۔ موصوف ہمارے قریبی موضوع ولید پور (متصل بھیرہ) میں مولانا محمد کامل صاحب نعمانی علیہ الرحمہ کے عرس میں شرکت کے لیے ان کے خلیفہ حضرت صوفی محمد جان علیہ الرحمہ کی دعوت پر کچھوچھہ شریف سے یا اور مقامات سے ہوتے ہوئے تشریف لائے تھے۔

والد صاحب عرصۂ دراز تک گجرات کے شہر سورت میں بھی رہ چکے تھے، وہاں حضرت شیر بیشۂ اہل سنت مولانا حشمت علی صاحب علیہ الرحمہ کی تقریروں اور مجلسوں سے بہت مستفید ہوئے۔ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے یہاں گھوسی بھی آمد ورفت رکھتے تھے۔ دیگر علما خصوصًا حافظ ملت علیہ الرحمہ سے قریبی تعلقات تھے۔

ہم لوگوں کے لیے دینی اور دنیاوی طور پر بہت کچھ کر گئے، گاؤں کی سنیت کو مضبوط ومستحکم کرنے میں بھی ان کا نمایاں کردار ہے ورنہ وہابیت کی ہوا تو ہمارے علاقے کو بری طرح مسموم کر گئی تھی۔ رب قدیر انھیں جنت الفردوس سے نوازے اور عفو وغفران، رحمت وحنان کا معاملہ فرمائے۔ دعاؤں سے نوازیں۔ متصلب، دین دار، پابند شرائع، متحرک ومحرک شخص تھے، ہمارا دینی وملی مزاج ان کا اور والدۂ مرحومہ کا ہی عطیہ ہے، تغمدهما الله تعالىٰ بغفرانه وفضله وانعامه۔

(فتاویٰ رضویہ باب التیمم کی عربی عبارات کے) ترجمہ کے کام میں بھی غیر معمولی تعطل واقع ہوا، جو غالبًا امتحان شش ماہی کی مصروفیات کے دنوں سے شروع ہوا تھا اور تاحال جاری ہے۔ کبھی کبھی صفحہ دو صفحہ لکھ گیا ہوں۔ اصل کے ص: ۷۰۰ تک ترجمہ ہو گیا ہے جو خلیجی بحران وغیرہ کتابوں کے پیکٹ میں جانا تھا مگر دفتر کی کچھ عجلت اور میری کچھ سستی کی وجہ سے رکھا رہ گیا، اب جلد ہی کسی وقت ارسال ہوگا۔ تقریبًا دو سو صفحات باقی ہیں، مولیٰ تعالیٰ آپ حضرات کی عظیم و وقیع فرمائش میرے قلم سے باحسن وجوہ پوری کرائے اور جلد تر، تاکہ دوسرے موقوف کاموں کی بھی تکمیل ہو جائے۔ اس درمیان آپ حضرات کے متعدد علمی تحائف بھی نظر نواز ہوئے جن کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا اور کوئی تبصرہ بھی رقم نہ ہوا۔ ان دینی خدمات کو قبول عام وتام عطا فرمانے والا رب جلیل ہے۔ ہم کم سوادوں کے ذکر وشکر کی کیا وقعت؟ رب جلیل اپنے انعامات خاصہ سے شاد کام فرمائے اور دین متین کو آپ حضرات کی خدمات سے سربلندی واستحکام بخشے، وجعل لنا نصيباً منا بفضله وكرمه.

مولانا نعمانی صاحب کے نام آپ کا حالیہ خط دو تین دن پہلے نظر نواز ہوا جس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے غیروں کے استنادی حوالوں اور ان کے لیے کلمات تبجیل وتعظیم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور آپ نے انھیں جواب دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ متعصب ومعاند گروپ جس سے ہمارا سابقہ ہے بالقصد ہمارے اکابر کو نظر انداز کرتا ہے اور کسی جہت سے بھی ان کا نام لینا گوارا نہیں کرتا۔ ایک سال پہلے دہلی میں ایک فقہی سیمینار ہوا تھا جس کے خطبۂ صدارت میں علمائے ہند کی فقہی خدمات کا علی میاں نے ذکر کیا تو صرف مولوی اشرف علی تھانوی اور مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی کا ذکر کیا۔ خطبۂ نظامت میں صرف رشید احمد گنگوہی اور اشرف علی تھانوی کا ذکر تھا۔ اس صریح تعصب پر

جماعت اسلامی کے ایک نمائندہ سے بھی ضبط کا یارانہ رہا اور اس نے کھل کر کہا کہ مولانا احمد رضا خاں کی فقہی خدمات کا پلہ ان کے سارے معاصرین پر بھاری ہے مگر ان کو صرف مسلکی عصبیت کی بنا پر نظر انداز کیا گیا ہے جو تاریخی بد دیانتی ہے۔ اور یہ کوئی ایک مثال نہیں، بہت غور سے ان کی ساری تحریروں کو کھنگال ڈالیے، ہمارے کسی بزرگ کا کیا ذکر کریں گے کسی مشہورِ آفاق قدیم بزرگ کا بھی تذکرہ نہیں کرتے۔ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے نام سے بھی پہلوتہی کرتے ہیں اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان ہی کو سب کچھ شمار کر کے ختم کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں خود ہمارا یہ فریضہ ہے کہ اپنے اکابر کی خدمات کو اس قدر عیاں کر دیں کہ ہر آنکھ والے کو خود بہ خود نظر آنے لگے۔

بفضلہ تعالیٰ امام احمد رضا قدس سرہ کی علمی خدمات کم سواد معاندوں کے اعتراف واقرار کی محتاج نہیں۔ اہل نظر کے سامنے حضرۃ الامام کے قلم سے نکلی ہوئی کوئی ایک تحقیق وتحریر بھی رکھ دی جائے تو اسی سے وہ اعتراف کمال پر مجبور ہو جائے گا۔ اور عالم اسلام اور علمی دنیا کا بڑا طبقہ علمی میدان میں اعتراف حقائق کا عادی بھی ملے گا۔

عرصۂ دراز کے بعد ہم کلام ہوا اور بڑی لمبی بات کر گیا، کہیں بارِ خاطر نہ ہو، بہرحال معاف کریں۔ خدا نے چاہا تو اب ایسا طویل وقفہ نہ ہوگا، حضرت مفتی صاحب مدظلہ، مولانا تابش صاحب اور دیگر قریبی احباب وعلما کی خدمات میں ہدیۂ تسلیم پیش ہے۔

محمد احمد مصباحی

[بھیرہ ولید پور، ۱۵؍ جمادی الآخرہ ۱۴۱۱ھ، شب جمعہ]

☆☆☆

مکتوب (۲) محترمی **مولانا عبد الحکیم شرف قادری**..... دام ظلکم.... سلام مسنون ..... مزاج گرامی؟

کرم نامہ موصول ہوا، حضرت مفتی شریف الحق صاحب قبلہ کی خدمت میں پیش کر دیا، انھیں بھی خبر نہ تھی کہ مولانا عبد الحق صاحب اور مولانا کلیمی نے کیا لکھا ہے؟ نزہۃ القاری کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے، دوسرے کی تیاری ہے، بعد سلام مفتی صاحب نے کہا ہے کہ آئندہ اشاعت کے بعد جلد ہی گفتگو ہوگی یعنی کتابیں منتخب کر کے طلب کی جائیں گی، تعاون کی واقعی ضرورت ہے۔ "بائبل، قرآن اور سائنس" کے لیے ناشر کو خط لکھ رہا ہوں، آنے کے بعد ارسال خدمت کروں گا، "استقامت" مولانا تابش قصوری، ممتاز احمد قادری اور سید حامد لطیف صاحبان کے لیے ہدیۃً بلا عوض بھیجتا ہوں، تساہل میں اِدھر کئی بار اُن کے نام ہدیہ ارسال نہ کر سکا جس کی وجہ سے گڑبڑی ہوئی، آئندہ خیال رکھوں گا۔ غالبًا اوائل ستمبر میں الدراسات الاسلامیہ کی کاپی اور مضمون کی کئی کاپیاں موصول ہوئی تھیں اور تابش صاحب کے نام اطلاعی عریضہ بھی لکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی شرح نحو میر بھی نظر نواز ہوئی تھی جو اپنے

اختصار، جامعیت، حسن تفہیم، تمرینات قواعد، ضمیمۂ تعریفات، مصطلحات نحویہ وغیرہ فوائد کثیرہ کے باعث سابقہ تمام شروح میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ اور طباعت وکتابت کا حسن ان سب پر مستزاد ہے۔ فجزاکم اللہ عناوعن سائر الطلبة خیرالجزاء ووفقناوایاکم لما یحب و یرضیٰ۔

الدراسات الاسلامیہ میں جو مضمون شائع ہوا اسے میں بھول چکا تھا، نعمانی صاحب کے نام مولانا تابش کا خط آیا تو میں نے سمجھا شاید مولوی عارف اللہ کا مضمون ہو لیکن دیکھنے اور پڑھنے کے بعد یاد آیا۔ بہت مناسب رسالہ میں آپ حضرات نے اشاعت کرائی جس پر شکر گزار اور ممنون ہوں۔

آپ کی طرف سے البریلویہ ملی تھی، یہاں کے علما میں بھی اس کے باعث کافی اضطراب ہے، علامہ مشتاق احمد نظامی نے شعبان میں اس سلسلے میں ایک مجلس علما الہ آباد میں بلائی تھی جس میں کچھ تجاویز طے ہوئیں۔ شوال کی ملاقات میں مجھ سے کہہ رہے تھے اس کا جواب ضرور لکھوں گا، اردو میں لکھ کر ایک عزیز سے ترجمہ کرائیں گے اور ترجمہ سے پہلے اور بعد مختلف اہل نظر کو دکھائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے تمام مندرجات کو سامنے رکھ کر اثباتی طرز پر ایک کتاب لکھی جائے جس میں مسلک اہل سنت کا احقاق اور نجدیت وغیر مقلدیت کا ابطال ہو، ساتھ ہی امام احمد رضا قدس سرہ کی عظمت وعبقریت پر ان کے معاصر علمائے حجاز کی آرا پیش کردی جائیں اور ان کے صحیح حالات بھی بیان ہوں۔ دیباچہ میں ظاہر کیا جائے کہ یہ کتاب البریلویہ کے رد کے طور پر ہے۔ اور البریلویہ کی چند کھلی ہوئی غلطیوں کی نشان دہی بھی کردی جائے۔ جوابی کتاب کا نام "الشیخ احمد رضا البریلوی واھل السنۃ" یا "البریلویہ: عقائد وحقائق" ہی رکھ دیا جائے یا اور کوئی نمایاں نام، جس سے سابقہ کتاب کی طرف بھی ذہن منتقل ہو سکے، "البریلویۃ ھدف الظالمین الکاذبین"۔ آپ نے یہ نہ بتایا کہ وہاں اس سلسلے میں کیا ہو رہا ہے؟ دبئی میں ایک رسالہ "الھدیٰ" نکلتا ہے اس کے ہفتہ وار ایڈیشن میں وہاں کے خطیب کا خطبۂ جمعہ اور ایک مضمون شائع ہوا تھا جو "البریلویہ" ہی کی روشنی میں نجدی الخیال امام نے لکھا تھا، اس کا رد مولانا اختر رضا خاں ازہری نے الھدیٰ اور مختلف حکام دوبئی کو بھیجا ہے۔ وہ مضمون سنی دنیا، بریلی میں ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

اس کتاب اور دوبئی کے مضمون سے خود میں بہت غم والم میں مبتلا ہوا، ہونا تو یہ چاہیے کہ سب کام چھوڑ کر اس کے طرز پر ایک مؤثر، دل نشیں اور ٹھوس جواب جلد سے جلد تیار کرکے شائع کیا جائے اور دوسرے تعارفی رسائل و کتب کی بھی تیز تر اشاعت ہو۔ لیکن حرماں نصیبی ہے کہ دوسرے کام چھوٹتے نہیں بلکہ بڑھتے جارہے ہیں۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ ہمارا تیار کیا جواب سعودیہ میں داخل کیسے ہو سکے گا؟ مگر اس باعث جواب ترک کرنے کی ضرورت نہیں، دوسرے عرب ممالک میں تو پہنچ سکے گا جہاں جہاں ہمیں بدنام کیا گیا ہے۔ واللہ الموفق لکل خیر.

[محمد احمد مصباحی، محمد آباد، گوہنہ، ضلع مئو]

مکتوب (۳) محترمی **علامہ شرف قادری** صاحب مدظلہ..... سلام مسنون...... مزاج گرامی؟

عید مبارک، کرم نامہ نظر نواز ہوا۔ اس سے پہلے دو عریضے ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ پہلا اور آخری پیکٹ موصول ہوکر مسرت بخش ہوا، حیاتِ علیم رضا والا پیکٹ بھی ہنوز نہیں ملا۔ البتہ دوام العیش اور تذکرۃ المحدثین کسی اور پیکٹ میں تھیں وہ دستیاب ہیں۔ عصری ایجادات، حیات علیم رضا، بہار شریعت حصہ ۱۸ کی دستیابی نہ ہوئی۔ بہتر یہ ہے کہ کتابیں محمد آباد ہی کے پتے پر ارسال کریں، ان شاء تعالیٰ آسانی اور سہولت ہوگی۔ جامعہ اشرفیہ کی نئی عمارت مبارک پور حلقے میں شمار نہیں ہوتی اس لیے خود آکر وصول کرنا ہوتا ہے مگر اطلاع پہنچنے پر پہنچنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔ میں اشرفیہ کی کتابیں یہاں محمد آباد سے بحفاظت بھیج دیا کروں گا۔ بلکہ خود اپنے نام کی بھی تمام کتابیں ملاحظہ کے لیے بھیج دیتا ہوں۔ احباب کا بھی آنا رہتا ہے، اس لیے بعض اوقات بھیجنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ مرآۃ التصانیف آپ کا عظیم کارنامہ ہے۔ مقدمہ بھی بہت جاندار اور ضرورت کے بالکل مطابق ہے۔ التعلیق المجلی کی اشاعت دوسرا عظیم کارنامہ ہے۔ علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی صاحب کی کتاب مرآۃ التصانیف خود ان کے گھر جاکر پیش خدمت کردی، البتہ خط لکھنا بھول گیا، ورنہ اس رسالے میں شامل ارسال کرتا۔ فالج گر گیا ہے جس کا علاج کر رہے ہیں۔ پہلے تو بہت زیادہ معذوری ہوگئی تھی مگر اب افاقہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ علاج خود اپنے گھر محلہ کریم الدین پور گھوسی میں ہی رہ کر کرتے ہیں۔

التعلیق المجلی بھی جلد ہی مبارک پور بھیج رہا ہوں، وہ پیکٹ ڈاک خانے سے پتہ بدل کر محمد آباد ہی کے پتے پر آیا ہے۔

سید صاحب کا کرم نامہ بھی آج ہی نظر نواز ہوا۔ میں حسب وعدہ ان کے حکم کی تعمیل کی کوشش کر رہا ہوں۔ محترم مولانا غلام یاسین صاحب راز امجدی ان دنوں گھر آئے ہیں۔ ہفتے کو بھیرہ اور محمد آباد آنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ انھوں نے لاہور اترنے کا خیال بتایا تو ممکن ہے ان کے ذریعہ ترجے کا کچھ حصہ تبیض کرکے ارسال کروں۔ مع اہل وعیال ہیں، لاہور اترنے پر دشواری ہو سکتی ہے، مگر شاید فاتحہ پڑھنے کی غرض سے ایک دن قیام کریں۔

[محمد احمد اعظمی مصباحی، ۱۲ ربیع النور ۱۴۰۱ھ]

☆☆☆

مکتوب (۴) **مولانا عبدالحکیم شرف قادری**، لاہور...... تحیہ مسنونہ ...... مزاج گرامی؟

ڈاک سے ارسال کردہ کتابیں، خطوط سب دستیاب ہیں، دستی خط اور کتابیں بھی نظر نواز ہوئیں۔ تحقیق الفتوی یہاں بالکل ختم ہے، پہلے بھی ایک بار آپ کی فرمائش اس کے لیے آئی تھی، غالباً نہ بھیج سکا، محدث اعظم کا ترجمۂ قرآن

حاصل کر کے ڈاک سے بھیج سکوں گا، تادمِ تحریر ہم لوگ بھی زیارت سے محروم ہیں۔ باغی ہندوستان کی ہیئت بہت زیادہ بدل چکی ہے، نیا مقدمہ تو زیادہ جاندار نہیں، نئے اضافے قابل قدر ہیں۔ کئی بار اس کے مصارف طبع کا انتظام مکمل ہوا اور ادارہ کی کسی ہنگامی حاجت میں منتقل ہو گیا۔ دعا فرمائیں اب اس میں تاخیر نہ ہو۔ ڈاکٹر قمر النسا کا مقالہ دیکھا، گراں قدر، لائق ستائش اور باعث تبریک ہے۔ پھر عربی زبان کے سبب اس کی انفرادیت مسلّم ہے۔ مکتبہ قادریہ کی ہمت پر صد مبارک باد۔ مولانا تابش قصوری کی خدمت میں بعد تسلیم عرض ہے کہ "اعمال رضا" کی عام اجازت حضور مفتی اعظم قدس سرہ کی طرف سے جملہ اہل سنت کے لیے ہے اور قانونی اجازت کی آپ کو ضرورت نہیں۔ بلاوجہ کی پریشانی میں کیوں پڑیں۔ تاہم میں قاضی عبد الرحیم صاحب کو لکھ رہا ہوں اگر انھوں نے جواب دے دیا تو ارسال خدمت کروں گا۔ آٹھ سال محمد آباد میں استقلال کے ساتھ گزارتے ہوئے اشرفیہ کی ضرورت و دعوت پر اچانک مبارک پور آنا پڑا۔ لیکن معمولات کو معمول پر لانے میں سات مہینے ہو رہے ہیں کامیاب نہ ہو سکا۔ خط و کتابت سے بہت دور جا پڑا ہوں۔ لیکن امید ہے کہ آپ کی تنبیہ اثر دکھائے گی۔

بقیہ کتب حاصل ہونے کے بعد ڈاک سے ارسال ہوں گی، بروقت مولوی محمد ہارون افریقی کے ذریعہ درج ذیل کتب بھیج رہا ہوں:

فتاوی رضویہ اول، مقامع الحدید، مقدمہ فیصلہ مقدسہ، اسلامی اخلاق وآداب۔ دعاؤں میں یاد رکھیں تو کرم بالائے کرم ہو۔ عنایت احباب وبزرگاں کی سخت ضرورت ہے۔ مناسب سمجھیں تو حضرت حکیم اہل سنت، پروفیسر جلال الدین صاحب، مولانا تابش صاحب اور پروفیسر مسعود احمد صاحب کو مقامع الحدید ایک ایک دے دیں۔ آپ کے پتہ پر ڈاک سے مزید چلی جائے گی۔ پہلے ہی بھیجی ہوتی لیکن ترمیم شدہ محصول ڈاک باضابطہ معلوم نہ ہونے کے باعث تعویق ہوتی گئی۔ غالباً گزشتہ جمعہ کو ڈاک ریٹ دفتر میں آ گیا ہے، اب کچھ تیزی آسکے گی۔ والسلام مع الاکرام

[محمد احمد مصباحی غفرلہ، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ، یوپی، ۱۳/جمادی الاولی ۱۴۰۷ھ]

☆☆☆

مکتوب (۵) **مولانا عبد الحکیم شرف قادری**، لاہور..... تحیۃ مسنونہ...... مزاج گرامی؟

تعطیل کلاں کے بعد مبارک پور حاضر ہوا تو کرم نامہ [۱۲ اپریل ۱۹۸۶ء اور ۲ جون ۱۹۸۷ء] ایک ساتھ وصول ہوئے، یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ آپ کو فتاویٰ رضویہ اول، کاملان رام پور، اور نئی کتاب کے دو پیکٹ وصول ہوئے۔ "بانی درس نظامی" از مفتی محمد رضا فرنگی محلی لکھنؤ سے ۱۹۷۳ میں شائع ہوئی تھی، نئی اشاعت کا مجھے علم نہیں، کہیں سے حاصل کر کے بھیجنے کی فکر میں ہوں، فتاویٰ رضویہ ہفتم اور باغی ہندوستان اس سے قبل ارسال

کرنے کی کوشش میں ہوں، باغی ہندوستان کی اشاعت پر ہمت افزائی کا حق آپ نے ادا کر دیا ہے، جو کام سے بہت زیادہ ہے۔ مجلس رضا سے حکیم [محمد موسیٰ امرتسری] صاحب کی بے تعلقی پہلے سن چکی تھی ادارہ ٹوٹنے کی خبر سخت اندوہ ناک ہے، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے۔

فتاویٰ رضویہ اول کی تعریب کا کام سات آٹھ سال پہلے میں نے شروع کیا تھا جو چند صفحات سے آگے نہ بڑھا، خیال تھا کہ اصل کتاب کو باقی رکھا جائے اور اردو عبارتوں کی مقدار میں ہی عربی ترجمے کی کتابت کرا کر چپکا دیا جائے اور امتیاز کے لیے اس پر [یہ نشان] دونوں طرف ہو، اس طرح تصحیح کی زحمت سے نجات ہو جائے گی مگر عربی کتاب کی نکاسی اور طباعت کا معاملہ ہمارے لیے بہت سنگین ہے اس لیے قلم رکا تو پھر آگے نہ بڑھ سکا۔ اب آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ مفتی [عبد القیوم ہزاروی] صاحب نے دو فاضلوں کو اس پر لگا دیا ہے اور کام ایک مقدار میں ہو چکا ہے۔ "اندھیرے سے اجالے تک" کا ترجمہ مولوی محمد اسحاق صاحب رام پوری نے مکمل کر کے شعبان سے قبل میرے پاس بھیج دیا، رمضان کے شروع میں نظر ثانی کے لیے میں نے اٹھایا تو چند خامیاں نظر آئیں:

(۱) وہ انھوں نے کسی دوسرے سے مبیضہ کرایا ہے (چوں کہ خود ان کا خط ذرا اچھا نہیں) اور مبیضہ پر اچھی طرح نظر ثانی نہ کی، اس لیے کافی غلطیاں نقل کی پیدا ہو گئیں۔

(۲) اس نقل میں پیراگراف کی تبدیلی پر بھی دھیان نہیں دیا گیا ہے جب کہ اردو کتاب میں اس کا خاص اہتمام ہے۔

میں نے فوراً انھیں خط لکھا کہ آپ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ بھیجیں تاکہ میں نقل کی اصلاح سے بچ جاؤں، افسوس کہ وہ خط انھیں نہ ملا اور اب شوال میں خبر آئی۔ بہر حال میرا خیال یہ ہے کہ مسودہ مل جانے کے بعد مبیضہ، مسودہ دونوں آپ کے پاس بھیج دوں آپ خود اصلاح و تصحیح کر کے اگر چاہیں تو کاتب کے حوالے کر دیں۔

"حاشیہ سیالکوٹی" والا پیکٹ مل گیا، اس سے قبل مبارکپور کے پتہ پر بھی ایک پیکٹ ملا تھا، تابش صاحب نے مجاہد ملت نمبر طلب کیا ہے، ماہنامہ اشرفیہ کا مجاہد ملت نمبر یا ندائے حبیب کلکتہ کا مجاہد ملت نمبر؟ اول الذکر ختم ہو گیا ہے، آخر الذکر ملنے کی امید ہے۔ حضرت مفتی شریف الحق صاحب قریب الصحۃ ہیں، مبارکپور تشریف لا چکے ہیں لیکن ابھی کھڑے نہیں ہو پاتے۔ بیٹھنے، لیٹنے کے سوا چارہ نہیں۔ سلام سے یاد فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر النسا بیگم کی کتاب پر تبصرہ کے لیے نعمانی صاحب سے گزارش کر دی ہے۔ مولانا نور بخش توکلی نے جو شرح بردہ لکھی ہے وہ مجھے زیادہ پسند آئی۔ قدیم شروح و حواشی سے استفادہ کے علاوہ انھوں نے خاص محنت یہ کی ہے کہ معجزات و فضائل کی

وافر احادیث خصائص کبریٰ وغیرہ سے ہر شعر کے تحت جمع کردی ہیں۔ یہ فراوانی متقدم شروح میں نہیں۔ حل لغات، نحو وصرف اور بیان مطالب بھی مناسب انداز میں موجود ہے۔ کیا دوبارہ اس کی اشاعت نہ ہوئی؟ میں نے جو نسخہ دیکھا غالباً وہ ۱۳۴۸ھ یا اس سے قبل کا ہے۔ پھر اس کی اشاعت ہو تو بہتر ہوگا۔ بدایۃ الصرف کے آخر میں لکھا ہے کہ اس کے بعد تکمیل الصرف پڑھائی جائے یہ کتاب میری نظر سے نہ گزری۔ دستیاب ہو تو دس پندرہ عدد ارسال فرمادیں کرم ہوگا۔ کچھ اور کتابوں کی ضرورت ہے ان کے نام آئندہ لکھوں گا۔ محترم تابش صاحب اور دیگر احباب کی خدمات میں ہدیۂ تسلیم پیش ہے۔

[محمد احمد مصباحی غفرلہ، مبارک پور، ۲۱ جون ۱۹۸۷ء]

☆☆☆

مکتوب (۶) **مولانا عبدالحکیم شرف قادری**، لاہور..... تحیہ مسنونہ..... مزاج گرامی؟

"من عقائد اہل السنۃ" کی زیارت سے آنکھیں پرنور اور دل مسرور ہوئے۔ رب کریم اس فرض کی ادائیگی پر آپ کو اپنی بیکراں نعمتوں سے نوازے۔ زبان، حسن بیان، اختصار و وضوح، طرز استدلال، انداز ردّ وجواب بھی قابل ستائش ہے۔ اس کتاب کی تحریر واشاعت پر آپ کو اور آپ کے ادارہ کو مبارکباد پیش ہے۔ راقم نے "مرآۃ النجدیۃ" [از: مفتی محمد اختر رضا ازہری] پر لکھے ہوئے اپنے مقدمہ کی نقل ارسال خدمت کی تھی۔ قدرے ترمیم کے ساتھ وہ بھی شامل اشاعت ہو جاتی تو کار آمد ہو سکتی تھی، اس میں کچھ اصولی بحثیں اور دل چسپ تنقیدیں ہیں۔ اب مسئلہ اشاعت کا ہے میرا اندازہ ہے کہ "البریلویہ" ایک لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں چھپی ہے اور مفت تقسیم ہوئی۔ اس کے جواب میں جو کتاب ہے وہ دو لاکھ کی تعداد میں شائع ہو تو کسی طرح تلافی ہو سکتی ہے۔ جناب محمد سعید نوری [سکریٹری رضا اکیڈمی، ۲۶ کامبیکر اسٹریٹ، بمبئی ۳] کو بھی اس کے دو نسخے اشاعت کی ہدایت کے ساتھ ارسال کردیے جائیں، میں کوشش کروں گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع کرکے تقسیم کریں۔ جد الممتار ارسال کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ ان شاء المولیٰ تعالیٰ چند نسخے جلد ہی پہنچیں گے۔ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں ایک مفصل عریضہ ارسال کیا تھا جس میں اپنی بعض مصروفیتوں کی وجہ سے افسوس کے ساتھ تعمیل ارشاد سے معذرت لکھی تھی۔ امید کہ بلا ناگواریِ خاطر قبول فرمالیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں قریب میں کام ہوگا تو خبر گیری بھی ہوتی رہے گی اور اطمینان رہے گا۔ آج گرامی نامہ موصول ہوا ہے کہ کام شروع کرادیا گیا ہے۔ عربی اور انگریزی زبان میں زیادہ سے زیادہ کام ہونا ضروری ہے۔ ابھی یہ میدان تقریباً بالکل خالی ہے جس کے باعث گمنامی ہے اور نام پہنچا بھی تو ردّ وذم کے ساتھ، جس کا جواب اب دس سال کے بعد منظر عام پر آرہا ہے۔

پہلی کمی افراد کی ہے، دوسری روابط کی، تیسری وسائل اور وسائل کے صحیح استعمال کی۔ اب جو نوجوان اچھی طرح عربی لکھنے والے تیار ہو رہے ہیں انھیں اس طرف لگایا جائے۔ محض اِدھر اُدھر کی منفعت بخش ملازمتوں میں وہ گم ہو کر نہ رہ جائیں۔ کچھ دینی کام بھی کریں (اگرچہ معقول معاوضہ کے ساتھ کریں) تیسری کمی بھی محض ذکر کی حد تک ہے۔ اگرچہ اپنی کوئی حکومت نہیں، پھر بھی اہل سنت کے باثروت عوام دین کے لیے قربانی پیش کرنا جانتے ہیں، وہ اس طرف متوجہ کیے جائیں تو بہت کام ہو سکتا ہے۔ کام جب ہوگا تو روابط میں وسعت ان شاء المولیٰ تعالیٰ خود ہی آجائے گی۔ خط طویل ہوا، مبادا بارِ خاطر نہ ہو۔ احباب اور بزرگوں کی خدمات میں ہدیۂ سلام پیش ہے، خصوصاً مولانا تابش قصوری کی خدمت میں۔

والسلام [محمد احمد مصباحی

۶/ جون ۱۹۹۵ء]

☆☆☆

مکتوب (۷) **مولانا عبدالحکیم شرف قادری**، لاہور......... مکرمی..... سلام مسنون

"اندھیرے سے اجالے تک" آپ کا عظیم جماعتی اور علمی وتاریخی کارنامہ ہے جسے دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اس کتاب کی چند خصوصیات ہیں:

(۱) البریلویہ (از: احسان الٰہی ظہیر) کے ہر الزام کا جواب بسط وشرح سے پیش کیا گیا ہے۔

(۲) ہر موضوع سے متعلق امام احمد رضا کے حالات وخدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو بجائے خود ایک سوانحی خدمت ہے جس کی روشنی میں الزامات خود ہی تارِ عنکبوت کی طرح اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس طرح یہ کتاب ایک مثبت تحقیق کی بھی حامل ہے۔

(۳) البریلویہ کے افتراءات کا جواب بڑی ہی بردباری، علمی متانت، عقلی سنجیدگی اور حوالوں کی پختگی کے ساتھ دیا گیا ہے، میری نظر میں یہ آپ کے قلم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ورنہ ظہیر نے جس عیاری وبے باکی کے ساتھ حقائق کو مسخ کرنے اور شخصیت کی مکروہ تصویر بنانے کی ناروا کوشش کی ہے وہ امام احمد رضا کے ہر معتقد کو شعلہ بداماں بنانے کے لیے کافی ہے۔

سو سال بلکہ زیادہ عرصہ سے قادیانی، رافضی، نیچری، غیر مقلد، دیوبندی سبھی فرقے امام احمد رضا کے سخت مخالف ہیں، لیکن مخالفت، تعصب اور عناد کے باوجود امام احمد رضا کی فقہی مہارت، غیر معمولی ذہانت، قوتِ تحریر اور مختلف علوم وفنون میں کمال کے معترف رہے ہیں۔ لیکن احسان الٰہی ظہیر وہ پہلا شخص ہے جسے عناد وتعصب

میں اس مرتبۂ کمال تک ترقی ہوئی کہ امام احمد رضا کو "سیئ الحافظہ، غائب الدماغ" لکھا اور ان کی تصانیف کو ان کے متعلقین اور تلامذہ کا کارنامہ شمار کیا۔ آخر ان متعلقین اور تلامذہ نے امام احمد رضا کے بعد یا ان کی زندگی ہی میں کوئی ایک ہی کتاب ان کے معیار کی لکھی ہوتی، ان کے لیے کون سا مانع تھا؟ جب وہ خود اپنے نام سے اپنی کتابیں شائع کرتے ہیں تو وہ بلندیٔ فکر واستدلال نہیں ملتی جو امام احمد رضا کی کتابوں میں ہے۔

(۴) "اندھیرے سے اجالے تک" کے تمام حوالے انتہائی دیانت داری سے پیش کیے گئے ہیں اور جملہ مندرجات کے مآخذ موجود ہیں، جب کہ البریلویہ میں بغیر کسی حوالہ کے امام رضا کے ابتدائی استاد مرزا غلام قادر بیگ بریلوی کو قادیانی کا بھائی بنادیا ہے اور جگہ جگہ حوالے تو دیے ہیں لیکن عبارت بالکل مختلف ہے، اصل میں کچھ اور ہے اور البریلویۃ میں کچھ۔ خدا کا شکر ہے کہ اہلِ سنت کے پاس حقائق ہی حقائق ہیں جن کا اجالا پھیلتے ہی اندھیرا غائب ہوجاتا ہے اور معاندکی پر تعصب کاوشِ فکر وقلم خاک میں مل کر رہ جاتی ہے۔

(۵) آپ کی کتاب اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ استطراد سے خالی ہے اور ایجاز وحسنِ بیان سے آراستہ ہے، حوالے اور دلائل زیادہ ہیں اور بے ضرورت خامہ فرسائی بالکل نہیں۔

(۶) کتاب کی کتابت اور تصحیح بھی بہت عمدہ ہے۔ جب کہ اس زمانہ میں اکثر کتابیں اغلاطِ کتابت کی خاصی مقدار لیے ہوتی ہیں، غالبًا پروف پر آپ کی بھی نظر گزری ہے۔

آپ نے اہلِ سنّت کو ایک عظیم فرض کفایہ سے سبک دوش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رب کریم آپ کو ہم تمام سنیوں کی طرف سے اپنی شان کے لائق جزاؤں سے نوازے اور اس کتاب کے عربی ایڈیشن اور دیگر ابواب کی تکمیل کا سامان بھی احسن واکمل طور پر جلد فرمائے۔

[محمد احمد مصباحی بھیروی، فیض العلوم محمد آباد، گوہنہ، اعظم گڑھ، یوپی ۴ر ربیع النور ۱۴۰۶ھ/۱۸ نومبر ۱۹۸۵ء]

☆☆☆

مکتوب (۸) **مولانا عبدالحکیم شرف قادری**، لاہور... سلام مسنون.... مزاج گرامی؟

عرصہ سے کوئی خط نہ لکھ سکا، "شیشے کے گھر" وغیرہ کا پیکٹ موصول ہو گیا تھا، شکر گزار ہوں۔ "اندھیرے سے اجالے تک" کے عربی ترجمہ کی فرمائش میرے ذہن میں برابر رہی لیکن مبارک پور آنے کے ساتھ گھریلو پریشانیاں بھی کچھ اس طرح دامن گیر رہیں کہ قرار نہ ملا۔ جامعہ کے فاضل مولانا محمد اسحاق رامپوری اس طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن ضروری ہے کہ ان کو درج ذیل کتابیں فراہم کردی جائیں۔ (۱) البریلویۃ، (۲) مفاهيم يجب أن تصحح (۳) رد قادیانیت ورفض وغیرہ سے متعلق جو رسائل آپ کی تقدیم کے ساتھ

مرکزی مجلس رضا سے شائع ہوئے ہیں۔ (۴) شیشے کے گھر۔

امید کہ اول فرصت میں درج ذیل پتہ [مولانا محمد اسحاق رامپوری۔ دار العلوم علیمیہ جمداشاہی۔ بستی] پر مذکورہ کتب ارسال کرانے کی زحمت فرمائیں گے، مجلس رضا کو بھی موصوف نے بعض کتب کے لیے لکھا ہے اگر خط پہنچ گیا ہو تو سکریٹری صاحب سے ترسیل کی فرمائش کردیں۔ حضرت حکیم اہل سنت کو سلام مسنون عرض ہے۔ "ندائے یا رسول اللہ" وغیرہ کے بعد المجمع الاسلامی سے کوئی نئی کتاب شائع نہ ہوسکی۔ باغی ہندوستان، اسلامی اخلاق وآداب، الرحیل، بادۂ حجاز وغیرہ کی کتابت شدہ کاپیاں منتظر اشاعت ہیں۔ ماہنامہ اشرفیہ کی ادارت مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب نے ماہ جون ۸۶ء سنبھال لی ہے لیکن ان کا مستقل قیام "چریاکوٹ" ہی رہتا ہے۔ مولانا محمد منشا تابش قصوری صاحب کو ہدیۂ سلام پیش ہے۔ امید کہ آئندہ کچھ مفصل لکھوں گا، فی الحال اجازت دیں۔ شیخ محمد یوسف ہاشم الرفاعی کی کتاب کا آپ نے تذکرہ کیا تھا ان کی عربی کتاب کس پتہ سے دستیاب ہوسکتی ہے؟ میں بھی خریدنا چاہتا ہوں۔ والسلام [محمد احمد مصباحی، اشرفیہ، مبارک پور، ۱۳ ستمبر ۱۹۸۶ء]

☆☆☆

مکتوب (۹) **مولانا عبدالحکیم شرف قادری**، لاہور...... سلام مسنون..... مزاج گرامی؟

آپ کی مرسلہ کتب "مفاہیم یجب أن تصحح، البریلویۃ، رسائل رضویہ" وغیرہ موصول ہوگئیں، میں بہت شرمندہ ہوں کہ اطلاع بھی نہ بھیج سکا۔ اس سے قبل غالبًا آپ کے ایما پر مرکزی مجلس رضا سے "الرد المحکم المنیع"، شیشے کے گھر، اندھیرے سے اجالے تک، رسائل رضویہ موصول ہوئے تھے اس کی بھی اطلاع نہ دے سکا۔

المجمع الاسلامی سے نومبر میں "مقامع الحدید علی خد المنطق الجدید" پہلی بار منظر عام پر آئی ہے۔ عرفی نام "فلسفہ اور اسلام" ہے۔ اسلامی اخلاق وآداب کے نام سے بہار شریعت کے حصہ شانزدہم کی تجدید ہوئی ہے۔ یہ کتابیں جلد ہی آپ کے پتہ پر جائیں گی۔ ادھر محصول ڈاک میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن مقامی ڈاک خانہ سے تفصیل معلوم نہیں ہو پارہی ہے اس لیے سخت پریشانی ہے۔ آگے سے معلوم کرنے کی کوشش ہے تاکہ جلد تر آپ حضرات کی خدمات میں ترسیل تحائف ہوسکے۔

"مفاهيم يجب ان تصحح" کا ترجمہ سنا تھا کہ کوئی صاحب علم پاکستان میں کررہے ہیں، جو نئی کتابیں منظر عام پر آئی ہوں باخبر فرمائیں تو نوازش ہوگی۔ اندھیرے اجالے کا ترجمہ مکمل ہوگیا ہے مترجم نظر ثانی کرتے ہوئے قسط وار میرے پاس بھیجنے والے ہیں۔ آج ۳۰ صفحات آئے ہیں۔ مولانا تابش قصوری صاحب کو سلام عرض ہے۔ مرکزی مجلس رضا کا خط صدر محترم حضرت حکیم اہل سنت کو یا سکریٹری صاحب کے پاس کسی کے ہاتھ ایک دو

دن میں بھیج دیں تو نوازش ہوگی۔ کچھ کتابیں مجلس کے لیے ارسال کرنا ضروری ہے۔ خاطر خواہ کوئی تحفہ نظر نہیں آتا، عجب پریشانی ہے۔ والسلام [محمد احمد مصباحی، ۲ دسمبر ۱۹۸۶ء]

☆☆☆

محترمی **حکیم محمد موسیٰ امرتسری** ..... زیدت عنایتکم...... سلام مسنون..... مزاج گرامی؟

"الرد المحکم المنیع" کے ساتھ مجلس رضا لاہور کی چند کتابیں جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے پتہ پر راقم سطور کو دستیاب ہوئیں۔ اطلاع میں غیر معمولی تاخیر ہوئی جس پر معذرت خواہ ہوں۔ غالباً ۴۲ روپے کے ٹکٹ اس پیکٹ پر لگ گئے تھے۔ وزن کے لحاظ سے مجھے کچھ زیادہ محسوس ہوئے۔ میں بہت جلد مجلس کے لیے کچھ کتابیں ارسال کرنا چاہتا تھا، جو کم از کم ڈاک خرچ کی تلافی کر سکیں۔ لیکن دیر ہوتی جا رہی ہے۔ کرم الٰہی شامل حال ہوا تو جلد ہی مولانا شرف قادری مد ظلہ کے ذریعہ آپ کو "فلسفہ اور اسلام" (مقامع الحدید علی خد المنطق الجدید) اور "اسلامی اخلاق و آداب" وغیرہ موصول ہوں گی۔ امید کہ مزاج عالی بعافیت ہوگا۔ والسلام

[محمد احمد مصباحی غفرلہ، ۲ دسمبر ۱۹۸۶ء]

☆☆☆

سراپا سعادت و عنایت **پروفیسر مسعود احمد نقش بندی** [کراچی]... دام فضلکم.... تحیۂ مسنونہ

والا نامہ محررہ ۱۶ر فروری ۱۹۸۴ء پیش نظر ہے۔ (۱) جد الممتار اول (۲) نور و نار (۳) اجالا (۴) حقوق والدین و اولاد (۵) امام احمد رضا کے ایمان افروز وصایا (۶) جشن میلاد النبی ﷺ (۷) تعارفِ امام احمد رضا (۸) دعوتِ فکر، طبع دہلی ارسال خدمت ہیں۔ دو تین کتابیں سید ریاست علی صاحب کے نام لکھ دی ہیں۔ کسی ذریعہ سے ان تک پہنچ جائیں یا ان کو اطلاع ہو جائے تو کرم ہوگا۔ ان کی مرسلہ کتب و حواشی تا دم تحریر وصول نہیں ہوئیں۔ ایک جد الممتار جس پر کسی کا نام درج نہیں وہ بھی انھی کو دے دیں تو بہتر ہے یا کوئی اور لینے پر مُصر ہو تو اس کی قیمت ہی ان تک پہنچ جائے۔ وعدہ کر چکا ہوں کہ حواشی کی ترسیل و نقل کے اخراجات خود ادا کروں گا۔ اس لیے ابھی سے تدبیر کر رہا ہوں۔ ان کا حساب دیکھنے کے بعد بقیہ کے لیے کوئی صورت ہوگی ان شاء المولیٰ تعالیٰ۔

اجالا، معارف رضا ۱۹۸۳ء، امام احمد رضا اور عالم اسلام کے ایک ایک نسخے مولانا شرف قادری مد ظلہ کی عنایت سے مل گئے تھے، غالباً پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ مؤخر الذکر مقالہ سے متعلق بھیونڈی خبر بھیج رہا ہوں۔ ان کی طرف سے اشاعت مقالات کے متعلق کوئی خبر استفسارات کے باوجود نہ آئی، اس لیے مذکورہ مقالہ اب تک نہ بھیج سکا۔ معلوم نہیں کیا ہو رہا ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن انصاری کے مقالۂ قرآن سے متعلق پہلے آپ نے جو کچھ لکھا تھا وہ میرے لیے باعث تحیر بنا، اسی لیے اپنی سی کوشش اس کے حصول کے لیے کر ڈالی، جو ماخذ آپ نے بتائے تھے وہ سب میں دیکھ چکا ہوں، اس لیے مزید حیرت ہوئی کہ مولانا نے کس ترکیب سے وہ نتائج اخذ کیے۔ ابن حزم کا صرف القول الفصل میں (تمام روایات و شواہد کے خلاف) عہد فاروقی میں ہزاروں مصاحف کا نشر ہو جانا بتانا چنداں قابل التفات نہیں۔ اگر اس کا کوئی ماخذ معتبر ہو تو صحاح سے اعلیٰ نہ ہوگا۔ بہر حال مسلمان کو اس تردید کی بھی کیا ضرورت ہے؟ ان کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ قرآن کی تدوین تورات و انجیل کی طرح بعد میں نہ ہوئی بلکہ پہلے ہی سے ہو چکی تھی۔ جزئیات..... میں انھوں نے افراط سے کام لیا اسی سے اختلاف ہو سکتا ہے۔

بعض مصروفیات کے باعث اس موضوع پر باضابطہ کوشش نہ کر سکا۔ اب ارادہ کر رہا ہوں کہ کچھ محنت کے بعد آپ کو خط لکھوں، تاکہ کارآمد بھی ہو مگر آپ کی دعاے مستجابت شرط ہے۔ وماذلک علیہ تعالیٰ بعزیز۔

اجالا میں ایک صفحہ آپ سے متعلق بھی لکھا تھا مگر اس کی کتابت جس وقت ہو رہی تھی مجھے سخت الجھنیں درپیش تھیں جن کے باعث یہ سوچ لیا کہ اصل کتاب کسی طرح چھپ جائے، دوسری کمی کو پروفیسر صاحب کی محبت و عنایت اور عالی ظرفی معاف کر دے گی اگرچہ ناظرین نہ معاف کریں۔

نور و نار پر جس تقریب کا تذکرہ کیا تھا یہاں کی اشاعت میں شامل نہ ہو سکی، آپ کے پاس بھیج رہا ہوں شاید کہ مصرف میں آ جائے اگر مناسب ہو۔ ورنہ بے کار تو یہاں بھی ہے۔ حسب سابق آج بھی آپ کا وقت عزیز زیادہ لے لیا، کتابوں کے متعلق تاثرات کا انتظار رہے گا اور دیگر معروضات کا ہمہ وقت اشتیاق۔ السلام علیکم وعلیٰ من لدیکم۔

محمد احمد مصباحی

فیض العلوم محمد آباد گوہنہ اعظم گڑھ (یوپی)

۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ - ۷ر مارچ ۱۹۸۳ء شب پنج شنبہ

☆☆☆

برادر محترم **مولانا بدر القادری** .... سلام مسنون ...... مزاج گرامی؟

عرصہ سے آپ کا خط نہ ملا، نہ ہی میں خود کچھ لکھ سکا، میری معذوری تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ خدا کرے آپ کسی الجھن اور پریشانی کا شکار نہ ہوں۔ فکر لگی رہتی ہے کہ مفسدوں سے کوئی گزند نہ پہنچے۔ نعمانی صاحب نے آپ کا خط بنام سربراہ اعلیٰ صاحب میرے حوالے کیا تھا کہ میں ان کو دے دوں۔ پڑھا تو اس میں میرے اور علامہ کے نام کی تصریح مناسب نہ معلوم ہوئی اس لیے ایک طویل عریضہ کے ساتھ آپ کو واپس کر دیا تھا۔ اندیشہ ہوا کہ یہ واپس کرنا

بارِ خاطر نہ گزرے مگریہی اُس وقت مناسب سمجھ میں آیا۔ اگر کوئی تکدر ہو تو معاف فرمادیں گے۔

امسال مولانا یسین اختر مصباحی صاحب عرس حافظ ملت میں شریک ہوئے تھے۔ آپ کے حساب سے دو ہزار روپے آ گئے ہیں اور مزید کی امید دلائی ہے اور خوش حالی و کامیابی کا بھی ذکر کیا۔ خدا کرے وہ جلد سے جلد سبکدوش ہوں۔ بحمدہ تعالیٰ "حجاز" کی مقبولیت بڑھ رہی ہے جس میں مولانا کی فکری صلاحیت، عملی ذوق اور حسن انتخاب کا زیادہ دخل ہے۔ آپ کا مضمون "فقیہ عصر علامہ امجدی" بہت پسند آیا۔ ایک ضروری اقدام آپ نے کیا۔ اپنے اکابر اور بزرگوں کو ان کی زندگی ہی میں پہچاننا، اور پہچان کرانا ضروری ہے اس سلسلہ میں یہ فکر بھی نہیں کرنی چاہیے کہ جب کوئی اعلی حضرت جیسا عبقری، صدر الشریعہ جیسا فقیہ، مفتی اعظم جیسا مرشد و متقی، مجاہد ملت جیسا پر عزم، حافظ ملت جیسا معمار اور محدث پاکستان جیسا قد آور ہو جبھی اس کو قابل اعتنا سمجھا جائے۔

ہر دور کے لحاظ سے اس دور کے اکابر کی حیثیت متعین ہوتی ہے اور جو واقعی کمالات ہوں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ نہ اس طرح کہ اصاغر پر ان کا تفوق ثابت ہی نہ ہو سکے اور نہ ہی اس طرح کہ قدیم اکابر کے ہم پلہ دکھایا جائے۔ یہ بر سبیل تذکرہ لکھ گیا۔ بفضلہ تعالیٰ آپ کی نگارش میں یہ ساری باتیں ملحوظ ہیں۔ فتاوی امجدیہ کے تحشیہ و تعلیق کا ذکر بھی شامل کرلیں۔ مبارک پور میں حافظ ملت کی آمد، مفتی صاحب کے داخلہ، ان کی فراغت، ان کے بڑے صاحبزادہ (وفات یافتہ) کے نام میں غالباً کتابت یا طباعت کا کچھ سہو ہو گیا ہے۔ اگر مسودہ میں بھی ایسا ہی ہو تو مفتی صاحب سے استصواب کرکے بنالیں گے۔

مولوی مبارک حسین سلمہ نے آپ کا حالیہ کرم نامہ دکھایا تھا۔ بہت مناسب اور ضروری مشوروں سے آپ نے نوازا ہے۔ ایک دو بات میرے ذہن میں بھی تھی اور چریاکوٹ کی ملاقات میں آپ سے عرض بھی کیا تھا۔ لیکن آپ نے زیادہ جوانب کا احاطہ کرتے ہوئے ہدایات دی ہیں۔ خدا کرے ان پر مکمل عمل ہو۔ دشواری یہ ہے کہ ادارہ تحقیقات عرس کمیٹی کے تحت ہے اور عرس کمیٹی مولانا نصیر الدین صاحب کے تحت ہے، انھیں اس راہ کے سفر اور اس کی دشواریوں کا تجربہ نہیں، نہ ہی خاطر خواہ ذوق و حوصلہ۔ پھر وہ اخراجات میں بڑی تحقیق و تفتیش اور کفایت شعاری کے پابند ہیں جو مالیات کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ مگر ضروریات کی تکمیل میں حائل ہو جائے تو مضر ہو جاتا ہے۔ بہر حال کام میں جو مستعدی اور تیزی ہونی چاہیے اس کی توقع نہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مولوی مبارک وغیرہ زیر تعلیم ہیں۔ فرصت ملنے ہی پر کچھ کر سکیں گے، تجربات بھی کم ہیں۔ مجھ سے جو ہو سکتا ہے دریافت کرنے پر بتاتا اور سکھاتا رہتا ہوں۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہے کہ جو بات انھیں طویل تجربہ اور سالہا سال گذارنے کے بعد دریافت ہوتی آغاز کار سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی ہے اور اس کی روشنی میں موثر اور

مناسب پیش قدمی پر کاربند ہوتے ہیں۔ کاش وہ اور ان کے شعبہ کے بالادست حضرات اس فائدہ کی قدر کر سکیں۔ میں تو قدر دانی اور ناقدری کے اندیشہ سے بالاتر ہو کر ہی نیک عمل میں تعاون کا عادی ہوں۔ والحمد للہ الذی یوفق لکل خیر ویجزی کل محسن ومخلص وکفی بہ ھادیا وولیا ونصیراً۔

المجمع الاسلامی کے تحت تصنیفی کام کا بامعاوضہ آغاز عرصہ سے ٹلتا جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں دو تین زحمتیں حائل ہیں: (۱) تقریباً ایک ہزار روپیہ ماہانہ بدل خدمت کا انتظام ایک مصنف کے لیے (۲) لائبریری کا انتظام (۳) رہائش گاہ اور خوراک کا انتظام۔ مگر اب میرا خیال یہ ہے کہ جس حالت میں ہم ہیں اسی حالت میں آغاز ہو جانا چاہیے، اس سے دوسروں کو بھی راہ ملے گی اور قلم کی قیمت کا (پس ماندہ ماحول میں) احساس بھی بیدار ہوگا۔ ایسے دوسرے ادارے بھی قائم ہو سکیں گے۔ (۲)(۳) کا انتظام اشرفیہ، فیض العلوم، قادریہ چریاکوٹ سے بعوض یا بلا عوض رابطہ و تعاون کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ البتہ ماہانہ بدل خدمت کا مناسب انتظام بہر حال المجمع الاسلامی کے ذمہ ہی عائد ہوگا۔ کتابوں کی آمدنی ابھی اتنی نہیں کہ ادارہ پر یہ بار ڈالا جا سکے اور ایسے معاونین بھی نہیں جو یہ بار اٹھا سکیں۔ نہ ہی تعاون لینے اور مالیات کی فراہمی کا ہی بندوبست ہے، لیکن کرنا ضروری ہے اس لیے آپ بھی اس سلسلہ میں غور کریں اور میں بھی کئی ماہ سے غور کر رہا ہوں۔ ان شاء المولیٰ تعالیٰ آئندہ شوال سے اس کا آغاز ہو جانا ہے۔ اگر آپ کی رائے اس کے برخلاف ہو تو بھی مطلع فرمائیں۔

امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت کو عالم عرب میں متعارف کرانے کے لیے ایک مثبت مؤثر اور جامع کتاب کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کام مولانا عارف اللہ فیضی صاحب نے شروع کردیا ہے، دعا فرمائیں۔ جد الممتار ثانی کی اشاعت کا آپ نے خیال بھی ظاہر کیا تھا، اب آپ کا ارادہ اور احوال کیا ہیں؟ خدا نے چاہا تو وہ چند ماہ بعد پریس کے حوالے کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ استاذ گرامی مولانا عبد الرؤف بلیاوی قدس سرہٗ کی حیات بقلم مولانا قمر الحسن بستوی عرس حافظ ملت قدس سرہٗ موقع پر شائع ہو جانی تھی، مگر کچھ مالیات کی کمی اور زیادہ میری سستی کی وجہ سے رہ گئی۔ چند صفحات کا میں اضافہ کر رہا ہوں، ان شاء المولیٰ تعالیٰ رواں سال ہجری کے شوال تک منظر عام پر آجائے گی۔ مزید لکھنے کی جگہ ختم ہو گئی اس لیے انتظار جواب کے ساتھ عریضہ یہیں ختم کرتا ہوں۔ خدا کرے آپ مع متعلقین بعافیت و مسرت رہ کر جلد جوابات سے نوازیں۔

والسلام .... [محمد احمد مصباحی، محمد آباد، یکم فروری ۱۹۹۰ء]

☆☆☆

حضرۃ الشیخ عبدالحمید محمد سالم قادری حفظہ اللہ تعالیٰ ـــــــــــ تحیہ مسنونہ

جو بھی دنیا میں آیا ہے اُسے یہاں سے جانا ہے مگر کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بندہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ الٰہی! کیا سے کیا ہوگیا۔ عزیز گرامی مولانا اُسید الحق محمد عاصم قادری کا ناگہانی سانحہ ایسا ہی ہے۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کا علمی شغف، سنجیدہ فکر اور متوازن سلوک آقران اور اصاغر و اکابر کے درمیان معروف تھا۔ جامعہ ازہر سے واپسی کے بعد تعلیم و تبلیغ، تصنیف واشاعت، حسن تنظیم وانتظام وغیرہ میں ان کے انہماک کے ثمرات بڑے حوصلہ افزا تھے۔ سبھی مخلصین کو ان کی ذات سے طویل عرصے تک ہمہ جہت اور دوررَس خدمات کی امیدیں وابستہ تھیں مگر ان کی ناگہانی رحلت کے باعث سبھی سخت غم زدہ اور بالکل نااُمید ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجعون۔

پھر بھی یہ سوچ کر دل کو کچھ تسلّی ہوتی ہے کہ عموماً لوگ جتنا کام ایک لمبی عمر میں کر پاتے ہیں آں عزیز نے تقریباً دس سال میں کر لیے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے شہادت کی موت پائی جس کی آرزو ہزار ہا ہزار افراد ہزار بار کرتے ہیں مگر وہ ان کا مقدر نہیں ہوتی۔ تیسرے یہ کہ انھیں سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جوار کرم ملا جو صرف اپنی تمنا اور سعی وتدبیر سے نہیں ملتا جب تک حسنِ قسمت کی یاوری نہ ہو۔ اس موقع سے محدث اعظم حضرت مولانا سید محمد کچھوچھوی علیہ الرحمہ کا شعر بار بار یاد آتا ہے:

موت آئے تو درِ پاک نبی پر سیّد ۔۔۔ ورنہ تھوڑی سی زمیں ہو شہِ سمناں کے قریب

شہِ جیلاں کا مقام و مرتبہ شہِ سمناں اور بیش تر اولیائے قبل وبعد سے بلانزاع بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ ان کا قرب اگر ہزار دعا والتجا کے بعد بھی ملے تو نصیبے کی ارجمندی میں کلام نہیں مگر آں موصوف کو شاید یہ قرب بے التجا، بعطائے خاص نصیب ہوا، فیالہ مِن نصیب!

سانحہ بہت عظیم ہے اور والدین، اعزہ واقربا، اہل سلسلہ اور اہل محبت کے لیے غم والم کا کوہ گراں، مگر رب تعالیٰ نے اپنے کرم سے اس حادثے میں غم والم کے ساتھ کچھ صبر وشکر کا بھی سامان پیدا فرما دیا ہے اس لیے امید ہے کہ سبھی حضرات مرضی مولا پر راضی ہو کر اپنی عالی ہمتی اور کمال بندگی کا ثبوت دیں گے۔

والسلام مع توکید تعزیت واکرام

[محمد احمد مصباحی، ۲۲ر مارچ ۲۰۱۴ء]

☆☆☆

مکتوب (۱) بنام **مفتی عبیدالرحمن رشیدی** [سابق شیخ الحدیث دارالعلوم اہل سنت شمس العلوم، گھوسی]

سنیچر کو ابرار حسین سلمہ کے ذریعہ آپ کی (گھوسی) آمد اور والد صاحب قبلہ کی رحلت کی خبر سنی۔ یہ حادثہ فاجعہ کسی وقت ہونا ہی تھا، اگرچہ ان کی بقا ہمارے لیے بہت سے فوائد وعوائد کا سبب ہوتی، مگر لارادّ لقضائہ، فصبرٌ جمیل۔ گھر کے حالات دگرگوں ہوں گے، جنھیں سنبھالنے میں آپ کو بڑی زحمتیں پیش آئی ہوں گی۔ آئندہ کیا ہوتا ہے معلوم

نہیں۔ ان سوالات سے تسکین اور تعزیت کے لیے شنبہ ہی کو حاضری کا ارادہ تھا، مگر آج کل بعض مصروفیات بہت سے ضروری کاموں میں حارج بن رہی ہیں، دیکھیے کب تک آپاتا ہوں۔ آج بھی کوئی امید نہیں۔ والسلام۔

محمد احمد اعظمی مصباحی

[فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ، اعظم گڑھ]

۱۱ر اپریل ۱۹۸۳ء

☆☆☆

مکتوب (۲) بنام **مفتی عبیدالرحمن رشیدی** [سابق شیخ الحدیث دارالعلوم اہل سنت شمس العلوم، گھوسی]

۱۳ر فروری ۱۹۸۵ء کو کرم نامہ اسی نشست میں موصول ہوا، ہوسکتا ہے جواب سے پہلے ملاقات ہی نصیب ہو جائے۔ عرس حافظ ملت کی معین تاریخ سلخ جمادی الاولیٰ، غرہ جمادی الآخرہ ہے۔ امسال ۲۱/ ۲۲ر فروری جمعرات، جمعہ کو ہے۔

تاریخ نجد و حجاز سال گزشتہ میرے پاس آئی تھی، کوشش کر کے طبع بھی کرائی گئی۔ شعبان میں یہاں سوا سو نسخے دہلی سے طبع ہو کر آ گئے تھے، چند نسخے میرے پاس رہ گئے ہیں، ناشر کا پتہ یہ ہے: فضل احمد نوری، نوری اکیڈمی، چلکہر، بلیا۔ یہ مولوی اعجاز حسین مالک اعجاز بک ڈپو کا فرزند ہے، ..... خیر کسی طرح یہ کتاب اور سنی بہشتی زیور بڑی آب وتاب سے شائع کرائی گئی۔

"امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات" کئی برس سے کتابت شدہ رکھی ہے بیس ہزار کا خرچ صرف ایک ہزار طبع کرانے میں لگتا ہے، کسی طرح انتظام ہوا تو اب زیر طبع ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ عرس عزیزی تک آ جائے گی۔ "تنزیہ المکانۃ الحیدریہ" بھی بعد تحشیہ وتحقیق وترجمہ بنام "براءت علی از شرک جاہلی" ساتھ ہی چھپنے گئی ہے۔ وہ بھی آ جانی چاہیے۔ "باغی ہندوستان" پر مؤلف نے نظر ثانی کر کے کافی حذف وترمیم واضافہ کیا تھا، میرے پاس پہنچی تو چند صفحاتِ ترمیم میں نے بھی بھیجے جو مؤلف نے قبول کرتے ہوئے ۱۶ر فروری ۱۹۸۴ء کو مجھے خط لکھا اور ۱۸ر فروری کو علی گڑھ ہی میں راہی ملک دارِ بقا ہوگئے۔ ان کے ہم درس مفتی نجم الحسن خیر آبادی..... سے جلد تر اشاعت کے لیے جارہی ہے۔ زیر کتابت ہے۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے متعدد رسائل کتابت شدہ ہیں، مولانا بدرالقادری نے اپنے دو مجموعہ کلام "بادۂ حجاز" (ارمغان نعت) اور "الرحیل" (مجموعہ نظم وغزل) کتابت کرا کے المجمع کے حوالے کیا ہے اور دو تہائی خرچ

بھی بطور تعاون دینے والے ہیں اس لیے اس کی طباعت بھی جلد عمل میں آنی چاہیے۔ ایک صاحب **صوفی محمد اکرم**
لاہور کے ہیں، ایک کتاب "صحابہ کا عشق رسول" مرتب کر کے مع صرفۂ طباعت ہمارے حوالے کر چکے ہیں جس
کی ترتیب جدید، تصحیح، اضافہ، ترمیم پر کافی محنت کر کے قابل اشاعت بنایا گیا ہے، موضوع اچھا اور مؤثر ہے اور اب
کافی مفید ہو گیا ہے، اس لیے یہ سب عن قریب زیر طبع بدعاے احباب آئیں گی۔ علاوہ ازیں خرید شدہ زمین کی تعمیر
کا اہم مسئلہ ہے جس کے لیے تا حال کوئی حرکت عمل میں نہ آسکی۔ رب کریم مدد فرمائے، والسلام۔

محمد احمد مصباحی

۱۹؍ فروری ۱۹۸۵ء

☆☆☆

مکتوب (۳) بنام **مفتی عبید الرحمن رشیدی** [سابق شیخ الحدیث دار العلوم اہل سنت شمس العلوم، گھوسی]

میں آپ کو خط بھیجنے ہی والا تھا کہ ۳۰؍ اکتوبر کو بنارس کی میٹنگ میں آپ کو ضرور تشریف لانا ہے، جب تک
آپ کا کرم نامہ موصول ہوا، یہ میٹنگ صرف شرعی بورڈ کے منتخب ممبران ہی کی تو ہے۔
مولانا قادری صاحب سیوان کانفرنس میں منہمک نہ ہوتے تو امید تھی باضابطہ ایک دعوت نامہ یا یاددہانی کا
خط لکھتے۔ سیوان کانفرنس میں انھوں نے یوں ہی کافی مسائل رکھ دیے ہیں۔ پھر وہ ایک پر ہجوم اجتماع ہوگا، اس
میں ان اہم مسائل پر سنجیدہ بحث و مباحثہ کی گنجائش کہاں نکل پائے گی، یہ تو بنارس ہی میں سکون واطمینان سے
۲۹ ممبران طے کر سکیں گے۔ البتہ سیوان کانفرنس کے اجتماع سے منظوری لینا بہتر ہے کہ شرعی بورڈ کا فیصلہ ہم
سب کو قبول ہوگا، جیسا کہ انھوں نے دعوت نامہ کانفرنس میں تحریر کیا ہے۔ سیوان کانفرنس کے لیے ۱۵؍ مسائل
مولانا نے رکھے ہیں، وہ بھی اہم اور دیر طلب ہیں، دعوت نامہ امید ہے کہ آپ کو بھی بھیجا ہوگا، ڈاک کی گڑبڑی سے
ممکن ہے نہ پہنچا ہو۔ یا اب ملا ہو۔
ایک بات یہ بھی لکھنے والا تھا کہ فرصت ملنے پر اپنی عظیم کتاب "اختیار نبوت" پر نظر ثانی کر کے اغلاطِ کتابت
درست کر دیں اور ہو سکے تو تقریر و تفہیم کو ذرا اسہل بھی بنا دیں۔ پھر مسودہ راقم کے پاس بھیجیں کسی کتب خانہ کو متوجہ کیا
جائے کہ اس کی اچھی کتابت اور عمدہ تصحیح کرا کے دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کرائے۔
مبارک پور میں ممبران کے انتخاب کی بات آئی تو سب سے پہلے آپ کا نام پیش کیا۔ اسی لیے مجھے یہ فکر تھی کہ آپ
کا فتویٰ اور آپ کی شرکت وہاں ضرور ہو۔ فتویٰ بھیج دینے کی اطلاع سے خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ میٹنگ میں شرکت بھی
ہوگی۔ کاش اہم جماعتی مصارف کے لیے ہر جگہ کوئی انجمن ہوتی اور اس کا مخصوص فنڈ ہوتا تو علماے کرام کو آسانی ہوتی۔

عید کے موقع پر رویت ہلال کی تفتیش کے لیے اِدھر، اُدھر جانا یا بھیجنا ہو تو مصارف کا سوال سامنے آجاتا ہے اور پریشانی
ہوتی ہے۔ اسی طرح دور دراز سے مفتیان کرام کو بنارس میٹنگ میں پہنچنا ہو تو بھی مصارف کا مسئلہ ہے۔ مدارس طلبہ اور
تعلیم کے اخراجات کے سوا کا اپنے کو ذمہ دار نہیں سمجھتے جب کہ عموماً علاقہ کے جملہ ملی و دینی مسائل میں عوام مدارس کو ہی
اپنا نمائندہ و مرجع سمجھتے ہیں۔ خدا کرے آپ کا مزاج بعافیت ہو، حاضرین مجلس کو سلام مسنون پیش ہے۔

محمد احمد مصباحی غفرلہ

[فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ، ضلع اعظم گڑھ، یوپی]

۱۵؍ اکتوبر ۱۹۸۵ء

مکتوب (۴) بنام **مفتی عبید الرحمن رشیدی** [سابق شیخ الحدیث دار العلوم اہل سنت شمس العلوم، گھوسی]

کرم نامہ نظر افروز ہوا، خبیب رضا نے بتایا کہ فتاویٰ رضویہ غیر مجلد لینے کے بعد ۴۲ روپے بچے ہیں۔ میں
نے کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی جانے والا ہو تو تذکرۃ الاولیا اور باغی ہندوستان مجھ سے لے کر بھیج دینا، حساب بعد میں ہو
جائے گا۔ دار الافتا سے تعلق کی آپ کچھ تفصیلات لکھتے تو ان کی روشنی میں کچھ بات آگے بڑھائی جاتی، گورکھپور میں
کیا اشارہ ملا اور اب کیا خیال ہے؟ ایک بات تو ظاہر ہو گئی تھی کہ یہاں حاضری کی پابندی رہے گی اور رخصتیں
مدرسین کی طرح ملتی رہیں گی۔ دوسری بات بدلِ خدمت کی رہ جاتی ہے، یہ تو آپ کی طرف سے آمادگی اور کچھ
اندازہ بتانے کے بعد ہی صاف ہوگی۔ حضرت مفتی محمد شریف الحق صاحب کو چودہ سو روپے ادارہ پیش کرتا ہے، وہ
دس دن قبل تشریف لا چکے ہیں۔ تیسری بات تحدید کار کی ہے، وہ تو عین وقت پر یا کام شروع ہونے کے بعد آپ،
مفتی صاحب، مولانا نظام الدین صاحب اور عزیز ملت مل کر ہی متعین کر سکتے ہیں۔
چمنی بازار کی پیش کش کا کیا ہوا؟ اور شمس العلوم سے متعلق کیا ارادہ ہے؟ جہاں تک سہولت و مراعات کا تعلق
ہے وہ غالباً چمنی بازار اور شمس العلوم سے زیادہ حاصل ہو سکتی ہیں، اعزاز بھی زیادہ ہی ہوگا، یہاں کی بات دگر
ہے۔ بس یہ ہے کہ مرکزی اور مشہور ادارہ ہے، بیرونی حضرات اس کے متعلقین کی قدر کرتے ہیں، دار الافتا کی
مرجعیت بھی غالباً بریلی شریف کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ رہا معاملہ تدریس کی شمولیت کا، میرا اندازہ ہے کہ اب
اسے پسند نہیں کریں گے، کیوں کہ دو حضرات کو تدریس بھی سپرد تھی، مگر اس کا نتیجہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ تدریس
کو اصلی اور افتا کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں، اول کے لیے خارج اوقات میں بھی مطالعہ کرتے ہیں اور ثانی کے لیے
مقررہ گھنٹیوں سے زیادہ کچھ کرنے کے روادار نہیں۔ اس میں بھی کام کی کوئی منضبط تحدید ممکن نہیں، اس لیے کافی
قلتِ کار کا تجربہ یا اندازہ سامنے آرہا ہے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ صرف دار الافتا کے لیے خدمات حاصل کی جائیں تاکہ
اس کا کام زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد آپ جیسا فرمائیں بات کی جائے۔ ابھی اپنے

طور پر میں کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ جواب کا انتظار رہے گا، والسلام

محمد احمد مصباحی

[۲۷ر شوال المکرم ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۵ر جون ۱۹۸۷ء]

☆☆☆

مخدومانِ گرامی (**خانقاہ عالیہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ**) زیدت أفضالکم و زالت أحزانکم

السلام علیکم و رحمة الله و برکاته

حضرت والدۂ مخدومہ کا سایہ اٹھ جانا بڑے ہی رنج والم کا باعث ہے اس کا احساس فرزندوں کو جس قدر ہو گا دوسرے اس کا اندازہ کما حقہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر آنے والا اپنے جانے کا بھی ایک مقررہ وقت لے کر آیا ہے جسے ہم جانیں یا نہ جانیں مگر وہ کسی نہ کسی دن رونما ضرور ہوتا ہے۔ و ذلک تقدیر العزیز العلیم. و لن تجد لسُنّة الله تبدیلاً.

اقارب، اعزّہ اور اہل تعلق کے دل غم زدہ، آنکھیں اشک بار، پلکیں نم ناک اور چہرے افسردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وقت مقرر سے ناآشنا انسانوں کے فطری اُنس کا ظہور ہے اور وہ عزیز علیم کی تقدیر غالب کا قہر و تسلّط۔ خالق و مالک وہی ہے، حکومت اسی کی، فیصلہ اُسی کا۔ بندوں کے لیے صبر و رضا کے سوا چارہ کیا ہے؟ اسی میں اجر ہے اور اسی سے درجات کی بلندی۔

نا اہلی کے باوجود یہ چند سطریں زیر قلم آگئیں مگر اس اندیشے کے ساتھ کہ سورج کو چراغ دِکھانا کہیں فرد جرم نہ بنے یا دفتر سفاہت میں ایک عدد کا اضافہ نہ ہو۔

وقت کی قلّت، موسم سرما کی شدّت، ذرائع کی دشواری اور اپنی کمزوری کے باعث شرکت جنازہ سے محرومی رہی، جس پر افسوس ہمیشہ رہے گا اور ندامت بھی۔

ربّ کریم والدۂ مخدومہ کو اپنی رضا و عطا اور قرب خاص سے نوازے، پس ماندگان کو صبر و اجر سے بہرۂ وافر مرحمت فرمائے اور اُن کا سایۂ کرم صحت و نعمت و عافیت کے ساتھ تمام وابستگانِ بارگاہ پر دراز سے دراز تر فرمائے۔ آمین یا أکرم الأکرمین بجاه حبیبك النجیب الأمین و رسولک الأشرف الأفضل المتین، صلّ و سلّم علیه و آله و صحبه و تابعیه إلی یوم الدین.

یکے از حزیناں، بندۂ بارگاہ

محمد احمد مصباحی

۳ر صفـــر ۱۴۳۲ / ۹ر جنوری ۲۰۱۱ء

مکتوب (۱) محترمی **مولانا منشا تابش قصوری** .... زید کرمکم ...... سلام مسنون .... مزاج گرامی؟

"امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات" کا پیکٹ چند دنوں پہلے حضرت علامہ شرف قادری مد ظلہ کے نام ارسال ہوا ہے۔ غالباً ایک نسخہ آپ کا بھی ہے۔ تاثرات سے آگاہ فرمائیں تو نوازش ہوگی۔ خصوصاً حکیم موسیٰ صاحب سے مولانا شرف صاحب کچھ تحریر کرالیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ امید ہے کہ حضرت شرف صاحب بھی کتاب کا مطالعہ کریں گے اور کچھ نقد و تبصرہ سے بھی ضرور شاد کام فرمائیں گے۔ مولانا یٰسین اختر صاحب بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے بیس پچیس نسخے لاہور ارسال کرکے وہاں کی کچھ مطبوعات حاصل کی جائیں۔ علامہ شرف صاحب کو زحمت دینا تو نامناسب ہے جیسا کہ آپ نے ایک وقت لکھا تھا اور مجھے بھی احساس ہے۔ ان کا بدل (اس امر میں) کون ہو سکتا ہے؟ اس سے روشناس کرانا آپ ہی کی عنایت پر ہے۔ جواب سے نوازیں۔

اگر کوئی مکتبہ طبع کرانا چاہے تو بر وقت اسے ذرا روک دیں تاکہ یہاں مطلوبہ کتب آسکیں اور پھر جو مکتبہ شائق اشاعت ہو وہ مولانا یٰسین اختر صاحب سے درج ذیل پتہ پر مراسلت کرلے۔ انھوں نے مزید کچھ تصحیح کی ہے۔ تصحیح شدہ نسخہ یا فہرست تصحیحات وہ بھیج دیں گے بعد اصلاح جدید اشاعت ہو تو اچھا ہے۔ کتابت کی بعض غلطیاں میری نظر سے بھی بعدِ طبع گزریں مگر میں نے مولانا سے کہہ دیا ہے کہ آپ ہی عمیق نظر سے دیکھ ڈالیں۔ مجھے فرصت ملنا مشکل ہے۔ کچھ دوسرے احباب بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہاں کچھ دنوں پہلے مولانا مبین الہدیٰ نورانی کے ذریعہ علامہ شرف صاحب کا ایک خط آیا تھا، انھوں نے جو کتابیں لکھی تھی وہ سب مل چکی ہیں، جواب بھی میں نے دے دیا ہے۔ مزید آپ مطلع فرمادیں۔ خدا کرے آپ تمام حضرات بخیر و عافیت ہوں۔ حضرت مفتی صاحب، علامہ شرف صاحب، حکیم محمد موسیٰ صاحب وغیرہم کی خدمت عالیہ میں سلام نیاز ضرور پیش کریں، کرم ہوگا۔

[محمد احمد مصباحی، محمد آباد گوہنہ، ۲۰ مارچ ۱۹۸۵ء]

☆☆☆

مکتوب (۲) محترمی **مولانا منشا تابش قصوری**...... سلام مسنون.......... مزاج گرمی؟

آپ کے خطوط موصول ہوئے، کرم فرمائی اور احباب نوازی کا شکریہ۔ "امام احمد رضا اور رد بدعات منکرات" اکتیس عدد مولانا شرف قادری کے لیے ارسال ہو چکی ہیں۔ "تذکرۂ میلاد رسول" دہلی طباعت کے لیے جا چکی ہے، توفیق ایزدی و نصرت الٰہی شامل حال رہی تو اوائل رمضان میں اس کی دو تین کاپیاں آپ کے نام ارسال کردی جائیں گی۔ یہ کتابت ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ نئی کتابت کرائیں تو ۲۴ صفحات میں بھی کتاب سکتی ہے۔ وفد ہوازن نے جو اشعار بارگاہ رسالت میں پیش کیے تھے ان کی شرح زرقانی علی المواھب میں دیکھنے

کا موقع نہ مل سکا، آپ یا علامہ شرف صاحب مقابلہ کرلیں تو اچھا ہے۔ ویسے اشعار کا مقابلہ البدایہ والنہایہ سے مَیں
نے کرلیا ہے اس کے مطابق درست ہیں اور ترجمہ بھی میرے خیال سے ٹھیک ہی ہے۔
شعبان میں بلکہ اس کے ایک عشرہ قبل ہی سے امتحاناتِ سالانہ کی مصروفیات کے باعث ساری مراسلت
معرض التوا میں پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے آپ کے نام بھی عریضہ نہ جاسکا۔ مقام رسول، سلام رضا، عورت کی
دیت، اتحاد بین المسلمین، حرمت تعزیہ وغیرہ کتب موصول ہوگئی تھیں، غالبًا تاریخ ارسال سے دس بارہ ایام بعد۔
خدا کرے یہاں سے ارسال شدہ کتب بھی پہنچ چکی ہوں۔ مطلوبہ کتب کی فہرست جلد ہی بھیجنے والا ہوں انتظار ضرور
کرلیا جائے۔ صوفی محمد اکرم صاحب گئے مگر آپ حضرات سے ملاقات نہ کرسکے جس کا افسوس ہے، خدا کرے کی
طرح وہ رد بدعات ساتھ لے گئے ہوں۔ ان کی کتاب "صحابہ کا عشق رسول" بھی عنقریب پریس سے آجانی
چاہیے۔ آپ کے نام وہ بھی ارسال ہوگی۔ خدا کرے پسند آئے۔ مولانا شرف صاحب کی خدمت میں ہدیۂ سلام
پیش ہے۔ رد بدعات پر ان کے اور حکیم محمد موسیٰ صاحب کے تاثرات کا انتظار ہے، مولانا نعمانی صاحب بخیر
ہیں۔ سلام قبول ہو۔ [محمد احمد مصباحی غفرلہ ۱۳ مئی ۱۹۸۵ء]

☆☆☆

مکتوب (۳) محترمی **مولانا منشا تابش قصوری**...... تحیۂ مسنونہ..... مزاج گرامی؟
۳؍ جون ۱۹۸۵ء کا مرسلہ کرم نامہ نظر نواز ہوا۔ اس سے قبل سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ ملیں۔ پھر
الافاضات الیومیہ اور الجوھرا لمنتظم وغیرہ دستیاب ہوئیں۔ عنایات فراواں کا بے حد شکر گزار ہوں۔ مولانا شرف
قادری صاحب کی خدمت میں عریضہ ہے کہ کتاب کا اندراج ضرور کریں گے اور اِدھر سے کمی کی صورت میں
آگاہی فرماتے رہیں گے، میں بھی یادداشت رکھنے کی کوشش میں رہتا ہوں۔ بہار شریعت مطبع آگرہ کا ایک سیٹ
ارسال ہے۔ تذکرۂ میلاد رسول طبع تو ہو چکی مگر پارسل کا شب و روز انتظار ہے اس لیے اس کی کتابت شدہ کاپی
بھیج رہا ہوں۔ اسی کو ریڈیوز کرکے ۱۸...... سائز پر یہاں طبع کرایا گیا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی ایک جدید کتابت
۲۴ صفحات میں لا سکتے ہیں۔ یہاں کاتب نے ۳۴ صفحات کردیے تھے، جسے میں نے کٹنگ کراکے ۳۰ میں
کیا۔ ایک صفحہ سلام رضا، ایک صفحہ تعارف کتب شامل کرکے ۳۲ صفحات پورے ہوگئے۔ آپ کے پاس ۲۹
صفحات ارسال ہیں، ٹائٹل پیج دہلی میں رہ گیا۔ آپ کے لیے کوئی خاص کارآمد بھی نہ ہوتا۔ مطبوعہ نسخہ بھی آنے
کے بعد ملا تو ارسال کرنے کی کوشش ہوگی۔ ساتھ میں صوفی محمد اکرم صاحب کی ترتیب "صحابہ کا عشق رسول" بھی
ہوگی۔ مولانا یٰسین اختر صاحب آج ۵ شوال کو یہاں تشریف لائے تھے آپ کا تاثراتی مکتوب پیش کردیا۔ مزید

تاثرات کے منتظر ہیں۔ اب وہ پوری کتاب اور ترتیب پر نظر ثانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ الشورۃ الہندیہ کی کتابت
ست رفتاری کے ساتھ تکمیل کے قریب پہنچ رہی ہے۔ دیکھیے طباعت کی رفتار کیا ہوتی ہے؟ استقامت کا نمبر
شائع ہوگیا۔ بمشکل ایک عدد حاصل ہوا ہے، مزید کا انتظار ہے، کانفرنس توقع سے زیادہ ناکام رہی، بیرونی
مندوبین نفی کے برابر رہے، اخبارات و رسائل میں اعلانات کہیں نظر سے نہ گزرے۔ خیریت کہیے کہ نعمانی
صاحب اور راقم کی غیر معمولی کاوش کے باعث نمبر کامیاب ہے۔ فہرست کے بارے میں ہم نے جو خاکہ بنا کر دیا
تھا وہ نامکمل تھا مگر زبانی طور پر سب ہدایات دے دی گئی تھیں، اصحاب ادارہ کا کرشمہ ہے کہ عجب طرح کی فہرست
بنائی۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ سب کو سمیٹا جائے اور اکثر اہم حصوں پر کچھ نہ کچھ مضامین آجائیں۔ چنانچہ اس قسم کے
مضامین راقم نے خود اپنی نگرانی میں یہاں کے اہل قلم سے تیار کرائے جو شامل مجموعہ ہیں۔ ایک تو طباعت میں
ترتیب باقی نہ رکھی۔ دوسرے فہرست میں بھی مرتب طریقہ پر سب کو (باختلاف صفحات سہی) نہ دکھا سکے۔ تاہم
نمبر وقیع اور قابل مطالعہ ہے، جسے امید قوی ہے کہ پذیرائی حاصل ہوگی۔ میں نے آپ کے نام ایک عریضہ میں چند
کتابوں کے نام لکھے تھے کیا وہ سب دستیاب ہو سکتی ہیں؟
مکتبہ قادریہ کی فہرست میں شرح ملا جلال کا نام برابر آرہا ہے، عرصہ سے میں اس کا طالب ہوں، دو عدد اگر
ہو تو ارسال کرائیں۔ اور بالکل ختم ہو چکی تو نئی فہرستوں میں اس کی قیمت کی جگہ خالی کردیں، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ
کتاب موجود ہے۔ دوسرے حالات بفضلہ تعالیٰ اچھے ہیں۔ علامہ شرف قادری، مفتی صاحب، اور حکیم صاحب
وغیرہم بزرگوں کی خدمت میں ہدیۂ سلام پیش ہے۔ خدا کرے تمام حضرات بعافیت ہوں۔
[محمد احمد مصباحی غفرلہ، فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ، ضلع اعظم گڑھ، ۵ شوال ۱۴۰۵ھ مطابق ۲؍ جون ۱۹۸۵ء]

☆☆☆

برادر محترم **مولانا یٰسین اختر مصباحی**! ..... سلام مسنون.... مزاج گرامی؟
بشارت نامہ موصول ہو کر مسرت بخش ہوا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ قابل اعتماد شخص غیر مقرر اور غیر پیر ہو کر
بھی اگر میدان عمل میں اترے تو ابھی قوم بہت کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ الحمد للہ کہ آپ نے اعتماد اور اثر
دونوں حاصل کرلیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ منصوبوں کے مطابق آپ کو کامیابی مل جاتی ہے تو المجمع الاسلامی کی کوئی
ضرورت نہیں رہ جاتی کیوں کہ اس کے سارے مقاصد آپ نے دار القلم میں جذب کرلیے ہیں اور اس کے لیے
اس کے ارکان میں سے کوئی اپنا مکمل وقت بھی نہیں دے سکتا جب کہ دار القلم کے لیے آپ سب کچھ کرنے کو ہمہ
وقت سرگرم ہیں۔ مقاصد بروئے کار آنا ضروری ہے خواہ المجمع الاسلامی کے نام سے ہو یا دار القلم کے نام

سے۔ آپ کا منصوبہ وخیال بھی یہی ہوگا۔ حجاز سے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی، خریدار پریشان ہیں۔ غالبًا مئی، جون کا بھی مشترکہ دوماہی شمارہ نکالنے کا پروگرام ہے تاہم اطلاع مل جاتی ہے تو بتانے میں آسانی ہوتی ہے۔ والسلام.....

محمد احمد مصباحی [۱۷/ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ /یکم جون/۱۹۹۱ء]

☆☆☆

باسمہ تعالی وتقدس

بخدمت گرامی حضرت علامہ قمرالزماں اعظمی دام ظلہ ——— سلام مسنون

خبر ملی کہ آپ کی اہلیہ محترمہ اس دار فانی سے دار بقا کو رحلت کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ رجعون

ایک دیرینہ مونس وشریک حیات کی ناگہاں جدائی کسی کوہ الم سے کم نہیں، یقیناً آپ کو زبردست صدمہ پہنچا اور فرزندوں کو بھی، مگر قضائے الٰہی میں کسی کو دخل اندازی کا یارا نہیں، ولا رادّ لقضائہ، للہ ما أخذ وما أعطیٰ، وکل شیء عندہ إلی أجل مسمّی.

رب تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور آپ حضرات کو صبر جمیل واجر جزیل سے نوازے اور اس غم والم اور صبر شکیب کو آپ حضرات کے لیے رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔ جملہ فرزندوں کو سلام مسنون مع تعزیتِ مسطور۔

شریک غم۔ محمد احمد مصباحی

ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مبارک پور

ورکن المجمع الاسلامی مبارک پور

۱۲/ شوال ۱۴۴۰ھ /۱۶/ جون ۲۰۱۹ء

☆☆☆

عزیزانِ گرامی ——— فرزندانِ مولانا مبین الہدیٰ نورانی

آپ کے والد ماجد کی رحلت کی خبر بوسائط، فون سے ملی، وقت اتنا کم تھا کہ جنازے میں شرکت کی صورت نظر نہ آئی۔ اس ناگہانی خبر سے سخت قلق اور صدمہ ہوا۔

موصوف میرے رفیق درس تھے۔ ہم لوگوں کے درمیان دینی، علمی، اشاعتی اور دعوتی امور پر اکثر تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ جب میں فیض العلوم جمشید پور میں مدرس تھا اُس وقت ایک دو بار بیت الانوار گیا میں بھی حاضری کا اتفاق ہوا اور مولانا کی معیت میں آپ کے جد امجد مولانا شاہ سراج الہدیٰ علیہ الرحمہ سے بھی ملاقات و گفتگو کا موقع ملا۔ ایک بار ذرا تفصیل سے کتب خانے کا بھی جائزہ لیا اور بہت سی اہم کتابوں سے روشناسی اور کچھ

استفادے کا بھی شرف حاصل ہوا۔

میں جمشید پور میں تھا اسی دوران مولانا بھی باری مسجد کے امام وخطیب کی حیثیت سے جمشید پور آگئے تھے۔ اس وقت ذاکر نگر اور دھتکی ڈیہہ وغیرہ میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی۔ وہاں سے آنے کے بعد جلال پور، محمد آباد گوہنہ اور مبارک پور میں رہا تو بھی روابط جاری رہے۔ خصوصًا مبارک پور وہ آتے تو دینی وعلمی مسائل کے علاوہ بعض خانگی معاملات پر بھی کھل کر گفتگو کرتے۔ ناگہاں یہ سارا ربط ٹوٹ گیا۔ جیسے کسی نے مین سوئچ دبا کر سارا کنکشن کاٹ دیا۔ مگر قدرت کا فیصلہ اٹل ہے۔ اس دنیا میں کوئی بقائے دوام کی سند لے کر نہ آیا۔ ہر آنے والے کو ایک دن جانا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

مولا تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت وغفران کا معاملہ فرمائے۔ ان کی نیکیوں کا نرخ دوبالا کرے۔ آپ سب بھائی بہنوں اور آپ کی والدہ ماجدہ و دیگر متعلقین کو صبر جمیل واجر جزیل سے نوازے۔ خیر کی راہ میں مشکلات جھیلنے کا حوصلہ بخشے۔ دین وشریعت پر استقامت اور دارین کی سعادت نصیب فرمائے۔ آپ لوگوں کے درمیان اتفاق اور محبت ووداد قائم رکھے اور نیکیوں کی راہ میں سب کو تیز گام بنائے۔ آمین یا ارحم الراحمین بجاہ حبیبک سید المرسلین علیہ وعلیہم وعلی آلہ وصحبہ افضل الصلاۃ واکرم التسلیم۔

غم گین وغم گسار

محمد احمد مصباحی

صدر المدرسین، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ

۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ

۱۳/ نومبر ۲۰۰۹ء

☆☆☆

حضرات فرزندان علامہ سید مظہر ربانی علیہ الرحمہ ——— سلام مسنون

۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۱/ مارچ ۲۰۱۴ء جمعہ کی صبح کو پیر طریقت عالم شریعت حضرت مولانا سید مظہر ربانی قبلہ کے وصال پرملال کی خبر ملی۔ إنّا للہ و إنّا الیہ راجعون۔

موصوف حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رضوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے دور آخر کے شاگردوں اور دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے دور اول کے قابل فخر فرزندوں میں تھے۔ مختلف میدانوں میں ان کی گراں قدر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ باندہ میں دار العلوم ربانیہ بھی ان کی حرکت وعمل کی ایک دل آویز یادگار ہے۔ دیگر مقامات میں بھی نہ معلوم کتنی یادگاریں ہوں گی جو اُن کی یاد ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

ان کا سانحۂ ارتحال نہ صرف اہل خاندان واہل سلسلہ بلکہ سبھی اہل سنت کے لیے غم واندوہ کا باعث ہے۔ مگر کلّ شيء عندہ لاجل مسمّی ہ و لن یؤخّر اللہ نفسًا اذا جاء اجلها۔

ہم پر لازم ہے کہ مرضی مولیٰ پر راضی رہیں اور صبر کا ثواب عظیم ضائع نہ ہونے دیں۔
عزیز المساجد جامعہ اشرفیہ میں حضرت کے لیے دعا و ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔ مولیٰ تعالیٰ
ان کے درجات بلند فرمائے اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل و اجر جزیل سے نوازے، ساتھ ہی انھیں اور
ہمیں دین و ملت کی بیش بہا خدمات کی توفیق جلیل مرحمت فرمائے۔ آمین

والسلام مع الاکرام

شرکاے غم : خدام جامعہ اشرفیہ مبارک پور

☆☆☆

مکتوب نمبر (۱) برادر عزیز مولانا حافظ احمد القادری (امریکہ) ——— **سلام مسنون**

۲۷؍رمضان کا مرسلہ خط ملا — میں آپ سے کہنے والا تھا کہ سفر کے دن روزہ نہ رکھیں مگر کئی بار ملاقات کے
وقت بھولتا گیا، جانے کے بعد سوچا کہ آپ خود ہی اس کا لحاظ کریں گے، خیر پریشانی تو ہوئی مگر افسوس کی بات نہیں، جس
طرح یہ روزہ زندگی کا سب سے بڑا روزہ ہوا اسی طرح ان شاء المولیٰ تعالیٰ اس کا اجر بھی سب سے بڑا ہوگا۔
غالباً اب مولانا زرقانی بھی وہاں پہنچ چکے ہوں، مولانا محمد اقبال صاحب نے برطانیہ ان کے پہنچنے پھر وہاں سے
۵؍مارچ کو امریکہ کے لیے روانہ ہونے کی اطلاع اپنے خط میں دی ہے، خدا کرے باہم مل جل کر خیر و خوبی کے ساتھ
متعلقہ خدمات انجام دیں۔
المجمع الاسلامی کا تعمیری کام اب تک موقوف ہے، کتابوں کا اسٹاک یہاں اب فوراً منتقل کرنے کا خیال ہے تاکہ
یہاں رہ کر دونوں کام (اشاعتی و تعمیری) بخوبی ہوتا رہے۔
۸؍شوال کی شام کو مبارک پور آگیا، ۹؍شوال سے شب و روز امتحان داخلہ وغیرہ کے کام ہوتے ہیں، آج صبح
۱۹؍شوال سے تعلیم شروع ہو سکی، سالانہ امتحان کا رزلٹ باقی تھا، پھر داخلہ بھی زیادہ ہوا، درجات عربی میں ایک ہزار
سے زائد اور حفظ و قراءت میں ڈیڑھ سو کے قریب طلبہ ہو چکے ہیں۔
آپ کا خط مولانا نصر اللہ صاحب، مولانا مسعود صاحب وغیرہ کو دکھا دیا، بفضلہٖ تعالیٰ سب لوگ بخیریت ہیں، آپ
کی کام یابی و کامرانی کے لیے رب کریم سے دعا و التجا ہے، وہ اپنے بے پایاں افضال و عنایات سے نوازے۔

والسلام

محمد احمد مصباحی

شب ۲۰؍۱۰؍۱۴۱۷ھ/۲۷؍۲؍۱۹۹۷ء

مکتوب نمبر (۲) برادر عزیز مولانا حافظ احمد القادری اعزکم المولیٰ ——— **سلام مسنون**

خط مرسلہ ۳؍مارچ ۱۹۹۷ء میں موصول ہوا، اس سے قبل والے خط کا جواب دے چکا ہوں۔
اس خط کو فیکس کرنے کی کوشش ایک ہفتے تک ہوتی رہی مگر ناکامی رہی، بالآخر ڈاک سے ارسال ہوا۔
یہاں جو فرسودہ نظام ہے اس میں فیکس اور فون سب پریشان کن ہے، ایک دن کراچی فون کے لیے رمضان
میں کوشش ہوئی تھی تو تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہوگیا، شوال میں مولانا اقبال صاحب نے مبارک پور فون لگایا تو بڑی
مشکل سے لائن ملی اور جب تک میں پہنچا لائن کٹ گئی، پھر انھوں نے کوشش کی مگر ناکامی رہی اس طرح کے
المناک حادثات معمول بن چکے ہیں۔
برطانیہ سے امریکہ ایک منٹ کے لیے صرف ۱۲؍پیسے میں کال ہوجاتی ہے، یعنی انڈین روپے سے سات
روپے میں اور برطانیہ سے انڈیا ۶۵؍پیسے میں ہوتی ہے یعنی قریب چالیس روپے میں۔ اس کے بعد بھی اطمینان
نہیں کہ گفتگو پوری ہوجائے۔
فون لگنے کے لیے درخواست، کاغذات اور رقم غالباً ۵؍ماہ قبل جمع ہے مگر اب تک کچھ پتا نہیں، کئی بار دوڑ
دھوپ بھی ہوئی، بہت سے دوسرے لوگ بھی دوڑ رہے ہیں مگر ہر کام اپنی انڈین رفتار سے ہوتا ہے۔
المجمع کا پورب کمرہ جس کی بنیاد بھر چکی تھی اب اس کی دیوار لنٹر تک آچکی ہے، لائبریری کی بھی بنیاد پڑ گئی ہے۔
کتابوں کا سارا اثاثہ محمد آباد سے مبارک پور آخر شوال کو آچکا ہے۔ کھاتا ابھی محمد آباد ہی میں ہے، مبارک پور
میں بھی جلد ہی کھولنا ہے۔
امسال اشرفیہ میں بیرونی طلبہ کی تعداد ساڑھے گیارہ سو ہوگئی، گزشتہ سال نو سو سے کم تھے، پرانے ہاسٹل
کے اوپر کچھ کمرے زیر تعمیر ہیں، مسجد کا کام بھی ہوتا رہتا ہے۔
اشرفیہ سے حج و زیارت کے لیے جانے والوں کی تعداد اس سال زیادہ ہے۔
حضرت مفتی شریف الحق صاحب، علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب، مولانا عبد الحق صاحب رضوی، مولانا
عبد الشکور صاحب، حافظ محمد عمر صاحب، حافظ محمد ہاشمی صاحب۔
نصف جا چکے نصف اول ۵؍یا ۷؍اپریل تک یہاں سے روانہ ہوں گے، مولا تعالیٰ مقبول فرمائے اور ہمیں
بھی توفیق خیر سے نوازے۔ حامد رضا نے محمد آباد میں داخلہ لے لیا ہے۔
دیگر احوال بفضلہٖ تعالیٰ اچھے ہیں۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں اور رہیں۔

والسلام

[محمد احمد مصباحی، اشرفیہ مبارک پور، ۷؍۱۱؍۱۴۱۷ھ/۲۷؍۳؍۱۹۹۷ء]

مکتوب نمبر (۳) برادر عزیز مولانا حافظ احمد القادری اکرمکم المولی— سلام مسنون

مزاج گرامی؟

آپ کا خط موصول ہوا—— المجمع الاسلامی کے رجسٹریشن، دستور اور تعارف وغیرہ سے متعلق آپ کا مشورہ بجا ہے مگر کام ٹلتا جا رہا ہے، جو بانیان ہیں وہ چار حضرات یا پانچ حضرات پانچ جگہ ہیں، ساری ذمہ داری میرے سر آجاتی ہے، دیگر ارکان میں آپ، مولانا نصر اللہ صاحب، مولانا عبد الغفار صاحب کا نام ہے بفضلہ تعالیٰ آپ لوگوں کا تعاون برابر حاصل ہے۔ بہر حال رب تعالیٰ کا فضل شامل حال رہے تو سب کچھ آسان ہے۔ تعارف تو چھپنا ہے، دیکھیے کب توفیق ہوتی ہے۔

رضا مسجد کا کام شروع نہ ہو سکا، گرمی کی شدت ہے اور آمد و رفت کی پریشانی، نگرانی مولانا نصر اللہ صاحب کو کرنی ہوگی مگر پریشانی کے باعث میں سوچتا ہوں کہ ذرا موسم نرم ہو تو کام شروع ہو۔

عطاء المصطفیٰ بھائی کو آپ کا خط ملا تھا، وہ جواب لکھانے کے لیے گزشتہ ہفتہ میں میرے پاس آئے، میں نے کہا کہ مجھے بھی خط لکھنا ہے اسی میں آپ کی خیر و عافیت کا تذکرہ کر دوں گا۔

گھر پر حالات حسب معمول ہیں، رب تعالیٰ آپ کو عزت و عافیت کے ساتھ دینی و علمی خدمات کے میدان میں کامیاب و کامراں رکھے اور ہم سب کو توفیق خیر سے نوازے۔

والسلام

محمد احمد مصباحی، اشرفیہ مبارک پور

۱۶/ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ/ ۲۴/ ۵/ ۱۹۹۷ء

☆☆☆

عزیزم مولانا انور علی....... سلام مسنون

یہاں سے جانے کے بعد نہ آپ نے کوئی خط لکھا نہ کوئی اطلاع ملی کہ ترجمہ کا کام کس مرحلہ میں ہے اور باقی کی تکمیل کب اور کیسے ہوگی؟ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں۔ تفتیش کے بعد پتہ چلا تو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اپنے احوال اور ترجمہ سے متعلق تفصیل لکھیں۔ کتابیں بہت حفاظت سے رہیں اور جلد ہی کام مکمل کرکے سب یہاں بھیجنے کی کوشش کریں۔ احباب ادارہ کو سلام کہہ دیں۔

محمد احمد مصباحی [۹ ربیع النور ۱۴۱۱ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۹۹۰ء]

☆☆☆

مکرمی مولانا حیدر علی نعیمی [صدر المدرسین دارالعلوم نعیمیہ، تلشی پور، گونڈہ]

سلام مسنون..... مزاج گرامی؟

صدرالافاضل کی حیات و خدمات پر کام بہت پہلے ہونا چاہیے تھا افسوس کہ اب انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کی خدمات کو جاننے والے بھی دنیا سے اکثر اٹھ چکے ہیں۔

(۱) جو بچے ہیں ان کا پتہ لگائیں اور ان سے لکھائیں یا ان سے حالات سن کر قلم بند کریں۔

(۲) دوسرے لکھنے والوں کے لیے پہلے آپ کو خود کتابیں فراہم کرنی ہوں گی جب ہی وہ کام کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں صرف ایک کتاب "حیات صدرالافاضل" [از مولانا غلام معین الدین نعیمی] عرصہ ہوا چھپی تھی آپ اس کی دوسری اشاعت کا انتظام کریں تاکہ اہل قلم کو دے کر کچھ لکھا سکیں۔

(۳) صدرالافاضل سے متعلق السواد الاعظم، سنی یا دیگر رسائل کے اگر نمبر نکلے تھے تو ان کی کم از کم سو عدد فوٹو کاپی کرائیں تاکہ لکھنے والے ان سے استفادہ کر سکیں۔

(۴) السواد الاعظم، دبدبۂ سکندری، سنی، انوار الصوفیہ وغیرہ جتنے بھی رسائل میں حضرت کے کچھ حالات و واقعات ملنے کی توقع ہے انھیں جمع کرکے فوٹو کاپی کرائیں۔ لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں سے ہی حاصل ہوں تو وہیں سے لے کر کاپی کرائیں۔

(۵) ان کی جو تصانیف مطبوعہ ہیں مگر نایاب یا کمیاب ہو چکی ہیں تو دوبارہ ان کی اشاعت کی فکر کریں یا سو کی تعداد میں ان کی کاپیاں اپنے پاس محفوظ کر لیں تاکہ مذکورہ مقصد میں کارآمد ہوں۔

(۶) اگر کوئی مضمون یا تحریر غیر مطبوعہ ہو اور محفوظ ہو تو اس کی اشاعت کا بندوبست کریں۔

(۷) رسائل میں اگر ان کے متفرق مضامین مل جائیں تو یکجا کرکے شائع کریں۔ اسی طرح پروفیسر مسعود احمد صاحب کی کتاب تحریک آزادی ہند اور ماہنامہ السواد الاعظم کی بھی ہندوستان میں اشاعتِ نو ہونی چاہیے۔ میرے خیال سے یہ سارے کام سیمینار سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں، ساتھ ہی سیمینار کے انعقاد کا ضروری وسیلہ اور لازمی تیاری بھی۔ سال دو سال کی تاخیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں مگر جو کام ہو باضابطہ اور باقاعدہ ہو، محض چند جذباتی مضامین لکھ، لکھا لینے سے شخصیت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ باقی آپ حضرات خود غور کر لیں۔ ان کاموں کے بعد پھر آپ سے سیمینار اور اس کے انعقاد کے طریقۂ کار وغیرہ پر گفتگو تفصیلی ملاقات میں طے ہو سکتی ہے۔ بروقت اجازت دیں۔

والسلام..... محمد احمد مصباحی

[فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ، ۱۰ فروری ۱۹۹۲ء]

اخی العزیز مولانا محمد اسحاق الرضوی—— تحیة وسلاما

تسلمت رسالتکم قبل أسبوع، کنت احسب أن الترجمة ذهبتم بها، لکن فتشت الکتب والقراطیس بعد ما تلقیت الرسالة فوجدت الترجمة عندی، والیوم سلمتها إلیٰ الأخ العزیز الأستاذ محمد عارف الله القادری لیطالعها عاجلاً بنظرة تصویب فانی کثرت الأشغال عندی، ولا اکاد أکملها فی أسابیع، وأرجو من فضل ربی القدیر أن یمنحنی الفرصة فی قابل عاجل لقراءة ما کتبتم. ونسأله العون فی کل ما نرید و کفی به ناصرا و معینا وإلیه المرجع والمأب.

من المامول أن کتاب "مفاهیم یجب أن تصحح" وغیره ورد إلیکم من لاهور ونسخة الکتاب المذکور التی کانت عندی کنت وضعتها علی الکتب التی اخذتم فالمرجو أنکم ذهبتم بها— ولذاکنت وضعت.

أتمنی السلامة والعافیة ودوام العافیة لکم والسلام علیکم وعلی الإخوان الکرام، زادکم المولیٰ رقیا.

محمد احمد المصباحی

من فیض العلوم ، بمحمدآباد کهنه، اعظم جراه

☆☆☆

اخی العزیزمولانا محمد اسحاق الرضوی—— تحیة وسلاما

أسفاً وندماً علی أنی لم أکتب الیکم شیئا مع ما تسلمت الترجمة— فأزیلواهمومکم بأنی قد ألفیت کل ما أرسلتم إلیّ بید الطالب توقیر أحمد وبالبرید مرتین، إنی مفجوع بفوات الأوقات فی هذه الدار. وذا لأسباب. أدعو المولی الموفق الکریم أن یمنح لی الفرص و یوفقنی للخیر و یزیل العائقات. کان الاستاذ عبدالحکیم شرف القادری ارسل الیکم الکتب لکنهاارتدت إلیه فأرسل ثانیا إلیّ وفیها: "مفاهیم یجب أن تصحح" ومن الظلمات إلی النور/ وشیشے کے گھر/ والبریلویة/ ورسائل الإمام أحمد رضا المطلوبة. وفی الظرف الراهن أصوب "باغی هندوستان" فإن بعض أهل العلم مرتقبون لطبعه و یتشوقون ما أضیف إلیه من الأبحاث الجدیدة.

ومن المبشرات أن مقال الدکتوراة للسیدة قمر النساء بیگم الحیدرآبادیة قد نُشرت من المکتبة القادریة بلاهور وتسلمت نسخة منها أمس تحتوی علی نحو سبع مائة صفحة.

هذا جد حسن ناجح فی التعریف بأحد من علماء أهل السنة. کثر المولیٰ ما

یرفع ویجلی صنائع أعلامنا النبلاء ،دُمتم بخیر.

والسلام علیکم وعلی من لدیکم

محمد احمد الاعظمی المصباحی مبارك پور

١٩٨٧/١/١٤م

☆☆☆

الاخ العزیزمولانا محمد اسحاق الرضوی—— تحیة وسلاماً

تسلمت الیوم رسائلکم مع مجلد أعداد هدی الاسلام-شکرا- ماکتبتم عن "الظلمات والنور" لعلکم تشتغلون باعادة النظر إلیها فی رمضان.

"المورد السهل فی النحو العربی" هذا الاسم یحتاج إلیٰ تغییر و اختصار مثل "قواعد النحو"-"النحو العربی" "النحو السهل""النحو المیسور""مسائل النحو". فإن الجزء الأول من الاسم المختار لاینبئی عن مواد الکتاب حتی یتم الجزء الأخیر. فیخشی أن یهجر الأخیر و یبقی الأول غیر منبئی عن محتویات الکتاب وما رأیتم فی "ادیب بارع" فحسن. قام المجمع الاسلامی فی الأیام الراهنة بنشر بعض الکتب الأردیة وهی.

(١) المبین للاستاذ السید سلیمان اشرف

(٢) حقائق تحریك بالاکوٹ للشاه حسین الگردیزی

(٣) امتیاز حق... راجا غلام محمد

(٤) مسئله ختم نبوت اور تحذیر الناس للعلامة احمد سعید الکاظمی وعدة کتب سوی ماذکرت.

وأرجو من فضل الله وتیسیره أن تاتی الکتب المذکورة قبل منتصف شعبان من دلهی إلی محمد آباد.

والسلام

محمد احمد المصباحی

١٩٨٨/٣/٢١م

☆☆☆

عزیز مکرم مولانا حکیم محمد اسحاق رضوی ـــــــــــــــ سلام مسنون

میں نے آج آپ کا ترجمہ اٹھایا کہ چند دنوں میں دیکھ کر اسے لاہور بھیج دوں، ایک دو صفحے دیکھے تو ناقل نے کافی غلطیاں کی ہیں، ترجمہ کی موزونیت اور حسن و خوبی سے زیادہ دماغ سوزی نفس عبارت کے ملانے میں ہو رہی ہے، اس لیے آپ اصل ترجمہ اپنے قلم کا لکھا ہوا، ارسال کریں، نقل کی تصحیح تو خود آپ کو وقت نظر کے ساتھ کر دینی تھی تاکہ میری زحمت کم رہے۔

دوسری خرابی اس نقل میں یہ ہے کہ حوالہ کی عبارتیں اصل کتاب سے حوض کم کر کے درمیان میں ممتاز طور پر لکھی جاتی ہیں، لیکن نقل میں ساری سطریں مسلسل ہیں، یہ سخت مصیبت ہے، ممکن ہے آپ نے خود لکھتے ہوئے یہ امتیاز قائم کیا ہو۔

افسوس کہ تعلیم کے ایام میں دیکھنے کا موقع بالکل نہ نکال سکا ورنہ اصل کاپی پہلے ہی طلب کر لی ہوتی، اب آپ کی کاپی دیکھنے کے بعد ہی میں کسی نتیجہ تک پہنچ سکوں گا، ہو سکتا ہے ہفتہ عشرہ مبارک پور میں آپ کا وقت لینا پڑے، مزید کیا لکھوں، بہت سارے کام پڑے رہتے ہیں اور کوئی معاون و مددگار بھی نظر نہیں آتا، ہر کام میں تاخیر، تعویق، انقطاع ہوتا رہتا ہے۔ مولا تعالیٰ میرے حال پر رحم فرمائے۔

والسلام

[محمد احمد مصباحی، فیض العلوم محمد آباد گوہنہ، ۱۸ر۴ر۱۹۸۷ء]

☆☆☆

مولانا المکرم حکیم محمد اسحاق رضوی ـــــــــــــــ سلام مسنون

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ ایک عرصہ سے نہ آپ کا کوئی خط ملا نہ آپ کی قلمی سرگرمیوں کا کچھ سراغ مل سکا۔ ایک صاحب کمال کا قرطاس و قلم سے رشتہ توڑ لینا اپنے کو زندہ دفن کرنے کے مترادف ہوگا، ساتھ ہی اپنی مخفی صلاحیتوں اور علمی توانائیوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی بھی۔ رب کریم آپ کو آسیب روزگار سے بچائے اور دین و علم کی نمایاں خدمات میں لگائے، تعلیمی اصلاح سے متعلق آپ نے جو مضمون لکھا تھا وہ کہیں شائع، ہوا یا نہیں؟ نور مصطفیٰ، حجاز، تہذیب الاخلاق علی گڑھ میں ترمیم و نظر ثانی کے ساتھ بھیج دیں تو مناسب ہوگا، آپ کی خوش حالی و ترقی اور علمی و قلمی سربلندی کا متمنی و دعاگو ہوں۔ انتظار جواب کے ساتھ۔

(محمد احمد مصباحی - ۸ر۲ر۱۹۹۰ء)

☆☆☆

عزیز برادرم مولانا محمد اسحاق رام پوری..... سلام مسنون..... بخیر باشی!

زندہ رہنے کے لیے عزم جواں اور ہمت واستقلال چاہیے، آپ کو معلوم نہیں کہ ایک شخص کے علاوہ
سارے مجمع نے آپ کی حمایت کی اور ایک معترض کا بھی، میں نے جو جواب دیا اور اس گرفت پر جو کڑی گرفت کی
اس کا کوئی جواب ان سے نہ بن پڑا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ اس قسم کی باتوں سے آپ خاطر برداشتہ ہوئے ہیں تو پوری
رپورٹ آپ کو مفصل سناتا اور آئندہ کا طریق کار بھی۔ ہرگز ایسے انتہا پسندوں سے اس حد تک پست ہمت نہیں ہونا
چاہیے نہ ہی اپنی حقیقت اپنی حیثیت سے زیادہ قرار دینا چاہیے، یہ یاد رکھیے کہ دنیا قدر دانوں سے نہ کل خالی تھی نہ
آج خالی ہے۔ بس ہمت واستقلال چاہیے، اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے مسلسل چوّن سال تک جو گراں بہا خدمات
انجام دیں ان کی حیات میں خود ان کے قریبی ماحول میں ان کی پذیرائی اور قدر افزائی کتنی ہوئی؟ چند حضرات کے
سوا بیش تر تو یہ بھی نہ جان سکے کہ اس کنج خمول میں رد و افتا کے ساتھ اور کتنی عظیم تحقیقات ہوتی رہتی ہیں، خود رد و
افتا میں جو انھوں نے تحریر کر دیا ہے آج میں عالم اسلام کے نامور محقق، محدث، فقیہ قسم کے شہرت یافتہ اہل قلم کی
تحریروں سے مقابلہ کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ رد و فتوی میں بھی کتنی گہرائی تھی جو دنیا کے اکابر محققین کے مطالعہ و
تحقیق میں نہ آ سکی مگر اعلیٰ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ (اگرچہ کسی اور موقع کے لیے)

بے نشانوں کا نشاں مٹتا نہیں
مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا

یہ شعر میں دیکھتا ہوں تو ان کی شخصیت پر بالکل راست نظر آتا ہے، قدرت نے بے شمار محققین کو آج ان کا
گرویدہ بنا دیا ہے۔

ہاں صالح تنقید قبول کر لینا چاہیے اور صالح و غیر صالح کی آمیزش پر مشتمل ہو تو "خذ ما صفا ودع ما کدر" کی
راہ واضح ہے۔ اصل کام یہ ہے کہ تعلیم عام ہو، مطالعہ وسیع ہو، ذہن کے دریچے کھلیں اور علم و فکر سے دماغ روشن
ہو، بفضلہٖ تعالیٰ یہ کام رفتہ رفتہ ہو رہا ہے اور مزید کوشش جاری ہے۔

ہمارے علما دوسرے ممالک میں اور خود ہندوستان میں بھی جہاں مسلک کی اشاعت اور احقاق حق و ابطال باطل
کی خدمات انجام دے رہے ہیں وہیں غیر مسلموں اور ملحدوں کے رد اور انھیں دعوت حق دینے کا کام بھی کر رہے ہیں۔
مبلغ اسلام مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی قدس سرہ کی تو پوری زندگی اس میں گزری، ان کے بعد اب متعدد حضرات اس
طرح کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہر حال ہمیں بلند فکر ہو کر ایسے کام کرنے چاہئیں جو دنیا و آخرت دونوں جگہ نفع بخش ہوں
اور منتہا و مقصود رضائے مولیٰ، ورنہ اہل اسلام سے زیادہ ریسرچ تو مادہ پرست ملحدین کر رہے ہیں لیکن بازار آخرت

میں اس کی قیمت کچھ بھی نہیں۔ خدا کرے آپ ہوش مندی کے ساتھ اپنا علمی سفر تیز تر جاری رکھیں۔ باقی آئندہ۔

محمد احمد مصباحی
اشرفیہ مبارک پور
۲۷؍فروری ۱۹۹۰ء

☆☆☆

مکرمی مولانا حکیم محمد اسحاق رضوی ______ سلام مسنون

آپ کا خط ملا—— بڑی مسرت ہوئی کہ تحریری کام کی جانب پھر آپ کا میلانِ طبع ہوا، میں تو یہ سوچ چکا تھا کہ ایک آدمی ہم نے کھودیا، خدا کرے آپ دل جمعی کے ساتھ کچھ کریں۔

رد قادیانیت سے متعلق رسالہ کو دوبارہ دیکھنے اور طبع کرانے کا خیال بالکل جاتا رہا، اب ان شاء المولی تعالیٰ اسے تلاش کرکے پاکستان بھیج دوں گا، امید ہے کہ وہاں سے طبع ہو جائے گا۔

البریلویہ کا رد عربی میں آنا بہت ضروری تھا اسی لیے میں نے آپ کو زحمت دی تھی، ایک بار آپ کا خط آیا تھا کہ پہلے جو کچھ لکھا تھا میں نے سب سوخت کر دیا، اس کے بعد میں نے بعض احباب سے درخواست کی کہ وہ دوسرا ترجمہ کر ڈالیں، مولانا (عبد الحکیم) شرف قادری صاحب نے بھی لکھا مگر کوئی تیار نہیں ہوا، تحریری کام بہر حال مشکل ہے اس کے لیے محنت و استقلال ضروری ہے یا آدمی اس کا اس قدر خوگر ہو جائے کہ جب تک کچھ لکھ نہ لے اسے قرار نہ ملے، دو باتوں میں سے کوئی ایک ضروری ہے اور دوسری زیادہ کارگر اور بارآور ہوتی ہے، مگر ایسے افراد کی بڑی قلت ہے۔ رب کریم فضل فرمائے تو سب آسان ہے۔ آپ کا رجحان جس کام کی بھی جانب ہو اسے کرتے رہیں کم از کم عادت تو پڑے گی، قلم میں روانی اور صفائی تو آئے گی، ممتاز اہل قلم نے ایسا طویل عرصہ گزارا ہے جس میں لکھا اور لکھتے رہے پھر ایک زمانے کے بعد جب پختگی آگئی تو وہ منظر عام پر آئے۔

والسلام

[محمد احمد مصباحی، ۱۵؍۴؍۱۴۱۵ھ]

☆☆☆

مکرمی مولانا حکیم محمد اسحاق رضوی ______ سلام مسنون

آپ کا خط ملا—— امید تھی کہ بریلی شریف عرس رضوی میں ملاقات ہو جائے گی، مگر میں بہت تھوڑا وقت لے کر پہنچا، بارہ بجے دن میں حاضر ہوا اور بعد مغرب واپسی ہو گئی۔

قل تک اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں مکتبہ جام نور کے اندر بیٹھا رہا، بعد قل آستانے پر حاضر ہوا اور ازہری مہمان خانہ میں چند احباب اور بزرگوں سے ملاقات کی پھر واپس ہو گیا۔

رد قادیانیت میں جو رسائل ہیں ان کا ذکر "اندھیرے سے اجالے تک" میں موجود ہے۔

(۱) السوء والعقاب علی المسیح الکذاب
(۲) الجراز الدیانی علی المرتد القادیانی (آپ کا ترجمہ کردہ)
(۳) قہر الدیان علی مرتد بقادیان (مختلف شمارے)
(۴) الصارم الربانی علی اسراف القادیانی (از: حجۃ الاسلام)

قہر الدیان کے نام سے مستقل رسالہ نکلتا تھا، اس کے شمارے متعدد ہوں گے۔ سب کی تلاش اور ان سب کو یکجا کرنا ضروری ہے، کوشش جاری ہے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

والسلام
محمد احمد مصباحی
۱۰؍۳؍۱۴۱۶ھ/۸؍۸؍۱۹۹۵ء

☆☆☆

مکرمی مولانا حکیم محمد اسحاق رضوی ______ سلام مسنون

آپ کا سابقہ خط ملا تھا مگر جواب نہ دے سکا، رسائل رد قادیانیت کے لیے میں نے دفتر میں ہدایت کی تھی کہ منگا کر آپ کے پاس ارسال کریں۔ شاید اس کی بھی تعمیل نہ ہو سکی، میں خود منگا کر بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

آپ نے جو سوانحی رسالہ لکھا ہے انشاء اللہ المولیٰ تعالیٰ موصول ہونے کے بعد میں اسے جلد ہی دیکھ لوں گا اور مناسب یہ ہے کہ کمپیوٹر سے کمپوزنگ کرا کے اشاعت ہو، رضا اکیڈمی سے بات ہوئی ہے اور خود المجمع الاسلامی کی طرف سے بھی اشاعت ہو سکتی ہے۔ مگر ضروری بات یہ ہے کہ مسودہ اگر کسی صاف اور خوش خط لکھنے والے سے نقل کرائیں تو مناسب ہے، ورنہ آپ خود بہت صاف لکھیں، کیوں کہ کمپوزنگ کرنے والے عموماً کم خواندہ ہوتے ہیں اور سبقتِ ید سے بھی غلطیاں کر جاتے ہیں، سبقتِ نظر اور اور خطائے فہم بھی ساتھ ہو جائے تو غلطیوں کی مقدار اور زیادہ ہو گی۔

حوالے کی عبارتوں کے لیے حوض کم کرنے، مناسب مقامات پر کومہ لگانے، واوین لگانے، نئی سطر کچھ جگہ چھوڑ کر شروع کرنے، وغیرہ قواعدِ نسخ و کتابت کی پوری رعایت مسودے میں ہونی ضروری ہے، جو "ی" پڑھنے میں آتی ہے اس کے نیچے اب نقطہ لگانے اور جو تلفظ میں نہیں آتی اسے بے نقطہ رکھنے کا التزام ہے اسی طرح جو ہمزہ (بصورت

الف، غیر ہمزۂ وصل) تلفظ میں آتا ہے اس کے اوپر یا نیچے حسب تلفظ چھوٹا ہمزہ لگانے کا التزام ہے۔ اور بھی چیزیں ہیں، مسودے میں ان سب کی رعایت ہوگی جب ہی کمپوزنگ صحیح ہو پائے گی۔ آپ کی خیر وعافیت کا متمنی ہوں۔

والسلام

[محمد احمد مصباحی، ۱۱/۷/۱۴۱۶ھ/ ۵/۱۲/۱۹۹۵ء]

☆☆☆

مکرمی مولانا حکیم محمد اسحاق رضوی ———— **سلام مسنون**

خط ملا—— رسائل رد مرزائیت کا ایک نسخہ مطبوعہ کراچی، قادری بک ڈپو بریلی سے آیا ہے اب اس کی فوٹو کاپی جلد ہی آپ کو ارسال ہوگی، ساتھ ہی رسالہ تعزیہ داری بھی، رسالۂ تعزیہ داری میں بعض مراسم سے متعلق سوالات ہیں، ان مراسم کی توضیح حاشیہ میں کرنی ہوگی تاکہ قاری سوالات وجواب بخوبی سمجھ سکے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

محمد احمد مصباحی

۸/۸/۱۴۱۶ھ

☆☆☆

مکرمی مولانا حکیم محمد اسحاق رضوی ———— **سلام مسنون**

دونوں خط ملے—— مولا تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے اور برکتوں سے نوازے۔ میرا ارادہ سفر حج کا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ ذی قعدہ کی کسی تاریخ میں روانگی ہو، آپ شوال کے اندر ہی ملاقات کر لیں تو اچھا ہے ورنہ محرم کے اخیر میں رکھیں۔ والسلام

محمد احمد مصباحی

فیض العلوم محمد آباد گوہنہ

۴/شوال ۱۴۱۶ھ/ ۲۴/فروری ۱۹۹۶ء

☆☆☆

مکرمی مولانا محمد عیسیٰ رضوی [دار العلوم غوثیہ رضویہ، ناندیڑ، مہاراشٹر]..... سلام مسنون

کرم نامہ موصول ہوا۔ جمع احادیث کا کام میں خود کئی سال سے سوچ رہا تھا اور ارادہ تھا کہ چند فارغین کے ذریعہ اس کی تکمیل کراؤں۔ اتفاقاً جہان رضا میں پڑھا کہ آپ یہ کام تنہا کر رہے ہیں تو میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ یقیناً آپ نے جو خدمت شروع کی ہے بڑی ہی مسرت بخش اور قابل قدر ہے۔ رب کریم تکمیل سے نوازے۔ اور اپنی خاص تائیدات مرحمت فرمائے۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے تخریج احادیث کے تحت جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں ان میں بعض کتابیں وہ ہیں جو خود اعلیٰ حضرت کی نظر سے نہ گزریں یہ خود اعلیٰ حضرت کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ بلکہ امام جلال الدین سیوطی وغیرہ کی جامع صغیر اور جمع الجوامع وغیرہ کے حوالوں کی بنیاد پر ان کی تخریج فرمائی ہے۔ ان کتابوں میں سے چند مثلاً مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبد الرزاق، سنن سعید بن منصور، مسند حمیدی، صحیح ابن خزیمہ، دلائل النبوۃ للبیہقی، شعب الایمان للبیہقی وغیرہ چند سال پہلے، پہلی بار طبع ہو چکی ہیں، بعض وہ ہیں جو اب تک طبع نہ ہوئیں اور قلمی نسخے بھی دست یاب نہیں۔ ان کے حوالوں کی جگہ کنز العمال کا حوالہ دے دیا جائے۔

میرا ارادہ یہ تھا کہ "مجموعۂ احادیث" عربی میں تیار کیا جائے اور جن احادیث کے مکمل الفاظ اعلیٰ حضرت کی کتاب میں نہیں آئے ہیں ان کی تکمیل اس کتاب سے کر دی جائے۔ میرے خیال سے جب آپ حوالوں کی تخریج کر رہے ہیں تو یہ کام آپ کے لیے زیادہ مشکل نہیں۔ اردو عربی دونوں مجموعے ایک ساتھ تیار ہو سکتے ہیں۔

یہ بھی خیال تھا کہ جو حدیث اعلیٰ حضرت کی جس کتاب یا رسالے سے اخذ کی جائے اس کتاب یا رسالے کا حوالہ بھی دیا جائے اور مجموعہ کا نام "المجموعۃ الرضویۃ فی الأحادیث النبویۃ" رکھا جائے۔

ابتدائی مرحلہ میرے ذہن میں یہ تھا کہ ایک کتاب میں جتنی احادیث آئی ہیں ایک جگہ لکھ دی جائیں اور نیچے اس کتاب کا حوالہ دے دیا جائے اور یہ بھی کہ فلاں موضوع کے اثبات میں یہ حدیث کتاب مذکور میں رقم ہوئی ہے۔ اس طرح اُن تمام احادیث کا استقصا ہو جائے گا جو اعلیٰ حضرت کی کتابوں میں درج ہیں۔ البتہ بعض احادیث مکرر بھی ہو جائیں گی، اس میں کوئی زیادہ حرج نہیں اور تکرار ختم بھی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کہ ایک جگہ حدیث لکھ کر ان تمام کتب ورسائل اور مقامات کے حوالے دے دیے جائیں جن میں اعلیٰ حضرت نے اس حدیث کو درج فرمایا ہے۔ ساتھ ہی اگر اعلیٰ حضرت نے حدیث کی سند و متن یا اعتباری حیثیت سے متعلق کچھ کلام کیا ہے تو وہ بھی لکھا جائے۔ اس طرح ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو جاتا، اگرچہ ابواب کی ترتیب نہ ہو پاتی۔ مگر اس کی ایک صورت یہ تھی کہ ہر حدیث کا اندراج نمبر مسلسل لکھا جائے جس سے یہ شمار ہو سکے کہ کل کتنی احادیث ہوئیں اور آخر میں ایک فہرست ابواب بنائی جائے اور ہر باب کے تحت اس سے متعلق احادیث کے نمبر درج کر دیے جائیں اس طرح موضوعات کے تحت جو شخص جو حدیث تلاش کر رہا ہو گا اس فہرست کے ذریعہ اپنے مطلوب تک پہنچ جائے گا، کسی حدیث کا تعلق متعدد ابواب سے ہے تو ان سبھی ابواب کے تحت ان کا نمبر لکھ دیا جائے۔

ان سارے کاموں کے ساتھ اصل حوالوں کی تخریج کو میں نے نہ سوچا تھا اس لیے کہ یہ سب دیر طلب اور محنت طلب عمل ہے اس کے لیے کم از کم تمام مطبوعہ کتب حدیث کا مرتب کے پاس موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد تلاش کی جو دشواری ہے وہ مزید برآں۔ آپ جیسے افراد پر کام تقسیم کر کے اس کو بھی سر کیا جا سکتا تھا۔ آپ کی ہمت قابل صد آفریں ہے کہ آپ نے تنہا ان سب کی باضابطہ ابوابی، حوالوں کی تخریج اور ترجموں کی تکمیل کے ساتھ جمع فرمانے کا ارادہ کیا اور

ساتھ سو صفحات مکمل بھی کر لیے۔ رہا احکام و مسائل کی تحریر کا معاملہ میرے خیال سے یہ کام موضوع سے خارج ہے۔ کہیں نفس حدیث کی توضیح کی ضرورت ہو تو وہ کی جا سکتی ہے۔ احکام و مسائل کے لیے فقہی کتابیں کافی ہیں، جہاں تک ہو سکے کتب میں درج شدہ تمام احادیث کی تدوین ضروری ہے۔ اس لیے وہ راستہ زیادہ آسان تھا جو میں نے تحریر کیا۔ میرے حساب سے طریقۂ عمل یہی ہونا چاہیے کہ:

(۱) ایک تصنیف لی جائے اور اس میں جتنی احادیث آئی ہیں نمبر وار جمع کی جائیں۔ فتاویٰ رضویہ کی احادیث میں فتاویٰ رضویہ کا صفحہ بھی درج کیا جائے اور رسائل کی احادیث میں رسائل کا نام ہی کافی ہے اور صفحہ دے دیا جائے تو بھی حرج نہیں۔ اس طرح کسی کتاب میں درج شدہ کوئی حدیث چھوٹنے نہ پائے۔

(۲) وہ حدیث کسی اور نے اپنے مطلب کے اثبات کے لیے لکھی تھی اور اعلیٰ حضرت نے اسے لکھ کر اس پہ کلام کیا ہے تو اسے بھی واضح کیا جائے اور پوری تنقید کو تحریر کیا جائے۔

(۳) کسی حدیث سے متعلق صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ ہونے کا افادہ ہے تو وہ بھی لکھا جائے۔

(۴) بطور مقدمہ منیر العین کی اصولی بحثیں بھی تلخیص کے ساتھ جمع کر دی جائیں۔ دیگر کتب میں بھی ایسی جو بحثیں ہوں وہ بھی جمع کی جائیں بشرطے کہ مرقومہ احادیث کے ذیل میں وہ نہ آسکی ہوں۔

(۵) آخر میں ابوابی اور موضوعاتی فہرست دی جائے جس کے ذریعہ مطلوبہ حدیث بآسانی دست یاب ہو جائے، اور شروع سے مسلسل مطالعہ کرنے والا اگر متنوع مضامین سے گزرتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔

(۶) اصل کتب کے حوالوں کو اردو مجموعہ کے تحت رقم کرنے کے ساتھ ایک عربی مجموعہ بھی تیار کیا جائے۔ اعلیٰ حضرت نے بہت سی احادیث کا کچھ حصہ اردو میں، کچھ عربی میں لکھا ہے۔ اردو مجموعہ میں تو انھیں بعینہٖ لایا جا سکتا ہے مگر عربی مجموعہ میں مکمل الفاظ اصل کتاب سے جمع کرنا ضروری ہے۔

(۷) مسائل فقہیہ کی ضرورت نہیں البتہ فہرست کے ذریعہ بہت سے مسائل کا ذکر یا اجمالی اشارہ ہو جائے گا۔ میرے خیال سے ان میں سے اکثر باتوں کو آپ نے بھی ترتیب میں ملحوظ رکھا ہے۔ فرق ترتیب ابوابی کا رہ جاتا ہے۔ اگر ابوابی ترتیب قائم رکھتے ہوئے تمام احادیث کتب و رسائل آپ نے جمع کر دی ہیں تو اب ترتیب میں ترمیم غیر ضروری ہے ویسے ہی باقی رکھیں۔ باقی گفتگو آئندہ خط میں ہو پائے گی۔ فی الحال اجازت دیں۔

محمد احمد مصباحی

۷؍۱۱؍۱۴۱۳ھ — ۳۰؍۴؍۱۹۹۳ء

☆☆☆

مولانا المکرم **مولانا محمد اقبال گجراتی** (مقیم برطانیہ) زیدت مکارمکم .... سلام مسنون.. مزاج گرامی؟

آپ کے سابقہ خط کے مطابق رقم کی تقسیم اور کتابوں کی تقسیم عمل میں آچکی۔ ایک خط بھیج چکا ہوں جس میں آپ

کا حساب بھی ہو گا۔ ایک ضروری بات یہ لکھنی ہے کہ مفتی عبد القیوم ہزاروی مدظلہ جو حضرت محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد علیہ الرحمۃ کے داماد ایک مخلص اور معمر عالم دین ہیں۔ تنظیم المدارس اور جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے ناظم بھی ہیں ان کی نگرانی میں رضا فاؤنڈیشن سے جدید انداز میں فتاویٰ رضویہ کی جلدیں بڑی جاں فشانی کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ ہر جلد پر حوالوں کی تخریج، عربی، فارسی عبارتوں کے اردو ترجمے، پیراگراف چینجنگ کے ساتھ کتابت پھر تصحیح، فہرست سازی وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔ ہر کام ذمہ داری اور سلیقے سے ضابطے کے ساتھ کرتے ہیں پھر طباعت اور اشاعت کا مرحلہ آتا ہے۔ قریبًا ایک لاکھ روپے ایک جلد کو منظر عام پر لانے میں صرف جاتے ہیں، مگر نکاسی کی رفتار سست ہے۔ جو رقم لگتی ہے اس کے خالی ہونے میں بہت دیر لگتی ہے۔ جب کہ اگلا کام برابر جاری رہتا ہے۔ اہل خیر کی جانب سے مخلصانہ تعاون بھی کم مل رہا ہے۔ کام بڑا ہے، دینے والے سوچتے ہوں گے کہ جو ہم نے دیا بہت ہے، اسی سے اگلا کام بھی جاری رہے گا اور ان کا حال یہ ہے کہ ایک لاکھ کے قریب تو یک مشت لگ جاتا ہے وہ کب واپس نکلے گا کوئی ٹھیک نہیں۔ جو نکلتا ہے وہ بھی تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے۔

آپ نے کسی خط میں ذکر کیا تھا کہ بعض اہل خیر امام احمد رضا قدس سرہ کی کتابوں کی اشاعت کے لیے پچھتر ہزار روپے اور بعض پندرہ ہزار روپے تک دے سکتے ہیں۔ اگر ان کو اس طرف آپ متوجہ کر سکیں تو اچھا ہے، ہمارے یہاں کام میں ابھی تک تسلسل اور نظم و ضبط نہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں، نہ ہی اپنی لائبریری اور افراد، اس لیے تاخیر ہے۔ تعمیری کام بعونہ تعالیٰ جاری ہے۔ اس سلسلے میں آپ حضرات کی، خصوصًا آپ کی مخلصانہ توجہ اور ہمدردی باعث مسرت و تشکر ہے۔ رضا فاؤنڈیشن کے لیے جو حضرات بڑا تعاون کر سکتے ہوں وہ یہ بھی طمع نہ رکھیں کہ ان کا نام کتاب میں شائع ہو۔ مفتی صاحب کی صواب دید پر چھوڑیں، وہ چاہیں تو دے سکتے ہیں۔ یہ خالص دینی و علمی ادارہ ہے شخصی و تجارتی نہیں۔ چاہیں تو مراسلت بھی کر لیں۔ ڈرافٹ "رضا فاؤنڈیشن لاہور" ہی کے نام ہوتا ہو گا۔ دریافت بھی کر سکتے ہیں۔ میرا تذکرہ کر دیں امید ہے کہ جواب کسی سے لکھا دیں گے یا خود لکھیں گے۔ ان کی جانب سے میرے پاس کوئی اپیل نہیں آئی ہے مگر مجھے ضرورت کا علم ہوا اور یاد آیا کہ کبھی آپ نے اس سلسلے میں مجھے لکھا تھا اور میں نے یہ لکھا کہ بروقت کسی ایسی کتاب کا پروگرام نہیں اس لیے وہ تعاون نہ لیا جا سکا۔ ان کے لیے مکمل ایک جلد کا بھی انتظام ہو سکتا ہے تو ان کے لیے سہولت ہو گی اور کام میں تیزی آ سکے گی۔ عمر کے آخری دور سے گزر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس سلسلے کی تکمیل جلد ہو جائے۔

خدا کرے آپ مع اہل و عیال بہ خیر و عافیت ہوں، علامہ قمر الزماں اعظمی سے پتے موصول ہو جائیں تو میرے پاس بھیج دیں۔ کل دار المطالعہ کی بھی چھت لگ گئی۔ اس کے بعد صفائی اور پلاستر کا بھی ارادہ ہے۔ پھر اگلے حصے (اتری جانب) پر ان شاء المولیٰ تعالیٰ ہاتھ لگے گا۔ تائید ایزدی سے امید ہے کہ کام بہ حسن و خوبی جاری رہے گا۔ مولانا نصر اللہ صاحب، مولانا عبد الغفار صاحب، اسی طرح مولانا سلطان صاحب بڑی محنت کر رہے ہیں۔ تقریبًا روزانہ محمد آباد

خیرآباد سے آمد ورفت رکھتے ہیں۔ چھٹیوں میں رک بھی جاتے ہیں۔

دعا فرمائیں کی خدا و رسول (جل وعلا و ﷺ) کی بارگاہ میں ادارہ مقبول ہو اور آپ سب معاونین اور ہم سب متعلقین کی خدمات بھی مقبول ہوں۔ حاجی آدم صاحب سے ملاقات کا اشتیاق ہے مگر دوری کی وجہ سے ہمت نہیں ہوتی۔ امتحان سالانہ بھی قریب ہے، کچھ دوسرے کام بھی ہو رہے ہیں اس لیے سفر بھی مشکل ہے۔ علی عیسی صاحب کو سلام کہ دیں۔

محمد احمد مصباحی

۳ر رجب ۱۴۱۷ھ - ۱۵ر نومبر ۱۹۹۶ء

☆☆☆

مکرمی **الحاج محمد سعید نوری** ...... سلام مسنون ..... مزاج گرامی؟

ماہ شعبان میں ملاقات کے بعد آپ کا ایک خط ملا تھا وہ بھی غالبًا مولانا یسین اختر صاحب کی موجودگی کے باعث تحریر ہو گیا تھا۔ اب ماہ شوال کا اختتام ہے لیکن نہ کوئی خط آیا نہ جد الممتار آئی۔ کفل الفقیہ اور المعتقد میں نے ارسال کی، اس کی بھی رسید نہ ملی۔ جو طویل پروگرام مرتب ہوا ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس طویل خاموشی اور بے تعلقی کے ساتھ کیسے مکمل ہو سکے گا؟ میرا خیال ہے کہ مولانا اسلم رضا یا کسی اور عالم کا چند گھنٹے وقت اشاعت اور مراسلت کے سلسلے میں حاصل کریں تو امید ہے کہ کچھ تیزی آسکے گی۔ اور اگر ایسا آدمی ہو جو عربی، اردو کتابوں کی باقاعدہ تصحیح کرلے تو بہت خوب، ورنہ کم از کم یہ کر سکے کہ کاتب سے یا کمپیوٹر والے سے لین دین کرے، بائنڈنگ والے سے معاملہ رکھے، طباعت کے لیے دہلی جاکر کام کراسکے۔ بمبئی میں ہو تو وہیں دیکھ بھال کرے۔ قابل اعتماد ہونا بہت ضروری ہے، ورنہ ایسا کرنا ہوگا کہ اپنے ممبروں یا خاص لوگوں میں سے ایک آدمی دہلی جاکر کاغذ کی خریداری، فلم کی تیاری، پریس سے معاملہ، بائنڈر سے بات چیت کرکے آجائے اور جو آدمی رہے وہ رک کر وہاں کام مکمل کرائے۔ تنخواہ وغیرہ معقول ہو کہ کسی دوسرے کام کے لالچ میں نہ پڑے۔ الغرض جب آپ لوگ اس قدر مصروف ہیں کہ آٹھ مہینے سے کتاب رکھی ہوئی ہے اور اس کا ایک صفحہ چھپانا اور جلد بندی کرانا قابو سے باہر ہے اور ایک خط لکھنا مشکل ہے تو کوئی متبادل حل نکلنا چاہیے۔ ورنہ جو پروگرام دو سال کے اندر کرنے کا طے ہوا ہے وہ بیس سال تک جاسکتا ہے جب کہ ہم لوگ قبر میں پہنچ چکے ہوں گے۔

اسی حساب سے یہ بھی سوچیں کہ مسلک حق کی اشاعت، امام احمد رضا قدس سرہ کی شخصیت اور خدمات کا تعارف، ان کے عظیم مشن کی ترویج جو ہمارا اصل نشانہ ہے وہ کس قدر دور جا پڑے گا۔ جب کہ باطل جماعتوں کی تگ ودو اور ہمارے خلاف پروپیگنڈہ مہم بہت تیزی، بہت طاقت اور بہت عیاری کے ساتھ دنیا بھر میں جاری

ہے۔ سب کا جواب غریب سُنّیوں کو ہی دینا ہے اور کسی حکومت کی امداد اور طاقت کے بغیر دینا ہے۔ اس ماحول میں ہمیں صحیح منصوبہ بندی اور برق رفتار تیزی کی کس قدر ضرورت ہے؟ محتاج بیان نہیں۔ طرح طرح کی مصروفیات بتاکر ہم اپنے کو اور اپنے ساتھیوں کو تسلی تو دے سکتے ہیں مگر کام کے تقاضے اس سے پورے نہیں ہو سکتے اس کے لیے ہر چیز کا مناسب اور معقول حل نکال کر ہی چلنا ہوگا، ہمت اور حکمت سے کام لیں۔ رب تعالیٰ کارساز اور مددگار ہے، اسی سے امید اور اسی پر بھروسا ہے۔ احباب کو سلام عرض ہے، خیر و عافیت کی تمناؤں کے ساتھ۔ والسلام...... [محمد احمد مصباحی غفرلہ، فیض العلوم محمد آباد، ۳۰/شوال ۱۵ھ]

☆☆☆

عزیز گرامی **مولانا اسلم رضا والحاج محمد سعید نوری** ..... زیدت مکارمکما .... سلام مسنون.. مزاج گرامی؟

آپ حضرات کے خلوص، نیک نیتی اور تحریک کی برکت کہ جو کام شروع ہوا تھا بعونہٖ تعالیٰ آج مکمل ہو گیا۔ ۴۳ صفحات ارسال ہو چکے، ۵۷ مزید ارسال ہو رہے ہیں، کل ۱۰۰ صفحات ہو گئے جو ڈیڑھ دو سو صفحات میں آئیں گے۔ ۳۰۰ صفحات کی کتاب پر ان ۲۰۰ صفحات کو اگر تقدیم کے نام سے دیا جاتا تو بہت انگشت نمائی کا سبب ہوتا اور خود مجھے بھی پسند نہ آیا اس لیے اس کو "حُدُوثُ الفِتَن وجهادُ أعيانِ السنن" کے نام سے آخر میں مع ٹائٹل پیج کے شامل کیا جائے۔ الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا جا سکتا ہے ایسی صورت میں کم از کم تعارف صاحب معتقد و صاحب معتمد کی ڈبل کاپی نکلوا کر ایک معتقد کے ساتھ لگے گی اور ایک الگ کتاب میں ہوگی۔ اس کا خرچ چاہیں تو المجمع الاسلامی سے انتظام کیا جائے اور ناشر کی جگہ المجمع الاسلامی دے دیں۔ جیسی رائے ہو مطلع کریں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ رضا اکیڈمی پر آپ لوگوں کے منشا کے خلاف کوئی بار ڈالا جائے۔ کتاب بفضلہ تعالیٰ جامع ہو گئی، اس میں قدیم فرقوں کے بعد ہندوستان کے نوزائیدہ فرقوں کا خاصا تعارف آ گیا۔ پھر اہل سنت کی مساعی اور ہر دور کے علما کا اجتماعی تذکرہ بھی آ گیا جن کی مجموعی تعداد ایک سو چالیس ہوگی۔ بدمذہبوں سے اجتناب اور سنت کی اشاعت کے موضوع پر سو سے زیادہ احادیث کریمہ بھی آ گئیں، آثار واقوال مزید برآں۔ کتابت اور تصحیح سے متعلق کچھ باتیں پہلے لکھ چکا ہوں وہ ملحوظ رہیں۔ اگر کتابت "المعتقد" کے ساتھ چھپے تو ٹائٹل پر "المعتقد والمعتمد" کے ناموں کے بعد یہ اضافہ کردیں: (بیرونی اندرونی دونوں پر ہو جائے تو بہتر ہے۔) [و يليهما: حدوثُ الفتن وجهاد أعيان السنن] بقلم الأستاذ محمد أحمد المصباحي الأعظمي، عضو المجمع الإسلامي والأستاذ بالجامعة الاشرفية مبارکفور. خط کشیدہ حصہ نہ دیں تو بھی چل سکتا ہے۔ ٹائٹل بہت بھر جائے گا تو بھی اچھا نہ معلوم ہوگا۔ ہاں ایک دو بار تصحیح کے بعد یہاں ضرور بھیجیں، اس کے بعد ہی فائنل کاپی نکلوائیں۔ مزید کیا لکھوں۔ مولیٰ تعالیٰ آپ حضرات کو اور مجھے بھی زیادہ سے زیادہ دینی وعلمی خدمات کی توفیق بخشے اور قبول فرمائے۔ احباب کو سلام عرض ہے خصوصًا بابو بھائی، ابراہیم بھائی، رفیق بھائی، عارف بھائی حسن سلمہ وغیرہم کو سلام کہیں۔ مولیٰ تعالیٰ سب کو دارین کی سعادتوں سے

نوازے اور ہر مشکل و پریشانی کو دور فرمائے۔ والسلام

تاخیر کا سبب یہ ہے کہ احادیث کے انتخاب اور سوانح علما کی تلاش میں کم و بیش چار ہزار صفحات کی ورق گردانی اور مطالعہ کرنا ہوا، جب کہ تدریسی کام بھی جاری ہے۔ کئی کئی بار رخصت بھی لی۔ تعطیلات بھی زیادہ تر اسی میں استعمال کیں مگر جو وقت لگنا تھا لگ کر رہا، کچھ اپنی صحت کی ناہمواری کا بھی دخل ہے۔ بہر حال ہو گیا اس پر رب کریم کا شکر ہے۔ امید کہ آپ لوگ بھی معاف کریں گے۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کام روکنا پڑا اور انتظار کی مصیبت جھیلنی پڑی۔ [محمد احمد مصباحی، ۲۵ جمادی الآخرہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۶ اکتوبر ۱۹۹۹ء]

☆☆☆

محترم مولانا ابوالحسن واحد رضوی [آستانۂ عالیہ فیض آباد شریف، محمد نگر]...... سلام مسنون

میرا آپ سے سابقہ کوئی تعارف نہیں، شاید یہ مولانا مشاہد رضا کی کارستانی ہے کہ آپ نے اپنا ترجمہ نظر ثانی کے لیے ایک طالب علم کے پاس بھیج دیا۔ ترجمہ سے آپ کا علمی و فنی کمال عیاں ہے۔ اس مشکل نظم کو دل کش اردو نثر کا جامہ دینا آپ کی مہارت کی دلیل ہے۔ صوفی محمد اول صاحب کے ترجمے کی کاپی اتنی دھندلی اور ناصاف آئی کہ میں دو چار سطر بھی پڑھنے سے قاصر رہا۔ آپ کا ترجمہ دیکھتے ہوئے چند مقامات پر مجھے جو سمجھ میں آیا وہ نیچے لکھ دیا۔ بعض جگوں میں صرف بطور مشورہ کچھ لکھا ہے۔ پسند ہو تو لے لیں ورنہ ترک کر دیں۔ والسلام

[محمد احمد مصباحی، ناظم تعلیمات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ یوپی، ہند [۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ شب سہ شنبہ]

☆☆☆

ذمہ داران جامعہ اشرفیہ کے نام ...... سلام مسنون...... مزاج گرامی؟

کیم جمادی الآخرہ کو میں نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کے ذریعہ کچھ جواب دے دوں گا اس لیے چند سطور پیش خدمت ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ تدریسی خدمت میں سیکڑوں جید علما مصروف ہیں اور یہ کام بڑی حد تک پورا ہو رہا ہے لیکن تصنیف و اشاعت کی لائن میں ابھی بہت زیادہ خلا نظر آرہا ہے جس کے باعث ایک بڑا طبقہ ہمارے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے اس لیے اب ہمارا مطمح نظر ثانی الذکر شعبہ بن گیا ہے اور تدریس سے تعلق بربنائے ضرورت ہے جو (بہ دیر یا جلد) کسی وقت بھی ختم ہو سکتا ہے۔ اہل سنت کو ایک ایسے اشاعتی و تصنیفی ادارے کی سخت ضرورت ہے جو ۲۵ سے ۵۰ افراد تک کے اسٹاف پر مشتمل ہو کر مختلف اصناف شعبہ میں سرگرم عمل ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ غالبًا آپ لوگ مجھے ادب و انشا کے خانے پر فٹ کریں گے جب کہ اس سے میری دلچسپی برسوں پہلے ختم یا قریب الختم ہو چکی ہے اب یہاں ادب و انشا کے اسباق مولوی محمد عارف اللہ فیضی کے سپرد کر دیے ہیں وہ اسے بخوبی انجام دے رہے ہیں..... پھر جامعہ اشرفیہ میں ادب و انشا کے لیے دو متخصص عالم عرصۂ دراز تک رہ چکے

ہیں اور انھوں نے اپنی بساط بھر بڑی محنت اور شوق سے کام کیا مگر جامعہ ہی کے قابل ذکر حلقہ کی جانب سے ملک بھر میں یہ نشر کیا گیا کہ دس برس رہے مگر ایک فرد بھی پیدا نہ کیا۔ اس الزام کو عملاً یوں تائید حاصل ہوئی کہ اس جگہ ان کے شاگردوں میں سے کوئی بھی بٹھانے کے قابل اب تک شمار نہ کیا گیا، اس طرح وہ الزام ایک حقیقت کی شکل میں آچکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں دوسرا کوئی شخص بھی اس شعبہ میں جائے گا تو اس کا انجام اگلوں سے مختلف نہ ہوگا۔ اپنے سابقہ سارے رکارڈ کے وہاں پہنچ کر خراب ہونے یا کیے جانے کا بڑا خطرہ میرے بھی سامنے ہے..... دوسرے معاملات اپنی جگہ ہیں۔

میں بحمدہ تعالیٰ کبھی اس احساس سے خالی نہ رہا کہ اشرفیہ کا حق میرے اوپر دوسرے تمام اداروں سے زیادہ ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی رہ کر جو بھی دینی و علمی کام کریں وہ اشرفیہ ہی کا کام ہے۔ اس کی تاسیس کے وسیع منصوبے کسی خاص در و دیوار کے پابند نہیں بلکہ خطۂ ارضی کو محیط ہیں۔ اب میرے خیالات و خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے اور ان کا حل بتاتے ہوئے اگر آپ حضرات کا کچھ فرمان ہو تو بندہ تعمیل کے لیے حاضر ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان... والسلام.

محمد احمد مصباحی غفرلہ، محمد آباد گوہنہ

۶ جمادی الآخرہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۸۶ء

☆☆☆

محترم مولانا فضل احمد چشتی لاہور ــــــــــــ سلام مسنون

تقریبًا ایک ماہ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ کچھ کاغذات بھیجنا ہے، اپنا ای میل پتا دیجیے۔ میں نے جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا ای میل ایڈریس دے دیا۔ آپ نے کاغذات بھیجنے کے تقریبًا دو ہفتہ بعد اطلاع دی، اُس وقت میں مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے سیمینار میں شرکت کے لیے ممبئی جا رہا تھا، اس لیے ای میل چیک نہ کرا سکا۔ ۲۹/ جنوری ۱۱ء کو واپسی کے بعد یاد نہ آیا— آج ۵/ فروری ۱۱ء کو آپ نے پھر یاد دہانی کی تو میں نے ڈاک نکلوائی، معلوم ہوا کہ یہ سوال نامہ دار الافتا کو وقتِ وصول ہی سپرد کر دیا گیا تھا مگر اس پر نہ مرسِل کا نام تھا، نہ مرسَل الیہ کا، نہ کوئی ای میل ایڈریس جس پر جواب ارسال ہو۔

میرا خیال تھا کہ یہ درسی کتب سے متعلق آپ کے اشکالات پر مشتمل کاغذات ہوں گے مگر آج آپ کے بتانے، پھر خود دیکھنے کے بعد انکشاف ہوا کہ یہ کل ۱۴ صفحات ہیں۔

پہلا صفحہ ایک مجموعۂ رسالات و خطبات کا ٹائٹل پیج معلوم ہوتا ہے جس پر بعد تسمیہ یہ درج ہے:

تبرکات عالمی مبلغ اسلام حضرت علامہ عبدالعلیم میرٹھی صدیقی علیہ الرحمہ (خلیفۂ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا

خاں بریلوی علیہ الرحمہ)مرتبہ: **محمد نعیم اللہ۔ خاں قادری (بی ایس سی، بی ایڈ، ایم اے اردو، پنجابی، تاریخ)**
ناشر: فیضان مدینہ پبلیکیشنز جامع مسجد عمر روڈ کاموکنگے ضلع گوجرانوالہ
اندر ایک دوسرا ٹائٹل پیج ہے جس پر یہ عبارت درج ہے: **کمیونزم کو عالمگیر بننے سے کس طرح روکا جائے؟**
المعروف بہ کمیونزم کا توڑ۔ مصنفہ: فضیلت مآب مولانا شاہ محمد عبد العلیم صدیقی القادری، جسے فقیر تاج الدین قادری نوری ریٹائرڈ، ہیڈ ماسٹر نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔
اس کے بعد کمیونزم سے متعلق ایک خطاب معلوم ہوتا ہے جو اردو میں ترجمہ شدہ ہے۔ صفحات نمبر ۵۴۸ تا ۵۶۰ ہیں۔ غالبًا یہ نمبرات پورے مجموعہ کتاب کے اعتبار سے ہیں۔
پہلے ٹائٹل کی پشت پر ایک سوال ہے۔ سائل کا نام، پتہ اس طرح درج ہے: **السائل السید مراتب علی شاہ و سید مدثر علی شاہ، مکان نمبر ۱۹۰ محلہ شارجہ کالونی، دبئی ٹاون، رائیونڈ روڈ، تحصیل و ضلع لاہور، پاکستان بتاریخ ۲۷ر محرم الحرام ۱۴۳۲ھ**

سوال میں سائل نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

''یہ اور اسی طرح کی دوسری کتابیں، تحریریں، تقریریں جو عبد العلیم میرٹھی کی طرف منسوب ہیں اور صریح یا کنائی یا اشاری کفر یا زندقہ پر مشتمل ہیں''۔ الخ

چوں کہ دعویٰ کا اثبات مدّعی کے ذمہ ہوتا ہے اس لیے سائل مدعی سے مطالبہ ہے کہ مرسلہ ص ۵۴۸ تا ۵۶۰ میں مندرج: جو عبارتیں صریح کفر یا زندقہ پر مشتمل ہیں انھیں الگ کر کے لکھے اور اُن کا کفر یا زندقہ ہونا دلائل شرعیہ سے واضح کرے۔ اسی طرح جو عبارتیں بطور اشارہ و کنایہ کفر یا زندقہ پر مشتمل ہیں انھیں الگ کر کے لکھے، اور اشارہ یا کنایہ کے طور پر اُن کا کفر یا زندقہ ہونا دلائل شرعیہ سے واضح کرے۔ یہ لحاظ ضروری ہے کہ قائل کے کلام سے جو معنیٰ ظاہر اور واضح ہے اسی کو بیان کیا جائے، اپنی طرف سے کچھ ملاوٹ کر کے زبردستی کوئی معنیٰ ہرگز نہ پیدا کیا جائے۔ سائل کے اثباتِ دعوی کے بعد اس پر غور ہوگا اور آگے کوئی جواب دیا جا سکے گا۔

مولانا فضل احمد چشتی سے گزارش ہے کہ سائل مدعی تک میری یہ تحریر پہنچا دیں، میں خود ان سے کوئی شناسائی نہیں رکھتا۔ محض آپ کے تقاضے کی وجہ سے یہ سطریں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ والسلام مع الاکرام

محمد احمد مصباحی
صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی
تاریخ: یکم ربیع النور ۱۴۳۲ھ /۵ر فروری ۲۰۱۱ء

مکرمی مولانا محمد عالم گیر مصباحی (استاذ دار العلوم اسحاقیہ جودھ پور)________ **سلام مسنون**

مجلس شرعی کے نویں سیمینار سے متعلق آپ کے جوابات موصول ہو گئے۔ حضرت مفتی اشفاق حسین صاحب و مفتی شیر محمد صاحب کی خدمات میں سلام عرض ہے، آپ بھی حضرات سیمینار میں شرکت فرمائیں تو اچھا ہوگا، کوشش کریں کہ آپ کے علاوہ کم از کم مفتی شیر محمد صاحب ضرور آجائیں۔

دیگر احوال بفضلہ تعالیٰ اچھے ہیں، تعطیل کے دنوں میں مراسلت کا پتا کیا ہوگا۔ مطلع کریں۔

والسلام
محمد احمد مصباحی
مجلس شرعی جامعہ اشرفیہ مبارک پور
۲۴ر رجب ۱۴۲۰ء/۴ر نومبر ۱۹۹۹ء

☆☆☆

عزیز گرامی مولانا محمد عالم گیر مصباحی ________ **سلام مسنون**

کتاب ''سیدنا عبد الوہاب جیلانی کا مدفن'' پانچ عدد ارسال ہے چار پر نام لکھے ہوئے ہیں، باقی ایک آپ جسے چاہیں دے سکتے ہیں۔

حضرت مفتی اعظم راجستھان کے نام جو کتاب ہے اس کے ساتھ حضرت کے نام ایک خط بھی ہے، آپ دیکھ لیں اور کوشش کر کے حضرت کا موقف تحریری طور پر حاصل کر کے میرے پاس بھیجیں۔ اگر حضرت اس کی تائید کر دیتے ہیں تو یہ بڑی بات ہوگی۔ اس کے بعد آپ چاہیں گے تو مزید کتابیں ارسال کی جا سکتی ہیں۔ ہدیہ بیس روپے ہے۔ دس روپے میں عموماً دی جاتی ہے، سو عدد آپ کے ذریعہ نکل جائے تو بہت اچھا۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں اور حضرت کی تائیدی رائے لینے میں کام یاب ہو جائیں۔

حضرت اگر تائید کر دیں تو مفتی شیر محمد صاحب سے بھی تائیدی دست خط لے لیں اگر وہ تیار ہو جائیں۔

والسلام
محمد احمد مصباحی
۲۰۰۸/۶/۱۴

☆☆☆

عزیز محترم مولانا سید اکرام الحق مصباحی زیدت مکارکم ——— سلام مسنون

الجزء المفقود من المصنف، عرصہ ہوا اس کے کئی نسخے آئے یہاں آئے تھے میں نے مطالعہ بھی کیا تھا مگر ہندوستان میں کہیں سے اس کی اشاعت نہ ہوئی، آپ حضرات کی کوششوں سے نہ صرف یہ کہ یہاں اس کی اشاعت عمل میں آئی بلکہ اس کا سلیس اور عام فہم ترجمہ بھی ہوگیا، ترجمے میں آپ نے شگفتگی اور روانی کے ساتھ تفہیم عام کا خاص خیال رکھا ہے۔ اب علما، طلبا، عوام سبھی کے لیے اس سے استفادہ آسان ہوگیا ہے۔ رب تعالیٰ آپ کو توفیق مزید سے نوازے۔ احباب کو سلام عرض ہے۔ خدا کرے سبھی مدرسین وطلبہ بخیر وعافیت ہوں اور دینی وعلمی خدمات سے سرفراز وشاد کام بھی۔

پس نوشت:

کمپوزنگ میں کوشش کے بعد بھی کچھ غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اگر کتاب بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا تو جو غلطیاں نظر میں آجائیں گی نشان زد کر کے انشاء المولیٰ تعالیٰ مطلع کروں گا۔ امام عبد الرزاق کی عمر میں غالباً ۸۵ کو الٹ کر ۵۸ کر دیا ہے شاید آپ نے بھی دیکھا ہو۔

ایک نسخہ برائے تصحیح مخصوص کر لیں تا کہ جو غلطیاں ملیں اس نسخے میں نشان زد ہو جائیں اور آئندہ کبھی اشاعت کی باری آئے تو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔

والسلام
محمد احمد مصباحی
۱۶ر جمادی الآخرہ ۱۴۳۹ھ

☆☆☆

عزیز گرامی مولانا ازہار احمد امجدی ——— زیدت مدار جکم

سلام مسنون

تحقیقاتِ ازہری کا مطالعہ کیا۔ آپ کی محنت وجستجو اور اندازِ تحقیق وتنقیح سے دلی مسرت ہوئی۔ قلم برابر جاری رہے تو مزید ترقی کی امید ہے۔

۱- مولانا اسید الحق مرحوم کی تحریروں پر آپ کا تنقیدی مضمون غالباً ان کی حیات میں شائع ہو چکا تھا مگر زیر نظر مجموعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی شہادت کے بعد لکھا گیا ہے، اس لیے از اول تا آخر ہر جگہ رحمہ اللہ وغیرہ الفاظ ہیں۔ پھر بھی بعض جگہ یوں ہے کہ "مولانا جواب دیں" ——— اگر بعد کا ہے تو "مولانا جواب دیں" یا

اس طرح کا کوئی مطالبہ یا جملہ بعد وفات بے جا ہے، اسے حذف ہونا چاہیے یا مناسب حال ترمیم ہونی چاہیے۔

۲- آپ نے ضابطہ یہ بتایا ہے کہ سند میں اگر کوئی راوی صدوق ہو تو حدیث حسن ہوگی مگر حدیث ما بين قبري و منبري کی ایک سند میں دو صدوق ہونے کے باوجود اسے آپ نے صحیح الاسناد اور اس سے قبل کی سند میں ایک صدوق آنے پر اسے حسن الاسناد لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کتابت کی غلطی ہو۔

سند میں کوئی صدوق راوی آجانے سے حدیث درجۂ صحت لذاتہ سے فروتر ہو کر حسن ہو جاتی ہے۔ یہ ضابطۂ کلیہ ہے یا اس میں کچھ استثنا بھی ہے؟

۳- اس سے قبل تارک نماز وجماعت سے متعلق آپ کی کتاب دیکھی جس سے آپ کے جذبۂ عمل اور عمل کے لیے لوگوں کو بیدار کرنے کی لگن کا احساس ہوا۔ یہ وصف ہر عالم دین میں ہونا چاہیے۔

آپ برابر لکھتے رہیں تو زبان میں مزید شگفتگی اور برجستگی پیدا ہو سکتی ہے جب مخاطب عوام ہوں تو شگفتہ بیانی، شکوہ الفاظ اور سوز دروں کی بے تکلف جھلک سے تاثیر میں زبردست اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی محنت بہت جلد یہ رنگ بھی پیدا کر سکتی ہے۔

۴- دونوں کتابیں دیکھتے وقت جہاں زبان یا کمپوزنگ کی خامی نظر آگئی وہاں میں نے نشان لگا دیا ہے تا کہ اگلی اشاعت میں ان کو، اور بغور پڑھنے پر مزید جو ملے سب کو، درست کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک ایک نسخہ آپ نے تصحیح کے لیے الگ کر رکھا ہوگا، اسی پر میرے نشانات بھی نقل کر لیں تا کہ ساری تصحیحات ایک نسخے میں یکجا رہیں۔

کچھ قابل توجہ باتیں ذہن میں آئیں، انھیں ذیل میں دیکھیں:

(۱) خواص کی طرح لفظ عوام بھی مذکر ہے (یعنی جمع مذکر)۔

(۲) فعل متعدی کا مفعول جب علامت مفعولی کے بغیر ہو تو فعل کی تذکیر وتانیث مفعول کے لحاظ سے ہوگی اور جب علامت مفعولی آجائے تو فعل واحد مذکر ہوگا۔

(۳) مصدر کبھی مفرد ہوتا ہے کبھی دوسرے لفظ سے ملا کر پورا مصدر مانا جاتا ہے۔ اول جیسے لکھنا پڑھنا دوم جیسے بیان کرنا، روایت کرنا، اس میں قدرے فرق اور تفصیل بھی ہے جو اساتذہ کی تحریروں میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گی۔

(۴) اردو میں دعا، ثنا، رضا، اکتفا وغیرہ کا املا بغیر ہمزہ کے ہے۔ لیے، دیے، کیے کا رائج املا ی کے ساتھ ہے۔ نثری تحریر میں یائے اضافت سے متعلق میرا رجحان یہ ہے کہ بغیر ہمزہ کے ہو ثنائے خدا۔

علماے دین، اسی طرح اولیاے کرام، حکماے عظام۔ نظم سے متعلق یہ خیال ہے کہ جہاں تقطیع میں دو حرف آئیں وہاں ے پر ہمزہ لکھا جائے اور جہاں ایک حرف ہو وہاں صرف ے لکھی جائے۔ بعض لوگ نثر و نظم میں ہر جگہ حذف ہمزہ کے قائل ہیں اور بعض ہر جگہ ے پر ہمزہ لکھنے پر زور دیتے ہیں۔

(۵) میری راے یہ ہے کہ "آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" کی جگہ "حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" یا اس طرح کے الفاظ (سرکار، آقا، ہمارے نبی، اللہ کے رسول وغیرہ) لکھنا، بولنا چاہیے۔ میں نے اپنے بزرگوں کے کلام میں "آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" نہ دیکھا۔ غالبًا تبلیغیوں، دیوبندیوں اور کم سواد اردو نگاروں کی طرف سے اس کی ابتدا ہوئی پھر اپنے لوگ بھی اس میں مبتلا ہو گئے۔

(۶) اردو میں معنی کو اہل زبان بکسر نون بولتے اور جمع استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی یہ ہیں۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی تحریروں میں بھی اس لفظ کا استعمال آپ کو بطور جمع ہی ملے گا۔ ہم لوگوں کی خالص اردو ترکیبوں میں اگر یہ بطور واحد استعمال ہو تو وہ قابل اصلاح ہے۔

یہ خط ابھی بھیج نہ سکا تھا کہ رفع المنارہ کا ترجمہ دیکھنا شروع کر دیا۔ اس میں آپ کی کاوش، عربی زبان کی اردو میں خاطر خواہ تفہیم، لفظی ترجمہ کی بجاے سہل، آسان اور شستہ زبان میں مطالب کو بیان کرنے کی کوشش بہت پسند آئی۔ خود کتاب بھی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ احادیثِ توسل پر جدید مبتدعین کے اعتراضات اور تلبیسات کا محدثانہ اور ماہرانہ جائزہ لیا گیا ہے جو یقینًا کسی دیدہ ور، وسیع النظر اور علوم حدیث کے متبحر ہی کی شان ہے۔

اسے اردو کا جامہ پہنا کر آپ نے ایک قیمتی علمی ذخیرے سے اپنے علما، طلبا اور عوام کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ غیروں کی کتابیں ان کے ہندی ہم مذہب بڑی تیزی سے اردو میں بھی عام کر رہے ہیں، ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ان کے جواب میں اہل سنت کی جو معیاری و بلند پایہ نگارشات ہیں انھیں بھی اردو میں عام کیا جائے۔ فجزاك الله أحسن الجزاء، و زادك علما و عملا، و يسر لك نشر الدين و العلم و ما يرضى به الله جلّ و علا و رسوله المجتبى المرتضى عليه و على آله و صحبه الصلاة و السلام.

اس کتاب میں بھی میں نے زبان اور کمپوزنگ کی خامیوں پر نشانات لگا دیے ہیں جو آپ دیکھ کر اپنے نسخے میں نقل کر لیں گے اور بہت سارے نشانات آپ خود بھی لگا چکے ہوں گے ـــ کچھ اور باتیں بھی ذہن میں آ رہی

ہیں جنھیں وقتِ ملاقات ذکر کرتا، مگر معلوم نہیں کب ملاقات ہو، اور ہو تو فرصت رہے یا نہ رہے، اور فرصت بھی رہے تو ساری باتیں یاد آئیں یا نہ آئیں۔ اس لیے کچھ اشارات لکھ دیتا ہوں، جہاں ضرورت محسوس کریں وقت ملاقات مجھ سے تفصیل کرا سکتے ہیں۔

① بدمذہب قابل تحقیر ہوتا ہے خصوصًا وہ جو اپنی بدمذہبی کا داعی و مبلغ، ضال مضل ہو۔ اور کلمۂ ترحم "رحمہ اللہ" وغیرہ سے اس کی توقیر ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے: "من وقر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الإسلام"۔ اگر کسی کے کلام میں بدمذہب کے لیے ایسا کلمہ استعمال ہو تو منکر ہے جسے مٹانا چاہیے، نہ کہ مزید بڑھانا اور پھیلانا۔

خصوصًا دیوبندی علما جو عرب میں اپنے کو سنی و صوفی سے متعارف کراتے ہیں اور بہت سے عرب سنی ان سے متعلق غلط فہمی کے شکار ہیں مگر برصغیر کے سنی علما ان کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں اور ان کی تکفیر کلامی سے واقف ہیں۔

② آپ نے کتاب کی تسہیل میں بڑی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر تھوڑے تصرف سے تفہیم میں مزید آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً ص ۲۳۶ پر ایک حدیث ذکر کر کے اس کے دیگر تخریج کرنے والوں کی فہرست ہے۔ اسے یوں لکھا جا سکتا ہے:

حدیث مذکور کی تخریج کرنے والے دیگر محدثین:

۱. امام احمد رحمہ اللہ	کتاب:	مسند	۳/۲۷، ۵۰، ۹۳۔ فضائل الصحابہ ۱/۴۹
۲. ابوداؤد	//	سنن	۴/۴۸
۳. ترمذی	//	سنن	جیساکہ تحفہ ۱۰/ ۱۴۱-۱۴۲ میں ہے۔
۴. ابن ماجہ	//	سنن	۱/۳۷
۵. حمیدی	//	المستخرج	۲/۳۳۳
۶. عبد بن حمید	//	المنتخب	۱۷۰
۷. ابویعلی موصلی	//	مسند	۲/۳۶۹-۴۰۰
۸. ابن ابی عاصم	//	السنۃ	۲/۶۱۶
۹. خیثمہ بن سلیمان طرابلسی	//	جزء الفضائل	۲۰۰
۱۰. علی بن الجعد	//	مسند	۲۵۹، ومابعد، نسختی

اس طرح کے مقامات کتاب میں بہت ہیں، پیش نظر انداز میں لکھنے سے قارئین کے لیے فہم اور ضبط

میں آسانی ہے۔

(۳) کئی جگہ مسند بزار بحوالہ کشف الاستار جیسے الفاظ ہیں۔ اس تعبیر سے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ بزار نے کشف الاستار کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ جب کہ مراد یہ ہے کہ بزار نے تخریج کی ہے اور صاحب کشف الاستار نے اس کا حوالہ دیا ہے اس لیے اس طرح کی تعبیر ہونی چاہیے: یہ مسند بزار میں ہے جیساکہ کشف الاستار میں مذکور ہے یا جیساکہ صاحب کشف الاستار نے بتایا، یا حسب بیان کشف الاستار۔

○ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب بار بار اشاعت کے قابل ہے، اس لیے اس کی مزید تہذیب وتحسین جو تھوڑی محنت سے ہوسکتی ہے وہ کر دی جائے ـــــ اور اشاعت جاری رہے۔ پھر اس کی عمدہ تلخیص اور اس کی بکثرت اشاعت بھی ہوتی رہے تو عام لوگوں کے لیے یہ بھی بہت مفید ہے۔

بہر حال میں ان علمی دینی کاوشوں پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور مزید کی امید رکھتا ہوں۔ واللہ ولی التوفیق و الإنعام۔

محمد احمد مصباحی
۱۱ر رجب ۱۴۳۶ھ
یکم مئی ۲۰۱۵ء-جمعہ

☆☆☆

مکرمی.......... سلام مسنون

مفصل خط ملا۔ آپ حضرات کا دینی ودعوتی شعور قابل تحسین ہے۔ اخلاص ومحنت کے ساتھ کام کرنے والے میدان میں اتر آئیں تو کوئی زمین بنجر اور ناقابل تسخیر نہیں۔ تدبیر وحکمت، حزم واحتیاط، دور اندیشی اور صحیح منصوبہ بندی ضروری ہے۔ اسلامی اکیڈمی تو اچھا نام ہے اسے شاخ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اجالا کی طباعت (دوہزار) اسی کاغذ پر ہو جس پر ہمارے یہاں سے پہلے شائع ہوئی ہے تو چار ہزار روپے کا تخمینہ ہے۔ یہ رقم آپ المجمع الاسلامی، اسٹیٹ بینک آف انڈیا، محمد آباد گوہنہ، برانچ نمبر ۱۱۴۸ کا ڈرافٹ بنواکر بھیج سکتے ہیں۔ بعد طبع پارسل آپ کے پتہ پر بک کر دیا جائے گا اور حساب بھی ارسال ہوگا، جو کمی بیشی ہوگی اس کا حساب بعد میں ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ اشاعت مسلک اور تعارف سنیت کے لیے حسب ذیل کتابیں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ چند مکتبے قائم ہو جائیں تو ان کے ذریعہ یہ کام ہوتا رہے گا۔ مولانا انوار اللہ صاحب حیدرآبادی کی کتاب "انوار احمدی" علامہ ارشد القادری نے نئے انداز میں مرتب کی ہے جام نور بکڈپو دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔ جنوب

میں اسے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ عقائد علماے دیوبند بھی مفید ہوگی، اس لیے کہ اُدھر بہت سے لوگ مسلک دیوبند سے واقف نہیں۔ [۲۵/اگست ۱۹۹۰ء]

☆☆☆

محترمی....... سلام مسنون....... مزاج گرامی؟

سنی علما اور سنی شعرا کی تاریخ مرتب ہونی بہت ضروری ہے۔ اس کا احساس آپ کو بھی ہوگا۔ پاکستان کے اہل قلم نے اس میدان میں نمایاں پیش قدمی کی ہے۔ ۱۴۰۰ھ میں معاصر علماے اہل سنت پاکستان کی مختصر تاریخ "تعارف علماے اہل سنت" کے نام سے شائع ہوئی۔ اہل سنت کی تیرہویں، چودہویں صدی کی تصانیف کی فہرست "مرآۃ التصانیف" قریبًا ساڑھے چھ ہزار کتابوں کے اجمالی تذکرہ پر مشتمل سال مذکور میں لاہور سے شائع ہوئی۔ لیکن ہمارے یہاں ابھی وہی ریت ہے۔ زبانی زیادہ، قلمی کم ،بلکہ کالعدم۔ ادھر حکیم محمد موسیٰ امرتسری، مولانا عبدالحکیم شرف قادری اور مولانا تابش قصوری وغیرہم کی تحریک پر راجا رشید محمود نعت گو شعرا کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ معاصر شعرا کے حالات کے لیے تابش قصوری صاحب نے راقم حروف کو لکھا ہے۔ لیکن آپ حضرات کی تاریخ اور احوال ہیں کہاں جو میں ارسال کروں؟ عرض یہ ہے کہ اپنے متعلق اور اپنے پسندیدہ نعت گو شعرا کے متعلق جو مواد بہ سہولت فراہم کر سکیں درج ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں، اگر اس میں زحمت ہو تو میرے پاس دستی یا ڈاک سے بھیجیں تاکہ میں وہاں ارسال کردوں۔ مجموعۂ کلام بھی ہو تو اچھا ہے ورنہ نمونہ ضرور ہو۔ [۲۷/رجب المبارک ۱۴۰۶ھ]

(پتہ: مولانا محمد منشا تابش قصوری، استاذ جامعہ نظامیہ رضویہ، لوہاری منڈی، لاہور)

شہر ممبئی کے ایک پرجوش قلم کار کے نام

کرم فرمائے بندہ......... زیدت عنایتکم.......... سلام مسنون

ایک کتابچہ اور مراسلہ آپ کا موصول ہوا تھا جس میں احقر سے آپ نے "غوث الوریٰ" کا اداریہ مستقلاً لکھنے کی فرمائش کی تھی، ابھی اس کا جواب بھی نہ لکھ سکا تھا کہ دوسرا کرم نامہ پیش نظر ہے جس میں آپ نے "تاریخ اسلام" کا مستقل عنوان راقم کے سپرد کیا ہے۔ اسی طرح مسائل وافکار وغیرہ کی مستقل عنوانات مختلف اہل قلم کے اسمائے گرامی کے ساتھ آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔ اگر یہ تمام اہل قلم انبساط کے ساتھ آپ سے حتمی وعدہ ہر ماہ اپنا مضمون بھیجنے سے متعلق کرلیں تو بھی میں نہیں سمجھتا کہ پابندی وقت کے ساتھ آپ کو ہر ماہ مضامین موصول ہوجایا کریں گے کیوں کہ ہر شخص کے ساتھ ذاتی مصروفیات اور ذمہ داریاں ہی اس قدر ہیں جن کا پورا کرنا اس کے لیے مشکل ہوجاتا ہے جب کہ وہ ان کی اصل ذمہ داریاں فرض درجہ کی ہیں اور آپ کی تفویض کردہ ذمہ داری بمنزلۂ نفل۔ جب کہ مضامین کا ذخیرہ مرتب کے پاس موجود رہنا ازبس ضروری ہے۔ رسالے سے متعلق میں نے عزیز گرامی مولانا عبدالسمیع بہرائچی کو اپنے خیالات تفصیلاً لکھے تھے، وہ خط شاید ان کے ساتھ ہی رہ گیا ہو اور کسی دوسرے کی نظر بھی نہ پڑی ہو۔ میں اپنے خیالات ازسرنو آپ کو لکھتا ہوں، ان کی روشنی میں آپ کام کریں تو کامیابی یقینی ہے:

(۱) جتنے بھی مستقل عنوانات آپ متعین کریں وہ آپ خود لکھیں اور ہرگز کسی باہر اور دور کے آدمی پر رسالہ کا کوئی عنوان نہ رکھیں۔ ورنہ آپ کا بہت سا وقت مراسلت میں ہی برباد ہوجائے گا اور آخر میں ہمت ہار جائیں گے۔ جب کہ یہی وقت آپ خود لکھنے میں صرف کریں تو کامیاب رہیں گے۔

(۲) ضروری نہیں کہ آپ ہر ماہ تازہ مضامین خود لکھیں، بلکہ اپنے متعینہ عنوانات کے مناسب کتابوں سے اخذ کرکے صاحب کتاب کا نام بشکل مضمون نگار لکھ کر رسالے میں پیش کردیں۔ ڈائجسٹ والے برابر یہی کررہے ہیں اور ندوہ سے شائع ہونے والا "البعث الاسلامی" ان کے حلقے میں اہل قلم کی کثرت کے باوجود زیادہ تر اقتباس شدہ عربی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے اور قارئین کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ مضامین اس رسالے کے لیے لکھے گئے ہیں یا کسی کتاب سے لیے گئے۔

(۳) اس صورت میں آپ کے پاس ایک متوسط قسم کی لائبریری ہونا ضروری ہے۔ تاکہ ہر مضمون پر آپ کو مطلوبہ مواد مل سکے۔

(۴) رسالہ کی کتابت، طباعت، ترسیل، توسیع اشاعت، حساب کتاب کے لیے آپ دو تین آدمی رکھیں اور خود صرف ہدایات دیں اور نگرانی کریں ورنہ ترتیبی کام آپ سے نہ ہوپائے گا۔ تصحیح کتابت خود کریں البتہ سخت ضرورت کے پیش نظر آپ موقع نکال کر ان کا تعاون کردیا کریں۔ یہاں تک کہ وہ **مکمل ٹرینڈ** ہوجائیں۔

(۵) پھٹکر خریدار بنانے کے بجائے زیادہ ایجنٹ بنانے کی کوشش کریں اس سے دو فائدے ہوں گے ایک تو ترسیل کے پتے کم رہیں گے اور نکاسی زیادہ۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ایجنٹوں کو رسالے جب وی پی جائیں گے تو انھیں موصول ہوں

گے جب کہ پھٹکر خریداروں کے رسالے زیادہ تر ضائع ہوجاتے ہیں اور شکایتی خطوط کا انبار لگ جاتا ہے۔ دوبارہ، سہ بارہ بھیجنے پر بھی بعض خریدار محروم رہ جاتے ہیں اور کلرک صاحبان سے پتے لکھنے میں بھی بڑی غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔ پھر ڈاک والوں کے پڑھنے، پہنچانے، قصداً ضائع کرنے، ردی پر بیچنے کی غلطیاں اور خیانتیں ان سب پر مستزاد ہیں۔

(۶) البتہ مقامی حضرات کو پھٹکر خریدار ضرور بنائیں اور ان کے پاس ہر ماہ آپ کا آدمی ایک دن موٹر سائیکل یا کسی اور سواری سے تمام رسالے گھوم کر پہنچا دیا کرے۔

(۷) رسالہ کی اشاعت کم از کم پانچ ہزار ہونی ضروری ہے ورنہ اخراجات کا نکلنا مشکل ہوگا۔ بہت سے خریدار یا ایجنٹ ٹوٹ جاتے ہیں، ان کے جوڑنے اور ان کے متبادل پیدا کرنے پر بھی برابر نظر رہنی چاہیے۔

(۸) ضروری ہے کہ رسالہ ہر ماہ کے اندر ہی ختم ہوجایا کرے کیوں کہ موقوتی اور میعادی نام کی چیزوں کو وقت گزرنے کے بعد از کار رفتہ شمار کرلیا جاتا ہے اور بیش قیمت ہونے کے باوجود وہ بے قیمت بن جاتی ہیں۔

(۹) ایجنٹوں کو اتنا وقت ملنا چاہیے کہ وہ رسالہ ہر ماہ کے نصف اول میں نکال ڈالیں ورنہ وہ رقم خالی نہ کرسکے تو بقایا چلانا شروع کردیں گے اور نوبت بندیِ معاملت تک پہنچے گی جس کا اثر ادارہ کی مالیات پر پڑے گا۔

(۱۰) مضامین اور کتابت طباعت میں دلکشی اتنی ہونی چاہیے کہ آدمی دیکھتے ہی خریدنے پر اپنے کو مجبور پائے اور ہر ماہ اس کے لیے بے قرار رہے۔ ایسا ہوا تو کبھی رسالہ رکھا نہیں رہے گا۔ ہر ایجنٹ کے پاس سے نکلتا ہی چلا جائے گا اور کامیابی آپ کی قسمت ہوگی۔

(۱۱) بامعاوضہ اشتہارات رسالے کو خودکفیل بنانے، آگے بڑھانے اور کارکنوں کا اضافہ کرنے میں بہت زیادہ معاون ہوسکتے ہیں اور یہ بمبئی کی دنیا میں آسان ہے۔

جن تجربات اور خیالات کے پیش نظر میں نے یہ مشورے رقم کیے ہیں ان کی تفصیل زیادہ صفحات کی متقاضی ہے اور بہت سی باتوں سے آپ خود واقف ہیں اور غور کرکے باقی کی تہ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ میرا مقصود حوصلہ شکنی نہیں بلکہ حوصلہ افزائی ہے مگر میں ایسی حوصلہ افزائی کا قائل نہیں جو صرف لفظوں تک محدود ہو اور وقتی خوش دلی کے سوا دائمی جادہ پیمائی عطا نہ کرسکے۔

نوید مسرت میں آپ کے نام کے ساتھ "مفکر اسلام" لگا ہوا ہے، کچھ دنوں بعد لوگ مولانا، علامہ بھی لکھنا شروع کردیں گے، مزید خطابات کی بھی توقع ہے۔ یہ ایک مرض ہے جو ہماری جماعت کے عوام اور علما کو کھائے جارہا ہے۔ اس بیماری کے سارے جراثیم سے اپنے کو ہر طرح بچانے کی تدبیر کریں، ضمیر پہلے تو ملامت کرتا ہے، لیکن سنا سنا کر جب اُسے مردہ کردیا جاتا ہے تو پھر ان القاب کے بغیر راضی نہیں ہوتا۔

کاش کوئی آدمی محترم اصغر حسین طیب صاحب کو ان سب باتوں کے پس منظر و پیش منظر سے آگاہ کرتے ہوئے کام پر متوجہ کرے جو پائیدار اور کامیاب ہو۔ آپ خود اعتمادی پیدا کریں اور، ہرگز یہ تصور بھی نہ کریں کہ دور والے مستقل

طور پر آپ کا ساتھ دیتے رہیں گے، ان کے بھروسے پر آپ رہے تو خود وہ اور ان کے ساتھ بہت سے اور، آپ کے ڈوبنے کے تماشائی تو بن سکتے ہیں آپ کی دستگیری نہیں کر سکتے۔ مرحوم رسالوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ کرنے سے قبل ہی وہ کام کر لینا ضروری ہے جو رسالے کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔

والسلام...[خیر اندیش: محمد احمد مصباحی غفرلہ، یکم جون ۱۹۸۶ء]

☆☆☆

علامہ محمد احمد مصباحی۔ احوال وافکار

مصنف: توفیق احسن برکاتی

ضخامت: ۵۶۰ صفحات   قیمت: ۴۰۰ روپے

ملنے کا پتا: المجمع الاسلامی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ

اس کتاب میں صدر العلماء علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ العالی کے گوشہ ہاے زندگی پر بڑی دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) باب اول: جامعہ اشرفیہ کا علمی اور ادبی ماحول (۲) باب دوم: صدر العلماء احوال و آثار (۳) باب سوم: علمی اور قلمی یادگاریں (۴) باب چہارم: کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ (۵) باب پنجم: افکار عالیہ

باب اول کے تحت مدرسہ اشرفیہ سے لے کر دار العلوم اشرفیہ اور الجامعۃ الاشرفیہ یعنی آج تک کے علمی اور ادبی ماحول کا مرحلہ وار تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے، یہ باب انتالیس ذیلی سرخیوں پر مشتمل ہے، جس میں تاریخ اشرفیہ کا پورا علمی منظر نامہ ادبی و تحقیقی اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ **باب دوم** سارے ابواب سے ضخیم ہے، اس میں حضرت صدر العلماء دام ظلہ العالی کی پیدائش، نشو ونما، تعلیم و تربیت، خاندانی پس منظر، تدریس، تصنیف، تقریر، نثر نگاری، علمی تبحر، اسلوب نگارش، مکتوب نگاری، علما و مشائخ سے روابط، اشرفیہ کے فروغ و ترقی میں سعی پیہم، عادات و اخلاق اور اوصاف حمیدہ جیسے پچاس عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ ساری باتیں براہ راست حضرت صدر العلماء کے کتب و رسائل، مکتوبات و مقالات اور گہرے مشاہدات کی روشنی میں لکھی گئی ہیں۔ **باب سوم** میں مؤلف نے حضرت صدر العلماء کی اب تک کی تمام تصنیفات، تراجم، تحقیقات اور رسائل کی تفصیل باعتبار سنین اشاعت پیش کی ہے۔ **باب چہارم** صاحب تذکرہ کی پندرہ کتابوں کے تفصیلی جائزے اور تبصرے پر مبنی ہے۔ یہ جائزہ بڑی باریک بینی سے لیا گیا ہے، مندرجات کے تعارف میں موصوف نے سوجھ بوجھ اور زیرکی سے کام لیا ہے، قلم کی پختگی نے جائزے کو پر مغز اور قابل اعتبار بنا دیا ہے۔ **باب پنجم** میں حضرت صدر العلماء کے کچھ افکار عالیہ جمع کیے گئے ہیں۔ یہ افکار انسان کی زندگی کے مختلف گوشوں میں رہ نما ثابت ہوں گے اور طلب علم کی راہ میں آنے والی دشواریوں کا حل پیش کریں گے۔ یہ کتاب ہر خاص و عام کے لیے مفید ہے، امید ہے کہ اہل ذوق استفادہ کریں گے۔

اختر حسین فیضی مصباحی

۲۶/نومبر ۲۰۲۱ء

AL-MAJMAUL ISLAMI
Millat Nagar Mubarakpur, Azamgarh